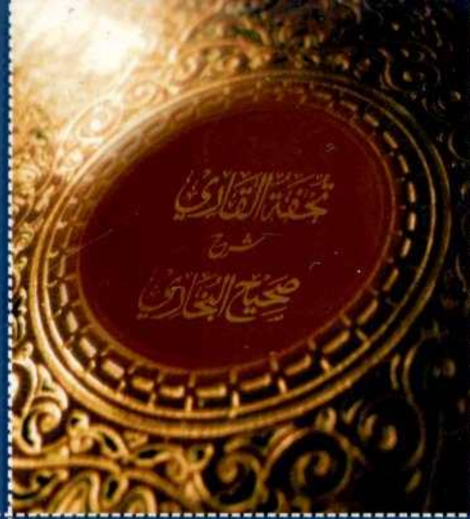


تحفة القاري

شرح

صحيح البخاري

جلد اوّل

افادات
حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ
محدث دار العلوم دیوبند

ترتیب
جناب مولانا مفتی حسین احمد صاحب پالن پوری
فاضل دار العلوم دیوبند



زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی

تحفۃ القاری

شرح

صحیح البخاری

جلد اوّل

اِفادات

حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ

محدّث دار العلوم دیوبند

ترتیب

جناب مولانا مفتی حسین احمد صاحب پالن پوری

فاضل دار العلوم دیوبند

ناشر

زمزم پبلشرز

نزد مقدس مسجد اُردو بازار کراچی

کتاب کا نام ـــــــ تحفۃ القاری صحیح البخاری جلد اوّل

تاریخ اشاعت ـــــــ اگست ۲۰۱۱ء

باہتمام ـــــــ احباب زمزم پبلشرز

ناشر ـــــــ زمزم پبلشرز کراچی

صفحات ـــــــ ۵۹۲

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی

فون: 021-32729089

فیکس: 021-32725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: www.zamzampublishers.com

ملنے کے دیگر پتے

- مکتبہ بیت العلم، اردو بازار کراچی۔ فون: 32726509
- مکتبہ دار الھدیٰ، اردو بازار کراچی۔ فون: 32711814
- دار الاشاعت، اُردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی
- مکتبہ بیت العلم، 17 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ فون: 042-37112356
- مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار لاہور

Madrasah Arabia Islamia
1 Azaad Avenue P.O Box 9786,
Azaadville 1750 South Africa
Tel : 00(27)114132786

Azhar Academy Ltd.
54-68 Little Ilford Lane
Manor Park London E12 5QA
Phone: 020-8911-9797

Islamic Book Centre
119-121 Halliwell Road, Bolton Bl1 3NE
U.K
Tel/Fax . 01204-389080

Al Farooq International
68, Asfordby Street Leicester LE5-3QG
Tel : 0044-116-2537640



فہرست مضامین

مقدمہ

بابٌ: كيفَ كَانَ بَدْءُ الوَحْيِ إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم

کتاب الإیمان

۳-کتابُ العلم

٤- كتابُ الوضوء

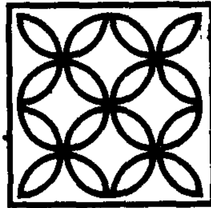
عربی ابواب کی فہرست

٢ – كتاب الإيمان

(١) مصری نسخہ میں ایک باب زائد ہے، ہندی نسخہ میں وہ پہلے باب میں شامل ہے، اس لئے نمبر٢ حذف کیا ہے١٢

كتابُ العِلْمِ

كتابُ الْوُضُوْءِ



عرضِ مرتب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والعاقبة للمتقین، والصلوة والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین، وعلی آلہ وأصحابه وأزواجه وذریاته وعلماء أمته أجمعین، أما بعد:

علوم اسلامیہ کا سرچشمہ اور دین وشریعت کی اصل واساس قرآن مجید ہے۔ اور احادیثِ مبارکہ اس کی تبیین وتشریح اور توضیح وتفسیر ہیں، ان کے بغیر نہ آیات مبارکہ کے شانِ نزول اور مطالب ومقاصد تک رسائی ممکن ہے اور نہ اجمال کی تشریح، عموم کی تخصیص اور مبہم کی تفصیل ممکن ہے، اسی لئے مسلمانوں نے آغازِ اسلام ہی سے قرآنِ کریم کے بعد سب سے زیادہ توجہ احادیثِ شریفہ کی طرف مبذول کی ہے، اور حضور اقدس ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ہر گوشے اور ہر خدوخال کو کمال دیانت واحتیاط سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اور ہر اس علم کی حفاظت وتدوین، نقل واشاعت، جمع وترتیب اور ضبط واتقان کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی ہے جس کا کوئی رشتہ علم حدیث سے ہے، اور پوری جان کاہی، قابلیت، عقیدت اور اخلاص کے ساتھ اس کی ایسی خدمت کی ہے کہ جس کی آج تک کوئی مثال ہے نہ نظیر، اور نہ آئندہ ہوگی۔

خدامِ حدیث کے اس زمرہ میں ایک وقیع نام محدثِ جلیل متکلم اسلام، فقیہ النفس حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم ومدت فیوضھم (شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) کا بھی آتا ہے، جن کی تقریر بخاری کی یہ پہلی جلد بنام 'تحفۃ القاری' ہدیۂ ناظرین کی جارہی ہے، حضرت موصوف کو اللہ عزوجل نے بیان وتوضیح کا ایک خاص ملکہ عطا فرمایا ہے، آپ مشکل مسائل کو تقریر وتحریر کے ذریعہ نہایت عمدہ طریقہ پر ذہن نشین کردیتے ہیں، آپ کا ذوق لطیف، طبیعت سادہ اور نفیس ہے، مزاج میں استقلال واعتدال ہے، اور حق وباطل اور صواب وخطا کے درمیان امتیاز کرنے کی وافر صلاحیت رکھتے ہیں، اور حقائق ومعارف کے ادراک میں یکتائے زمانہ ہیں، موصوف کو خداوند قدوس نے ذکاوتِ طبع، ذہنِ رسا اور فطری سلامت روی کا جوہر عطا فرمایا ہے، اور علمی ریاضت سے قلبی فراست اور فرقانی قوت بھی عطا فرمائی ہے۔ اسی وجہ سے آپ کی ذات میں علم کے ساتھ معرفت، تبحر کے ساتھ

تفقہ اور دراست کے ساتھ علمی لطافتیں جمع ہیں، آپ قرآن وسنت کے غواص ہیں، آپ کو علوم نقلیہ کے ساتھ علوم عقلیہ میں بھی کمال حاصل ہے، اسی لئے آپ کی زبان وقلم سے نقلی مسائل بھی عقلی اور استدلالی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ آپ امام اکبر، مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کے سب سے بڑے شارح ہیں۔ اور ازہر الہند دارالعلوم دیوبند میں بیس سال تک آپ نے حجۃ اللہ البالغہ کا کامیاب درس دیا ہے، اور رحمۃ اللہ الواسعہ کے نام سے پانچ ضخیم جلدوں میں حجۃ اللہ البالغہ کی شرح لکھی ہے جو مطبوعہ ہے اور مقبول عام وخاص ہے، اس لئے حکمت شرعیہ سے بھی آپ کو حظ وافر حاصل ہے۔ دین کا کوئی کیسا ہی مسئلہ ہو، دقیق ہو یا رقیق، آپ اس کی ایسی دلنشیں حکمت بیان فرماتے ہیں کہ طبیعت عش عش کرنے لگتی ہے، چنانچہ موصوف کا ہر درس، ہر تقریر اور ہر تحریر علمی نکات ولطائف اور اسرار وحکم سے لبریز ہوتی ہے۔ موصوف آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے رازوں سے اس طرح پردہ اٹھاتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے جیسے علوم وفنون کا ایک بحر ذخار موجزن ہے، خداوند قدوس نے آپ کو رسوخ فی العلم کے ساتھ مرتب گفتگو کا سلیقہ بھی عطا فرمایا ہے، آپ کا طرزِ تدریس، افہام وتفہیم کا انداز اور مشکل سے مشکل مباحث کو سہل انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ منفرد اور ممتاز ہے، آپ کی ہر تحریر اور ہر تقریر حسن ترتیب اور مشکل کو آسان بنانے میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، اور گنجینۂ علم وحکمت ہوتی ہے۔

حضرت الاستاذ دامت برکاتہم کو خداوند قدوس نے طویل تدریس کا موقع عنایت فرمایا ہے، نصف صدی سے زائد تدریسی تجربہ رکھتے ہیں، اور چالیس سال سے ایشیاء کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، اور علوم وفنون میں بھی طالبان علوم نبوت کو سیراب کرتے رہے ہیں، آپ کا انداز خطابت نہایت مؤثر، درس نہایت مقبول اور عام فہم ہے، بالخصوص حدیث شریف کا سبق خصوصی شان کا حامل ہے۔ اس کی سب سے بڑی شہادت دورۂ حدیث کے طلبہ کی موصوف کے ساتھ گرویدگی ہے، آپ نے تیس سال مسلسل ترمذی شریف کا کامیاب درس دیا ہے، جو مرتب ہو کر بنام 'تحفۃ الالمعی' دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے، اور مقبول عام وخاص ہے۔ یہ شرح اپنی ظاہری ومعنوی خوبیوں کی وجہ سے بے نظیر وبے بہا ہے، اور حضرت والا کی للّٰہیت عشقِ نبوی اور زندگی بھر کی علمی وعملی کاوشوں اور وسیع تر مطالعہ کا ثمرہ ہے۔

حضرت الاستاذ دامت برکاتہم نے ۱۴۰۲ھ میں جو کیمپ کا سال تھا، جب قضیہ نامرضیہ پیش آیا، بخاری شریف جلد ثانی پوری پڑھائی تھی، پھر ۱۴۰۵ھ میں جب سابق شیخ الحدیث حضرت الاستاذ مولانا نصیر احمد خان صاحب رحمہ اللہ کی آنکھوں کا آپریشن ہوا، اور موصوف نے طویل رخصت لی تو مجلسِ تعلیمی نے بخاری شریف جلد اول کا سبق حضرت والا کو سونپا، اس وقت حضرت اقدس مولانا ریاست علی صاحب بجنوری دامت برکاتہم ناظم تعلیمات تھے، اس تجویز کی نقل

حسب ذیل ہے:

حضرتِ محترم مولانا سعید احمد صاحب! زید مجدکم

سلام مسنون: حضرت مولانا نصیر احمد صاحب زید مجدہم کی تحریر پر غور وخوض کے بعد مجلسِ تعلیمی منعقدہ ۱۸-۱-۱۴۰۵ھ نے بخاری شریف جلد اول کا سبق عارضی طور پر آں محترم سے متعلق کیا ہے، ساعت چہارم میں شروع فرمادیں، دعا ہے کہ خداوند قدوس علم وعمل میں ترقی عطا فرمائے، آمین (حضرت مولانا) ریاست علی (صاحب) ۱۸-۱-۱۴۰۵ھ

اگلے سال حسب معمول حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب رحمہ اللہ نے بخاری شریف پڑھائی، پھر ۱۴۲۹ھ میں حضرت رحمہ اللہ نے علالت کی وجہ سے تدریس سے معذرت کی اور صدارت سے بھی سبک دوشی حاصل کی تو مجلسِ تعلیمی نے پھر حضرت والا ہی کو بخاری شریف جلد اول کا سبق سپرد کیا۔ اس وقت ناظم تعلیمات حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم تھے، تجویز کی نقل درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم المقام حضرت مولانا سعید احمد صاحب زیدت معالیکم

سلام مسنون: حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب مدظلہ صدر المدرسین کی تحریر گرامی جس میں حضرت نے بوجہ علالت بخاری شریف کے درس سے معذرت کی ہے مجلسِ تعلیمی میں پیش ہوئی مجلس تعلیمی نے طے کیا ہے کہ چونکہ حضرت صدر صاحب مدظلہ نے گذشتہ بیماری میں بھی بخاری شریف کا درس آپ سے متعلق کردیا تھا، اس لئے مجلس تعلیمی نے بخاری شریف جلد اول کا درس آپ سے متعلق کیا ہے۔ مورخہ ۱۷ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ چہارشنبہ سے آں جناب بخاری شریف جلد اول کا سبق ساعت چہارم میں شروع فرما کر ممنون فرمائیں، نوازش ہوگی۔ والسلام

(حضرت مولانا سید) ارشد (صاحب) ۱۶-۳-۱۵۲۹ھ

پھر اسی سال شعبان میں جب مجلسِ شوری کا اجلاس ہوا تو مؤقر شوری نے اس تجویز کی توثیق کی، اور شیخ الحدیث کے منصب کے ساتھ صدر المدرسین کے عہدۂ جلیلہ کے لئے بھی آپ کا انتخاب فرمایا، اس تجویز کا متن حسب ذیل ہے:

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

مکرم ومحترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب زید مجدکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج عالی بعافیت ہو۔ اطلاعاً تحریر ہے کہ مجلسِ شوری منعقدہ ۲۱ شعبان المعظم ۱۴۲۹ھ نے اپنی پہلی نشست میں جناب والا کو دارالعلوم دیوبند کا صدر المدرسین منتخب کیا ہے۔ حسب دستور دارالعلوم دیوبند کا صدر المدرسین بحیثیتِ عہدہ مجلس شوری کا رکن ہوتا ہے، اس لئے جناب والا آئندہ مجلس شوری کے جلسوں میں شرکت

فرمائیں گے۔شوریٰ کی اگلی نشست ان شاء اللہ آج ہی بعد نماز مغرب متصلاً مہمانخانہ دارالعلوم میں منعقد ہوگی، جناب اس میں شرکت فرمائیں۔فقط والسلام،مرغوب الرحمٰن عفی عنہ مہتمم دارالعلوم دیوبند

اس وقت سے آج تک حضرت والا برابر بخاری شریف جلد اول کا درس دے رہے ہیں، اور صدارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ موصوف کی عمر میں برکت عطا فرمائیں اور ان کے فیوض و برکات کو عام و تام فرمائیں، آمین یارب العالمین!

سن ۱۴۲۹ھ میں حضرت مدظلہ نے بخاری شریف کتاب التہجد سے شروع فرمائی تھی، یہاں تک حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب رحمہ اللہ نے پڑھائی تھی، اسی وقت سے حضرت والا کے احباب وتلامذہ اصرار کر رہے تھے کہ ترمذی شریف کی طرح بخاری شریف کا درس بھی مرتب ہوکر شائع ہو، تاکہ آپ کے فیوض عام وتام ہوں، اور آنے والی نسلیں قیامت تک ان سے مستفیض ہوں، مگر چونکہ درس درمیان سے شروع ہوا تھا، اس لئے درخواست قبول کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی، پھر اگلے سال باقاعدہ اسباق ریکارڈ کئے گئے، مگر کسی وجہ سے ترتیب کا کام شروع نہ ہوسکا۔

امسال احقر نے حضرت والد صاحب کے حکم سے درس وتدریس موقوف کرکے سبق میں پابندی کے ساتھ حاضر رہ کر باقاعدہ بخاری شریف پڑھی، اور برادر محترم مولوی محمد توصیف مظفر پوری نے جو دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں اسباق ریکارڈ کئے اور ٹیپ سے حرف حرف نقل کرکے احقر کو دیئے، میں نے ان کو مرتب کیا اور دورانِ درس جن کتب حدیث اور کتبِ فقہ کا حوالہ آیا ان کی مراجعت کرکے بقید صفحات بین القوسین حوالے درج کئے، تاکہ مراجعت میں سہولت ہو، پھر مسودہ حضرت والد صاحب کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے اس کو پڑھا اور حذف واضافہ کرکے قابل اشاعت بنایا۔

حضرت الاستاذ دامت برکاتہم درس میں سنت کے مطابق ٹھہر ٹھہر کر کلام فرماتے ہیں اور دقیق مضامین دو تین بار بیان فرماتے ہیں کبھی بلفظہ مکرر بیان کرتے ہیں اور کبھی الفاظ بدل کر مضمون دوہراتے ہیں، نبی ﷺ کا بھی یہی طریقہ تھا، اس لئے دقیق علمی مضامین بھی قابل فہم بن جاتے ہیں، اور ائمہ سلف، ائمہ مجتہدین اور محدثین کرام کا ذکر انتہائی ادب وعظمت کے ساتھ کرتے ہیں، اور فقہاء کے مذاہب اور دلائل کی وضاحت میں جو طریقہ اختیار فرماتے ہیں وہ عام فہم ہونے کے ساتھ انوکھا بھی ہوتا ہے۔حضرت موصوف اقوال مختلفہ کی تنقیح اس انداز سے کرتے ہیں کہ ہر امام کا قول حدیث شریف سے قریب نظر آتا ہے۔عام طور پر درس میں مجتہدین کے مذاہب میں تقابل اور ترجیح قائم کی جاتی ہے، اور ائمہ کے مذاہب وادلہ بیان کرتے وقت بعض مرتبہ اعتدال قائم نہیں رہتا۔حضرت الاستاذ اس کو پسند نہیں کرتے، وہ

فرمایا کرتے ہیں کہ جب چاروں مذاہب برحق ہیں تو ان میں ترجیح قائم کرنے سے کیا فائدہ؟ حق بہرحال حق ہے، اس میں تشکیک اور مراتب نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ اختلاف کی بنیاد نکھاری جائے، کیونکہ مجتہدین امت کے سامنے سارے دلائل ہیں، ان کے سامنے ایک طرفہ دلائل نہیں ہیں، پھر اختلاف کیوں ہوا؟ اس کی کوئی وجہ ہونی چاہئے، اس لئے حضرت مدظلہ ایسا طریقہ اختیار فرماتے ہیں کہ ائمہ کرام کے دلائل بھی سامنے آجاتے ہیں، اور اختلاف کی بنیاد بھی نکھر جاتی ہے۔ اور ائمہ حق کا مقام ومرتبہ بھی ملحوظ رہتا ہے، اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ تمام راستے ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہیں، اور چلنے والا جس راہ کو بھی اختیار کرے گا منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔

حدیث پڑھانے والوں کی ایک عادت یہ چلی آرہی ہے کہ سال کے شروع میں اتنی لمبی تقریریں کرتے ہیں کہ زیادہ تر تطویل کی وجہ سے طلبہ کے لئے غیر مفید اور ناقابل فہم ہوتی ہیں، اور سال کے آخر میں چونکہ کتاب کا اکثر حصہ باقی رہ جاتا ہے، اور ختم کرانا ضروری ہوتا ہے اس لئے اتنی مختصر تقریر ہوتی ہے کہ اختصار کی وجہ سے طلبہ کے پلّے کچھ نہیں پڑتا، بلکہ بعض اوقات تو صرف عبارت خوانی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ حضرت والد صاحب کے درس کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ پورا سال درس اس ٹھہراؤ اور ترتیب سے ہوتا ہے کہ کتاب بحسن وخوبی مکمل ہوجاتی ہے، یہ نہیں ہوتا کہ بعض مشہور مباحث میں اتنا وقت صرف کردیا جائے کہ دوسرے مباحث اور بقیہ کتاب کے لئے وقت باقی نہ رہے اور صرف ورق گردانی کرکے بقیہ کتاب پوری کردی جائے۔

اور موصوف کے درس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ آپ جو بھی کتاب پڑھاتے ہیں اس کا ایک ایک حرف حل کرتے ہیں، کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں چھوڑتے، امسال حضرت مدظلہ نے بخاری شریف کی عبارت خود ہی پڑھی ہے، تاکہ صحیح اعراب ریکارڈ ہوجائیں، اور کوئی بات تشنہ نہ رہے، جب طالب علم عبارت پڑھتا ہے تو بار بار روک کر ہر ہر لفظ کی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے آپ نے خود عبارت پڑھی اور ہر عبارت کی ضروری وضاحت کی۔ اس لئے احقر نے باب سے متعلق تقریر لکھنے کے بعد عبارت صحیح اعراب کے ساتھ رکھی ہے، پھر حضرت الاستاذ کی وہ وضاحتیں درج کی ہیں جو عبارت خوانی کے ضمن میں آئی ہیں، ان شاء اللہ اس سے طلبہ کو فائدہ پہنچے گا۔

شرح کے چند امتیازات:

۱- بخاری شریف کے تراجم دقیق ہیں، ان کے ضمن میں امام بخاری رحمہ اللہ اپنا فقہی مسلک بھی بیان فرماتے ہیں، کیونکہ آپ مجتہد ہیں، اور ابواب واحادیث کے درمیان گہرا تعلق ہوتا ہے، اس لئے بخاری شریف میں تراجم اور احادیث کے درمیان تطبیق معرکۃ الآراء مسئلہ سمجھا جاتا ہے، حضرت الاستاذ نے اس پہلو کو خاص طور پر اجاگر کیا ہے، ہر ترجمہ کا مقصد

امام بخاری رحمہ اللہ کا مسلک اور ابواب واحادیث کا باہمی ربط خاص طور پر واضح فرمایا ہے اور اس پر محققانہ کلام کیا ہے۔

آپ نے بخاری شریف فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب مرادآبادی قدس سرہ (سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند) سے پڑھی ہے۔ حضرت فخر المحدثین قدس سرہ کو دو باتوں میں کمال حاصل تھا۔ ایک: بخاری شریف کی کتابوں اور ابواب کے درمیان ربط قائم کرنا، دوم: ہر باب کا مقصد متعین کرنا اور باب کی حدیثوں کو اس پر منطبق کرنا۔ پہلے موضوع پر حضرت مرادآبادی کی ایک مطبوعہ تصنیف ہے، جس کا نام ہے: القول الفصیح بِنَضْدِ أبوابِ الصحیح: نضد کے معنی ہیں: جوڑنا، یعنی بخاری شریف کی کتب وابواب میں ربط بیان کیا ہے یہ قیمتی کتاب مطبوعہ ہے مگر کبریت احمر ہے، اور دوسرے موضوع پر بھی حضرتؒ کی تصنیف دو جلدوں میں چھپی ہوئی ہے جو ابواب الحج کے ختم تک ہے، اس میں مقاصد ابواب، اور حدیثوں کا باب سے ربط بیان کیا ہے۔ اس کا نام القول النصیح فی مقاصد أبواب الصحیح ہے، اس کی جلد اول حضرت مرادآبادی رحمہ اللہ نے خود شائع کی تھی جو کتاب الطہارہ تک ہے، اور دوسری جلد ۱۴۰۵ھ میں جب حضرت الاستاذ نے بخاری شریف کی جلد اول پڑھائی تو اس کا مسودہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب مدظلہ سے لے کر شائع فرمایا مگر وہ بھی اب کبریت احمر ہے۔ یہ کتاب حضرت الاستاذ کے مطالعہ میں رہتی ہے، اور آپ حضرت مرادآبادی قدس سرہ کی خوشہ چینی کرتے ہیں، اس لئے بہت سے ابواب میں آپ کو حضرت مرادآبادی قدس سرہ کی جھلک نظر آئے گی، غرض مقاصد ابواب میں اگر کوئی خوبی نظر آئے تو وہ دراصل حضرت مرادآبادی قدس سرہ کی مرہون منت ہے۔

۲- ایمانیات میں جو مسائل اہل السنہ والجماعہ کے درمیان اختلافی ہیں ان کی ایسی دلنشیں وضاحت فرمائی ہے کہ اختلاف کی بنیاد اور وجوہات واضح ہوجاتی ہیں، اور قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ اہل حق کے درمیان اختلاف محض لفظی ہے، حقیقی اختلاف فرق باطلہ کے ساتھ ہے، آپ نے فرق باطلہ کا تعارف کرایا ہے اور ان کی گمراہی کے اسباب پر محققانہ کلام فرمایا ہے۔

۳- کتاب کے شروع میں ایک طویل مقدمہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ مقدمہ خود ایک مکمل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، اور بڑی قیمتی اور نایاب معلومات وتحقیقات پر مشتمل ہے۔ حضرت مدظلہ نے حدیث کی حیثیت وحجیت، اس کی تدوین وترتیب کے تاریخی مراحل، حجازی اور عراقی مکاتب فکر کی تاریخ، جمع قرآن وجمع حدیث کی تاریخ بڑے اچھے انداز میں بیان فرمائی ہے، اور دیگر بہت سے اہم، معرکۃ الآراء، پیچیدہ اور مختلف فیہ مسائل پر نہایت محققانہ کلام فرمایا ہے۔ خاص طور پر تقلید کی ضرورت واہمیت پر موصوف نے اعلی اور استدلالی انداز میں روشنی ڈالی ہے، اور اجماع وقیاس کی واقعی حیثیت اور وحی اور صاحب وحی کے مقام پر جس علمی انداز میں بحث کی ہے وہ بصیرت پیدا کرنے والی باتیں ہیں۔ اور علماء کے لئے عام طور پر اور طلبہ کے لئے خاص طور قیمتی سوغات ہیں۔

۴- بخاری شریف کے ہندوستانی نسخہ میں عبارت قدیم طرز پر چھپی ہوئی ہے، کچھ پتا نہیں چلتا کہ بات کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے، ہم نے متن مصری نسخہ کا رکھا ہے، مگر اس کو ہندی نسخہ کے مطابق کیا ہے اور مصری نسخہ کی ترقیم کی پیروی کی ہے، کیونکہ وہی ترقیم شائع ذائع ہے، البتہ مصری نسخہ میں بعض حدیثیں زائد ہیں اور بعض حدیثیں ہندوستانی نسخہ میں زائد ہیں، مصری نسخہ میں جو زائد حدیثیں ہیں ان کو حذف کیا ہے اور ان کا نمبر بھی حذف کیا ہے اور ہندوستانی نسخہ میں جو زائد حدیثیں ہیں ان کو شامل کیا ہے، کیونکہ ہمارے دیار میں یہی نسخہ رائج ہے اور ان پر بٹا لگا کر نمبر ڈالے ہیں، نیز عبارتوں کو جدا جدا کیا ہے، اس سے بھی ان شاء اللہ کتاب فہمی میں مدد ملے گی۔

۵- بخاری شریف کے شروع میں طویل گفتگو کا معمول نہیں۔ بڑے بڑے عربی شراح بھی معمولی خطبہ لکھ کر کتاب شروع کر دیتے ہیں، مگر حضرت الاستاذ سال کے شروع میں پندرہ دن مسلسل تمہیدی باتیں کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ جو طلبہ مشکوٰۃ سے دورہ میں آتے ہیں ان کا علمی مستوی فروتر ہوتا ہے۔ جب کہ دورہ میں دقیق ابحاث سے ان کو سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے حضرت الاستاذ فن حدیث سے متعلقہ مباحث بہت تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ طلبہ کا ذہنی معیار بلند ہو، اور وہ دورہ کی ابحاث سے کما حقہ فائدہ اٹھا سکیں۔

۶- پہلے طلبہ جید الاستعداد ہوتے تھے، احادیث سمجھے ہوئے ہوتے تھے، اس لئے اکابرین کی توجہ مقصد باب اور باب کے ساتھ حدیث کی تطبیق کی طرف زیادہ رہتی تھی، حدیثوں کی شرح عام طور پر نہیں کی جاتی تھی۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی بخاری شریف کی جو تقریریں چھپی ہوئی ہیں اور فیض الباری کے ملاحظہ سے یہ بات آشکارا ہے، مگر اب دور بدل گیا ہے، کچھ طلبہ تو اب بھی حدیثیں سمجھے ہوئے ہوتے ہیں مگر عام طلبہ کو حدیث سمجھانی پڑتی ہے، جبھی ان کی سمجھ میں حدیث کی باب سے تطبیق آسکتی ہے، اس لئے حضرت الاستاذ ہر حدیث کی وضاحت فرماتے ہیں تاکہ ہر طالب علم سبق سے کما حقہ فائدہ اٹھائے، جو حدیثیں مکرر آتی ہیں ان کو تو بار بار نہیں سمجھاتے مگر جب حدیث پہلی مرتبہ آتی ہے تو پوری وضاحت کے ساتھ حدیث سمجھاتے ہیں، یہ بھی اس تقریر کی ایک خصوصیت ہے۔

یہ شرح کے چند واضح امتیازات میں جو عرض کئے گئے، ان کے علاوہ بھی قارئین بہت سی خوبیاں پائیں گے۔

حضرت والا کی سبق میں پابندی سبق آموز ہے، ابتداء و انتہاء میں منٹ منٹ کا لحاظ فرماتے ہیں، نہ ذرا دیر پہلے سبق شروع فرماتے ہیں اور نہ دیر تک جاری رکھتے ہیں، اور دورانِ سبق صرف سبق پڑھاتے ہیں ادھر اُدھر کی باتوں سے گریز کرتے ہیں، البتہ طلبہ کی اصلاح سے متعلق کوئی بات ہو تو نصیحت فرماتے ہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہیں کرتے، اور ایمان و اخلاص، فکر آخرت اور اصلاح و تربیت میں رسماً آگے بڑھنے کے بجائے نہایت دل سوزی اور مؤثر انداز میں اصلاح و تربیت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، اگر سبق کے دوران سہو ہو جائے تو متنبہ ہونے پر بلا تکلف رجوع

فرمالیتے ہیں، کبھی دوسرے دن آکر رجوع فرماتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ میں نے فلاں بات غلط کہی تھی، صحیح بات یہ ہے۔ اور حضور اقدس ﷺ سے عشق ایسا ہے کہ صاف صاف درود شریف پڑھتے ہیں اور طلبہ کو بار بار اس کی نصیحت فرماتے ہیں۔ اور جلدی درود پڑھنے پر ناگواری کا اظہار فرماتے ہیں اور ہر بار درود شریف پڑھنے کی تاکید فرماتے ہیں۔

فن خطابت میں بھی اللہ عزوجل نے حضرت والا کو منفرد سلیقہ مرحمت فرمایا ہے، ملک و بیرون ملک میں آپ کے تبلیغی اور اصلاحی اسفار برابر جاری رہتے ہیں مگر سبق کے ایام میں آپ عام طور پر معذرت کرلیتے ہیں اور بدرجۂ مجبوری سفر کرنے کی صورت میں دیگر اوقات میں تلافی مافات کرتے ہیں۔

آج احقر کے جسم کا رواں رواں منعم حقیقی، رب کریم کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہے کہ اس نے اس ناکارہ کو ناکارگی اور تساہلی کے باوجود حضرت اقدس مدظلہ کے دروس بخاری شریف کے مجموعہ کی پہلی جلد بنام 'تحفۃ القاری' ہدیہ ناظرین کرنے کی سعادت بخشی۔ اور حضرت والا کے ہزاروں محبین ومتوسلین کی دیرینہ خواہش پوری فرمائی۔ اس عظیم نعمت پر رب کریم کا جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

میں نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ کتاب میں کوئی جگہ تشنہ نہ رہے، اگر میں اس مقصد میں کسی درجہ کامیاب ہوا ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور حضرت الاستاذ کا فیض ہے اور اگر کسی جگہ کوئی غلطی ہوگئی ہے تو درگذر فرمائیں اور مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اس کی اصلاح کردی جائے۔ وما توفیقي إلا باللہ علیه توکلت وإلیه أنیب، وصلی اللہ علی النبي الکریم وعلی آله وصحبه أجمعین۔

کتبہ

حسین احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

ابن

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

۱۸ر ربیع الاول ۱۴۳۲ھ = مطابق ۲۲ر فروری ۲۰۱۱ء بروز منگل



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله، نحمده ونستعينه ونستغفره، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا، ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلله فلا هادى له، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لاشريك له، وأشهد أن محمداً عبده ورسوله.

شہادتین کا جواب دینا چاہئے اور جواب دینے کے دوطریقے:

طلبۂ عزیز! جس طرح اذان میں شہادتین کا جواب دیا جاتا ہے، اسی طرح جب خطبہ پڑھا جائے تو بھی شہادتین کا جواب دینا چاہئے، عام طور پر لوگ اس مسئلہ سے واقف نہیں۔ اذان میں شہادتین کا جواب تو دیتے ہیں، مگر خطبہ میں کوئی جواب نہیں دیتا، یہ ٹھیک نہیں۔

اور جواب دینے کے دوطریقے ہیں: ایک مفصل، دوسرا مختصر۔ مفصل طریقہ یہ ہے کہ جب مؤذن یا خطیب کہے: **أشهد أن لا إله إلا الله** تو سامعین بھی کہیں: **أشهد أن لا إله إلا الله** اور جب مؤذن یا خطیب کہے: **أشهد أن محمداً رسول الله** تو سامعین بھی کہیں: **أشهد أن محمداً رسول الله**۔

اور جواب دینے کا مختصر طریقہ یہ ہے کہ آپ شہادتین کے جواب میں کہیں: **و أنا** (میں بھی) حدیث شریف میں ہے کہ آنحضور ﷺ جب جمعہ کے دن خطبہ کے لئے منبر پر تشریف فرما ہوتے اور مؤذن اذان میں شہادتین پکارتا تو آپ کہتے: **و أنا**: میں بھی یہ گواہی دیتا ہوں (مشکوٰۃ حدیث ۶۷۷) مگر زور سے کہنا ضروری نہیں، آہستہ بھی کہہ سکتے ہیں، غرض شہادتین کا جواب دینا چاہئے خواہ مفصل ہو یا مختصر۔

طلباء کو متون حدیث سے مناسبت پیدا کرنی چاہئے:

عزیزو! آج کل طلبہ کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ساری توجہ تقریر میں بیان ہونے والے فنی مباحث پر مرکوز کردیتے ہیں، متن حدیث کے ساتھ مناسبت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے، حالانکہ یہ فنی مباحث اصل نہیں، اصل احادیث ہیں۔ گذشتہ سالوں میں آپ حضرات نے حدیث کی تین کتابیں پڑھی ہیں: مشکوٰۃ الآثار، الفیۃ الحدیث اور مشکوٰۃ المصابیح۔ مگر آپ نے حدیثیں یاد نہیں کیں، آپ حضرات کو کم از کم پانچ سو حدیثیں یاد ہونی چاہئے تھیں، لیکن شاید ہی کسی کو پانچ

حدیثیں یاد ہوں۔ یہ صورتِ حال ٹھیک نہیں، حدیث کے متن کو یاد کرو اور اس کا مفہوم اچھی طرح سمجھو۔ سال پورا ہوتے ہوتے ہر طالب علم کو کم از کم دو ہزار حدیثیں یاد ہونی چاہئیں۔

میرا معمول یہ ہے کہ میں روزانہ سبق شروع کرنے سے پہلے ایک حدیث یاد کراتا ہوں، اور ابتداء اسماء حسنیٰ سے کرتا ہوں، یعنی سب سے پہلے اسمائے حسنیٰ یاد کراتا ہوں، جب طلبہ کو اسماء حسنیٰ یاد ہوجاتے ہیں تو پھر میں جو کتاب پڑھاتا ہوں اس میں سے ایک حدیث یاد کراتا ہوں، تاکہ جب کتاب میں وہ حدیث آئے تو سمجھنے میں آسانی ہو، حفظ کی ہوئی بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ اگر حدیث یاد نہ ہو تو مطلب آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا، اور سمجھ میں آجاتا ہے تو جلدی بھول جاتا ہے، اس لئے میں بخاری شریف ہی میں سے حدیثیں یاد کراؤں گا۔

محفوظات سے بھی حدیثیں یاد کریں:

لیکن ساری کام کی باتیں ہر کتاب میں نہیں ہوتیں بکھری ہوئی ہوتی ہیں:

چہ خوش گفت دانا کہ دانش بسے است ❁ ولکن پراگندہ باہر کسے است

کسی عقلمند نے کتنی اچھی بات کہی ہے کہ عقلمندی کی باتیں بہت ہیں مگر ہر شخص کے پاس بکھری ہوئی ہیں، پس ہمارے کام کی حدیثیں جو ہماری زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں بہت ہیں مگر کسی ایک کتاب میں جمع نہیں، طلبہ کے لئے ضروری حدیثیں جو کتب احادیث میں پھیلی ہوئی ہیں میں نے محفوظات میں جمع کی ہیں، محفوظات کے تین حصے ہیں وہ حدیثیں یاد کرنے کے لئے جمع کی ہیں، پس محفوظات کو حاصل کرنا چاہئے اور ان حدیثوں کو بھی یاد کرنا چاہئے۔

اسمائے حسنیٰ یاد کرنے کی فضیلت:

صحیحین کی حدیث ہے: إن لله تسعةً وتسعين اسماً مِأةً إلا واحداً، مَن أَحْصَاهَا دَخَل الجنةَ: (بخاری حدیث ۲۷۳۶) بیشک اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں سو مگر ایک کم، جو ان کا احاطہ کرے گا وہ جنت میں جائے گا۔

احصاء کے مفہوم میں تین چیزیں شامل ہیں:

أحصی: باب افعال کا فعل ماضی ہے اور حَصَی (کنکری) سے بنا ہے، اس کے لغوی معنی ہیں: شمار کرنا، پرانے زمانہ میں کنکریوں سے شمار کرتے تھے، بلکہ آج تک کرتے ہیں، مگر إحصاء کے مفہوم میں صرف گننا نہیں بلکہ تین باتیں پائی جائیں تب احصاء ہوگا۔

جیسے طواف کے سلسلہ میں حدیث ہے: مَنْ طافَ بالبيت سَبْعًا فأحصاها: جس نے بیت اللہ کے سات چکر لگائے پس ان کو گنا: یہاں بھی صرف گننا مراد نہیں، بلکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ساتوں چکروں میں اللہ کی طرف متوجہ رہا، لغویات سے بچا رہا تو ثواب کا مستحق ہوگا، اور اگر دورانِ طواف باتیں کرتا رہا تو معہود ثواب نہیں ملے گا، گو کہ طواف

ہوجائے گا۔اسی طرح یہاں احصاء کے مفہوم میں تین چیزیں ہیں: اول: اسمائے حسنیٰ کو حفظ کرنا، دوم: ان کے معانی کو سمجھنا، سوم: اسماء حسنیٰ کی حقیقت اپنے اندر پیدا کرنا۔

اسمائے حسنیٰ دوطرح کے ہیں: عام اور خاص، جو خاص ہیں وہ تو خاص ہیں اور جو عام ہیں ان کی حقیقت اپنے اندر پیدا کرنا احصاء ہے۔

خاص نام کی مثال: اللہ تعالیٰ واحد ہیں، احد ہیں۔واحد ہونا اور احد ہونا اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، وہی یگانہ ہیں، باقی سب چیزیں جوڑا جوڑا ہیں، یٰس شریف میں ہے: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ﴾: پاک ہے وہ ذات جس نے تمام چیزیں جوڑا جوڑا بنائیں، جوڑا ہونے سے پاک صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس کے علاوہ ہر چیز جوڑا جوڑا ہے، ﴿مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ﴾ زمین سے جو چیزیں اگتی ہیں ﴿وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ﴾ اور خود انسان بھی ﴿وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ اور جن مخلوقات کو لوگ نہیں جانتے: سب جوڑا جوڑا ہیں۔

اور سورۃ الذاریات میں ہے: ﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْئٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾: ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا تاکہ تم (آخرت کو) یاد کرو، معلوم ہوا کہ واحد اور احد ہونا اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے۔

اسی طرح عظیم ہونا اور متکبر (بڑائی والا) ہونا بھی اللہ کے خاص نام ہیں۔مسلم شریف میں روایت ہے: الكبرياء ردائي والعَظَمَة إزاري —— یہ لفظ ظا کے زبر کے ساتھ ہے، اردو میں ظا کے سکون کے ساتھ عظمت بولتے ہیں جو عربی میں صحیح نہیں، جیسے کھانے کی دعا ہے: بسم الله وعلى بَرَكة الله: لفظ بَرَكة: راء کے زبر کے ساتھ ہے جس کے معنی ہیں زیادتی، بہتات اور نُمو۔اردو میں چونکہ برکت راء کے سکون کے ساتھ بولتے ہیں اس لئے لوگ دعا میں بھی راء کے سکون کے ساتھ پڑھ دیتے ہیں، حالانکہ عربی میں یہ لفظ راء کے زبر کے ساتھ ہے، اس کا خیال رکھنا چاہئے —— بہر حال حدیث ہے: الكبرياء ردائي، والعَظَمة إزاري، فمَنْ نَازَعني واحدًا منهما أَدْخَلْتُه النار (مشکوۃ حدیث ۵۱۱۰) بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری لنگی ہے، پس جو یہ دو کپڑے مجھ سے چھینے گا میں اسے جہنم میں داخل کردونگا، معلوم ہوا کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی خاص صفتیں ہیں۔

الغرض: میں یہ سمجھا رہا تھا کہ اسمائے حسنیٰ میں سے کچھ نام اللہ کے ساتھ خاص ہیں، ان صفات کو اللہ کے ساتھ خاص رکھنا ضروری ہے، مگر ایسی صفات کم ہیں۔اکثر صفات عام ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ العدل (انصاف کرنے والے) ہیں پس انسانوں سے بھی یہ مطلوب ہے کہ وہ انصاف کرنے والے بنیں: ﴿اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾: انصاف کرو، پرہیزگاری سے قریب تر یہی بات ہے، اللہ تعالیٰ غفّار ہیں، بندوں سے بھی یہ صفت مطلوب ہے، یعنی تم بھی معاف کرنے والے بنو، اگر تمہارے ماتحتوں سے کوئی چوک ہوجائے تو درگذر کرو، اللہ غفّار (بہت بخشنے والے) ہیں، بندے اگرچہ بہت بخشنے والے نہیں ہوسکتے، لیکن بخشنے والے ہوسکتے ہیں، اللہ رحیم (مہربانی فرمانے والے) ہیں، انسانوں سے بھی یہ صفت مطلوب

ہے، حدیث میں ہے: **الراحمون یرحمهم الرحمن، ارحموا من فی الأرض یرحمکم من فی السماء:** مہربانی کرنے والوں پر رحمان مہربانی کرتے ہیں، لہٰذا تم زمین والوں پر مہربانی کرو، آسمان والا تم پر مہربانی کرے گا۔

غرض: پہلے ان ناموں کو اچھی طرح یاد کرنا چاہئے پھر ان کے معانی کو سمجھنا چاہئے پھر جو عام صفات ہیں ان کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے، جب یہ تین باتیں جمع ہونگی تب احصاء کا تحقق ہوگا، اور **دخل الجنة** کی بشارت کا بندہ مستحق ہوگا۔

اسمائے حسنٰی گھر میں لٹکانے پر ثواب کا کوئی وعدہ نہیں:

لوگوں میں اسمائے حسنٰی کے سلسلہ میں بڑی کوتاہی پائی جاتی ہے، اسمائے حسنٰی شاندار چھاپ کر برکت کے لیے گھروں میں لٹکاتے ہیں، مگر ان کو یاد کوئی نہیں کرتا، نہ ان کے معانی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، نہ ان کی حقیقتوں کو اپنے اندر پیدا کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ عزیزو! جنت پانے کے لئے لٹکانا کافی نہیں، اور ایک اہم بات یہ ہے کہ بچہ پورا قرآن کریم حفظ کر لیتا ہے اور قرآن کے شروع میں اسمائے حسنٰی چھپے ہوئے ہیں مگر وہ حافظ کو زندگی بھر یاد نہیں ہوتے، کیونکہ استاذ نے یاد نہیں کرائے اور یاد کرانا تو درکنار کبھی توجہ بھی نہیں دلائی، کیونکہ خود استاذ صاحب کو ہی یاد نہیں، پس بچوں کو کیا یاد کرائیں گے، اور کیا توجہ دلائیں گے!

اگر حفظ کلاس میں اسمائے حسنٰی یاد کرانے کا سلسلہ شروع ہو جائے تو بڑی تعداد میں لوگوں کو یہ نام یاد ہو جائیں گے، بعض مسجدوں میں دیوار پر یہ نام لکھے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض مسجدوں میں اسکرین پر آتے ہیں اور سالوں گذر جاتے ہیں مگر ایک نمازی کو بھی وہ نام یاد نہیں ہوتے، حالانکہ اگر روزانہ صرف ایک نام یاد کیا جائے تو تین مہینے میں سب نام یاد ہو جائیں گے۔ مگر ایک نمازی بھی یاد نہیں کرتا، لوگ سمجھتے ہیں کہ تزئین کے لیے یہ نام لکھے ہیں، جب لوگوں میں اتنی سرد مہری پائی جاتی ہے تو اگر میں آپ حضرات سے کہہ دوں کہ ان ناموں کو یاد کر لینا تو شاید ہی کوئی یاد کرے گا، اس لئے میں سب سے پہلے اسمائے حسنٰی یاد کراتا ہوں۔

اور آپ حضرات بچے نہیں ہیں۔ دورۂ حدیث شریف کے طالب علم ہیں، پس میں کسی نام کے معنی نہیں بتاؤں گا، آپ کو خود سمجھنا ہے، میری ایک کتاب محفوظات ہے، اس کے تین حصے ہیں، دوسرے حصے میں میں نے اسمائے حسنٰی ترجمے کے ساتھ دیئے ہیں چھوٹا سا رسالہ ہے اسے لو اور اس کی مدد سے اسماء حسنٰی کو سمجھو۔

اب آگے بڑھو! سب سے پہلے مصنفِ کتاب حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کے حالات زندگی سے متعلق چند باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں:

امام بخاری رحمہ اللہ کا نام ونسب:

امام بخاری رحمہ اللہ کا نام: محمد، کنیت ابوعبداللہ، اور لقب امیر المؤمنین فی الحدیث ہے، والد ماجد کا نام اسماعیل ہے،

اسماعیل ذی علم اور بلند پایہ محدث تھے، انھوں نے امام مالک رحمہ اللہ سے روایتیں کی ہیں، حماد بن زید کو دیکھا ہے، اور عبداللہ بن المبارکؒ سے مصافحہ کیا ہے، خود امام بخاری رحمہ اللہ نے التاریخ الکبیر میں ـــــ یہ کتاب پانچ جلدوں میں مطبوعہ ہے، اس میں امام بخاریؒ نے رواتِ حدیث کا تذکرہ کیا ہے ـــــ اپنے والد کا بھی تذکرہ کیا ہے، اور لکھا ہے کہ انھوں نے امام مالک رحمہ اللہ سے روایت بھی کی ہے، حماد رحمہ اللہ کو دیکھا ہے اور عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا ہے۔

دادا کا نام ابراہیم، اور پردادا کا نام مغیرہ ہے، یہ پہلے مجوسی تھے پھر مسلمان ہوئے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا خاندان فارسی خاندان ہے۔ جس کے اراکین خسروانِ ایران کے عہد میں ممتاز عہدوں پر فائز تھے، مغیرہ پہلے شخص ہیں جو حاکم بخاریٰ یمان بن اخنس جُعفی کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے، چونکہ اس زمانہ کا دستور تھا کہ جو شخص جس کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا، اس کو اسی کے قبیلہ کی طرف منسوب کرتے تھے، اس لئے امام بخاریؒ کا خاندان جعفی کہلانے لگا، پس یہ نسبت: ولاءً ہے[1]

مغیرہ کے والد کا نام بَرْدِزْبَہ (باء کے زبر، راء کے سکون، دال کے زیر، زاء کے سکون اور با کے زبر کے ساتھ) تھا یہ مجوسی تھا، اس کا انتقال کفر کی حالت میں ہوا ہے، اور بردزبہ: عجمی لفظ ہے اس کے معنی معلوم نہیں، بعض حضرات نے لکھا ہے: یہ فارسی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں: کسان (کھیتی کرنے والا) واللہ اعلم۔

سوال: امام بخاری رحمہ اللہ کی کوئی اولاد نہیں تھی پھر آپ کی کنیت ابوعبداللہ کیسے ہوئی؟

جواب: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آنحضور ﷺ سے عرض کیا تھا: یارسول اللہ! آپؐ کی سب بیویوں کی کنیتیں ہیں، میری کوئی کنیت نہیں! آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنے بھانجے عبداللہ کی نام پر کنیت رکھ لو''

معلوم ہوا اولاد ہی کے نام پر کنیت رکھنا ضروری نہیں، پس ہوسکتا ہے: امام بخاری رحمہ اللہ نے کسی رشتہ دار کے لڑکے کے نام پر اپنی کنیت رکھی ہو ـــــ یا ہوسکتا ہے: امام بخاریؒ کے یہاں کوئی لڑکا پیدا ہوا ہو جس کا نام عبداللہ رکھا ہو، پھر اس کا بچپن میں انتقال ہوگیا ہو۔

تاریخ ولادت ووفات اور مدتِ عمر:

امام بخاریؒ ۱۳ شوال سنہ ۱۹۴ھ بروز جمعہ شہر بخاری میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۲ دن کم ۶۲ برس کی عمر میں سنہ ۲۵۶ھ میں وفات

(۱) دورِ اول میں تین نسبتیں چلتی تھیں: ایک: نسبی نسبت، دوم نسبتِ عتاقہ، سوم: نسبت وَلاء، آباؤ واجداد کی طرف نسبت: نسبی نسبت کہلاتی تھی، اور معتِق (آزاد کرنے والے) کے قبیلہ کی طرف نسبت: نسبتِ عتاقہ کہلاتی تھی، اور اسلام میں داخل کرنے والے کی طرف نسبت: نسبت ولاء کہلاتی تھی۔

پائی، کسی نے آپ کا سن پیدائش، مدتِ عمر اور سن وفات اس طرح منضبط کیا ہے، وُلد فی صدق، وعاش حمیدا، ومات فی نور: صدق سے ولادت (۱۹۴ھ) نور سے وفات (۲۵۶ھ) اور حمید سے مدت عمر (۶۲) کے اعداد نکلتے ہیں۔

وفات کا واقعہ:

جب امام بخاری رحمہ اللہ نے حاکم بخاری خالد بن احمد ذہلی کے گھر جا کر شہزادوں کو درس دینے سے اور ان کے لئے مخصوص مجلس کرنے سے انکار کیا تو حاکم اور حضرت کے درمیان اختلاف کی خلیج حائل ہوگئی، لیکن چونکہ حضرت کا پورے شہر بخاری پر بلکہ تمام ممالک اسلامیہ پر گہرا علمی اثر تھا، اس لئے حکومت کے بل بوتے پر حضرت کے خلاف کسی قسم کا اقدام مشکل تھا، چنانچہ حاکم نے حضرت کو عقائد میں متہم کرنے کا پلان بنایا، تاکہ عوام کے جذبات مشتعل ہوجائیں۔ حاکم نے بعض علمائے سوء کو استعمال کیا انھوں نے خلق قرآن کے مسئلہ سے امام صاحب کو متہم کیا، اس کا سہارا لے کر حاکم بخاری نے حضرت کو شہر سے نکل جانے کا حکم دیدیا۔

حضرت بخاریؒ سے بیکند پہنچے، لیکن چونکہ عائد کردہ الزام کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی، اس لئے بیکند میں حضرت کی آمد کے سلسلہ میں دو گروہ ہوگئے، کچھ لوگ آپ کی آمد سے خوش تھے اور کچھ ناراض۔ اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے وہاں رہنا پسند نہیں کیا، اور خرتنگ نامی گاؤں کی طرف چل دیئے، جو آپ کا ننہال تھا، یہ گاؤں سمرقند سے دس میل کے فاصلہ پر ہے، اہل سمرقند نے آپ کو سمرقند آنے کی دعوت دی جو آپ نے قبول فرمالی، اور رمضان المبارک کا مہینہ گذار کر شب عید الفطر سنہ ۲۵۶ھ میں اونٹ پر سوار ہونے کی غرض سے چند قدم چلے، جب سواری کے قریب پہنچے تو فرمایا: میں نقاہت محسوس کررہا ہوں، چنانچہ آپ نے سمرقند جانے کو طبیعت کی بحالی تک مؤخر کردیا، لیکن شبِ عید الفطر ہی میں آپ کا خرتنگ میں وصال ہوگیا، اور وہیں قبر مبارک بنی، میں نے آپ کی قبر کی زیارت کی ہے۔

خرتنگ کی تحقیق:

خر کے معنی ہیں: گدھا، اور تنگ کے معنی ہیں: کمی۔ یہ سمرقند سے دس میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، اور آباد ہے، وہیں امام بخاریؒ کا مزار ہے، مزار کے ساتھ ایک خوبصورت مسجد بھی ہے، میں نے اس مسجد میں نماز پڑھی ہے، کہتے ہیں: حضرت الامامؒ کی وفات کی خبر سن کر اتنی بڑی تعداد میں لوگ وہاں پہنچے کہ سواری کے گدھے کم پڑ گئے، اس وجہ سے اس گاؤں کا نام خرتنگ پڑ گیا، یا اور کسی بڑے آدمی کی وجہ سے یہ صورت پیش آئی ہوگی اس لئے یہ نام مشہور ہوگیا۔

تعلیم کا آغاز:

امام بخاریؒ رحمہ اللہ ابھی کم عمر ہی تھے کہ سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا، چنانچہ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ ماجدہ کی

تربیت ونگرانی میں حاصل کی، احادیث یاد کرنے کا شوق بچپن ہی سے تھا، جب دسویں سال میں قدم رکھا تو تحصیل حدیث کا شوق دامنگیر ہوا، چنانچہ آپ نے دس سال کی عمر میں اتنی حدیثیں حفظ کرلیں کہ گیارہویں سال میں ایک بہت بڑے محدث امام داخلی رحمہ اللہ کے سبق میں سند میں ان کی غلطی پکڑی۔ دورانِ سبق امام داخلی کی زبان سے نکلا: سفیان، عن أبی الزبیر، عن إبراهیم: امام بخاریؒ نے عرض کیا: ابوالزبیر ابراہیم سے روایت نہیں کرتے، داخلی نے ان کی بات تسلیم نہیں کی اور اصل کتاب دیکھنے کے لئے مکان میں تشریف لے گئے، اور اپنی غلطی پر متنبہ ہوئے اور باہر آ کر فرمایا: ''میں نے جو کہا تھا وہ غلط تھا، صحیح آپ بتلائیں؟'' امام بخاری نے کہا صحیح: سفیان، عن الزبیر بن عدی، عن إبراهیم ہے، داخلیؒ یہ سن کر حیران رہ گئے۔ اور امام بخاریؒ کی تصویب کی۔ یہ واقعہ امام موصوف کی عمر کے گیارہویں سال کا ہے، جب آپ سولہ سال کے ہوئے تو عبداللہ بن المبارکؒ کی تمام کتابیں یاد کرلیں، اور امام وکیع رحمہ اللہ کی کتابیں بھی ازبر کرلیں۔

زیارتِ حرمین شریفین:

امام بخاری رحمہ اللہ گیارہ سال کی عمر میں والدہ ماجدہ اور بڑے بھائی احمد کے ساتھ حج کے لئے مکہ معظمہ گئے، حج سے فارغ ہوکر والدہ اور بھائی تو وطن لوٹ گئے، مگر امام صاحب نے تحصیل علم کے لئے مکہ معظمہ ہی میں قیام کیا، گویا گیارہ سال کی عمر تک تو انھوں نے وطن کے محدثین سے حدیثیں حاصل کیں، اور گیارہ سال کے بعد تحصیل حدیث اور زیارتِ علماء کے لئے دور دراز کے اسفار شروع کئے، اور اس راہ کی سخت تکالیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

شیوخ واساتذہ:

امام بخاری رحمہ اللہ کا دور اسلام کی فتوحات کا دور ہے، اسلامی مملکت وسیع ہوگئی تھی اور تابعین، تبع تابعین اور حاملین حدیث دور دور تک پھیل گئے تھے، اس لئے امام بخاریؒ کو تحصیل حدیث کے لئے طویل اسفار کرنے پڑے۔ بعض مرتبہ صرف ایک حدیث کے لئے امام صاحب نے ایک ماہ کی مسافت طے کی ہے، کہا جاتا ہے کہ امام بخاریؒ کے اساتذہ کی تعداد ایک ہزار اسّی ہے، جن سے آپ نے حدیثیں لکھی ہیں۔

تعدادروایات:

امام بخاری رحمہ اللہ نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے انتخاب کرکے بخاری شریف تصنیف فرمائی ہے۔ بخاری شریف میں کل حدیثیں بشمول مکررات، معلقات اور متابعات نو ہزار بیاسی ہیں۔ اور مکررات کو کم کرنے کے بعد یہ تعداد دو ہزار سات سو اکسٹھ رہ جاتی ہیں (۱)

(۱) شیخ تقی الدین ابن الصلاح کی تحقیق کے مطابق بخاری شریف میں کل احادیث مع مکررات سات ہزار دو سو پچھتر ہیں ←

جاننا چاہئے کہ بخاری شریف میں تکرار صرف متن حدیث میں ہوتی ہے، سندوں میں تکرار نہیں ہوتی، جلد اول میں خود امام بخاریؒ نے ایک جگہ (کتاب الحج، باب التعجیل إلی الموقف ۱:۲۶۲ میں) یہ بات لکھی ہے کہ فلاں باب میں جو حدیث گذری ہے وہ اس باب میں بھی لکھی جاسکتی ہے، مگر چونکہ مکرر حدیث لکھنا میرا طریقہ نہیں اس لئے میں نہیں لکھ رہا۔ اور جب حدیث کی سند بدل جاتی ہے تو حدیث بدل جاتی ہے، پھر حضرت اس کو دوبارہ لکھتے ہیں۔

بعد میں علماء نے جائزہ لیا تو پوری کتاب میں ایک سوا ڑسٹھ حدیثیں مکرر پائی گئیں، یعنی بخاری شریف میں اتنی حدیثیں بعینہٖ سند کے ساتھ ایک سے زیادہ جگہ آئی ہیں، اب سوال یہ ہے کہ جب حضرت نے خود لکھا ہے کہ مکرر حدیثیں نہیں لکھتا پھر یہ حدیثیں مکرر کیوں لائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بخاری شریف سولہ سال میں لکھی گئی ہے اور وہ ایک ضخیم کتاب ہے، اتنی بڑی کتاب میں نظر چوک سکتی ہے، ایسی بھول ہوجاتی ہے اور ہر انسان سے ہوتی ہے، لہٰذا اگر یہ حدیثیں مکرر ہیں تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔

مظاہر علوم سہارن پور کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب کا اس موضوع پر ایک رسالہ ہے جو ان کی کتاب الیواقیت الغالیۃ جلد سوم میں مطبوعہ ہے، تفصیل کے لئے اس کو دیکھنا چاہئے۔

امام بخاریؒ حدیث لکھنے سے پہلے غسل کرتے تھے اور دو نفلیں پڑھتے تھے:

بہر حال مکررات کے ساتھ بخاری شریف میں کل حدیثیں نو ہزار بیاسی ہیں، جن کا انتخاب حضرت نے چھ لاکھ

← اور علامہ نوویؒ سے بھی یہی تعداد مروی ہے اور حذف مکررات کے بعد تعداد چار ہزار ہے (مقدمہ فتح الباری ص:۴۶۵) لیکن حافظ رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق بخاری شریف میں مسند احادیث کی تعداد: سات ہزار تین سو ستانوے ہے اور تعالیق کی تعداد: ایک ہزار تین سو اکتالیس ہے، اور متابعات علی اختلاف الروایات تین سو چوالیس ہیں، وجملةُ ما فيه من المتابعات والتنبيه على اختلاف الروايات ثلاث مأة وأحد وأربعون حديثا (مقدمہ فتح الباری ص:۴۶۹) یہاں أحد وأربعون کتابت کی غلطی ہے، صحیح: أربعة وأربعون ہے، اور دلیل یہ ہے کہ حافظؒ نے مجموعہ نو ہزار بیاسی بتایا ہے۔ فرماتے ہیں: تسعة آلاف واثنان وثمانون حديثا: اور یہ بات اسی وقت صحیح ہوسکتی ہے جب متابعات کی تعداد تین سو چوالیس ہو۔ علامہ قسطلانی رحمہ اللہ نے بھی اس کی صراحت کی ہے کہ بخاری شریف میں کل احادیث نو ہزار بیاسی ہیں اور ان میں احادیث موقوفہ (صحابہ کے اقوال) اور احادیث مقطوعہ (اکابر تابعین کے اقوال) شمار نہیں: وجملةُ ما فيه من المتابعات والتنبيه على اختلاف الروايات ثلاث مأة وأربعة وأربعون حديثا، فجملة ما في الكتاب على هذا بالمكرر تسعةُ آلاف واثنان وثمانون حديثا خارجا عن الموقوفات على الصحابة والمقطوعات على التابعين فمن بعدهم (مقدمہ قسطلانی ۱:۵۰) اور حذف مکررات کے بعد تعداد دو ہزار پانچ سو تیرہ ہے (غیر مکرر روایات مرفوعہ ۲۳۵۳ ہیں۔ اور غیر مکرر متابع ومعلقات ۱۶۰۔ پس مجموعہ: ۲۵۱۳ ہوا) وجميعُ ما فيه موصولا ومعلقا بغير تكرار ألفا وخمسين مأة حديث وثلاثة عشر حديثا (مقدمہ لامع ص:۳۷)

احادیث سے کیا ہے، اور طریقہ حضرت کا یہ تھا کہ جب بھی کوئی حدیث لکھتے تو پہلے غسل کرتے دو رکعت نفل پڑھتے، پھر اس حدیث کی تمام سندوں پر غور کرتے، جو صحیح سند ہوتی اس کو درج کرتے۔

ثلاثیات:

وہ احادیث ثلاثیات کہلاتی ہیں جن میں امام بخاری اور نبی ﷺ کے درمیان صرف تین واسطے ہوں، بخاری شریف میں ۲۲ ثلاثیات ہیں، ان میں سے بیس حدیثیں حنفی شیوخ سے روایت کی ہیں۔

اصحاب وتلامذہ:

آپ کے تلامذہ اور مستفیدین کا حلقہ نہایت وسیع ہے، کہا جاتا ہے کہ آپ سے براہ راست نوے ہزار تلامذہ نے جامع صحیح سنی ہے، آپ کے شاگردوں میں بڑے بڑے علماء ومحدثین ہیں مثلاً امام ترمذی، امام نسائی اور امام مسلم وغیرہ۔

والدہ کی دعا:

امام بخاریؒ بچپن میں نابینا ہوگئے تھے، جس کی وجہ سے ان کی والدہ پریشان رہتی تھیں، وہ نہایت گریہ وزاری کے ساتھ بارگاہِ ایزدی میں ان کی بصارت کے لئے دعا کیا کرتی تھیں، ایک رات ماں نے خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں دیکھا، وہ ان سے فرما رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے تیری گریہ وزاری اور کثرتِ دعا کی وجہ سے تیرے بیٹے کو بصارت عطا فرمادی، جب وہ صبح کو اٹھیں تو اپنے فرزند کی آنکھوں کو روشن پایا۔

بخاری شریف تصنیف کرنے کا داعیہ:

امام بخاری رحمہ اللہ کے احوال وکوائف سے متعلق ضروری باتیں تقریبا سب بیان ہو چکی ہیں، جس کو مزید باتیں درکار ہوں وہ امام بخاریؒ کی زندگی پر چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اردو میں بھی اور عربی میں بھی ان کا مطالعہ کرے، البتہ دو باتیں نہایت اہم ہیں، طالب علموں کو ان سے واقف ہونا چاہئے۔

پہلی بات: امام بخاریؒ نے بخاری شریف کیوں لکھی؟ اس کا جواب کتاب کے شروع میں جو مقدمہ ہے اس میں ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ [1] کی مجلس میں جس میں امام بخاریؒ بھی شریک تھے کسی نے کہا: ''کاش تم میں سے کوئی ایسی کتاب لکھے جس میں اختصار کے ساتھ نبی ﷺ کی حدیثوں کو جمع کیا گیا ہو'' کیونکہ اب حدیثیں بہت ہوگئی ہیں اور ان کی سندیں پھیل گئی ہیں، اس لئے صحیح جامع اور مختصر مجموعہ کی ضرورت ہے۔

امام بخاریؒ کے دل میں یہ بات اتر گئی اور انھوں نے یہ پُر خار وادی طے کرنے کی ٹھان لی، اور بخاری شریف لکھ کر

(۱) حضرت اسحاق: امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے خواجہ طاش یعنی استاذ بھائی ہیں۔

امت پر احسان عظیم فرمایا۔

ملحوظہ (۱): بعض حضرات کہتے ہیں: امام بخاریؒ سے بخاری شریف لکھنے کی درخواست خود حضرت اسحاق بن راہویہؒ نے کی تھی، مگر یہ بات صحیح نہیں، صحیح بات وہ ہے جو میں نے ابھی بیان کی کہ یہ درخواست حضرت اسحاق کی مجلس میں شریک کسی دوسرے شخص نے کی تھی، بخاری شریف کے شروع میں جو مقدمہ ہے اس میں ہے: فقال بعضُ أصحابنا: لو جمعتم كتابا مختصِراً ـــــ صاد کے کسرہ اور فتح دونوں کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں، جیسے مستقبِل کی باء دونوں طرح پڑھی جاسکتی ہے ـــــ لسنن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس میں صراحت ہے کہ درخواست کرنے والا حضرت اسحاق بن راہویہ کے علاوہ کوئی اور شخص تھا۔

ملحوظہ (۲): پہلے یہ بات آچکی ہے کہ دور اول میں سندوں کے بدلنے سے حدیث بدلتی تھی، جیسے حدیث إنما الأعمال بالنيات: آنحضور ﷺ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، پھر ان سے حضرت علقمہ روایت کرتے ہیں، اور ان سے ابراہیم تیمی، پھر ان سے یحییٰ بن سعید انصاری یہاں تک سند ایک ہے، پھر یحییٰ بن سعید انصاری سے پانچ سو تلامذہ اس حدیث کو روایت کرتے ہیں، پس یہ پانچ سو حدیثیں ہوگئیں، اس طرح حدیثیں لاکھوں سے متجاوز ہوگئی تھیں، خود امام بخاریؒ نے چھ لاکھ احادیث میں سے انتخاب کرکے بخاری شریف لکھی ہے، کیونکہ درخواست کرنے والے نے اختصار کے ساتھ حدیثوں کو جمع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

بخاری شریف کا نام:

دوسری بات: بخاری شریف کا نام بہت لمبا ہے۔ لوگوں کے لئے اتنا لمبا نام لینا اور یاد رکھنا دشوار تھا اس لئے لوگوں نے اصل نام کی جگہ مصنف کے وطن کا نام رکھ دیا، جیسے طحاوی شریف کا نام ہے: شرحُ معاني الآثار المختلفةِ المرويةِ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الأحكام: مسائل فقہیہ میں نبی پاک ﷺ سے مروی روایتوں میں جو تعارض نظر آتا ہے ان روایتوں کے معانی کی ایسی وضاحت جس سے تعارض ختم ہوجائے۔

یہ طحاوی شریف کا پورا نام ہے، اور اُس کتاب کا موضوع بھی یہی ہے یعنی مسائل فقہیہ میں جن مسائل میں روایات متعارض ہیں، امام طحاویؒ باب قائم کرکے اولاً ان تمام متعارض روایتوں کو لاتے ہیں، پھر ان کی اس طرح توجیہ کرتے ہیں کہ روایتوں کا تعارض ختم ہوجائے۔

مگر جب لوگوں کے لئے اتنا طویل نام یاد رکھنا مشکل ہوگیا تو انھوں نے آگے پیچھے سے حذف کرکے معانی الآثار نام کردیا۔ پھر جب معانی الآثار کا مفہوم بھی پلے نہیں پڑا تو پورا نام حذف کردیا اور اب نام ہوگیا طحاوی شریف۔ چنانچہ جب بھی طحاوی شریف بولتے ہیں تو ذہن فوراً اس کتاب کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے اور اتنی بات کافی ہے، لیکن طالب علم

کے لئے اتنی بات کافی نہیں۔ طالب علم کو پورا نام، اس کے معنی اور اس کی حقیقت معلوم ہونی چاہئے، کیونکہ عنوان معنون پر دلالت کرتا ہے، جب تک عنوان نہیں سمجھے گا معنون سمجھ میں نہیں آئے گا۔

اسی طرح بخاری شریف کا نام بھی بہت طویل ہے: الجامع الْمُسْنَدُ الصحیحُ المختصرُ: من أمور رسولِ الله صلی الله علیه وسلم وسُنَنِهِ وَأَيَّامِهِ: من أمور کا تعلق چاروں کلموں سے ہے صرف المختصر سے نہیں، امام بخاریؒ من سے پہلے چار لفظ لائے ہیں: جامع، مسند، صحیح اور مختصر۔ اور مِن کے بعد تین لفظ لائے ہیں: امور، سنن اور ایام۔ ان ساتوں چیزوں کی حقیقت جان لینے کے بعد کتاب کا موضوع سمجھ میں آئے گا۔

جامع کسے کہتے ہیں؟

علماء کرام نے فن حدیث کو آٹھ اقسام میں گھیرا ہے، جیسے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ نے الفوز الکبیر میں قرآن کریم کے مضامین کو پانچ علوم میں گھیرا ہے: علم الاحکام، علم المخاصمہ، التذکیر بایام اللہ، التذکیر بآلاء اللہ اور علم المعاد۔ یا جیسے علماء نے پورے دین کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے: اعتقادات، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق۔ اسی طرح محدثین نے احادیث کا آٹھ عنوانوں میں احاطہ کیا ہے، اور وہ اس شعر میں جمع ہیں:

سِیَر، آداب وتفسیر وعقائد ❁ فتن، اَشراط واَحکام ومناقب

۱-سِیَر: سِیرۃ کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں: اسلام کا حربی نظام۔ اس کے لئے امام بخاریؒ نے المغازی کا لفظ استعمال کیا ہے، مغازی اور سیر ہم معنی ہیں یعنی اسلام کا حربی نظام۔

۲-آداب: ادب کی جمع ہے، ادب کے معنی ہیں: ما یُحمَد فِعلُه، ولا یُذَمُّ ترکُه: یعنی وہ کام جن کے کرنے پر تعریف کی جائے اور جن کے چھوڑنے پر برائی نہ کی جائے، جیسے اونچی جگہ بیٹھ کر وضو کرنا آداب میں سے ہے، لہٰذا اگر کوئی اونچی جگہ بیٹھ کر وضو کرتا ہے تو بہت اچھا کرتا ہے اور اگر ایسا نہیں کرتا یعنی وضو کے لئے کسی اونچی جگہ کا انتخاب نہیں کرتا البتہ وضو کرتے وقت کپڑوں کی حفاظت کرتا ہے تو کوئی بات نہیں۔

۳-تفسیر: قرآنِ کریم کی بیشتر آیتیں واضح ہیں۔ ان کی تفسیر کے لئے حدیثوں کی ضرورت نہیں، لیکن کچھ آیات ایسی ہیں جن کا پس منظر ہے۔ جب تک وہ پس منظر معلوم نہ ہو ان آیتوں کو کماحقہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ جیسے سورۂ احزاب میں آیت ہے: ﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا﴾: جب حضرت زید بن حارثہ نے اپنی زوجہ حضرت زینبؓ سے اپنی حاجت پوری کرلی تو ہم نے ان کا نکاح آپؐ سے کردیا۔ اس آیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ان روایات کا جاننا ضروری ہے جن میں اس کا شان نزول آیا ہے۔

چنانچہ حدیثوں میں کافی روایات تفسیر قرآن سے متعلق بھی ہیں، ترمذی شریف میں کتاب التفسیر اتنی بڑی ہے کہ تحفہ

الاُمّ کی پوری ساتویں جلد میں سمائی ہے۔اور بخاری شریف کی کتاب التفسیر اس سے بھی طویل ہے،اسی طرح مستدرک حاکم میں بھی کتاب التفسیر کافی لمبی ہے،البتہ مسلم شریف میں مختصر ہے۔

۴-عقائد: عقائد دین کی بنیادیں ہیں۔ بخاری شریف میں دو کتابیں عقائد کے تعلق سے ہیں،شروع میں کتاب الایمان ہے اور آخر میں کتاب التوحید۔

۵-فتن: فتنۃ کی جمع ہے،یعنی وہ واقعات جو مستقبل میں پیش آنے والے ہیں جن کی وجہ سے مؤمنین کے پیر لڑکھڑا جائیں گے اور بہت سے ایمان سے کنارہ کش ہوکر کفر کی پناہ تلاش کریں گے،احادیث میں ان فتنوں کی پہلے سے اطلاع دی گئی ہے تاکہ مسلمانوں کے لئے فتنوں کے زمانہ میں ایمان پر ثابت قدم رہنا آسان ہو۔

مثلاً نبی پاک ﷺ کی وفات ایک ایسی ہی بڑی آزمائش تھی،چنانچہ قرآنِ کریم میں پہلے سے اس کی خبر دیدی گئی، تاکہ جب واقعہ پیش آئے مؤمنین کے قدم لڑکھڑا نہ جائیں۔جب آنحضور ﷺ کی وفات کی خبر پھیلی تو منافقین نے پروپیگنڈہ شروع کردیا کہ اسلام کا شیرازہ منتشر ہونے والا ہے۔اب مسلمان باقی رہنا ضروری نہیں،حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلوار لے کر کھڑے ہوگئے کہ اگر کوئی کہے گا کہ آنحضرت ﷺ کی وفات ہوگئی تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا،اس فتنہ یعنی آزمائش کی خبر پہلے سے دیدی گئی تھی،چنانچہ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سورۂ آل عمران کی آیت (۱۴۴) تلاوت فرمائی تو معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُوْلٌ﴾ محمد (ﷺ) صرف ایک رسول ہیں،خدا نہیں ہیں۔خدا حی لا یموت ہے﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾: آپؐ کی وفات کوئی انوکھا واقعہ نہیں،آپؐ سے پہلے بہت سے رسول وفات پاچکے ہیں،﴿أَفَائِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى أَعْقَابِكُمْ؟﴾تو کیا اگر آنحضور ﷺ کی وفات ہوجائے یا آپؐ جامِ شہادت نوش فرمالیں تو تم اپنی ایڑیوں پر واپس پلٹ جاؤ گے؟ یعنی مرتد ہوجاؤ گے؟﴿وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا﴾: اگر کوئی اپنی ایڑیوں پر پلٹتا ہے اور اسلام سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے تو اس میں اسلام کا کچھ نقصان نہیں وہ خود اپنی دنیا وآخرت برباد کررہا ہے﴿وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾: اور شکر گذار بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں بہترین بدلہ ہے۔یعنی جو لوگ ثابت قدم رہیں گے،موج حوادث سے متاثر ہوکر راہ حق سے دستبردار نہیں ہونگے ان کا اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا مقام ہے اور آرام دہ جگہ جنت ان کی ثابت قدمی کا بدلہ ہے۔

غرض آنحضور ﷺ کی وفات بھی امت کے لئے ایک بڑی آزمائش تھی،لفظ فتنہ کا مفہوم ہمارے ذہنوں میں غلط بیٹھا ہوا ہے اس لئے میں نے اس کی جگہ لفظ آزمائش استعمال کیا،غرض یہ آزمائش پیش آنی تھی،کسی نہ کسی دن آنحضرت ﷺ کی وفات ہونی تھی اس لئے قرآن نے پہلے سے آیت نازل کردی تاکہ جب یہ واقعہ پیش آئے تو لوگ بچل نہ جائیں،اسی طرح مستقبل میں پیش آنے والے بہت سے واقعات ہیں جو حضور ﷺ نے بیان فرمائے ہیں تاکہ جب وہ واقعات پیش آئیں تو لوگ ڈگمگا نہ جائیں۔

نصیر الدین طوسی نے امیر تیمور لنگ کو پہلی رصدگاہ بنانے کے لئے کس طرح آمادہ کیا؟

رصدگاہ: جس میں ستاروں کی چالوں اور حرکتوں کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے اور آئندہ پیش آنے والے احوال کا اندازہ کیا جاتا ہے، سب سے پہلے تیمور لنگ کے زمانہ میں نصیر الدین طوسی نے رصدگاہ قائم کی ہے، نصیر الدین نے تیمور لنگ سے کہا: ہمیں رصدگاہ قائم کرنی چاہئے، تیمور لنگ نے پوچھا: اس پر کتنا خرچ آئے گا؟ نصیر الدین نے پچاس ہزار کا تخمینہ بتایا، بادشاہ نے پوچھا: رصدگاہ بنانے سے فائدہ کیا ہوگا؟ وزیر نے کہا: ہم ستاروں کی چالوں اور حرکتوں پر نظر رکھیں گے جس کی وجہ سے آنے والے واقعات کی خبر ہمیں پہلے سے ہوجائے گی، مثلاً: طوفانی بارش ہونے والی ہے، تیز ہوا چلنے والی ہے، یا زلزلہ آنے والا ہے، اس کی ہمیں پہلے سے خبر ہوجائے گی، بادشاہ نے کہا: کیا ہم ان حادثات کو روک سکیں گے؟ وزیر نے کہا: نہیں، حادثات اپنے وقت پر پیش آکر رہیں گے، بادشاہ نے کہا: پھر پہلے سے جاننے کا کیا فائدہ؟ جب حادثہ پیش آئے گا لوگ خود بخود جان لیں گے، رصدگاہ قائم کرنا اور اس پر اتنا بڑا صرفہ کرنا فضول ہے۔ نصیر الدین نے عرض کیا: میں اس کی افادیت سمجھاؤں گا۔

پھر اس نے برتن بنانے والوں کو بلا کر حکم دیا کہ بہت سارے ایسے ہلکے پھلکے برتن بناؤ جو کسی کو لگیں تو چوٹ نہ آئے اور شور بہت ہو۔ جب برتن تیار ہوگئے تو اس نے بادشاہ سے دربار بلانے کی درخواست کی، اور دربار ہال کی چھت میں چند سوراخ کھلوادیئے اور اجلاس شروع ہوا، جب پلان کے مطابق مقررہ وقت پر سوراخوں سے دھڑ ادھڑ برتن گرنے لگے تو لوگ حواس باختہ ہوکر بھاگے، لیکن بادشاہ اور وزیر اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھے رہے، جب تماشہ ختم ہوا تو وزیر نے عرض کیا: جہاں پناہ! پہلے سے حادثہ کو جاننے کا یہ فائدہ ہے، ہم چونکہ اس کے بارے میں جانتے تھے اس لئے مطمئن رہے، اور درباری نہیں جانتے تھے اس لئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ تیمور لنگ کی سمجھ میں آگیا اور اس نے رصدگاہ قائم کرنے کی اجازت دیدی۔

غرض: حادثہ کی پہلے سے اطلاع ہو تو جب حادثہ پیش آتا ہے آدمی ڈگمگاتا نہیں، جب ہمیں پہلے سے معلوم ہے کہ کانا دجال نکلے گا، اور اس کے ساتھ جنت وجہنم ہوگی، اور اس کے حکم پر زمین اپنے خزانے اگل دے گی، پس جب دجال آکر یہ کرشمے دکھائے گا تو مؤمن پریشان نہیں ہوگا، کیونکہ وہ ان باتوں کو پہلے سے جانتا ہے، آنحضور ﷺ نے اس کی پیشگی اطلاع دیدی ہے، اسی طرح کی تمام وہ روایتیں جن میں آپؐ نے آئندہ پیش آنے والے واقعات کی اطلاع دی ہے وہ فتن کی احادیث کہلاتی ہیں۔

۶- **أشراط**: شَرَط کی جمع ہے۔ شرط کے معنی ہیں: علامت، اور **أشراط الساعۃ** کے معنی ہیں: قیامت کی علامتیں،

قیامت کب آئے گی؟ کوئی نہیں جانتا، حتی کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام جن کی ڈیوٹی صور پھونکنے کی ہے وہ بھی نہیں جانتے، حدیث جبرئیل میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضور ﷺ سے قیامت کے بارے میں پوچھا تھا، آپؐ نے اس کا جواب دیا: آپ کو بھی اس کا علم نہیں مجھے بھی نہیں، جتنا آپ جانتے ہیں اتنا ہی میں جانتا ہوں، قیامت بالیقین آنے والی ہے، مگر کب آئے گی، اس کو رب ذوالجلال کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

سورۃ النمل (آیت ۶۵) میں ارشاد پاک ہے: ﴿قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَیْبَ إِلَّا اللّٰہُ﴾: آپ کہیں: جو خلقت آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے ان میں سے کوئی غیب کو نہیں جانتا بجز رب کائنات کے، ﴿وَمَا یَشْعُرُوْنَ أَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ﴾ اور نہ لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ وہ کب دوبارہ اٹھائے جائیں گے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غیب کی باتیں صرف اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔

پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پوچھا: قیامت کی علامتیں کیا ہیں؟ جن سے پتہ چل جائے کہ اب قیامت قریب ہے، آپ ﷺ نے دو علامتیں بتائیں، ایک: باندی اپنی مالکہ کو جنے، دوسری: ننگے، بھوکے چرواہے یعنی بے حیثیت لوگ ایک دوسرے سے بڑھ کر عمارتیں بنانے لگیں۔

ان کے علاوہ بھی آنحضور ﷺ نے مختلف روایات میں بہت سی قیامت کی علامتیں بیان فرمائی ہیں، وہ سب اشراط الساعہ ہیں اور یہ بھی فن حدیث کا ایک مستقل عنوان ہے۔

۷-احکام: اس کے لئے دوسرا لفظ شریعت (قانون) ہے حدیثوں کا بڑا حصہ احکام پر مشتمل ہے۔

۸-مناقب: منقبت کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں: فضیلت، جن روایتوں میں آنحضور ﷺ کے عہد میں موجود شخصیات کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں، یا گذشتہ انبیاء کی فضیلتوں کو بیان کیا گیا ہے، یا آئندہ آنے والی شخصیات کے فضائل بیان کئے گئے ہیں جیسے حضرت مہدی کے فضائل: ان کو مناقب کی روایت کہتے ہیں۔ حدیث کی ہر کتاب میں کتاب المناقب آتی ہے، اس میں یہی حدیثیں ہوتی ہیں۔

پس جس کتاب میں مذکورہ آٹھوں مضامین کی حدیثیں جمع کی گئی ہوں اس کو ''جامع'' کہتے ہیں، امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کے نام میں پہلا لفظ یہی جامع استعمال کیا ہے، آپ جو کتابیں دورۂ حدیث شریف میں پڑھتے ہیں ان میں جامع صرف دو کتابیں ہیں: بخاری شریف اور ترمذی شریف، اور مسلم شریف کے بارے میں اختلاف ہے، کیونکہ اس میں تفسیر کا حصہ بہت کم ہے، باقی کتابیں جامع نہیں۔

المُسند:

امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب کے نام میں دوسرا لفظ مسند استعمال کیا ہے، اس کا سادہ ترجمہ: باسند حدیثیں ہے، بخاری میں کوئی حدیث بے سند نہیں، مُسند، أَسند (باب افعال) سے اسم مفعول ہے، أَسند کے معنی ہیں: رَفْعُ الحدیثِ

إلی قائِلہ (بات اٹھائی جائے اس کے کہنے والے کی طرف) یعنی سند کے ساتھ بات بیان کی جائے۔أسند الحدیث کا مطلب ہے: آنحضور ﷺ تک بات سند کے ساتھ پہنچائی۔

ایک دوسرا لفظ ہے: مَسند (میم کے زبر کے ساتھ) اس کے معنی ہیں: بیٹھنے کی جگہ، ٹیک لگانے کی جگہ، بعض طلبہ ان دونوں میں فرق نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں: مَسند امام احمد بن حنبل، یہ غلط ہے، جیسے پیر کا خلیفہ مُجاز (میم کے پیش کے ساتھ) ہے یہ بھی اسم مفعول ہے أجازَ سے (اجازت دیا ہوا) اور ایک لفظ حقیقت کا مقابل مَجاز (میم کے زبر کے ساتھ) ہے، لوگ ان دونوں میں بھی فرق نہیں کرتے وہ کہتے ہیں: فلاں صاحب فلاں حضرت کے مَجاز (بفتح المیم) ہیں یہ بھی غلط ہے صحیح لفظ میم کے پیش کے ساتھ مُجاز ہے، اسی طرح طلبہ لفظ مُسند میں بھی غلطی کرتے ہیں، اس لئے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ کتب حدیث کے ناموں میں جو لفظ آتا ہے وہ مُسند (بضم المیم) ہے، یعنی وہ کتاب جس میں حدیثیں سند کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کے نام میں دوسرا لفظ المُسند استعمال کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ میری اس کتاب میں تمام حدیثیں سند کے ساتھ ہیں، سند کے بغیر کوئی حدیث نہیں۔

ملحوظہ (۱): بعض کتابوں میں حدیثیں سندوں کے بغیر بھی بیان کی گئی ہیں جیسے مشکوٰۃ شریف۔ آپ حضرات جانتے ہیں کہ مشکوٰۃ میں حدیثوں کی سند نہیں ہے صرف صحابی کا نام ہے، اور صحابی کا نام بھی صاحب مشکوٰۃ نے بڑھایا ہے، ورنہ مشکوٰۃ کی اصل مصابیح السنۃ میں امام بغوی رحمہ اللہ نے صحابی کا نام بھی نہیں لکھا، نہ حوالہ دیا ہے، یہ دونوں کام صاحب مشکوٰۃ نے کئے ہیں، یعنی شروع میں صحابی کا نام بڑھایا ہے اور آخر میں ان کتابوں کا حوالہ دیا ہے جہاں سے حدیث لی ہے، اور جب حوالہ دیدیا تو گویا سند بیان کردی، کسی کو سند دیکھنی ہو تو جس کتاب کا حوالہ ہے اس میں دیکھ لے۔

غرض: مشکوٰۃ شریف کی حدیثیں مجرّد ہیں، کیونکہ صاحب مشکوٰۃ نے یہ حدیثیں اپنی سند سے روایت نہیں کیں، بلکہ دوسری کتابوں سے نقل کی ہیں اور ان کی سندیں اصل کتابوں میں موجود ہیں، اصطلاح میں ایسی کتابوں کو مجرد اور ایسا کرنے کو تجرید کہا جاتا ہے۔

ملحوظہ (۲): بخاری شریف میں ایسی روایتیں بھی ہیں جو بلاسند ہیں وہ روایتیں معلقات کہلاتی ہیں۔ المُسند سے وہ روایتیں مراد نہیں، کیونکہ وہ بخاری شریف کی روایتیں نہیں ہیں۔ وہ روایتیں تو باب کے ضمن میں آئی ہیں، وہ مسئلہ کی دلیل کے طور پر یا تائید کے طور پر لائی گئی ہیں، اسی لئے امام بخاری رحمہ اللہ تعلیق میں معمولی ضعیف روایتیں بھی لاتے ہیں، بخاری شریف کی اصل حدیثیں وہ ہیں جو سند کے ساتھ مذکور ہیں، اور ایسی کسی روایت میں ہلکا سا ضعف بھی نہیں ہوتا، اسی لئے بخاری کی معلق روایتوں کا جب حوالہ دیتے ہیں تو رواہ البخاری نہیں کہتے بلکہ رواہ البخاری تعلیقا یا رواہ البخاری فی ترجمۃ الباب کہتے ہیں۔ خلاصۂ کلام: معلقات بخاری شریف کی روایتیں نہیں، بخاری شریف کی روایتیں صرف وہ ہیں جو باسند ہیں، اور المُسند سے وہی روایتیں مراد ہیں۔

الصحیح:

امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب کے نام میں تیسرا لفظ الصحیح استعمال کیا ہے، جس زمانہ میں حضرتؒ نے یہ کتاب لکھی ہے اس زمانہ میں حدیث کی دو ہی قسمیں تھیں، یا تین قسمیں تھیں: صحیح، ضعیف اور موضوع، موضوع کو حدیث کہنا ہی صحیح نہیں، موضوع حدیث نہیں ہوتی جیسے بعض حضرات مرزا غلام احمد قادیانی کے حالات میں مرزا کی تین بیویاں لکھتے ہیں، تیسری بیوی احمدی بیگم کو بتاتے ہیں، حالانکہ احمدی بیگم سے مرزا کا نکاح نہیں ہوا، احمدی بیگم کے تعلق سے تو مرزا کی بڑی فضیحت ہوئی ہے۔ مرزا نے پیشین گوئی کی تھی کہ میرا نکاح احمدی بیگم سے ہوگا، مگر مرتے دم تک نکاح نہیں ہوا۔ پس جو لوگ احمدی بیگم کو مرزا کی تیسری بیوی بتاتے ہیں وہ صحیح نہیں، اسی طرح موضوع کو حدیث کی تیسری قسم قرار دینا غلط ہے۔

بہر حال حدیث کی دو قسمیں ہیں: صحیح اور ضعیف، یعنی جس وقت بخاری شریف لکھی گئی اس وقت حدیث کی یہی دو قسمیں تھیں، اور آج جو حدیث کی بہت سی قسمیں ہیں وہ امام بخاریؒ کے بعد میں وجود میں آئی ہیں۔ چھٹی صدی میں امام نووی رحمہ اللہ نے تقریب لکھی پھر سیوطیؒ نے اس کی شرح تدریب لکھی، پھر نویں صدی میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے نخبۃ اور نزہۃ لکھیں اور رفتہ رفتہ حدیث کی اقسام بڑھتی گئیں۔

صحیح اور ضعیف سند کی صفتیں ہیں:

اور صحیح اور ضعیف سند کی صفتیں ہیں، متن کی صفتیں نہیں۔ یعنی صحیح اور ضعیف سند ہوتی ہے حدیث نہیں ہوتی، حدیث تو دو حال سے خالی نہیں یا تو جو بات نبی پاک ﷺ کی طرف منسوب کی گئی ہے وہ واقعی آپؐ کی بات ہے یا آپؐ کی بات نہیں ہے، اگر آپؐ کی بات ہے تو سر آنکھوں پر، ورنہ وہ مردود ہے، مگر اس کا پتہ چلانا ممکن نہیں، اس کا فیصلہ ظن غالب کے طور پر سند ہی کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے، اگر سند میں کوئی خرابی نہیں یعنی سند متصل ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں تو فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ آپؐ کا قول وفعل ہے، اور بصورتِ دیگر دوسرا فیصلہ کیا جائے گا۔ اور یہ دونوں فیصلے ظنی ہونگے۔ پس حدیث کو جو صحیح یا ضعیف کہا جاتا ہے وہ مجازی تعبیر ہے۔

اور صحت وضعف کا تعلق صرف ان سندوں سے ہے جو کتب حدیث کے مصنفین سے رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہیں، اور مصنفین کتب کے بعد جو سندیں ہم تک پہنچی ہیں وہ صرف برائے برکت ہیں، حدیث کی صحت وضعف پر اثر انداز نہیں، مثلاً امام بخاریؒ سے ہم تک جو سند پہنچی ہے اس میں بہت سے اساتذہ مجہول ہیں، ان کے حالات معلوم نہیں، اور جب وہ مجہول ہیں تو ساری بخاری شریف مجہول ہوجائے گی، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ مصنفین کتب کے بعد جو سندیں چلتی ہیں وہ صرف برکت کے لئے ہوتی ہیں۔ اعتبار مصنفین کتب تک کا ہے۔

بخاری شریف میں صرف صحیح، مسلم شریف میں صحیح اور حسن اور دیگر کتب میں ضعیف حدیثیں بھی ہیں:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں صرف صحیح مرفوع متصل روایتیں لی ہیں، حسن اور ضعیف روایتیں نہیں لیں۔ اور امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں حسن روایات بھی لی ہیں، کیونکہ حدیث حسن سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ البتہ ضعیف روایات نہیں لیں، امام مسلمؒ نے خود اپنی صحیح کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ میں اصول میں صحیح حدیثیں لاؤنگا اور متابعات میں حسن حدیثیں بھی لاؤنگا اور اگر کسی باب میں اصول میں صحیح احادیث نہ ہونگی تو پھر حسن حدیثیں لاؤنگا۔

غرض: امام مسلم کا معیار امام بخاریؒ سے فروتر ہے، اور ان دونوں بزرگوں کے علاوہ اور حضرات نے بھی صحیح کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں جیسے صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان اور صحیح ابن السکن وغیرہ، مگر ان کا معیار بخاری و مسلم کے معیار سے فروتر ہے، اور سنن اربعہ کے مصنفین نے تو ضعیف احادیث بھی لی ہیں، کیونکہ ضعیف اگر حسن لغیرہ بن جائے تو وہ بھی قابل استدلال ہو جاتی ہے۔

المختصر:

چوتھا لفظ المختصر استعمال کیا ہے، اس کو اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں پڑھ سکتے ہیں، لیکن عام طور پر اسم مفعول پڑھتے ہیں، جیسے مختصر المعانی، یعنی امام بخاریؒ فرما رہے ہیں کہ میری صحیح مطول نہیں ہے بلکہ مختصر ہے، یعنی صحیح سندوں سے مروی تمام حدیثیں صحیح بخاری میں نہیں ہیں، بلکہ تھوڑی سی ہیں، اور پہلے یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح چھ لاکھ احادیث سے انتخاب کر کے تصنیف فرمائی ہے۔ ان چھ لاکھ احادیث میں سے ہر صحیح حدیث بخاری شریف میں نہیں لی گئی، اس صورت میں بخاری شریف بہت طویل ہو جاتی، بلکہ یہ صحیح بالاختصار لکھی گئی ہے، کتاب کے شروع میں جو مقدمہ ہے اس کے دوسرے صفحہ پر امام بخاریؒ کا یہ قول ہے: **ما أدخلتُ فی کتاب الجامع إلا ما صَحَّ وترکتُ کثیراً من الصحاح لحال الطول**: میں نے اپنی کتاب میں صرف صحیح حدیثیں لی ہیں اور میں نے بہت سی صحیح حدیثیں چھوڑ دی ہیں کتاب کے طول کا خیال کر کے۔

اس جملہ کا خلاصہ یہ ہے کہ بخاری شریف کی ہر حدیث کی سند صحیح ہے، لیکن جتنی صحیح حدیثیں ہیں وہ سب بخاری میں نہیں ہیں، وہ حدیثیں بخاری کے علاوہ دوسری کتابوں میں ہیں، اور اس کی موٹی دلیل یہ ہے کہ مسلم شریف کی حدیثیں بھی صحیح ہیں اور بہت سی حدیثوں میں امام مسلمؒ متفرد ہیں، یعنی وہ حدیثیں صرف مسلم میں ہیں، بخاری میں نہیں ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ سب صحیح حدیثیں بخاری میں نہیں ہیں، بخاری کے علاوہ کتب حدیث میں بھی صحیح حدیثیں ہیں، پس غیر

مقلدین کا ہر مسئلہ میں بخاری کی حدیث کا مطالبہ صحیح نہیں۔

مِنْ أُمور رسولِ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وسُنَنِهِ وَأَيَّامِه :

کتاب کے نام کے شروع میں جو چار لفظ آئے ہیں: جامع، مُسند، صحیح اور مختصر ان کی ضروری تفصیل گذر چکی، اور بعد میں جو تین لفظ آئے ہیں: امور، سنن اور ایام ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

أمور:

أَمْرٌ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں: کام، معاملہ۔ یہ لفظ بہت عام ہے، آنحضور ﷺ کے اقوال، افعال، تقریرات اور اوصاف سب کو شامل ہے، اور رسول اللہ کی قید سے صحابہ اور تابعین کے اقوال وافعال نکل گئے۔ امام بخاریؒ فرما رہے ہیں: میری صحیح میں صرف احادیث مرفوعہ ہیں، موقوفہ اور مقطوعہ نہیں۔

جاننا چاہئے کہ امام بخاریؒ باب کے ضمن میں صحابہ اور تابعین کے اقوال بھی لاتے ہیں مگر جس طرح ضمناً آنے والی حدیثیں بخاری کی حدیثیں نہیں، اسی طرح ضمناً آنے والے صحابہ وتابعین کے اقوال بھی بخاری کی روایتیں نہیں، بخاری کی روایتیں صرف وہی ہیں جو حدثنا کے بعد آتی ہیں۔

اور بخاری میں احادیثِ موقوفہ ومقطوعہ کو جگہ نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ تدوینِ حدیث کے تیسرے دور میں جبکہ صحیح بخاری لکھی گئی ہے عام ذہن یہ بن گیا تھا کہ صرف مرفوع روایات حدیثیں ہیں، صحابہ اور تابعین کے اقوال وفتاوی حدیثیں نہیں، اس لئے ان کو حدیث کی کتابوں میں نہیں لینا چاہئے، اور یہ ذہن کیوں بنا تھا؟ اس کی تفصیل آگے تدوین حدیث کے عنوان کے تحت آئے گی!

سُننه:

سُنن: سنة کی جمع ہے۔ یہ تعمیم کے بعد تخصیص ہے، لفظ امور عام تھا اور لفظ سنن خاص ہے، یعنی امام بخاریؒ فرماتے ہیں: احادیث مرفوعہ میں سے جو سنت ہیں ان کو میں نے اپنی کتاب میں لیا ہے، اس تخصیص سے معلوم ہوا کہ حدیث اور سنت میں فرق ہے، دونوں ایک نہیں، اگر دونوں ایک ہوتے تو تخصیص کی ضرورت نہ تھی، یہ خاص سمجھنے کا مضمون ہے اس کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہئے۔

قرآن وحدیث اور فقہ میں سنت کے معنی:

سب سے پہلے یہ بات جاننی چاہئے کہ سنت کا لفظ قرآن کریم میں بھی آیا ہے: ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً﴾: آپ اللہ کی سنت کو بدلتا ہوا نہیں پائیں گے، اور حدیثوں میں بھی یہ لفظ آیا ہے: ترکتُ فیکم أمرین لن تضِلُّوا ما

تَمَسَّكْتُمْ بهما: كتابَ اللّٰهِ وسنةَ رسولِه (مشکوۃ حدیث ۱۸۶) میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں، جب تک تم ان دونوں کو مضبوط پکڑے رہوگے گمراہ نہیں ہوؤ گے: ایک: اللہ کی کتاب، دوسری: میری سنت، اور فقہ میں بھی لفظ سنت آتا ہے مگر تینوں جگہ معنی الگ الگ ہیں۔

قرآنِ کریم میں سنت کے کیا معنی ہیں؟ اس موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ کے مبحث اول میں مفصل کلام کیا ہے، تفصیل رحمۃ اللہ الواسعہ میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں جو صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں اور جن کی وجہ سے اسباب سے مسببات وجود میں آتے ہیں ان ودیعت کردہ صلاحیتوں سے مسببات کے وجود میں آنے کا نام اللہ کی سنت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے آگ میں جلانے کی صلاحیت وقابلیت ودیعت فرمائی، اور پانی میں بجھانے کی صلاحیت ودیعت فرمائی، چنانچہ آگ اپنا کام کرتی ہے، کوئی بھی چیز آگ میں ڈالیں گے تو وہ جل جائے گی[1] آگ پر پانی ڈالدو بجھ جائے گی یہ جو آگ اور پانی میں اللہ کی ودیعت فرمائی ہوئی صلاحیتیں ہیں جن سے مسببات وجود میں آتے ہیں، اسی کا نام اللہ کی سنت ہے، غرض قرآن کریم میں جہاں بھی لفظ سنت آیا ہے یہی معنی ہیں۔

اور قرآنِ کریم میں یہ لفظ قوموں کے عروج وزوال کے تعلق سے بھی آیا ہے، جن میں کفار کی شامتِ اعمال کا بیان ہوتا ہے، سورہ بنی اسرائیل (آیت ۷۷) اور سورۃ الفاطر (آیت ۴۲) میں یہی بات بیان کی گئی ہے یعنی ایمان واعمال صالحہ سے معاشرہ ترتا ہے، اور کفر وطغیانی اور انبیاء کی مخالفت سے ڈوبتا ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے، جو کبھی بدلتی نہیں۔

اور فقہ میں جو احکام ستہ ہیں: فرض، واجب، سنت، مستحب اور مباح۔ ان میں سنت کا تیسرا درجہ ہے، اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی۔ اس خاص درجے کے جو احکام ہیں وہ سنت کہلاتے ہیں، پھر سنت کی دو قسمیں ہیں: مؤکدہ اور غیر مؤکدہ۔

اور حدیثوں میں سنت کے معنی ہیں: **الطريقة المَسْلُوكة في الدين**: دینی راہ یعنی وہ راستہ جس پر مسلمانوں کو چلنا ہے۔

حدیث وسنت میں فرق:

حدیث وسنت نہ تو دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں یعنی دونوں میں تباین کی نسبت نہیں ہے اور نہ دونوں ایک ہیں، یعنی دونوں میں تساوی کی نسبت بھی نہیں ہے، بلکہ عام وخاص من وجہ کی نسبت ہے، اور جہاں یہ نسبت ہوتی ہے وہاں تین مادے ہوتے ہیں، دو افتراقی اور ایک اجتماعی، جیسے ابیض اور حیوان میں من وجہ کی نسبت ہے، اور مادۂ

(۱) سوال: اگر کوئی کہے کہ اللہ نے آگ میں جلانے کی صلاحیت رکھی ہے، پھر آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کیوں نہیں جلایا؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ خرق عادت ہے، اللہ تعالیٰ اسباب کی صلاحیت کے خلاف بھی کرتے ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ اسباب: اسباب ہیں، خدا نہیں، خدا ان سے اوپر ہے، اور اسباب کی لگام خدا کے ہاتھ میں ہے، جب تک وہ چاہیں گے اسباب کام کریں گے، اور جب وہ نہیں چاہیں گے اسباب کچھ نہیں کریں گے۔

افتراقی سفید کپڑا اور کالی بھینس ہیں، اول صرف ابیض ہے اور ثانی صرف حیوان، اور سفید بیل مادۂ اجتماعی ہے وہ ابیض بھی ہے اور حیوان بھی، حدیث اور سنت کے درمیان بھی یہی نسبت ہے۔ اس لئے کبھی حدیث الگ ہوجاتی ہے، وہ سنت نہیں ہوتی اور کبھی سنت الگ ہوجاتی ہے وہ حدیث نہیں ہوتی، اور کبھی دونوں جمع ہوجاتے ہیں وہ حدیث بھی ہوتی ہے اور سنت بھی۔

وہ روایتیں جو صرف حدیث ہیں سنت نہیں:

پہلا مادّۂ افتراقی: تین قسم کی روایتیں ہیں جو صرف حدیث ہیں سنت نہیں:

پہلی قسم: وہ حدیثیں جو منسوخ ہیں سنت نہیں، کیونکہ مسلمانوں کو ان پر نہیں چلنا، بعد میں جو ناسخ حدیثیں آئی ہیں مسلمانوں کو ان پر چلنا ہے، جیسے حدیث ہے. تَوَضَّئُوْا مِمَّا مَسَّتِ النارُ: آگ پر پکی ہوئی چیز کی مزاولت سے وضو کرو، یہ اعلی درجہ کی صحیح حدیث ہے، مگر بعد میں یہ حکم باقی نہیں رہا۔ بعد میں نبی ﷺ، خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھاتے پیتے تھے اور وضو کئے بغیر نماز پڑھتے تھے۔ اس لئے حدیث توضؤا مما مست النار: منسوخ ہے پس وہ سنت نہیں۔

قرآن کریم میں ایسی کوئی آیت نہیں جو اپنے تمام مواد میں منسوخ ہو:

اور قرآنِ کریم میں نسخ کی دو شکلیں ہوتی تھیں: ایک: اللہ تعالیٰ منسوخ آیت کو اٹھا لیتے تھے، دوسری: اللہ تعالیٰ منسوخ آیت بھلا دیتے تھے، حضور ﷺ اور صحابہ سب اس کو بھول جاتے تھے، ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى إِلَّا مَاشَاءَ اللّٰهُ﴾: ہم آپ کو قرآن پڑھائیں گے پس آپؐ اس کا کوئی حرف نہیں بھولیں گے مگر جسے اللہ چاہیں یعنی جس کو منسوخ کرنا ہوتا تھا اس کو بھلا دیتے تھے۔

آج جو قرآن کریم موجود ہے کیا اس میں ایسی کوئی آیت ہے جو اپنے تمام مواد میں منسوخ ہو؟ آپ حضرات الفوز الکبیر میں یہ بحث پڑھ کر آئے ہیں، متقدمین کہتے ہیں: قرآن میں پانچ سو آیتیں منسوخ ہیں، پھر ابن العربی اور سیوطی رحمہما اللہ نے کہا: بیس آیتیں منسوخ ہیں، پھر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ نے کہا: صرف پانچ آیتیں منسوخ ہیں، اور میں نے الفوز الکبیر کی عربی شرح العون الکبیر میں لکھا ہے کہ قرآن کریم میں ایسی کوئی آیت نہیں جو اپنے تمام مواد میں منسوخ ہو، اور شاہ صاحبؒ نے جن پانچ آیتوں کو منسوخ مانا ہے، العون الکبیر میں ان کا مطلب بیان کیا ہے اور میری یہ نئی رائے نہیں، اور حضرات نے بھی یہ بات لکھی ہے۔

غرض: قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں جو اپنے تمام مواد میں منسوخ ہو، ہاں ایسی آیتیں ہیں جو بعض احوال میں معمول بہا ہیں اور بعض میں نہیں، جیسے مؤلفۃ القلوب والی آیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو موقوف کیا ہے، منسوخ

نہیں کیا، اگر کبھی حالات خراب ہوجائیں اور دوراول جیسے حالات پیدا ہوجائیں تو زمانے کا امیر المؤمنین مؤلفۃ القلوب کا حصہ جاری کرسکتا ہے، مفتی جاری نہیں کرسکتا۔ مجتہد جاری نہیں کرسکتا، جب زمانے کے امیر المؤمنین نے موقوف کیا ہے تو زمانے کا امیر المؤمنین ہی اس کو جاری کرسکتا ہے۔

ایسی اور بھی آیتیں ہیں، جیسے قرآن میں ہے: جب موت کا وقت قریب آئے تو والدین کے لئے اور رشتہ داروں کے لئے شریعت کے مطابق وصیت کرو، اب یہ حکم باقی نہیں، کیونکہ میراث کے احکام اللہ تعالیٰ نے نازل فرمادیئے، مگر اب بھی ایسی صورت پیش آسکتی ہے کہ وصیت ضروری ہو، جیسے کسی کو ڈر ہو کہ اس کے بعد لڑکے سب ترکے پر قبضہ کرلیں گے، ماں باپ کو کچھ نہیں دیں گے، یا بعض بیٹے قبضہ کرلیں گے اور بعض کو کچھ نہیں دیں گے تو ایسی صورت میں شریعت کے احکام کے مطابق وصیت نامہ لکھ کر کورٹ سے رجسٹر کرالینا چاہئے، ایسی صورت میں اس آیت پر عمل ہوگا۔

حدیث کی کتابوں میں منسوخ حدیثیں بھی ہیں:

بہرحال قرآنِ کریم میں تو ایسی کوئی آیت نہیں جو اپنے تمام مواد میں منسوخ ہو، لیکن حدیثوں میں منسوخ حدیثیں بھی ہیں۔ دوراول کے جو احکام تھے وہ بھی حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں اور بعد میں جو احکام آئے وہ بھی کتابوں میں ہیں، پس پہلی قسم کی روایتیں صرف حدیث ہیں سنت نہیں، اور دوسری قسم کی روایتیں حدیث بھی ہیں اور سنت بھی۔

منسوخ حدیث کا پتہ کیسے چل سکتا ہے؟

اور حدیثوں میں نسخ کا پتہ کبھی تو قرینہ سے چلتا ہے اور کبھی خود صحابہ صراحت کرتے ہیں کہ یہ حکم پہلے تھا، بعد میں یہ حکم نہیں رہا، جیسے ابوداؤد اور ترمذی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: **كان آخِرَ الأمرين من رسول الله صلى الله عليه وسلم تركُ الوضوء مما مست النار**: آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد وضو نہ کرنا آنحضور ﷺ کا آخری عمل ہے، اس حدیث میں حضرت جابرؓ نے صراحت کی ہے کہ وہ حدیثیں جن میں آگ پر پکی ہوئی چیزوں کی مزاولت سے وضو کا حکم ہے وہ دورِاول کی ہیں اور منسوخ ہیں۔

اور کبھی قرینہ سے اس کا پتہ چلتا ہے، جیسے آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے: **كنتُ نَهَيْتُكم عن زيارة القُبور فَزُوْرُوْها** (مشکوۃ حدیث ۱۷۶۲) میں نے تمہیں قبرستان جانے سے روکا تھا، اب قبرستان جایا کرو، اس حدیث میں قرینہ ہے کہ قبرستان جانے کی ممانعت دوراول میں تھی، بعد میں اجازت ہوگئی۔ پس جواز کی روایات سنت ہیں اور ممانعت کی روایتیں صرف حدیث ہیں۔

اور کبھی نہ کوئی قرینہ موجود ہوتا ہے، نہ صحابہ کی صراحت سے تقدیم وتاخیر کا پتہ چلتا ہے، ایسی صورت میں مجتہدین غور کرتے ہیں اور تقدیم وتاخیر کا فیصلہ کرتے ہیں، پھر کبھی تو مجتہدین متفق ہوجاتے ہیں اور کبھی ان میں اختلاف ہوجاتا

ہے، جیسے دوحدیثیں ہیں: الماء من الماء: اور إذا التقی الختانان فقد وجب الغسل: پہلی حدیث کا مدعی یہ ہے کہ اگر میاں بیوی صحبت کریں اور انزال ہو جائے تو غسل واجب ہوگا اور اگر انزال سے پہلے مجامعت ختم کردیں تو غسل واجب نہیں ہوگا، اور دوسری حدیث کا مدعی یہ ہے کہ جب صحبت شروع کردی اور مرد کی شرم گاہ عورت کی شرم گاہ میں چلی گئی تو دونوں پر غسل واجب ہو گیا، انزال ہو یا نہ ہو۔

ان دونوں حدیثوں میں سے کونسی حدیث مقدم ہے اور کونسی مؤخر؟ اس کی کوئی صراحت نہیں، نہ کوئی قرینہ ہے، اس لئے دور اول میں صحابہ میں اس مسئلہ میں اختلاف رہا، بعض صحابہ اکسال کی صورت میں عدم غسل کا فتوی دیتے تھے اور بعض وجوب غسل کا، اور یہ اختلاف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک باقی رہا، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس مسئلہ میں صحابہ نے غور کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ یہ مسئلہ ازواج مطہرات سے پوچھا جائے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو اپنی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا مگر انھوں نے لاعلمی ظاہر کی، اور کہا: میرے ساتھ ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آدمی بھیجا تو انھوں نے کہا: میرے اور نبی ﷺ کے درمیان ایسی صورت پیش آئی ہے اور ہم نے غسل کیا ہے، جب صحابہ کو نبی ﷺ کا عمل معلوم ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا: آج کے بعد اگر کوئی شخص ایسا کرے گا اور غسل نہیں کرے گا تو میں اس کو سخت سزا دوں گا (تفصیل طحاوی میں ہے) اس دن سے تمام صحابہ کا اجماع ہو گیا کہ اکسال کی صورت میں غسل واجب ہے، اب اس مسئلہ میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہا۔

اور کبھی تقدیم وتاخیر کی تعیین میں مجتہدین کے درمیان اختلاف ہو جاتا ہے، جیسے رفع یدین اور ترک رفع کی روایات۔ یعنی رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین مسنون ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں اعلی درجہ کی صحیح روایتیں موجود ہیں کہ نبی پاک ﷺ ان دونوں موقعوں پر رفع یدین کرتے تھے، اور پانچ روایتیں ایسی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ پوری نماز میں کہیں بھی رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ غرض: رفع کی روایتیں زیادہ ہیں اور ترک رفع کی پانچ ہیں —— اور جاننا چاہئے کہ نماز کے شروع میں تکبیر تحریمہ کے ساتھ جو رفع ہے وہ نماز سے باہر ہے، اس لئے وہ زیر بحث نہیں۔

بہر حال اس مسئلہ میں صحابہ کے زمانہ سے اختلاف چلا آرہا تھا، وہی اختلاف جب ائمہ مجتہدین کے دور تک پہنچا تو امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ رفع کی روایتیں دورِ اول کی ہیں اور ترک رفع کی بعد کی، اور قرینہ یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد چاروں خلفاء نے جو آپؐ کے مصلے پر کھڑے ہوئے رفع یدین نہیں کیا، جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سترہ نمازیں آپؐ کی حیات میں پڑھائی ہیں، پس کیا یہ ممکن ہے کہ آنحضور ﷺ کا آخری عمل حضرت ابوبکرؓ آپؐ کے مصلے پر کھڑے ہوتے ہی موقوف کردیں؟ یہ بات ممکن نہیں۔

پس چاروں خلفاء کا رفع یدین نہ کرنا دلیل ہے کہ رفع کی روایتیں دورِ اول کی ہیں اور ترک رفع کی روایتیں بعد کی،

اس لئے رفع کی روایتیں منسوخ ہیں اور ترک رفع کی روایتیں ناسخ، اور ناسخ روایتیں ہی سنت اور معمول بہا ہوتی ہیں۔

اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کا رجحان اس کے برعکس ہے، یعنی ان کے نزدیک ترک رفع کی روایتیں مقدم اور منسوخ ہیں اور رفع کی روایتیں مؤخر ہیں اس لئے وہی روایتیں سنت اور معمول بہا ہیں۔

وہ کہتے ہیں: رفع تعظیم فعلی اور نماز کا زیور ہے، بیٹی کے لئے زیور بنا کر رکھ دیتے ہیں جب شادی کا وقت آتا ہے تو زیور اس کو پہناتے ہیں، اسی طرح رفع یدین جو تعظیم فعلی اور نماز کا زیور ہے آخر میں نماز کو پہنایا گیا ہے، یعنی رفع آنحضور ﷺ نے آخر میں شروع کیا ہے۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ صغار صحابہ نے اپنے زمانہ میں رفع یدین کیا ہے اگر رفع والی روایتیں منسوخ ہوتیں تو صحابہ اس پر کیسے عمل کرتے؟ منسوخ روایات پر عمل جائز نہیں۔

بہر حال دونوں فریقوں کے پاس قرائن ہیں اس لئے ناسخ و منسوخ متعین کرنے میں اختلاف ہو گیا، لیکن اتنی بات طے ہوگئی کہ بڑے دو اماموں کے نزدیک ترکِ رفع کی روایتیں سنت ہیں، اور رفع کی روایتیں صرف حدیث ہیں اور چھوٹے دو اماموں کے نزدیک رفع کی روایتیں سنت ہیں اور ترک رفع کی روایتیں صرف حدیث ہیں۔

دوسری قسم: وہ حدیثیں جو نبی ﷺ کے ساتھ خاص ہیں وہ اگرچہ حدیثیں ہیں مگر سنت نہیں، جیسے نبی ﷺ کے لئے نکاح کے باب میں چار کی قید نہیں تھی، آپؐ کے نکاح میں نو بیویاں جمع ہوئی ہیں، جب حضور ﷺ کا یہ فعل ہے تو حدیث ہوئی مگر سنت نہیں، امت کو جس راستہ پر چلنا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی چار ہی بیویاں ایک ساتھ جمع کرسکتا ہے، اور حضور کا فعل حضور کے ساتھ خاص ہے۔

سورۂ احزاب (آیت ۵۰) میں ہے: ﴿خَالِصَةً لَكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ یہ حکم آپؐ کے لئے خاص ہے، مؤمنین کے لئے نہیں ہے ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْ أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ﴾ امت کے لئے ان کی بیویوں اور باندیوں کے سلسلہ میں جو احکام ہیں وہ ہم جانتے ہیں، کیونکہ وہ ہم نے مقرر کئے ہیں، چنانچہ سورۂ نساء کے شروع میں ہے: ﴿فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾: پس نکاح کرو تم ان عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں دو دو، تین تین اور چار چار سے۔ امت کے لئے یہی حکم ہے۔ وہ ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ چار سے نکاح کرسکتے ہیں اور آنحضور ﷺ کے نکاح میں جو چار سے زیادہ ازواج جمع ہوئی ہیں وہ آپؐ کی خصوصیت ہے۔

مگر اہل حدیث (غیر مقلد) اس حدیث پر بھی عمل کرتے ہیں، ان کے نزدیک امت کے لئے بھی نکاح کے باب میں کوئی تحدید نہیں، نواب صدیق حسن خان صاحب بھوپالی کے صاحبزادے نواب نور الحسن خان صاحب نے عرف الجادی میں یہ مسئلہ صراحتاً لکھا ہے، حالانکہ یہ فعل نبوی سنت نہیں، امت کا اجماع ہے کہ امت کے لئے چار سے زیادہ بیویاں جمع کرنا جائز نہیں۔

صوم وصال کا حکم:

صوم وصال: دو یا زیادہ دنوں کے روزے مسلسل رکھنا، بیچ میں افطار نہ کرنا، نبی پاک ﷺ اس طرح کا روزہ رکھتے تھے، لیکن آپؐ نے امت کو اس روزے سے منع فرمایا (بخاری حدیث ۱۹۶۱) بعد میں اختلاف ہوا کہ صوم وصال کا جواز آنحضور ﷺ کے ساتھ خاص تھا یا امت کے لئے بھی یہ روزہ جائز ہے؟ حضرت عمر اور حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم کے نزدیک صوم وصال کا جواز آنحضور ﷺ کے ساتھ خاص نہیں تھا، امت کے لئے بھی جائز ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: نبی پاک ﷺ نے امت کو صوم وصال سے شفقت کی بنا پر منع فرمایا ہے (بخاری حدیث ۱۹۶۴) پس صوم وصال فی نفسہ جائز ہے۔ حضرت عائشہ، حضرت عمر اور حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم صوم وصال رکھتے تھے۔ مگر اکثر صحابہ کی رائے یہ تھی کہ یہ روزہ حضور ﷺ کے ساتھ خاص تھا۔

غرض حدیثوں میں بعض احکام وہ ہیں جو آنحضور ﷺ کے ساتھ خاص ہیں، ایسے احکام حدیث ہیں سنت نہیں۔

تیسری قسم: نبی ﷺ نے کسی مصلحت سے کوئی بات فرمائی یا کوئی عمل کیا یا کسی مسئلہ کی وضاحت کے لئے کوئی عمل کیا تو وہ حدیث ہے مگر سنت نہیں، جیسے ایک مرتبہ نبی ﷺ نے ایک قوم کی کوڑی پر کھڑے ہوکر پیشاب فرمایا (بخاری حدیث ۲۲۴) یہ حدیث ہے مگر سنت نہیں، یعنی یہ دینی طریقہ نہیں، کیونکہ آپؐ ہمیشہ بیٹھ کر ہی پیشاب فرماتے تھے، پس وہی سنت ہے۔

پھر ایک مرتبہ حضور ﷺ نے کھڑے ہوکر پیشاب کیوں کیا؟ جواب: مسئلہ کی وضاحت کے لئے، کبھی انسان کو ایسی مجبوری پیش آتی ہے کہ بیٹھ نہیں سکتا، مثلاً کوڑی ہے، گندگی کی جگہ ہے ایسی مجبوری میں کھڑے ہوکر پیشاب کرنا جائز ہے، یا کسی بیماری کی وجہ سے بیٹھ نہیں سکتا تب بھی یہی حکم ہے۔

پھر سنت کیا ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: **مَن حدَّثكم أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كان يبولُ قائمًا فلا تُصَدِّقُوه ما كان يبول إلا قاعِدًا**: اگر تم سے کوئی بیان کرے کہ آپؐ کی عادت کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کی تھی تو ہرگز نہ ماننا، آپؐ ہمیشہ بیٹھ کر ہی پیشاب فرمایا کرتے تھے (ترمذی حدیث ۱۱)

لطیفہ: نیویارک کی ایک مسجد میں ایک غیر مقلد حدیث کی تعلیم کر رہا تھا اس نے بخاری شریف کھول کر یہی حدیث بیان کی اور کہا: کھڑے ہوکر پیشاب کرنا سنت ہے، اس حدیث سے یہ بات صراحتاً ثابت ہوتی ہے، مجمع میں سے ایک شخص نے سوال کیا: یہ سنت صرف مردوں کے لئے ہے یا عورتوں کے لئے بھی؟ بس سٹی گم ہوگئی۔

دوسری مثال: بخاری شریف (کتاب التہجد باب ۳۵ حدیث ۱۱۸۳) میں حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: **صلّوا قبل صلوة المغرب**: مغرب سے پہلے نفلیں پڑھو، یہ بات دو مرتبہ فرمائی، پھر تیسری مرتبہ **لِمَنْ شاء** بڑھایا۔ یعنی مغرب سے پہلے کوئی نفلیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے، راوی عبداللہ مزنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: آپؐ نے **لِمَنْ شاءَ** اس لئے

بڑھایا کہ لوگ اس کو سنت نہ سمجھ لیں، کراھیۃَ أن یَتَّخِذَھا الناسُ سنۃً: اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ لوگ اس کو سنت بنالیں، اس سے معلوم ہوا کہ حدیث اور سنت میں فرق ہے اور ارشاد پاک: صلُّوا قبل صلوۃ المغرب مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھا، عصر کے فرضوں کے بعد جو نفلوں کی ممانعت ہے وہ غروب شمس تک ممتد ہے، سورج چھپتے ہی کراہیت ختم ہوجاتی ہے، اب کوئی نفلیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے، مگر اس وقت میں نفلیں پڑھنا سنت نہیں، نہ نبی ﷺ نے مغرب سے پہلے کبھی نفلیں پڑھی ہیں اور نہ چاروں خلفاء نے، کیونکہ مغرب میں تعجیل (جلدی کرنا) مطلوب ہے، سنتیں پڑھنے سے تاخیر ہوجائے گی،

تیسری مثال: ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی ﷺ کے ساتھ لیٹی ہوئی تھیں کہ حیض شروع ہوگیا، وہ اٹھ کر خاص کپڑے باندھنے لگیں، تو آپؐ نے فرمایا: لنگی باندھ کر میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔ یہ زندگی میں ایک مرتبہ کا واقعہ تھا اور مسئلہ کا بیان تھا سنت نہیں تھا۔ جب حضرت عائشہؓ یہ واقعہ بیان کرتیں تو ساتھ ہی کہتیں: و أیُّکم یَملِكُ أَرَبَہ: تم میں سے کون ہے جو اپنی خواہش پر کنٹرول رکھ سکتا ہے! یعنی اس کو سنت سمجھ کر حالت حیض میں بیوی کو ساتھ مت لٹاؤ، ورنہ گناہ میں مبتلا ہوجاؤ گے۔

سوال: وہ کونسا مسئلہ ہے، جس کی اس فعل نے وضاحت کی ہے؟

جواب: اس حدیث نے سورۃ البقرۃ (آیت ۲۲۲) کی تفسیر کی ہے، ارشاد پاک ہے: ﴿وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ؟ قُلْ: ھُوَ أَذًی، فَاعْتَزِلُوْا النِّسَاءَ فِیْ الْمَحِیْضِ، وَلاَ تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰی یَطْھُرْنَ﴾: لوگ آپؐ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں؟ آپؐ کہیں: وہ تکلیف دہ حالت ہے، پس تم حیض کے زمانے میں عورتوں سے علاحدہ رہا کرو، اور ان کے نزدیک مت جایا کرو، جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں۔

اور نزول آیت کے وقت یہود ومجوس حالت حیض میں عورت کے ساتھ کھانے پینے اور ایک گھر میں رہنے کو بھی جائز نہیں سمجھتے تھے، اور نصاری ومشرکین مجامعت سے بھی پرہیز نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اس کی وضاحت ضروری تھی کہ کہاں تک نزدیک جاسکتے ہیں، اور کہاں پہنچ کر رک جانا ضروری ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے مختلف افعال سے اس کی وضاحت فرمائی۔ آپؐ حائضہ بیوی کے ساتھ کھاتے تھے، بلکہ اس کی کھائی ہوئی ہڈی لے کر نوش فرماتے تھے، اس کی گود میں سر رکھ کر سوتے تھے، بلکہ قرآن بھی پڑھتے تھے۔ اسی سلسلہ کی یہ روایت بھی ہے کہ آپؐ نے حائضہ بیوی کو لنگی کے ساتھ اپنے ساتھ لٹایا ہے، اس سے آگے آپؐ کا کوئی عمل نہیں، چنانچہ امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس جگہ رک جانا ضروری ہے۔ ناف اور گھٹنے کے درمیان کے جسم کو بغیر حائل کے ہاتھ لگانا جائز نہیں۔ باقی جسم کو ہاتھ لگا سکتے ہیں۔

غرض: یہ تین قسم کی روایتیں حدیثیں تو ہیں مگر سنت نہیں، اول: جو حدیثیں منسوخ ہیں، دوم: جو حدیثیں نبی پاک ﷺ کے ساتھ خاص ہیں یا جن میں آپؐ کے ذاتی احوال کا بیان ہے۔ سوم: وہ کام جو نبی ﷺ نے کسی مصلحت

سے کیا ہے۔

خلفائے راشدین نے جو کام ملک وملت کی تنظیم کے لئے کئے ہیں وہ سنت ہیں حدیث نہیں:

دوسرا مادۂ افتراق: کچھ چیزیں سنت ہیں مگر حدیث نہیں، وہ خلفائے راشدین کی سنتیں ہیں، وہ من أمور الخلفاء الراشدین ہیں، من أمور رسول الله صلی الله علیه وسلم نہیں ہیں۔

جاننا چاہئے کہ حکومتیں دوطرح کی ہیں: قومی حکومت (نیشنل گورنمنٹ) اور بین الاقوامی حکومت (انٹرنیشنل گورنمنٹ) آنحضور ﷺ کے زمانہ تک اسلامی حکومت صرف جزیرۃ العرب میں قائم ہوئی تھی یعنی قومی حکومت تھی اس لئے آنحضور ﷺ نے صرف قومی حکومت کے احکام بیان فرمائے، بین الاقوامی حکومت کے احکام بیان نہیں فرمائے۔ اس لئے کہ اگر بین الاقوامی حکومت کے احکام بیان کئے جاتے تو وہ قبل از وقت ہوتے اور ان کو سمجھنے میں بھی دشواری ہوتی اور یاد رکھنے میں بھی، یہ تو صرف قرآن کریم کا معجزہ ہے کہ ایک حرف سمجھے بغیر عجمی بچہ پورا قرآن حفظ کر لیتا ہے۔ اور اس طرح پڑھتا ہے جیسے سمجھ کر پڑھ رہا ہو، کوئی دوسری کتاب سمجھے بغیر حفظ کر کے کوئی دکھائے تو ہم جانیں!

غرض: قبل از وقت احکام بیان کئے جائیں گے تو ان کا سمجھنا بھی مشکل ہوگا اور یاد رکھنا بھی، جیسے آج کل کلونک کا مسئلہ چل رہا ہے، یہ انگریزی لفظ ہے، اس کے معنی ہیں: قلم کاری، یعنی ایک آدمی سے چند آدمی بنانا، اگر آنحضور ﷺ چودہ سو سال پہلے یہ مسئلہ بیان کرتے تو کون سمجھتا؟ اسی طرح اگر حضور ﷺ بین الاقوامی حکومت کے احکام بیان کرتے تو صحابہ کیسے سمجھتے؟ اور نہ سمجھتے تو یاد کیسے کرتے؟ اور امت تک کیسے پہنچاتے؟ مسئلہ وقت پر ہی سمجھ میں آتا ہے، اور وقت پر ہی بیان کیا جاتا ہے، اس لئے آنحضور ﷺ نے بین الاقوامی حکومت کے احکام بیان نہیں کئے، بین الاقوامی حکومت قائم ہوئی ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کل دو سال رہی ہے، اور وہ دو سال بھی بڑے ہنگاموں میں گذرے ہیں، اندرونی مسائل اتنے پیچیدہ تھے کہ ان سے نمٹنا مشکل تھا۔ پھر جب جزیرۃ العرب کے مسائل نمٹ گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جزیرۃ العرب سے متصل جو دو سپر پاور تھے: ایران اور روم، ان کے ساتھ جنگیں شروع ہوئیں، اور اللہ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی، ایران تو بالکل ختم ہوگیا اور روم پیچھے ہٹ گیا، اور بین الاقوامی حکومت قائم ہوئی، ملت بھی بہت بڑھ گئی، بے شمار لوگ اسلام میں داخل ہوئے، اس طرح جب بین الاقوامی حکومت قائم ہوئی تو اس کے احکام بیان کرنے ضروری ہوئے۔ وہ خلفاء راشدین نے بیان کئے اور وہ ان کی سنتیں قرار پائیں۔ اور جب ملت بڑھ گئی تو ملت کی تنظیم بھی ضروری ہوئی، وہ خلفاء راشدین نے کی اور وہ ان کی سنتیں ٹھہریں۔

غرض ملک وملت کو منظم کرنے کے لئے چاروں خلفائے راشدین نے جو طریقے رائج کئے ہیں وہ خلفاء راشدین کی

سنتیں ہیں، حدیثیں نہیں ہیں۔ یہ دوسرا مادۂ افتراقی ہوا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سنت:

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو کچھ قبائل نے دار الحکومت (سنٹرل گورنمنٹ) کو زکوتیں دینے سے انکار کر دیا، ان کو مانعین زکوٰۃ کہتے ہیں۔ مانعین زکوٰۃ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ زکوٰۃ کے وجوب کا انکار کرتے تھے، بلکہ مانعین زکوٰۃ کہتے تھے کہ ہم اپنی زکوٰۃ خود اپنے غریبوں میں تقسیم کریں گے، مدینہ (دار الحکومت) کو نہیں بھیجیں گے، یہ حضور ﷺ کی خصوصیت تھی، ان کی دلیل یہ تھی کہ سورۃ التوبہ (آیت ۱۰۳) میں ارشاد پاک ہے: ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ، إِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾: آپؐ ان کے مالوں میں سے صدقہ (زکات) لیجئے، جس کے ذریعہ آپ ان کو پاک صاف کریں، اور ان کے لئے دعا کیجئے بیشک آپؐ کی دعاؤں سے ان کو تسلی ہوتی ہے، اب جبکہ آنحضور ﷺ دنیا سے پردہ فرما گئے تو کون دعائیں دے گا؟ اور کس کی دعا تسکین کا باعث ہوگی؟ لہٰذا اب ہم سنٹرل گورنمنٹ کو زکوتیں نہیں بھیجیں گے، ہم اپنے قبیلے کی زکوتیں وصول کر کے خود تقسیم کریں گے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا: میں ان کے ساتھ جنگ کروں گا، حضرت عمرؓ نے فرمایا: یہ لوگ مسلمان ہیں، ان کے ساتھ جنگ کیسے جائز ہے؟ حدیث میں ہے: أُمِرتُ أن أُقاتِل الناس حتی یقولوا: لا إله إلا الله: مجھے حکم ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑوں جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں یعنی اسلام قبول کرنے پر جنگ بند کر دینا ضروری ہے۔ مگر صدیق اکبرؓ برابر یہی فرماتے رہے کہ میں ان سے جنگ کروں گا، اگر وہ نبی ﷺ کے زمانہ میں زکات میں رسی دیتے تھے اور وہ نہیں دیں گے تو بھی میں ان سے جنگ کروں گا اور ان کو مجبور کروں گا کہ وہ زکوٰۃ مرکزی حکومت کو بھیجیں (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۹۰) مگر پھر جنگ کی نوبت نہیں آئی، وہ لوگ قائل ہو گئے اور انھوں نے سنٹرل گورنمنٹ کو زکوٰۃ بھیجنی شروع کر دی۔

اب مسئلہ طے ہو گیا کہ جو چیزیں شعائر اسلام میں سے ہیں اگر چہ وہ سنت ہوں اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت بالاتفاق ان شعائر کو ترک کر دے تو ان کے ساتھ جنگ کی جائے گی اور ان کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ شعائر اسلام کو قائم کریں، مثلاً کسی علاقہ کے لوگ بالاتفاق طے کر لیں کہ وہ اذان نہیں دیں گے تو اگر چہ اذان دینا سنت ہے، فرض یا واجب نہیں، مگر چونکہ اذان شعائر اسلام میں سے ہے اس لئے ان کے ساتھ جنگ کی جائے گی اور ان کو اذان دینے پر مجبور کیا جائے گا، یا کسی علاقہ کے مسلمان طے کر لیں کہ وہ اپنے بچوں کی ختنہ نہیں کرائیں گے تو اگر چہ ختنہ کرانا اصح قول کے مطابق سنت ہے مگر شعائر اسلام میں سے ہے۔ اس وجہ سے ان کو ختنہ کرانے پر مجبور کیا جائے گا یہ سب مسائل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سنت سے طے ہوئے۔

دوسری سنت: آنحضور ﷺ نے اپنے بعد کوئی خلیفہ نامزد نہیں کیا، حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے اشارے فرمائے مگر صراحت نہیں کی، چنانچہ آپؐ کے بعد بالاتفاق حضرت ابوبکرؓ خلیفہ چنے گئے، لیکن صدیق اکبرؓ نے اپنے بعد خلیفہ نامزد کیا،

ایک پرچہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لکھا اور بند کر کے لوگوں کے پاس بھیجا اور اس پر بیعت لی، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہوگئے، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بعد خلیفہ نامزد کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ بھی آپؓ کی سنت ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنتیں تو بے شمار ہیں، جن کے ذریعہ آپؓ نے ملک وملت کی تنظیم کی ہے، جیسے باجماعت تراویح کا نظام بنایا، آنحضور ﷺ کے زمانہ میں باجماعت تراویح کا نظام نہیں تھا، لوگ اپنے طور پر تراویح پڑھتے تھے، حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں بھی اسی طرح چلتا رہا، پھر جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو انھوں نے باقاعدہ جماعت کے ساتھ تراویح کا نظام بنایا اور ملت کو منظم کیا۔ اسی طرح ایک مجلس کی اور ایک لفظ کی تین طلاقوں کو تین قرار دیا اور چور دروازہ بند کردیا یہ بھی ملت کی تنظیم کی ہے، علاوہ ازیں: عراق جولڑ کر فتح کیا گیا تھا اس کی زمینیں مجاہدین میں تقسیم نہیں کیں اور ذمیوں پر جزیہ کی شرح مقرر کی یہ سب ملک کی تنظیم ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سنت:

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے دو زبردست کام کئے ہیں: ایک: جمعہ کی پہلی اذان بڑھائی، دوسرا: قرآن کو سرکاری ریکارڈ سے نکال کر لوگوں کو سونپ دیا اور امت کو لغتِ قریش پر جمع کردیا۔ یہ حضرت عثمانؓ کے دو بڑے کام ہیں جن کے ذریعہ انھوں نے ملت کی تنظیم کی۔

آنحضور ﷺ کے زمانے میں جمعہ کی دو ہی اذانیں تھیں، پہلی اذان اس وقت ہوتی تھی جب امام منبر پر آکر بیٹھتا تھا، یہ اذان مسجد کے دروازے کی چھت پر ہوتی تھی، پھر خطبہ کے بعد نماز سے پہلے اقامت ہوتی تھی یہ دوسری اذان تھی، حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مدینہ کی آبادی دور تک پھیل گئی لوگ اذان کے بعد بھی خطبہ کے دوران آتے رہتے تھے، اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک اذان بڑھائی تاکہ سب لوگ خطبہ شروع ہونے سے پہلے مسجد میں پہنچ جائیں، چنانچہ پہلی اذان کے دس منٹ کے بعد حضرت عثمانؓ منبر پر تشریف لاتے تھے، پھر دوسری اذان امام کے سامنے دی جاتی تھی، پھر نماز سے پہلے اذان یعنی اقامت ہوتی تھی، اس طرح جمعہ کی پہلی اذان کے ذریعہ حضرت عثمانؓ نے امت کو منظم کیا یہ آپؓ کی سنت ہے، حدیث نہیں۔

دوسرے کام کی تفصیل: نبی ﷺ کی وفات کے بعد فوراً مسیلمہ کذاب کے ساتھ جنگ یمامہ پیش آئی جس میں کافی حفاظ شہید ہوئے، حضرت عمرؓ نے صورتِ حال سے گھبرا کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ قرآنِ کریم کو سرکاری ریکارڈ میں لے لیا جائے تاکہ اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ رہے، حضرت عمرؓ نے اس پر بہت اصرار کیا، بنانچہ صدیق اکبرؓ نے قرآن کو سرکاری ریکارڈ میں لے لیا، پھر حضرت عثمانؓ کے زمانہ کے آخر میں یہ بات سامنے آئی کہ

لوگوں نے مختلف طرح سے قرآن لکھ رکھے ہیں۔ کسی نے نزول کی ترتیب سے، کسی نے لوح محفوظ کی ترتیب سے، اس سے اختلاف رونما ہونا ناگزیر تھا، چنانچہ جب حضرت حذیفۃ بن الیمانؓ جنگ ارمینیہ اور آزربائیجان سے لوٹے تو انھوں نے حضرت عثمانؓ کو اختلافات کی اطلاع دی، اور عرض کیا کہ اس سے پہلے کہ امت قرآن میں مختلف ہوجائے آپ اس کی خبر لیں، چنانچہ آپؓ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بلایا اور تین چار آدمیوں کی کمیٹی بنائی اور ان کو دوبارہ قرآن جمع کرنے کا حکم دیا۔

کمیٹی نے پانچ مصاحف تیار کیے، ایک مصحف حضرت عثمانؓ نے اپنے پاس مدینہ میں رکھا اور باقی مصاحف مختلف شہروں میں بھیج دیئے، اور حکم دیا کہ اب مسلمان اس قرآن سے نقلیں لیں اور یہ بھی حکم دیا کہ لوگوں نے جو مختلف قرآن لکھ رکھے ہیں وہ پایۂ تخت کو بھیج دیں، اس طرح حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو موجودہ قرآن پر جمع کردیا۔

غرض حضرت عثمانؓ نے اس ایک کام کے ذریعہ دو کام کئے: ایک: لوگوں کو موجودہ قرآن پر جمع کردیا، اس لئے آپؓ **جامع الناس علی هذا القرآن** ہیں مگر تخفیفاً آپؓ کو **جامع القرآن** کہا جاتا ہے۔

دوم: قرآن جو صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں سرکاری ریکارڈ میں لیا گیا تھا اس کو ریکارڈ سے نکال کر مسلمانوں کو سونپ دیا (جمع قرآن کی تاریخ کے لئے تحفۃ الالمعی ۱:۶۱-۶۶ دیکھیں)

چنانچہ آج بھی قرآن کریم دنیا کی کسی اسلامی حکومت کے ریکارڈ میں نہیں، سعودی حکومت قرآن کریم چھاپتی ہے، تفسیر چھاپتی ہے یہ اس کے لئے سعادت کی بات ہے، مگر سعودیہ سمیت کوئی اسلامی حکومت قرآن کریم کی محافظ نہیں۔ قرآن کریم کو حضرت عثمانؓ نے سرکاری ریکارڈ سے نکال کر مسلمانوں کو سونپ دیا ہے، جیسا کہ نبی ﷺ نے سونپا تھا۔ اب پوری ملت اسلامیہ قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ دار ہے، کوئی اسلامی حکومت ذمہ دار نہیں، یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سنت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بنتے ہی مسلمانوں میں جنگیں شروع ہوئیں، پہلی جنگ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہوئی، اس جنگ میں حضرت عائشہؓ اونٹ پر سوار تھیں اس لئے اس جنگ کا نام جنگ جمل پڑا، اس جنگ میں حضرت عائشہؓ کی فوج ہاری، اور مال غنیمت اکٹھا ہوا اور قیدی بھی پکڑے گئے، حضرت عائشہؓ بھی قیدیوں میں تھیں، حضرت علیؓ کی فوج نے مال غنیمت کی تقسیم کا مطالبہ کیا، حضرت علیؓ نے تقریر فرمائی کہ اگر مال غنیمت تقسیم ہوگا تو قیدی بھی غلام باندی بنائے جائیں گے، پس تم میں سے کون منحوس ہے جو اپنی ماں حضرت عائشہؓ کو اپنی باندی بنائے گا؟ بس سناٹا چھا گیا اور مسئلہ طے ہوگیا کہ اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑیں تو نہ مال: مال غنیمت ہوگا اور نہ قیدی غلام باندی بنائے جائیں گے، یہ حضرت علیؓ کی سنت ہے۔

خلفائے راشدین کی سنتوں کی پیروی کیوں ضروری ہے؟

غرض یہ خلفائے راشدین کے وہ طریقے ہیں جو ملک وملت کی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں، جن کو حدیث شریف کی رو سے اپنانا ضروری ہے۔ نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے: علیکم بسنتی وسنۃِ الخلفاء الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ، تَمَسَّکوا بها، وعَضُّوا علیها بالنَّواجِذ: میرا طریقہ لازم پکڑو اور میرے بعد جو میرے جانشین آئیں گے ان کا طریقہ لازم پکڑو، سنَّتي وسنة الخلفاء میں واو کے ذریعہ عطف کیا گیا ہے اور جہاں واؤ کے ذریعہ عطف کیا جاتا ہے من وجہٍ اتحاد ہوتا ہے اور من وجہٍ مغایرت، پس حضور ﷺ کی سنت اور خلفائے راشدین کی سنتوں میں فی الجملہ مغایرت ماننی پڑے گی۔ اور دونوں ہی سنتوں کی پیروی ضروری ہوگی۔

سوال: یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ آنحضور ﷺ کا طریقہ تو اس لئے لازم پکڑنا ضروری ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، گفتۂ او گفتۂ اللہ بود، آپؐ کی ہر بات اللہ کی بات ہوتی ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوْحٰى﴾ لیکن خلفاء کی پیروی کیوں ضروری ہے؟ وہ تو اللہ کے رسول نہیں ہیں؟

جواب: نبی پاک ﷺ نے فرمایا ہے کہ ان کی پیروی دو وجہ سے ضروری ہے: ایک: وہ راشد ہونگے، راشد کے معنی ہیں: راہ یاب۔ دوم: وہ مہدی ہونگے، مہدی کے معنی ہیں: ہدایت مآب۔ یعنی ہدایت ان کی گھٹی میں پڑی ہوگی، آنحضور ﷺ نے یہ دو سندیں ان کو عطا فرمائی ہیں اس لئے ان کی بات ماننی ضروری ہے۔

اور ائمہ کی تقلید بھی اسی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ وہ پورے دین کے جاننے والے ہیں انھوں نے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہی، انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ قرآن وحدیث سے سمجھ کر کہا ہے۔

بہر حال خلفائے راشدین کی پیروی اس لئے کرنی ہے کہ وہ راہ یاب، ہدایت مآب ہونگے، پھر حضور ﷺ نے تاکید فرمائی: تَمَسَّکوا بها: مفرد کی ضمیر لائے ہیں، تثنیہ کی ضمیر نہیں لائے، کیونکہ حضور ﷺ کی سنت کو مضبوط پکڑنے میں تو کسی مسلمان کو تردد نہیں ہوسکتا، ہاں خلفائے راشدین کی سنتوں کی پیروی میں اشکال ہوسکتا ہے۔ اس لئے حضور ﷺ نے تاکید فرمائی: تَمَسَّکوا بها: اور ضمیر کا مرجع اقرب ہوتا ہے یعنی خلفائے راشدین کی سنتوں کو مضبوط پکڑو، پھر مزید تاکید فرمائی: وعَضُّوا علیها بالنَّواجذ: اور خلفائے راشدین کی سنتوں کو ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑو، ہاتھوں ہی سے نہیں، ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑو!

خلفائے راشدین کی باتیں حضورؐ کے جانشین ہونے کی وجہ سے حجت ہیں:

اس حدیث سے دو باتیں سمجھ میں آئیں: ایک: خلفائے راشدین کی باتیں حجت ہیں، دوم: خلفائے راشدین کی باتیں اس وجہ سے حجت ہیں کہ وہ خلفاء ہیں، حضور ﷺ کے جانشین ہیں، حکومت کے سربراہ اور ذمہ دار ہیں، صرف

امت کے مجتہد ہونے کی حیثیت سے ان کی باتیں حجت نہیں، اسی لئے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے دو چیزوں کی تخصیص کی، فرمایا: ملک اور ملت کی تنظیم سے تعلق رکھنے والی خلفائے راشدین کی جو باتیں ہیں ان کو اپنانا ضروری ہے، اور ان کے علاوہ جو باتیں ہیں وہ خلفائے راشدین کے عام اجتہادات ہیں، ان میں خلفاء دیگر صحابہ کے مانند ہیں، جس طرح دیگر صحابہ کے اجتہادات میں سے کچھ باتیں لی جاتی ہیں اور کچھ باتیں چھوڑی جاتی ہیں، اسی طرح خلفاء کے اجتہادات میں سے بھی کچھ باتیں لی جاتی ہیں اور کچھ باتیں چھوڑی جاتی ہیں، جیسے عورت کو ہاتھ لگانے سے وضوٹوٹتا ہے یا نہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ وضوٹوٹ جاتا ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کو نہیں لیا یا جیسے کسی حاملہ عورت کا شوہر وفات پاجائے تو عدت چار مہینے دس دن ہوگی یا وضع حمل؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ أبعد الأجلَين عدت ہوگی، چاروں فقہاء نے اس کو نہیں لیا، بالا جماع وضع حمل سے عدت پوری ہوجائے گی، غرض خلفاء کے جو اجتہادات ہیں وہ مجتہدین کے عام اجتہادات کی طرح ہیں ان کو لینا ضروری نہیں، ہاں جو باتیں ملک وملت کی تنظیم سے تعلق رکھتی ہیں ان کو لینا ضروری ہے۔

وہ روایتیں جو حدیث بھی ہیں اور سنت بھی.

مادۂ اجتماع: بہر حال میں یہ سمجھا رہا تھا کہ جہاں من وجہٍ کی نسبت ہوتی ہے وہاں تین مادے ہوتے ہیں دو افتراقی اور ایک اجتماعی، دو افتراقی مادے میں نے سمجھا دیئے، باقی جتنی حدیثیں ہیں وہ سب سنتیں بھی ہیں اور حدیثیں بھی۔ اور وہ اٹھانوے فیصد ہیں، صرف ایک فیصد ایسی حدیثیں ہیں جو سنت نہیں، اور ایک فیصد خلفائے راشدین کی وہ باتیں ہیں جن کو لینا ضروری ہے اور وہ حدیث نہیں، صرف سنت ہیں۔

آمدم برسر مطلب:

غرض امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کے نام میں تعمیم کے بعد تخصیص کی ہے یعنی من أمور رسول اللہ کے بعد سننه لاکر اشارہ کیا ہے کہ اس کتاب میں وہ حدیثیں جو سنتیں ہیں ان کو بیان کیا ہے۔

أيامه:

پھر تیسرا لفظ لائے وأيامه: أيّام: یوم کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: دن، لیکن قرآن کریم کی اصطلاح میں ایام اللہ (اللہ کے دن) ان عظیم واقعات کو کہا جاتا ہے جن میں اطاعت شعار بندوں کو انعامات سے نوازا گیا ہے اور نافرمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا گیا ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مع تبعین صحیح سالم سمندر سے پار ہوگئے اور فرعون اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ غرقاب ہوگیا۔ یہ واقعہ ایام اللہ کی مثال ہے۔ اسلام میں اس کی

مثال جنگ بدر ہے، ایک طرف ایک ہزار مسلح فوج تھی، دوسری طرف صرف تین سوتیرہ نہتے صحابہ تھے جو تیرہ سال سے ظلم وستم کی چکی میں پس رہے تھے، لیکن جب مقابلہ ہوا تو صرف آدھے دن میں رزلٹ آ گیا، وہ ہزار جو ہرطرح آلاتِ حرب سے لیس تھے اور فخر وغرور اور تکبر کے ساتھ دندناتے ہوئے آئے تھے بری طرح ہارے اور پورے عرب میں ذلیل وخوار ہوئے، اور مسلمان فتح ونصرت کا پھریرا اڑاتے ہوئے اور مال غنیمت سمیٹ کر بامراد گھروں کولوٹے، غرض: ایام اللہ نام ہے ان عظیم واقعات کا جو اللہ کی طرف سے رونما ہوتے ہیں، جن میں نیک بندوں کوسرخ روئی حاصل ہوتی ہے، اور نافرمان ذلیل وخوار ہوتے ہیں۔

پس امام بخاریؒ کی کتاب کے نام میں جو ایام ہے اس سے مغازی اور غزوات مراد ہیں، یعنی آنحضور ﷺ نے جو جنگیں لڑی ہیں ان کا بیان بھی بخاری شریف مین ہے۔

سوال: بخاری شریف میں تفسیر کے مضامین بھی ہیں۔ آداب بھی ہیں، فتن بھی ہیں، اشراط الساعہ بھی ہیں، مناقب بھی ہیں، پھر دو کی تخصیص کیوں کی؟ یعنی سنن وایام کی تخصیص کیوں کی؟

جواب: حدیثوں کو جو آٹھ عنوانوں میں گھیرا گیا ہے یہ بعد کے لوگوں نے گھیرا ہے، جس وقت یہ کتاب لکھی جارہی تھی اس وقت حدیثوں کو ان آٹھ عنوانوں میں گھیرا نہیں گیا تھا، جیسے شاہ ولی اللہ صاحب نے قرآن کریم کے مضامین کو پانچ علوم میں گھیرا ہے، شاہ صاحبؒ سے پہلے کسی نے ان علوم خمسہ میں قرآن کے مضامین کو نہیں گھیرا، اگرچہ مفسرین نے قرآن کریم کے مضامین کا احاطہ کرنے کی کوشش کی تھی، مگر ان کے الگ الگ عنوانات تھے، علوم خمسہ میں سب سے پہلے شاہ صاحب نے گھیرا ہے، اسی طرح احادیث کو آٹھ عناوین میں بعد میں تقسیم کیا گیا ہے، امام بخاریؒ کے زمانہ میں یہ تقسیم نہیں تھی۔

دوسرا جواب: عام میں جب تخصیص کی جاتی ہے تو اہم کی تخصیص کی جاتی ہے، غیر اہم کو چھوڑ دیا جاتا ہے، مذکورہ آٹھ عناوین میں سب سے اہم یہی دو ہیں یعنی سُنن وایام۔ سنن کا یعنی فقہ اسلامی کا اہم ہونا تو ظاہر ہے، اور ایام کی یعنی غزوات کی حدیثیں بھی اہمیت کی حامل ہیں، لوگوں کے ذہنوں میں یہ اشکال آتا ہے کہ جب آنحضور ﷺ پوری کائنات کے لئے رحمت ہیں تو پھر آپؐ نے جنگیں کیوں لڑیں؟ مغازی کی احادیث میں اس کا جواب ہے کہ یہ جنگیں دین کے کاز کے لئے لڑی گئی ہیں، جاہ وجلال اور رعب ودبدبہ قائم کرنے کے لئے نہیں لڑی گئیں، جیسے ڈاکٹر سڑے ہوئے عضو کو کاٹ دیتا ہے، پھوڑے میں نشتر لگاتا ہے، یہ سرسری نظر میں ظلم نظر آتا ہے، مریض کو تکلیف پہنچاتا ہے، مگر حقیقت میں وہ مریض پر احسان ہے، اسی طرح جہاد بھی رحمت کا مظہر ہے، سڑے ہوئے عضو کو کاٹنے کی مثال ہے۔

احادیث میں صرف سنت کومضبوط پکڑنے کا حکم دیا گیا ہے:

یہاں ایک اہم بات جاننی چاہئے، پورے ذخیرۂ حدیث میں ایک بھی حدیث ایسی نہیں جس میں آنحضور ﷺ

نے حدیث کو مضبوط پکڑنے کا حکم دیا ہو، ایسی روایتیں تو ہیں جن میں آپؐ نے حدیثوں کو یاد کرنے کے فضائل بیان کئے ہیں، حدیثیں محفوظ کر کے دوسروں تک پہنچانے والوں کو دعائیں دی ہیں، لیکن کوئی ضعیف حدیث بھی ایسی نہیں جس میں آپؐ نے حدیث کو مضبوط پکڑنے کا حکم دیا ہو، ہر جگہ سنت کو مضبوط پکڑنے کا حکم دیا ہے، جیسے ابھی آپ نے حدیث سنی: **عليكم بسنتي وسنة الخلفاء**: **بسنتي** فرمایا، **بحديثي** نہیں فرمایا مشکوٰۃ (حدیث ١٨٦) میں ہے: **تركتُ فيكم أمرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما: كتابَ الله وسنةَ رسوله**: اس میں بھی سنت کا لفظ آیا ہے۔ اور مشہور حدیث ہے: **من تمسَّك بسنتي عند فساد أمتي فله أجر مأة شهيد** (مشکوٰۃ شریف ١٧٦)

غرض کسی حدیث میں حدیثوں کو مضبوط پکڑنے کا حکم نہیں دیا، ہاں حدیثوں کو یاد کرنے کے فضائل آئے ہیں اور دوسروں تک پہنچانے کے بھی فضائل آئے ہیں، چنانچہ امت نے تمام حدیثیں محفوظ کیں، مخصوص بھی اور منسوخ بھی اور وہ ہم تک پہنچائیں، مگر جہاں تک ہدایت کا تعلق ہے سب روایات میں سنت کو مضبوط پکڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اہل قرآن کے مقابلہ میں ہمارا مسلکی عنوان حجیت حدیث ہے

اور اہل حدیث (غیر مقلدین) کے مقابلہ میں حجیت سنت ہے:

غرض یہ بات ہم منقح کر چکے کہ حدیث اور سنت میں عموم وخصوص من وجہ کی نسبت ہے، احادیث کا اٹھانوے فیصد حصہ مادۂ اجتماعی ہے، اور دو فیصد مادۂ افتراقی، اب اصل بات سمجھنی چاہئے، ہمارا مسلکی عنوان ہے: حجیت حدیث یعنی ہمارا دعوی یہ ہے کہ حدیث حجت ہے مگر یہ عنوان فرقہ اہل قرآن کے مقابلہ میں ہے، یہ فرقہ حدیث کا انکار کرتا ہے یعنی حدیث کی حجیت کا انکار کرتا ہے، پس ان کے مقابلہ میں ہمارا عنوان حجیتِ حدیث ہوگا۔

سوال: عرف عام میں حدیث اور سنت کو ایک سمجھا جاتا ہے، اور ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں، پس من وجہٍ کی نسبت کیسے ہوسکتی ہے؟ تساوی کی نسبت ہونی چاہئے؟

جواب: کبھی دو چیزوں میں معمولی فرق ہوتا ہے تو عمومی استعمال میں اس کا لحاظ نہیں کرتے، لیکن خصوصی استعمال میں اس فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جیسے لوگ ایمان واسلام کے استعمال میں فرق ملحوظ نہیں رکھتے۔ ایک کی جگہ دوسرے کو استعمال کرتے ہیں، ایمان کی جگہ اسلام اور اسلام کی جگہ ایمان بول دیتے ہیں۔ نصوص میں بھی ایک کا دوسرے پر اطلاق آیا ہے، مگر خصوصی استعمال میں فرق ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

پہلی مثال: حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضور ﷺ سے پہلا سوال کیا تھا: ما الإيمان؟ ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے چھ عقیدے بتلائے، پھر انھوں نے دوسرا سوال کیا: ما الإسلام؟ اسلام کیا ہے؟ تو آپؐ نے پانچ اعمال بتلائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اور ایمان دو الگ الگ چیزیں ہیں، اسی لئے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے الگ الگ

سوال کئے، اور آپؐ نے الگ الگ جواب دیئے۔ غرض خصوصی استعمال میں ایمان واسلام کے درمیان فرق ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اور وہ فرق یہ ہے کہ عقیدوں کا نام ایمان ہے، اور اعمال۔ جو عقیدوں کے پیکر محسوس ہیں ان کا نام اسلام ہے۔

دوسری مثال: قرآنِ کریم میں ہے: ﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا، قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾: گنوار کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے، آپؐ کہیں: تم ایمان نہیں لائے، ہاں یوں کہو کہ ہم مسلمان ہوگئے یعنی مخالفت چھوڑ کر مطیع ہوگئے اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا [الحجرات ۱۴]

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک: ایمان اور اسلام کے درمیان فرق، بدوؤں نے جو کہا تھا: آمَنَّا: قرآن نے کہا: تم غلط کہتے ہو، أسلمنا: کہو یعنی ہم سرینڈر ہوئے، ہم نے اطاعت قبول کی، وہ لوگ اعمال ظاہری کرتے تھے، مسجدوں میں نماز پڑھتے تھے۔ زکات دیتے تھے، حج کرتے تھے، پس أسلمنا کہنا تو درست ہے، لیکن عقائد ابھی ان کے دلوں میں نہیں گھسے، پس آمنّا کہنا درست نہیں۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ایمان کا محل قلب ہے یعنی ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے، محض اعمال کا نام نہیں (یہ معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، تفصیل کتاب الایمان کے شروع میں آئے گی)

اسی طرح حدیث اور سنت میں فرق ہے، اگرچہ ایک دو فیصد ہی کا سہی مگر ہے، اور اٹھانوے فیصد ایک کا دوسرے پر اطلاق ہوتا ہے۔ اسی لئے جب ہمارا مقابلہ فرقۂ اہل قرآن سے ہوگا تو ہمارا مسلکی عنوان حجیتِ حدیث ہوگا۔ اہل قرآن کے نزدیک مصدر تشریع صرف قرآن ہے، یعنی صرف قرآن کریم سے احکام شرعیہ مستنبط کئے جاتے ہیں، حدیثوں سے مستنبط نہیں کئے جاتے، ان کے نزدیک حدیثیں مصدر تشریع نہیں۔

جاننا چاہئے کہ فرقہ اہل قرآن حدیثوں کی تاریخی حیثیت کا انکار نہیں کرتا بلکہ ان کے نزدیک حدیثیں بزرگوں کے ملفوظات کی طرح ہیں، جس طرح بزرگوں کے ملفوظات سے استفادہ کرنا چاہئے لیکن ان سے شرعی احکام ثابت نہیں ہونگے، اسی طرح حدیثیں بھی ہیں، ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے لیکن وہ مصدر تشریع نہیں ان سے احکام مستنبط نہیں کئے جائیں گے۔

اہل قرآن کے مقابلہ میں ہمارا دعوی یہ ہے کہ قرآن کی طرح حدیثیں بھی حجت ہیں قانون سازی کا مصدر ہیں، اس لئے ہمارا عنوان ہوگا کہ حدیثیں بھی حجت ہیں اور یہ عنوان اٹھانوے فیصد حدیثوں کے لحاظ سے ہوگا، کیونکہ عمومی استعمال میں ایک دو فیصد کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔

اور اہل حدیث (غیر مقلدین) کے مقابلہ میں ہمارا مسلکی عنوان حجیت سنت ہوگا، ہم نے اپنا نام اہل السنۃ رکھا ہے اور غیر مقلدین نے اہل حدیث۔ ان کے نزدیک ہر حدیث حجت ہے خواہ منسوخ ہو یا مخصوص، اور ہمارے نزدیک مطلق حدیث حجت نہیں بلکہ وہ حدیث حجت ہے جو سنت بھی ہے، جو حدیثیں سنت نہیں وہ مسائل میں حجت نہیں، اسی وجہ سے

ہمارا نام اہل السنۃ ہے۔

اجماع بھی حجت ہے

پھر غیر مقلدین سے ہمارا دوسرا اختلاف یہ ہے کہ اجماع بھی حجت ہے۔ اہل حدیث کہتے ہیں: قرآن وحدیث کے بعد کوئی چیز حجت نہیں۔ پس ہمارے نزدیک مصادر شرعیہ تین ہیں: قرآن، سنت اور اجماع۔ اس لئے ہمارا پورا نام: اہل السنہ والجماعہ ہے، یعنی سنت کو اور مسلمانوں کے اجماعی فیصلوں کو حجت ماننے والے۔

اہل السنہ والجماعہ کا نام ایک حدیث سے لیا گیا ہے:

اور یہ نام ایک حدیث سے لیا گیا ہے۔ روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل کے بہتّر فرقے ہوئے اور میری امت کے تہتّر فرقے ہونگے، جن میں سے ایک جنت میں جائے گا باقی جہنم رسید ہونگے، پوچھا گیا: یارسول اللہ! وہ ایک فرقہ کونسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: **ما أنا عليه و أصحابي**: وہ وہ فرقہ ہے جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہوگا (مشکوۃ حدیث ۱۷۱)

ما أنا عليه: نبی ﷺ جس طریقہ پر تھے اس کا نام سنت ہے، اور صحابہ کی جماعت جس طریقہ پر تھی وہ امت کا اجماعی راستہ ہے۔ اس حدیث سے اہل السنۃ والجماعہ کا نام لیا گیا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے منہاج السنۃ میں اہل السنۃ والجماعہ کے یہی معنی بیان کئے ہیں، فرماتے ہیں: سنت سے مراد نبی پاک ﷺ کا طریقہ ہے اور جماعت سے مراد صحابہ کا اجماع ہے، غیر مقلد عالم نواب وحید الزماں صاحب نے بھی نزول الابرار میں یہی معنی بیان کئے ہیں کہ سنت سے مراد حضور ﷺ کا طریقہ ہے اور جماعت سے مراد امت کا اجماع ہے (تحفۃ الالمعی ۱: ۸۵)

اور میں نے کہا کہ اہل قرآن سے امتیاز کرنے کے لئے ہمارا مسلکی عنوان حجیت حدیث ہے اور اہل حدیث سے امتیاز کرنے کے لئے ہمارا نام اہل السنہ ہے اور چونکہ ہم چار فقہاء کے مقلد ہیں اور امت کے اجماعی فیصلوں کو حجت مانتے ہیں اس لئے ہمارا پورا نام اہل السنہ والجماعہ ہے۔

ملحوظہ: فرقہ اہل قرآن: قرآن سے نیچے کسی چیز کو حجت نہیں مانتا، اس لئے وہ کافر ہیں، مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ نے فتاوی رحیمیہ (۱: ۴) میں اس کی صراحت کی ہے، اور فرقہ اہل حدیث: جو حدیث کو حجت مانتا ہے مگر اجماع کو حجت نہیں مانتا وہ مسلمان ہے مگر گمراہ فرقہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نصیب فرمائیں (آمین)

اہل قرآن قدیم فرقہ ہے اور حدیثوں میں اس کی خبر دی گئی ہے:

اور اہل قرآن ابھی وجود میں نہیں آئے بلکہ وہ قدیم فرقہ ہے اور حدیث میں اس کی پیشین گوئی ہے۔ نبی ﷺ نے

فرمایا: میری امت میں عنقریب ایسے لوگ پیدا ہونگے جو مسہریوں پر تکیہ لگائے دراز پڑے ہونگے، جب ان کو میرے دیئے ہوئے احکام میں سے کوئی حکم پہنچے گا، یعنی کوئی ایسی حدیث پہنچے گی جس میں آنحضور ﷺ نے از قبیل امر یا از قبیل نہی کوئی حکم دیا ہے تو وہ پڑا پڑا کہے گا: حسبُنا کتابُ اللہ! ہمارے لئے قرآن کافی ہے یعنی حدیث کو رہنے دو۔ حضور ﷺ نے فرمایا: سنو! مجھے قرآن کے ساتھ قرآن کے مانند احکام دیئے گئے ہیں یا اس سے بھی زیادہ۔ یعنی جتنے احکام قرآن میں ہیں، اتنے ہی احکام حدیثوں میں ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ۔ میں نے حدیثوں میں حکم بھی دیئے ہیں، ممانعتیں بھی کی ہیں، وعظ بھی کہے ہیں، نصیحتیں بھی کی ہیں (مشکوۃ حدیث ۱۶۲)

غرض اس فتنہ کی خبر سین اور سوف کے ذریعہ دی گئی ہے، یعنی بہت جلد یہ فرقہ وجود میں آئے گا۔ چنانچہ صحابہ کے آخر دور میں یہ فرقہ وجود میں آیا، اور انھوں نے اپنا نام اہل القرآن رکھا۔ حالانکہ قرآن کو ساری امت مانتی ہے وہ اکیلے ہی قرآن والے کیوں ہوگئے؟ بلکہ ان کا صحیح نام منکرین حدیث ہے اور اس نام میں مضاف پوشیدہ ہے، یعنی منکرینِ حجیتِ حدیث۔

میں نے پہلے یہ بات بتائی ہے کہ اہل قرآن حدیث کی تاریخی حیثیت کا انکار نہیں کرتے، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ سب آنحضور ﷺ کے ارشادات ہیں، انہیں پڑھو اور نصیحت حاصل کرو، جیسے بزرگوں کے ملفوظات سے نصیحت حاصل کرتے ہیں، باقی قانونِ اسلامی ان حدیثوں سے اخذ نہیں کیا جائے گا، وہ صرف قرآن سے اخذ کیا جائے گا، لوگوں کو لفظ منکرین حدیث سے دھوکہ ہوتا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ فرقہ حدیث کی تاریخی حیثیت کا انکار کرتا ہے، ایسا نہیں ہے، بلکہ وہ منکرین حجیت حدیث ہیں، یعنی وہ حدیث کی حجیت کا انکار کرتے ہیں، اس لئے ان کے مقابلہ میں ہمارا مسلکی عنوان حجیت حدیث ہوگا اور چونکہ یہ قدیم فرقہ ہے اس لئے اس کی تردید میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی السنة ومکانتها فی التشریع الإسلامی، اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی محدث کبیر علیہ الرحمہ کی حجیت حدیث اور حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کی تدوین حدیث اس سلسلہ کی بہترین کتابیں ہیں۔

باطل نظریہ وجود میں آکر ختم نہیں ہوتا، کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتا ہے:

اور جاننا چاہئے کہ جب کوئی غلط نظریہ اور گمراہ جماعت پیدا ہوتی ہے تو پھر وہ نظریہ کبھی ختم نہیں ہوتا، اس کی جڑیں باقی رہتی ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں، جیسے اب معتزلہ ناپید ہوگئے مگر ان کے نظریے باقی ہیں، وہ اس زمانہ میں مودودیت کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں، اسی طرح انکار حدیث کا فتنہ آج بھی موجود ہے۔ اس لئے ان پرانے نظریات سے بحث کرنا فضول نہیں۔

کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ مدرسوں میں شرح عقائد پڑھاتے ہیں اور معتزلہ کی تردید کرتے ہیں، جب معتزلہ دنیا میں رہے نہیں تو ان کی تردید کرنے سے کیا فائدہ؟ موجودہ زمانے میں جو گمراہ فرقے ہیں ان کی تردید کرنی چاہئے۔

یہ اعتراض غلط ہے، اس لئے کہ اگرچہ معتزلہ ناپید ہوگئے ہیں مگران کے نظریات اب بھی باقی ہیں، وہ مختلف شکلوں میں نمودار ہوتے رہتے ہیں، پس اگر شرح عقائد میں معتزلہ کی تردید کی جاتی ہے تو معتزلہ کی تردید کے ضمن میں آج جو باطل نظریات پائے جاتے ہیں ان کی بھی تردید ہوجاتی ہے۔

سوال: یہاں ایک معقول سوال ہے کہ آج کل جو باطل نظریے پائے جاتے ہیں براہ راست ان کی تردید کیوں نہیں کی جاتی؟ ضمناً تردید کیوں کرتے ہیں؟

جواب: ایسی کوئی کتاب موجود نہیں جس میں موجودہ باطل نظریات کی تردید کی گئی ہو، جو عربی میں ہو اور نصاب میں داخل کرنے کے قابل ہو، یہ ایک مجبوری ہے، اس لئے پرانی کتابوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

بہرحال اہل قرآن فرقے کے جو خیالات ہیں وہ ختم نہیں ہوئے، اور وہ جماعت بھی ختم نہیں ہوئی، آج بھی دنیا میں اہل قرآن فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود ہیں، وہ خود کو اہل قرآن کہتے ہیں۔

حدیث لکھنے کی ممانعت سے حجیت حدیث پر اعتراض کا جواب:

فرقہ اہل قرآن جو حدیث کو حجت نہیں مانتا وہ بہت سے شبہات (بوگس دلیلیں) رکھتا ہے ان سب اعتراضوں کے جوابات تدوینِ حدیث اور حجیت حدیث کے موضوع پر لکھی گئی عربی اور اردو کی کتابوں میں موجود ہیں، ان کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ یہاں ہم ان کے ایک اعتراض کو لیتے ہیں کیونکہ اس کا جواب تشفی بخش نہیں دیا گیا۔

اہل قرآن جو صرف قرآن کو حجت مانتے ہیں ان کا ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ جس طرح قرآن نزول کے ساتھ ہی لکھ کر محفوظ کرلیا گیا، حدیثیں لکھ کر محفوظ کیوں نہ کی گئیں، اور نہ صرف یہ کہ حدیثیں لکھی نہیں گئیں بلکہ آنحضور ﷺ نے صاف فرمایا کہ اگر کسی نے قرآن کے ساتھ میری باتیں لکھی ہیں تو وہ ان کو مٹادے، چنانچہ سو سال تک حدیثیں زبانی روایت ہوتی رہیں، یہ اتنا طویل زمانہ ہے کہ اس میں سب کچھ ہوسکتا ہے، حدیثوں میں زیادتی بھی ہوسکتی ہے اور کمی بھی اور کچھ حدیثیں ضائع بھی ہوسکتی ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حدیثیں نہ وحی ہیں نہ حجت شرعیہ۔

جواب: اس اعتراض کا جواب عام طور پر یہ دیا جاتا ہے کہ حدیثیں آنحضور ﷺ کے زمانہ میں بھی لکھی گئی ہیں، مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے نبی پاک ﷺ کی اجازت سے حدیثیں لکھی تھیں، جس کا نام انھوں نے صحیفۂ صادقہ رکھا تھا، یا جیسے آنحضور ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر جو تقریر فرمائی تھی، یمن کے ایک شخص نے جن کا نام ابوشاہ تھا عرض کیا تھا کہ یارسول اللہ! یہ تقریر میرے لئے لکھوا دیجئے میں اس کو یمن لے جاؤں گا، آپؐ نے فرمایا: اکتبوا لأبی شاہ: ابوشاہ کو یہ تقریر لکھ کر دیدو، یا مختلف معاہدے، خطوط اور دستاویز لکھے گئے، پس یہ کہنا صحیح نہیں کہ حدیثیں نہیں لکھی گئیں۔

مگر یہ جواب تشفی بخش نہیں، کیونکہ ان روایات سے تدوین حدیث ثابت نہیں ہوتی، صرف جواز ثابت ہوتا ہے، جبکہ

منکرین حدیث جواز کو مانتے ہیں، ان کا اشکال یہ ہے کہ حدیثیں بھی اگر وحی اور حجت ہو تیں تو قرآن کی طرح ان کو بھی لکھ کر محفوظ کر لیا جاتا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جملہ روایات لکھ کر محفوظ نہیں کی گئیں۔

پس اس اعتراض کا صحیح جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی بھی حفاظت لکھ کر نہیں کی گئی، حفظ کے ذریعہ کی گئی ہے، اور حدیثوں کی بھی اسی طرح حفاظت کی گئی ہے، کیونکہ چھپے ہوئے قرآن میں تو جو چاہے رد و بدل کر سکتا ہے، لیکن حافظوں کے دل و دماغ میں جو قرآن محفوظ ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا، نہ سب حافظوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ کسی کے ماتھے پر نہیں لکھا کہ وہ حافظ ہے۔

غرض نہ تو قرآن لکھ کر محفوظ کیا گیا نہ حدیثیں لکھی گئیں بلکہ دونوں کی حفاظت حفظ کے ذریعہ کی گئی، یعنی نہ تو قرآن کریم ریکارڈ میں رکھا گیا نہ حدیثوں کا ریکارڈ تیار کیا گیا، بلکہ دونوں کی حفاظت کا مدار حفظ پر رکھا گیا۔

تفصیل: بندوں کی ہدایت کے لئے اللہ نے انبیاء بھیجے، ان پر کتابیں نازل فرمائیں جن کی تعداد ایک سو چار بیان کی جاتی ہے، وہ سب کتابیں اللہ کا کلام نہیں تھیں، اللہ کا کلام صرف یہی آخری کتاب یعنی قرآنِ کریم ہے، پورے قرآن میں کسی بھی جگہ سابقہ کتابوں کو کلام اللہ نہیں کہا گیا، جگہ جگہ کتاب اللہ کہا گیا ہے، اور قرآن کریم کو کتاب اللہ بھی کہا گیا ہے اور کلام اللہ بھی۔

گذشتہ کتابوں کی حفاظت کی ذمہ داری بھی امتوں کے سر تھی، حکومتیں ان کی محافظ نہیں تھیں، اسی طرح قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری بھی مسلمانوں کی ہے، حکومتیں حفاظت کی ذمہ دار نہیں، سورۂ مائدہ (آیت ۴۴) میں ہے: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ، يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ أَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبَّانِيُّوْنَ وَالأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتَابِ اللهِ﴾ ترجمہ: بیشک ہم نے تورات نازل فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی تھی، انبیاء جو کہ اللہ کے مطیع تھے اس کے موافق یہود کو حکم دیا کرتے تھے، اور اہل اللہ اور علماء بھی، بایں وجہ کہ ان کو اس کتاب کی نگہداشت کا حکم دیا گیا تھا۔ اور وہ اس کے اقراری ہو گئے تھے۔

معلوم ہوا کہ تورات کی حفاظت کی ذمہ داری لوگوں کی تھی حکومت کی نہیں تھی، قرآنِ کریم کی حفاظت کا ذمہ دار بھی امت کو بنایا گیا ہے، ارشادِ پاک ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ﴾: حافظون: حافظ کی جمع ہے، اس لفظ میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کی حفاظت کرنے والے ہیں، مگر چونکہ یہ دنیا دار الاسباب ہے، یہاں ہر چیز کا سبب ہے اس لئے قرآن کے اصل محافظ تو اللہ ہیں مگر دنیا میں اس کی حفاظت حافظوں کے ذریعہ کرتے ہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اللہ کی کتابوں میں تو تحریف ہو سکتی ہے مگر اللہ کے کلام میں تحریف ممکن نہیں، اللہ کا ارشاد ہے: ﴿لَاتَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللهِ﴾: اللہ کی باتوں کو کوئی بدل نہیں سکتا، مگر احادیث شریفہ کی یہ صورتِ حال نہیں، ان میں تبدیلی ممکن ہے، کیونکہ احادیث شریفہ گذشتہ کتابوں کی طرح ہیں، احادیث شریفہ بھی اگرچہ وحی ہیں مگر قرآن کی وحی

میں اور حدیثوں کی وحی میں فرق ہے، اسی لئے قرآن کریم کو وحی متلو اور احادیث شریفہ کو وحی غیر متلو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محدثین ہمیشہ حدیثوں پر محنت کرتے رہتے ہیں اور اپنی پوری توانائی صرف کرکے جو خامیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی نشاندہی کرتے ہیں، اور وجہ اس کی یہی ہے کہ احادیث شریفہ اگرچہ وحی ہیں لیکن اللہ کا کلام نہیں، اور کلام اللہ کے علاوہ ہر چیز میں گڑبڑ کا امکان ہے، تبدیلی اور تحریف سے محفوظ صرف کلام اللہ ہے۔

نزول قرآن کے ساتھ حفظ شروع ہوا:

بہر حال نزول قرآن کے ساتھ حفظ کا سلسلہ شروع ہوا، ہر رات جتنا قرآن نازل ہوا تھا اللہ پاک کو سنانا پڑتا تھا ——
حفظ سنانے کے چار درجے ہیں: ایک: بچہ سبق یاد کرکے خود کو سناتا ہے یعنی زبانی پڑھ کے دیکھتا ہے کہ سبق یاد ہو گیا یا نہیں؟ پھر صبح استاذ کو سناتا ہے، استاذ کو سنانے کے لئے اور پکا چاہئے، چنانچہ صبح اٹھ کر یاد کرتا ہے، استاذ کو سنانے کے لئے رات کا یاد کیا ہوا کافی نہیں، پھر تیسرا سنانا اللہ پاک کو ہے، نماز میں پڑھنا ہے، یہ اللہ کو سنانا ہے، یہ سنانا استاذ کو سنانے سے بھی زیادہ مشکل ہے، جو سبق استاذ کو سنایا ہے وہ نماز میں پڑھنے کے لئے کافی نہیں، نماز میں پڑھنے کے لئے اور پکا یاد کرنا پڑتا ہے، تب اللہ پاک کو سنا سکتا ہے، ورنہ نماز میں بھولے گا اور چوتھا سنانا لوگوں کو ہے۔ فرض نماز میں یا تراویح میں پڑھنا ہے، یہ اور بھی مشکل ہے۔

دورِ اول میں تہجد اسی لئے فرض کیا گیا تھا کہ جتنا قرآن نازل ہوا ہے وہ سارا اللہ پاک کو سنایا جائے، کیونکہ بڑی عمر کا حفظ پکا نہیں ہوتا، بچپن کا حفظ پکا ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ بے اختیار ہوتا ہے، جب تک استاذ کہتا ہے رٹتا ہے، اور بڑا با اختیار ہوتا ہے وہ خود فیصلہ کرتا ہے اور رٹنا چھوڑ دیتا ہے، حالانکہ مطلوبہ مقدار تک رٹے بغیر قرآن پکا نہیں ہوتا، اس لئے صحابہ کو رٹوایا گیا، انھیں نماز میں اللہ کو سنانے کا حکم دیا گیا، پھر جب لوگ اس کے عادی ہو گئے تو تہجد تو باقی رہا مگر اس کی فرضیت منسوخ ہو گئی۔

سوال: جب حفاظتِ قرآن کا مدار حفظ پر تھا تو پھر نزول کے ساتھ ہی قرآن کیوں لکھوایا گیا؟

جواب: قرآن میں متعدد چیزیں ایسی ہیں جن کی حفاظت لکھ کر ہی کی جا سکتی ہے، مثلاً:

۱- آیات توقیفی ہیں یعنی گول دائرے والی آیات کی تعیین من جانب اللہ ہے، ان کو لکھے بغیر یاد نہیں رکھا جا سکتا، چھوٹی آیتیں ایک سانس میں ملا کر پڑھی جاتی ہیں، پس ان کو لکھے بغیر کیسے یاد رکھا جا سکتا ہے؟

۲- قرآن کا رسم الخط توقیفی ہے، یعنی کونسا لفظ کس طرح لکھا جائے گا یہ بات بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے بتائی گئی ہے، جیسے اللذی کو الّذی: ایک لام کے ساتھ، اللیل کو الّیل ایک لام کے ساتھ اور العالمین کو العٰلمین ع پر کھڑے زبر کے ساتھ، اور بالغداۃ کو بالغدٰوۃ واؤ اور دال پر کھڑے زبر کے ساتھ لکھا گیا ہے، یہ رسم الخط بھی لکھے بغیر محفوظ نہیں رکھا جا سکتا۔

۳- جب قرآن کریم کا نزول شروع ہوا تو سات طرح سے قرآن پڑھنے کی اجازت تھی، أُنْزِلَ القرآن علی سبعة

أحرف: اور سات کا عدد عربی میں تکثیر کے لئے ہے، حصر کے لئے نہیں، لیکن قرآن نازل ہوا تھا قریش کی لغت میں، موجودہ قرآن لغت قریش ہی کے مطابق لکھا ہوا ہے، مگر اس کو مختلف طرح سے پڑھنے کی اجازت دو وجہ سے تھی:

پہلی وجہ: بڑی عمر کے لوگ اپنی مادری زبان کی کتاب کو معنی کی رعایت کے ساتھ یاد تو کر سکتے ہیں مگر ان کے لئے بعینہ رٹنا دشوار ہوتا ہے، اس لئے شروع اسلام میں معنی کی حفاظت کرتے ہوئے الفاظ بدل کر پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی۔

مثلاً سورۃ الفرقان کی پہلی آیت ہے: ﴿تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا﴾ اس میں اگر کوئی تبارك کی جگہ تعالیٰ پڑھے تو جائز ہے، کیونکہ دونوں کے معنی ایک ہیں، اور نَزَّلَ کی جگہ أَنْزَلَ الفرقان کی جگہ القرآن، علی عبدہ کی جگہ علی محمد اور نذیراً کی جگہ بشیراً پڑھے تو جائز ہے، کیونکہ قرآن کے پہلے مخاطب اہل لسان اور عمر رسیدہ لوگ تھے، بچوں کی طرح رٹنا ان کے بس میں نہیں تھا اس لئے معنی کی رعایت کے ساتھ بعض الفاظ کو بدل کر پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی، مگر یہ عارضی رخصت تھی۔

بخاری شریف میں یہ واقعہ ہے کہ حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ نماز میں سورۃ الفرقان پڑھ رہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنا تو وہ کچھ کا کچھ پڑھ رہے تھے، ان کو غصہ آیا، جب حضرت ہشامؓ نے نماز پوری کی تو حضرت عمرؓ نے ان کو گریبان سے پکڑا اور حضور ﷺ کے پاس لے گئے اور کہا: یارسول اللہ! یہ شخص سورۃ الفرقان غلط پڑھ رہا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: ان کو چھوڑ دو، پھر حضرت ہشامؓ سے فرمایا: پڑھو، انھوں نے ویسا ہی پڑھا جیسا حضرت عمرؓ نے سنا تھا۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ھکذا أُنزلت: سورۃ الفرقان اسی طرح اتاری گئی ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اب تم پڑھو، انھوں نے جس طرح حضور ﷺ نے ان کو پڑھایا تھا پڑھا آپؐ نے فرمایا: ھکذا أُنزلت: سورۃ الفرقان اسی طرح اتاری گئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حیرت میں پڑ گئے کہ دونوں طرح ٹھیک کیسے ہوسکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: أُنزل القرآن علی سبعة أحرف: قرآنِ کریم سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، پس جس کے لئے جو آسان ہو اس طرح پڑھے (بخاری ۴۹۹۲) اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ معنی کی رعایت کے ساتھ الفاظ کی تبدیلی جائز تھی۔

دوسری وجہ: بعض قبائل الف لام تعریف کی جگہ میم استعمال کرتے تھے، وہ رب العالمین کو رب مَعالمین پڑھ سکتے تھے، مگر اس طرح لکھنا جائز نہیں تھا، جیسے بعض ممالک کے لوگ آج بھی جیم ادا نہیں کر سکتے وہ گاف پڑھتے ہیں، وہ وِجْهَة کو وِگهة پڑھتے ہیں مگر اس طرح لکھنا جائز نہیں، پس اگر تمام قبائل اپنے اپنے قاعدوں کے مطابق پڑھیں گے اور قرآن لکھا ہوا نہ ہوگا تو اصل لفظ کیا ہے؟ اس کی حفاظت کیسے ہوگی؟ ان دو دشواریوں کی وجہ سے نزول کے ساتھ ہی قرآن لکھوایا گیا تھا، کچھ حفاظت ہی کے لئے نہیں لکھا گیا تھا۔

قرآن سرکاری ریکارڈ میں نہیں رکھا گیا:

اور اس کی دلیل کہ قرآن کا لکھنا حفاظت کے لئے نہیں تھا بلکہ اور مقاصد کے لئے تھا: یہ ہے کہ جب قرآن کی کوئی

آیت نازل ہوتی تو کاتبین وحی کو بلا کر لکھوالیا جاتا، اور لکھا ہوا کاتبوں کے پاس رہتا۔ حضور ﷺ کے گھر میں نہیں رہتا تھا، پھر جب کوئی نئی وحی آتی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام بتلاتے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد لکھا جائے، اس طرح جب کوئی سورت مکمل ہوجاتی تو کاتبین پوری سورت کسی ایک جگہ لکھ لیتے اور آنحضور ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے۔ آپؐ ملاحظہ فرماتے اور صحابہ میں سے جو مانگتا اسے دیدیتے، لکھا ہوا نہ کاتبین کے پاس رہتا تھا نہ حضور ﷺ کے پاس۔

آنحضور ﷺ جہاں اللہ کے رسول تھے، امیر المؤمنین بھی تھے، یعنی اسلامی حکومت کے سربراہ بھی تھے، اگر حضور ﷺ کے گھر میں لکھا ہوا قرآن رہتا تو اس کو سرکاری ریکارڈ میں رکھنا کہتے۔ مگر مشیت ایزدی یہ تھی کہ قرآن سرکاری ریکارڈ میں نہ رہے، کیونکہ جو چیز سرکاری ریکارڈ میں ہوتی ہے اس کی حفاظت کی ذمہ داری سرکار کی ہوتی ہے، پبلک کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی، اور حکومتیں بدلتی رہتی ہیں اور ریکارڈ ضائع بھی ہوجاتے ہیں اس لئے اگر قرآن سرکاری ریکارڈ میں رہتا تو محفوظ نہ رہتا، چنانچہ عام لوگوں کو قرآن سونپ دیا گیا۔ قرآن انہی کی طرف اتارا گیا ہے اور انہی کو اس کی حفاظت کرنی ہے، اللہ کی گذشتہ کتابوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا، وہ کتابیں بھی لوگوں کو سونپ دی گئی تھیں مگر انھوں نے اللہ کی کتابوں کی حفاظت نہ کی اور مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ اس کی حفاظت کی بلکہ اس کو عزیز از جان رکھا۔

قرآن نبی ﷺ کی معرفت لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے:

قرآنِ کریم صرف نبی ﷺ کی طرف نازل نہیں کیا گیا، بلکہ لوگوں کی طرف نازل کیا گیا ہے، البتہ نبی ﷺ کی معرفت آیا ہے، سورۃ النحل میں ہے: ﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ یہ قرآن لوگوں کی طرف آپؐ کی معرفت اس لئے اتارا گیا ہے کہ آپؐ ان کے لئے قرآن کی تشریح کریں، ان کو قرآن سمجھائیں ورنہ درحقیقت قرآن لوگوں کی طرف اتارا گیا ہے، قرآن ﴿هُدًى لِلنَّاسِ﴾ ہے، جب لوگوں کی طرف اتارا گیا ہے تو اس کی حفاظت بھی لوگوں کو کرنی ہے، حکومت کی ذمہ داری نہیں۔ اگر حضور ﷺ لکھا ہوا قرآن اپنے گھر میں رکھتے تو حفاظت کی ذمہ داری گورنمنٹ کی ہوجاتی، اس لئے حضور ﷺ نے لکھا ہوا قرآن اپنے پاس محفوظ نہیں رکھا، بلکہ لوگوں کو سونپ دیا، یہ دلیل ہے کہ قرآن کا لکھوانا حفاظت کے لئے نہیں تھا، اگر حفاظت کے لئے لکھوایا ہوتا تو لکھا ہوا آپؐ کے گھر میں رہتا، یا کم از کم کاتبین وحی کے پاس رہتا، جبکہ ایسا نہیں کیا گیا۔

مذکورہ بالا تفصیل یہ بات سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ قرآنِ کریم کی حفاظت بھی حفظ کے ذریعہ سے ہوئی ہے اور حدیثوں کی حفاظت بھی حفظ کے ذریعہ سے ہوئی ہے۔ صحابہ جو کچھ سنتے تھے یاد کرتے تھے پھر آپس میں مذاکرہ کرتے تھے، اصاغر: اکابر کو سناتے تھے اور بعض حضرات نبی ﷺ کو سناتے تھے، بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک صحابی کو نبی ﷺ نے ایک دعا سکھائی، انھوں نے یاد کرکے آپؐ کو سنائی اور وبنبیك الذی أرسلت کی جگہ برسولك الذی

أرسلت پڑھا تو آپؐ نے ٹوکا اور فرمایا: بنبیك الذی أرسلت (بخاری حدیث ۲۴۷) اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ حدیثیں یاد کرکے آنحضور ﷺ کو سناتے تھے۔

غرض جس طرح صحابہ قرآن کو یاد کرتے تھے، حدیثوں کو بھی یاد کرتے تھے، پس اہل قرآن کا یہ وسوسہ کہ جس طرح قرآن کی حفاظت لکھ کر کی گئی ہے، حدیثوں کی حفاظت لکھ کر کیوں نہ کی گئی؟ یہ محض وسوسہ ہے دلیل نہیں۔ قرآن کی حفاظت بھی حفظ کے ذریعہ ہوئی ہے اور حدیثوں کی بھی۔ دونوں مصادر شرعیہ کی ایک ہی طرح حفاظت کی گئی ہے۔

سوال: یہ بات تو واضح ہوگئی کہ قرآن وحدیث کی حفاظت حفظ کے ذریعہ کی گئی، اور قرآن جو لکھا گیا تھا وہ دو مقاصد سے لکھا گیا تھا، حفاظت کے مقصد سے نہیں لکھا گیا تھا، مگر سوال یہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے حدیثیں لکھنے سے منع کیوں کیا؟

جواب: قرآن صحابہ کے گھروں میں بکھرا ہوا تھا، کوئی سورت کسی کے پاس تھی اور کوئی کسی کے پاس، اور آئندہ قرآن کا جمع کرنا مقدر تھا، اس وقت اصل تحریروں کی ضرورت پیش آئے گی، پس اگر صحابہ کے گھروں میں قرآن بھی لکھا ہوا ہوتا اور حدیثیں بھی تو اشتباہ کا اندیشہ تھا، اس لئے نبی ﷺ نے عمومی طور پر حدیثیں لکھنے سے منع فرمایا تاکہ جب جمع قرآن کا موقع آئے تو اشتباہ کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔

اور جو خاص مواقع میں حدیثیں لکھی گئیں ان میں اشتباہ کا اندیشہ نہیں تھا، کیونکہ ان کے عناوین میں اشارہ تھا کہ وہ قرآن نہیں ہیں، حدیثیں ہیں، جیسے حدیبیہ میں معاہدہ لکھا گیا هذا ماقاضٰی علیه محمد رسول الله إلخ یہ عنوان خود بولے گا کہ یہ قرآن نہیں ہے، صلح نامہ ہے، اسی طرح خطوط میں من محمد إلی کسری، من محمد إلی هرقل لکھا گیا تھا، اس میں صاف اشارہ تھا کہ یہ قرآن نہیں ہے، حدیثیں ہیں۔ اور ابوشاہؓ کے لئے مکہ کا جو خطبہ لکھا گیا تھا، اس کے شروع میں کاتب لکھے گا: هذا ما خَطَب رسول الله صلی الله علیه وسلم یومَ فتح مكة: اس سے سمجھ میں آجائے گا کہ یہ حدیث ہے قرآن نہیں، اسی طرح کوئی خاص شخص ایسا ہوسکتا ہے جو حدیثوں کو قرآن سے الگ رکھے، جیسے حضرت عبداللہ۔ غرض حدیثیں عام طور پر لکھنے کی اجازت ہوتی تو ہر شخص حدیثیں لکھ کر اپنے گھر میں رکھتا، اور اسی گھر میں قرآن بھی ہوتا تو اشتباہ کا اندیشہ تھا، اس لئے آنحضور ﷺ نے عمومی طور پر حدیثیں لکھنے سے منع فرمایا، اور خاص مواقع میں حدیثیں لکھی گئیں اور خاص آدمیوں کو اجازت دی۔

سوال: جب قرآن کی حفاظت کا مدار روز اول سے آج تک حفظ پر ہے تو حدیثوں کی حفاظت کا مدار آج تک حفظ پر کیوں نہیں؟ سو سال کے بعد حدیثوں کو مدون کیوں کیا گیا؟

جواب: عرصہ گذرنے کے بعد حدیثوں میں کچھ ایسی نئی باتیں پیدا ہوئیں کہ تدوین ناگزیر ہوگئی، اور ایسی باتیں قرآن میں آج تک پیدا نہیں ہوئیں، مثلاً:

جب کبار صحابہ کا دور گذر گیا اور صغار صحابہ کا دور شروع ہوا تو انھوں نے حدیثوں میں سند کا اضافہ کیا کیونکہ کچھ لوگوں

نے حدیثیں گڑھنے کا کاروبار شروع کر دیا تھا، اس لئے صحیح حدیثوں کو گھڑی ہوئی حدیثوں سے جدا کرنے کے لئے سند ناگزیر ہوگئی، مقدمۂ مسلم میں محمد بن سیرین رحمہ اللہ کا قول ہے کہ سلف یعنی صحابہ اسناد کا مطالبہ نہیں کرتے تھے، مگر جب فتنہ واقع ہوا یعنی گمراہ فرقے وجود میں آئے تو انھوں نے کہا: سَمُّوْا لنا رجالکم: حدیث کی سند بیان کرو تاکہ دیکھا جائے کہ راوی ٹھیک ہے تو اس کی روایت لی جائے، اور اگر راوی گمراہ فرقے سے تعلق رکھتا ہے تو اس کی روایت نہ لی جائے، نیز مقدمہ مسلم ہی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ جب لوگ ہر طرح کی سواری پر سوار ہونے لگے تو ہم نے ہر طرح کے راویوں سے حدیث لینا چھوڑ دیا۔

اسناد کا یہ سلسلہ دن بدن بڑھتا رہا اور متن کا یاد رکھنا تو آسان ہے مگر راویوں کی معرفت کے بغیر اسناد کا یاد رکھنا مشکل ہے، اور زمانہ اتنی تیزی سے گذرتا ہے کہ پچاس سال میں تین نسلیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ پس غور کریں: اگر آج تک سندوں کا سلسلہ جاری ہوتا تو ایک ہلہ والی حدیث جیسے: إنما الأعمال بالنيات اس کی سند دسیوں لائن میں ہوتی، سوچو، رواۃ اس بارگراں کو کیسے اٹھاتے؟ اس لئے تدوین حدیث ضروری ہوگئی۔

علاوہ ازیں: علم کے جو اصل حامل تھے یعنی عرب ان کا حافظہ تو بے مثال تھا لیکن پہلی صدی گذرتے گذرتے علم حدیث کے حامل عجمی بن گئے، عرب برائے نام رہ گئے، تاریخ میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ جب حج سے واپس آئے تو عبد الملک بن مروان سے ان کی ملاقات ہوئی، اس زمانہ میں حج میں علماء خاص طور سے آتے تھے تاکہ دوسرے علماء سے استفادہ کریں۔ عبد الملک نے امام زہری سے پوچھا: مکہ میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ امام زہریؒ نے کہا: حضرت طاؤس، اس نے پوچھا: کیا وہ عرب ہیں یا آزاد کردہ؟ زہریؒ نے کہا: وہ آزاد کردہ ہیں، یعنی عجمی ہیں، پھر اس نے اور مختلف شہروں کے نام لئے کہ وہاں بڑا عالم کون ہے؟ اور وہ عرب ہیں یا عجمی؟ سب جگہ بڑے عالم موالی اور عجمی تھے، آخر میں اس نے کوفہ کے بارے میں پوچھا، امام زہریؒ نے کہا: وہاں کے بڑے عالم ابراہیم نخعی ہیں اور وہ عرب ہیں، یہ سن کر عبد الملک نے ٹھنڈی سانس لی، اور کہا: قریب تھا میں کہ میری جان نکل جاتی اچھا کیا تم نے جو ایک عرب کا نام لیا کہاں گئے عرب؟ جو علم عجمیوں کے پاس چلا گیا! ان وجوہ سے تدوین حدیث ناگزیر ہوگئی۔

جمع قرآن کی تاریخ

آنحضور ﷺ کے بعد جنگ یمامہ میں جب متعدد حفاظ شہید ہوگئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ قرآن کو سرکاری ریکارڈ میں لے لیا جائے تاکہ اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ ختم ہوجائے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا: میں وہ کام کیسے کروں جو نبی ﷺ نے نہیں کیا؟ حضرت عمرؓ نے کہا: بخدا! یہ کام اچھا ہے۔ اس طرح دونوں بزرگوں کے درمیان تبادلۂ خیال ہوتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے صدیق اکبرؓ کا سینہ کھول دیا، ان کو شرح صدر ہوگیا، پھر دونوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کا کام سونپا، ابتداءً حضرت

زید نے بھی وہی بات کہی جو حضرت ابوبکرؓ نے کہی تھی، لیکن دونوں حضرات کے سمجھانے پر ان کا بھی شرح صدر ہو گیا۔

پھر اعلان کیا گیا کہ جس کے پاس قرآن کی اصل تحریر ہے، جو نبی ﷺ کے ملاحظہ سے گذر چکی ہے اور اس کے اصلی ہونے پر دو گواہ بھی موجود ہیں ایسی تحریریں لائی جائیں، جب اصل تحریریں جمع ہوگئیں تو پہلے حافظوں کے حفظ سے مقابلہ کیا گیا، جب اطمینان ہو گیا تو حضرت زیدؓ نے اس کو مختلف چیزوں پر نقل کیا اور اس کو ایک تھیلے میں بھر کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سونپ دیا، اس طرح قرآن کریم سرکاری ریکارڈ (حفاظت) میں لے لیا گیا، اور وہ اصلی تحریریں جن لوگوں سے حاصل کی گئی تھیں ان کو واپس کر دی گئیں کیونکہ وہ امانت تھیں۔

پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں قرآن میں اختلاف ہوا تو انھوں نے دوبارہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بنائی اور قرآن کو لغت قریش کے مطابق لکھوا کر پانچ مصاحف تیار کرائے، اور ایک مصحف مدینہ منورہ میں رکھا اور باقی مصاحف مختلف شہروں میں بھیج دیئے اور حکم دیا کہ اب مسلمان اسی قرآن سے نقلیں لیں، نیز یہ بھی حکم بھیجا کہ لوگوں نے جو مختلف طرح سے قرآن لکھے ہیں وہ پایۂ تخت بھیج دیئے جائیں۔ جب سب قرآن آگئے تو حضرت عثمانؓ نے ان کو جلوا دیا، اس طرح حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو موجودہ قرآن پر جمع کر دیا۔ اور جو قرآن سرکاری ریکارڈ میں لیا گیا تھا وہ دوبارہ مسلمانوں کو سونپ دیا (تفصیل کے لئے دیکھئے تحفۃ الألمعی ۱:۶۱-۶۵)

حضرت عمرؓ نے حدیثیں جمع کرنے کا ارادہ کیا مگر اشارہ نہ پایا:

غرض سب سے پہلے قرآن جمع کرنے کا خیال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آیا، اور ان کے مشورہ سے قرآن جمع کیا گیا، اسی طرح حدیثیں جمع کرنے کا خیال بھی سب سے پہلے حضرت عمرؓ کو آیا، انھوں نے اپنے دور خلافت میں احادیث جمع کرنے کا یعنی ان کو سرکاری ریکارڈ میں لینے کا ارادہ کیا تاکہ حدیثیں ضائع نہ ہوں نہ ان میں گڑبڑ ہو سکے۔ چنانچہ آپؓ نے مشورہ کے لئے صحابہ کو جمع کیا اور ان کے سامنے اپنا خیال ظاہر کیا، تمام صحابہ نے تائید کی مگر آپؓ کو شرح صدر نہ ہوا۔ آپؓ نے استخارہ شروع کیا اور ایک ماہ تک مسلسل استخارہ کرتے رہے، اس کے بعد شرح صدر ہوا کہ حدیثوں کو مدون نہیں کرنا چاہئے، چنانچہ آپؓ نے پھر صحابہ کو جمع کیا اور فرمایا: مجھے یاد آیا: گذشتہ امتوں نے جو اللہ کی کتابیں ضائع کیں تو اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کی باتیں بھی لکھ لیں، پھر وہ ان میں ایسے مشغول ہوئے کہ اللہ کی کتابوں سے ان کی توجہ ہٹ گئی اور وہ ضائع ہوگئیں، پس بخدا! میں اللہ کی کتاب کے ساتھ کسی چیز کو نہیں رلاؤں گا۔

(جامع بیان العلم ۱:۶۷، السنة ومكانتها في التشريع الإسلامي ص:۱۲۱)

تدوین حدیث کا سہرا حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے سر بندھا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد تدوین حدیث کا کسی کو خیال نہیں آیا، یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ

خلیفہ بنے ــــ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ پہلی صدی کے ختم پر خلیفہ بنے ہیں۔ آپ کا حضرت عمرؓ سے ماں کی طرف سے رشتہ ہے، آپ کی نانی حضرت عمرؓ کی پوتی تھی ــــ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے سوچا کہ اکثر صحابہ گذر چکے ہیں، اور حدیثوں کے ساتھ سندوں کا اضافہ ہو گیا ہے، اور حدیثیں گڑھنے کا رواج بھی شروع ہو چکا ہے۔ پس اگر سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تو آئندہ بہت دشواری پیش آئے گی اس لئے آپ کے ذہن میں احادیث مدون کرنے کا خیال آیا۔ آپ نے مدینہ منورہ کے گورنر اور قاضی ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ مدینہ میں جو حدیثیں اساتذہ بیان کرتے ہیں ان کو لکھ کر میرے پاس بھیج دو، کیونکہ مجھے علم کے مٹنے کا اور علماء کے ختم ہونے کا اندیشہ ہے، خاص طور پر عبدالرحمٰن بن اسعد بن زرارہؓ کی بیٹی عمرہ (متوفیہ سنہ ۹۸ھ) اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پوتے قاسم (متوفی سنہ ۱۲۰ھ) کی حدیثیں جو وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں لکھ کر بھیجو، یہی حکم آپ نے تمام گورنروں کے نام لکھا کہ آپ حضرات کے علاقوں میں جو حدیثیں بیان کی جاتی ہیں وہ سب لکھ کر میرے پاس بھیجو، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا پروگرام یہ تھا کہ جب سب جگہ سے حدیثیں آجائیں گی تو امام زہری ان کو مرتب کریں گے۔ پھر وہ سرکاری ریکارڈ میں محفوظ کر لی جائیں گی، گورنروں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا والا نامہ علماء کو دکھایا اور یہ کام ان کے سپرد کیا، چنانچہ علماء نے کام شروع کر دیا، ابھی حدیثیں جمع ہو کر پایۂ تخت کو نہیں پہنچی تھیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا انتقال ہو گیا، ان کے بعد ولید خلیفہ بنا، ولید کو اس کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لئے وہ آڈر گیا گذرا ہو گیا، مگر علماء نے جو کام شروع کیا تھا وہ چلتا رہا۔ اس طرح تدوینِ حدیث کا آغاز ہوا اور اس کا سہرا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سر بندھا۔

تدوینِ حدیث کے پہلے دور میں علاقہ واری حدیثیں جمع کی گئیں:

تدوینِ حدیث کے پہلے دور میں علماء نے علاقہ واری حدیثیں جمع کیں، مدینہ کے محدثین نے مدینہ کی، بصرہ والوں نے بصرہ کی، کوفہ والوں نے کوفہ کی، یمن والوں نے یمن کی اور شام والوں نے شام کی حدیثیں جمع کیں، اس طرح بہت سی کتابیں وجود میں آگئیں، ان کتابوں میں سے آج صرف امام مالک رحمہ اللہ کی موطا اور امام اعظم رحمہ اللہ کی مسانید موجود ہیں، باقی کتابیں مفقود ہو گئیں۔ تدوینِ حدیث کا یہ پہلا دور دوسری صدی کے نصف اول پر مکمل ہو گیا۔

تدوینِ حدیث کے دوسرے دور میں جوامع لکھی گئیں:

جب تدوینِ حدیث کے پہلے دور میں علاقہ واری حدیثیں جمع کی گئیں تو ضرورت محسوس ہوئی کہ ایسی کتابیں لکھی جائیں جن میں تمام حدیثیں جمع ہوں، کیونکہ مختلف کتابوں میں سے حدیث تلاش کرنا مشکل ہے، اس طرح تدوینِ حدیث کا دوسرا دور شروع ہوا، چنانچہ دوسری صدی کے نصف آخر میں جوامع لکھی گئیں، جیسے جامع سفیان ثوری، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند امام احمد وغیرہ۔ اس دور کے مصنّفین نے پہلے دور کی کتابوں سے حدیثیں نقل نہیں

کیں، بلکہ اسلامی دنیا کی خاک چھانی۔ ہر ہر محدث کے پاس پہنچ کر حدیثیں لیں اور اپنی کتابوں میں درج کیں۔
اس دور کی کتابوں میں صحیح غیر صحیح کا خیال نہیں رکھا گیا، مرفوع غیر مرفوع کا بھی امتیاز نہیں کیا، بلاتفریق سب روایات لے لیں، البتہ پہلے دور کی کتابوں میں امام مالکؒ نے صحیح غیر صحیح کا امتیاز کیا ہے، اور دوسرے دور کی کتابوں میں امام احمدؒ نے صحیح (قابل استدلال) حدیثوں کا انتخاب کیا ہے، اور انھوں نے اپنی مسند میں صرف مرفوع روایات لی ہیں، موقوف اور مقطوع روایات نہیں لیں۔
ملحوظہ: امام احمدؒ کا مُسند تیسرے دور کی کتاب بھی ہوسکتا ہے، اس لئے کہ امام احمد کا انتقال سنہ ۲۴۱ھ میں ہوا ہے، جبکہ تدوین حدیث کا دوسرا دور دوسری صدی پر مکمل ہوگیا ہے، پس اگر مسند احمد کو تیسرے دور کی کتابوں میں شمار کیا جائے تو دوسرے دور کی کتابوں میں کوئی ایسی کتاب نہیں جس میں صحیح اور غیر صحیح کا امتیاز کیا گیا ہو۔

تدوین حدیث کا دوسرا دور مکمل ہونے پر تین نئی باتیں پیدا ہوئیں:

تدوین حدیث کے پہلے دو مرحلوں کی کتابوں میں احادیثِ مرفوعہ، احادیثِ موقوفہ (صحابہ کے اقوال وفتاوی) اور احادیث مقطوعہ (اکابر تابعین کے اقوال وفتاوی) سب لئے گئے ہیں. پھر جب تدوین حدیث کا دوسرا دور مکمل ہوا تو تین نئی باتیں سامنے آئیں:
پہلی بات: یہ خیال پیدا ہوا کہ حدیث کی کتابوں میں صرف نبی ﷺ سے تعلق رکھنے والی باتیں ہی لی جائیں۔ صحابہ اور تابعین کے اقوال وفتاوی کو حدیث کی کتابوں میں نہیں لینا چاہئے، جیسا کہ دور اول میں امام مالکؒ نے عام طور پر اور دور ثانی میں امام احمدؒ نے خاص طور پر ایسا کیا ہے۔
دوسری بات: امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ کے زمانہ تک صحابہ کے فتاوی بھی حجت سمجھے جاتے تھے، ان کی موجودگی میں مجتہد قیاس نہیں کرتا تھا، ان کے اقوال کو لیتا تھا، اور اگر صحابہ میں اختلاف ہوتا تو مجتہد انتخاب کرتا تھا، مگر اب یہ نیا خیال پیدا ہوا کہ هم رجال ونحن رجال: وہ بھی مجتہد ہیں اور ہم بھی مجتہد ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے مذہبِ شافعی کے وجود میں آنے کی جو پانچ بنیادیں بیان کی ہیں ان میں سے چوتھی بنیاد یہی ہے، فرماتے ہیں: امام شافعی رحمہ اللہ کے زمانہ میں صحابہ کے اقوال جمع کیے گئے تو وہ بہت ہوگئے، اور ان میں اختلاف وانتشار پایا گیا اور ان میں سے بہت سے اقوال کو امام شافعیؒ نے صحیح حدیثوں کے خلاف پایا اس لئے امام شافعیؒ نے صحابہ کے اقوال سے تمسک چھوڑ دیا، جب تک کہ وہ کسی بات پر متفق نہ ہوجائیں اور فرمایا کہ وہ بھی آدمی ہیں اور ہم بھی آدمی ہیں، یعنی وہ بھی امت کے مجتہد ہیں اور ہم بھی مجتہد ہیں، اور ایک مجتہد پر دوسرے مجتہد کی اتباع لازم نہیں۔ اور چونکہ تمام محدثین امام شافعیؒ کے بلاواسطہ یا بالواسطہ شاگرد تھے اس لئے اس نئے رجحان سے تمام محدثین متأثر ہوگئے۔
تیسری بات: مرسل روایات حجت ہیں یا نہیں؟ حنفیہ اور مالکیہ مرسل ومنقطع روایات سے بھی استدلال کرتے تھے،

مگر جب حدیثیں تمام طرق سے جمع کی گئیں تو یہ بات سامنے آئی کہ بہت سی مرسل روایتیں بے اصل ہیں، اور بہت سی مرسل روایتیں مسند روایات کے خلاف ہیں، اس لئے امام شافعیؒ نے مرسل روایات سے صرف نظر کی، اور چند مخصوص مراسیل کے علاوہ عام طور پر مرسل روایتوں سے استدلال چھوڑ دیا۔ امام شافعی کے اس خیال سے بھی محدثین متاثر ہوئے۔

ملحوظہ: متقدمین کی اصطلاح میں منقطع، معضل، معلق اور مرسل سبھی پر مرسل کا اطلاق ہوتا تھا، منقطع وہ روایت ہے جس کی سند کے درمیان سے کوئی راوی چھوٹ گیا ہو، پھر اگر مسلسل دو راوی چھوٹ گئے ہوں تو وہ معضل ہے، ورنہ منقطع اور ابتداء سند سے ایک یا زیادہ راوی چھوٹ گئے ہوں تو وہ معلق ہے، اور تابعی کے بعد صحابی کا تذکرہ چھوڑ دیا گیا ہے وہ مرسل اصطلاحی ہے۔

تدوین حدیث کا تیسرا دور اور امور مذکورہ کی رعایت:

تیسری صدی پوری تدوین حدیث کا تیسرا دور ہے، اس دور میں جو کتابیں لکھی گئیں وہی اب پڑھائی جاتی ہیں، اس دور کی کتابوں میں مذکورہ تین باتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں، یعنی اس دور کی کتابوں میں صرف مرفوع حدیثیں لی گئی ہیں، صحابہ کے انفرادی فتاوی نہیں لئے گئے، نہ مرسل روایتیں لی گئیں ہیں، بلکہ امام بخاریؒ نے تو صرف صحیح مرفوع متصل روایتیں ہی لی ہیں، اور امام مسلمؒ نے صحیح کے ساتھ حسن کو بھی لیا ہے، اور ارباب سنن نے ضعیف احادیث بھی لی ہیں، کیونکہ ضعیف اگر حسن لغیرہ بن جائے تو وہ قابل استدلال ہو جاتی ہے۔

کتب ستہ کے مصنّفین کا زمانہ:

غرض دورۂ حدیث میں جتنی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ سب ایک ہی زمانہ کے مصنّفین کی ہیں۔ امام بخاریؒ کا انتقال ۲۵۶ ہجری میں ہوا ہے اور امام مسلمؒ کا ۲۶۱ ہجری میں، امام ابن ماجہؒ کا ۲۷۳ ہجری میں، امام ابوداؤدؒ کا ۲۷۵ ہجری میں، امام ترمذیؒ کا ۲۷۹ ہجری میں اور امام نسائی کا ۳۰۳ ہجری میں انتقال ہوا ہے۔

اور تیسرے دور میں جو تدوین حدیث عمل میں آئی وہ بھی رجال حدیث سے براہ راست روایتیں لے کر کتابوں میں درج کی گئیں، پہلی کتابوں سے نقل نہیں کیں، اس زمانہ میں ایسا کرنا جائز نہیں تھا حتی کہ مجتہدین کے اقوال بھی ان کی کتابوں سے نقل کرنا جائز نہیں تھا۔ رجال سے روایت کرنا ضروری تھا۔

تدوین حدیث کے چوتھے دور میں باقی ماندہ حدیثیں جمع کی گئیں:

پھر تیسرے دور کے مصنّفین نے جو حدیثیں چھوڑ دی تھیں بعد کے محدثین نے ان کو اپنی کتابوں میں درج کیا، اور براہ راست اساتذہ سے حاصل کر کے لکھا، جیسے طبرانی کے معاجم ثلاثہ اور بیہقی کی سنن کبری، تدوین حدیث کے چوتھے

دور کی کتابیں ہیں۔ اب ساری حدیثیں مدون ہوگئیں، آگے پھر تدوین نہیں ہوئی، البتہ حدیث کی مختلف طرح سے خدمت ہوتی رہی اور وہ آج تک جاری ہے۔

خلاصۂ مراد:

پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح قرآن کی حفاظت حفظ کے ذریعہ ہوئی ہے، اسی طرح حدیثوں کی حفاظت بھی حفظ کے ذریعہ ہوئی ہے، مگر قرآن میں تو آج تک کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوئی، جس طرح صحابہ قرآن حفظ کرتے تھے، صحابہ کے بچے بھی حفظ کرتے تھے، اور آج ہم بھی اور ہمارے بچے بھی اسی طرح حفظ کرتے ہیں، لیکن حدیثوں میں کئی نئی باتیں ایسی پیدا ہوگئیں کہ حدیثوں کو منضبط کرنا ضروری ہوگیا۔ مگر حدیثیں سرکاری ریکارڈ میں چلی جائیں یہ اللہ کو منظور نہیں تھا، کیونکہ جو چیز سرکاری ریکارڈ میں چلی جاتی ہے اس کی طرف سے لوگ غافل ہو جاتے ہیں، لوگ اپنی کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے، چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حدیثوں کو سرکاری ریکارڈ میں لینا چاہا مگر اللہ نے اس کو پسند نہیں کیا، اور آزادانہ تدوین حدیث شروع ہوئی، اور چار مرحلوں میں مکمل ہوئی۔

بخاری شریف کے شروع میں وحی کا بیان بطور تمہید ہے

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ایمان کے بیان سے شروع کی ہے، اور کتاب التوحید پر ختم کی ہے، اور شروع میں وحی کا بیان بہ طور تمہید لائے ہیں، یعنی حجیتِ حدیث ثابت کرنے کے لئے وحی کا بیان شروع میں لائے ہیں، جیسے فقہ کی کتابیں نماز کے بیان سے شروع ہوتی ہیں، کیونکہ نماز دین کا بنیادی ستون ہے۔ مگر چونکہ نماز کے لئے طہارت شرط ہے اس لئے فقہاء بہ طور تمہید پہلے طہارت کے مسائل بیان کرتے ہیں، اسی طرح دین نام ہے دو چیزوں کا: عقائد کا اور اعمال کا، عقائد: ایمان کہلاتے ہیں اور اعمال: اسلام کہلاتے ہیں۔ اور چونکہ اعمال کا مدار عقائد پر ہے اس لئے وہ اصل الاصول ہیں۔ اس لئے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح ایمان کے بیان سے شروع کی ہے اور ایمان ہی کے بیان پر ختم کی ہے۔ کتاب التوحید بھی کتاب الایمان ہی ہے، اور اعمال کا تذکرہ بیچ میں لائے ہیں، کیونکہ ایمان اور اعمال میں دو فرق ہیں: ایک: اعمال کے لئے ایمان شرط ہے، اور ایمان کے لئے کوئی چیز شرط نہیں۔ دوسرا: فرق یہ ہے کہ اعمال منقطع ہو جاتے ہیں، مثلاً: نماز شروع کی تو پانچ سات منٹ میں پوری ہوگئی، روزہ شروع کیا غروب شمس پر پورا ہوگیا، مگر ایمان مسلسل چلنے والی حقیقت ہے، ایک لمحہ کا انقطاع بھی گوارا نہیں ﴿لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾: اگر تو ایک لمحہ کے لئے بھی شرک میں مبتلا ہو جائے تو سابقہ تمام اعمال ختم ہو جائیں گے۔

غرض: امام بخاریؒ نے بخاری شریف کتاب الایمان سے شروع کی ہے اور کتاب الایمان ہی پر ختم کی ہے، اور درمیان میں اعمال کا بیان لائے ہیں، اور اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اعمال کے لئے ایمان شرط ہے اور ایمان کا موت

سے اتصال ضروری ہے۔

اور شروع میں وحی کا بیان تمہید کے طور پر لائے ہیں، وہ مقصود نہیں۔ حدیث کی حجیت ثابت کرنے کے لئے یہ مضمون لائے ہیں، اور وحی کے بیان سے ابتداء کر کے حضرت نے منکرین حدیث کا رد کیا ہے، ان سے سوال کریں گے کہ قرآن حجت کیوں ہے؟ وہ یہی جواب دیں گے کہ قرآن وحی ہے اس لئے حجت ہے، پس حدیثیں بھی تو وحی ہیں، پھر وہ حجت کیوں نہیں؟ دونوں وحی جلی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ایک وحی متلو ہے اور ایک غیر متلو، مگر دونوں وحی ہیں اور وحی بھی جلی۔ پھر ایک وحی تو حجت ہو اور دوسری نہ ہو یہ کیا بات ہوئی؟ حدیث کی حجیت پر امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ مختصر مگر نہایت مضبوط استدلال ہے۔

حدیث کے وحی ہونے پر قرآن سے استدلال

حدیث کے وحی ہونے پر قرآن میں متعدد دلیلیں ہیں اور احادیث شریفہ میں بھی دلیلیں ہیں، مگر چونکہ منکرین حدیث صرف قرآن کو حجت مانتے ہیں اس لئے ہمیں قرآن ہی سے دلیل پیش کرنی ہوگی ——— قرآنِ کریم میں متعدد آیات ہیں جو حدیث کے وحی ہونے پر صریح دلیل ہیں۔

پہلی آیت: سورۃ القیامہ میں ہے: ﴿لَاتُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ، إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ، فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ، ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾: ترجمہ: آپؐ قرآن پڑھنے کے لئے اپنی زبان نہ ہلائیں تاکہ جلدی سے اس کو سیکھ لیں، بیشک ہمارے ذمہ اس کو جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہے (آپؐ کی زبان سے) پس جب ہم پڑھیں (فرشتہ کی زبانی) تو آپؐ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں یعنی خاموشی سے سنیں، پھر بیشک ہمارے ذمہ اس کو کھول کر بیان کرنا ہے۔

تفسیر: جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضور ﷺ کو وحی (قرآن) سناتے تھے تو آپؐ زبان سے ان کے ساتھ پڑھتے تھے تاکہ قرآن یاد ہو جائے، اس سے آنحضور ﷺ پر دوہرا بوجھ پڑتا تھا۔ بخاری شریف میں پہلے ہی صفحہ پر حدیث ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب آنحضور ﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپؐ پر اتنا بوجھ پڑتا تھا کہ سخت جاڑے کے زمانے میں آپؐ کے ماتھے سے پسینہ ٹپکنے لگتا تھا، ایک طرف وحی کا بوجھ، دوسری طرف یہ فکر تھی کہ کہیں وحی کا کوئی حصہ یاد ہونے سے رہ نہ جائے، اس لئے آپؐ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ پڑھتے تھے اس لئے اللہ نے منع فرمایا: ﴿لَاتُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾: نہ ہلایئے آپؐ وحی کے ساتھ اپنی زبان کو تاکہ قرآن کو آپؐ جلدی سے لے لیں، یعنی یہ اندیشہ نہ کریں کہ وحی کا کوئی حصہ یاد ہونے سے رہ جائے گا اس لئے کہ: ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾: بیشک ہمارے ذمہ ہے اس وحی کو آپؐ کے دل و دماغ میں جمع کر دینا، پھر اس کو پڑھنا یعنی جو وحی نازل ہوئی ہے اس کو یاد کرانا ہمارے ذمہ ہے، آپؐ کو وہ وحی خود بخود یاد ہو جائے گی، پھر جب آپؐ وہ وحی لوگوں کے سامنے پڑھنا چاہیں گے تو ہم صحیح صحیح پڑھا دیں گے۔

غرض جو اندیشہ تھا اس کو دور کر دیا، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ پڑھ کر بلا وجہ مشقت برداشت کیوں کی جائے؟ ﴿فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾ پس جب ہم اس وحی کو پڑھیں ـــــ یہ التفات ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے پڑھنے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا پڑھنا قرار دیا ہے ـــــ پس آپؐ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں یعنی آپؐ اس وحی کی طرف جو حضرت جبرئیل علیہ السلام پڑھ رہے ہیں متوجہ رہیں ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ پھر اس وحی کو کھولنا اور بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے، یعنی آپؐ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے سوال نہ کریں کہ اس وحی کا کیا مطلب ہے؟ ہم خود اس کا مطلب آپ کو سمجھا دیں گے، چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی پہنچا کر چلے جاتے تھے، حضور ﷺ ان سے کچھ نہیں پوچھتے تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ اس وحی کو کیسے کھولتے تھے؟ اس کی بہت سی شکلیں ہوتی تھیں۔ علماء نے وحی کے تیرہ طریقے بیان کئے ہیں اور وہ بھی استقرائی ہیں یعنی تلاش وجستجو کے بعد اتنے ہی طریقے سامنے آئے ہیں، ان میں حصر نہیں، وحی کے ان کے علاوہ اور بھی طریقے ہوسکتے ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ مختلف طرح سے اس وحی کو یعنی قرآن کریم کو آنحضور ﷺ کے لئے کھولتے تھے۔

یہ جو اللہ نے وحی آپؐ کے لئے کھولی، پھر آپؐ نے اسے سمجھایا یہی حدیثیں ہیں، پس قرآنِ کریم سے حدیثوں کا وحی ہونا ثابت ہوا اس طرح کہ اللہ نے قرآن حضور ﷺ پر کھولا، اور آپؐ نے اپنے الفاظ میں اسے سمجھایا، پس حدیثیں بھی اللہ کی وحی ہیں۔

مثلاً: قرآن میں جگہ جگہ نماز قائم کرنے کا حکم آیا ہے، لیکن ایک جگہ بھی تفصیل نہیں آئی کہ نماز کیا ہے؟ آنحضور ﷺ نے اس کی تفصیل سمجھائی، بلکہ نماز پڑھ کر دکھائی اور فرمایا: صَلّوا کما رأیتمونی أُصلی: جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا اسی طرح نماز پڑھو۔ اسی طرح زکوٰۃ کا جو نظام نبی پاک ﷺ نے بنایا وہ سب حدیثیں زکوٰۃ کی تبیین وتشریح ہیں، اسی طرح حضورؐ نے جو مختلف قتلوں کی دیت مقرر کی وہ ﴿دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ﴾ کی تفصیل ہے۔

بہر حال بے شمار باتیں قرآن میں ایسی ہیں جن پر آنحضور ﷺ کی تبیین وتشریح کے بغیر عمل نہیں کیا جا سکتا، اور یہ تبیین وتشریح خود اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے: ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾: پھر وحی (قرآن) کو کھولنا اور اس کو سمجھانا ہمارے ذمہ ہے، اور اللہ کا سمجھایا ہوا وہی ہے جو حدیثوں میں آیا ہے، پس حدیثیں بھی وحی ہوئیں، بس فرق اتنا ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیثیں غیر متلو۔

دوسری آیت: مشرکین کا ایک اعتراض یہ تھا کہ اللہ کے یہاں کرّوبیوں کی کمی نہیں ـــــ کرّوبی: فارسی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: مقرب فرشتہ ـــــ جب اللہ کو رسول بھیجنا ہی تھا تو کسی فرشتہ کو رسول بنا کر کیوں نہیں بھیجا؟ انسانوں میں سے ایک ایسا انسان جو ہماری طرح کھاتا پیتا ہے، شادی بیاہ کرتا ہے، بازاروں میں گھومتا ہے بلکہ مالی اعتبار سے بے حد تنگ دست بھی ہے، اس کو رسول بنا کر کیوں بھیجا؟ یہ مشرکین کا اعتراض تھا، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں کئی جگہ موقع

کی مناسبت سے اس کا جواب دیا ہے، سورۃ النحل (آیت ۴۳) میں ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالاً نُوحِيْ إِلَيْهِمْ﴾: حضرت آدم علیہ السلام سے سرور کائنات ﷺ تک سنت الٰہی یہی رہی ہے کہ ہمیشہ مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا ہے، کبھی کسی فرشتہ کو رسول بنا کر نہیں بھیجا۔

نبوت بھاری ذمہ داری ہے اس لئے عورتوں کو نبوت سے سرفراز نہیں کیا گیا

یہاں سے معلوم ہوا کہ عورتیں کبھی نبی اور رسول نہیں بنائی گئیں، نبوت سے سرفراز ہمیشہ مرد ہی کئے گئے، اور عورتوں کو یہ منصب اس لئے سپرد نہیں کیا کہ نبوت بھاری ذمہ داری ہے۔ اور عورتوں پر کوئی بھاری ذمہ داری نہیں رکھی گئی، اس لئے کہ وہ صنف نازک ہیں، جیسے کمانا عورتوں کے ذمہ نہیں رکھا گیا، کیونکہ مال حاصل کرنے کے لئے دن بھر دوڑ دھوپ کرنا، مزدوری کرنا، پیٹھ پر بوجھ ڈھونا، مشقت کا کام ہے، عورتوں کے بس کا یہ کام نہیں۔ اسی طرح جہاد عورتوں پر فرض نہیں کیا، کیونکہ میدانِ جنگ میں سورماؤں کا پتہ پانی ہوجاتا ہے۔ اسی طرح نبوت ورسالت بھی بھاری ذمہ داری ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے آنحضور ﷺ تک جن نبیوں کے تذکرے قرآن میں آئے ہیں، ان کو پڑھو، پتہ چلے گا کہ وہ کن کن پریشانیوں سے دوچار ہوئے ہیں۔

علاوہ ازیں: عورت اپنی وضع (نسوانی حالت) برقرار رکھتے ہوئے نبوت و رسالت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی، اس لئے اللہ نے عورتوں کو نبی اور رسول نہیں بنایا۔

اس کی نظیر [1]: حضرت لوط علیہ السلام کے پاس جب فرشتے آئے اور قوم نے بدفعلی کی نیت سے ان کا مطالبہ کیا تو حضرت لوط علیہ السلام پریشان ہوگئے۔ ان کو پتا نہیں تھا کہ یہ فرشتے ہیں، حضرت یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ نوجوان ہیں جو میرے یہاں مہمان آئے ہیں، چنانچہ قوم کے مطالبہ سے پریشان ہوکر حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا: ﴿لَوْ أَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِيْ إِلَى رُكْنٍ شَدِيْدٍ﴾: کاش میرے اندر تم سے نمٹنے کا بل ہوتا، یا میرا کوئی مضبوط جتھا ہوتا (تو میں تمہیں مزہ چکھاتا!)

اس آیت کی تفسیر میں نبی ﷺ نے فرمایا: حضرت لوط علیہ السلام اتنے پریشان ہوگئے تھے کہ ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہر نبی جتھے ہی میں بھیجا (تاکہ آڑے وقت میں قوم کام آئے)

آنحضور ﷺ کا جب بائیکاٹ کیا گیا اور آپؐ شعب ابی طالب میں محصور ہوگئے تو بنو مطلب اور بنو ہاشم نے آخر تک آپؐ کا ساتھ دیا، حالانکہ اس وقت تک وہ سب مسلمان نہیں ہوئے تھے، تین سال تک انھوں نے آنحضور ﷺ

(۱) نظیر وہ ہے جو ممثل لہ کا فرد نہ ہو مگر ممثل لہ کی وضاحت کرے اور مثال ممثل لہ کا فرد ہوتی ہے اور ممثل لہ کی وضاحت کرتی ہے، جیسے کلُّ فاعل مرفوعٌ، نحو أکل زیدٌ: یہ مثال ہے اس لئے کہ یہ ممثل لہ کا فرد ہے۔ اور کلُّ فاعل مرفوع نحو کان اللّٰہُ علیمًا: یہ نظیر ہے اس لئے کہ اللہ جو کان کا اسم ہے وہ مسند الیہ ہے اور فاعل بھی مسند الیہ ہوتا ہے پس یہ نظیر ہوئی۔

کے ساتھ ہر طرح کی مشقت برداشت کی، لیکن آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ بہر حال خاندان اور قبیلہ سہارا بنتا ہے اسی لئے حضرت لوط علیہ السلام نے مضبوط خاندان کی تمنا کی اور اللہ نے بعد میں جتنے بھی نبی مبعوث فرمائے سب جتھے ہی میں مبعوث فرمائے۔

یہ اس بات کی نظیر ہے کہ نبوت ورسالت بھاری ذمہ داری ہے، عورتوں کے لئے اس سے نپٹنا آسان نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا، عورتوں کو رسول بنا کر نہیں بھیجا۔

انبیاء بھی عام انسانوں کی طرح بشر ہیں لیکن ان میں ایک سُرخاب کا پر لگا ہوا ہے!

یہاں ایک سوال ہے کہ انبیاء بھی رجال ہیں اور ہم بھی رجال ہیں، پھر ہم میں اور ان میں فرق کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے: ہم جس کو نبی اور رسول بناتے ہیں اس میں سُرخاب کا پر لگاتے ہیں، وہ سرخاب کا پر تمہارے اندر نہیں ہے، ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالاً نُوْحِيْ إِلَيْهِمْ﴾: ہم جس کو نبی بناتے ہیں اس کی طرف وحی بھیجتے ہیں، یہ سُرخاب کا پر ہے، اب وہ دوسرے رجال کی طرح نہیں رہتے۔ بیشک وہ بشر ہوتے ہیں لیکن دوسرے بشروں کی طرح نہیں ہوتے۔ سورۂ کہف میں ارشاد پاک ہے: ﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوْحَى إِلَيَّ﴾: میں تمہاری طرح بشر ہوں، لیکن میری طرف اللہ تعالیٰ وحی بھیجتے ہیں، یہ میرا امتیاز ہے۔

اور قرآن کے جو مخاطبِ اول تھے یعنی مشرکین مکہ ان کا رسالت ونبوت کے ساتھ عہد بہت دور چلا گیا تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد مشرکین میں کوئی نبی اور رسول مبعوث نہیں ہوا تھا، لیکن جزیرۃ العرب میں بنی اسرائیل رہتے تھے، ان میں یعنی حضرت اسحاق ویعقوب کی اولاد میں نبوت ورسالت کا سلسلہ جاری تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً چھ سو سال پہلے گذرے ہیں، اس لئے قرآن نے کہا: ﴿فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لاَ تَعْلَمُوْنَ﴾: اگر تمہیں یہ بات معلوم نہ ہو کہ ہمیشہ رجال ہی رسول ہوکر آتے رہے ہیں تو اہل کتاب تمہارے درمیان موجود ہیں ان سے پوچھ لو کہ ہمیشہ رسول کون آیا ہے؟ وہ تمہیں بتائیں گے کہ ہمیشہ انسان ہی رسول بن کر آئے ہیں ﴿بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ﴾: جار مجرور کے دو متعلق ہوسکتے ہیں: ایک: أرسلنا اور دوسرا: لاتعلمون۔ پہلی صورت میں یہ ایک سوال کا جواب ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ جب نبی اور رسول ہمارے جیسے انسان ہیں تو وہ ہمیں قائل کیسے کریں گے؟ فرشتہ ہوتا تو کرشمہ دکھاتا اور کرشمے دکھا کر قائل کرتا! اس کا جواب دیا کہ ہم نے ان کو خالی ہاتھ نہیں بھیجا بلکہ ﴿بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ﴾: واضح دلیلوں کے ساتھ اور آسمانی کتابوں کے ساتھ بھیجا ہے، وہ آسمانی کتابوں کے ذریعہ اور ان کی واضح دلیلوں کے ذریعہ لوگوں کو قائل کریں گے۔

اور اگر جار مجرور کا تعلق لاتعلمون سے ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ اگر تمہارے پاس آسمانی کتابوں کا علم نہیں تو اہل کتاب کے پاس کئی آسمانی کتابیں موجود ہیں: تورات، انجیل، زبور، سب ان پر نازل ہوئی ہیں۔ اور دین کی واضح دلیلیں بھی ان

کے پاس موجود ہیں پس ان سے دریافت کرلو کہ کیا کبھی کوئی فرشتہ نبی اور رسول بن کر آیا ہے؟ وہ تمہیں بتائیں گے کہ رسول ہمیشہ مرد ہی آئے ہیں، کبھی کوئی فرشتہ رسول بن کر نہیں آیا۔

اس کے بعد فرمایا: ﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾: اور ہم نے آپ کی طرف الذکر (قرآنِ کریم) نازل کیا، تاکہ آپ لوگوں کو وہ وحی کھول کر سمجھائیں جو لوگوں کی طرف نازل کی گئی ہے، اور تاکہ لوگ بھی سوچیں۔

قرآنِ کریم لوگوں کی طرف اتارا گیا ہے مگر رسول اللہ کی معرفت بھیجا گیا ہے، اگرچہ اللہ کی رحمتیں براہ راست آتی ہیں، واسطہ سے نہیں آتیں، بارش سیدھی برستی ہے اور کھیتی کو سیراب کرتی ہے، ہوا سیدھی ہماری ناک تک پہنچتی ہے، اللہ کی سب نعمتیں سیدھی آتی ہیں۔ پھر دین اور قرآن براہ راست کیوں نہیں آیا؟ درمیان میں رسول اللہ کا واسطہ کیوں ہے؟ اس کا جواب دیا کہ اگر قرآن ہر شخص کے گھر میں لٹکا دیا جاتا تو اس کو کون سمجھاتا؟ اس لئے ہم نے یہ قرآن رسول کی معرفت بھیجا ہے، ورنہ حقیقت میں یہ قرآن لوگوں کی طرف اتارا گیا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی معرفت اس لئے بھیجا ہے کہ وہ لوگوں کو قرآن کھول کر سمجھا دیں۔ آپ ﷺ نے جو قرآن کی تبیین وتشریح کی ہے وہی حدیثیں ہیں، پس حدیثوں کا وحی الٰہی ہونا ثابت ہوگیا۔

احادیث شریفہ میں جو کچھ آیا ہے وہ سب قرآن کریم ہی کی تشریح وتوضیح ہے، اس سے الگ کچھ نہیں، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ وعظ میں یہ حدیث بیان کی: لَعَنَ اللّٰهُ الواصِلَةَ والمُستوصِلَة، والواشِمَةَ والْمُسْتَوْشِمَةَ: اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی اس عورت پر جو بالوں میں دوسرے کے بال ملاتی ہے اور اس عورت پر جو اپنے بالوں میں دوسرے کے بال ملواتی ہے، اور بدن گودنے والی پر اور بدن گدوانے والی پر۔ جب ابن مسعودؓ بیان کرچکے تو ایک عورت نے سوال کیا: آپ ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو ہم قرآن میں نہیں پاتے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے پوچھا: کیا تو نے سارا قرآن پڑھ لیا ہے؟ اس نے کہا: ہاں میں قرآن کی حافظہ ہوں، حضرت نے پوچھا: کیا تو نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی: ﴿مَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾: رسول تمہیں جو کچھ دیں اس کو لے لو، اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ؟ اس عورت نے کہا: ہاں یہ آیت تو قرآن میں ہے۔ حضرتؓ نے فرمایا: یہ حدیث اسی آیت کے ذیل میں آتی ہے (بخاری حدیث ۵۹۳۹)

غرض تمام احادیث شریفہ کسی نہ کسی آیت کی توضیح وتشریح ہیں، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ جب وہ کوئی کتاب شروع کرتے ہیں تو سب سے پہلے آیات لکھتے ہیں، پھر باب قائم کرکے حدیثیں لاتے ہیں، اور اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آگے آنے والی تمام روایات اسی آیت کی تفسیر ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾: اور تاکہ لوگ (بھی) غور کریں، اس میں اجتہاد کی اعتباریت کا بیان ہے،

آنحضور ﷺ نے قیامت تک کے مسائل بیان نہیں فرمائے، کیونکہ مسائل قبل از وقت نہیں سمجھے جاسکتے، اور بغیر سمجھے یاد بھی نہیں رکھے جاسکتے، اس لئے آپؐ نے صرف اپنے زمانے کی ضروریات بیان فرمائی ہیں، پھر آگے قیامت تک پیش آنے والے مسائل مجتہدین امت قرآن وحدیث میں غور کرکے نکالیں گے، اسی کا نام اجتہاد ہے، پس اجتہاد کی اعتباریت ﴿وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ سے ثابت ہوئی۔

تیسری آیت: سورۃ النجم میں ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوْحىٰ﴾: نبی ﷺ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے، آپؐ جو کچھ فرماتے ہیں وہ اللہ کی وحی ہوتی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے، اس آیت کے عموم میں قرآن کے ساتھ احادیث بھی داخل ہیں، کیونکہ تفسیر کا قاعدہ ہے: العِبرةُ لِعمُوم اللفظ لالخصوص المَورِد: اگر آیت کسی خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہو، مگر الفاظ عام ہوں تو حکم عام ہوتا ہے، پس یہ کہنا کہ آیت کا تعلق قرآن سے ہے، یعنی نبی ﷺ جو کلام پیش کررہے ہیں وہ آپؐ کا اپنا کلام نہیں، بلکہ اللہ کا کلام ہے، حدیثوں سے اس آیت کا کچھ تعلق نہیں۔ یہ بات تفسیر کے مذکورہ قاعدہ کے خلاف ہے۔ آیت کے الفاظ عام ہیں تو حکم بھی عام رہے گا۔

﴿إِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ﴾ کا مصداق

جیسے طالب علم سوال کرتے ہیں کہ آیت: ﴿فَاسْعَوْا إِلىٰ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ کا مصداق کونسی اذان ہے؟ پہلی اذان مصداق ہے یا جو اذان خطیب کے سامنے دی جاتی ہے وہ مصداق ہے؟ جواب یہ ہے کہ پہلی اذان صداق ہے، اس پر طلباء اشکال کرتے ہیں کہ پہلی اذان تو آنحضور ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھی، وہ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بڑھائی ہے، وہ آیت کا مصداق کیسے ہوسکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نماز جمعہ کے لئے اذانِ اول ہی سے بلایا جاتا ہے، اذانِ ثانی تو اس بات کی اطلاع کے لئے ہے کہ خطیب آگیا، پس بات چیت اور نماز بند کرو۔ غرض: ﴿إِذَا نُوْدِيَ﴾ کے الفاظ عام ہیں، پس پہلی ہی اذان مصداق ہوگی، کیونکہ تفسیر کا قاعدہ ہے کہ جب نص کے الفاظ عام ہوں تو حکم بھی عام ہوگا، شان نزول کی خصوصیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب مذکورہ آیت نازل ہوئی تو جمعہ کی دو ہی اذانیں تھیں۔ پہلی اذان جو خطیب کے منبر پر آنے کے بعد مسجد نبوی کے دروازے کی چھت پر دی جاتی تھی، وہ دو مقاصد کے لئے تھی۔ ایک غائبین کو بلانے کے لئے، دوم حاضرین کو امام کی آمد کی اطلاع دینے کے لئے، پس یہی اذانِ اول آیت کا مصداق تھی، کیونکہ اسی کے ذریعہ لوگوں کو نماز کے لئے بلایا جاتا تھا۔

پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں مدینہ کی آبادی بڑھ گئی اور پھیل گئی، اور لوگ خطبہ کے دوران بھی آتے رہے، تو آپؓ نے دونوں مقاصد الگ الگ کردیئے، اور ہر مقصد کے لئے الگ اذان مقرر کی۔ غائبین کو بلانے کے لئے خطبہ شروع ہونے سے دس منٹ پہلے (مثلاً) اذان دی جاتی تھی اور زوراء پر دی جاتی تھی، جو کوئی بلند جگہ تھی،

تاکہ آواز دور تک پہنچ جائے، اور دوسری اذان حاضرین کو اطلاع دینے کے لئے مسجد کے اندر امام کے سامنے دی جانے لگی، اب اس کو چھت پر دینے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

غرض: حقیقت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوئی اذان نہیں بڑھائی، پہلے ایک اذان دو مقاصد کے لئے تھی، حضرت عثمانؓ نے دونوں مقاصد کے لئے الگ الگ اذانیں کردیں اور بس۔ پس اب نماز کے لئے پہلی ہی اذان سے بلایا جاتا ہے، اس لئے وہی ﴿نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ﴾ کا مصداق ہے، کیونکہ آیت میں پہلی یا دوسری کی کوئی تخصیص نہیں، آیت کے الفاظ عام ہیں۔

قرآنِ کریم کو بے وضو چھونا جائز نہیں

اسی طرح سورۃ الواقعہ کی آیت ۷۹ ہے: ﴿لَایَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾: نہیں چھوتے لوح محفوظ کو مگر نہایت پاکیزہ بندے۔ اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط کیا گیا ہے کہ بغیر وضو قرآن کو چھونا جائز نہیں۔ مگر غیر مقلدین کے نزدیک جائز ہے، مودودی صاحب کا بھی اسی طرف میلان ہے، وہ کہتے ہیں آیت لوح محفوظ کے بارے میں ہے، ہم کہتے ہیں: آیت کے الفاظ عام ہیں پس حکم بھی عام ہوگا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اوپر سے یہ مضمون چلا آرہا ہے: ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ﴾ میں قسم کھاتا ہوں یعنی دلیل میں پیش کرتا ہوں ایک برج میں ستاروں کے اکٹھا ہونے کی جگہ کو ـــــ جس سال قرآن کا نزول شروع ہوا اس سال سات ستارے ایک برج میں اکٹھا ہوئے تھے، جو نہ کبھی اس سے پہلے اکٹھا ہوئے اور نہ آئندہ کبھی اکٹھا ہونگے ـــــ جب آسمانوں میں ایسا انوکھا واقعہ پیش آیا تو لامحالہ زمین میں بھی کوئی عظیم الشان واقعہ پیش آنا چاہئے، وہ عظیم الشان واقعہ نزول قرآن کا واقعہ تھا ﴿وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ﴾: اور یہ بہت بڑی دلیل ہے اگر تم بوجھو! جب سے کائنات شروع ہوئی ہے کبھی وہ ستارے ایک جگہ اکٹھا نہیں ہوئے اور نہ آئندہ ہونگے، اس سے معلوم ہوا کہ زمین میں کوئی عظیم الشان واقعہ پیش آنے والا ہے۔

سوال: کیا علویات کے سفلیات پر اثرات پڑتے ہیں جیسا کہ علم نجوم کہتا ہے؟

جواب: علم نجوم باریک باتوں کا نام ہے، جیسے موت وحیات، نیک بختی اور بدبختی، ان کو تو شریعت نے سند نہیں دی، مگر موٹی موٹی باتیں تو شریعت مانتی ہے، جیسے دن، رات، صبح، دوپہر اور شام کا تعلق سورج سے ہے۔ یہ علویات ہی کے اثرات سفلیات پر پڑرہے ہیں، ایسے واضح اثرات شریعت مانتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں فرمایا ہے کہ علویات کے جو سفلیات پر موٹے موٹے اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا شریعت انکار نہیں کرتی۔

یہ کس بات کی دلیل ہے؟ ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ﴾ اس بات کی کہ قرآن باعزت پڑھنے کی کتاب ہے، یہ دعوی ہے اس

پر مذکورہ دلیل قائم کی ہے ﴿فِیْ كِتَابٍ مَّكْنُوْنٍ﴾ وہ قرآن چھپا کر رکھی ہوئی کتاب میں ہے۔ یعنی لوح محفوظ میں ہے، وہاں سے زمین پر اتارا گیا ہے۔ اور لوح محفوظ کہاں ہے؟ ﴿لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ اس کو نہایت پاکیزہ بندوں کے سوا کوئی نہیں چھوتا یعنی وہاں تک فرشتوں ہی کی پہنچ ہے۔ شیاطین وہاں نہیں پہنچ سکتے، جب شیاطین وہاں پہنچ ہی نہیں سکتے تو وہ قرآن میں کیا گڑبڑ کر سکتے ہیں؟ ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾: سارے جہانوں کے پالنہار نے اس کو نازل کیا ہے۔

غرض آیت لوح محفوظ سے متعلق ہے، اس کے باوجود چاروں ائمہ نے اس سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ بے وضو قرآنِ کریم کو ہاتھ لگانا جائز نہیں، صحابہ کے زمانہ سے یہ مسئلہ اس آیت سے سمجھا جا تا رہا ہے۔ اور صرف صحابہ ہی نہیں صحابیات بھی یہ مسئلہ اسی آیت سے اخذ کرتی تھیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کے واقعہ میں ہے کہ جب وہ اپنی بہن کے گھر پہنچے اور بہنوئی اور بہن کی پٹائی کی اور بہن کے چہرے پر خون دیکھا تو انھیں ندامت ہوئی، اور انھوں نے کہا: تم کیا پڑھ رہے تھے لاؤ مجھے دو، بہن نے کہا: تم ناپاک ہو، اُس کتاب کو صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ غسل کرو پھر دونگی، چنانچہ حضرت عمرؓ نے غسل کیا پھر سورۂ طٰہ ان کو دی گئی جس کو انھوں نے پڑھا اور ان کے دل کی کایا پلٹ گئی۔

اور یہ مسئلہ اس آیت سے اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ آیت کا شانِ نزول (مورِد) اگر چہ خاص ہے یعنی آیت لوح محفوظ کے بارے میں ہے مگر اس میں دو عام الفاظ ہیں: ایک: لَايَصِلُ إليه کے بجائے لَايَمَسُّهُ کہا گیا ہے۔ دوسرا: الملائكة کے بجائے المطهّرون فرمایا گیا ہے، اب آیت کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں کہ لوح محفوظ ایسی جگہ ہے جہاں فرشتوں کے علاوہ کسی کی پہنچ نہیں، بلکہ الفاظ کے عموم تک مسئلہ ثابت کیا جائے گا۔ یعنی پاک بندے (باوضو) ہی اس کو چھو سکتے ہیں بے وضو نہیں چھو سکتے، یہی ائمہ اربعہ کی متفقہ رائے ہے۔

فائدہ: قرآنِ کریم میں جہاں بھی غیر اللہ کی قسم کھائی ہے واوِ قسمیہ کے ذریعہ کھائی ہے، یا لام کے ذریعہ کھائی ہے، باء کے ذریعہ کسی جگہ قسم نہیں کھائی، اور اُن قسموں میں اس دعوے کی دلیل ہوتی ہے جو آگے صراحتاً آتا ہے یا مضمون سے منتزع کیا جاتا ہے، یعنی وہ صرف صورتاً قسم ہوتی ہے حقیقتاً قسم نہیں ہوتی، اس لئے کہ غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں۔ اور اگر کہیں فعل قسم استعمال کیا ہے تو لا زائدہ بڑھا کر قسم کھائی ہے، جیسے کشتی چلانے والے کو اردو میں ''ناخدا'' کہتے ہیں، یہ 'نا' اس لئے بڑھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشابہت ختم ہو جائے، اسی طرح لفظ قسم کے ساتھ لا زائدہ بڑھاتے ہیں تا کہ غیر اللہ کی قسم نہ رہے جو حرام ہے (فائدہ ختم ہوا)

غرض میں یہ بتلا رہا تھا کہ اگر کوئی کہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ کا سیاق وسباق اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ آیات وحی متلو (قرآن کریم) کے ساتھ خاص ہیں، کیونکہ آگے ارشاد ہے: ﴿عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى، ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى، وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلٰى﴾: ان کو ایک فرشتہ تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقت ور ہے، زور آور ہے، پھر وہ فرشتہ اپنی اصل شکل میں نمودار ہوا ایسی حالت میں کہ وہ آسمان کے بلند کنارے پر تھا۔

اور شانِ نزول کی روایات میں ہے کہ یہ سورۃ المدثر کے نزول کا واقعہ ہے، اس موقع پر حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنی اصل صورت میں نمودار ہوئے تھے، اور اس سورت کی ابتدائی آیات وحی کی تھیں پس اس آیت سے حدیث کی حجیت پر استدلال کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ آیات تو وحی متلو (قرآن کی وحی) کے ساتھ خاص ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مورِد (شانِ نزول) اگرچہ خاص ہے مگر آیت کے الفاظ عام ہیں، اور ایسی صورت میں خاص شان نزول کا اعتبار نہیں ہوتا، بلکہ الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے۔

اور آیت عام اس طرح ہے کہ وما یتلو کے بجائے وما ینطق فرمایا ہے، یہ الفاظ عام ہیں، یعنی رسول اللہ ﷺ جو بھی بولیں وہ وحی ہے۔ بولنا عام ہے، خواہ قرآن کے الفاظ تلاوت کریں خواہ اس کی تبیین وتشریح کریں، سب وحی ہیں، پس ثابت ہوا کہ قرآن کی طرح احادیث بھی وحی ہیں۔

حدیث کے وحی ہونے کا طریقہ کیا تھا؟

قرآنِ کریم کی وحی کا جو طریقہ تھا وہ حدیث کی وحی کا نہیں تھا، بلکہ جب قرآن میں کوئی حکم نازل ہوتا تو اس کی پوری حقیقت آنحضور ﷺ کو سمجھادی جاتی، پھر موقع بہ موقع آپؐ اس حکم کی تفصیلات امت کے سامنے بیان کرتے، مثلاً سورۃ الاعراف (آیت ۱۵۷) میں ارشاد پاک ہے: ﴿يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ، وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾: آپؐ لوگوں کو نیک باتوں کا حکم دیتے ہیں اور ناجائز باتوں سے روکتے ہیں۔ اور پاکیزہ چیزوں کی ان کے لئے حلت بیان کرتے ہیں، اور گندی چیزوں کی ان پر حرمت واضح کرتے ہیں اور لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو ان سے دور کرتے ہیں۔

اس آیت میں نبی ﷺ کے پانچ فرائض منصبی بیان کئے گئے ہیں، آیت کے نزول کے ساتھ ہی آپؐ کو پانچوں باتوں کی حقیقت سمجھادی گئی۔ معروف کیا ہے اور منکر کیا ہے؟ طیب کی حقیقت کیا ہے اور خبیث کی کیا ہے؟ اور بوجھ اور طوق کس قسم کی چیزیں ہیں؟ پھر پوری زندگی آپؐ اس خداداد علم کے ذریعہ احکام کی تشریح کرتے رہے، احادیث کی وحی کا یہی طریقہ تھا۔

وحی کی تین صورتیں:

پہلی صورت: یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا کلام لے کر آتے، اور نبی ﷺ کے سامنے اس کی تلاوت کرتے، وحی کے الفاظ آپؐ کے دل ودماغ میں محفوظ ہوجاتے، پھر آپؐ اس وحی کی صحابہ کے سامنے تلاوت کرتے اور کاتبین وحی میں سے جو موجود ہوتا اس کو بلا کر لکھوالیتے، اس وحی میں نہ جبرئیل علیہ السلام کا کچھ دخل ہوتا، نہ نبی ﷺ کا، یہ قرآنِ کریم کی وحی کا طریقہ تھا، اور یہ وحی کی سب سے اعلیٰ قسم ہے۔

دوسری صورت: اللہ تعالیٰ کے یہاں سے ایک مفصل مضمون آتا الفاظ نہیں آتے۔ مضمون کا دل میں القاء کیا جاتا، نبی ﷺ اس مضمون کو اپنے الفاظ میں تعبیر کرتے مثلاً کوئی اردو کتاب کسی انگریزی جاننے والے کو دی جائے کہ اس کا ترجمہ کردو تو مترجم کا مضمون میں کوئی دخل نہیں ہوگا، وہ صرف زبان بدلے گا۔ وحی کی یہ صورت حدیث قدسی کہلاتی ہے، حدیث: بایں معنی کہ الفاظ نبی ﷺ کے ہیں اور قدسی: بایں معنی کہ مضمون اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے، حدیث قدسی کی علامت یہ ہے کہ اس کے شروع میں قال الله تبارك وتعالىٰ یاعن الله تبارك وتعالىٰ یا اس کے مانند کوئی جملہ آتا ہے، احادیث قدسیہ دوسو سے کچھ زائد ہیں اور ان میں احکام نہیں، وہ مواعظ ورقاق سے تعلق رکھنے والی روایات ہیں۔

تیسری صورت: تفہیمی وحی ہے یعنی نزول قرآن کے ساتھ حکم خداوندی کی پوری حقیقت نبی ﷺ کو سمجھادی جاتی ہے، پھر آپ اپنی خداداد فہم سے موقع بہ موقع اس کی تفصیل فرماتے ہیں اور اس کی جزئیات بیان کرتے ہیں، جیسے: ﴿أَقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ﴾ کے نزول کے ساتھ ہی اقامتِ صلوٰۃ کا مطلب سمجھادیا یعنی دو باتوں کی پوری تفصیل سمجھادی: ایک: نماز کی حقیقت کیا ہے؟ دوم: اقامت (اہتمام کرنے) کے کیا معنی ہیں؟ پھر مختلف مواقع میں آپ نے دونوں باتوں کی تفصیل کی۔ نماز کے ارکان ستہ کو جوڑ کر اس کی ہیئت کذائی بنائی، اور منبر پر چڑھ کر صحابہ کو نماز پڑھ کر دکھائی، اور نماز کے اہتمام کے لئے مسجدیں بنائیں۔ مکی دور میں اس کا موقع نہیں تھا اس لئے آپ کسی گھر میں نماز ادا فرماتے تھے، ہجرت کے بعد مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی قُبا میں مسجد بنائی، پھر مدینہ منورہ میں مسجد بنائی، پھر جماعت کے لئے بلاوے کا انتظام کیا، اذان کا سلسلہ قائم کیا۔ پھر مدینہ میں محلہ محلہ مسجدیں بنوائیں، جماعت کا نظام بنایا۔ نماز کے ارکان وشرائط بیان کئے، مستحبات ومندوبات سکھلائے، مکروہات وممنوعات سے واقف کیا۔ یہ سب احادیث نبویہ ہیں، حدیث: بایں معنی کہ الفاظ نبی ﷺ کے ہیں اور نبوی: بایں معنی کہ مضمون بھی نبی ﷺ نے پھیلایا ہے، یہ احکام تفصیل سے نازل نہیں ہوئے بالا جمال سمجھائے گئے ہیں۔

جیسے مہتمم صاحب کے پاس ڈاک جمع ہوجاتی ہے تو آپ پیشکار کو بلا کر جوابات سمجھا دیتے ہیں، ایک خط دیتے ہیں اور فرماتے ہیں: جواب لکھ دو: آنا مشکل ہے، دوسرا خط دیتے ہیں اور کہتے ہیں: دعا کرتا ہوں، تیسرا خط دیتے ہیں اور فرماتے ہیں: شکریہ لکھ دو۔ اب پیشکار مفصل جوابات لکھ کر لاتا ہے، مہتمم صاحب اس کو پڑھتے ہیں اور دستخط کرتے ہیں اگر کوئی جواب صحیح نہیں ہوتا یا اس میں کمی ہوتی ہے تو دوبارہ لکھنے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا انبیاء کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔

وحی کی دو قسمیں

علاوہ ازیں وحی کی دو قسمیں ہیں: وحی صریح اور وحی حکمی۔ پھر وحی صریح کی دو قسمیں ہیں: متلو یعنی قرآنِ کریم، اور غیر متلو یعنی احادیث شریفہ۔ اور وحی حکمی پانچ چیزیں ہیں: نبی کا خواب، نبی کا اجتہاد، اجماع امت، صحابہ کا اجتہاد اور مجتہدین کا اجتہاد۔

قرآنِ کریم کا نام وحی متلور کھنے کی وجہ

مَتْلُوّ: اسم مفعول ہے اس کے معنی ہیں: تلاوت کی ہوئی۔ قرآنِ کریم کو وحی متلو اس وجہ سے کہتے ہیں کہ فرشتہ اللہ کے یہاں سے الفاظ لے کر آتا ہے اور نبی پاک ﷺ کے سامنے ان کی تلاوت کرتا ہے۔ پھر نبی ﷺ ان الفاظ کی امت کے سامنے تلاوت کرتے ہیں، اس وحی میں نہ فرشتہ کا کوئی دخل ہوتا ہے نہ نبی ﷺ کا۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نبی ﷺ کے سامنے اور نبی ﷺ نے امت کے سامنے تلاوت کردی تو ان کا عمل مکمل ہوگیا، پھر امت کو نماز میں تلاوت کرنے کا حکم دیا اور نمازوں کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ حصہ تلاوت کرنے کا حکم دیا، اور اس تلاوت کو باعثِ اجر وثواب گردانا، اس لئے اس کا نام وحی متلو رکھا گیا۔

احادیث شریفہ کا نام وحی غیر متلو رکھنے کی وجہ

وحی صریح کی دوسری قسم: وحی غیر متلو ہے، یعنی جس کے الفاظ اللہ کے یہاں سے نہیں آئے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنے الفاظ میں حکم خداوندی پہنچایا یا اللہ تعالیٰ نے قلبِ نبوت میں مضمون الہام فرمایا یا اللہ تعالیٰ نے نبی پاک ﷺ کو جو فہم عطا فرمایا تھا اس سے آپؐ نے قرآنِ کریم سے استنباط کیا۔ یہ سب احادیث ہیں اور ان کا نام وحی غیر متلو ہے، کیونکہ وحی کی اس قسم کی تلاوت مشروع نہیں اس لئے اس کا یہ نام رکھا گیا ہے۔

نبی کا اجتہاد، نبی کا خواب اور اجماع امت بھی وحی ہیں:

اور وحی حکمی باقاعدہ تو وحی نہیں ہوتی مگر حقیقت میں وہ بھی وحی ہوتی ہے یعنی اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، اور وحی حکمی پانچ چیزیں ہیں:

۱- نبی پاک ﷺ کا اجتہاد: نبی پاک ﷺ بھی دیگر مجتہدین کی طرح اجتہاد فرماتے ہیں، اور دیگر مجتہدین کے اجتہاد میں جس طرح خطا وصواب کا احتمال ہوتا ہے نبی پاک ﷺ کے اجتہاد میں بھی یہ دونوں احتمال ہوتے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ مجتہد کی غلطی باقی رہ سکتی ہے، اس کو تنبیہ نہیں کی جاتی اور نبی کو خطا پر برقرار نہیں رکھا جاتا، وحی صریح کے ذریعہ اس کو اطلاع کردی جاتی ہے، پس جب نبی ﷺ کو اجتہاد پر باقی رکھا جائے تو وہ اللہ کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اجتہاد بھی حکماً وحی ہے۔

۲- نبی کا خواب بھی وحی ہے، امت کے کسی فرد کا خواب حجت نہیں کیونکہ وہ وحی نہیں، اس کی حیثیت صرف بشارت کی ہوتی ہے، مگر نبی کا خواب حکماً وحی ہوتا ہے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خواب کو حکم خداوندی جان کر اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا، اگر نبی کا خواب وحی نہ ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے صاحبزادے کو ذبح کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی، کیونکہ آپ کو ذبح کرنے کا حکم خواب کے علاوہ کسی اور

طریقہ سے نہیں دیا گیا تھا۔

۳-اجماع امت بھی حکماً وحی ہے، خود نبی ﷺ نے اس کی صحت کی اطلاع دی ہے۔ارشاد فرمایا: **لا تجتمع أمتی علی الضّلالة**: میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہوگی (مشکوٰۃ حدیث ۳۴) پس اگر کسی بات پر اجماع ہوجائے تو یہ عنداللہ اس کے حق ہونے کی دلیل ہے، یہ حدیث مستدرک حاکم (۱۱۵:۱) میں اس طرح ہے: **لایَجْمَع اللّٰه هذه الأمةَ علی الضلالة أبدا، وقال: ید الله علی الجماعة، فاتَّبِعُوْا السَّواد الأعظم، فإنَّه مَن شَذَّ شَذَّ فی النار**: اللہ تعالیٰ اس امت کو گمراہی پر کبھی جمع نہیں ہونے دیں گے (معلوم ہوا کہ صرف صحابہ کا اجماع ہی نہیں بلکہ قیامت تک امت کا اجماع حجت ہے) اور ارشاد فرمایا: اللہ کا ہاتھ (تائید ونصرت) جماعت پر ہے، پس امت کی اکثریت کا اتباع کرو جو امت کی اکثریت سے علاحدہ ہوگا وہ دوزخ میں اکیلا ہوگا یعنی امت جنت میں جائے گی اور وہ اکیلا جہنم میں ہوگا۔

اور سورۃ النساء کی آیت: ۱۱۵ ہے: ﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيْرًا﴾: اس آیت میں حجیت حدیث اور حجیت اجماع کا بیان ہے، ارشاد ہے: جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا اس کے بعد کہ اس کے لئے امر حق واضح ہو چکا (یہ حجیت حدیث کا بیان ہے) اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ پر چلے گا (یہ حجیت اجماع کا بیان ہے) تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے، اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے۔اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے۔حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الرِّسالة میں اس آیت سے حجیت اجماع پر استدلال کیا ہے، آپ نے فرمایا: ''یہ مؤمنین کا راستہ ہی اجماع امت ہے''

غیر مقلدین: قرآن کے بعد صرف حدیثوں کو حجت مانتے ہیں اور وہ بھی صحیح حدیثوں کو، ضعیف حدیثوں کو حجت نہیں مانتے، البانی صاحب نے ضعیف حدیثوں کو موضوع حدیثوں کے ساتھ ملا دیا ہے اور ان کو نا قابل حجت قرار دیا ہے اور غیر مقلدین شیعوں کی طرح اجماع امت کو بھی حجت نہیں مانتے، اور ناچنا نہیں آنگن ٹیڑھا کے طور پر کہتے ہیں: ہم قطعی اجماع کو حجت مانتے ہیں، ظنی اجماع کو حجت نہیں مانتے، تو کیا اجماع کا تذکرہ قرآنِ کریم میں ہوگا؟ اس کے قطعی ہونے کی اور کیا صورت ہے؟ اور جب اخبار آحاد جو ظنی ہیں حجت ہیں تو اجماع ظنی کیوں حجت نہیں؟

اجتہاد (قیاس) بھی حکماً وحی ہے:

وحی حکمی کی چوتھی اور پانچویں صورت: صحابہ کا اجتہاد اور امت کا اجتہاد بھی حکماً وحی ہے اور یہ حکماً وحی دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: اجتہاد (قیاس) کی اعتباریت قرآن وحدیث سے ثابت ہے اور اس کی یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ حکماً وحی ہو، اس کی دوسری کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، سورۃ النحل کی آیت ۴۴ جو پہلے آچکی ہے اس کے آخر میں ہے: ﴿وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾: اور تاکہ وہ (یعنی امت کے مجتہدین) غور وفکر کریں، یعنی پہلے نبی ﷺ الذکر کی تبیین وتشریح کریں گے پھر اس کو اسوہ بنا کر امت کے مجتہدین غور وفکر کریں گے، اور نو پید صورتوں کے احکام اس میں سے مستنبط کریں گے، اگر امت کا اجتہاد

حجت نہیں تو اس آیت کے کوئی معنی نہیں!

اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ انھوں نے عرض کیا: أَجْتَهِدُ رَأْيِي ولا آلُو: اگر قضیہ کا حکم سنت رسول اللہ میں نہیں ملے گا تو میں اپنی رائے کو تھکاؤں گا اور ذرا کوتاہی نہیں کروں گا، یعنی انتہائی غور وفکر کر کے قرآن وسنت سے مسئلہ مستنبط کروں گا۔ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: الحمد لله الذي وَفَّقَ رسولَ رسولِ الله لما يَرْضى رسولُ اللهِ: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے رسول کو وہ بات سجھائی جو اللہ کے رسول کو پسند ہے (ابوداؤد حدیث ۳۵۹۲ كتاب الأقضية) غرض: حضرت معاذؓ کے اجتہاد کو رسول اللہ ﷺ کا غایت درجہ پسند فرمانا اس کے حکماً وحی ہونے کی واضح دلیل ہے۔ رہا قیاس میں خطا (چوک) کا احتمال تو اس سے درگذر کیا جائے گا جیسے بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں اجتہاد میں خطا ہوئی تھی، اس سے درگذر کیا گیا اور مال غنیمت کو حلال رکھا گیا۔

دوسری وجہ: شریعتِ اسلامیہ آفاقی اور ابدی ہے، اور زمانہ تغیر پذیر ہے، دنیا کے احوال بدلتے رہتے ہیں، پس قیامت تک پیش آنے والے احوال کے احکام تفصیل سے قرآن وحدیث میں بیان نہیں کئے گئے، کیونکہ ان کو محفوظ کرنا اور روایت کرنا بہت دشوار تھا، اس لئے قرآن وحدیث میں زیادہ تر احکام اصولی رنگ میں بیان کئے گئے ہیں، ان کو زمانہ کے احوال پر منطبق کرنا مجتہدین امت کا کام ہے، غرض: یہ ایک ایسی ضرورت ہے جو اجتہاد کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوسکتی۔ اور نئے مسائل کے تعلق سے اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا، وہ برابر کھلا ہوا ہے۔ جیسا کہ آگے تفصیل سے آئے گا —— اور اس وجہ کی طرف بھی ﴿وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ میں اشارہ ہے۔ ورنہ غور وفکر کی کوئی حاجت نہ تھی۔

حدیث کی تعریف:

علامہ عینی رحمہ اللہ نے شرح البخاری میں حدیث کی تعریف یہ کی ہے: ما أُضِيفَ إلى النبي صلى الله عليه وسلم من قولٍ أو فعلٍ أو تقريرٍ أو صفةٍ: حدیث: وہ باتیں ہیں جو نبی ﷺ کی طرف منسوب ہوں، خواہ وہ آپ کا ارشاد ہو، یا آپؐ کا کیا ہوا کام ہو، یا آپؐ کی برقرار رکھی ہوئی بات ہو یا آپؐ کے ذاتی حالات ہوں۔

قول، فعل اور صفت (ذاتی حالات) تو واضح ہیں اور تقریر کے معنی ہیں: تائید، یعنی کسی مسلمان نے آپؐ کے سامنے کوئی کام کیا جس کو آپؐ نے دیکھا مگر اس پر نکیر نہیں فرمائی تو یہ تقریر ہوئی، پھر تائید کی دو صورتیں ہیں: ظاہری اور خفی، تقریر ظاہری: یعنی بالفعل آنحضور ﷺ کے علم میں وہ بات آگئی، جیسے جب آپؐ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو لوگوں میں کھجوروں کی بیع سلم کا رواج تھا۔ بیع سلم شرعی اصول سے ناجائز ہے کیونکہ اس میں بوقت عقد مبیع موجود نہیں ہوتی، مگر آپؐ نے اس کو برقرار رکھا اور جہالت وتنازع کو ختم کرنے کے لئے تین شرطوں کا اضافہ کیا، فرمایا: جب کیل معلوم ہو، وزن معلوم ہو اور مبیع سونپنے کا وقت معلوم ہو تو بیع جائز ہے، یہ تقریر ظاہری کی مثال ہے۔

اور تقریر خفی یہ ہے کہ بالقوۃ آنحضور ﷺ کے علم میں بات آئی اور آپؐ نے نکیر نہ فرمائی ہو، جیسے حضرت جابر

رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب قرآنِ کریم نازل ہورہا تھا ہم بیویوں اور باندیوں سے عزل کیا کرتے تھے، مگر آپؐ نے ہمیں منع نہیں کیا۔ عزل لوگوں کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ گھروں کے اندر پیش آتا ہے، اس لئے اس کا علم آنحضور ﷺ کو بالفعل نہیں ہوسکتا، لیکن اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہیں اگر یہ فعل ناجائز ہوتا تو وحی متلو یا وحی غیر متلو کے ذریعہ آنحضور ﷺ کو اس کی اطلاع کی جاتی اور آپؐ لوگوں کو اس سے منع فرماتے، لیکن حضور ﷺ نے منع نہیں کیا، معلوم ہوا کہ عزل جائز ہے، یہ عزل کا جواز تقریر نبوی سے ہے۔

فن حدیث کی تعریف:

فن حدیث ایک کلی ہے اس کے تحت بہت سی انواع ہیں، اصول حدیث کی کتابوں میں اس کی اسّی سے زیادہ انواع بیان کی گئی ہیں۔ جیسے: فن غریب الحدیث، مشکل الحدیث، مختلف الحدیث، فقہ السنہ، فن رجال اور اس کی انواع وغیرہ۔

فن حدیث: علمٌ یُبْحَثُ فیه عن قول رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وفعله وتقریره: روایةً ودِرایةً: فن حدیث وہ علم ہے جس میں تین باتوں سے بحث کی جاتی ہے: نبی ﷺ کے اقوال وافعال وتقریرات سے اور یہ گفتگو دو حیثیتوں سے کی جاتی ہے، روایت کے اعتبار سے اور درایت کے اعتبار سے —— نبی ﷺ کے ذاتی احوال سے فن حدیث میں بحث نہیں کی جاتی، کیونکہ وہ آپؐ کے ساتھ خاص ہیں۔

اور روایةً کے معنی ہیں: اتصالاً وانقطاعاً: أی صحةً وضُعفًا: یعنی اس حیثیت سے بحث کی جاتی ہے کہ جو حدیثیں ہم تک پہنچی ہیں وہ سند متصل سے مروی ہیں یا سند میں کسی جگہ انقطاع ہے؟ اگر سند متصل ہے تو اس کے تمام راوی ثقہ ہیں یا بعض راوی ضعیف بھی ہیں؟ اگر تمام راوی ثقہ ہیں تو وہ حدیث صحیح ہے، اور اگر ایک بھی راوی ضعیف ہے تو وہ حدیث ضعیف ہے۔

گذشتہ سالوں میں آپ حضرات نے حدیث شریف کی تین کتابیں پڑھی ہیں: مشکوٰۃ الآثار، الفیۃ الحدیث اور مشکوٰۃ المصابیح۔ یہ تینوں کتابیں حدیث شریف پڑھنے کے لئے ہیں، فن حدیث پڑھنے کے لئے نہیں۔ اگرچہ اب اساتذہ نے مشکوٰۃ شریف میں بھی فن حدیث پڑھانا شروع کردیا ہے، جب میں مشکوٰۃ شریف پڑھتا تھا تو ایک ہی استاذ پوری مشکوٰۃ پڑھاتے تھے، اور دو گھنٹے میں پوری کرادیتے تھے اور پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ طالب علم حدیث پڑھتا اگر کہیں اعراب غلط پڑھتا تو استاذ ٹوکتا اور اعراب صحیح کراتا، اور وجہ بتاتا، پھر استاذ ایسا ترجمہ کرتا کہ عام طور پر ترجمہ ہی سے حدیث کا مفہوم واضح ہوجاتا، پھر استاذ مختصر تشریح کرتا اور کوئی حدیث بظاہر مسلک احناف کے خلاف نظر آتی تو استاذ وضاحت کرتا کہ احناف اس حدیث کی یہ توجیہ کرتے ہیں۔

لیکن اب اساتذہ نے جس طرح دورۂ حدیث میں بحثیں ہوتی ہیں، مشکوٰۃ میں بھی بحثیں شروع کردی ہیں، حالانکہ مشکوٰۃ شریف صرف حدیث پڑھانے کے لئے ہے، فن حدیث پڑھانے کے لئے دورۂ حدیث ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف

میں ساری سندیں حذف کردی ہیں اور دورہ میں فن حدیث پڑھنا ہے، ہر ہر حدیث پر روایۃ بھی بحث کرنی ہے اور درایۃ بھی۔ مگر بخاری و مسلم میں روایۃً بحث کی کوئی خاص ضرورت نہیں، اس لئے کہ شیخینؒ نے صحیح سندیں ہی ذکر کی ہیں، گوکہ صحیحین کی بعض سندوں پر اشکالات ہیں مگر وہ بہت معمولی اشکالات ہیں، اس لئے میں عام طور پر بخاری میں روایۃً یعنی صحۃً و ضعفاً بحث نہیں کرتا۔

اور دِرایۃ کے معنی ہیں: فَهمًا و استدلالاً: یعنی حدیث کو سمجھنا اور اس سے مسائل کا استنباط کرنا، علماء دیوبند نے اس کے لئے طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ گذشتہ اکابر نے حدیث کا جو مطلب سمجھا ہے اور حدیث سے جو مسئلہ مستنبط کیا ہے اس کو زیر بحث لایا جائے اور اس میں کوئی اختلاف ہو تو اس کو بھی زیر بحث لایا جائے، اور اس کو حدیث فہمی کا ذریعہ بنایا جائے۔

کچھ لوگ (غیر مقلدین) یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ دیوبند میں حدیث نہیں پڑھائی جاتی، اقوال رجال پڑھائے جاتے ہیں۔ ابوحنیفہ یہ کہتے ہیں، شافعیؒ یہ کہتے ہیں، مالکؒ اور احمد یہ کہتے ہیں، بلکہ بعض تو یہ بھی کہتے ہیں کہ دیوبند میں مذہبِ حنفی کی ترجیح پڑھائی جاتی ہے۔ حدیث نہیں پڑھائی جاتی۔

یہ دونوں باتیں غلط ہیں، میں نے ابھی بتایا کہ ہمارے یہاں گذشتہ اکابر کے اقوال اس لئے زیر بحث لائے جاتے ہیں کہ حدیث فہمی میں وہ معین و مددگار بنیں۔ اور دوسری بات غلط اس لئے ہے کہ دورۂ حدیث میں پچیس پچاس شوافع تو ہمیشہ رہتے ہیں، اور کبھی مالکی اور حنبلی طلبہ بھی آجاتے ہیں، مگر دارالعلوم کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ دیوبند میں دورہ پڑھ کر کوئی شافعی، مالکی یا حنبلی حنفی بن گیا ہو، اگر حنفیت کی ترجیح پڑھائی جاتی تو ہر سال دو چار طالب علم ضرور متأثر ہوتے اور شافعیت سے نکل کر حنفیت میں آجاتے، مگر اس طرح کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، اس لئے کہ ہماری بحثوں کا حاصل حدیث فہمی ہے، حنفیت کو ترجیح دینا نہیں ہے۔ البتہ ایک بات قدرتی ہے: میں حنفی ہوں، پس جب میں کسی مسئلہ پر گفتگو کروں گا تو خود بخود بات مذہب کی ترجیح کی طرف چلی جائے گی، جیسے امام طحاوی رحمہ اللہ نے طحاوی شریف اس لئے نہیں لکھی کہ حنفیت کو ترجیح دیں، بلکہ اس لئے لکھی ہے کہ متعارض احادیث میں تطبیق دیں۔ مگر امام طحاویؒ چونکہ مذہب احناف کے بہت بڑے محقق ہیں اس لئے جب وہ کسی مسئلہ میں گفتگو کریں گے تو بات خود بخود حنفیت کی ترجیح کی طرف چلی جائے گی۔ حالانکہ خود امام طحاویؒ نے مقدمہ میں صراحت کی ہے کہ انھوں نے یہ کتاب ان لوگوں کے جواب میں لکھی ہے جو کم فہمی کی وجہ سے احادیث کو باہم متعارض سمجھتے ہیں، یعنی منکرین حدیث کے جواب میں لکھی ہے، نہ کہ حنفیت کی ترجیح میں، اسی طرح جب استاذ حنفی ہوگا تو اس کی گفتگو خود بخود حنفیت کی ترجیح کی طرف چلی جائے گی کیونکہ یہ بات فطری ہے۔

ایک واقعہ: سوڈان کا ایک مالکی طالب علم تھا، احمد میرف۔ بڑا ذہین اور سمجھ دار طالب علم تھا، وہ مجھ سے مناسبت رکھتا تھا اور عصر کے بعد میرے پاس آتا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا: جب میں پڑھ کر سوڈان جاؤں گا تو دیوبند کے طرز

پر حدیث پڑھاؤں گا! میں نے پوچھا: دیوبند کا کیا طریقہ ہے؟ کہنے لگا: دیوبند میں اساتذہ مذہب حنفی کی ترجیح قائم کرتے ہیں، جب میں اپنے یہاں دورۂ حدیث شریف پڑھاؤں گا تو مذہب مالکی کی ترجیح قائم کروں گا۔ میں نے کہا: جب تیرادورہ کامیاب ہوجائے تو مجھے لکھنا میں تیرے یہاں پڑھنے آؤں گا!

غرض: اقوالِ رجال سے بحث کرنے کا مقصد حدیث فہمی ہے۔ خود اقوال رجال مقصود نہیں، نہ حنفیت کی ترجیح مقصود ہے۔ جیسے حدیث میں ہے: أُمِرَ بلالٌ أن يَّشفع الأذانَ ويوتر الإقامة: حضرت بلال رضی اللہ عنہ حکم دیئے گئے کہ اذان دوہری کہیں، اور تکبیرا کہری کہیں، دوہرا کہنے اور اکہرا کہنے کا کیا مطلب ہے؟ ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں: مماثل کلمات ایک ایک مرتبہ کہے جائیں، البتہ شروع اور آخر میں اللہ اکبر دو دو مرتبہ کہا جائے، اور شوافع اور حنابلہ کے نزدیک قدقامت الصلوۃ بھی دومرتبہ کہا جائے، اور امام مالکؒ کے نزدیک قد قامت الصلوۃ ایک مرتبہ کہا جائے، پس ان کے نزدیک تکبیر کے کلمات دس ہونگے اور باقی دواماموں کے نزدیک گیارہ، اور اذان دوہری کہی جائے یعنی مماثل کلمات دو دو مرتبہ کہے جائیں۔

اور امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یوتر الإقامة میں ایتار صوتی مراد ہے، ایتار کلماتی مراد نہیں، یعنی مماثل کلمات کو ایک ایک مرتبہ کہنا مراد نہیں بلکہ ایک آواز میں کہنا مراد ہے، اذان میں مماثل کلمات دو سانس میں کہے جاتے ہیں اور تکبیر میں ایک ہی سانس میں۔

اب ہمیں غور کرنا ہے کہ کس کا بیان کیا ہوا مطلب قرینِ صواب ہے، چنانچہ روایات کا جائزہ لیا گیا تو ابوداؤد میں صحیح سند سے یہ روایت ملی: حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر کے سترہ کلمات سکھائے اور اذان کے انیس، سترہ کا عدد خاص ہے جس میں کمی بیشی کا احتمال نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ ایتار سے ایتار صوتی مراد ہے، ایتار کلماتی مراد نہیں۔ اگر ایتار کلماتی مراد لیا جائے گا تو دونوں روایتوں میں تعارض ہوجائے گا اور تطبیق کی کوئی شکل باقی نہیں رہے گی۔

علاوہ ازیں ایتار صوتی کی توجیہ ایسی ہے جس کو شوافع نے بھی اللہ اکبر میں اختیار کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری کتاب الاذان باب دوم میں یہی جواب دیا ہے کہ چونکہ الله أكبر دومرتبہ ایک سانس میں کہا جاتا ہے اس لئے وہ ایک ہی کلمہ ہے۔

غرض اس طرح جب غور کیا جائے گا تو حدیث کا صحیح مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ گذشتہ مجتہدین کے اقوال کو زیر بحث لانے کا یہی مقصد ہے، حنفیت کی ترجیح ہرگز مقصود نہیں۔

اجتہاد کا دروازہ من وجہٍ بند ہوا ہے، بالکلیہ بند نہیں ہوا

گذشتہ مجتہدین کے اجتہادات واستنباطات کو زیر بحث لانے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ ایک طرح کی ریہل سل ہے، اس سے قیامت تک نئے پیش آنے والے مسائل کا حل قرآن وحدیث سے نکالنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی سوال کرے کہ اجتہاد کا دروازہ تو بند ہے پھر اس تمرین کا کیا فائدہ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اجتہاد کا دروازہ من وجہ

بند ہے، بالکلیہ بند نہیں، یعنی چوتھی صدی تک جو مسائل طے ہو گئے، خواہ اتفاقی طے ہوئے یا اختلافی، ان میں اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ اب اِن مسائل کو تحقیق کا موضوع نہیں بنایا جائے گا، اس سے امت میں انتشار پھیلے گا، مثلاً: نماز میں رفع یدین سنت ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ طے ہو گیا ہے اور اختلافی ہے، اب اگر کوئی اس کو تحقیق کا موضوع بنائے گا اور دو باتوں میں سے کوئی ایک بات اختیار کرے گا، تو تحقیق کا کیا فائدہ ہوا؟ اور اگر کوئی تیسری رائے قائم کرے گا تو امت میں اختلاف بڑھے گا۔ اب تک امت دو دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے، آئندہ تین میں بٹ جائے گی اس لئے کہ اس رائے کے ماننے والے بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہونگے۔ بیوقوفوں کی دنیا میں کمی نہیں۔

اور اگر وہ محقق ترجیح قائم کرتا ہے مثلاً رفع یدین والی روایت کو راجح قرار دیتا ہے تو دنیا کی کونسی طاقت ہے جو ترک رفع والوں کو اس رائے پر لے آئے؟ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ حنفیت اور شافعیت کو ملا کر ایک فقہ تیار کروں اور سب مسلمان اس کی پیروی کریں، حالانکہ اصول کے اختلاف کے ساتھ فروعات کا اتحاد ممکن نہیں، اور فرض کرو ایسا مجموعہ مرتب کر لیا جائے تو دنیا کے تمام احناف اور شوافع کو اس نئی فقہ پر کون لائے گا؟ یہ ناممکن بات ہے، پس امت پر رحم کیا جائے، وہ جس حال میں ہے اسی پر اس کو رہنے دیا جائے۔

البتہ قیامت تک جو نئی باتیں پیش آئیں گی ان میں اجتہاد ناگزیر ہے، اجتہاد کے بغیر قرآن و حدیث میں سے ان کے احکام کیسے نکلیں گے؟ پس اجتہاد کے دروازے کا ایک پٹ بند ہے، اور ایک کھلا ہے، چنانچہ کوئی بھی نیا مسئلہ دارالافتاء کو بھیجا جاتا ہے تو وہاں سے جواب ضرور آتا ہے۔ یہ اجتہاد ہی سے تو جواب دیا جاتا ہے؟

اور یہ جو متجددین کہتے ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے، اس لئے اجتہاد کا دروازہ کھولو یعنی از سر نو اجتہاد کرو، ان کا مقصد یہ ہے کہ منصوصات شرعیہ میں بھی اجتہاد کرو، جن امور کی حرمت مصرح ہے ان کو بھی جائز کرو، جیسے مبیع اگر معدوم ہو تو بیع باطل ہے، وہ کہتے ہیں: اب زمانہ بدل گیا ہے لہٰذا مسئلہ بدلو۔ بیع کے وقت مبیع کا وجود ضروری نہیں، اسی طرح آج سود کے بغیر گذارہ نہیں، لہٰذا سود کے جواز کا فتوی دو۔

ظاہر ہے یہ مہمل باتیں ہیں جو منصوصات ہیں ان میں مجتہدین کا کیا اختیار ہے؟ پس ان کا مطالبہ غلط ہے، اور علماء جو کہتے ہیں کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے اس کا مطلب وہ ہے جو میں نے بیان کیا، نو پید مسائل کے احکام تو قرآن و سنت سے نکالنے ہونگے اور اس کے لئے تیاری بھی کرنی پڑے گی، تفاسیر میں احکام القرآن کی بحث اور احادیث میں فقہاء کی آراء کا تذکرہ اور ان کے استدلالات کا جائزہ یہ سیکھنے کے لئے ہے کہ ان حضرات نے مسائل کس طرح مستنبط کئے ہیں؟ اس سے طلبہ میں صلاحیت پیدا ہوگی اور وہ نئے مسائل کے احکام نصوص سے نکال سکیں گے۔

فن حدیث کا موضوع:

فن حدیث کا موضوع ہے: اَلْمَروِیات مِن حیثُ الرِّوایة والدِّرایة: فن حدیث کا موضوع مرویات ہیں، روایت

ودرایت کے اعتبار سے، موضوع تعریف سے اخذ کیا جاتا ہے، اور حیثیت کی قید کے ساتھ محیّث (مقید) ہوتا ہے، پس فن حدیث کا موضوع نبی ﷺ کے اقوال وافعال وتقریرات ہیں، دو حیثیتوں سے: روایت کی حیثیت سے اور درایت کی حیثیت سے، یعنی ان دو اعتباروں سے مذکورہ تین چیزوں سے فن حدیث میں بحث کی جاتی ہے۔

فن حدیث کی غرض وغایت

فن حدیث کی غرض وغایت دو ہیں: عمومی اور خصوصی، عمومی غرض وغایت تمام علوم شرعیہ کی ایک ہے، علوم شرعیہ چھ ہیں اور وہ علوم عالیہ کہلاتے ہیں: قرآن یعنی تفسیر، حدیث، فقہ اور تینوں کے اصول یعنی اصول تفسیر، اصول حدیث اور اصول فقہ۔ یہ چھ فنون علوم شرعیہ ہیں اور یہی علوم ہمارے مدارس عربیہ کی غرض وغایت ہیں، ان کے علاوہ مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ علوم آلیہ ہیں، آلہ کے معنی ہیں: اوزار، ذریعہ، یعنی باقی علوم مذکورہ چھ علوم کے لئے وسیلہ اور ذریعہ ہیں، غرض: تمام علوم شرعیہ کی عمومی غرض وغایت سعادت دارین ہے۔ دنیا وآخرت کی نیک بختی حاصل کرنا ان علوم کا مقصد ہے۔

اور خصوصی غرض وغایت علوم شرعیہ کی الگ الگ ہیں، اور فن حدیث کی خصوصی غرض وغایت دو ہیں: تأسّی اور تشریع۔ تأسّی کے معنی ہیں: اسوہ بنانا، نمونۂ عمل بنانا، اور تشریع کے معنی ہیں: قانون سازی، دستور وآئین بنانا، پس احادیث شریفہ دو مقاصد سے پڑھنی چاہئیں:

پہلا مقصد: آنحضور ﷺ کی ذات کو نمونۂ عمل بنانا۔ آپؐ نے جو احکام دیئے ہیں اور جو ارشادات فرمائے ہیں ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا، قرآن کریم میں متعدد جگہ آیا ہے کہ رسول کی اطاعت کرو، اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے جو احکام دیئے ہیں ان پر عمل کرو، شمائل ترمذی میں روایت ہے: ازہرؓ نامی ایک صحابی تھے، وہ گاؤں کے رہنے والے تھے، جمعہ کے لئے مدینہ آتے تھے، اور گاؤں میں کھیتوں میں جو سبزی ترکاری ہوتی ہے وہ آنحضور ﷺ کے لئے ہدیہ لاتے تھے، پھر جب وہ گھر لوٹتے تھے تو آنحضور ﷺ گھریلو ضرورت کی چیزیں خرید کر ان کو ہدیہ کرتے تھے، آپؐ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا: ازہر ہمارا گاؤں ہے اور ہم اس کا شہر ہیں۔ یعنی ہماری گاؤں کی ضرورتیں ازہر پوری کرتے ہیں اور ہم اس کی شہر کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔

غرض ان کا آنحضور ﷺ سے گہرا تعلق تھا، ایک مرتبہ وہ بازار میں خرید وفروخت میں مشغول تھے کہ آنحضور ﷺ نے پیچھے سے ان کی آنکھیں دبا دیں، انھوں نے کہا: کون ہے؟ چھوڑ! پھر جب انھوں نے دست مبارک کی نرمی سے اور بدن مبارک کی خوشبو سے آپؐ کو پہچان لیا تو اپنی پیٹھ آپؐ کے سینہ سے لگادی، آپؐ نے ہاتھ ہٹالیا، اس سے بھی گہرے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔

پھر آپؐ نے مزاحاً فرمایا: اس بندے کو کون خریدتا ہے؟ حضرت ازہرؓ کالے تھے۔ انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے

رسول! تب تو آپؐ مجھے کھوٹا پائیں گے یعنی مجھ کالے کلوٹے کو کون خریدے گا؟ اور خریدے گا تو کیا قیمت دے گا؟ آپؐ نے فرمایا: مگر تم اللہ کے نزدیک کھوٹے نہیں ہو!

اس کے بعد آپؐ نے ان کی لنگی پر نظر ڈالی۔ وہ ٹخنوں سے نیچے تھی، آپؐ نے فرمایا: اپنی لنگی اونچی باندھو، اس میں دو فائدے ہیں: ایک: لنگی کا نچلا حصہ صاف ستھرا رہتا ہے، دوسرا: لنگی زیادہ دنوں تک چلتی ہے۔ (لنگی نیچی ہوگی تو چلتے وقت پیروں میں الجھے گی اور جلدی پھٹے گی) حضرت ازہرؓ نے پہلی بات کا تو کوئی جواب نہیں دیا، البتہ دوسری کا جواب دیا۔ عرض کیا: یارسول اللہ! یہ تو لٹھے کی لنگی ہے (پھٹ جائے گی تو دوسری لے آئیں گے) آپؐ نے فرمایا: أَمَالَكَ فِيَّ أسوة؟ کیا تمہارے لئے میری ذات میں کوئی نمونہ نہیں؟ انھوں نے آنحضور ﷺ کی لنگی دیکھی تو وہ آدھی پنڈلی تک تھی، بس انھوں نے فوراً اپنی لنگی اوپر کرلی اور جہاں تک آپؐ کی لنگی تھی وہاں تک اپنی لنگی باندھ لی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضور ﷺ کی ذات اسوہ اور نمونہ ہے، اور اسی لئے ہم حدیثیں پڑھتے ہیں کہ ہم خود کو حضور کا نمونہ بنائیں۔ سورۃ الاحزاب (آیت ۲۱) میں ارشاد پاک ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾: بخدا! واقعہ یہ ہے کہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں عمدہ نمونہ ہے، پس اگر طلبہ اس مقصد کا استحضار کر کے حدیثیں پڑھیں تو ان کو فائدہ ہوگا، ورنہ سعی لاحاصل رہے گی۔

دوسرا مقصد: قانون سازی ہے یعنی احادیث سے آئین اسلامی بنانا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے دنیا میں زندگی گذارنے کے لئے جو دستور نازل کیا ہے اس کا ماخذ قرآن وسنت ہیں، تمام احکام شرعیہ انہی دو سے ماخوذ ہیں۔ اسی لئے ہم گذرے ہوئے مجتہدین کے اقوال زیر بحث لاتے ہیں تاکہ قرآن وسنت سے مسائل اخذ کرنے کا ہمارے اندر سلیقہ پیدا ہو۔

لیکن میرے عزیزو! آج کل ایک عام غلطی ہو رہی ہے، جس کی وجہ سے ہمارے فضلاء میں عموماً عصر حاضر کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی، اور وہ یہ ہے کہ فضلاء مسلسل محنت جاری نہیں رکھتے، ایک وقت تک ریہل سل کرتے ہیں پھر چھوڑ دیتے ہیں، جیسے طلبہ سال بھر مناظرہ کی تمرین کرتے ہیں لیکن فارغ ہونے کے بعد اس مشق کو جاری نہیں رکھتے۔ اس لئے روز نئے نئے فتنے سر ابھار رہے ہیں اور ہمارے فضلاء ان سے لوہا نہیں لے سکتے، اگر وہ ریہل سہل جاری رکھیں تو ایک دن آئے گا کہ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرسکیں گے۔

ہمارے طلبہ مدارس سے نکل کر فارغ ہوجاتے ہیں، یہ فراغت کا تصور ان کو آگے نہیں بڑھنے دیتا، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے مدرسہ میں سب کچھ پڑھ لیا۔ حالانکہ مدارس میں سب کچھ نہیں پڑھایا جاتا، نہ یہ بات ممکن ہے، بلکہ مدارس میں علم حاصل کرنے کی استعداد بنائی جاتی ہے، اب طلباء کو مدارس سے نکلنے کے بعد زندگی بھر اپنا علمی سفر جاری رکھنا ہے۔ تحصیل علم کا زمانہ پالنے سے قبر تک ہے۔ اگر ہمارے فضلاء اس بات کو پلّے باندھیں تو ان کا مقام ثریا سے بھی بلند ہوسکتا ہے۔

حجازی اور عراقی مکاتب فکر

اب یہ بات جاننی چاہئے کہ صحابہ کے زمانہ تک عقائد میں اختلاف نہیں تھا، یہ اختلاف تابعین کے زمانہ سے شروع ہوا، مگر اعمال میں اختلاف صحابہ کے زمانہ میں بھی تھا، بلکہ آنحضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں بھی صحابہ میں اختلاف ہوا ہے۔ مشہور واقعہ ہے: غزوۂ احزاب میں بنوقریظہ نے غداری کی تھی۔ نبی ﷺ نے غزوۂ احزاب سے فارغ ہوکر صحابہ کو حکم دیا کہ فوراً بنوقریظہ پر چڑھائی کرو، اور عصر کی نماز وہاں جاکر پڑھو، چنانچہ صحابہ تیاری کرکے بنوقریظہ کی طرف چل پڑے، راستہ میں عصر کی نماز کا وقت آگیا۔ صحابہ میں اختلاف ہوا، بعض نے کہا: عصر کی نماز بنوقریظہ میں جاکر پڑھیں گے، ہمیں یہی حکم ہے، اور بعض نے کہا: حکم کا منشا یہ ہے کہ فوراً بنوقریظہ پہنچو، عصر کی نماز قضا کرو، یہ منشا نہیں۔ ان حضرات نے راستہ میں عصر پڑھی، دوسرے دن جب آپؐ پہنچے تو یہ واقعہ ذکر کیا گیا، آپؐ نے دونوں جماعتوں میں سے کسی سے کچھ نہیں کہا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کے زمانہ میں صحابہ کے درمیان احکام میں اختلاف ہوا ہے، مگر ان کے زمانہ میں فقہی مکاتب فکر وجود میں نہیں آئے تھے، سب سے پہلی تقسیم جو امت میں ہوئی وہ یہ تھی کہ امت دو حصوں میں تقسیم ہوئی: ایک: حجازی مکتب فکر وجود میں آیا اور دوسرا: عراقی مکتب فکر۔

اور اس تقسیم کی وجہ یہ ہوئی کہ آنحضور ﷺ کے بعد چار خلفاء ہوئے ہیں، ان میں سے تین مدینہ منورہ میں رہے ہیں، اس وقت تمام علماء مدینہ میں اکٹھا تھے، پھر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو وہ خلافت لے کر کوفہ (عراق) چلے گئے، اور ان سے پہلے وہاں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھیج چکے تھے، اس لئے ان کے شاگرد وہاں پہلے سے موجود تھے، اور اب جب کہ خلافت وہاں منتقل ہوئی تو سارے علماء بھی ادھر آگئے، اس طرح قدرتی طور پر دو مکتب فکر وجود میں آگئے، ایک: حجازی مکتب فکر: جو تین خلفاء اور ان کے زمانہ کے علماء سے بنا، اور ایک عراقی مکتب فکر: جو حضرت ابن مسعود، حضرت علی رضی اللہ عنہما اور ان کے شاگردوں سے وجود میں آیا۔ یہ امت میں سب سے پہلی تقسیم ہوئی۔

اس سے پہلے مکاتب فکر کا اختلاف نہیں تھا، پوری امت ایک تھی اور جس کو کوئی مسئلہ پیش آتا وہ جو بھی عالم ملتا اس سے پوچھ لیتا۔ لیکن جب امت دو مکاتب فکر میں بٹ گئی تو حجازی مکتب فکر والا جو ذہن رکھتے تھے وہ اپنے مکتب فکر کے عالم ہی سے مسئلہ پوچھتے تھے۔ عراقی مکتب فکر کے عالم سے مسئلہ نہیں پوچھتے تھے۔ اور جو عراقی مکتب فکر والا ذہن رکھتے تھے وہ اپنے مکتب فکر کے عالم ہی سے مسئلہ پوچھتے تھے، دوسرے سے نہیں پوچھتے تھے۔ بہر حال امت میں سب سے پہلے یہ دو مکتب فکر وجود میں آئے اور یہ تابعین کے زمانہ کی بات ہے۔

دونوں مکاتب فکر کے اصلی اور ذیلی کام:

حجازی مکتب فکر کا اصل کام حدیثیں روایت کرنا تھا اور وہ مسائل جو حدیث میں نہیں ہیں ان کے بارے میں اگر کوئی سوال

کرتا تو وہ اس کے جواب بھی دیتے تھے، کیونکہ وہ مجتہد بھی تھے۔ پس وہ محدثین فقہاء کہلائے۔ اور عراقی مکتب فکر کا اصل کام فقہ پر محنت کرنا تھا، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جو خلافت مدینہ منورہ سے نکل کر عراق میں چلی گئی تھی وہ پھر واپس نہیں آئی۔ اور یہ قدرتی بات ہے کہ گورنمنٹ کو حدیثوں سے زیادہ پیش آمدہ معاملات میں احکام شرعیہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے اس مکتب فکر کے علماء کی اصل محنت مسائل پر رہی، مگر مسائل کے لئے قرآن وسنت کو جاننا ضروری ہے، اس لئے وہ قرآن وسنت کو بھی جانتے تھے، مگر محنت ان کی مسائل پر ہوتی تھی، اس لئے وہ 'فقہاء محدثین' کہلائے۔

پھر مسائل طے کرنے میں فقہاء اتنے آگے بڑھ گئے کہ وہ زمانے کی ضرورت سے آگے سوچنے لگے۔ اگر یہ صورت پیش آئے تو یہ حکم ہے اور یہ صورت پیش آئے تو یہ حکم ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ کی مبسوط میں ایسے فرضی سوالات أرأیتَ (بتلایئے) کے عنوان سے ہیں، تاکہ جب وہ صورتیں پیش آئیں تو ان کے احکام پہلے سے معلوم ہوں، اور حجازی مکتب فکر والے اس کو پسند نہیں کرتے تھے، وہ کہتے تھے: جب تک واقعہ پیش نہ آئے احکام کیوں بیان کرتے ہو؟ مگر فقہاء گورنمنٹ کی ضرورت سے کام کر رہے تھے اور گورنمنٹ کے پاس ہر معاملہ کا حل پہلے سے موجود رہنا چاہئے۔

پھر آگے چل کر حجازی مکتب فکر میں رمزی نام امام مالکؒ کا استعمال ہونے لگا، اور وہ اس جماعت کے سرخیل بن گئے، پھر امام مالکؒ کے شاگرد امام شافعیؒ آئے، پھر امام شافعیؒ کے شاگرد امام احمدؒ آئے اور تینوں میں مسائل میں اختلافات ہوئے، اس لئے حجازی مکتب فکر تین مکاتبِ فکر میں بٹ گیا۔ اور عراقی مکتب فکر میں رمزی نام امام ابوحنیفہؒ کا استعمال ہونے لگا۔ عراق میں اور بھی مجتہد ہوئے مگر یہ مکتب فکر تقسیم نہیں ہوا۔ امام اعظمؒ کے دو شاگرد: امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ بڑے مجتہد تھے، حضرت امام شافعیؒ نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ خود فرماتے ہیں: حَمَلْتُ عن محمد وِقْرَی بَعیرٍ: میں نے امام محمدؒ سے ایک اونٹ کا بوجھ حاصل کیا ہے، اس زمانے میں طلبہ موٹے کاغذ پر لکھتے تھے۔

بہر حال عراقی مکتب فکر آخر تک ایک رہا، امام اعظمؒ کے شاگردوں نے خود کو امام اعظمؒ سے الگ نہیں کیا، آج امام ابو یوسفؒ کے سارے اقوال فقہ حنفی میں شامل ہیں، امام محمدؒ کے سارے اقوال فقہ حنفی میں شامل ہیں، ان کے علاوہ بھی بڑے بڑے شاگرد ہوئے ہیں، ان سب کے اقوال فقہ حنفی میں شامل ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تین چوتھائی دنیا نے عراقی مکتب فکر کی پیروی کی، اور ایک چوتھائی دنیا حجازی مکاتب فکر میں بٹ گئی۔

فقہی مکاتب فکر میں برحق چار مکاتب ہیں

اور آپ حضرات جانتے ہیں کہ مسائل فقہیہ کے کچھ اصول ہیں، اگر اصول صحیح ہیں تو ان پر مبنی فقہ بھی صحیح ہے، اور اگر اصول غلط ہیں تو فقہ بھی غلط ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک بنیادی اصول تین ہیں، اور ایک فرعی اصل ہے، منار الانوار متن نور الانوار کے شروع میں ہے: إعلم أنّ أصول الشرع ثلاثةٌ: كتابُ الله، وسنةُ رسوله، وإجماعُ الأمة، والأصل الرابع: القياس المُستَنبَط

من هذه الأُصول الثلاثة: یہ بات جان لیں کہ شریعت (فقہ) کے اصول تین ہیں: اللہ کی کتاب، اللہ کے رسول کی سنت اور اجماع امت، اور چوتھی اصل وہ قیاس ہے جس کے ذریعہ ان تین اصولوں سے مسائل نکالے جاتے ہیں۔

اب دیکھو! سب سے پہلے ایک فرقہ پیدا ہوا، اس نے کہا: حسبُنا کتابُ الله: ہمارے لئے قرآن کافی ہے۔ اس سے آگے ہم کوئی چیز نہیں مانتے، یہ فرقہ خود کو اہل قرآن کہتا ہے اور حقیقت میں وہ منکرین حدیث ہیں۔ پس یہ فرقہ جو صرف قرآن کو مانتا ہے اس کی فقہ کیسے برحق ہوسکتی ہے؟ اصول تو تین ہیں ان میں سے جو صرف قرآن کو مانتا ہے: اس کی فقہ قطعاً غلط ہے۔

دوسرا فرقہ کہتا ہے: قرآن کے بعد حدیثیں حجت ہیں (سنت نہیں) اور اس سے آگے کوئی چیز حجت نہیں۔ یہ فرقہ خود کو اہل حدیث کہتا ہے اور حقیقت میں وہ منکر اجماع وقیاس ہے، یہ فرقہ چونکہ سنت کو اور اجماع کو حجت نہیں مانتا اور قیاس (تعلیل) سے بھی کام نہیں لیتا، صرف نص کے ظاہر کو لیتا ہے اس لئے اس کی فقہ (فقہ ظاہری) بھی برحق نہیں ہوسکتی؟

اور اہل السنۃ والجماعہ کہتے ہیں: قرآن کے بعد ہر حدیث حجت نہیں بلکہ وہ حدیث حجت ہے جو سنت بھی ہے۔ اور حدیث اور سنت کے درمیان فرق بیان کیا جاچکا ہے، پھر تیسری اصل اجماع امت ہے، یہ بھی حجت شرعیہ ہے اس لئے ان کا نام اہل السنۃ والجماعہ ہوا۔ رہا قیاس تو وہ آلۂ استنباط ہے، وہ مثبت حکم نہیں، بلکہ مُظہر حکم ہے، اس لئے منار میں اس کو الگ بیان کیا ہے۔ یہی وہ امت کا سوادِ اعظم ہے جس کے اصول صحیح ہیں، پس ان پر مبنی فقہ بھی برحق ہے۔

پھر اہل السنۃ والجماعہ چار جماعتوں میں تقسیم ہوگئے: حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی۔ یہ حضرات قرآن کو بھی حجت مانتے ہیں، سنت کو بھی، اجماع کو بھی اور قیاس کو بھی، ایک شخص نے دعوت کی، تین ڈیگیں تیار کیں: پلاؤ کی، قورمہ کی اور زردہ کی۔ ان میں سے کھانا کیسے نکالا جائے گا؟ اس کے لئے بڑے چمچے (ڈوئی، کف گیر) کی ضرورت ہے، یہی کف گیر قیاس ہے۔ اور تین ڈیگیں قرآن، سنت اور اجماع امت ہیں، پس جب قیاس کے ذریعہ احکام: اصول شرع سے نکالے جائیں گے تو اصول کی طرح قیاس بھی معتبر ہوگا، ورنہ اصول شرع کی اعتباریت محل نظر ہوجائے گی۔

تقلید صرف تین قسم کے مسائل میں ہے، اور ان میں تقلید کے بغیر چارہ نہیں:

اور ائمہ کی تقلید صرف تین قسم کے مسائل میں کی جاتی ہے، باقی ساری شریعت میں کسی کی تقلید نہیں کی جاتی، اللہ اور اس کے رسول ہی کی تقلید کی جاتی ہے، اور ان تین قسم کے مسائل میں تقلید کے علاوہ چارہ نہیں۔ اور وہ تین قسم کے مسائل فقہ کے بیس فیصد مسائل ہیں۔

وہ تین قسم کے مسائل یہ ہیں:

۱- کبھی نص فہمی میں اختلاف ہوجاتا ہے کہ اِس آیت کا اور اِس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ ایک امام کہتا ہے: یہ مطلب ہے، دوسرا کہتا ہے: یہ مطلب ہے، اور زبان کی رو سے دونوں مطلب ہوسکتے ہیں تو تقلید کے علاوہ چارہ نہیں رہتا۔

۲- کبھی ناسخ ومنسوخ متعین کرنے میں اختلاف ہوجاتا ہے، یعنی کونسی روایت مقدم ہے اور کونسی مؤخر: اس میں اختلاف ہوجاتا ہے۔

۳- کبھی مسئلہ استنباطی ہوتا ہے، نص کی تہ میں جاکر مسئلہ نکالنا ہوتا ہے، اور اس میں اختلاف ہوجاتا ہے۔ سب کی مثالیں یہ ہیں:

نص فہمی میں اختلاف کی مثالیں:

پہلی مثال: قرآنِ کریم میں ہے: ﴿أَوْ لاَ مَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾: یا تم نے عورتوں سے قربت کی ہو۔ اس آیت میں وضو توڑنے والی چیز کا ذکر ہے یا غسل توڑنے والی چیز کا؟ قرآنِ کریم میں لاَمَسَ: باب مفاعلہ سے ہے، لَمَسَ: مجرد نہیں ہے، لَمَسَ کے معنی ہیں: چھونا، اور لاَمَسَ کے معنی ہیں: دو شخصوں میں سے ہر ایک کا دوسرے کو چھونا۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت میں موجباتِ غسل کا بیان ہے، لاَمَسَ باب مفاعلہ سے ہے، اور ایک ساتھ مرد عورت کو پکڑے اور عورت مرد کو پکڑے: ایسا کب ہوتا ہے؟ جب آدمی صحبت کرتا ہے اور فراغت کا وقت آتا ہے تو مرد بیوی کو پکڑتا ہے اور بیوی مرد کو، اور دونوں فارغ ہوتے ہیں۔ پس جب انزال ہوگیا تو غسل واجب ہوگیا۔ غرض امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ﴿لاَمَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ میں نواقض غسل کا بیان ہے۔

اور دوسرے تین اماموں کے نزدیک لاَمَسَ: لَمَسَ کے معنی میں ہے اور اس آیت میں نواقض وضو کا بیان ہے، وہ کہتے ہیں: اگر باوضو آدمی نے کسی عورت کو ہاتھ لگایا تو وضو ٹوٹ گیا۔ اور عربی زبان کے قواعد سے دونوں معنی کی گنجائش ہے اور ہر ایک کی بات معقول نظر آتی ہے، پس یہ نص فہمی کا اختلاف ہے۔

دوسری مثال: اسی آیت کا یہ ٹکڑا ہے: ﴿أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ﴾: یا آیا ہو تم میں سے کوئی نشیبی جگہ سے (تو وضو ٹوٹ جائے گا) اب فقہاء میں اختلاف ہوا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا: جب آدمی نشیبی جگہ میں جاتا ہے تو انسان کے بدن سے ناپاکی نکلتی ہے، پس سر سے پیر تک کہیں سے بھی ناپاکی نکل کر بہہ جائے: تو وضو ٹوٹ جائے گا۔ دو راہوں کی کوئی تخصیص نہیں۔ اور تین اماموں نے کہا: نشیبی جگہ میں ناپاکی اگلی راہ سے یا دونوں راہوں سے نکلتی ہے، باقی جسم سے نہیں نکلتی، اس لئے انھوں نے طے کیا کہ سبیلین سے ناپاکی نکلے گی تو وضو ٹوٹے گا، ورنہ نہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک قئی، نکسیر، پھوڑے پھنسی سے پیپ یا خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

جب ایسا اختلاف ہوجائے تو ہم کیا کریں؟ جس کو جس امام سے عقیدت ہو اس کی تقلید کرے، ایسی صورت میں تقلید کے علاوہ راستہ کیا ہے؟ ہمارے پاس اتنا علم نہیں کہ ہم خود فیصلہ کریں کہ آیت کا یہ مطلب ہے یا وہ۔

تیسری مثال: نبی پاک ﷺ نے فرمایا: صَلاَةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى، فَإِذَا خِفْتَ الصُّبْحَ فَأَوْتِرْ بِرَكْعَةٍ: رات کی نماز (تہجد کی نماز) دو دو، دو دو رکعتیں ہیں، پس جب تمہیں اندیشہ لاحق ہو کہ صبح صادق ہونے والی ہے تو ایک رکعت کے

ذریعہ نماز کو طاق بناؤ۔

اس حدیث میں دو مسئلوں میں اختلاف ہوا:

پہلا اختلافی مسئلہ: تہجد کی نماز میں ہر دو رکعت پر سلام پھیرنا: یہ مسئلہ ہے یا یہ تہجد گذاروں کے لئے سہولت ہے؟ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ تہجد گذاروں کے لئے ایک سہولت ہے، مسئلہ نہیں۔

مسئلہ کیا ہے؟ مسئلہ اختلافی ہے کہ نفلوں میں دو پر سلام پھیرنا اولیٰ ہے یا چار پر؟ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کہتے ہیں: خواہ رات کے نفل ہوں یا دن کے (اور سنت مؤکدہ بھی نفل ہیں) دو رکعتوں پر سلام پھیرنا اولیٰ ہے، اور اگر کوئی ایک سلام سے چار پڑھے تو یہ بھی جائز ہے، البتہ دو رکعت پر سلام پھیرنا اولیٰ ہے۔

اور امام مالکؒ فرماتے ہیں: رات میں ایک سلام سے چار رکعتیں پڑھنا جائز ہی نہیں، اور دن میں اولیٰ یہ ہے کہ دو پر سلام پھیرے، اور چار ایک سلام سے جائز ہیں۔

اور صاحبینؒ نے فرمایا کہ رات میں دو پر سلام پھیرنا اولیٰ ہے، اور دن میں چار نفلیں ایک سلام سے پڑھنا افضل ہے۔

اور امام اعظم رحمہ اللہ نے فرمایا: رات کے نفل ہوں یا دن کے: چار ایک سلام سے پڑھنا افضل ہے، اور دو پر سلام پھیرنا جائز ہے۔

اور امام اعظم کی دو دلیلیں ہیں:

ایک: دن میں بھی فرض نماز چار رکعتوں والی ہے (ظہر اور عصر) اور رات میں بھی فرض نماز چار رکعتوں والی ہے (عشاء) اور فرائض غیر اولیٰ ہیئت پر نہیں ہو سکتے، بہترین حالت پر ہی فرائض ہوتے ہیں۔ پس ایک سلام سے چار نفلیں پڑھنا اولیٰ ہے۔

دوسری دلیل: نبی ﷺ سے دن میں چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھنا ثابت ہے، آپؐ ظہر سے پہلے چار سنتیں ایک سلام سے پڑھتے تھے، اور کبھی عصر سے پہلے بھی چار سنتیں ایک سلام سے پڑھتے تھے، اور نبی کبھی مسئلہ کی وضاحت کے لئے تو غیر اولیٰ کام کر سکتا ہے، جیسے آپؐ نے ایک مرتبہ کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا، مگر نبی بالدوام یا بالاکثر غیر اولیٰ کام نہیں کرتا، اور حضورؐ نے دن میں چار سنتیں ہمیشہ یا اکثر ایک سلام سے پڑھی ہیں، اس لئے یہی افضل ہے، اور رات کے نفلوں کو دن کے نفلوں پر قیاس کریں گے، پس رات میں بھی چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھنا افضل ہے۔

اور حضورؐ نے جو فرمایا ہے: صلاۃُ اللیل مثنیٰ مثنیٰ: امام اعظم رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ مسئلہ نہیں مصلحت ہے، یہ تہجد گذاروں کے لئے ایک سہولت ہے۔

صحابہ تہجد کی نماز بہت لمبی پڑھتے تھے، پس اگر چار کی نیت باندھیں گے تو تھک جائیں گے، اس لئے فرمایا: دو کی نیت باندھو اور لمبی پڑھو، پھر سلام پھیر کر ذرا ٹانگیں سیدھی کرو، اور ستالو، پھر اگلی دو کی نیت باندھو۔ اس طرح اگر کوئی

رات بھر بھی نفلیں پڑھتا رہے گا تو تھکے گا نہیں۔

بہر حال حدیث کے پہلے ٹکڑے میں اختلاف ہوا ہے، امام اعظم کی رائے اور ہے، اور صاحبین کی اور، اور دیگر ائمہ کی اور۔ اور سب حضرات اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں، پس ایسی صورت میں تقلید کے علاوہ راستہ کیا ہے؟

دوسرا اختلافی مسئلہ: حدیث کا اگلا ٹکڑا ہے: إِذَا خِفْتَ الصُّبْحَ فَأَوْتِرْ بِرَكْعَةٍ: جب تمہیں اندیشہ لاحق ہو کہ اب صبح ہونے والی ہے تو ایک رکعت کے ذریعہ نماز کو طاق بناؤ۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ تین امام کہتے ہیں: اب دو رکعتوں پر سلام پھیر دو، اور ایک رکعت علاحدہ پڑھو، ایک رکعت کے ذریعہ طاق بنانے کا یہی مطلب ہے، چنانچہ ان کے نزدیک دو پر سلام پھیرتے ہیں، اور ایک رکعت الگ سلام سے پڑھتے ہیں۔

اور احناف کہتے ہیں: اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب تمہیں صبح کا اندیشہ لاحق ہو تو اب دو کی نیت مت باندھو، بلکہ تین کی نیت باندھو، اور دو کے ساتھ تیسری رکعت بھی ملاؤ، یہ آخری تین رکعتیں طاق ہوگئیں، اس سے پہلے والی سب رکعتیں جفت تھیں۔

اور حنفیہ کے نزدیک اس حدیث کا یہ مطلب اس لئے ہے کہ نسائی شریف میں سند صحیح سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وتروں کی دو رکعتوں پر سلام نہیں پھیرتے تھے[1] اس حدیث کی روشنی میں حنفیہ نے مذکورہ بالا حدیث کا مطلب سمجھا ہے۔

احناف کے نزدیک أوتر برکعة: ایک رکعت کے ذریعہ نماز طاق بناؤ کا یہی مطلب ہے کہ اس سے پہلے والی دو رکعتوں کو طاق بناؤ، غرض یہی حدیث حنفیہ کی بھی دلیل ہے اور تین اماموں کی بھی، اور اختلاف نص فہمی کا ہے۔ اب ہم کیا کریں؟ ہمارے لئے ایک ہی راستہ ہے: جس کو جس امام سے عقیدت ہو اس کی تقلید کرے۔

روایات میں بھی اختلاف اور تطبیق میں بھی اختلاف:

دوسری قسم کے مسائل: کبھی روایات میں بھی تعارض ہوتا ہے، اور ان کی تطبیق میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے، یعنی ناسخ و منسوخ کی تعیین میں اختلاف ہو جاتا ہے، جیسے حدیث کی کتابوں میں رفع یدین کی روایات بھی ہیں اور عدم رفع کی بھی، یہ دونوں روایتیں ایک زمانہ کی نہیں ہو سکتیں۔ اب ان میں سے کونسی دور اول کی ہیں اور کونسی دور مابعد کی؟ یہ طے کرنے میں ائمہ میں اختلاف ہوگیا، بڑے دو امام کہتے ہیں: رفع والی روایتیں دورِ اول کی ہیں، اور عدم رفع والی روایتیں بعد کی ہیں، اور چھوٹے دو امام کہتے ہیں: عدم رفع والی روایتیں دورِ اول کی ہیں اور رفع والی بعد کی۔ غرض ناسخ و منسوخ طے کرنے میں اختلاف ہوگیا، پس ہم کیا کریں؟ یہی کہ جس کو جس امام سے عقیدت ہو اس کی تقلید کرے۔

---

(۱) نسائی شریف، حدیث ۱۶۹۸ باب کیف الوتر بثلاث؟ کتاب قیام اللیل۔

اور بڑے دواماموں کی دلیل یہ ہے کہ خلفائے راشدین نے رفع یدین نہیں کیا۔ اگر رفع یدین نبی ﷺ کا آخری عمل ہوتا تو چاروں خلفاء رفع ضرور کرتے، ایسا ممکن نہیں کہ خلفاء آپؐ کے مصلیٰ پر کھڑے ہوتے ہی آپؐ کا عمل بدل دیں۔

استنباطی مسائل میں اختلاف:

تیسری قسم کے مسائل: استنباطی مسائل ہیں۔ موتی دریا کی تہ میں ہوتے ہیں، اوپر نہیں تیرتے، اور موتی ہر کوئی نہیں نکال سکتا، غواص (غوطہ خور) ہی نکال سکتا ہے۔ ایسے ہی استنباطی مسائل ہیں: جو قرآن وحدیث کی ظاہری سطح پر نہیں ہیں، بلکہ تہ میں ہیں: ان کو کون نکالے گا؟ مجتہدین امت نکالیں گے، مگر ان میں کبھی اختلاف ہوجاتا ہے، ایسی صورت میں تقلید (پیروی) کے علاوہ راستہ کیا ہے؟ میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں:

آیتِ وضو میں پانچ استنباطی مسائل اور ان میں اختلاف

قرآنِ کریم میں آیتِ وضوء ہے، اس آیت میں وضو کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے: دنیا کے تمام مسلمان اسی طرح وضو کرتے ہیں، لیکن اس آیت میں پانچ استنباطی مسائل ہیں، جن میں اختلاف ہوا ہے:

پہلا مسئلہ: یہ ہے کہ وضو میں نیت ضروری ہے یا نہیں؟ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ضروری ہے۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک ضروری نہیں، اور اس کی صرف دو صورتیں ہیں: ایک آدمی کھیت میں ہل چلا رہا تھا، بارش شروع ہوگئی اور وہ سر سے پیر تک بھیگ گیا، اب نماز کا وقت ہوگیا، تو کیا نماز پڑھنے کے لئے اُس کو وضو کرنی پڑے گی یا وہ جو بھیگا ہے اس سے وضو ہوگئی؟ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے وضو نہیں ہوئی، اس لئے کہ اس نے نیت نہیں کی، اور دوسرے ائمہ کہتے ہیں: اس کی وضو ہوگئی۔

یا ایک آدمی جنبی تھا اور تالاب پر کھڑا تھا، اس کا دوست آیا اور دھکا دیدیا، وہ تالاب میں گر پڑا اور ڈوب کر نکل آیا، پس کیا اس کا غسل ہوگیا؟ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: نہیں ہوا، کیونکہ اس نے غسل کی نیت نہیں کی، اور دوسرے ائمہ کہتے ہیں ہوگیا۔ یہ مسئلہ آیت کے ظاہر میں نہیں ہے، یہ استنباطی مسئلہ ہے، اور اس میں اختلاف ہوا ہے، پس ہم کیا کریں؟ یہی نا کہ جس کو جس امام سے عقیدت ہو اس کی پیروی کرے۔

دوسرا مسئلہ: آیت میں وضو کی جو ترتیب ہے وہ لازم ہے یا غیر لازم؟ یعنی اسی ترتیب سے وضو کرنی ضروری ہے یا نہیں؟ ایک آدمی کھیت سے آیا، اس نے پہلے مٹی سے آلودہ پیر دھوئے، پھر چہرہ دھویا، پھر ہاتھ دھوئے اور مسح کیا، تو وضو ہوئی یا نہیں؟ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وضو نہیں ہوئی، کیونکہ وضو میں ترتیب ضروری ہے، دوسرے ائمہ کہتے ہیں: وضو ہوگئی، ترتیب سنت ہے، ضروری نہیں، اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں جو واو ہے وہ ترتیب کے لئے ہے یا مطلق جمع کے لئے؟ اس میں اختلاف ہوا ہے، اور یہ استنباطی مسئلہ ہے، اس میں تقلید کے علاوہ چارہ کیا ہے؟

تیسرا مسئلہ: آیت وضو میں إلی المرافق اور إلی الکعبین ہے، یعنی ہاتھوں کو کہنیوں تک اور پیروں کو ٹخنوں تک دھوؤ، اس "تک" کا کیا مطلب ہے؟ کہنیاں دھونی ہیں یا نہیں؟ ٹخنے دھونے ہیں یا نہیں؟ امام زفر رحمہ اللہ کہتے ہیں: نہیں دھونے، غایت: مغیا سے خارج ہے۔ باقی ائمہ کہتے ہیں: دھونے ہیں، غایت: مغیا میں داخل ہے۔ غرض إلی کے معنی متعین کرنے میں اختلاف ہو گیا۔

چوتھا مسئلہ: وضو میں موالات شرط ہے یا نہیں؟ موالات کے معنی ہیں: ایک عضو خشک ہونے سے پہلے دوسرا عضو دھونا۔ کسی نے ایک عضو دھویا، پھر کسی سے باتیں کرنے لگا، اور دھویا ہوا عضو خشک ہو گیا، پھر اگلا عضو دھویا تو وضو ہوا یا نہیں؟ امام مالکؒ کہتے ہیں: وضو نہیں ہوا، موالات شرط ہے۔ باقی ائمہ کہتے ہیں وضو ہو گیا۔

پانچواں مسئلہ: وضو میں پیر دھونے ہیں یا ان پر مسح کرنا ہے؟ شیعہ کہتے ہیں: پیروں پر مسح کرنا ہے، اور اہل السنہ والجماعۃ کہتے ہیں: پیر دھونے ہیں، اگر ان پر خفین نہ ہوں۔ شیعہ آیت کی جر والی قراءت سے استدلال کرتے ہیں، اور اہل السنہ فتح والی قراءت سے۔

میں یہ مثالیں اس بات کی پیش کر رہا ہوں کہ جو استنباطی مسائل ہیں، جو نص کی تہ میں ہیں، ان مسائل میں غواصوں (ائمہ مجتہدین) کے درمیان اختلاف ہوئے ہیں، پس یہ تین قسم کے مسائل ہیں: ۱-نص فہمی کا اختلاف ۲-جہاں روایات میں تعارض ہو اور تطبیق میں بھی اختلاف ہو ۳-استنباطی مسائل، جن کے استنباط میں اختلاف ہو جائے تو ان تین قسم کے مسائل میں تقلید کرنی ضروری ہے، ان میں تقلید کے علاوہ کوئی راستہ نہیں، اور یہ مسائل فقہ اسلامی کا بیس فیصد حصہ ہیں، باقی اسّی فیصد مسائل وہ ہیں جو قرآن وحدیث میں صراحۃً آئے ہیں، ان میں کسی امام کی تقلید نہیں، ان میں اللہ ورسول ہی کی تقلید کی جاتی ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا مذہب

اب ہمیں امام بخاری رحمہ اللہ کا مسلک جاننا چاہئے، اس لئے کہ مصنَّف (اسم مفعول) کو جاننے کے لئے مصنِّف (اسم فاعل) کے کوائف اور اس کے مذہب سے واقفیت ضروری ہے۔ تاکہ کتاب علی وجہ البصیرت شروع کی جا سکے، امام بخاریؒ کے ضروری حالات پہلے بیان ہو چکے ہیں یہاں صرف ان کے مسلک کے بارے میں گفتگو کرنی ہے۔

حضرت امام بخاریؒ اپنے خیال میں مجتہد مطلق تھے، وہ کسی کی پیروی نہیں کرتے تھے، انھوں نے بخاری شریف میں احناف پر بھی رد کیا ہے، شوافع، مالکیہ اور حنابلہ پر بھی۔ لیکن چوتھی صدی میں جب مجتہدین بہت ہو گئے تو چار منقح اور مدون مذاہب کو تقلید کے لئے متعین کیا گیا اور باقی کو چھوڑ دیا گیا، ان میں حضرت امام بخاریؒ کے مسلک کو بھی چھوڑ دیا گیا ہے، آج دنیا میں کوئی ان کی تقلید کرنے والا نہیں، بلکہ چوتھی صدی سے پہلے بھی کوئی ان کی تقلید نہیں کرتا تھا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ جو امام بخاری رحمہ اللہ کے خاص شاگرد ہیں، جن کی محبت وعقیدت کا یہ حال تھا کہ امام بخاریؒ کی وفات پر

روتے روتے آنکھیں کھودیں، انھوں نے بھی پوری ترمذی شریف میں ایک جگہ بھی امام بخاریؒ کا کوئی فقہی قول بیان نہیں کیا، جبکہ وہ ترمذی شریف میں جگہ جگہ رجال حدیث اور اسناد حدیث کے سلسلہ میں امام بخاریؒ کی رائیں نقل کرتے ہیں اور بیس سے زائد مجتہدین کے فقہی اقوال ترمذی شریف میں لائے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام ترمذیؒ کے نزدیک امام بخاریؒ درجۂ اجتہاد کو نہیں پہنچے تھے، جیسے پانچویں صدی میں ابن جریر طبری رحمہ اللہ بہت بڑے مؤرخ اور محدث ہوئے ہیں، ان کا بھی دعوی تھا کہ وہ امت کے پانچویں مجتہد ہیں مگر امت نے ان کو مجتہد نہیں مانا۔ اسی طرح امام بخاریؒ اگر چہ خود کو مجتہد سمجھتے تھے مگر امت نے ان کو مجتہد تسلیم نہیں کیا۔

امام بخاری رحمہ اللہ اور فقہ حنفی:

جاننا چاہئے کہ صحاح ستہ کے مصنفین چونکہ حجازی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے قدرتی بات ہے کہ ان کو عراقی مکتب فکر سے کلی مناسبت نہیں ہوسکتی۔ ان حضرات نے اہل الرائے کی فقہ کا مطالعہ ضرور کیا ہے، مگر اس کو باقاعدہ پڑھا نہیں، اور مطالعہ اور اساتذہ سے پڑھنے میں فرق ظاہر ہے۔ اور امام بخاری رحمہ اللہ کے ساتھ تو ابتداء میں کچھ ایسے عوامل بھی پیش آئے ہیں جس کی وجہ سے انھوں نے فقہ حنفی کی تحصیل چھوڑ کر حدیث کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ''امام بخاری رحمہ اللہ کو مذہب حنفی کی پوری واقفیت نہ تھی، جس کی وجہ سے باب الحیل وغیرہ میں ائمہ حنفی کی طرف مسائل کا انتساب غلط کیا ہے'' (انوار الباری ۱:۵)

دیگر محدثین کی صورت حال یہ نہیں تھی۔ اور امام ترمذیؒ نے ترمذی شریف میں جو امام ابوحنیفہ اور صاحبین رحمہم اللہ کا نام لے کر کوئی قول ذکر نہیں کیا، اس کی صحیح وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں کتابوں سے نقل کرنا جائز نہیں تھا، سند سے اقوال روایت کئے جاتے تھے۔ کتاب العلل میں امام ترمذیؒ نے مجتہدین کے اقوال کی سندیں لکھی ہیں۔ فقہاء کے یہ اقوال حدیثوں کے ساتھ روایت کئے جاتے تھے، سفیان ثوری اور ابن المبارک رحمہما اللہ کے اقوال جو انھوں نے مجلس درس میں بیان کئے تھے وہ امام ترمذی رحمہ اللہ کو سند کے ساتھ پہنچے تھے، اور احناف کے اقوال سند کے ساتھ نہیں پہنچے تھے، مگر حجازی مکتب فکر کے حضرات: عراقی مکتب فکر کی فقہ کا مطالعہ کرتے تھے، اس طرح وہ ان کے فقہی اقوال سے واقف تھے، اسی طرح عراقی مکتب فکر کے حضرات: حجازی مکتب فکر کے محدثین کی کتابیں پڑھتے تھے اور وہ ان کی حدیثوں سے واقف تھے۔ جیسے امام طحاویؒ شرح معانی الآثار میں ائمہ احناف کا تو نام لیتے ہیں مگر دوسرے ائمہ کے لئے ذھب قوم کہتے ہیں، اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان کے اقوال امام طحاوی کو سند کے ساتھ نہیں پہنچے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کو دو ابتلاء پیش آئے:

پہلا ابتلاء: نیشاپور میں پیش آیا۔ جب امام بخاری رحمہ اللہ نیشاپور میں وارد ہوئے تو آپ کا شاندار استقبال کیا

گیا۔ پھر جب انھوں نے درسِ حدیث شروع کیا تو سب محفلیں سونی پڑگئیں، کہتے ہیں: اس سے امام ذُہلی رحمہ اللہ کے دل میں حسد پیدا ہوا، اور کسی نے بھری محفل میں پوچھا: **ما تقول في اللفظ بالقرآن، مخلوق هو أم غير مخلوق؟** ہم جو قرآن پڑھتے ہیں: اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں، آیا وہ پڑھنا حادث ہے یا قدیم؟ امام بخاریؒ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ سائل بار بار کھڑے ہو کر یہی سوال کرتا رہا، تیسری مرتبہ سوال کرنے پر امام صاحب نے جواب دیا: **القرآن كلام الله غير مخلوق، وأفعال العباد مخلوقة، والامتحان بدعة:** قرآن اللہ کا کلام ہے اور قدیم ہے (کیونکہ یہ اللہ کی صفت ہے) اور بندوں کے افعال حادث ہیں یعنی انسان کا پڑھنا حادث ہے، اور آزمائش کرنا ناجائز ہے، اس پر سائل نے اور دوسرے لوگوں نے ہنگامہ بپا کر دیا (سیر اعلام النبلاء ۱۲: ۴۵۳)

دوسرا ابتلاء: پھر جب آپ بخاری پہنچے تو وہاں بھی چین نہیں ملا، مؤرخین نے اس کی دو وجہیں لکھی ہیں: ایک: بخاری کے امیر خالد نے آپ سے درخواست کی کہ اس کے گھر آکر اس کی اولاد کو بخاری شریف اور التاریخ الکبیر پڑھائیں۔ امام صاحب نے انکار کیا، اس نے دوسری درخواست کی کہ اس کی اولاد کے لئے علاحدہ مجلس منعقد کریں، جس میں دوسرے طلباء شریک نہ ہوں، امام صاحب نے یہ درخواست بھی نہیں مانی تو اس کا پارہ چڑھ گیا، اور آپ کو بخاری سے نکال دیا۔

اور حاکم نے دوسری وجہ لکھی ہے: **كان جماعة يختلفون إليه، يُظهرون شِعار أهل الحديث من إفراد الإقامة، ورفع الأيدي في الصلاة وغير ذلك:** کچھ لوگ (غیر مقلدین) آپ کے پاس آنے جانے لگے، اور وہ غیر مقلدوں کے خاص مسائل برملا کرنے لگے، جیسے اقامت اکہری کہنا، نماز میں رفع یدین کرنا وغیرہ تو لوگوں نے کہا: یہ بندہ ہنگامہ بپا کرے گا، اور شہر کا سارا ماحول بگاڑ ڈالے گا، اور محمد بن یحییٰ نے اس کو نیشاپور سے نکال دیا ہے درانحالیکہ وہ محدثین کے پیشوا ہیں، چنانچہ لوگوں نے امیر بخاری سے مدد طلب کی اور امام صاحب کو بخاری سے چلتا کیا (سیر ۱۳: ۴۶۵)

یہی غیر مقلدین جو امام بخاری رحمہ اللہ کے اخراج کا سبب بنے آج تک ان کی کتاب کے گرد ہالہ بنائے ہوئے ہیں، وہ ہر مسئلہ میں مطالبہ کرتے ہیں کہ بخاری شریف میں حدیث دکھاؤ، گویا سب صحیح حدیثیں بخاری شریف میں آگئی ہیں۔ حالانکہ خود امام بخاری رحمہ اللہ نے صراحت فرمائی ہے کہ تمام صحیح حدیثیں میں نے اپنی کتاب میں نہیں لیں۔ جو صحیح حدیثیں میں نے کتاب میں نہیں لیں وہ اس سے زیادہ ہیں جو میں نے لی ہیں۔ کتاب کے طویل ہو جانے کے اندیشہ سے امام صاحب نے ایسا کیا ہے۔ مگر غیر مقلدین لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں، اور یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ساری صحیح حدیثیں بخاری شریف میں آگئی ہیں —— اور یہ تو آخر کا حال ہے۔ داؤد ظاہری تو شروع سے امام بخاری کے ساتھ لگے رہے ہیں۔ فیض الباری (۱: ۲۴۳) میں ہے کہ طلب حدیث کے اسفار میں داؤد ظاہری امام بخاری کے ساتھ رہے ہیں۔ اس طرح ان لوگوں نے امام بخاری رحمہ اللہ کو متاثر بھی کیا ہے اور بدنام بھی کیا ہے، بلکہ آج تک کر رہے ہیں۔

عبارت میں پیچیدگی:

اور بخاری شریف کوعلی وجہ البصیرت شروع کرنے کے لئے یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کا مقام اگر چہ حدیث میں امیر المؤمنین فی الحدیث کا ہے مگر آپ کی تحریرات میں پیچیدگی ہوتی ہے۔شراح امام صاحب کی مراد پانے میں بہت جگہ پریشان ہوجاتے ہیں اور کلام میں تعقید تین وجوہ سے ہوتی ہے: مضمون کی بلندی سے، عبارت میں ایجاز سے اور بیان میں عدم سلاست سے۔امام بخاری رحمہ اللہ کے کلام میں تینوں وجوہ جمع ہیں۔مضمون مجتہدانہ ہوتا ہے، تراجم کی عبارت بہت مختصر ہوتی ہے اور آپ کی عبارت میں امام ترمذی رحمہ اللہ جیسی سلاست بھی نہیں ہوتی، اس لئے تراجم ابواب سمجھنے کے لئے بعض جگہ بہت غور کرنا پڑتا ہے۔

ثلاثیات بخاری:

امام بخاری رحمہ اللہ سے آنحضور ﷺ تک کم سے کم تین واسطے ہیں، ان حدیثوں کو ثلاثیات بخاری کہتے ہیں اور وہ بائیس حدیثیں ہیں جو بخاری شریف کا امتیاز ہیں۔اور امام احمد رحمہ اللہ کی مسند میں ڈھائی سو ثلاثیات ہیں، اور امام مالک رحمہ اللہ کی موطا میں ثُنائیات بھی ہیں، اور امام اعظم رحمہ اللہ کی مُسند میں وحدانیات بھی ہیں، کیونکہ امام اعظمؒ کا بعض صحابہ سے سماع ہے [۱] اس لئے صرف صحابی کا ایک واسطہ ہے، اور ترمذی شریف میں صرف ایک ثلاثی حدیث ہے، اور ابوداؤد ونسائی میں ثلاثیات نہیں۔

بخاری شریف کی سند

میری سند امام بخاری رحمہ اللہ تک بائیس واسطوں سے پہنچتی ہے۔آپ حضرات کے لئے میرا ایک واسطہ بڑھ جائے گا۔

——— میں بخاری شریف دو حضرات سے روایت کرتا ہوں:

اول: فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مرادآبادی قدس سرہ (۱۳۰۷-۱۳۹۲ھ) آپ نے ۱۳۲۸ھ میں فراغت حاصل کی ہے، آپ دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔اور علامہ کی وفات کے بعد صدر المدرسین بھی ہوئے۔

دوم: جامع المعقول والمنقول حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہ (۱۳۰۴-۱۳۸۷ھ) آپ نے

(۱) امام اعظم رحمہ اللہ کی ولادت سنہ ۸۰ھ میں ہوئی ہے۔اس وقت متعدد صحابہ بقید حیات تھے، جن سے امام اعظمؒ کی ملاقات ہوئی ہے، اور ان سے روایت بھی کی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: قواعد فی علوم الحدیث ص:۳۰۶ تحقیق شیخ عبد الفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ)

۱۳۲۷ھ میں فراغت حاصل کی، آپ دارالعلوم دیوبند میں صدر المدرسین کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے، احقر نے آپ سے مقدمہ مسلم مع کتاب الایمان اور ترمذی جلد اول پڑھی ہے، اور اوائل کتب حدیث پڑھ کر عام اجازت حاصل کی ہے۔

(۲) —— مذکورہ دونوں حضرات روایت کرتے ہیں زعیم حریت، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن بن ذوالفقار علی صاحب دیوبندی رحمہما اللہ (۱۲۶۸-۱۳۳۹ھ) سے، آپ ۱۳۰۸ھ سے تا وفات دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین رہے۔ بخاری شریف اور ترمذی شریف آپ کے زیر درس رہتی تھیں، آپ سے چار اکابر دارالعلوم صحیح بخاری شریف اور دیگر کتب حدیث روایت کرتے ہیں۔

اول: محدث العصر علامہ محمد انور شاہ بن محمد معظم شاہ کشمیری قدس سرہ (۱۲۹۲-۱۳۵۲ھ) آپ نے ۱۳۱۴ھ میں فراغت حاصل کی ہے۔

دوم: شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب بن سید حبیب اللہ صاحب فیض آبادی، ثم مدنی، ثم دیوبندی قدس سرہ (۱۲۹۶-۱۳۷۷ھ) آپ نے ۱۳۱۶ھ میں فراغت حاصل کی ہے۔

سوم: فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب قدس سرہ مرادآبادی (۱۳۰۷-۱۳۸۷ھ) آپ نے ۱۳۲۷ھ میں فراغت حاصل کی ہے۔

چہارم: حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہ (۱۳۰۴-۱۳۸۷ھ) آپ نے ۱۳۲۷ھ میں فراغت حاصل کی ہے۔ حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ کا دور تو اب ختم ہوگیا۔ اب دنیا میں شاہ صاحب کا کوئی شاگرد نہیں رہا، البتہ شیخ الاسلام حضرت مدنی، فخر المحدثین حضرت مرادآبادیؒ اور علامہ بلیاویؒ کے شاگرد موجود ہیں، اس وقت اس درسگاہ میں (دارالعلوم دیوبند کی دارالحدیث میں) جتنے اساتذۂ کرام حدیث پڑھاتے ہیں وہ یا تو حضرت مدنی کے شاگرد ہیں یا حضرت مرادآبادی اور علامہ بلیاوی کے۔

(۳) —— حضرت شیخ الہند: حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ (۱۲۴۸-۱۲۹۷ھ) سے روایت کرتے ہیں۔ حضرت نانوتویؒ نے علوم عقلیہ ونقلیہ سے فارغ ہوکر دہلی کے ایک مطبع میں جو حضرت مولانا احمد علی بن شیخ لطف اللہ صاحب محدث سہارن پوری کا تھا تصحیح کتب کا کام کیا ہے، ۱۲۷۳ھ میں حضرت نے انگریزوں کے خلاف شاملی کے جہاد میں شرکت کی، اس تحریک کے ناکام ہونے کے بعد حضرت روپوش ہوگئے، کیونکہ حضرت کے خلاف وارنٹ تھا، پھر ۱۲۷۷ھ میں سفر حج پر تشریف لے گئے اور دوران سفر قرآن کریم حفظ کیا، حرمین شریفین سے واپسی کے بعد میرٹھ میں قیام کیا اور ایک مطبع میں جس کے مالک ممتاز علی خان صاحب تھے تصحیح کتب کا کام کیا۔

جس وقت دیوبند میں حاجی عابد حسین صاحب قدس سرہ نے دارالعلوم کی بنیاد رکھی: حضرت نانوتوی قدس سرہ میرٹھ میں تھے، حضرت کے مشورے سے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی تھی، اور حضرت اس کی مجلس شوری کے رکن رکین تھے

کچھ زمانہ کے بعد حضرت دیو بند تشریف لائے اور چھتہ کی مسجد میں قیام فرمایا۔ حضرت نانوتویؒ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم نہیں رہے۔ اساتذہ کو جب کوئی مشکل پیش آتی تو وہ حضرت سے رجوع کرتے، حضرت نانوتوی قدس سرہ سے: حضرت شیخ الہندؒ نے میرٹھ کے قیام کے زمانہ میں دورہ کی تمام کتابیں پڑھی ہیں۔

④ —— حضرت نانوتوی قدس سرہ: حضرت شاہ عبدالغنی بن شاہ ابی سعید مجددی دہلوی، ثم مدنی قدس سرہ (۱۲۳۵-۱۲۹۶ھ) سے حدیث روایت کرتے ہیں —— حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی: حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد بن عبدالاحد سرہندی رحمہ اللہ کے خاندان سے ہیں، جب انگریزی حکومت کا ہندوستان پر پوری طرح تسلط ہوگیا اور تحریک جہاد بالاکوٹ میں ناکام ہوگئی تو انگریزی حکومت نے حضرت کے خلاف وارنٹ جاری کیا، کیونکہ آپ اس تحریک کے پشت پناہ تھے، اس لئے حضرت ۱۲۷۳ھ میں ہجرت کر کے اولاً مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، پھر مدینہ منورہ میں فروکش ہوگئے، اور وہیں وفات پائی۔

⑤ —— شاہ عبدالغنی مجددی: حضرت ابوسلیمان محمد اسحاق بن محمد افضل عمری دہلوی ثم مکی رحمہ اللہ (۱۱۹۶-۱۲۶۲ھ) سے روایت کرتے ہیں —— شاہ محمد اسحاق: سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ صاحب کے نواسے ہیں، شاہ عبدالعزیزؒ نے ان کو اپنا بیٹا اور نائب بنایا تھا، اور اپنی تمام کتابیں اور گھر وغیرہ انہی کو عطا کر دیا تھا، چنانچہ حضرت اپنے نانا کی جگہ بیٹھ کر طویل عرصہ تک مخلوق خدا کو فیضیاب کرتے رہے، پھر ۱۲۴۰ھ میں سفرحج پر تشریف لے گئے اور شیخ عمر بن عبدالکریم مکیؒ (متوفی ۱۱۴۷ھ) سے اجازت حاصل کی، پھر ہندوستان واپس تشریف لائے، اور دہلی میں سولہ سال تک درس وتدریس میں مشغول رہے، پھر ۱۲۵۸ھ میں مع اہل وعیال مکہ کی طرف ہجرت فرمائی اور وہیں واصل بحق ہوئے، اور جنت المعلی میں حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا کے جوار میں مدفون ہوئے۔

⑥ —— شاہ محمد اسحاقؒ: سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی قدس سرہ (۱۱۵۹-۱۲۳۹ھ) سے روایت کرتے ہیں —— حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب زہدوتقوی، علم وذکاوت، فہم وفراست اور حفظ میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے، حضرت کا تاریخی نام غلام حلیم تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں فراغت حاصل کی، اور درس وتدریس میں مشغول ہوئے، علماء کی ایک جماعت نے آپ سے استفادہ کیا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کی وفات کے وقت آپ کی عمر سولہ سال تھی، والد کے انتقال کے بعد حضرت شاہ صاحب نے شیخ نوراللہ بڈھانوی، شیخ محمد امیر کشمیری، اور شیخ محمد عاشق بن عبیداللہ پھلتی سے جوآپ کے والد کے اجل تلامذہ میں سے تھے استفادہ کیا اور اجازت حاصل کی۔

⑦ —— شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ: مسند الہند شاہ ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم عمری دہلوی قدس سرہ (۱۱۱۴-۱۱۷۶ھ) سے روایت کرتے ہیں —— شاہ ولی اللہ صاحبؒ: مُسند الہند ہیں، برصغیر کی حدیث کی تمام سندیں آپ کے واسطہ سے اوپر جاتی ہیں، آپ انتہائی ذہین تھے، سات سال کی عمر میں حافظ قرآن ہوگئے تھے، اور پندرہ سال کی عمر میں تمام

علوم متداولہ سے فارغ ہوگئے تھے، اس کے بعد تقریباً تیرہ سال دہلی میں درس وتدریس میں مشغول رہے، پھر ۱۱۴۳ھ میں حجاز مقدس کا سفر کیا، اور دوسال وہاں رہ کر ہر مکتب فکر کے علماء سے استفادہ کیا، اور اجازتِ حدیث حاصل کر کے دو سال بعد ہندوستان واپس تشریف لائے اور درس وتدریس نیز تصنیف وتالیف میں مشغول ہوئے۔

⑧ ـــــ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ: شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم بن حسن کُردی کورانی شہرزوری ثم مدنی شافعی رحمہ اللہ (۱۰۸۱-۱۱۵۴ھ) سے حدیث روایت کرتے ہیں۔

⑨ ـــــ شیخ ابوطاہر کردیؒ: اپنے والد شیخ ابو اسحاق شہاب الدین ابراہیم بن حسن کردی کورانی شہرزوری ثم مدنی شافعی (۱۰۲۵-۱۱۰۱ھ) سے روایت کرتے ہیں، آپ فقہائے شافعیہ میں درجۂ اجتہاد تک پہنچے ہوئے تھے، اسّی سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں سے الأَمَمُ لإيقاظ الْهِمَم طبع ہوگئی ہے۔

⑩ ـــــ شیخ ابراہیم کردی: شیخ ابو اسحاق: صفی الدین احمد بن محمد بن یونس دَجانی، قُشاشی، مالکی ثم شافعیؒ (متوفی ۱۰۷۱ھ) سے روایت کرتے ہیں، آپ دَجانی قبیلہ کی طرف منسوب ہیں آپ کے دادا یونس قُدس سے مدینہ منتقل ہوگئے تھے، اور قُشَاشہ (کباڑ) بیچتے تھے اس لئے یہ نسبت ہوگئی، آپ ستر کتابوں کے مصنف ہیں ان میں سے الدرَّةُ الثَّمينة فيما لزائر النبی صلی اللہ علیہ وسلم إلى المدينة طبع ہوگئی ہے۔

⑪ ـــــ قشاشی رحمہ: ابو المواہب احمد بن علی بن عبد القدوس شنّاوی، مصری ثم مدنی (۹۷۵-۱۰۲۸ھ) سے روایت کرتے ہیں، شنُّو مصر کے غربی حصہ میں ایک دیہات ہے۔

⑫ ـــــ شنّاوی رحمہ اللہ: علامہ شمس الدین محمد بن شہاب الدین احمد بن حمزہ رملی، منوفی، مصری انصاری معروف بہ شافعی صغیر (۹۱۹-۱۰۰۴ھ) سے روایت کرتے ہیں، رملہ: منوفیہ (مصر) کا گاؤں ہے فقہ شافعی میں نہاية المحتاج إلى شرح المنهاج وغیرہ آپ کی متعدد کتابیں ہیں۔

⑬ ـــــ رملی رحمہ اللہ: شیخ الاسلام، قاضی القضاۃ، زین الدین زکریا بن محمد انصاری، قاہری، ازہری شافعی (۸۲۳-۹۲۶ھ) سے روایت کرتے ہیں، آپ کی تفسیر فتح الرحمان اور تحفۃ الباری علی صحیح البخاری وغیرہ کتابیں مطبوعہ ہیں۔

⑭ ـــــ شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمہ اللہ: امام الائمہ، حافظ الدنیا ابوالفضل احمد بن علی کنانی عسقلانی ثم قاہری شافعی معروف بہ ابن حجر عسقلانی (۷۷۳-۸۵۲ھ) سے روایت کرتے ہیں، فتح الباری شرح بخاری، تہذیب التہذیب اور نخبۃ الفکر وغیرہ کتابوں کے مصنف ہیں اور علمی دنیا کی معروف شخصیت ہیں۔

⑮ ـــــ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ: مسند القاہرہ شیخ ابراہیم بن احمد بن عبدالواحد تنُّوخی، بَعلی، ثم شامی ثم قاہری (۷۱۰-۸۰۰ھ) سے روایت کرتے ہیں۔

⑯ ـــــ تنوخی رحمہ اللہ: شہاب الدین ابوالعباس احمد بن طالب مقرنی ثم صالحی (۶۲۳-۷۳۰ھ) سے روایت

کرتے ہیں، آپ نے ایک سوسات سال کی عمر میں وفات پائی، اور وفات کے دن بھی صحیح بخاری کا سبق پڑھایا۔

⑰ ـــــ شیخ شہاب الدین: ابوعلی حسین بن مبارک زَبِیْدی ثم بغدادی حنفی (۵۴۶-۶۳۱ھ) سے روایت کرتے ہیں۔

⑱ ـــــ شیخ ابوعلی: شیخ عبدالاول بن عیسیٰ بن شعیب سِجْزی ہروی (۴۵۸-۵۵۳ھ) سے روایت کرتے ہیں، سِجزی: سیستان کی طرف نسبت ہے۔

⑲ ـــــ شیخ سجزیؒ: ابوالحسن عبدالرحمٰن بن محمد بن مظفر داؤدی بُوسنجی (۳۷۴-۴۶۴ھ) سے روایت کرتے ہیں۔ بُوسَنج: ہرات کے مضافات میں ایک گاؤں ہے، آپ نے ۳۸۱ھ میں ابن حَمُّویہ سے بخاری شریف پڑھی ہے۔

⑳ ـــــ داؤدی رحمہ اللہ: ابومحمد عبداللہ بن احمد بن حَمُّویہ، حموی، سرخسی (۲۹۳-۳۸۱ھ) سے روایت کرتے ہیں، آپ نے ۳۱۶ھ میں فربریؒ سے بخاری شریف سنی ہے۔

㉑ ـــــ ابن حَمُّویۃ رحمہ اللہ: ابوعبداللہ محمد بن یوسف بن مطر، فربری رحمہ اللہ (۲۳۱-۳۲۰ھ) سے روایت کرتے ہیں، فِرَبْر: بخارا کے مضافات میں ایک گاؤں ہے۔

㉒ ـــــ فِرَبْری رحمہ اللہ: حضرت امام بخاری رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں ـــــ امام بخاری رحمہ اللہ سے بخاری شریف نوے ہزار تلامذہ نے سنی ہے، لیکن سب کی سندیں منقطع ہوگئیں، صرف فربری رحمہ اللہ کی سند باقی ہے، انھوں نے بخاری شریف امام بخاریؒ کے وفات والے سال عنفوان شباب میں پڑھی ہے۔

اجازتِ حدیث کے لئے تین شرطیں:

اس کے بعد ایک خاص بات یاد رکھنی چاہئے۔ حدیث کی اجازت تین شرطوں کے ساتھ دی جاتی ہے، جب یہ شرطیں پائی جائیں گی اجازت ہوگی ورنہ نہیں:

پہلی شرط: طالب علم نے استاذ کے سامنے حدیث پڑھی ہو یا سنی ہو، اگر اس نے نہ حدیث پڑھی نہ سنی، غیر حاضر تھا یا بیٹھا ہوا سوتا رہا تو اس کو اجازت نہ ہوگی۔

دوسری شرط: وہ حدیث کو سمجھا بھی ہو، جو حدیث کو نہیں سمجھا اس کو اجازت نہ ہوگی۔

تیسری شرط: تَثَبُّت یعنی حدیث کا مضبوط یاد ہونا، اور پوری احتیاط کے ساتھ آگے بیان کرنا۔

لہٰذا طلباء کو سبق میں پابندی سے حاضر رہنا چاہئے، کوئی حدیث پڑھنے سے یا سننے سے رہ نہ جائے، اور خوب توجہ سے حدیث کو سمجھنا چاہئے اور آئندہ حدیث بیان کرتے وقت پوری احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ اور یہ پڑھنا ہی اجازت ہے۔ تصدّی للإقراء (استاذ کا پڑھانے کے لئے بیٹھنا) ہی اجازت ہوتی ہے، سال کے آخر میں مستقل اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اوائل کتب پڑھ کر جو اجازت دی جاتی ہے وہ کاملین کو دی جاتی ہے، ہر کسی کو نہیں دی جاتی، چنانچہ دارالعلوم کی سند میں بھی حدیث کی اجازت نہیں دی جاتی، صرف یہ لکھا جاتا ہے کہ اس فاضل نے حدیث کی یہ یہ کتابیں پڑھی ہیں اور بس۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب: كيفَ كَانَ بَدْءُ الوَحْيِ إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم

وحی کی تاریخ

بَدءٌ: کے لغوی معنی ہیں: ابتداء، آغاز، اس باب میں پانچ حدیثیں ہیں، بعض حضرات نے ان کو سات بنایا ہے، ان میں سے صرف تیسری حدیث میں آغاز وحی کا بیان ہے، باقی حدیثوں میں ابتداء وحی کا بیان نہیں، اس لئے یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ اس باب میں دوسری حدیثیں کیوں لائے ہیں؟

جواب: بدءٌ خاص اصطلاح ہے، امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ کے نزدیک بَدأٌ کے معنی ہیں: تاریخ، احوال: از ابتداء تا انتہاء، باب بدأ الحیض میں بھی یہی معنی ہیں: یعنی حیض کے احوال: از ابتداء تا انتہاء۔ باب بدأ الأذان میں بھی یہی معنی ہیں: اذان کے احوال: از ابتداء تا انتہاء پس بدأ الوحی کے معنی ہیں: وحی کے احوال: شروع سے آخر تک، اب سب حدیثیں باب سے منطبق ہوجائیں گی، کوئی بے جوڑ نہیں رہے گی، کیونکہ الگ الگ روایات میں وحی کے الگ الگ احوال مذکور ہیں۔

پھر امام بخاری رحمہ اللہ سورۃ النساء کی آیت (۱۶۳) لائے ہیں: ﴿إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوْحٍ وَالنَّبِيِّيْنَ مِنْ بَعْدِهِ﴾ یہ آیت لکھ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ وحی غیر متلو نبی ﷺ کی خصوصیت نہیں، ایسی وحی گذشتہ نبیوں پر بھی آتی رہی ہے۔ انبیاء علیہم السلام ٹیپ ریکارڈ کی مثال نہیں ہیں کہ جو کچھ اس میں بھر دیا گیا وہی بولتا ہے، انبیاء تو سب سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں، وہ وحی کی تبیین وتشریح کرتے ہیں، اور ان کی وضاحتیں بھی وحی ہوتی ہیں۔

حدیث: علقمۃ بن وقاص لیثی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو منبر پر یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اعمال کا نیتوں سے موازنہ کیا ہوا ہے، اور انسان کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی ہے، یعنی عمل کا ثمرہ نیت پر مرتب ہوتا ہے، مثلاً: جس نے دنیا کمانے کے لئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لئے ہے، جس کی اس نے نیت کی ہے، یعنی اس کی ہجرت لاحاصل ہے، اس کا کوئی ثواب نہیں ملے گا۔

تشریح: اس حدیث کے ضمن میں چند باتیں جاننی چاہئیں:

پہلی بات: یہ حدیث بہت اہم ہے اور اپنے جلو میں ایک اصولی ہدایت لئے ہوئے ہے۔ امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے پانچ لاکھ حدیثوں میں سے چار حدیثیں ایسی منتخب کی ہیں جو دین کا خلاصہ ہیں:

پہلی حدیث: إنما الأعمال بالنیات ہے۔ یعنی اعمال کی قبولیت وعدم قبولیت کا مدار صحیح اور فاسد نیت پر ہے، ہر عمل کرنے والے کو اس کی نیت کے مطابق صلہ ملتا ہے، صحیح نیت ہے تو ثواب ملتا ہے، مباح نیت ہے تو عمل لاحاصل رہتا ہے، اور بری نیت ہے تو گنہ ہوتا ہے۔ مثلاً ہجرت ایک عمل ہے، اگر ہجرت کرنے والی کی نیت صحیح ہے تو اس کی ہجرت مقبول ہے، ورنہ اس کی ہجرت کا کوئی ثواب نہیں۔

دوسری حدیث: مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْأِ تَرْکُه مالا یَعْنِیْه: آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی باتوں سے پرہیز کرے، بے کار باتوں میں وقت ضائع نہ کرے، یہ بہترین مسلمان ہے۔

تیسری حدیث: لایکون المُؤْمِنُ مؤمناً حتّٰی یَرضٰی لأخیه ما یَرضاہ لِنَفْسِه: آدمی مؤمن اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے بھائی (مسلمان) کے لئے وہی بات پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

چوتھی حدیث: الحلالُ بَیِّنٌ والحرامُ بَیِّنٌ: یعنی مؤمن کا مزاج یہ بن جانا چاہئے کہ وہ محتاط زندگی گذارے، فرمایا: حلال واضح ہے پس اس کو بے تکلف اختیار کرو، اور حرام بھی واضح ہے پس اس کے قریب بھی مت جاؤ، اور دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ امور ہیں جن کے بارے میں بہت سے لوگ نہیں جانتے کہ وہ حلال ہیں یا حرام؟ ایسی مشتبہ چیزوں کے بارے میں مؤمن کا مزاج یہ ہونا چاہئے کہ اس سے بچے جب تک جائز ہونا واضح نہ ہو جائے۔ اسی صورت میں آدمی کا دین اور اس کی عزت محفوظ رہے گی (تفصیل کے لئے دیکھیں: تحفۃ الالمعی ۴: ۱۰۳)

دوسری بات: إنما الأعمال بالنیات: میں إنما کلمۂ حصر ہے، اس کے بعد ہمیشہ مبتداء خبر آتے ہیں۔ اعمال: مبتداء ہے اور بالنیات: ظرف مستقر ہو کر خبر ہے —— جار مجرور کا مُتعلَّق (اسم مفعول) لفظوں میں مذکور ہو تو اس کو ظرف لغو کہتے ہیں اور محذوف ہو تو وہ ظرف مستقر ہے —— اور مُتعلَّق: یا تو فعل ہوتا ہے یا شبہ فعل، اسم میں متعلق بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی، پس جار مجرور اعمال سے متعلق نہیں ہو سکتے —— جار مجرور مُتعلِّق (بکسر اللام) ہیں اور وہ جس کے ساتھ جڑتے ہیں وہ مُتعلَّق (بفتح اللام) ہے —— حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری (۱: ۱۳) میں متعدد متعلق پوشیدہ مانے ہیں، فرماتے ہیں: ولابد من محذوف یتعلق به الجار والمجرور، فقیل: تُعتبر، وقیل تُکمل، وقیل: تصح، وقیل: تحصل، وقیل: تستقر: میرے نزدیک ان میں راجح فعل: تُعتَبَرُ یا اسم مفعول: مُعْتَبَرۃ ہے، پس تقدیر عبارت: الأعمال تُعْتَبَر بالنیات، یا الأعمال مُعْتَبَرۃ بالنیات ہے۔

لفظ اعتبار قرآن میں بھی آیا ہے ﴿فَاعْتَبِرُوْا یَا أُولِی الْأَبْصَارُ اور الفوز الکبیر میں آپ نے 'فن اعتبار' پڑھا ہے،

اعتبار کے معنی ہیں: موازنہ کرنا، اندازہ کرنا، جیسے کفش دوز جوتے کی تلی چمڑے پر رکھ کر اس کے برابر کاٹتا ہے، یہی اعتبار (موازنہ کرنا) ہے اور یہ قیاس نہیں ہے بلکہ قیاس کی ایک خاص نوعیت ہے۔ پس نبی پاک ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن اعمال کا نیتوں کے ساتھ موازنہ کیا جائے گا، اعمال کو نیتوں سے ملا کر دیکھا جائے گا، مگر بات ابھی واضح نہیں ہوئی اس لئے فرمایا: وإنما لکل امرئ مانوی: یہاں بھی إنما کلمۂ حصر ہے، پس اس کے بعد مبتداء خبر ہونگے، اور لکل امرئ: خبر مقدم ہے اور مانوی: مبتداء مؤخر، یعنی ہر شخص نے جیسی نیت کی ہے ویسا ہی اس کو بدلہ ملے گا، یہ پہلے ہی جملہ کی شرح ہے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔

مگر بات اب بھی واضح نہیں ہوئی، اس لئے آپ نے اس کو ایک مثال سے سمجھایا، مثال سے معنویات محسوسات بن جاتے ہیں۔ جس وقت آنحضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے ہجرت کا عمل جاری تھا، ہجرت کر کے لوگ مدینہ شریف آرہے تھے، چنانچہ نبی ﷺ نے ہجرت کی مثال بیان فرمائی کہ تین شخص ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے، ایک: اس لئے آیا کہ ابھی اسلام کا پودا جما نہیں، اس کی آبیاری کی ضرورت ہے، دشمنوں سے اس کی حفاظت ضروری ہے، اس نے سوچا: اگر میں وطن میں رہا تو اسلام کی کوئی خدمت نہیں کرسکوں گا۔ اس لئے وہ وطن چھوڑ کر مدینہ منورہ آ گیا تا کہ اسلام کی خدمت کر سکے۔

دوسرا شخص اس لئے ہجرت کر کے آیا کہ اس کی گاؤں میں پرچون کی دکان تھی، گاؤں میں سے لوگ ہجرت کر کے مدینہ جارہے ہیں، اور گاؤں کی آبادی گھٹ رہی ہے، اس لئے اس کی دکان پھیکی پڑ گئی، اس نے سوچا: مدینہ کی آبادی بڑھ رہی ہے اگر میں اپنی دکان وہاں لے جاؤں تو خوب چلے گی، میلے ٹھیلے میں لوگ اسی لئے دکانیں لگاتے ہیں کہ وہاں لوگ زیادہ جمع ہوتے ہیں۔ اور بکری خوب ہوتی ہے، چنانچہ اس شخص نے اسی نیت سے ہجرت کی۔

تیسرا شخص ایک عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے، وہ عورت مسلمان ہو کر مدینہ جا چکی ہے، اس لئے اس نے سوچا: میں بھی ہجرت کر کے مدینہ چلا جاؤں تا کہ اس عورت سے نکاح ہو سکے، چنانچہ وہ بھی ہجرت کر کے مدینہ چلا آیا۔

آنحضور ﷺ نے فرمایا: پہلا شخص جس نے دینی مقصد سے ہجرت کی ہے اس کی ہجرت اللہ ورسول کی طرف ہے، اس کو ہجرت پر اجر وثواب ملے گا، اور دوسرے اور تیسرے بندوں کی ہجرت دنیوی مقاصد سے ہے اس لئے ان کو کوئی اجر وثواب نہیں ملے گا۔

فائدہ (۱): حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ام قیسؓ نامی عورت کے پاس شادی کا پیغام بھیجا، ام قیسؓ نے شرط لگائی کہ وہ مدینہ ہجرت کر کے آجائے تو شادی ہو سکتی ہے، چنانچہ وہ شخص ہجرت کر کے مدینہ آ گیا اور مہاجر ام قیسؓ کے نام سے مشہور ہو گیا (اصابہ تراجم نساء ترجمہ ۱۴۵۹)

فائدہ (۲): آنحضور ﷺ نے جو مثالیں دی ہیں وہ مباح مقاصد سے ہجرت کی مثالیں ہیں، ناجائز مقصد سے بھی ہجرت ہو سکتی ہے، آپ نے قاعدہ کلیہ بیان فرمایا ہے: فهجرته إلى ما هاجر إليه: یہ قاعدہ مباحات کے ساتھ خاص

نہیں، پس اگر کوئی چوری کی نیت سے مسجد میں یا حج کے لئے جائے تو وہ گنہ گار ہوگا، بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک وہ شرعی رخصتوں (قصر وافطار وغیرہ) کا مستحق نہیں ہوگا۔

تیسری بات: اس حدیث کے تحت صرف عبادتیں اور مباحات آتے ہیں، معاصی اس حدیث کے تحت نہیں آتے، پس یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ جب اعمال کا مدار نیتوں پر ہے تو اگر کوئی برا کام اچھی نیت سے کرے تو اس کو اس پر بھی ثواب ملنا چاہئے۔ مثلاً ایک شخص اس نیت سے چوری کرتا ہے یا ڈاکہ مارتا ہے کہ جو مال حاصل ہوگا اس سے غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرے گا۔ یہ شخص ثواب کا مستحق ہونا چاہئے، یہ سوچنا غلط ہے اس لئے کہ جو کام فی نفسہ برے ہیں اور جن سے اللہ ورسول نے منع کیا ہے وہ اچھی نیت سے نیک نہیں بن سکتے۔ وہ بہر حال قبیح ہونگے۔ اس حدیث کا منشا صرف یہ سمجھانا ہے کہ اعمال صالحہ اگر بری نیت سے کئے جائیں تو وہ اعمال صالحہ نہیں رہیں گے، بری نیت کی وجہ سے برے ہوجائیں گے جیسے کوئی شخص خشوع وخضوع سے نماز پڑھتا ہے تاکہ لوگ اس کو بزرگ سمجھیں تو یہ ریا کاری ہے، حدیث میں اس کو شرک قرار دیا ہے۔

چوتھی بات: عبادات کی دو قسمیں ہیں: مقصودہ اور غیر مقصودہ، عباداتِ مقصودہ جیسے نماز، روزہ وغیرہ یہ عبادتیں اس حدیث کے تحت بالاتفاق آتی ہیں، اور عباداتِ غیر مقصودہ جیسے وضو اور غسل اس حدیث کے تحت آتے ہیں یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک وہ بھی اس حدیث کے تحت آتے ہیں، چنانچہ ان کے نزدیک عبادت غیر مقصودہ کے لئے بھی نیت ضروری ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک نہیں آتے اس لئے ان کے نزدیک عبادت غیر مقصودہ کے لئے نیت ضروری نہیں۔

یہاں دو اہم سوال ہیں:

پہلا سوال یہ ہے کہ باب کے شروع میں حدیث **إنما الأعمال بالنيات** کیوں لائے؟ وحی سے اس کا کیا تعلق ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ حدیث مختصر کر کے کیوں لائے؟ **فمن كانت هجرته إلى الله ورسوله فهجرته إلى الله ورسوله**: کو کیوں چھوڑ دیا؟ یہ حدیث بخاری شریف میں سات جگہ آئی ہے، اس جگہ کے علاوہ سب جگہ مکمل ہے، صرف اسی ایک جگہ مختصر کیوں لائے ہیں؟

پہلے سوال کا ایک مشہور جواب: یہ ہے کہ شروع میں یہ حدیث لاکر امام بخاری رحمہ اللہ نے طالب علموں کو نصیحت کی ہے کہ اچھی نیت سے پڑھو، اگر حُسن نیت کے ساتھ علم حاصل کروگے تو ثواب ملے گا ورنہ دھوبی کا کتا نہ گھر کا رہے گا نہ گھاٹ کا!

علم دین حاصل کرنا بڑی عبادت ہے، جہاد کے درجہ کی عبادت ہے، حدیث میں ہے: **مَن خَرَجَ في طَلَبِ العلم فهو في سبيل الله حتى يَرْجِعَ**: (مشکوٰۃ حدیث ۲۲۰) پس اگر اخلاص کے ساتھ یعنی اللہ کی خوشنودی کے لئے پڑھوگے تو

جس ثواب کا وعدہ ہے وہ ملے گا، ورنہ محنت رائگاں جائے گی۔

یہ جواب عام طور پر دیا جاتا ہے مگر فٹ نہیں بیٹھتا۔ مشکوٰۃ میں تو یہ توجیہ ٹھیک ہے، کیونکہ صاحب مشکوٰۃ نے خطبہ کے بعد باب سے پہلے یہ حدیث ذکر کی ہے، اگر امام بخاریؒ بھی بسم اللہ لکھ کر فوراً یہ حدیث ذکر کرتے، پھر باب قائم کرتے تو توجیہ صحیح ہوتی، لیکن یہاں تو نقشہ ہی دوسرا ہے، پہلے باب قائم کیا ہے، پھر آیت کریمہ لکھی ہے پھر یہ حدیث لائے ہیں۔

اس لئے صحیح جواب یہ ہے کہ یہ حدیث وحی کے بیان سے تعلق رکھتی ہے اور وحی کا بیان شروع کرنے سے پہلے استدراک (کسی امر کی تلافی) کے طور پر لائے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں: وحی ربانی اور وحی شیطانی، حجت وحی ربانی ہے، وحی شیطانی حجت نہیں۔ جیسے ہجرت کی دو قسمیں ہیں: اللہ و رسول کی طرف ہجرت، اور دنیا طلبی کے لئے ہجرت۔ اول دینی عمل ہے اور ثانی دینی عمل نہیں، اسی طرح وحی کی بھی دو قسمیں ہیں اور حجت وحی ربانی ہے وحی شیطانی نہیں، اور اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے حدیث کا ایک جز حذف کیا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ سورۃ النساء کی آیت (۱۶۲) جو امام بخاری رحمہ اللہ نے لکھی ہے اس میں وحی ربانی کا بیان ہے جو معتبر اور حجت ہے، پھر اس کے بعد امام بخاریؒ حدیث شریف کا صرف وہی جز لائے ہیں جس میں غیر معتبر ہجرت کا بیان ہے۔ اب قاری کے لئے لمحۂ فکر پیدا ہوگا، وہ سوچے گا: آخر ایک ہی ٹکڑا کیوں لائے، دوسرا ٹکڑا حذف کیوں کیا، ہر جگہ حدیث پوری لائے ہیں پھر یہاں ایک ٹکڑا حذف کیوں کیا؟ یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ امام بخاری رحمہ اللہ سے ان کے استاذ حمیدیؒ نے ادھوری حدیث بیان کی ہوگی، کیونکہ مُسند حمیدی میں یہ حدیث پوری ہے، اس لئے لامحالہ قاری کے لئے لمحۂ فکر پیدا ہوگا، وہ سوچے گا کہ یہاں حدیث مختصر کرنے کی کوئی وجہ ہونی چاہئے۔ وہ سوچتے سوچتے اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ جس طرح ہجرت کی ایک قسم معتبر ہے اور ایک غیر معتبر، اسی طرح وحی کی بھی دو قسمیں ہونی چاہئیں معتبر اور غیر معتبر، اور وحی ربانی کا معتبر (حجت) ہونا قرآن سے ثابت ہے پس دوسری قسم وحی شیطانی ہوگی، جو غیر معتبر ہے۔

سوال: اگر کوئی پوچھے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے معتبر ہجرت والا جز کیوں حذف کیا؟ غیر مقبول ہجرت والا جز بھی تو حذف کر سکتے تھے؟

جواب: اس کی وجہ معلوم نہیں، اگر امام بخاریؒ آپ کے خیال کے مطابق کرتے تب بھی آپ یہی سوال اٹھاتے، جیسے سورۃ المدثر میں ہے: ﴿عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ﴾ جہنم پر انیس فرشتے ہیں، طلبہ پوچھتے ہیں: انیس کیوں ہیں؟ استاذ جواب دیتا ہے: اٹھارہ ہوتے تب بھی تو یہی پوچھتا۔ اور بیس ہوتے تب بھی تیرا یہی سوال ہوتا۔ اصل جواب یہ ہے کہ خلقت خداوندی کی حکمتیں خدا ہی جانتے ہیں، تو بتا تیرے دو پیر کیوں ہیں؟ اور جانوروں کے چار پیر کیوں ہیں؟ اس کا جواب یہی ہے نا کہ خالق ہی اس کی حکمت جانتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی جواب یہ ہے کہ امام بخاری ہی جانتے ہیں کہ انھوں نے یہ جزء کیوں حذف کیا ہے؟ میں اس کی کوئی وجہ نہیں پا سکا ہوں۔ واللہ اعلم

انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں:

جاننا چاہئے کہ جس طرح جنات میں شیطان ہوتے ہیں، انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں، ارشاد پاک ہے:
﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ (سورۃ الانعام آیت ۱۱۲) ترجمہ: اور اسی طرح بنایا ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن انسانوں میں سے شیاطین (شریروں) کو اور جناتوں میں سے شیاطین (شریروں) کو جو سکھلاتے ہیں ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی باتیں فریب دینے کے لئے۔ اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک: یہ کہ شیاطین صرف جنات میں نہیں ہوتے، انسانوں میں بھی ہوتے ہیں، دوسری یہ کہ شیطان بھی وحی کرتے ہیں۔

ایک واقعہ: تحفظ ختم نبوت والوں نے ایک قصہ گھڑا ہے جس سے بات سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کی حاضری لی، جب حاضری لے چکے تو دیکھا کہ ایک کونے میں ایک لمبی ڈاڑھی والا بڈھا اور ایک کانا، بھدّا بیٹھے ہیں۔ جن کا نام رجسٹر میں نہیں ہے ان سے پوچھا: تم کون ہو؟ تمہارا نام تو رجسٹر میں نہیں؟ لمبی ڈاڑھی والا بولا: پروردگار عالم! آپ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بھیجے جو میری چھاتی پر مونگ دلتے رہے، میں نے سب کو برداشت کیا، اس ایک کو میں نے مبعوث کیا ہے، آپ اس کو برداشت نہیں کر سکتے؟ اس کا نام رجسٹر میں نہیں لکھ سکتے؟ لمبی ڈاڑھی والا شیطان تھا، اور کانا بھدّا مرزا غلام احمد قادیانی تھا۔

اس لطیفہ سے صرف اتنی بات سمجھانی ہے کہ شیطان بھی نبی مبعوث کرتا ہے، اور وہ بھی وحی بھیجتا ہے، غلام احمد قادیانی کے یہاں ایک حکیم نور الدین بھیروی تھا، قادیانی کو سب مواد وہی فراہم کرتا تھا اور قادیانی دھڑا دھڑ کتابیں لکھتا تھا، یہ انسانی شیطان تھا، پھر اس کے پیچھے برٹش گورنمنٹ تھی پھر اس کے پیچھے سب کا مہا گرو ابلیس تھا، یہ شیاطین کا سلسلہ تھا جو باہم ایک دوسرے کو وحی کرتے تھے۔

غرض: وحی اللہ کی طرف سے بھی آتی ہے اور شیاطین کی طرف سے بھی، حجت اور معتبر صرف وحی الٰہی ہے، وحی شیطانی نہ حجت ہے نہ معتبر!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

١ - بَابٌ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم؟

وَقَوْلُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ ﴿إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلٰى نُوْحٍ وَالنَّبِيِّيْنَ مِنْ بَعْدِهِ﴾ [النساء ١٦٣]

[١-] حدثنا الْحُمَيْدِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ، قَالَ: حدثنا يَحيىَ بْنُ سَعِيْدٍ الْأَنْصَارِيُّ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ مُحمدُ

ابْنُ إِبْرَاهِيمَ التَّيْمِيُّ، أَنَّهُ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصٍ اللَّيْثِيَّ، يَقُوْلُ: سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ عَلَى الْمِنْبَرِ، يَقُوْلُ: سَمِعْتُ رسولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: " إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا، أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا: فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَاهَاجَرَ إِلَيْهِ.

[انظر: ٥٤، ٢٥٢٩، ٣٨٩٨، ٥٠٧٠، ٦٦٨٩، ٦٩٥٣]

ترجمہ: (امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:) ہم سے حمیدیؒ نے حدیث بیان کی، وہ کہتے ہیں: ہم سے سفیان بن عیینہؒ نے حدیث بیان کی، وہ کہتے ہیں: ہم سے یحیٰ بن سعید انصاریؒ نے حدیث بیان کی، وہ کہتے ہیں: مجھے محمد بن ابراہیم تیمیؒ نے خبر دی، انھوں نے علقمہ بن وقاص لیثی رحمہ اللہ کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو منبر پر کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: (سند کا ترجمہ سب جگہ اسی طرح کریں گے اور حدیث کا ترجمہ اوپر آچکا)

تشریح:

۱- ایک حدیث ہے جس کو عام طور پر لوگ تین حدیثیں سمجھتے ہیں، اور تین نہیں تو دو تو سمجھتے ہی ہیں، حالانکہ وہ ایک حدیث ہے، مختلف طرق سے اس کے مختلف الفاظ آئے ہیں، وہ روایت یہ ہے: **كل أمرٍ ذي بال لم يُبدَأ ببسم الله فهو أقطع**: کسی طریق میں بسم اللہ ہے، کسی میں حمد للہ ہے اور کسی میں ذکر اللہ ہے، یہ الگ الگ روایتیں نہیں ہیں، ایک ہی روایت ہے، پس جب کوئی اہم کام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کر دیا جائے تو تینوں روایتوں پر عمل ہو گیا، بسم اللہ والی روایت پر تو عمل ظاہر ہے، اور الرحمن الرحیم اللہ کی تعریف ہے، اور پوری بسم اللہ اللہ کا ذکر ہے، اس لئے اہم کام بسم اللہ سے شروع کرنا کافی ہے، نبی ﷺ نے جتنے خطوط یا معاہدے لکھوائے ہیں سب میں صرف بسم اللہ ہے، اسی وجہ سے حدیث شریف کی اکثر کتابیں بشمول بخاری شریف صرف بسم اللہ سے شروع کی گئی ہیں۔

۲- امام بخاری رحمہ اللہ نے باب کے بعد فوراً سورۃ النساء کی آیت (۱۶۲) لکھی ہے اور مختصر لکھی ہے، اور صرف اتنی ہی آیت مراد نہیں، بلکہ یہ مضمون دور تک چلا گیا ہے وہ پورا مضمون مراد ہے۔ ان آیات مبارکہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے آخری پیغمبر ﷺ تک جتنے انبیاء آئے ہیں سب کے پاس وحی آئی ہے۔

سوال: حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے بھی نبی ہوئے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام پہلے نبی ہیں، پھر شیث علیہ السلام نبی ہوئے ہیں، پھر ایک روایت کے مطابق ادریس علیہ السلام نبی ہوئے ہیں، ان انبیاء کے پاس بھی وحی آئی ہے پھر ان کا تذکرہ کیوں نہیں کیا؟

جواب: حضرت نوح علیہ السلام اول الرسل ہیں، ان سے پہلے جو حضرات گذرے ہیں وہ صرف انبیاء تھے، رسول

نہیں تھے، اس لئے تشبیہ تام اس وقت ہوگی جب نوح علیہ السلام کا ذکر کیا جائے۔

نبی اور رسول میں انسانوں کی بہ نسبت عام خاص مطلق کی نسبت ہے، نبی عام ہے اور رسول خاص، تمام وہ برگزیدہ شخصیتیں جن کے پاس اللہ کے یہاں سے کتاب اور شریعت آئی ہے وہ رسول ہیں، اور جو صرف تبلیغ کے لئے مبعوث ہوئے ہیں، ان کو کوئی مستقل کتاب اور شریعت نہیں دی گئی وہ نبی ہیں، اور فرشتوں کو بھی شامل کرلیا جائے تو من وجہ کی نسبت ہوگی۔ انسان نبی اور فرشتہ رسول مادۂ افتراقی ہیں، اول صرف نبی ہے اور ثانی صرف رسول۔ اور مادۂ اجتماعی انسان رسول ہیں وہ نبی بھی ہیں اور رسول بھی۔

غرض حضرت نوح علیہ السلام اول الرسل ہیں، اور آنحضور ﷺ بھی رسول ہیں، لہٰذا جہاں سے رسولوں کا سلسلہ شروع ہوا ان کے ساتھ تشبیہ دی ہے، حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام رسول ہوئے ہیں، اس لئے فرمایا: ﴿وَأَوْحَيْنَا إِلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْمَاعِيْلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوْبَ﴾: اور ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بھی وحی بھیجی اور حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کے پاس بھی، مثلاً حضرت عیسیٰ، حضرت ایوب، حضرت یونس، حضرت ہارون اور حضرت سلیمان علیہم السلام۔ پھر فرمایا: ﴿وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُوْرًا﴾: اور ہم نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی۔ ﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ﴾ اور ہم نے وہ رسول بھیجے جن کے احوال ہم نے آپ کو اس سے پہلے سنائے اور ایسے رسول بھی جن کے احوال ہم نے آپ کو نہیں سنائے، کیونکہ تمام انبیاء ورسل کا تذکرہ قرآن کریم میں نہیں ہے۔ قرآن کریم میں صرف پچیس انبیاء ورسل کا ذکر ہے، اس لئے کہ قرآنِ کریم کے اولین مخاطب انہی شخصیتوں سے واقف تھے، دیگر انبیاء ورسل کو وہ نہیں جانتے تھے۔ پس اگر ان کے نام لئے جاتے تو قرآن ان کے لئے ایک چیستاں بن جاتا، قرآن کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے، بلکہ کتاب ہدایت ہے، اس لئے پوری توجہ ہدایت پر مرکوز رہنی چاہئے، پھر فرمایا: ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے رو در رو یعنی بلا واسطہ کلام کیا ﴿تَكْلِيْمًا﴾ مفعول مطلق ہے لہٰذا کَلَّمَ کے مجازی معنی: وحی بھیجنا مراد نہیں لیں گے، اس لئے کہ مفعول مطلق تاکید کے لئے آتا ہے۔ یہ سب وحیاں کیوں بھیجی گئیں؟ فرمایا: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾: بھیجے ہم نے پیغمبر خوشخبری اور ڈر سنانے والے تاکہ انبیاء کے آجانے کے بعد لوگوں کے لئے اللہ پر کوئی دلیل باقی نہ رہے، یعنی اللہ نے پیغمبروں کو اس لئے بھیجا تاکہ مؤمنین کو خوشخبری سنائیں اور کافروں کو ڈرائیں، اور لوگوں کے لئے قیامت کے دن یہ بہانہ بنانے کا موقع نہ رہے کہ پروردگار عالم! ہم کو آپ کی مرضی اور غیر مرضی معلوم نہیں تھی، اگر معلوم ہو جاتی تو ہم ضرور اس پر چلتے ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴾ اور اللہ زبردست حکمت والے ہیں۔

غرض: یہاں تک سب آیتیں مراد ہیں، پس آیتوں کا حاصل یہ ہے کہ میرے پاس جو اللہ کے یہاں سے وحی آتی

ہے وہ کوئی نیا سلسلہ نہیں ﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِنَ الرُّسُلِ﴾: آپ لوگوں سے کہہ دیں کہ میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں، رسولوں کا ایک سلسلہ ہے اور میں اس کی آخری کڑی ہوں۔

سوال: جب حدیث کے ذریعہ وحی کی دو قسمیں کرنی ہے تو پھر حدیث پہلے لکھنی چاہئے اور آیت بعد میں؟

جواب: بات صحیح ہے لیکن کلام اللہ کا حق ہے کہ آیت پہلے لکھی جائے، اور امام بخاری رحمہ اللہ کا طریقہ بھی یہی ہے، وہ ہر کتاب کے شروع میں آیات لکھتے ہیں، اور یہاں باب بمنزلہ کتاب ہے۔

جیسے نماز میں چار حالتیں ہیں: قیام، رکوع، سجدہ اور قعدہ، قراءت کے لئے قیام خاص کیا ہے اور رکوع وسجود میں قراءت کی ممانعت کی ہے، اس کی وجہ شاہ ولی اللہ صاحب نے یہ بیان فرمائی ہے کہ قیام اشرف حالت ہے، اس لئے قرآن کا حق ہے کہ نماز میں جو بہتر حالت ہے اس میں قراءت کی جائے، اسی طرح حدیث پہلے لانی چاہئے تھی مگر کلام اللہ کے حق کا خیال کر کے آیت پہلے لکھی ہے۔

۳- اس حدیث کو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے علقمۃ بن وقاص لیثی رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں، پھر ان سے محمد بن ابراہیم تیمیؒ روایت کرتے ہیں، پھر ان سے یحییٰ بن سعید انصاریؒ روایت کرتے ہیں (ایک دوسرے راوی یحییٰ بن سعید القطانؒ ہیں وہ بعد کے ہیں) یہ تینوں حضرات تابعی ہیں، اور یحییٰ انصاریؒ تک حدیث کی یہی ایک سند ہے البتہ حضرت عمرؓ کے علاوہ دیگر صحابہ سے بھی یہ حدیث مروی ہے مگر ان کی سندیں الگ ہیں، حضرت عمرؓ تک پہنچنے والی یہی ایک سند ہے، پھر یحییٰ انصاریؒ سے بہت سے تلامذہ نے یہ حدیث روایت کی ہے۔

غرض اس حدیث کی آدھی سند غریب ہے مگر اس سے حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیوں کہ یہ حدیث حضرت عمرؓ کے علاوہ دیگر صحابہ سے بھی مروی ہے۔

وحی کی صورتیں [1]

وحی کا بیان سورۃ الشوریٰ آیت (۵۱) میں آیا ہے اس لئے پہلے وہ آیت سمجھنی چاہئے: ارشاد پاک ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهِ مَايَشَآءُ، إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ﴾: کسی بشر میں سکت نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے رو در رو بات کریں، بشر اس کو برداشت نہیں کر سکتے، اس لئے وحی کی یہ صورت تو ممکن نہیں اور اس کی وجہ بشر کی کمزوری ہے۔ یہ کمزوری آخرت میں ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ بندوں کو اللہ تعالیٰ کی زیارت اور ہم کلامی کا شرف حاصل ہوگا۔

(۱) یہ عنوان حدیث (۲) سے تعلق رکھتا ہے۔

اور یہاں ضعفِ بشر اس وجہ سے ہے کہ یہ دنیا عمل کی زندگی ہے، پھل کھانے کی زندگی دوسری ہے، پس اگر اس عالم میں انسان قوی بنایا جاتا تو لاکھوں سال عمل کرنا پڑتا، اس لئے اس دنیا میں انسان ضعیف البنیان بنایا گیا ہے، ساٹھ ستر سال میں مرجاتا ہے، اور عمل کی زندگی ختم ہوجاتی ہے، پھرتا ابد پھل کھانا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، اس حکمت کے پیش نظر انسان اس دنیا میں ضعیف البنیان بنایا گیا ہے، اس کی ہر چیز ضعیف ہے، آنکھیں ضعیف ہیں، کان ضعیف ہیں، ناک ضعیف ہے، زبان ضعیف ہے، حتی کہ وہ حواس بھی ضعیف ہیں، جن کے پیچھے عقل کام کرتی ہے۔

جیسے ہم دوپہر میں سورج کو دیکھتے ہیں تو آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں اور عقل کچھ ادراک نہیں کرسکتی، پس جب سورج کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں اور عقل کچھ ادراک نہیں کرسکتی تو اللہ تعالیٰ کا ادراک بھلا انسان کیسے کرسکتا ہے؟ اور کان اللہ کی باتیں کیسے سن سکتے ہیں؟

بہر حال ان وجوہ سے کسی بندے میں سکت نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے رودررو گفتگو کریں، ہاں تین صورتیں ممکن ہیں:

وحی کی پہلی صورت:

﴿إِلَّا وَحْيًا﴾ مگر وحی کے طور پر: وحی کے لغوی معنی ہیں: اشارہ خفیہ، اشارہ سریعہ، یعنی چپکے سے کوئی اشارہ کردینا، جلدی سے کوئی اشارہ کردینا، جس کو وہی سمجھے جس کو اشارہ کیا گیا ہے، دوسرا کوئی نہ سمجھے، وحی ایک ایسا لفظ ہے جس میں فطرت یعنی نیچر میں رکھی ہوئی صلاحیتوں سے لے کر الہام تک کی سب صورتیں آجاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی فطرت میں وہ بات ودیعت فرمادی ہے جس کے لئے وہ مخلوق پیدا کی گئی ہے، اور قرآنِ کریم نے اس کو وحی سے تعبیر کیا ہے، ﴿وَأَوْحٰى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ﴾: تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی ﴿اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ﴾ کہ پہاڑوں میں گھر بنا، اور درختوں میں (بھی) اور لوگ جو عمارتیں بناتے ہیں ان میں (بھی) ﴿ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ﴾ پھر ہر پھل سے کھا یعنی ان کا رس چوس، غرض پورا سسٹم شہد کی مکھیوں کی فطرت میں رکھ دیا، اور اس کو قرآن نے وحی سے تعبیر کیا۔ اسی طرح آنکھ سے اشارہ کیا جائے، جس کو صرف مشیر اور مشارٌ الیہ سمجھیں یہ بھی وحی ہے یا اشارہ کنایہ میں بات کہی جائے یا خواب کے ذریعہ رہبری کی جائے یا اللہ تعالیٰ دل میں کوئی خیر کی بات ڈالیں یہ سب وحی ہیں —— اللہ کی طرف سے دل میں کوئی خیر کی بات ڈالی جائے تو وہ الہام ہے اور شیطان کی طرف سے کوئی شر کی بات دل میں ڈالی جائے تو وہ وسوسہ ہے۔

غرض وحی کی بہت شکلیں ہیں، ابتدائی شکل فطرت میں کوئی بات ودیعت فرمانا ہے۔ اور آخری درجہ دل میں کوئی خیر کی بات ڈالنا ہے، اور درمیان میں بہت سی شکلیں ہیں اسی میں یہ صورت بھی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام یا کوئی اور فرشتہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کوئی بات ڈالے، حدیث میں ہے: نَفَثَ فِي رُوْعِي: جبرئیل علیہ السلام نے میرے دل میں

یہ بات ڈالی۔اس صورت میں حضرت جبرئیل علیہ السلام سامنے نہیں آتے صرف آپؐ کے دل میں بات ڈالتے ہیں۔

غرض وحی کے لغوی معنی اشارہ خفیہ اور اشارہ سریعہ کے ہیں اور اصطلاحی معنی ہیں: اللہ کا وہ پیغام جو کسی انسان پر نازل ہوتا ہے اور جس کو دوسرے بندوں تک پہنچانے کا حکم دیا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے پاس وحی کس طرح آئی تھی؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے: ﴿وَأَوْ حَيْنَا إِلٰى أُمِّ مُوْسٰى أَنْ أَرْضِعِيْهِ﴾ الآیۃ: ہم نے موسیٰ کی والدہ کے پاس وحی بھیجی کہ موسیٰ کو دودھ پلاتی رہو، یہاں وحی بمعنی الہام ہے، باقاعدہ کوئی فرشتہ آکر یہ بات نہیں کہہ گیا تھا۔ آگے فرمایا: پھر جب تم کو ان کی نسبت اندیشہ ہو تو ان کو دریا میں ڈال دینا اور نہ ڈرنا نہ غم کرنا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے الہام ربانی کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کو ایک کشتی نما بکس میں رکھا اور دریائے نیل کے حوالے کیا، مگر وہ بےچین ہوگئیں: ﴿وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا﴾ یہ دلیل ہے کہ یہ الہام تھا، فرشتہ آکر کہہ جاتا تو بےچینی کی کوئی وجہ نہیں تھی، وہ مؤمنہ تھیں! اور الہام غیر نبی کا قطعی نہیں ہوتا، اس لئے بےچینی کے لئے وجہ جواز تھی۔

حضرت صدیقہ مریم رضی اللہ عنہا کے واقعہ میں ہے کہ وہ شروع میں بہت بےچین ہوگئی تھیں، مگر جب فرشتہ آکر کہہ گیا کہ گھبرائیں نہیں، بےخوف ہوکر بچہ کو لے کر بستی میں چلی جائیں، تو وہ مطمئن ہوگئیں، ایسے ہی موسیٰ کی والدہ کو مطمئن ہوجانا چاہئے تھا، مگر چونکہ وہ وحی بشکل الہام تھی، اس لئے ان کا دل بےقرار ہوگیا۔

غرض: شارحین کرام نے نصوص کا جائزہ لے کر وحی کی بارہ تیرہ قسمیں بیان کی ہیں، وہ سب ﴿إِلَّا وَحْيًا﴾ میں داخل ہیں:

وحی کی دوسری صورت:

﴿أَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ﴾: یا اللہ تعالیٰ کسی انسان سے بات کریں پردہ کے پیچھے سے: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ طور پر اسی طرح ہم کلامی ہوئی تھی اور نبی ﷺ سے بھی معراج میں اسی طرح ہم کلامی ہوئی ہے، مسلم شریف میں حدیث ہے: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے آنحضور ﷺ سے پوچھا: کیا معراج میں آپؐ نے اللہ کو دیکھا؟ آپؐ نے فرمایا: نُوْرٌ أَنّٰى أَرَاهُ (حدیث ۱۷۸ کتاب الایمان) میں اللہ کو کیسے دیکھتا وہ تو نور ہیں! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اللہ کو نہیں دیکھا اس کی دلیل خود قرآن میں ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی ہے: ﴿رَبِّ أَرِنِيْ أَنْظُرْ إِلَيْكَ﴾: پروردگار! میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَنْ تَرَانِيْ﴾ تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ آگے فرمایا: انسان کی بساط کیا ہے؟ یہ پہاڑ کروڑوں سال سے کھڑے ہیں، آندھیاں آتی ہیں، طوفان اٹھتے ہیں مگر ایک پتھر اپنی جگہ سے نہیں سرکتا ﴿أُنْظُرْ إِلَى الْجَبَلِ﴾ تم پہاڑ کی طرف دیکھو ہم اس پر اپنی تجلی ڈالتے ہیں اگر یہ برداشت کرسکے تو تم بھی مجھے دیکھ سکوگے ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا﴾ پھر جب تجلی ہوئی تو پہاڑ پاش پاش ہوگیا، اس کا وجود

باقی نہ رہا، اور موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہوکر گر پڑے۔ معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا تھا۔

نور اللہ کا حجاب ہے:

اور اللہ کا حجاب نور ہے یعنی خود تجلی مانع رویت تھی، کوئی اور حجاب نہیں تھا، کیونکہ اللہ کے علاوہ کوئی چیز اللہ کو چھپا نہیں سکتی، جیسے ہم دوپہر میں سورج کو دیکھتے ہیں تو دیکھ نہیں سکتے، حجاب مانع بنتا ہے، اور حجاب سورج کی روشنی ہوتی ہے، روشنی کی تیزی کی وجہ سے آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں اور آدمی دیکھ نہیں سکتا۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا پردہ کے پیچھے سے ہم کلامی کرنا ان دو واقعوں میں منحصر ہے یا ان کے علاوہ بھی کسی کی اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی ہوئی ہے؟

جواب: زمین پر صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلامی ہوئی ہے اور آسمانوں میں آنحضور ﷺ سے ہم کلامی ہوئی ہے، اور ممکن ہے جنت میں حضرت آدم علیہ السلام سے بھی ہم کلامی ہوئی ہو۔ غرض: زمین پر ہم کلامی صرف حضرت موسیٰ سے ہوئی ہے، اس لئے وہ کلیم اللہ کہلاتے ہیں ان کے علاوہ جس سے بھی ہم کلامی ہوئی ہے وہ فوق السماوات ہوئی ہے اور وہ چونکہ دوسری دنیا ہے اس لئے ان کو کلیم اللہ نہیں کہا گیا —— اور طور پر موسیٰ علیہ السلام جن ستر آدمیوں کو منتخب کر کے لے گئے تھے: انھوں نے صرف اللہ کا کلام سنا تھا، جیسے نبی ﷺ فرشتے کے واسطے کے بغیر بھی اللہ کا کلام سنتے تھے، پھر جب انھوں نے کہا: ﴿ أَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً ﴾ ہمیں اللہ کو بالکل سامنے دکھلاؤ (النساء آیت ۱۵۳) تو ایک بجلی نے ان کو ہلاک کردیا۔

وحی کی تیسری صورت:

﴿أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلاً فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهِ مَايَشَاءُ﴾: یا اللہ تعالیٰ قاصد (فرشتہ) بھیجتے ہیں پس وہ وحی کرتا ہے اللہ کے حکم سے جو اللہ چاہتے ہیں یعنی جو بات دے کر اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کو بھیجا ہے وہ اتنی بات رسول کو پہنچا دیتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں ہیں ﴿ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴾ علیٌّ کے معنی ہیں: برتر، عالی شان، یہ ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ﴾ کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے براہ راست ہم کلامی اس لئے نہیں فرماتے کہ وہ عالی شان اور برتر ہیں، اور دوسری صفت ہے: حکیم، جب اللہ تعالیٰ حکیم ہیں تو ضرور انسانوں کی تربیت کے لئے ان کے پاس پیغام بھیجیں گے تا کہ بندے اللہ کی مرضی اور نامرضی کو جان لیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مذکورہ تین راہیں نکالیں۔

اس کے بعد ارشاد پاک ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوْحًا مِنْ أَمْرِنَا﴾ —— قرآن میں روح کے متعدد معانی ہیں ان میں سے ایک معنی ہیں: سبب حیات، جسم کے لئے جو چیز سبب حیات ہے وہ بھی روح کہلاتی ہے اور خود روح کے لئے جو چیز سبب حیات ہے وہ بھی روح کہلاتی ہے، یعنی روح کی حیات ابدی کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو دین

نازل فرمایا ہے اس کے لئے بھی لفظ روح استعمال کیا گیا ہے۔ سورۃ النحل کی دوسری آیت: ﴿یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ أَمْرِهٖ﴾ میں روح سے یہی معنی مراد ہیں یعنی اللہ تعالیٰ فرشتوں کو اتارتے ہیں سبب حیات کے ساتھ، اپنے حکم سے۔ سبب حیات سے مراد دین ہے۔ سورۃ المؤمن (آیت ۱۵) میں بھی دین کو روح سے تعبیر کیا ہے۔

بہر حال اگلی آیت ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوْحًا مِنْ أَمْرِنَا﴾: اور اسی طرح ہم نے اپنا دین (تین طریقوں سے) آپؐ پر نازل کیا ہے۔ ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْإِيْمَانُ﴾: نبوت سے پہلے آپؐ نہ جانتے تھے کہ کتاب (قرآن) کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟

کتاب سے مراد قرآن ہے اور قرآن کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ وہ وحی متلو ہے، دوسری وحیاں اس کے تابع ہیں، اور ایمان سے عقائد و اعمال مراد ہیں، لیکن ایمان (عقائد) اسلام (اعمال) سے افضل ہیں اس لئے ایمان کی تخصیص کی ﴿وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾: لیکن ہم نے قرآن و ایمان کو نور بنایا۔ اس کے ذریعہ ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں راہ راست دکھاتے ہیں، ﴿جَعَلْنٰهُ﴾ میں ہ ضمیر کا مرجع قرآن و ایمان دونوں ہیں اس لئے کہ دونوں ایک ہیں۔

کیا قرآنِ کریم میں آنحضور ﷺ کو کہیں نور کہا گیا ہے؟

قرآن کریم میں صرف اللہ کی کتابوں کو نور کہا گیا ہے، کسی بھی نبی کو نور نہیں کہا گیا اور سورۃ المائدہ (آیت ۱۵) ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِنَ اللهِ نُوْرٌ وَكِتٰبٌ مُبِيْنٌ﴾: میں نور اور کتاب مبین سے قرآن کریم مراد ہے۔ نبی ﷺ مراد نہیں، مگر بریلوی کہتے ہیں: آنحضور ﷺ مراد ہیں اور اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں: حضور ﷺ بشر نہیں تھے، اور جن آیات کریمہ میں آپؐ کو بشر کہا گیا ہے وہ ان آیات کا غلط ترجمہ کرتے ہیں۔

اور جب آپؐ نور تھے تو آپؐ کا سایہ نہیں تھا اس لئے کہ نور کا سایہ نہیں ہوتا، حالانکہ مسند احمد (۱۳۲:۶) کی روایت میں صراحت ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے آپؐ کا سایہ دیکھا ہے —— ایک مرتبہ آنحضور ﷺ حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے ناراض ہوگئے، ایک مہینہ آپؐ ان کے پاس نہیں گئے پھر ایک دن دوپہر کے وقت تشریف لے گئے، آپؐ دیوار کی اوٹ سے آرہے تھے، حضرت زینبؓ نے آپؐ کا سایہ دیکھا اور پہچان لیا کہ یہ حضور کا سایہ ہے، پھر سوچا کہ حضور ﷺ تو مجھ سے ناراض ہیں یہ سایہ کس کا ہوسکتا ہے؟ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھیں کہ آپؐ نمودار ہوئے۔ اس روایت میں صاف صراحت ہے کہ حضور ﷺ کا سایہ تھا۔

بریلویوں کی بات دو وجہ سے غلط ہے:

پہلی وجہ: اگلی آیت ہے: ﴿يَهْدِیْ بِهِ اللهُ﴾ اس میں مفرد کی ضمیر ہے، اگر نور اور کتاب مبین الگ الگ ہوتے تو

بھما تثنیہ کی ضمیر آتی، مفرد ضمیر صاف دلالت کرتی ہے کہ نور اور کتاب مبین ایک ہیں۔

دوسری وجہ: قرآنِ کریم میں جگہ جگہ اللہ کی کتابوں کو نور کہا گیا ہے، اور کسی ایک جگہ بھی کسی انسان کو نور نہیں کہا گیا، پس یہاں بھی کتاب مبین ہی مراد ہے۔

ملحوظہ: اور اس سلسلہ میں جو حدیث پیش کی جاتی ہے وہ قطعاً موضوع ہے۔ حدیث کی ابتداء اس طرح ہے: أول ما خلق اللہ نوری: پھر لمبی حدیث ہے جو کشف الخفاء میں مذکور ہے، اس کے پڑھنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ روایت قطعاً بے اصل ہے اور مصنف عبدالرزاق کا جو لوگ حوالہ دیتے ہیں وہ بھی غلط ہے، مصنف میں یہ روایت نہیں ہے۔

غرض ان آیاتِ پاک میں وحی کی جملہ اقسام کو اکٹھا کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ انبیاء ورسل پر وحی کیوں بھیجتے تھے؟ اس کی وجہ بھی بیان کر دی ہے، لہٰذا اب جو کچھ حدیثوں میں آیا ہے وہ اسی آیت کریمہ کی تفسیر ہوگی۔

[۲-] حدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ رضی اللہ عنها: أَنَّ الْحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم فَقَالَ: يَارسولَ اللّٰهِ! كَيْفَ يَـأْتِيْكَ الْوَحْيُ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم: " أَحْيَانًا يَأْتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ، وَهُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ، فَيُفْصَمُ عَنِّيْ، وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ، وَأَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلاً، فَيُكَلِّمُنِيْ، فَأَعِيْ مَايَقُوْلُ"

قَالَتْ عَائِشَةُ: وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيْدِ الْبَرْدِ، فَيُفْصَمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِيْنَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا. [انظر: ۳۲۱۵]

ترجمہ: (سند کا ترجمہ اسی طرح کریں جس طرح پہلی حدیث میں کیا گیا ہے) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ (ابو جہل کے بھائی) حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپؐ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: ''کبھی میرے پاس وحی گھنٹی کی مسلسل آواز کی طرح آتی ہے، اور وحی کی یہ صورت مجھ پر بہت شاق (بھاری) ہوتی ہے، پس وہ مجھ سے منقطع ہوتی ہے درانحالیکہ میں محفوظ کر چکا ہوتا ہوں اس سے وہ بات جو اس نے کہی'' یعنی وہ بات پوری طرح دل ودماغ میں محفوظ ہو جاتی ہے، اُسے یاد نہیں کرنا پڑتا، ''اور کبھی فرشتہ میرے سامنے آدمی کا پیکر اختیار کرتا ہے'' یعنی انسانی شکل میں نمودار ہوتا ہے، ''پس وہ مجھ سے بات کرتا ہے، پس میں اس بات کو محفوظ کر لیتا ہوں جو وہ کہتا ہے'' ——— (وحی کی پہلی صورت کی وضاحت میں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: البتہ واقعہ یہ ہے کہ میں نے آنحضور ﷺ کو دیکھا کہ آپؐ پر وحی اتر رہی ہے، سخت جاڑے کے دنوں میں، پس وہ وحی آپؐ سے جدا ہوتی تھی درانحالیکہ آپؐ کا ماتھا پسینہ ٹپکاتا ہوتا تھا۔

تشریح:

۱-حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر مشرف باسلام ہوئے ہیں اور جنگ یرموک میں جام شہادت نوش فرمایا ہے، یہ ابوجہل کے بھائی تھے، ان کے ایک دوسرے بھائی عمرو بن ہشام بھی ہیں وہ بھی مسلمان ہو گئے تھے، وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ جب آنحضور ﷺ پر وحی نازل ہوتی ہے تو کیا کیفیت ہوتی ہے؟ حضرت یعلیٰؓ بھی اس کے خواہش مند تھے، متفق علیہ حدیث میں ہے کہ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہہ رکھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ مجھے دیکھنا ہے! پھر یہ واقعہ پیش آیا کہ جعرانہ میں ایک بدّو نے عمرہ کا احرام باندھا، اس نے جبہ پہن رکھا تھا اور خوشبو بھی لگا رکھی تھی، آپؐ سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا، آپؐ پر وحی کے آثار شروع ہوئے، جب آپؐ پر وحی کے آثار شروع ہوتے تھے تو جو لوگ موقع پر موجود ہوتے وہ آپؐ پر کوئی کپڑا ڈال دیتے۔ حضرت عمرؓ: حضرت یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ کی تلاش میں نکلے اور ان کو لا کر چادر کے نیچے گھسایا کہ دیکھ وحی اس طرح آتی ہے (مشکوٰۃ ۲۶۸۰)

غرض جس طرح حضرت یعلیٰؓ جاننا چاہتے تھے کہ وحی کس طرح آتی ہے؟ حضرت حارثؓ بھی جاننا چاہتے تھے، چنانچہ انھوں نے سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

قوله: أحيانا يَأْتِيني مِثلَ صَلصَلة الجَرَس: اور ایک روایت میں ہے: مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ عَلٰى صَفْوَانٍ صفوان کے معنی ہیں: چکنا پتھر، اگر کوئی زنجیر لے کر چکنے پتھر پر دوڑے تو ایک مسلسل آواز اور جھنکار پیدا ہوگی، آپؐ نے فرمایا: میرے پاس جو وحی آتی ہے وہ اس کے مانند ہوتی ہے۔

جاننا چاہئے کہ دنیا کی ہر زبان (بھاشا) ایک صوتِ مسلسل ہے، تقطیع (ٹکڑے ٹکڑے) کر کے اصطلاحات مقرر کی جاتی ہیں کہ یہ جیم ہے یہ دال ہے وغیرہ، چنانچہ جب ہم وہ زبان جو ہم نہیں جانتے سنتے ہیں تو وہ ہمیں ایک صوتِ مسلسل معلوم ہوتی ہے جس میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ صوتِ مسلسل نہیں ہوتی، اس میں تقطیع ہوتی ہے جو حروف کہلاتے ہیں، چنانچہ جو اس زبان سے واقف ہوتا ہے وہ بات سمجھ لیتا ہے، اسی طرح آنحضور ﷺ پر جو وحی آتی تھی وہ صوتِ مسلسل ہوتی تھی، مگر حقیقت میں صوتِ مسلسل نہیں ہوتی تھی، اس میں تقطیع ہوتی تھی، اور آنحضور ﷺ اس کو سمجھتے تھے، جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام جانوروں کی زبان سمجھتے تھے، ہم نہیں سمجھتے، ہمیں ان کا بولنا ایک صوتِ مسلسل معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ صوتِ مسلسل نہیں، اس میں تقطیع ہے، اس لئے حضرت سلیمان اس کو سمجھتے تھے۔

وحی کی اس صورت میں آنحضور ﷺ کو کوئی نظر نہیں آتا تھا، اور آواز بھی آپؐ اکیلے سنتے تھے، آپؐ کے پاس جو صحابہ موجود ہوتے تھے وہ اس آواز کو نہیں سنتے تھے۔

رہی یہ بات کہ جو صوتِ مسلسل آنحضور ﷺ سنتے تھے وہ کس کی آواز ہوتی تھی؟ اس سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں، کوئی کہتا ہے وہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی اصلی آواز ہوتی تھی اور کوئی کہتا ہے: حضرت جبرئیل علیہ السلام کے پروں کی

آواز ہوتی تھی، لیکن حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آواز ہوتی تھی، یہ مسئلہ حضرتؒ نے کتاب التوحید میں چھیڑا ہے، وہاں جہمیہ کا رد کیا ہے، جہمیہ اللہ تعالیٰ کے لئے صفاتِ متشابہات نہیں مانتے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کی تردید میں اللہ کے لئے صفات ثابت کی ہیں، اور من جملۂ صفات: صوتِ باری بھی ہے، اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آواز تھی، اور اس میں کچھ استبعاد نہیں، کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کا کلام سنا ہے، وہ آواز چاروں طرف سے آرہی تھی، اس کی کوئی جہت نہیں تھی۔ ارشاد پاک ہے: ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ تکلیما: مفعول مطلق تاکید کے لئے ہے، پس کلّم بمعنی وحی نہیں ہوسکتا، پس اسی طریقہ پر اگر وہ آواز اللہ کی ہو اور آنحضور ﷺ اس کو سنتے ہوں تو اس میں کوئی استبعاد نہیں، ہمارے علامہ کشمیری قدس سرہ نے بھی فیض الباری (۱:۲۰) میں اسی رائے کو اختیار کیا ہے، اگرچہ عام طور پر بخاری کے شراح اس رائے سے متفق نہیں، امام بخاری رحمہ اللہ کے دلائل درج ذیل ہیں:

پہلی دلیل: امام بخاریؒ نے دلیل میں یہ حدیث پیش کی ہے: إذا تكلّم الله بالوحي إلخ جب اللہ وحی بولتے ہیں تو اس آواز کو تمام فرشتے سنتے ہیں اور گھبراہٹ سے سب بیہوش ہوجاتے ہیں، صرف بڑے فرشتے یعنی ساتویں آسمان کے فرشتے ہوش میں رہتے ہیں، پھر جب ان فرشتوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوتی ہے یعنی وہ ہوش میں آتے ہیں تو نیچے والے فرشتے اوپر والے فرشتوں سے پوچھتے ہیں. پروردگار عالم نے کیا حکم دیا؟ یعنی وہ وحی کا ابتدائی حصہ سنتے ہی بے ہوش ہوجاتے ہیں اس لئے ہوش میں آنے کے بعد اوپر والے فرشتوں سے وحی کے بارے میں پوچھتے ہیں، وہ فرشتے بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا، اور اللہ نے جو حکم دیا وہ برحق ہے اور اللہ برتر وبالا ہیں! اس حدیث میں ہے: جب اللہ تعالیٰ وحی بولتے ہیں، پس تکلم ثابت ہوا، اور اس تکلم کو تمام فرشتے سنتے ہیں، پس صوت بھی ثابت ہوئی (بخاری کتاب التوحید باب قول الله تعالیٰ: وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إلخ)

دوسری دلیل: بخاری کے مذکورہ باب میں حضرت عبداللہ بن اُنیسؓ کی معلق حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندوں کو جمع فرمائیں گے پھر اللہ تعالیٰ پکار کر کوئی بات فرمائیں گے تو قریب اور دور کے سب اہل محشر اس بات کو یکساں سنیں گے، اس میں ہے: فيناديهم، پروردگار ان کو پکاریں گے، اس سے بھی اللہ تعالیٰ کا تکلم اور اللہ کے لئے صوت کا ہونا ثابت ہوا۔

قوله: وأحيانا يتمثل لِيَ المَلَكُ رجُلاً: وحی کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ فرشتہ میرے سامنے پیکر محسوس اختیار کرتا ہے ـــــ پیکر کے معنی ہیں: صورت وشکل۔ اور محسوس کے معنی ہیں نظر آنے والی ـــــ یعنی فرشتہ انسانی شکل میں آنحضور ﷺ کے سامنے نمودار ہوتا ہے، مگر اس فرشتہ کو عام طور پر حضور ﷺ کے علاوہ کوئی نہیں دیکھتا، البتہ کبھی صحابہ دیکھتے تھے، جیسے حدیث جبرئیل میں سب صحابہ نے جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا تھا، اور حضرت جبرئیل عام طور پر دحیہ کلبی

رضی اللہ عنہ کی صورت میں آتے تھے مگر اس وقت غیر معروف صورت میں آئے تھے اس لئے صحابہ نے ان کو نہیں پہچانا۔

قولہ: وهو أشده علي: یعنی وحی کی پہلی صورت آنحضور ﷺ پر بہت بھاری ہوتی تھی، کیونکہ اس صورت میں آپ کو حیز بشریت سے اٹھ کر حیز ملکوت میں پہنچنا پڑتا تھا، یعنی لوازم بشریت سے گونہ مجرد ہو کر صفات ملکیت سے متصف ہونا پڑتا تھا، اس لئے کہ موحی اور موحی الیہ میں فی الجملہ مناسبت ضروری ہے، دشواری کی وجہ یہ تھی ـــــ اور وحی کی دوسری صورت میں آپ اپنی حالت پر برقرار رہتے تھے۔ اور فرشتہ حیز ملکوت سے نزول کرتا تھا اور حیز بشریت میں قدم رکھتا تھا، اس لئے یہ صورت آپ پر بھاری نہیں ہوتی تھی۔

فائدہ (۱): علماء کرام نے فرمایا ہے کہ قرآنِ کریم کی وحی ہمیشہ حضرت جبرئیل علیہ السلام لے کر آتے تھے، وحی کی جو پہلی صورت ہے اس طریقہ پر قرآن کی وحی نہیں آئی تھی، کیونکہ قرآن کی وحی کے لئے ضروری تھا کہ وسائط قابل اعتبار ہوں، قرآنِ کریم آنحضور ﷺ تک پہنچا ہے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے۔ حضرت جبرئیلؑ معتبر فرشتے ہیں، قرآن میں ان کی پانچ صفتیں ہیں، پھر حضرت جبرئیلؑ نے وہ وحی آنحضور ﷺ کو پہنچائی۔ آپؐ موحی الیہ ہیں، آپؐ بھی صدفی صد قابل اعتبار ہیں، آپؐ کی بھی قرآن میں پانچ صفتیں ہیں، پھر احتمالاتِ خارجیہ جو اعتباریت میں قادح بنتے ہیں ان کی نفی بھی ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کی بھی پانچ دلیلیں ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کی وحی حضرت جبرئیل علیہ السلام ہی لے کر آتے تھے، اگر صوتِ متدارک (پے بہ پے مسلسل آنے والی آواز) کے ذریعہ قرآن کریم کی وحی آتی تو مذکورہ تین مضمون بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی یعنی حضرت جبرئیلؑ قابل اعتبار ہیں، حضورؐ قابل اعتبار ہیں، اور احتمالات قادحہ منتفی ہیں، ان مضامین کو قرآن میں بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی پانچ صفات آئی ہیں:

۱- وہ اللہ کے نزدیک قربِ منزلت رکھتے ہیں یعنی ذی رتبہ ہیں۔ ۲- وہ امانت دار ہیں۔ ۳- وہ کمزور نہیں۔ ۴- ان پر کسی کا اثر نہیں ہوسکتا۔ ۵- وہ تنہا نہیں ـــــ سورۃ التکویر (آیات ۱۹-۲۱) ہیں: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ. ذِیْ قُوَّةٍ، عَنْدَ ذِیْ الْعَرْشِ مَكِيْنٍ. مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِيْنٍ﴾: یہ قرآن کلام ہے ایک معزز فرشتہ کا لایا ہوا، جو قوت والا ہے، اور مالک عرش کے نزدیک ذی رتبہ ہے، وہاں اس کا کہا مانا جاتا ہے، امانت دار ہے۔ اور سورۃ النجم (۵و۶) میں ہے: ﴿عَلَّمَهُ شَدِيْدُ الْقُوٰى، ذُوْ مِرَّةٍ﴾: ان کو ایک فرشتہ تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقتور ہے، مضبوط بنا ہوا ہے یعنی پیدائشی طور پر طاقتور ہے۔

اور نبی ﷺ کی بھی پانچ صفات ذکر کی گئی ہیں:

۱- آپؐ بے عقل نہیں۔ ۲- آپؐ سے غلطی نہیں ہوئی۔ ۳- آپؐ نے بالقصد غلطی نہیں کی۔ ۴- آپؐ نے غرض فاسد سے بات نہیں بنائی۔ ۵- نہ آپؐ بات چھپانے والے ہیں ـــــ سورۃ التکویر میں ہے: ﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ﴾: اور تمہارے ساتھی مجنون نہیں ﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ﴾: اور وہ مخفی (بتلائی ہوئی) باتوں کے سلسلہ میں بخیل نہیں۔

اورسورۃ النجم میں ہے: ﴿مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى، وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى﴾: تمہارے ساتھی (نبی ﷺ) نہ راہ سے بھٹکے اور نہ غلط راستہ پر پڑ گئے، اور نہ وہ اپنی خواہش سے باتیں بناتے ہیں۔

اور پانچ احتمالاتِ خارجیہ قادحہ کی نفی کی ہے:

۱- ایسا نہیں ہے کہ راوی (حضور) نے مروی عنہ (جبرئیل) کو دیکھا نہیں: ﴿وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِيْنِ﴾: اور انھوں نے اس فرشتہ کو اصلی صورت میں آسمان کے صاف کنارہ پر دیکھا ہے۔

۲- ایسا بھی نہیں کہ راوی نے مروی عنہ کو پہچانا نہیں: ﴿فَاسْتَوٰى، وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلٰى﴾: پھر وہ فرشتہ اپنی اصلی شکل پر نمودار ہوا، درانحالیکہ وہ آسمان کے بلند کنارے پر تھا۔

۳- ایسا بھی نہیں کہ راوی مروی عنہ کی دوری کی وجہ سے بات اخذ نہ کرسکا ہو: ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى، فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى﴾: پھر وہ فرشتہ نزدیک آیا، پھر اور نزدیک آیا، سو دو کمانوں کے بقدر فاصلہ رہ گیا، بلکہ اور بھی کم۔

۴- ایسا بھی نہیں کہ جبرئیل نے جو کچھ وحی کی اس سے اللہ تعالیٰ بے خبر ہوں: ﴿فَأَوْحٰى إِلٰى عَبْدِهٖ مَا أَوْحٰى﴾: پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر وحی نازل فرمائی جو کچھ وحی نازل فرمائی، یعنی جبرئیل کی کردہ وحی اللہ تعالیٰ ہی کی وحی ہے۔

۵- ایسا بھی نہیں کہ حضور ﷺ نے بات غلط سمجھ لی ہو: ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأٰى﴾: دل نے غلط بیانی نہیں کی اس میں جو اس نے دیکھی۔

فائدہ (۲): نبی ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دو مرتبہ دیکھا ہے، ابتداء وحی میں اور معراج کی رات میں۔ ان دو موقعوں کے علاوہ کبھی آپؐ نے ان کو اصلی صورت میں نہیں دیکھا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت جبرئیلؑ آنحضور ﷺ کے پاس سب سے پہلی وحی لے کر جبل نور پر غار حراء میں آئے ہیں، اس وقت وہ انسانی شکل میں تھے، اور سورۂ اقراء کی پانچ آیتیں نازل کی تھیں، پھر فترت کا زمانہ ہے، فترت کے معنی ہیں: سستی یعنی وحی سست پڑ گئی، اور فترت کا زمانہ کتنا ہے؟ عام طور پر علماء تین سال لکھتے ہیں لیکن میری ناقص رائے میں زمانۂ فترت چھ ماہ ہے۔

بخاری شریف جلد ثانی میں یہ روایت ہے کہ آنحضور ﷺ زمانۂ فترت میں بہت زیادہ بے چین رہتے تھے، سوچتے تھے کہ کسی پہاڑ پر چڑھ کر خود کو گرادوں یعنی خودکشی کرلوں، یہ روایت غالباً صحیح نہیں اس لئے کہ یہ ابن شہاب زُہری رحمہ اللہ کی مرسل روایت ہے، اور ابن شہابؒ کے مراسیل بالاتفاق ضعیف ہوتے ہیں، وہ شِبْهُ لاشیئ ہوتے ہیں یعنی صرف پرچھائی ہوتے ہیں، حقیقت میں کچھ نہیں ہوتے، یہ روایت کتاب التعبیر کی پہلی حدیث ہے (حدیث نمبر ۶۹۸۲)

آنحضور ﷺ نبوت سے چھ ماہ پہلے سے غار حراء میں تشریف لے جاتے تھے، وہاں تنہا رہ کر اللہ کی عبادت کرتے تھے، پھر پہلی وحی نازل ہوئی تو آپؐ گھبرا گئے، اور گھبراہٹ کی وجہ علماء نے یہ بیان کی ہے کہ اس وقت آپؐ کو یہ نہیں بتایا

گیا تھا کہ آپ کو رسالت سے سرفراز کیا گیا ہے، اور آئندہ آپ پر جو وحی نازل ہونے والی ہے اس سلسلہ کی یہ پہلی کڑی ہے، اس لئے آنحضور ﷺ پریشان ہوئے، پھر حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا کی دلداری سے، اور ورقہ بن نوفل کی بات سے آپ مطمئن ہوگئے اور حسب معمول غار حراء میں جانے لگے، کئی دن وہاں رہ کر عبادت کرتے تھے، پھر جب توشہ ختم ہوجاتا تو واپس آجاتے، پھر کچھ دن گھر رہتے، پھر دوبارہ توشہ لے کر وہیں چلے جاتے، یہ سلسلہ چھ ماہ تک چلتا رہا، یہ فترت کا زمانہ ہے، اس میں وحی نہیں آئی، پھر چھ ماہ بعد ایک مرتبہ آنحضور ﷺ غار حراء سے گھر واپس تشریف لارہے تھے اور آپ اجیاد نامی محلہ سے گذر رہے تھے کہ آپ نے ایک آواز سنی، چاروں طرف دیکھا کچھ نظر نہ آیا، جب اوپر دیکھا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنی اصلی شکل میں کرسی پر بیٹھے ہوئے نظر آئے، ان کے چھ سو پر تھے اور ان کے جسم نے آسمان کے کنارے کو بھر رکھا تھا، آپ ان کو دیکھ کر گھبرا گئے اور جلدی قدم بڑھادیئے، گھر پہنچ کر گھر والوں سے کہا: دَثِّرُونی، دَثِّرونی، مجھے کمبل اڑھاؤ، مجھے کمبل اڑھاؤ، اتنے میں وہ فرشتہ جو آسمان پر نظر آیا تھا لٹک کر قریب آگیا ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى﴾: وہ دو کمانوں کے بقدر رہ گیا، بلکہ اس سے بھی قریب آگیا، اور دوسری وحی ﴿يٰأَيُّهَا الْمُدَّثِّرْ، قُمْ فَأَنْذِرْ﴾ نازل کی اور آپ کو بتلایا کہ آپ کو رسالت سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اب حضور ﷺ کی پریشانی ختم ہوگئی۔ اور آپ نے دعوت کا کام شروع کردیا، اور غار حراء میں جانا موقوف کردیا۔

بہر حال ایک موقعہ تو یہ تھا جب آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا ہے۔ پھر دوسری مرتبہ معراج میں دیکھا، آنحضور ﷺ کو مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک براق پر لے جایا گیا، پھر براق کو اس کھونٹے سے باندھ دیا جس سے انبیاء اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے، پھر آسمانوں پر چڑھنے کے لئے سیڑھی (لفٹ) لگائی گئی جس کے ذریعہ آپ آسمانوں پر چڑھے، یہاں تک کہ سدرۃ المنتہی پر پہنچے، سدرۃ کے معنی ہیں: بیری کا درخت اور منتہی کے معنی ہیں: آخری حد، باڈر۔ عالم تحتانی کا ایک باڈر ہے، وہاں بیری کا درخت ہے، وہ باڈر کی بیری ہے، اس کے پھل مٹکوں کے برابر اور پتے ہاتھی کے کان کے برابر ہیں، اس درخت پر سونے کے پتنگے چھا رہے ہیں، وہ درخت اتنا خوبصورت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: "میں اس کی خوبصورتی بیان نہیں کرسکتا!" وہاں پہنچ کر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ساتھ چھوڑ دیا، اور عرض کیا: اب آپ تنہا آگے جائیں، ہماری سرحد آگئی، جب حضرت جبرئیل وہاں پہنچے ہیں تو اپنی اصل شکل میں ہوگئے، یہ دوسرا موقعہ ہے جب آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اصلی صورت میں دیکھا ہے۔

قوله: أحيانا يأتيني مثل صلصلة الجرس: أحیان: حینٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: مطلق وقت، قلیل وکثیر سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، اور یہ ظرفیت کی بنا پر منصوب ہے، اور عامل بعد میں آنے والا فعل ہے (عمدۃ القاری ۱:۴۲) اور صلصلہ لغت میں اس آواز کو کہتے ہیں جو پتھر پر لوہے کی زنجیر کھینچنے سے پیدا ہوتی ہے، اور جرس کے معنی ہیں: گھنٹی، جسے جانور کے گلے میں باندھتے ہیں۔

قولہ:فیفصم عني: اس کو باب ضرب سے فعل معروف بھی پڑھ سکتے ہیں: یَفصِمُ (جدا ہونا) اور مجہول بھی پڑھ سکتے ہیں یُفصَم (جدا کیا جانا) اور باب افعال سے بھی معروف پڑھ سکتے ہیں یُفصِم، پہلی صورت اولیٰ ہے۔

قولہ: یتمثل لی الملك رجلاً: میں رجلاً منصوب بنزع خافض ہے، تقدیر عبارت ہے: أی تصور لی الملك تصورَ رجل (عمدۃ ۱:۴۲)

قولہ:ولقد رأیتُه: میں لام توطئہ للقسم ہے، توطئہ کے معنی ہیں: تمہید، جب کسی بڑے آدمی کی کار گذرنے والی ہوتی ہے تو اس سے آگے بائک سوار چلتے ہیں: جو اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ پیچھے چیف منسٹر کی گاڑی آرہی ہے، پس یہ لام توطئہ للقسم ہے۔ یہ اعلان کرتا ہے کہ آگے قسم آرہی ہے لیکن اس کے بعد قسم نہیں آتی، یہ لام خود ہی قسم کی قائم مقامی کرتا ہے، اس لئے اس لام کا ترجمہ ہے: بخدا، اور قد: ماضی پر تحقیق کے لئے آتا ہے۔

قولہ:فی الیوم الشدید البرد: قاعدہ سے البرد الشدید ہونا چاہئے، کیونکہ الشدید: البرد کی صفت ہے، لیکن جس طرح کلام کو سُبک کرنے کے لئے مرکب توصیفی کو مرکب اضافی سے بدل دیتے ہیں، مگر ترجمہ مرکب توصیفی کا کرتے ہیں، اسی طرح کبھی مرکب توصیفی کو موصوف صفت باقی رکھ کر الٹ دیتے ہیں، یہاں ایسا ہی کیا ہے۔

وحی کے ابتدائی احوال

حضرات انبیاء کے نفوس قدسیہ ابتداء ہی سے کفر وشرک اور ہر قسم کے فحشاء ومنکر سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں، وہ سراپا حق وصدق کی مثال ہوتے ہیں، ان کے قول وفعل اور نیت وعزم میں کہیں کذب کا شائبہ اور نام ونشان نہیں ہوتا، چونکہ منصب نبوت آنحضور ﷺ کے لئے ازل سے مقدر ہو چکا تھا اس لئے حق جل مجدہ نے ابتداء ہی سے آپؐ کے قلب اطہر کو ان تمام امور سے متنفر اور بیزار کر دیا جو منصب نبوت ورسالت کے منافی ہیں۔ جب زمانۂ نبوت قریب آیا تو رویائے صادقہ وصالحہ (سچے اور درست خواب) دکھائی دینے لگے، یعنی وحی کی ابتداء رویائے صالحہ وصادقہ سے ہوئی، آپؐ جو خواب دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہو کر رہتا، اور علماء نے فرمایا ہے کہ صبح صادق کے ساتھ تشبیہ اس لئے دی گئی ہے کہ ابھی آفتاب نبوت طلوع نہیں ہوا تھا، جس طرح صبح صادق کی روشنی طلوع آفتاب کا دیباچہ ہوتی ہے، اسی طرح رؤیائے صالحہ طلوع آفتاب نبوت ورسالت کا دیباچہ تھے، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: پھر آپؐ کے لئے تنہائی محبوب بنادی گئی، آپؐ غارِ حراء میں خلوت فرماتے اور کئی کئی راتیں وہاں رہ کر عبادت کرتے، پھر جب توشہ ختم ہو جاتا، اور گھر والوں کی یاد آتی تو آپؐ گھر واپس آتے، پھر چند دنوں کے بعد دوبارہ توشہ لے کر وہیں چلے جاتے اور مصروف عبادت ہو جاتے، یہ سلسلہ اسی طرح چھ ماہ تک چلتا رہا یہاں تک کہ جب عمر مبارک چالیس سال ہوگئی اور حسب معمول

آپؐ غار حراء میں تشریف فرما تھے کہ اچانک فرشتہ آیا۔ اس نے کہا: إقرأ: پڑھئے، آپؐ نے جواب دیا: ما أنا بقارئ: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، فرشتہ نے آپؐ کو باہوں میں لیا، اور سینہ سے لگا کر دبایا، اور اتنا سخت بھینچا کہ آپؐ فرماتے ہیں: ''میری طاقت نے جواب دیدیا!'' اس کے بعد چھوڑ دیا، اور پھر کہا: إقرأ: آپؐ نے پھر وہی جواب دیا، فرشتہ نے دوبارہ بھینچا اور چھوڑ دیا، تیسری مرتبہ بھینچنے کے بعد سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیتیں پڑھائیں اور چلا گیا، آنحضور ﷺ گھبرائے ہوئے گھر لوٹے اور حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا سے پورا واقعہ بیان کیا، اور فرمایا: مجھ کو اپنی جان کا خطرہ ہو چلا ہے! حضرت خدیجہؓ نے عرض کیا: ''ہر گز نہیں! خدا کی قسم! اللہ آپؐ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، آپؐ لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں، یعنی دوسروں کے قرضے اپنے سر لیتے ہیں، ناداروں کی خبر گیری کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، سماوی آفات میں آپؐ لوگوں کی مدد کرتے ہیں'' ۔ یعنی جو شخص ایسے محاسن و کمالات کا جامع ہو اس کی رسوائی ممکن نہیں، نہ وہ دنیا میں رسوا ہو سکتا ہے نہ آخرت میں، اس کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپؐ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو توریت و انجیل کے بڑے عالم تھے اور سریانی زبان سے عربی زبان میں انجیل کا ترجمہ کرتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے ان سے کہا: اے میرے چچا زاد بھائی! ذرا اپنے بھتیجے کا حال سنئے اور بتایئے کیا معاملہ پیش آیا ہے؟ ورقہ کے استفسار پر آنحضور ﷺ نے سارا واقعہ سنایا، ورقہ نے حال سن کر کہا یہ وہی سب سے بڑا راز دار فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی لاتا تھا، کاش میں آپؐ کے زمانۂ پیغمبری میں توانا ہوتا، جبکہ آپؐ کی قوم آپؐ کو اس شہر سے نکالے گی، اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو آپ کی بھر پور مدد کرونگا۔ آپؐ نے تعجب سے پوچھا: کیا وہ مجھے نکالیں گے، ورقہ نے کہا: جب بھی کوئی شخص پیغمبر ہو کر آتا ہے اور اللہ کا دین پیش کرتا ہے تو لوگ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں، پھر کچھ زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا، اور وحی سست پڑ گئی، یعنی کچھ عرصہ کے لئے وحی رک گئی۔

ملحوظہ: یہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا خلاصہ ہے، چونکہ یہ حدیث طویل ہے اس لئے قارئین کی سہولت کے لئے اس کو چند ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ترجمہ اور ضروری وضاحت لکھی جائے گی۔

[۳-] حدثنا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ، قَالَ: أَخْبَرَنَا اللَّيْثُ، عَنْ عُقَيْلٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ رضى الله عنها أَنَّهَا قَالَتْ: أَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ، فَكَانَ لَايَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَاءَ تْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ، ثُمَّ حُبِّبَ إِلَيْهِ الْخَلَاءُ وَكَانَ يَخْلُوْ بِغَارِ حِرَاءٍ، فَيَتَحَنَّثُ فِيْهِ — وَهُوَ التَّعَبُّدُ — اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ، قَبْلَ أَنْ يَنْزِعَ إِلَى أَهْلِهِ، وَيَتَزَوَّدُ لِذٰلِكَ، ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى خَدِيْجَةَ، فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا، حَتّٰى جَاءَ هُ الْحَقُّ، وَهُوَ فِيْ غَارِ حِرَاءٍ، فَجَاءَ هُ الْمَلَكُ فَقَالَ: اقْرَأْ، فَقَالَ. فَقُلْتُ: " مَا أَنَا بِقَارِئٍ" قَالَ: فَأَخَذَنِيْ فَغَطَّنِيْ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّيْ الْجَهْدَ، ثُمَّ أَرْسَلَنِيْ، فَقَالَ: اقْرَأْ، فَقُلْتُ: " مَا أَنَا بِقَارِئٍ" فَأَخَذَنِيْ فَغَطَّنِيْ الثَّانِيَةَ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّيْ الْجَهْدَ، ثُمَّ أَرْسَلَنِيْ، فَقَالَ: اقْرَأْ، فَقُلْتُ: " مَا

أَنَا بِقَارِئٍ" قَالَ: فَأَخَذَنِیْ فَغَطَّنِیْ الثَّالِثَةَ، ثُمَّ أَرْسَلَنِیْ، فَقَالَ: ﴿ اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اقْرَأْ وَرَبُّكَ الأَكْرَمُ﴾

ترجمہ: ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: پہلی وہ وحی جس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ شروع کئے گئے: سونے کی حالت میں اچھے خواب ہیں، پس آپؐ خواب نہیں دیکھا کرتے تھے مگر وہ سپیدۂ صبح کی طرح سامنے آجاتا تھا، یعنی خواب تعبیر کا محتاج نہیں ہوتا تھا، جو کچھ خواب میں دیکھا ہے اسی طرح واقعہ سامنے آجاتا تھا، پھر آپؐ کو تنہائی بھانے لگی، اور آپؐ غار حراء میں خلوت فرمایا کرتے تھے، پس اس میں کئی کئی دن عبادت کیا کرتے تھے، گھر یاد آنے پر گھر لوٹنے سے پہلے اور اس کے لئے توشہ لے جاتے تھے، پھر خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف لوٹتے تھے، پس اتنے ہی دنوں کا توشہ لے کر چلے جاتے تھے (عرب راتوں سے گنتے ہیں اور ہم دنوں سے) یہاں تک کہ آپؐ کے پاس دین حق پہنچا، درانحالیکہ آپؐ غار حراء میں تھے، پس آپؐ کے پاس فرشتہ آیا اور اس نے کہا: پڑھئے۔ آپؐ نے جواب دیا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: پس اس نے مجھے پکڑ کر بھینچا، یہاں تک کہ وہ بھینچنا میری آخری طاقت کو پہنچ گیا (یہ عربی محاورہ ہے اور اردو محاورہ ہے: یہاں تک کہ میری ہڈی پسلی ایک ہوگئی) پھر مجھے چھوڑ دیا، اور کہا: پڑھئے، میں نے دوبارہ یہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، پس فرشتہ نے مجھے پکڑ کر دوبارہ بھینچا یہاں تک کہ وہ بھینچنا میری آخری طاقت کو پہنچ گیا، پھر مجھے چھوڑ دیا، اور کہا پڑھئے، میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، آپؐ نے فرمایا: اس نے پھر تیسری بار مجھے پکڑ کر بھینچا پھر مجھے چھوڑ دیا، اور کہا: ﴿إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ یعنی پانچ آیتیں نازل کیں۔

ترکیب:

قوله: أول ما بُدِئ: أولُ: مضاف، ما بُدِئَ مضاف الیہ، پھر مرکب اضافی مبتداء اور الرؤیا الصّالحة فی النوم: خبر ہے، اور ما بُدئ میں ما موصولہ ہے اور مِن الوحی: اس کا بیان ہے۔

آپؐ کو نبوت کب ملی؟

تمام محدثین ومؤرخین کا اتفاق ہے کہ پیر کے دن پہلی وحی نازل ہوئی ہے، مگر اس میں اختلاف ہے کہ کس مہینے میں پہلی وحی آئی؟ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ماہ ربیع الاول کی آٹھ تاریخ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ پس بعثت کے وقت ٹھیک آپؐ کی عمر چالیس سال تھی، اور محمد بن اسحاق کی رائے یہ ہے کہ سترہ رمضان المبارک کو نبوت ملی۔ اور سترہ رمضان کو پہلی وحی آئی، پس بعثت کے وقت عمر چالیس سال چھ ماہ تھی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اسی قول کو راجح قرار دیا ہے، اور بعض حضرات نے دونوں قولوں کو جمع کیا ہے۔ اس طرح کہ نبوت ورسالت کی تمہید یعنی رویائے صالحہ کی ابتداء ربیع الاول سے ہوئی، اور باقاعدہ وحی کا سلسلہ چھ ماہ بعد سترہ رمضان سے شروع ہوا۔

سچے خوابوں کی حقیقت:

جوخواب ازقبیل مبشرات ہوتے ہیں وہ عالم مثال میں لے جاکر دکھائے جاتے ہیں ـــــ ہماری یہ دنیا عالم ناسوت ہے(ناس سے ناسوت بنا ہے)اوراس سے آگے عالم مثال ہے،مثال کے معنی ہیں: مانند،ٹوکاپی،عالم مثال دنیا کی اورآخرت کی ٹوکاپی ہے، پھراس سے آگے عالم ملکوت (فرشتوں کی دنیا) ہے،(ملکوت: ملک سے بنا ہے) پھراس سے آگے عالم جبروت (اللہ کی ذات) ہے(یہ جبار سے بنا ہے)

نبوت سے چھ ماہ پہلے آنحضور ﷺ کورویائے صالحہ نظر آنے لگے، بار بار آپؐ کوناسوت سے عالم مثال میں لے جایا جاتا تاکہ عالم ملکوت سے مناسبت پیدا ہوجائے اور یہ بات آنحضور ﷺ کے ساتھ خاص نہیں،سبھی انبیاء کے ساتھ یہی معاملہ رہا ہے،علقمۃ بن قیسؒ جوحضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے خاص تلمیذ ہیں ایک مرسل روایت میں فرماتے ہیں: انبیاء کوسب سے پہلے خواب دکھلائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب سچے خوابوں سے ان کے قلوب مطمئن ہوجاتے ہیں توبحالت بیداری ان پراللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے(فتح الباری ۱:۱۷)

قولہ:مثلَ فَلَقِ الصبح: لفظ مثل منصوب ہے اور مصدر محذوف کی صفت ہے، تقدیر عبارت ہے: إلا جاءتْ مجیئًا مثلَ فَلَقِ الصبح (عمدہ ۱:۵۶) ـــــ اورفَلَق (فااورلام کے زبر کے ساتھ) کے معنی ہیں: پھاڑنا، چیرنا،ارشاد پاک ہے:﴿إِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوىٰ﴾:اللہ تعالیٰ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والے ہیں،یعنی اگانے والے ہیں۔

حضرات علماء نے فرمایا:اس تشبیہ میں لطیف اشارہ ہے کہ سابق انبیاء چاندستاروں کے مانند ہیں اور نبی اکرم ﷺ آفتاب نبوت ہیں، اور جس طرح طلوع آفتاب کی خبرصبح صادق دیتی ہے اسی طرح رویائے صالحہ آفتاب نبوت کے مبادی اور پیش خیمہ ہوتے ہیں۔

قولہ: ثم حُبِّبَ إلیہ الخلاء: ثم یہاں ترتیب ذکری کے لئے ہے،اس کے مشہور معنی تراخی یہاں مرادنہیں،یعنی رویائے صالحہ اورخلوت کی محبت ساتھ ساتھ ہیں ـــــ اور حُبِّبَ (فعل مجہول) میں اس طرف اشارہ ہے کہ خلوت کی محبت خودبخود پیدانہیں ہوئی تھی ، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ تھا۔

خلوت گزینی کی افادیت:

اورخلوت کی محبت اس لئے دل میں ڈالی گئی کہ خلوت گزینی یعنی مخلوق سے علاحدگی تمام عبادتوں کی جڑ ہے، بلکہ بذات خودعبادت ہے۔اوراگرخلوت کے ساتھ ذکروفکر کی توفیق بھی مل جائے تونورعلی نور!میرے شیخ حضرت مولانا زکریا صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں: جس نے لوگوں سے دوری اختیار کی ،اور تنہائی کو پسند کیا: وہ اگرٹھیکری بھی ہوگا توہیرا بن جائے گا۔اور جولوگوں کے ساتھ تعلقات کا خواہاں ہوتا ہے اور یارانہ گانٹھنے کا شوقین ہوتا ہے وہ اگر ہیرا بھی ہوگا توٹھیکری

(بے وقعت) بن جائے گا۔

غارِ حراء کا بیان:

غارِ حراء: کعبہ شریف سے تین میل کے فاصلہ پر منی جاتے ہوئے بائیں طرف ایک پہاڑ ہے اس کا نام جبل نور ہے اس پر یہ غار ہے۔ یہ غار دیکھنے میں ایسا لگتا ہے: گویا قدرت نے عبادت کے لئے اس کو چھوٹا سا کمرہ بنایا ہے، اس کی اونچائی اتنی ہے کہ آدمی بسہولت کھڑا ہو سکے اور وسعت اتنی ہے کہ بہ سہولت لیٹ سکے، اور سامنے کی جانب بند ہے مگر اس میں سوراخ ہے جس سے بیت اللہ صاف نظر آتا ہے، باقی کچھ نظر نہیں آتا۔ غرض یہ غار نہ تو مکہ معظمہ سے اتنا دور ہے کہ وہاں تک پہنچنا مشکل ہو اور نہ اتنا قریب ہے کہ خلوت کا مقصد فوت ہو جائے، اور وہاں سے ہر وقت بیت اللہ نظر آتا ہے، اس وجہ سے آنحضور ﷺ نے عبادت کے لئے اس غار کا انتخاب فرمایا۔

قوله: فَيَتَحَنَّثُ- وهو التَّعبُّد- الليالي ذوات العدد: يَتَحَنَّثُ: باب تفعّل سے فعل مضارع معروف ہے، چونکہ یہ فعل غیر معروف ہے اس لئے امام زہری رحمہ اللہ نے وهو التَّعبُّد سے اس کی وضاحت کی۔ پس یہ کلمہ حدیث میں مُدرج ہے، اور تَحَنُّث کے معنی تَعبُّد حقیقی معنی نہیں، بلکہ التزامی معنی ہیں اس لئے کہ یہ حِنْث سے مشتق ہے اور حِنْث کے معنی ہیں: گناہ، لیکن چونکہ باب تفعل کی ایک خاصیت سلب مأخذ ہے اس لئے تَحَنُّث کے معنی ہیں: گناہ سے بچنا، اور رضاء الٰہی کے لئے گناہ سے بچنا عبادت ہے اس لئے تحنُّث کے معنی عبادت کے ہوئے۔

آپؐ غار حراء میں عبادت کس طرح کرتے تھے؟

اور آنحضور ﷺ غار حراء میں عبادت کس طرح کرتے تھے؟ اس سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں، اور راجح یہ ہے کہ آپؐ دین ابراہیمی واسماعیلی کے مطابق عبادت کرتے تھے، درمختار (۱:۱۶۳) میں ہے: **والمختار عندنا أنه كان يعمل بما ظهر له من الكشف الصادق من شريعة إبراهيم وغيره۔**

قوله: قبل أن ينزع: نَزَعَ (ض) نزعا کے معنی ہیں: اشتیاق کے ساتھ گھر لوٹنا، اور رَجَع کے معنی ہیں: صرف لوٹنا۔

قوله: ويَتَزَوَّدُ لذلك: آنحضور ﷺ چونکہ کئی کئی دن تک غار میں ٹھہرتے تھے، روزانہ گھر واپس نہیں آتے تھے اس لئے آپؐ توشہ لے جاتے تھے، اور توشہ ساتھ لے جانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ کھانے اور پینے کا انتظام رکھنا توکل کے منافی نہیں، بلکہ رزق خداوندی کی طرف اپنے فقر و فاقہ اور ضرورت و حاجت کا اظہار ہے جو عین عبادت ہے۔

قوله: حتى جاءه الحق وهو في غار حراء: جب آنحضور ﷺ کی عمر مبارک چالیس سال پوری ہوئی تو آپؐ توشہ ختم ہو جانے کی وجہ سے غروب شمس کے بعد گھر لوٹنے کے ارادہ سے غار حراء سے نکلے۔ غار کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان ہے جب آپؐ اس میں پہنچے تو اچانک حضرت جبرئیل علیہ السلام انسانی شکل میں سامنے آئے، اور انھوں نے

فرمایا: إقرأ، یہ إقرأ: حضرت جبرئیل علیہ السلام کا قول ہے یا وہ جو پہلی وحی لائے ہیں اس کا پہلا کلمہ ہے؟ دونوں احتمال ہیں، اور میرا رجحان یہ ہے کہ یہ حضرت جبرئیلؑ کا قول نہیں بلکہ پہلی وحی کا پہلا کلمہ ہے، جب بچے کو پڑھاتے ہیں تو پوری آیت ایک ساتھ نہیں پڑھاتے، ایک ایک کلمہ پڑھاتے ہیں، پس یہ پہلی وحی کا پہلا کلمہ ہے۔ مگر آنحضور ﷺ نے خیال فرمایا کہ یہ مجھے کچھ پڑھنے کو کہہ رہے ہیں، اس لئے آپؐ نے جواب دیا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، اس پر فرشتہ نے آپؐ کو تین مرتبہ شدت سے دبایا۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام کا یہ دبانا ملکی اور روحانی فیض پہنچانے کے لئے تھا، تاکہ ملکیت آپؐ کی بشریت پر غالب آجائے اور قلب مبارک آیات الٰہیہ، اسرار غیبیہ اور علوم ربانیہ کے تحمل کے لئے تیار ہوجائے۔ حضرات عارفین کا اس طرح فیض پہنچانا بطریق تواتر ثابت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک بار نبی ﷺ نے مجھ کو اپنے سینے سے لگایا اور یہ دعا فرمائی: اللّٰهم علّمه الكتاب: اے اللہ! اس کو اپنی کتاب کا علم عطا فرما۔ نبی اکرم ﷺ کا ابن عباس کو اپنے سینہ سے لگانا ایسا ہی تھا جیسا حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپؐ کو اپنے سینہ سے لگایا تھا (ماخوذ از سیرت النبی ۱:۱۴۹)

قولہ: حتی بلغ منی الجهد: یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ کتاب التفسیر اور کتاب التعبیر میں بھی لائے ہیں مگر حتی بلغ منی الجهد: یہاں صرف پہلی اور دوسری مرتبہ کے ساتھ ذکر کیا ہے لیکن کتاب التفسیر اور کتاب التعبیر میں تیسری مرتبہ کے ساتھ بھی ذکر کیا ہے۔

الجهد: میں جیم پر زبر بھی پڑھ سکتے ہیں اور پیش بھی، اور اس کو بَلَغَ کا فاعل بنا کر مرفوع بھی پڑھ سکتے ہیں اور مفعول بنا کر منصوب بھی، میرے نزدیک راجح مفعول بنانا ہے اور فاعل هُو ضمیر پوشیدہ ہے جو بھینچنے کی طرف راجع ہے، ترجمہ ہے: یہاں تک کہ وہ بھینچنا پہنچ گیا میری آخری طاقت کو۔

قولہ: فجاء ہ الملك: یہ فاء تفسیر یہ تفصیلیہ ہے، تعقیبیہ نہیں ہے۔

فَرَجَعَ بِهَا رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَرْجُفُ فُؤَادُه، فَدَخَلَ عَلٰى خَدِيْجَةَ بِنْتِ خُوَيْلِدٍ فَقَالَ: "زَمِّلُوْنِيْ، زَمِّلُوْنِيْ" فَزَمَّلُوْهُ حَتّٰى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ، فَقَالَ لِخَدِيْجَةَ وَأَخْبَرَهَا الْخَبَرَ: " لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ" فَقَالَتْ لَهُ خَدِيْجَةُ: كَلَّا، وَاللّٰهِ! مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ، وَتَقْرِيْ الضَّيْفَ، وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ، فَانْطَلَقَتْ بِهِ خَدِيْجَةُ حَتّٰى أَتَتْ بِهِ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ أَسَدِ بْنِ عَبْدِ الْعُزّٰى – ابْنَ عَمِّ خَدِيْجَةَ – وَكَانَ امْرَءً تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعِبْرَانِيَّ، فَيَكْتُبُ مِنَ الْإِنْجِيْلِ بِالْعِبْرَانِيَّةِ مَاشَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَكْتُبَ، وَكَانَ شَيْخًا كَبِيْرًا قَدْ عَمِيَ، فَقَالَتْ لَهُ خَدِيْجَةُ: يَاابْنَ عَمِّ اسْمَعْ مِنِ ابْنِ أَخِيْكَ، فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ: يَا ابْنَ أَخِيْ مَاذَا تَرٰى؟ فَأَخْبَرَهُ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم خَبَرَ مَا رَأٰى، فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ: هٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِيْ نَزَّلَ اللّٰهُ عَلٰى مُوْسٰى، يَا لَيْتَنِيْ فِيْهَا جَذَعًا! يَا لَيْتَنِيْ أَكُوْنُ

حَيًّا إِذْ يُخرِجُكَ قَوْمُكَ، فَقَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: " أَوَ مُخرِجِيَّ هُمْ؟" قَالَ: نَعَمْ، لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ إِلَّا عُوْدِيَ، وَإِنْ يُدْرِكْنِي يَوْمُكَ أَنْصُرْكَ نَصرًا مُؤَزَّرًا، ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ أَنْ تُوُفِّيَ وَفَتَرَ الْوَحْيُ. [انظر: ٣٣٩٢، ٤٩٥٣، ٤٩٥٥، ٤٩٥٦، ٤٩٥٧، ٦٩٨٢]

ترجمہ: پس آنحضرت ﷺ ان آیات کے ساتھ گھر لوٹے، درانحالیکہ آپؐ کا دل لرز رہا تھا (اور یونس اور معمر کی روایت میں فؤادہ کی جگہ بوادرہ ہے یعنی آپؐ کے مونڈھے کا گوشت کانپ رہا تھا) پس آپ حضرت خدیجہ بنت خویلد کے پاس آئے اور آپؐ نے فرمایا: مجھے کمبل اڑھاؤ، مجھے کمبل اڑھاؤ! چنانچہ انھوں نے کمبل اڑادیا (گھر میں حضرت خدیجہ کے ساتھ غلام وغیرہ بھی ہونگے اس لئے جمع کا صیغہ لائے ہیں) یہاں تک کہ آپؐ کا ڈر ختم ہوگیا۔ پس آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا: درانحالیکہ ان کو واقعہ بتایا (یہ جملہ حالیہ ہے) بخدا! واقعہ یہ ہے کہ مجھے اپنی ہلاکت کا اندیشہ لاحق ہوچلا ہے (یہ قال کا مقولہ ہے) پس آپؐ سے حضرت خدیجہؓ نے کہا: ہرگز نہیں یعنی آپؐ ہلاک نہیں ہونگے خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپؐ کو کبھی بھی رسوا نہیں کریں گے، بیشک آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، اور آپؐ بوجھ اٹھاتے ہیں یعنی مقروضوں کی طرف سے قرضے ادا کرتے ہیں، اور معدوم (انتہائی غریب) کے لئے کماتے ہیں یعنی ناداروں کی خبر گیری کرتے ہیں، اور آپؐ مہمان نوازی کرتے ہیں، اور آپؐ قدرتی آفات میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں، پھر حضرت خدیجہؓ آپؐ کو لے کر چلیں یہاں تک کہ آپؐ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لائیں جو نوفل بن اسد بن عبد العزی کے بیٹے اور حضرت خدیجہ کے چچازاد بھائی تھے، اور ورقہ ایسے آدمی تھے جو زمانۂ جاہلیت میں نصرانی ہوگئے تھے، وہ عبرانی کتاب لکھا کرتے تھے، پس انجیل سے عبرانی میں لکھتے تھے جو اللہ تعالیٰ چاہتے کہ لکھیں، اور وہ بہت بوڑھے آدمی تھے جو نابینا ہوچکے تھے۔ پس ان سے حضرت خدیجہؓ نے کہا: اے میرے چچازاد بھائی! اپنے بھتیجے کی بات سنئے، پس آپؐ سے ورقہ نے پوچھا: اے بھتیجے! تم نے کیا دیکھا؟ پس رسول اللہ ﷺ نے ان کو وہ پورا واقعہ بتلایا جو آپؐ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ پس آپؐ سے ورقہ نے کہا: یہ وہی ناموس (رازدار فرشتہ) ہے جس کو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا تھا۔ کاش میں زمانۂ دعوت میں جوان ہوتا! اے کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپؐ کو آپؐ کی قوم (مکہ سے) نکالے گی۔ پس رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: کیا اور وہ مجھے نکالنے والے ہیں؟ ورقہ نے کہا: ہاں، نہیں لایا کوئی شخص کبھی بھی اس کے مانند جو آپؐ لائے ہیں مگر وہ دشمنی کیا گیا ہے، یعنی جو شخص بھی اللہ کا کلام اور پیام لے کر آتا ہے لوگ اس کے دشمن ہوجاتے ہیں اور اگر میں نے آپؐ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپؐ کی بھرپور مدد کروں گا، پھر کچھ ہی دن گذرے تھے کہ ورقہ کا انتقال ہوگیا اور وحی سست پڑگئی یعنی وقتی طور پر رک گئی۔

حضرت خدیجہؓ کا ذکر خیر:

ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا آنحضور ﷺ کی پہلی زوجۂ مطہرہ ہیں اور بالاجماع پہلی مسلمان

ہیں۔ حافظؒ نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ یہ روایت صراحۃً اس پر دلالت کرتی ہے کہ علی الاطلاق سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایمان لائیں، آپؓ قبیلہ قریش سے تھیں، بڑی شریف اور مالدار عورت تھیں، زمانۂ جاہلیت کے رسوم ورواج سے پاک تھیں، اس لئے بعثت نبوی سے پہلے ہی آپؓ طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں، آپؓ کا سلسلہ نسب قُصی پر پہنچ کر آنحضرت ﷺ کے ساتھ مل جاتا ہے۔ آپؓ کا پہلا نکاح ابو ہالہ بن زرارہ تمیمیؓ سے ہوا تھا جس سے ہند اور ہالہ دو بیٹے پیدا ہوئے، اور دونوں مشرف باسلام ہوئے، پھر دوسرا نکاح عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوا جن سے ایک لڑکی ہند پیدا ہوئی یہ بھی مشرف باسلام ہوئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد آپؓ پھر بیوہ ہوگئیں اور پھر آنحضور ﷺ کی زوجیت میں آئیں۔

قوله: الرَّوع: (بفتح الراء) کے معنی ہیں: خوف، ڈر، اور راء کے پیش کے ساتھ رُوع کے معنی ہیں: دل، دماغ۔ حدیث میں ہے: إن جبرئيل نَفَثَ في رُوعي: حضرت جبرئیلؑ نے میرے دل میں ڈالا۔

قوله: وأخبرها الخبر: جملہ حالیہ ہے اور لقد خشيت على نفسي: قال کا مقولہ ہے۔

قوله: كلاَ والله ما يُخزيك الله أبداً: جب آنحضور ﷺ نے فرمایا: مجھے اپنی ہلاکت کا اندیشہ ہو چلا ہے تو حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو تسلی دی اور فرمایا: بخدا! اللہ تعالیٰ آپؐ کو کبھی رسوا نہیں کریں گے یعنی ہلاکت تو آخری مرحلہ ہے، مگر کبھی ہلاکت سے پہلے ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ آدمی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ حضرت خدیجہؓ نے ابتدائی مرحلہ کی نفی کردی کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو رسوا بھی نہیں کریں گے۔ کیونکہ آپؐ پانچ ایسے کام کرتے ہیں جو رفاہ عام کے ہیں۔ اور جو بھی رفاہ عام کے کام کرتا ہے وہ کبھی رسوا نہیں ہوتا، حدیث میں ہے: الصَّدقة تُطفِئُ غَضبَ الرَّبِّ ومِيتَةَ السَّوْء: خیرات رفاہی کام ہے اور اس کے دو فائدے ہیں: اس سے اللہ کا غصہ ٹھنڈا پڑتا ہے اور آدمی بری موت سے بچ جاتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رفاہ عام کے کام کرنے والوں سے لوگ محبت کرتے ہیں اور وہ بے وقاری اور رسوائی سے دوچار نہیں ہوتے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ایسے پانچ کام ذکر کئے ہیں:

① ـــــ إنك لَتصِلُ الرَّحِم: آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، اردو میں رحَم (بچہ دانی، بفتح الراء) بولتے ہیں مگر عربی میں راء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ رَحِم کی جمع أرحام ہے اور وَصَلَ (ض) وَصْلاً کے معنی ہیں: ملانا، یعنی آپؐ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں، حسن سلوک سے خاندانی تعلقات ہموار ہوتے ہیں اور میل ملاپ پیدا ہوتا ہے۔

② ـــــ وَتَحْمِلُ الكَلَّ: اور آپؐ بوجھ اٹھاتے ہیں یعنی جو بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں ان کی اعانت کرتے ہیں اور ان کو بوجھ سے نکالتے ہیں، مثلاً کسی پر بھاری قرضہ آپڑا ہے اور اس میں قرضہ ادا کرنے کی سکت نہیں تو آپؐ ایسے لوگوں کا تعاون کرتے ہیں۔

③ ـــــ وَتَكْسِبُ المعدومَ: کسب (ض) کسباً کے معنی ہیں: کمانا۔ اور المعدوم کے معنی ہیں: نیست، جس کا

وجود باقی نہیں رہا یعنی انتہائی درجہ کا غریب آدمی، یہ لفظ مجاز مَا یؤُول ہے یعنی وہ بندے جو انتہائی درجہ لاچار، اور مجبور ہیں، جیسے لولے لنگڑے، اندھے محتاج اور بوڑھی بیوہ عورتیں جن کی کوئی خبر گیری نہیں کرے گا تو مر جائیں گے۔ ایسوں کو نبی ﷺ کماتے ہیں یعنی مدد کر کے ان کو زندہ رکھتے ہیں یا ان کے لئے کماتے ہیں (اس صورت میں لام جارّہ محذوف ہوگا) یعنی کما کر ان کو روزی پہنچاتے ہیں۔

فائدہ: شارحین بخاری اس جملہ کے حل کرنے میں بہت پریشان ہوئے ہیں، حتی کہ خطابی رحمہ اللہ نے جو امام ابوداؤد رحمہ اللہ کے صرف ایک واسطہ سے شاگرد ہیں، جنھوں نے ابوداؤد کی سب سے پہلی شرح مَعالم السُّنن لکھی ہے، اور بخاری شریف کی بھی شرح لکھی ہے، فرماتے ہیں کہ المعدوم کاتبوں کی تصحیف ہے، صحیح لفظ المُعْدِم ہے، یہ باب افعال سے اسم فاعل ہے جس کے معنی ہیں: ختم کرنے والا، نادار۔ یعنی جس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ حالانکہ معدوم کا بھی یہی مطلب ہے اس لئے بخاری کے تمام شارحین خطابی رحمہ اللہ کی بات سے متفق نہیں، ان کے نزدیک یہی لفظ صحیح ہے اور اس کو معدوم مجاز مَایؤُول کے اعتبار سے کہا گیا ہے یعنی اگرچہ ابھی نہیں مرا مگر اگر یہی حال رہا تو بیچارہ مر جائے گا۔

اور تصحیف نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آگے (حدیث ۳۹۰۵) حضرت ابوبکرؓ کے واقعہ میں بھی یہی لفظ آرہا ہے، اور دونوں جگہ کاتبوں نے گڑبڑ کردی ہو یہ بات بہت بعید ہے۔

④ —— وَتَقْرِیْ الضَّیْفَ: اور آپؐ مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں، قَرَی (ض) قَرْیًا کے معنی ہیں: مہمانی کرنا، آج کل جگہ جگہ ہوٹل کھل گئے ہیں اور جیب بھی گرم ہیں اس لئے کھانے پینے کی کوئی پریشانی نہیں، مگر قدیم زمانہ میں یہ سہولت نہیں تھی، بڑے قصبات میں بھی کوئی ہوٹل نہیں تھا، ایسی جگہوں میں مہمان نوازی کرنا اور مسافروں کو کھانا کھلانا رفاہ عام کا کام ہے اور اس میں بہت بڑا ثواب ہے۔

⑤ —— وَتُعِیْنُ علی نوائِبِ الحق: تُعِیْنُ (از باب افعال): مدد کرنا، اور نوائب: نائبة کی جمع ہے: حادثہ اور نوائب الحق مرکب اضافی درحقیقت مرکب توصیفی ہے اس کے معنی ہیں: قدرتی حوادث، جیسے زلزلہ، بادوباراں کا طوفان وغیرہ نَابَ (ن) نَوْبًا کے معنی ہیں: پیش آنا۔ اور الحق کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حوادثات پیش آتے ہیں آپؐ ان میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

غرض: حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: آپؐ یہ یہ رفاہی کام کرتے ہیں اور ایسے کام کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کبھی رسوا نہیں کرتے، ہلاکت تو دور کی بات ہے۔

اور ان پانچ رفاہی کاموں کی نہ تخصیص ہے نہ حصر، اور بھی ایسے کام ہو سکتے ہیں، بخاری شریف کتاب المناقب (حدیث نمبر ۳۹۰۵) میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث آرہی ہے، اس میں ابن الدغنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بھی یہی پانچ کام بیان کئے ہیں، اس لئے ان کاموں کی آپ ﷺ کے ساتھ تخصیص نہیں۔

پھر حضرت خدیجہؓ آپؐ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، ورقہ توریت وانجیل کے بڑے عالم تھے اور بت پرستی سے بیزار ہوکر عیسائی بن گئے تھے۔ وہ سریانی زبان سے عربی زبان میں انجیل کا ترجمہ کرتے تھے، اور لوگوں میں تقسیم کرتے تھے، تاکہ لوگ عیسائیت قبول کریں یعنی وہ دین کی نشر واشاعت کا کام کرتے تھے، وہ بہت بوڑھے تھے اور نابینا ہوگئے تھے۔ ان کی باتوں سے نبی ﷺ کو اطمینان اس لئے ہوا تھا کہ پہلی وحی کے موقع پر آپؐ کو کچھ نہیں بتایا گیا تھا، نہ اس وقت دعوت کا حکم دیا گیا تھا، یہ سب کچھ دوسری وحی کے موقعہ پر بتایا گیا تھا۔

قوله: وكان امرأً تنصَّر في الجاهلية: ورقہ بن نوفل عبرانی زبان کے ماہر تھے اور وہ انجیل کو عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے، یہاں یہ ہے اور کتاب التعبیر میں ہے: **وكان يكتبُ الكتاب العربي، فيكتُب بالعربية من الإنجيل ماشاء الله أن يكتُب** (حدیث ۶۹۸۲) یعنی ورقہ عربی میں لکھا کرتے تھے، انجیل کا عربی میں ترجمہ کیا کرتے تھے، ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں، اس لئے کہ ورقہ عربی اور عبرانی دونوں زبانیں جانتے تھے اور انجیل کا سُریانی سے عربی اور عبرانی دونوں زبانوں میں ترجمہ کرتے تھے۔

قوله: يا ابن عمِّ: ورقہ: حضرت خدیجہؓ کے حقیقی چچازاد بھائی تھے، اسد بن عبد العزی کے دولڑکے تھے نوفل اور خویلد۔ ورقہ: نوفل کے لڑکے تھے اور حضرت خدیجہؓ: خویلد کی لڑکی تھیں اور مسلم (ص:۸۸) کی ایک روایت میں یا عمِّ آیا ہے، یہ کبرسنی کی وجہ سے احتراماً کہا ہے، جیسے بڑا چھوٹے کو بھتیجا کہتا ہے۔ ورقہ نے بھی آپؐ کو یا ابن أخي کہا ہے۔ آنحضور ﷺ اور ورقہ کا نسب قصی میں جا کر ملتا ہے اس طرح بھی آپؐ اور ورقہ چچازاد بھائی ہوئے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ قُصی کے ایک لڑکے کا نام عبد مناف تھا جو آنحضور ﷺ کے جدامجد ہیں اور دوسرے لڑکے کا نام عبد العزیٰ تھا جو ورقہ کے جدامجد ہیں، جب یہ دونوں بھائی تھے تو نیچے ان کی اولاد چچازاد بھائی ہوگی، جیسے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی والدہ اور حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی بہنیں تھیں، پس حضرت زکریا کی اہلیہ: حضرت مریم کی خالہ ہوئیں، اور حضرت زکریا کے صاحبزادے حضرت یحییٰ علیہ السلام: حضرت مریم کے خالہ زاد بھائی ہوئے۔ اس لئے حضرت مریمؑ کے صاحبزادے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام بھی خالہ زاد بھائی ہوئے۔ یہی صحیح رشتہ ہے۔ معراج میں جب حضور اکرم ﷺ تیسرے آسمان پر پہنچے ہیں تو وہاں آپؐ کی حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام سے ملاقات ہوئی ہے۔ اُس حدیث میں ہے کہ دو خالہ زاد بھائیوں سے ملاقات ہوئی۔

قوله: هذا الناموس الذي نَزَّل الله على موسىٰ: ناموس کے معنی ہیں: راز دار، یہ جاسوس کا مقابل ہے، بری خبریں لانے والے کو جاسوس اور اچھی خبر لانے والے کو ناموس کہتے ہیں، اس کی جمع نوامیس ہے۔ اور نوامیس الٰہیہ: اللہ کے یہاں سے آئے ہوئے احکام کو کہتے ہیں، چونکہ وہ احکام حضرت جبرئیل علیہ السلام کی معرفت آتے ہیں اس لئے ان کو نوامیس کہا جاتا ہے۔

سوال: جب ورقہ نصرانی تھے تو ان کو کہنا چاہئے تھا کہ یہ وہی ناموس ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی لے کرآتا تھا، انھوں نے حضرت عیسیٰ کے بجائے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام کیوں لیا؟

جواب: حضرت موسیٰ علیہ السلام انبیاء بنی اسرائیل کے اصل الاصول ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سلسلہ کے خاتم ہیں، پس اصل دین دین موسوی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی دین پر بھیجے گئے تھے جیسے آنحضرت ﷺ ملت اسماعیلی پر مبعوث کئے گئے ہیں، چنانچہ بنیادی احکام موسیٰ علیہ السلام پر آئے ہیں، اور انجیل میں احکام میں کچھ اضافہ ہوا ہے اور کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ باقی اصل احکام عیسائیت میں بھی وہی ہیں جو تورات میں ہیں، انجیل مستقل کتاب نہیں، توریت کا ضمیمہ ہے، ورقہ اس حقیقت سے واقف تھے اس لئے انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام لیا ہے۔

قوله: يا ليتني فيها جَذَعا: یعنی ابھی تو آپ کو دعوت کا کام سپرد نہیں ہوا، لیکن آگے ہوگا، پس جب آپ پر یہ ذمہ داری عائد کی جائے گی: کاش اس وقت میں جوان ہوتا تو آپ کا معاون و مددگار بنتا ——— جَذَعًا: کے معنی ہیں: پٹھا یعنی نوجوان، اور فیھا کی ضمیر دعوت کی طرف راجع ہے۔

قوله: يا ليتني أكون حيًّا إذ يُخرِجُك قومُك: یعنی جب آپ کو آپ کی قوم اس شہر سے نکالے گی: کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں، تو میں آپ کی بھرپور مدد کرونگا، لیکن اس کے بعد چند ہی دن گذرے تھے کہ ورقہ کا انتقال ہوگیا، ترمذی شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے پوچھا: یارسول اللہ! ورقہ نے آپ کی تصدیق کی تھی لیکن اعلانِ نبوت سے پہلے فوت ہوگئے، پس ان کا کیا حال ہے؟ آپ نے فرمایا: میں نے ورقہ کو خواب میں دیکھا، وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھے، اگر وہ دوزخی ہوتے تو کسی اور لباس میں ہوتے، اور مسند بزار اور مستدرک حاکم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ورقہ کو برا مت کہو میں نے ان کے لئے جنت میں ایک باغ یا فرمایا: دو باغ دیکھے ہیں (فتح الباری ۸: ۵۵۴ کتاب التفسیر سورۂ اقراء)

[٤-] قَالَ ابْنُ شِهَابٍ: وَأَخْبَرَنِيْ أَبُوْ سَلَمَةَ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ أَنَّ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ الْأَنْصَارِيَّ، قَالَ وَهُوَ يُحَدِّثُ عَنْ فَتْرَةِ الْوَحْيِ، فَقَالَ فِيْ حَدِيْثِهِ: بَيْنَا أَنَا أَمْشِيْ إِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِنَ السَّمَاءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِيْ فَإِذَا الْمَلَكُ الَّذِيْ جَاءَ نِيْ بِحِرَاءٍ جَالِسٌ عَلَى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، فَرُعِبْتُ مِنْهُ، فَرَجَعْتُ، فَقُلْتُ: زَمِّلُوْنِيْ، زَمِّلُوْنِيْ، فَأَنْزَلَ اللهُ تَعَالٰى: ﴿يٰأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَأَنْذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ فَحَمِيَ الْوَحْيُ وَتَتَابَعَ.

تَابَعَهُ عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوْسُفَ، وَأَبُوْ صَالِحٍ: وَتَابَعَهُ هِلَالُ بْنُ رَدَّادٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ؛ وَقَالَ يُوْنُسُ وَمَعْمَرٌ: بَوَادِرُهُ [انظر: ٣٢٣٨، ٤٩٢٢، ٤٩٢٣، ٤٩٢٤، ٤٩٢٥، ٤٩٢٦، ٤٩٥٤، ٦٢١٤]

ترجمہ: ابوسلمہ کہتے ہیں: حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: درانحالیکہ وہ وقفۂ وحی کا تذکرہ کررہے تھے، پس آپؐ نے اپنی بات میں فرمایا: ''دریں اثنا کہ میں چل رہا تھا میں نے آسمان سے ایک آواز سنی، میں نے اپنی نظر اٹھائی، اچانک وہ فرشتہ جو میرے پاس غارِ حراء میں آیا تھا آسمان وزمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ پس میں اس سے گھبرایا اور میں گھر لوٹا، اور میں نے کہا: مجھے کپڑا اڑھاؤ! مجھے کپڑا اڑھاؤ! پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں فرمائیں: اے کپڑا اوڑھنے والے! اٹھئے یعنی مستعد ہوجائیے، پس ڈرائیے اور اپنے رب کی بڑائی بیان کیجئے، اور اپنے کپڑوں کو پاک کیجئے، اور بتوں کو چھوڑ دیجئے، یعنی لوگوں کو سمجھائیے کہ وہ بتوں کو چھوڑ دیں، پس وحی گرم ہوگئی اور مسلسل آنے لگی یعنی پھر لمبا وقفہ نہیں ہوا۔

تشریح:

۱- پہلے یہ بتایا جاچکا ہے کہ سب سے پہلے سورۃ العلق کی پانچ آیتیں نازل ہوئی ہیں پھر چھ ماہ کے لئے وحی رک گئی پھر ایک بار آپؐ غارِ حراء سے اتر کر گھر آرہے تھے، جب آپؐ اجیاد نامی محلّہ سے گذر رہے تھے تو آپؐ نے ایک آواز سنی، آپؐ نے چاروں طرف دیکھا کوئی نظر نہ آیا، پھر آپؐ نے نظر اٹھائی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آسمان وزمین کے درمیان کرسی پر بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ آپؐ پر ہیبت طاری ہوگئی، آپ گھبرا کر گھر لوٹے اور کپڑوں میں لپٹ گئے، اسی وقت سورۃ المدثر کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل ہوئیں، جن میں آپؐ کو مستعد ہوکر کافروں کو ڈرانے کا اور ان کو بتوں سے باز رکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپؐ نے فوراً دعوت وتبلیغ کا کام شروع کردیا اور غارِ حراء میں جانا موقوف کردیا۔

۲- اس حدیث کی سند بھی ابن شہاب تک وہی ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کی تھی۔ پھر ابن شہاب نے یہ حدیث حضرت ابوسلمہ سے روایت کی ہے، حضرت ابوسلمہ مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ میں سے ہیں اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں، مگر ان کا اپنے والد سے لقاء وسماع نہیں۔ ابھی وہ بچے تھے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا انتقال ہوگیا تھا۔

قوله: تابعه عبد الله بن يوسف وأبو صالح: تابعہ کی ضمیر امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ یحییٰ بن بُکیر کی طرف راجع ہے، یعنی عبداللہ بن یوسف اور ابوصالح نے یحییٰ بن بکیر کی متابعت کی ہے، یعنی بخاریؒ کے استاذ الاستاذ امام لیث مصری سے اس حدیث کو یحییٰ بن بکیر، عبداللہ بن یوسف اور ابوصالح تینوں روایت کرتے ہیں اور ان کی روایتوں میں کوئی اختلاف نہیں، اس کا نام متابعت تامہ ہے، یعنی اگر کسی استاذ کے تلامذہ ایک دوسرے کے مانند روایت کریں تو وہ ایک دوسرے کے لئے متابع ہونگے اور اس کو متابعت تامہ کہیں گے۔

قوله: وتابعه هلال بن رداد عن الزهري: تابعہ کی ضمیر عقیل کی طرف راجع ہے، یعنی ہلال بن رداد اور عقیل کی روایت بھی اسی طرح ہے، یہ متابعت قاصرہ ہے، یعنی اگر اوپر کے کسی استاذ کے تلامذہ ایک دوسرے کی موافقت کریں تو اس کو متابعت قاصرہ کہتے ہیں۔

البتہ ابن شہاب زہریؒ کے دوسرے دوشاگرد یونس اور معمر کی روایت میں ذرا فرق ہے وہ فؤادہ کی جگہ بوادرہ کہتے ہیں، بس اس ایک فرق کے علاوہ باقی کوئی فرق نہیں۔

دوراول میں روایت بالمعنی کرتے تھے، مگر دور مابعد میں محدثین لفظوں کا فرق بھی ملحوظ رکھتے تھے، چنانچہ متابعت پیش کر کے امام بخاریؒ نے یحییٰ بن بکیر والی روایت کو ترجیح دی کیونکہ وہ چار راوی ہیں اور یہ دو ہیں اس لئے چار کی روایت راجح ہوگی۔

فائدہ: امام بخاریؒ کے استاذ الاستاذ: امام لیث بن سعد مصریؒ بلند پایہ محدث اور فقیہ ہیں، امام مالکؒ کے ہم پلہ ہیں، بلکہ ان سے بھی بڑے ہیں، امام مالکؒ نے بہت سے مسائل خط لکھ کر ان سے دریافت کئے ہیں، اور حضرت امام شافعیؒ نے قیام مصر کے زمانہ میں ان سے پڑھا ہے، اور ان سے پڑھنے کے بعد بہت سے اقوال سے رجوع کیا ہے جو ان کے اقوال جدیدہ کہلاتے ہیں۔

نبی ﷺ کو قرآن یاد نہیں کرنا پڑتا تھا، خود بخود یاد ہو جاتا تھا

سورۃ القیامہ میں ہے: ﴿لَاتُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ، إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْآنَهٗ، فَإِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهٗ، ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾: آپؐ قرآن کے ساتھ اپنی زبان نہ ہلائیں تاکہ اس کو جلدی لے لیں، یعنی یاد کرلیں، بیشک ہمارے ذمہ ہے اس کا (آپؐ کے دل ودماغ میں) جمع کرنا، اور اس کو (لوگوں کے سامنے) پڑھوانا، پس جب ہم (یعنی جبرئیلؑ) اس کو پڑھیں تو آپؐ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں، یعنی سننے کی طرف متوجہ رہیں، پھر بیشک ہمارے ذمہ ہے اس کو کھولنا، یعنی اس کے مضمرات کو سمجھانا۔ غرض: یاد کرادینا، لوگوں کے سامنے پڑھوادینا، اور اس کے معانی سمجھادینا: سب ہمارے ذمہ ہیں۔

ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب نبی ﷺ پر قرآن نازل ہوتا تھا تو آپؐ قرآن کے ساتھ اپنے ہونٹ ہلاتے تھے یعنی سراً پڑھتے تھے اس سے آپؐ پر دوہرا بوجھ پڑتا تھا، سورۃ القیامہ کی مذکورہ آیات میں آپؐ کو اس سے روک دیا، فرمایا: جب قرآن نازل ہورہا ہو تو آپؐ سننے کی طرف متوجہ رہیں۔ جبرئیلؑ کے ساتھ نہ پڑھیں، قرآن کو یاد کرادینا، لوگوں کے سامنے پڑھوادینا اور اس کے معانی سمجھادینا: سب ہمارے ذمے ہے۔

آیات کا ماقبل سے ربط: ماقبل میں یہ آیات ہیں: ﴿بَلِ الْإِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ، وَلَوْ أَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ﴾: انسان خود اپنی حالت سے واقف ہے اگرچہ وہ اپنے بہانے پیش کرے، یعنی قیامت کے دن انسان کو سب احوال یاد آجائیں گے۔ اس دن بھول کی نعمت ختم کردی جائے گی: ﴿يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَاسَعٰى﴾: جس دن انسان کو اپنا

سب کیا کرایایاد آجائے گا (النازعات ۳۵) پھر بھی کافر بہانے بنائے گا، اور اپنے کفر ومعاصی کے حیلے گھڑے گا۔

جیسے نبی اکرم ﷺ کو وحی خود بخود یاد ہوجاتی تھی، کبھی اس کا تجربہ نہیں ہوا کہ آپ وحی کا کچھ حصہ بھول گئے ہوں مگر پھر بھی آپ قرآن کو یاد کرنے کے لئے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ سرأپڑھتے تھے، ہونٹ ہلانے کا یہی مطلب ہے، مگر سرأپڑھنے سے آپ پر دوہرا بوجھ پڑتا تھا، اس لئے یہ بےضرورت مشقت برداشت کرنا تھا۔ لیکن اگر آپ سے اس عمل کی وجہ پوچھی جائے تو آپ ضرور کہیں گے کہ میں اس لئے پڑھتا ہوں کہ قرآن یاد ہوجائے، یہ عذر بس ویسا ہی ہے۔ کیونکہ وحی بھولنے کا آپ کو کبھی تجربہ نہیں ہوا۔ اسی طرح قیامت کے دن کفار بہانے بنائیں گے وہ بھی عذر بارد ہونگے، کیونکہ خود ان کو اپنے کرتوت یاد آجائیں گے۔

آیات کا مابعد سے ربط: پھر ان چار آیتوں کے بعد ہے: ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ، وَتَذَرُوْنَ الآخِرَةَ﴾: ہرگز نہیں، بلکہ تم جلدی (دنیا) کو پسند کرتے ہو اور پچھلی (آخرت) کو چھوڑے ہوئے ہو، یعنی انسان دنیا کو محبوب رکھتا ہے اور آخرت سے بےاعتنائی برتتا ہے، اس کی کوئی تیاری نہیں کرتا۔ ساری توانائی دنیا کے پیچھے خرچ کردیتا ہے ـــــ اس کی مثال بھی وہی ہے کہ نزول وحی کے وقت کی حالت ہی آپ کے پیش نظر رہتی ہے، حالانکہ پچھلی حالت پیش نظر رہنی چاہئے، جب آپ کو وحی خود بخود یاد ہوجاتی ہے تو بےضرورت دوہری مشقت کیوں برداشت کی جائے؟

بھول اور آگاہی: پھر ایک مرتبہ نبی ﷺ سے بھول ہوگئی، آپ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ پڑھنے لگے، پس یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُّقْضٰى إِلَيْكَ وَحْيُهُ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾: اور آپ قرآن لینے میں جلدی نہ کریں، اُس سے پہلے کہ آپ کی طرف اس کی وحی مکمل کردی جائے اور آپ دعا کریں: ''اے پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما!'' پھر اس آیت کو سورۂ طٰہٰ میں ایک خاص جگہ رکھا گیا (آیت ۱۱۴) کیونکہ وہاں ماقبل اور مابعد سے گہرا ربط ہے۔

ماقبل سے ربط: ماقبل میں یہ آیت ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا﴾: اور اسی طرح ہم نے قرآن کو نہایت واضح پڑھنے کی کتاب بنا کر نازل کیا ہے، یہاں لفظ قرآن اسم علم کے طور پر نہیں، بلکہ اپنے مصدری معنی میں ہے ﴿وَصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ﴾: اور ہم نے اس میں ہر طرح کے انتباہات دیئے ہیں، یعنی جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے کچھ واقعات وحی کے ذریعہ سنائے اسی طرح یہ پورا قرآن ہم نے نہایت واضح پڑھنے کی کتاب بنا کر نازل کیا ہے اور اس میں پھیر پھیر کر انتباہات دیئے ہیں، یعنی بنیادی مسائل: توحید، رسالت اور آخرت کو مختلف انداز سے بار بار بیان کیا ہے، اس لئے کہ قرآن مثانی ہے اس میں مواعظ وقصص کو مختلف پیرایوں میں بار بار دہرایا گیا ہے تاکہ وہ مضامین اچھی طرح ذہن نشین ہوجائیں ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾: تاکہ لوگ (کفر وشرک اور معاصی سے) بچیں، یعنی ایمان لائیں اور اپنی زندگیاں سنواریں۔ چنانچہ بہت سے بندے قرآن سنتے ہی ایمان لائے، جیسے حضرت عمر بن الخطاب

رضی اللہ عنہ نے سورۂ طٰہٰ کی ابتدائی آیات پڑھیں تو فوراً ایمان لے آئے ﴿أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا﴾: یا قرآن ان کے لئے کچھ نصیحت پیدا کرے، یعنی ان کے لئے لمحۂ فکریہ پیدا کرے، اور وہ اپنے انجام کو سوچیں اور یہ سوچ ان کو ہدایت تک پہنچادے ﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ﴾: پس بہت عالی شان ہیں اللہ تعالیٰ برحق بادشاہ! ـــــ یہ قرآن بھیجنے کی حکمت ہے۔ دنیا کے بادشاہ جو محض مجازی حاکم ہوتے ہیں ہمیشہ اپنی رعایا کی فکر کرتے ہیں، ان کے لئے دستور بناتے ہیں، ان کی بھلائی کی تدبیریں سوچتے ہیں، پس اللہ تعالیٰ جو برحق بادشاہ ہیں اور جو بڑے عالی شان ہیں: وہ یہ کام کیوں نہ کریں گے؟ ان کی شانِ عالی سے یہ بات بہت بعید ہے کہ وہ اپنی اشرف مخلوق انسان کو بس یونہی چھوڑ دیں، اور اس کی دینی اور روحانی ضرورت کا انتظام نہ کریں۔

اسی روحانی ضرورت کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم الشان کتاب نازل فرمائی ہے، یہ پڑھنے کی کتاب ہے، صرف سن لینے کی نہیں، سنی ہوئی بات ذہن سے نکل بھی جاتی ہے لیکن اگر کسی کتاب کو بار بار پڑھا جائے تو اس کا فائدہ تام ہوتا ہے۔

پھر قرآن کوئی پیچیدہ کتاب نہیں، نہایت صاف واضح کتاب ہے، ہر شخص خواہ عربی ہو یا عجمی، شہری ہو یا دیہاتی، مرد ہو یا عورت، پڑھا لکھا ہو یا بے پڑھا اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور ایمان کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

اس کے بعد یہ آیت ہے: ﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضٰى إِلَيْكَ وَحْيُهُ وَقُلْ: رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾: اور آپ قرآن کے بارے میں جلدی نہ کریں، اس سے پہلے کہ آپ کی طرف اس کی وحی مکمل کردی جائے، اور آپ دعا کریں: اے میرے پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما ـــــ یعنی جو غیر مسلم قرآن کریم کا مطالعہ کرے، اس کے لئے خاص ہدایت یہ ہے کہ وہ قرآن کے بارے میں فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرے، پہلے اطمینان سے پورے قرآن کا مطالعہ کرلے، اس لئے کہ قرآن مثانی ہے، پس ممکن ہے کوئی مضمون ایک جگہ سمجھ میں نہ آئے، جب وہ مضمون دوسری جگہ آئے گا تو بات واضح ہوجائے گی۔ البتہ یہ دعا کرتا رہے: الٰہی! میری راہ نمائی فرما۔ میرے علم میں اضافہ فرما اور مجھے ہدایت سے ہم کنار فرما، اگر اس طرح قرآن کریم کا مطالعہ کیا جائے گا تو ذہن کے دریچے کھلیں گے، اور لوگ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو وہ منزل مقصود تک پہنچیں گے۔

مابعد سے ربط: اس کے بعد قرآن کا مطالعہ کرنے والے کو ایک انتباہ دیا گیا ہے، ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلٰى آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾: اور البتہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے قبل ازیں آدمؑ سے ایک پیمان باندھا تھا، پس وہ بھول گئے اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے جو عہد و پیمان باندھا تھا اس کا تذکرہ اگلی آیات میں ہے اس واقعہ کو یاد دلانے سے مقصود یہ ہے کہ قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا مطالعہ کی ہدایت کو بھول نہ جائے، وہ قرآن کا مطالعہ پورا کرنے سے پہلے کوئی منفی فیصلہ نہ کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اور بھول کا احتمال اس لئے ہے کہ وہ آدم زاد ہے اور آدم علیہ السلام سے ذہول ہوچکا ہے، انھوں نے اللہ کی تاکید کے باوجود

بھول کر ممنوع درخت کھالیا تھا، اور اولاد میں باپ کا اثر ضرور آتا ہے، چنانچہ انسان کی فطرت میں بھی کسی مصلحت سے بھول کا مادہ رکھا گیا ہے، اس لئے انسان میں ارادہ کی پختگی نہیں، پس مطالعہ کرنے والے کو مذکورہ نصیحت یاد رکھنی چاہئے۔

[٥-] حدثنا مُوْسَى بْنُ إِسْمَاعِيْلَ، قَالَ: أَخْبَرَنَا أَبُوْ عَوَانَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُوْسَى بنُ أَبِيْ عَائِشَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا سَعِيْدُ بْنُ جُبَيْرٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضى الله عنهما فِيْ قَوْلِهِ تَعَالٰى: ﴿لَاتُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾ قَالَ: كَانَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يُعَالِجُ مِنَ التَّنْزِيْلِ شِدَّةً، وَكَانَ مِمَّا يُحَرِّكُ شَفَتَيْهِ - فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: رضى الله عنهما فَأَنَا أُحَرِّكُهُمَا لَكَ كَمَا كَانَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يُحَرِّكُهُمَا. وَقَالَ سَعِيْدٌ: أَنَا أُحَرِّكُهُمَا كَمَا رَأَيْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ رضى الله عنهما يُحَرِّكُهُمَا، فَحَرَّكَ شَفَتَيْهِ - فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿لَاتُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ، إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ قَالَ: جَمْعُهُ لَكَ صَدْرَكَ وَتَقْرَأُهُ ﴿فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾ قَالَ: فَاسْتَمِعْ لَهُ وَأَنْصِتْ ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا أَنْ تَقْرَأَهُ، فَكَانَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بَعْدَ ذٰلِكَ إِذَا أَتَاهُ جِبْرِيْلُ اسْتَمَعَ، فَإِذَا انْطَلَقَ جِبْرِيْلُ قَرَأَهُ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم كَمَا قَرَأَهُ [انظر: ٤٩٢٧، ٤٩٢٨، ٤٩٢٩، ٥٠٤٤، ٧٥٢٤]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت پاک: ﴿لَاتُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نزول قرآن کی وجہ سے سختی برداشت کرتے تھے۔ اور آپؐ ان لوگوں میں سے تھے جو ہونٹ ہلاتے تھے ــــــ ابن عباسؓ نے فرمایا: میں تجھے ہونٹ ہلا کر دکھاتا ہوں جس طرح رسول اللہ ﷺ ہونٹ ہلاتے تھے۔ اور سعید بن جبیر نے (اپنے شاگردوں سے) کہا: میں ہونٹ ہلاتا ہوں جس طرح میں نے ابن عباسؓ کو ہونٹ ہلاتے دیکھا ہے، چنانچہ انھوں نے اپنے ہونٹ ہلائے ــــــ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں: ''آپ قرآن کے ساتھ اپنی زبان نہ ہلائیں تاکہ اس کو جلدی لے لیں، بیشک ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا'' یعنی یاد کرانا، ابن عباسؓ نے فرمایا: قرآن کو آپؐ کے سینہ میں جمع کردینا اور آپؐ اس کو لوگوں کے سامنے پڑھیں گے یعنی پڑھوانا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ ''پس جب ہم (یعنی جبرئیلؑ) اس کو پڑھیں تو آپؐ اس پڑھنے کی پیروی کریں'' ابن عباسؓ نے فرمایا: آپ غور سے سنیں اور خاموش رہیں: ''پھر بیشک ہمارے ذمہ ہے اس کو کھولنا'' (ابن عباسؓ نے فرمایا:) پھر بیشک ہمارے ذمہ ہے کہ آپ اس کو پڑھیں، پس اس کے بعد جب جبرئیلؑ وحی لے کر آتے تو آپؐ بغور سنتے، پھر جب وہ چلے جاتے تو آپؐ اسی طرح قرآن پڑھتے جس طرح جبرئیلؑ نے اس کو پڑھا تھا۔

تشریح:

۱- یہ حدیث مسلسل بتحریک الشفتین ہے، ہر محدث ہونٹ ہلا کر اپنے تلامذہ کو دکھایا کرتا تھا، مگر اب اس کا تسلسل باقی

نہیں رہا، ہمارے اساتذہ نے ہمیں ہونٹ ہلا کرنہیں دکھایا بلکہ شاید ہی کسی مسلسل حدیث کا تسلسل باقی ہو، ننانوے فیصد مسلسلات کا تسلسل ختم ہوگیا ہے۔

۲-حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قرآنہ اور بیانہ میں فرق کیا ہے کہ پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام قرآن پڑھتے تھے، پھر آپؐ ان کو وحی سناتے تھے، پھر حضرت جبرئیلؑ کے جانے کے بعد لوگوں کو وہ وحی سناتے تھے، یہ بیانہ کا مطلب ہے۔

لیکن میں نے اوپر بھی بیان کیا ہے اور مقدمہ میں بھی یہ بات آئی ہے کہ پہلے قرآنہ کا مطلب ہے: لوگوں کو سنانا، یعنی اللہ کے ذمہ ہے وحی آپؐ کے دل ودماغ میں محفوظ کردینا، پھر لوگوں کے سامنے اس کو پڑھوانا، اور بیانہ کا مطلب ہے: وحی کی تبیین وتشریح بھی اللہ کے ذمہ ہے، چنانچہ کسی روایت میں یہ نہیں آیا کہ آپؐ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے کسی آیت کا مطلب پوچھا ہو۔ جب تبیین وتشریح کی ذمہ داری خود رب العالمین نے لے لی تو پھر حضرت جبرئیلؑ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ علماء نے عام طور پر یہی تفسیر کی ہے، اور حضرت تھانوی قدس سرہ نے یہیں سے اپنی تفسیر کا نام 'بیان القرآن' رکھا ہے۔

باب سے مناسبت: باب تھا: وحی کی تاریخ: از ابتدا تا انتہا۔ اور اس حدیث میں وحی کی ایک خاص حالت کا بیان ہے اور اس خاص حالت میں ایک ہدایت ہے، پس باب سے مناسبت ہوگئی۔

حل عبارت: یُعالج: یہ باب مفاعلہ سے فعل مضارع معروف ہے، اس کے معنی ہیں: دوا دارو کرنا۔ علاج معالجہ کرنا، اور یہاں مراد ہے: سہنا، برداشت کرنا —— من التنزیل: میں من اجلیہ ہے —— مِمَّا کی اصل من ما ہے، ما موصولہ الذی کے معنی میں ہے اور بعض حضرات نے مما کو بمعنی ربُما لیا ہے —— پڑھتے وقت زبان اور ہونٹ دونوں ہلتے ہیں اور آیت پاک میں صرف زبان کا تذکرہ ہے اور حدیث میں صرف ہونٹوں کا، یہ علی سبیل الاکتفاء ہے، اور کتاب التفسیر میں جریر کی روایت میں زبان اور ہونٹ دونوں کا تذکرہ ہے (عینی) —— جمعه لك صدرك: کِیلری میں فی صدرك ہے وہ زیادہ موزون ہے۔

رمضان المبارک میں آنحضرت ﷺ کی سخاوت بہت بڑھ جاتی تھی

حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: نبی ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے۔ اور رمضان المبارک میں جب جبرئیل علیہ السلام آپؐ سے ملاقات کرتے تھے تو آپؐ کی سخاوت اور بڑھ جاتی تھی، اور حضرت جبرئیلؑ رمضان المبارک کی ہر رات میں آپؐ سے ملاقات کرتے تھے اور آپؐ کے ساتھ قرآنِ کریم کا دور کرتے تھے،

پس بخدا! نبی پاک ﷺ نفع پہنچانے میں چلنے والی ہوا سے بھی زیادہ سخی ہوجاتے تھے۔

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ نبی ﷺ اگر چہ جود وسخا کا پیکر تھے، لیکن رمضان المبارک میں آپؐ کی سخاوت نقطۂ عروج تک پہنچ جاتی تھی، کیونکہ رمضان المبارک کی راتوں میں حضرت جبرئیل علیہ السلام آپؐ سے روزانہ ملتے تھے اورآپؐ کے ساتھ قرآن کا دور کرتے تھے۔

پہلی وحی سترہ رمضان المبارک کو آئی ہے، مگر وہ روایت امام بخاری رحمہ اللہ کی شرط کے مطابق نہیں، اس لئے امام بخاریؒ نے یہ روایت لاکر اشارہ کیا کہ پہلی وحی رمضان المبارک میں آئی ہے، یہی باب کے ساتھ مناسبت ہے۔

اور یہ بات اشارۃ النص سے ثابت ہوتی ہے، اس طرح کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر رمضان میں ملاقات کرتے تھے، پس پہلی وحی بھی رمضان المبارک میں لائے ہونگے۔

اوراس حدیث سے یہ مضمون بھی نکلتا ہے کہ قرآنِ کریم کو رمضان المبارک کے ساتھ خاص مناسبت ہے اسی لئے حضرت جبرئیلؑ رمضان کی ہر رات میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ دور کیا کرتے تھے، اور رات میں دور کرنے کی وجہ یہ ہے کہ رات کے مزاج میں انبساط ہے، اور دن کے مزاج میں انقباض، اسی وجہ سے دن کی نمازیں گونگی (سری) ہیں اور رات کی نمازیں جہری۔

مگر ہمارے حفاظ دن میں دور کرتے ہیں کیونکہ ان کا قرآن کچا ہوتا ہے، رات میں یاد کرتے ہیں، اور دن میں دور کرتے ہیں، حالانکہ حافظ کا قرآن ایسا پکا ہونا چاہئے کہ تراویح کے بعد رات میں دور ممکن ہو۔

غرض رمضان کے ساتھ قرآن کا خاص تعلق ہے اسی وجہ سے رمضان المبارک کی شب قدر میں پہلی وحی آئی ہے، اسی خاص تعلق کی وجہ سے اللہ نے رمضان کے روزے فرض کئے ہیں اور نبی پاک ﷺ نے رات میں تراویح مسنون کی ہے۔ حدیث میں ہے :فَرَضَ اللّٰہُ صیامَ رمضان، وسَنَّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامہ: اللہ نے رمضان کے روزے فرض کئے اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی راتوں میں سونے سے پہلے نفلیں (تراویح) مسنون کی (ابن عدی ۳:۲۲۷) تا کہ ان میں قرآن پڑھا جائے۔

فائدہ: باب کی حدیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ نیک بندوں کے ساتھ ملنا اثر انداز ہوتا ہے، ارشاد پاک ہے: ﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ﴾: اے مؤمنو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھی بنو، کیونکہ صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے آنحضور ﷺ رمضان المبارک میں چلنے والی ہوا سے بھی زیادہ سخی ہوجاتے تھے۔

[۶-] حدثنا عَبْدَانُ، قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰهِ، قَالَ: أَخْبَرَنَا يُوْنُس، عَنِ الزُّهْرِيِّ ح: قَالَ: وَحَدَّثَنَا بِشْرُ بْنُ مُحَمَّدٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ، قَالَ: أَخْبَرَنَا يُوْنُسُ- وَمَعْمَرٌ نَحْوَهُ - عَنِ الزُّهْرِيِّ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ عُبَيْدُ اللّٰهِ ابْنُ عَبْدِ اللّٰهِ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: كَانَ رسولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم أَجْوَدَ النَّاسِ،

وَكَانَ أَجْوَدُ مَا يَكُوْنُ فِيْ رَمَضَانَ حِيْنَ يَلْقَاهُ جِبْرِيْلُ، وَكَانَ يَلْقَاهُ فِيْ كُلِّ لَيْلَةٍ مِنْ رَمَضَانَ، فَيُدَارِسُهُ الْقُرْآنَ، فَلَرَسُوْلُ اللّٰهِ أَجْوَدُ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيْحِ الْمُرْسَلَةِ. [انظر: ۱۹۰۲، ۳۲۲۰، ۳۵۵٤، ٤۹۹۷]

وضاحت: حدیث کا ترجمہ اوپر آ گیا۔ اس حدیث کی دوسندیں ہیں، اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے ح لکھ کر دوسری سند بیان کی ہے ـــــ ح: تحویل کا مخفف ہے، تحویل: باب تفعیل کا مصدر ہے اس کے معنی ہیں: ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل کرنا، تحویل میں ت زائد ہے، اس لئے تخفیف میں مادہ کا پہلا حرف لیا ہے۔

عربی زبان کی ایک خصوصیت ہے جو دوسری زبانوں میں نہیں پائی جاتی۔ عربی میں تخفیف کے لئے شروع کا حرف بھی لیتے ہیں، بیچ کا بھی اور آخر کا بھی، جیسے ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: الٓمّٓ میں الف اللہ کا ہے، ل جبرئیل کا اور م محمد کی، یعنی یہ اللہ کا کلام ہے جو جبرئیل کے ذریعہ محمد ﷺ پر نازل ہوا، اللہ کا اور محمد کا پہلا حرف لیا اور جبرئیل کا آخری حرف لیا۔

عربی زبان کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ بڑے جملہ کو چھوٹا جملہ بلکہ ایک کلمہ بنا لیتے ہیں، جیسے بسم اللہ الرحمن الرحیم کا مخفف بَسْمَلة ہے، لاحول ولاقوۃ إلا باللہ کا مخفف حوقلة ہے۔ حي علی الصلوۃ کا مخفف حَيْعَلَةَ ہے، أنا مع الناس کا مخفف إمَّعَة ہے۔

الغرض تحویل کا جو مادہ ہے اس کا پہلا حرف لے کر مخفف بنایا ہے، ح: کو تین طرح پڑھنے کا رواج رہا ہے: (۱) پورا لفظ تحویل پڑھا جائے (۲) تخفیف کے ساتھ بغیر مد حا پڑھا جائے (۳) مد کے ساتھ حاءْ پڑھا جائے۔ یہ تینوں طریقے رائج رہے ہیں، مگر اب صرف ایک ہی طریقہ چل رہا ہے یعنی بغیر مد کے قصر کے ساتھ حا پڑھا جائے۔

اور یہ سند بدلنے کی علامت ہے، عام طور پر سند مصنف کتاب کی طرف سے بدلتی ہے اور جس راوی پر مختلف سندیں اکٹھا ہوتی ہیں اس کو مدار الاسناد یا مدار الحدیث کہتے ہیں جیسے یہاں دونوں سندیں عبداللہ بن المبارک پر اکٹھا ہوئیں اس لئے ابن المبارک مدار الاسناد ہیں۔

جاننا چاہئے کہ عبدان کی سند میں امام زہریؒ کے صرف ایک شاگرد یونس کا تذکرہ ہے، اور بشر بن محمد کی سند میں زہری کے دوسرے شاگرد معمر کا بھی تذکرہ ہے اور معمر کی روایت یونس کی روایت کی طرح ہے، یعنی دونوں کی روایت باللفظ متحد نہیں ہے، صرف معنیً متحد ہے، اور حدیث میں الفاظ یونس کی روایت کے ہیں۔

امام زہری رحمہ اللہ کے استاذ عبید اللہ بن عبد اللہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بھائی عتبہ کے پوتے ہیں اور یہ مدینہ کے فقہاء سبعہ میں سے ہیں، فقہائے سبعہ وہ سات کبار تابعین ہیں جن کے فتاوی پہلی صدی کے نصف آخر میں مدینہ منورہ میں چلتے تھے جبکہ صحابہ بقید حیات تھے[1]

(۱) وہ سات حضرات فقہاء یہ ہیں:

(۱) حضرت سعید بن المسیب مخزومی قرشی رحمہ اللہ (۱۳-۹۴ھ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قضایا کے حافظ تھے اور ←

قولہ: فَیُدَارِسُه القرآن: دَارَسَ مُدَارَسَةً (باب مفاعلہ) کے معنی ہیں: دوشخصوں کا باہم ایک دوسرے کو سبق سنانا، پڑھنا پڑھانا۔ اس کے لئے دوسرا لفظ مذاکرۃ ہے اور اردو میں اس کا نام تکرار ہے، آج کل تکرار کا جو طریقہ چل پڑا ہے کہ ایک طالب علم سبق دوہراتا ہے اور باقی سب اخفش کی بکریاں بن کر سنتے ہیں یہ تکرار نہیں، تکرار کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مجلس میں شریک ہر طالب علم سبق دوہرائے، جیسے رمضان میں جب حافظ دور کرتے ہیں تو ہر حافظ پڑھتا ہے، ہاں اس میں کوئی حرج نہیں کہ اگر وقت کم ہو تو ایک طالب علم ایک کتاب کی تکرار کرائے اور دوسرا دوسری کتاب کی۔ کیونکہ تکرار کا مقصود سبق یاد کرنا اور پڑھانے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ پس جب ہر طالب علم تکرار کرائے گا تبھی اس میں صلاحیت پیدا ہوگی۔

قولہ: الریح المرسلة: المرسلة: اسم مفعول ہے: چھوڑی ہوئی یعنی چلنے والی۔ ایک ہوا ٹھہری ہوئی ہوتی ہے، جیسے اس درسگاہ میں ہوا بھری ہوئی ہے، مگر اس کا کوئی نفع نہیں، جب پنکھا چلتا ہے اور ہوا کو ہلاتا ہے تو ہوا ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ دوسری ہوا چلتی ہوئی ہوتی ہے، دروازہ کھولو فوراً لگے گی، یہ الریح المرسلة ہے اس کا مقابل ٹھہری ہوئی ہوا ہے۔

← روایہ عمر کہلاتے تھے، یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایتوں کے حافظ تھے۔

(۲) حضرت عروۃ بن الزبیر بن العوام اَسدی قرشی رحمہ اللہ (۲۲-۹۳ھ) اپنی خالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے علم حاصل کیا، عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما کے حقیقی بھائی تھے، تمام سیاسی خرخشوں سے دور رہے۔

(۳) حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق رحمہ اللہ (۳۷-۱۰۷ھ) صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے، اپنی پھوپی حضرت عائشہؓ سے علم حاصل کیا تھا۔

(۴) حضرت خارجۃ بن زید بن ثابت رحمہ اللہ (۲۹-۹۹ھ) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے والا تبار صاحبزادے ہیں۔

(۵) حضرت عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبۃ بن مسعود ھُذَلی رحمہ اللہ (وفات ۹۸ھ) مدینہ منورہ کے مفتی، حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے اتالیق اور کبار تابعین میں ہیں۔

(۶) حضرت سلیمان بن یسار مولیٰ ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ عنہ (۳۴-۱۰۷ھ) آپ کے والد فارسی تھے، مولیٰ: آزاد کردہ۔

(۷) اور ساتویں فقیہ کے بارے میں تین قول ہیں:

(الف) ابوسلمۃ بن عبدالرحمٰن بن عوف زہری مدنی (وفات ۹۴ھ یا ۱۰۴ھ) یہ قول حاکم ابوعبداللہ نے علمائے حجاز سے نقل کیا ہے۔

(ب) حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر عدوی قرشی رحمہ اللہ (وفات ۱۰۶ھ) یہ قول عبداللہ بن المبارک کا ہے۔

(ج) ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشام مخزومی (متوفی ۹۴ھ) یہ قول ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان (متوفی ۱۳۰ھ) کا ہے۔

شہنشاہِ روم کے نام دعوتی والا نامہ

حدیبیہ میں آنحضور ﷺ اور کفار کے درمیان جن شرائط پر صلح ہوئی تھی ان میں ایک دفعہ یہ تھی کہ دس سال تک آپس میں لڑائی موقوف رہے گی، چنانچہ اہل مکہ نے مطمئن ہوکر کاروبار کی طرف توجہ دی اور آنحضور ﷺ نے اشاعت اسلام کی طرف توجہ مبذول فرمائی۔ جزیرۃ العرب میں تو دعوت کا کام چل ہی رہا تھا، اس کے اطراف میں جو چھوٹی بڑی حکومتیں تھیں آنحضرت ﷺ نے ان سب کو دعوت اسلام کے خطوط روانہ فرمائے، ان میں سے ایک خط حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ اس وقت کے سب سے بڑے سپر پاور روم کے بادشاہ قیصر کے نام روانہ فرمایا۔

قیصر: لقب ہے، روم کا ہر بادشاہ قیصر کہلاتا تھا، جیسے ایران کا ہر بادشاہ کسری، مصر کا ہر بادشاہ فرعون، اور حبشہ کا ہر بادشاہ نجاشی کہلاتا تھا۔

قیصر اس وقت فارس پر فتح یابی کے شکریہ میں قسطنطنیہ سے پیدل چل کر بیت المقدس آیا ہوا تھا، حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے امیر بُصری کے توسط سے وہ والا نامہ قیصر کے دربار میں پہنچایا، قیصر نے حکم دیا کہ عرب کے لوگ ملک میں آئے ہوئے ہوں تو ان کو حاضر کیا جائے، اتفاق سے ابوسفیان قریش کے قافلہ کے ساتھ تجارت کے لئے ملک شام گئے ہوئے تھے اور مقام غزّہ میں مقیم تھے۔ ابوسفیان اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، قیصر کے آدمیوں نے پورے قافلہ کو دربار میں حاضر کیا، قیصر نے ان لوگوں سے پوچھا کہ اس مدعی نبوت کا قریبی رشتہ دار کون ہے؟ ابوسفیان نے کہا: میں ہوں! قیصر نے ان کو آگے بٹھایا اور باقی قافلہ والوں کو ان کے پیچھے، اور ان سے کہا: میں کچھ باتیں دریافت کروں گا اگر یہ جھوٹ بولے تو تم اس کی تکذیب کر دینا۔ ابوسفیان کہتے ہیں: اگر مجھے اندیشہ نہ ہوتا کہ پیچھے والے تکذیب کریں گے تو میں جھوٹ بولتا۔

پھر قیصر نے ترجمان کے واسطہ سے ابوسفیان سے گیارہ سوال کئے، انھوں نے سب کے صحیح جواب دیئے، بس ایک جگہ ذرا گڑبڑ کردی، ان کو موقع مل گیا تھا۔

ابوسفیان اسلام کے کٹر مخالف تھے، مسلمانوں کے خلاف جتنی جنگیں لڑی گئیں بدر کے علاوہ ان سب میں کمانڈر انچیف ابوسفیان تھے، مگر جب آنحضور ﷺ نے ان کی بیٹی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کرلیا تو ان کی مکھی تیل میں گری، پھر انھوں نے مدینہ منورہ پر چڑھائی کرنے کی ہمت نہ کی، میں نے علمی خطبات (ص:۱۷۸) میں یہ بات تفصیل سے بیان کی ہے کہ آنحضور ﷺ نے حضرت خدیجہ اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہما کے علاوہ جتنے نکاح کئے ہیں وہ سب ملّی، ملکی اور شخصی مصالح سے کئے ہیں۔ حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح ملکی مصلحت سے کیا تھا۔

غرض ابوسفیان کو یہ ڈر تو نہیں تھا کہ ان کے ساتھی بادشاہ کے سامنے ان کی تکذیب کریں گے اس لئے کہ وہ سب اسلام

مخالف تھے، البتہ یہ ڈر تھا کہ مکہ پہنچ کر یہ لوگ پروپیگنڈہ کریں گے کہ ابوسفیان نے قیصر کے دربار میں جھوٹ بولا، اور عربوں کے یہاں سچ کی بڑی قدر و قیمت تھی، کسی سردار کی طرف جھوٹ کی نسبت اس کے لئے ڈوب مرنے کی بات تھی اس لئے ابوسفیان نے قیصر کے سوالوں کے بالکل صحیح جواب دیئے، بس ایک جگہ موقع مل گیا تو چوکے نہیں!

ہرقل کے سوال، اور ابوسفیان کے جواب

۱- ہرقل: تم میں اس مدعی نبوت کا نسب (خاندان) کیسا ہے؟
ابوسفیان: وہ ہم میں عالی نسب ہیں۔

۲- ہرقل: کیا تم میں کسی نے ان سے پہلے ایسا دعوی کیا ہے؟
ابوسفیان: نہیں۔

۳- ہرقل: اس مدعی نبوت کے آباؤاجداد میں کوئی بادشاہ ہوا ہے؟
ابوسفیان نہیں۔

۴- ہرقل: کیا شریف لوگ (رؤسا) ان کی پیروی کرتے ہیں یا کمزور لوگ؟
ابوسفیان: کمزور لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں۔

۵- ہرقل: ان کے پیروکاروں کی تعداد بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟
ابوسفیان: بڑھ رہی ہے۔

۶- ہرقل: کیا ان کے دین میں داخل ہو کر کوئی بر بنائے ناراضگی پلٹتا ہے؟
ابوسفیان: نہیں۔

۷- ہرقل: کیا تم نے ان کے بارے میں دعوئے نبوت سے پہلے کبھی جھوٹ کا تجربہ کیا ہے؟
ابوسفیان: نہیں۔

۸- ہرقل: کیا وہ عہد و پیمان کر کے اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں؟
ابوسفیان: نہیں۔ مگر آج کل ہمارے اور ان کے درمیان ناجنگ معاہدہ چل رہا ہے، معلوم نہیں وہ اس میں کیا کرتے ہیں (یہ ابوسفیان کو گڑبڑ کا موقعہ مل گیا)

۹- ہرقل: کیا کبھی تمہاری ان کے ساتھ جنگ ہوئی ہے؟
ابوسفیان: ہوئی ہے۔

۱۰- ہرقل: پھر جنگ کا نتیجہ کیا رہا؟

ابوسفیان: جنگ ہمارے اوران کے درمیان کنویں کا ڈول رہی، کبھی انھوں نے پانی بھرلیا، کبھی ہم نے۔

۱۱- ہرقل: وہ تمہیں کن باتوں کا حکم دیتے ہیں یعنی ان کی تعلیمات کیا ہیں؟

ابوسفیان: وہ کہتے ہیں: ایک اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور شرک کی باتیں جو تمہارے آباؤ اجداد کرتے تھے ان کو چھوڑ دو۔ وہ ہمیں نماز کا، خیرات کا، سچ بولنے کا، پاک دامنی کا، عہد وفا کرنے کا، امانتیں ادا کرنے کا اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں۔

ابوسفیان کے جوابات پر ہرقل کا تبصرہ

۱- ہرقل: میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس مدعی نبوت کا نسب تم میں کیسا ہے؟ تم نے بتایا کہ وہ عالی نسب ہیں، پس سنو! انبیاء ہمیشہ عالی نسب (خاندان) میں مبعوث کئے جاتے ہیں (پس یہ ان کے سچے نبی ہونے کی علامت ہے)

۲- ہرقل: میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا تم میں سے کسی نے ان سے پہلے یہ بات کہی ہے یعنی نبوت کا دعوی کیا ہے؟ تم نے نفی میں جواب دیا۔ پس سنو! اگر تم میں سے کسی نے ایسا دعوی کیا ہوتا تو میرے لئے یہ سوچنے کا موقعہ تھا کہ اس نے اُس کی سُر میں سُر ملائی!

۳- ہرقل: میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس مدعی نبوت کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ ہوا ہے؟ تم نے اس کا جواب بھی نفی میں دیا، پس سنو! اگر اس کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ گذرا ہوتا تو میرے لئے بدگمانی کا موقعہ تھا کہ یہ شخص اپنے آباؤ اجداد کا کھویا ہوا ملک حاصل کرنا چاہتا ہے، اور اس کے لئے نبوت کا سوانگ بھرا ہے!

۴- ہرقل: میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تم نے کبھی دعوئے نبوت سے پہلے ان کے بارے میں جھوٹ کا تجربہ کیا ہے؟ تم نے انکار کیا۔ پس سنو! یہ بات کیسے ممکن ہے کہ جو لوگوں کے معاملات میں جھوٹ نہ بولے، وہ سیدھا اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنے لگے!

۵- ہرقل: میں نے تم سے پوچھا تھا کہ شرفاء ان کی پیروی کرتے ہیں یا معمولی لوگ؟ تم نے کہا: معمولی لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں۔ پس سنو! انبیاء کی پیروی کرنے والے شروع میں معمولی لوگ ہی ہوتے ہیں۔

۶- ہرقل: میں نے تم سے پوچھا تھا کہ ان کے پیروکاروں کی تعداد دن بہ دن بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟ تم نے کہا: بڑھ رہی ہے۔ پس سنو! ایمان کا یہی معاملہ ہے، اس کی پیروی کرنے والے دن بہ دن بڑھتے ہیں، تا آنکہ وہ حد کمال کو پہنچ جائے۔

۷- ہرقل: میں نے تم سے پوچھا تھا کہ ان کے دین میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص اس دین سے ناراض ہوکر پلٹتا ہے یا نہیں؟ تم نے بتایا: کوئی نہیں پلٹتا۔ تو سنو! ایمان کا یہی معاملہ ہے، جب اس کی بشاشت دلوں میں سماجاتی ہے تو نکلتی نہیں!

۸- ہرقل: میں نے تم سے پوچھا تھا کہ وہ عہد شکنی کرتے ہیں یا نہیں؟ تم نے کہا: نہیں! پس سنو! انبیاء عہد شکنی نہیں کیا کرتے (اور ابوسفیان نے جو گڑبڑ کی تھی، اس کو ہرقل گول کرگیا، کیونکہ وہ بات سمجھ گیا تھا)

۹-و۱۰ ہرقل: میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تمہاری کبھی ان سے جنگ ہوئی ہے؟ اور ہوئی ہے تو نتیجہ کیا رہا؟ تم نے جواب دیا کہ ان کے ساتھ تمہاری جنگیں ہوئی ہیں، اور نتیجہ کنویں کا ڈول رہا، کبھی تم جیتے کبھی وہ جیتے۔ پس سنو! انبیاء کے ساتھ ابتداء میں اللہ کا ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کا بھی امتحان کرتے ہیں، مگر اچھا انجام انہی کے لئے ہوتا ہے (یہ تبصرہ یہاں روایت میں نہیں ہے، آگے حدیث (۲۸۰۴) میں آرہا ہے)

۱۱- ہرقل: میں نے تم سے پوچھا تھا کہ ان کی تعلیمات کیا ہیں؟ تم نے بتایا کہ وہ اللہ کی عبادت کا حکم دیتے ہیں، شرک سے روکتے ہیں، بتوں کو کنڈم کرتے ہیں، اور نماز کا، زکات کا، وفائے عہد کا، ادائے امانت کا، صدق وسچائی کا، پاک دامنی کا اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں۔ پس سنو! اگر یہ باتیں سچی ہیں تو وہ عنقریب میرے ان دو پیروں کی جگہ (بیت المقدس) کے مالک ہوجائیں گے۔ اور میں بالیقین جانتا تھا کہ وہ ظاہر ہونے والے ہیں، مگر میرا خیال یہ نہیں تھا کہ وہ تم میں ظاہر ہونگے۔ اور اگر مجھے یقین ہوتا کہ میں ان تک پہنچ سکوں گا تو میں ان کی ملاقات کے لئے ہر مشقت برداشت کرتا، اور اگر میں ان کے پاس ہوتا تو میں ان کے پیر دھوتا!

فائدہ: آنحضور ﷺ کے زمانہ میں دو سپر پاور (بڑی حکومتیں) تھے: روم اور ایران۔ رومی اہل کتاب (نصرانی) تھے اور ایرانی آتش پرست، دونوں طاقتوں کے درمیان عرصۂ دراز سے جنگ جاری تھی، اور مشرکین آتش پرستوں کو اپنے قریب سمجھتے تھے اور رومی اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے قریب سمجھے جاتے تھے، ایک جنگ میں ایرانی لشکر نے رومیوں کو شکست دی اور قیصر کو قسطنطنیہ میں پناہ لینے پر مجبور کردیا، بلکہ رومیوں کا دارالسلطنت بھی خطرے میں پڑ گیا، اس کی خبر جب مکہ پہنچی تو مشرکین نے خوب خوشیاں منائیں، وہ اس واقعہ سے مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے غلبہ کا فال لینے لگے، اور مسلمانوں کو سخت صدمہ پہنچا، اسی موقع پر سورۂ روم کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں کہ روم جزیرۃ العرب سے لگواں ملک میں ہارا لیکن وہ عنقریب چند سالوں میں جیتیں گے۔ چنانچہ سات سال کے بعد ایران کو شکست ہوئی اور رومیوں کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔

اِدھر قیصر روم نے یہ منت مان رکھی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے ایران پر فتح عطا فرمائیں گے تو وہ بیت المقدس پیدل جائے گا، جیسے پیدل حج کرنے کی منت درست ہے، اسی طرح وہ لوگ بیت المقدس پیدل جاتے تھے۔ چنانچہ وہ منت پوری کرنے کے لئے قسطنطنیہ سے پیدل ایلیاء (بیت المقدس) کے لئے چلا وہ جب بیت المقدس پہنچا اسی زمانہ میں آنحضور ﷺ کا والا نامہ حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے حاکم بُصری کی معرفت پہنچایا، وہ پہلے سے یہ بات جانتا تھا کہ مکہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، اس لئے بادشاہ نے مناسب سمجھا کہ خط پڑھنے سے پہلے اس مدعی نبوت کے بارے میں تحقیق کرے، چنانچہ اس نے ابوسفیان کو ان کے ساتھیوں کے ساتھ دربار میں بلایا اور آنحضور ﷺ کے بارے میں گیارہ سوال کئے، تفصیل گذر چکی۔

ملحوظہ: یہ حدیث طویل ہے، قارئین کی سہولت کے لئے تین حصوں میں لکھی جاتی ہے۔

[۷-] حدثنا أَبُو الْيَمَانِ الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ، قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، قَالَ: أَخْبَرَنِي عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ، أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ، أَنَّ أَبَا سُفْيَانَ بْنَ حَرْبٍ أَخْبَرَهُ، أَنَّ هِرَقْلَ أَرْسَلَ إِلَيْهِ فِيْ رَكْبٍ مِنْ قُرَيْشٍ، وَكَانُوْا تُجَّارًا بِالشَّأْمِ فِيْ الْمُدَّةِ الَّتِيْ كَانَ رَسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم مَادَّ فِيْهَا أَبَا سُفْيَانَ وَكُفَّارَ قُرَيْشٍ، فَأَتَوْهُ وَهُمْ بِإِيْلِيَاءَ، فَدَعَاهُمْ فِيْ مَجْلِسِهِ وَحَوْلَهُ عُظَمَاءُ الرُّوْمِ، ثُمَّ دَعَاهُمْ وَدَعَا تَرْجُمَانَه فَقَالَ: أَيُّكُمْ أَقْرَبُ نَسَبًا بِهٰذَا الرَّجُلِ الَّذِيْ يَزْعُمُ أَنَّهُ نَبِيٌّ؟ قَالَ أَبُوْ سُفْيَانَ: فَقُلْتُ: أَنَا أَقْرَبُهُمْ نَسَبًا، فَقَالَ: أَدْنُوْهُ مِنِّيْ، وَقَرِّبُوْا أَصْحَابَهُ فَاجْعَلُوْهُمْ عِنْدَ ظَهْرِهِ، ثُمَّ قَالَ لِتَرْجُمَانِهِ: قُلْ لَهُمْ: إِنِّيْ سَائِلٌ هٰذَا عَنْ هٰذَا الرَّجُلِ، فَإِنْ كَذَبَنِيْ فَكَذِّبُوْهُ، فَوَ اللّٰهِ لَوْلَا الْحَيَاءُ مِنْ أَنْ يَأْثِرُوْا عَلَيَّ كَذِبًا لَكَذَبْتُ عَنْهُ.

ثُمَّ كَانَ أَوَّلَ مَا سَأَلَنِيْ عَنْهُ أَنْ قَالَ: كَيْفَ نَسَبُهُ فِيْكُمْ؟ قُلْتُ: هُوَ فِيْنَا ذُوْ نَسَبٍ، قَالَ: فَهَلْ قَالَ هٰذَا الْقَوْلَ مِنْكُمْ أَحَدٌ قَطُّ قَبْلَهُ؟ قُلْتُ: لَا، قَالَ: فَهَلْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ؟ قُلْتُ: لَا، قَالَ: فَأَشْرَافُ النَّاسِ اتَّبَعُوْهُ أَمْ ضُعَفَاؤُهُمْ؟ قُلْتُ: بَلْ ضُعَفَاؤُ هُمْ قَالَ: أَيَزِيْدُوْنَ أَمْ يَنْقُصُوْنَ؟ قُلْتُ: بَلْ يَزِيْدُوْنَ، قَالَ: فَهَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ مِنْهُمْ سَخْطَةً لِدِيْنِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيْهِ؟ قُلْتُ: لَا، قَالَ: فَهَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُوْنَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُوْلَ مَا قَالَ؟ قُلْتُ: لَا، قَالَ: فَهَلْ يَغْدِرُ؟ قُلْتُ: لَا، وَنَحْنُ مِنْهُ فِيْ مُدَّةٍ لَانَدْرِيْ مَا هُوَ فَاعِلٌ فِيْهَا — قَالَ: وَلَمْ تُمَكِّنِّيْ كَلِمَةٌ أُدْخِلُ فِيْهَا شَيْئًا غَيْرُ هٰذِهِ الْكَلِمَةِ — قَالَ: فَهَلْ قَاتَلْتُمُوْهُ، قُلْتُ: نَعَمْ؟ قَالَ: فَكَيْفَ كَانَ قِتَالُكُمْ إِيَّاهُ؟ قُلْتُ: الْحَرْبُ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُ سِجَالٌ، يَنَالُ مِنَّا وَنَنَالُ مِنْهُ، قَالَ: مَاذَا يَأْمُرُكُمْ؟ قُلْتُ: يَقُوْلُ: اعْبُدُوْا اللّٰهَ وَحْدَهُ، وَلَا تُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا، وَاتْرُكُوْا مَا يَقُوْلُ آبَاؤُكُمْ، وَيَأْمُرُنَا بِالصَّلَاةِ، وَالصِّدْقِ، وَالْعَفَافِ، وَالصِّلَةِ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ابوسفیانؓ نے ان سے یہ واقعہ بیان کیا کہ ہرقل نے

قریش کی ایک جماعت کے ساتھ ان کے پاس بلاوا بھیجا، اور وہ بغرض تجارت شام گئے ہوئے تھے، اس زمانہ میں جس میں آنحضور ﷺ نے کفارِ قریش کے ساتھ مصالحت کی تھی، پس وہ سب ہرقل کے پاس پہنچے درانحالیکہ ہرقل ایلیاء میں تھا۔ پس بادشاہ نے ان کو اپنے دربار میں بلایا، درانحالیکہ اس کے اردگرد روم کے چودھری بیٹھے تھے، پھر ہرقل نے ان کو بلایا اور ترجمان کو بلایا (بادشاہ عربی سے ناواقف تھا اور ابوسفیان وغیرہ رومی زبان سے ناواقف تھے، اس وجہ سے ترجمان کا واسطہ رکھا) چنانچہ ہرقل نے پوچھا: وہ شخص جو یہ دعوی کرتا ہے کہ وہ نبی ہے اس کا سب سے قریبی رشتہ دار کون ہے؟ ابو سفیان کہتے ہیں: میں نے کہا: میں سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار ہوں۔ پس ہرقل نے (درباریوں سے) کہا: اس کو مجھ سے قریب کرو، اور اس کے ساتھیوں کو اس کے قریب اس کی پیٹھ کے پیچھے بٹھاؤ، پھر ہرقل نے ترجمان سے کہا: ان سے کہو کہ میں اس (ابوسفیان) سے اس شخص (مدعی نبوت) کے بارے میں پوچھوں گا پس اگر وہ مجھ سے جھوٹ کہے تو تم اس کا جھوٹ ظاہر کر دینا، ابوسفیان کہتے ہیں: قسم بخدا! اگر یہ شرم مانع نہ ہوتی کہ وہ میری طرف سے جھوٹ کو نقل کریں گے تو میں یقیناً حضورؐ کے بارے میں کذب بیانی کرتا۔

پھر پہلی بات جو ہرقل نے حضور ﷺ کے بارے میں مجھ سے پوچھی یہ تھی کہ تم میں اس کا نسب (خاندان) کیسا ہے؟ میں نے کہا: وہ ہم میں عالی نسب ہیں۔ ہرقل نے پوچھا: کیا تم میں کسی نے اس سے پہلے یہ بات کہی ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ ہرقل نے پوچھا: کیا اس کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ ہرقل نے پوچھا: کیا شرفاء (اونچی ناک والے) ان کی پیروی کرتے ہیں یا کمزور لوگ؟ میں نے کہا: غرباء پیروی کرتے ہیں۔ ہرقل نے پوچھا: ان کے پیروکاروں کی تعداد بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟ میں نے کہا: روز بروز بڑھ رہی ہے، ہرقل نے پوچھا: کیا ان میں سے کوئی دین میں داخل ہو کر بربنائے ناراضگی دین سے پلٹتا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ ہرقل نے پوچھا: کیا تم نے ان کو دعوئے نبوت سے پہلے کبھی جھوٹ کے ساتھ متّہم کیا ہے؟ یعنی کبھی ان کو جھوٹ بولتے دیکھا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ ہرقل نے پوچھا: کیا وہ عہد و پیمان کی خلاف ورزی کرتے ہیں؟ میں نے کہا: نہیں، لیکن آج کل ہمارے اور ان کے درمیان ایک صلح ٹھہری ہوئی ہے، ہم نہیں جانتے کہ وہ اس میں کیا کریں گے؟ ابوسفیان کہتے ہیں: موقع نہیں دیا مجھے کسی بات نے کہ گھساؤں میں اس میں سوائے اس بات کے یعنی یہی ایک بات خلاف واقعہ کہنے کا مجھے موقعہ مل گیا، مگر ہرقل سمجھدار تھا، وہ سمجھ گیا کہ اس کے پیچھے کیا مقصد کارفرما ہے، چنانچہ اس نے اس بات سے صرف نظر کر لی اور جب جوابوں پر تبصرہ کیا تو اس بات کا ذکر ہی نہیں کیا۔ ہرقل نے پوچھا: کیا تمہاری ان کے ساتھ جنگ ہوئی ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ ہرقل نے پوچھا: لڑائی کیسی رہی؟ یعنی کون ہارا کون جیتا؟ میں نے کہا: جنگ ہمارے اور ان کے درمیان کنویں کا ڈول رہی، حاصل کرتے تھے وہ ہم سے اور حاصل کرتے تھے ہم ان سے، یعنی کامیابی کبھی ان کے قدم چومتی تھی اور کبھی ہمارے۔ ہرقل نے پوچھا: وہ تمہیں کن باتوں کا حکم دیتے ہیں؟ میں نے کہا: وہ یہ کہتے ہیں کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، اور

اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور کفروشرک کے تمام مراسم جو تمہارے آباؤاجداد کرتے تھے ان کو یک لخت چھوڑ دو، اور وہ ہمیں نماز کا، سچائی کا، پاک دامنی کا اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں۔

وضاحتیں اور حل عبارت

قولہ: فی رکب: یہ راکب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: قافلہ: یہ قافلہ تیس آدمیوں پر مشتمل تھا —— قولہ: مَادَّفیھا: مَادَّ: باب مفاعلہ سے ماضی معروف ہے، اصل مَادَدَ تھا۔ اجتماع مثلین کی وجہ سے ادغام کیا گیا —— فأتوہ وھم بإیلیاء: بعض نسخوں میں وھو بإیلیاء: مفرد کی ضمیر ہے جو ہرقل کی طرف راجع ہے اور وہی نسخہ صحیح معلوم ہوتا ہے —— فدعاھم فی مجلسہ: دربار میں بلایا، اور ثم دعاھم سے مراد گفتگو کے لئے اپنے پاس بلایا۔ ابوسفیانؓ کا نسب چوتھی پشت میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ مل جاتا ہے: أبوسفیان صخر بن حرب بن أمیۃ بن عبد شمس بن عبد مناف۔

قولہ: ثم کان أَوَّلَ إلخ: أَوَّلَ ماسألنی: خبر مقدم ہے اور أَنْ قال اسم مؤخر۔ پس أولَ منصوب ہے۔

قولہ: سخطۃ: س: پر زبر اور پیش دونوں صحیح ہیں۔

فائدہ: ابوسفیان کا داماد عبیداللہ بن جحش مسلمان ہوا تھا اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حبشہ ہجرت کی تھی، مگر وہاں ایک عورت کے عشق میں گرفتار ہو کر مرتد (نصرانی) ہو گیا، پس اُس ارتداد کی وجہ دین سے ناراضگی نہیں تھی بلکہ عشق تھا، اسی وجہ سے ابوسفیان نے کہا: بربناء ناراضگی دین سے کوئی نہیں پھرا۔

قولہ: الکذِب: بکسر الذال اسم ہے: جھوٹ اور ذال کے جزم اور ک کے زیر کے ساتھ کِذْب: مصدر ہے: جھوٹ بولنا —— قولہ: فی مُدَّۃٍ: أی فی مصالحۃ —— قولہ: سِجَال: کنویں کا ڈول، پرانے زمانے میں گاؤں سے باہر ایک کنواں ہوتا تھا جس میں سے سارا گاؤں پانی بھرتا تھا اس کنویں پر چند ڈول رکھے رہتے تھے لوگ ان سے باری باری پانی بھرتے تھے، ابوسفیان نے جواب دیا کہ جنگوں کا نتیجہ کنویں کے ڈولوں کی طرح رہا، کبھی وہ پہلے پانی بھر لیتے تھے، کبھی ہم یعنی کامیابی کبھی ان کے قدم چومتی تھی کبھی ہماری۔ غرض: سِجْل کے معنی ہیں: پانی سے بھرا ہوا ڈول، اور خالی ڈول کو دَلْوٌ کہتے ہیں۔

قولہ: الصِدْق: بعض نسخوں میں اس کی جگہ صَدَقَۃ ہے، چونکہ نصوص میں اکثر نماز کے ساتھ صدقہ کا ذکر آیا ہے اس لئے غالب گمان یہ ہے کہ صدقۃ والا نسخہ صحیح ہے —— اور عفاف کے معنی ہیں: پاک دامنی یعنی شہوانی گناہ: زنا اغلام وغیرہ سے بچنا۔ الصِّلۃ: خاندان کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔

فائدہ: جاننا چاہئے کہ کتاب الشھادات، باب مَن أَمَرَ بإنجاز الوعد (حدیث ۲۶۸۱) میں اس حدیث میں دو لفظ آئے ہیں: الوفاء بالعھد: عہد و پیمان کو پورا کرنا، وأداء الأمانۃ: امانت سپرد کرنا۔ یہ اسلام کی بنیادی تعلیمات ہیں جن سے ابوسفیان جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے وہ بھی واقف تھے۔

باب سے حدیث کی مناسبت

حدیث کا یہی حصہ باب سے متعلق ہے، تفصیل جاننے سے پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ استدلال کی دوصورتیں ہیں: استدلال لِمّی اور استدلال اِنّی ۔علت سے معلول پر استدلال کا نام استدلال لِمّی ہے، اور معلول سے علت پر استدلال کا نام استدلال اِنّی ہے۔

جیسے: آپ نے کوئی دینی بات کہی، مخاطب نہیں مانتا، آپ نے کہا: حدیث میں یہ بات آئی ہے، اس نے بات مان لی کیونکہ نبی کی بات جھوٹی نہیں ہوسکتی، پس ہم نے اپنی بات کے صحیح ہونے پر حدیث سے استدلال کیا یہ علت سے معلول پر استدلال ہے۔اور ابوسفیان نے جو اسلامی تعلیمات بتلائیں ہرقل نے ان سے نبی پاک ﷺ کے سچے نبی ہونے پر استدلال کیا، یہ معلول سے علت پر استدلال ہے۔

دوسری مثال: دور دھواں نظر آیا، ہم نے دھویں سے آگ پر استدلال کیا اور کہا کہ وہاں آگ لگ رہی ہے، یہ معلول سے علت پر استدلال ہے اور یہ استدلال اِنّی ہے، اور اگر ہمارے سامنے انگیٹھی رکھی ہو، اس میں کوئلے جل رہے ہوں اور وہاں نام کو بھی دھواں نہ ہو، مگر ایک شخص کہتا ہے: انگیٹھی پر دھواں ہے، یہ علت سے معلول پر استدلال ہے اور یہ استدلال لِمّی ہے۔

غرض: یہاں تعلیماتِ اسلام سے آنحضور ﷺ کے دعوئے نبوت میں سچا ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، اور یہ تعلیمات اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں سے تعلیمات بذریعہ وحی ہی آتی ہیں پس وحی کا باب سے کا تعلق ہوگیا۔

بالفاظ دیگر: کبھی عنوان سے معنون پر استدلال کیا جاتا ہے اور کبھی معنون سے عنوان پر، جو شخص قرآن کو اللہ کا کلام (وحی) مانتا ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کو سچا نبی تسلیم کرتا ہے وہ قرآن وحدیث سے اسلامی تعلیمات کے برحق ہونے پر استدلال کرے گا، یہ عنوان سے معنون پر استدلال ہے، اور غیر مسلم جو نہ قرآن کو مانتا ہے، نہ نبی پاک ﷺ کی تصدیق کرتا ہے جب وہ تعلیمات اسلام کا مطالعہ کرے گا تو اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ جس نبی کی یہ تعلیمات ہیں وہ سچے نبی ہیں اور انھوں نے جو کتاب پیش کی ہے وہ اللہ کی کتاب ہے، یہ معنون سے عنوان پر استدلال ہوا، اور حدیث میں ہرقل نے معنون سے عنوان پر استدلال کیا ہے یعنی یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ تعلیمات بذریعہ وحی آنحضور ﷺ کے پاس آئی ہیں اور وحی کا باب چل رہا ہے، پس حدیث کا باب سے تعلق قائم ہوگیا۔

فَقَالَ لِلتَّرْجُمَانِ: قُلْ لَهُ: سَأَلْتُكَ عَنْ نَسَبِهِ؟ فَذَكَرْتَ أَنَّهُ فِيكُمْ ذُوْ نَسَبٍ، وَكَذٰلِكَ الرُّسُلُ تُبْعَثُ فِيْ نَسَبِ قَوْمِهَا، وَسَأَلْتُكَ: هَلْ قَالَ أَحَدٌ مِنْكُمْ هٰذَا الْقَوْلَ؟ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا، فَقُلْتُ: لَوْ كَانَ أَحَدٌ قَالَ هٰذَا

الْقَوْلَ قَبْلَهُ لَقُلْتُ: رَجُلٌ يَأْتَسِي بِقَوْلٍ قِيلَ قَبْلَهُ، وَسَأَلْتُكَ: هَلْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ؟ فَذَكَرْتَ أَنْ لاَ، فَقُلْتُ: فَلَوْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ، قُلْتُ: رَجُلٌ يَطْلُبُ مُلْكَ أَبِيهِ، وَسَأَلْتُكَ: هَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُوْنَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُوْلَ مَاقَالَ؟ فَذَكَرْتَ أَنْ لاَ، فَقَدْ أَعْرِفُ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ لِيَذَرَ الْكَذِبَ عَلَى النَّاسِ، وَيَكْذِبَ عَلَى اللّٰهِ، وَسَأَلْتُكَ: أَشْرَافُ النَّاسِ اتَّبَعُوْهُ أَمْ ضُعَفَاؤُهُمْ؟ فَذَكَرْتَ أَنَّ ضُعَفَاءَهُمُ اتَّبَعُوْهُ، وَهُمْ أَتْبَاعُ الرُّسُلِ، وَسَأَلْتُكَ: أَيَزِيْدُوْنَ أَمْ يَنْقُصُوْنَ؟ فَذَكَرْتَ أَنَّهُمْ يَزِيْدُوْنَ، وَكَذٰلِكَ أَمْرُ الإِيْمَانِ حَتّٰى يَتِمَّ، وَسَأَلْتُكَ: أَيَرْتَدُّ أَحَدٌ سَخْطَةً لِدِيْنِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيْهِ؟ فَذَكَرْتَ أَنْ لاَ، وَكَذٰلِكَ الإِيْمَانُ حِيْنَ تُخَالِطُ بَشَاشَتُهُ الْقُلُوْبَ، وَسَأَلْتُكَ: هَلْ يَغْدِرُ؟ فَذَكَرْتَ أَنْ لاَ، وَكَذٰلِكَ الرُّسُلُ لاَ تَغْدِرُ، وَسَأَلْتُكَ: بِمَا يَأْمُرُكُمْ؟ فَذَكَرْتَ أَنَّهُ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَعْبُدُوْا اللّٰهَ، وَلاَ تُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا، وَيَنْهَاكُمْ عَنْ عِبَادَةِ الأَوْثَانِ، وَيَأْمُرُكُمْ بِالصَّلاَةِ، والصِّدْقِ، وَالْعَفَافِ، فَإِنْ كَانَ مَا تَقُوْلُ حَقًّا فَسَيَمْلِكُ مَوْضِعَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ، وَقَدْ كُنْتُ أَعْلَمُ أَنَّهُ خَارِجٌ، وَلَمْ أَكُنْ أَظُنُّ أَنَّهُ مِنْكُمْ، فَلَوْ أَنِّيْ أَعْلَمُ أَنِّيْ أَخْلُصُ إِلَيْهِ لَتَجَشَّمْتُ لِقَاءَهُ، وَلَوْ كُنْتُ عِنْدَهُ لَغَسَلْتُ عَنْ قَدَمَيْهِ.

ثُمَّ دَعَا بِكِتَابِ رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم الَّذِيْ بَعَثَ بِهِ دِحْيَةُ الْكَلْبِيُّ إِلٰى عَظِيْمِ بُصْرَى، فَدَفَعَهُ إِلٰى هِرَقْلَ، فَقَرَأَهُ، فَإِذَا فِيْهِ:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ إِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ، سَلاَمٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى، أَمَّا بَعْدُ: فَإِنِّيْ أَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ الإِسْلاَمِ، أَسْلِمْ تَسْلَمْ، يُؤْتِكَ اللّٰهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ، فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الْيَرِيْسِيِّيْنَ، و: ﴿يٰأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ، أَنْ لاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّٰهَ، وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا، وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوْا اشْهَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾

قَالَ أَبُوْ سُفْيَانَ: فَلَمَّا قَالَ مَا قَالَ، وَفَرَغَ مِنْ قِرَاءَةِ الْكِتَابِ، كَثُرَ عِنْدَهُ الصَّخَبُ، فَارْتَفَعَتِ الأَصْوَاتُ، وَأُخْرِجْنَا، فَقُلْتُ لِأَصْحَابِيْ حِيْنَ أُخْرِجْنَا: لَقَدْ أَمِرَ أَمْرُ ابْنِ أَبِيْ كَبْشَةَ! إِنَّهُ يَخَافُهُ مَلِكُ بَنِي الأَصْفَرِ! فَمَا زِلْتُ مُوْقِنًا أَنَّهُ سَيَظْهَرُ، حَتّٰى أَدْخَلَ اللّٰهُ عَلَيَّ الإِسْلاَمَ.

ترجمہ: پس ہرقل نے ترجمان سے کہا: ان سے کہو: میں نے تم سے ان کے خاندان کے بارے میں دریافت کیا تھا، تم نے جواب دیا کہ وہ تم میں عالی نسب ہیں، اور اسی طرح انبیاء اپنی قوم کے اعلی خاندان میں بھیجے جاتے ہیں، اور میں نے تم سے پوچھا کہ کیا تم میں سے کسی نے اس سے پہلے یہ بات کہی ہے، تم نے جواب دیا: نہیں۔ پس میں نے سوچا: اگر ان سے پہلے کسی نے یہ بات کہی ہوتی تو میں کہتا: یہ ایسا آدمی ہے جو اقتداء کررہا ہے اس بات کی جو اس سے پہلے کہی گئی ہے۔ اور میں نے تم سے پوچھا: کیا اس کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟ تم نے جواب دیا: نہیں، پس میں نے سوچا: اگر اس کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ گذرا ہوتا تو میں یہ سمجھتا کہ یہ ایک ایسا آدمی ہے جو اپنے باپ دادا کا ملک

حاصل کرنا چاہتا ہے، اور میں نے تم سے پوچھا: کیا تم اس کو جھوٹ کے ساتھ متہم گردانتے تھے، اس سے پہلے کہ انھوں نے دعوی کیا جو کیا، تم نے جواب دیا: نہیں۔ پس میں بالیقین جانتا ہوں کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص لوگوں پر جھوٹ نہ بولے اور اللہ پر جھوٹ بول دے، اور میں نے تم سے پوچھا: شریف لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں یا کمزور لوگ؟ تم نے جواب دیا: کمزور لوگوں نے ان کی پیروی کی ہے۔ اور وہی لوگ رسولوں کی پیروی کرنے والے ہیں۔ اور میں نے تم سے پوچھا: ان کی تعداد بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟ تم نے جواب دیا: وہ لوگ بڑھ رہے ہیں، اور یہی ایمان کا حال ہے، تا آنکہ وہ حد کمال کو پہنچ جائے، اور میں نے تم سے پوچھا: کیا کوئی دین میں داخل ہوکر بر بناء ناراضگی دین سے پلٹتا ہے؟ تم نے جواب دیا: نہیں۔ اور یہی ایمان کا حال ہے: جب اس کی بشاشت دلوں میں پیوست ہوجاتی ہے (تو نکلتی نہیں) اور میں نے تم سے پوچھا: کیا وہ عہد شکنی کرتے ہیں؟ تم نے کہا: نہیں۔ اور اسی طرح انبیاء عہد شکنی نہیں کرتے۔ اور میں نے تم سے پوچھا کہ وہ تم کو کن باتوں کا حکم دیتے ہیں؟ تم نے بیان کیا کہ وہ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اللہ کی عبادت کرو، اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور وہ تمہیں بتوں کی عبادت سے روکتے ہیں اور تمہیں نماز کا، سچ بولنے کا، اور پاک دامنی کا حکم دیتے ہیں، پس اگر وہ باتیں جو تم نے کہی ہیں سچ ہیں تو وہ عنقریب میرے ان دونوں پیروں کی جگہ کے مالک ہوجائیں گے، اور میں بالتحقیق جانتا تھا کہ یہ نبی ظاہر ہونے والے ہیں، لیکن میرا یہ گمان نہیں تھا کہ وہ تم میں سے ہونگے، یعنی میں سمجھتا تھا کہ وہ نبی آخر الزماں بنی اسرائیل میں مبعوث ہونگے، پس اگر میں جانتا کہ میں ان تک پہنچ سکونگا تو میں ان سے ملاقات کے لئے ہر مشقت برداشت کرتا، اور اگر میں ان کے پاس ہوتا تو میں ان کے پیر دھوتا یعنی ہر خدمت کرتا۔

پھر ہرقل نے رسول اللہ ﷺ کا والا نامہ طلب کیا جو حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے عظیم بُصری (حارث بن شمر غسانی) کو دیا تھا، پس اس نے وہ ہرقل کو دیا اور ہرقل نے اس کو پڑھا، پس اچانک اس میں تھا:

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ یہ خط اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمدؐ کی طرف سے ہرقل کے نام ہے جو روم کی بڑی شخصیت ہے۔ اس شخص کے لئے سلامتی ہو جو ہدایت کی پیروی کرے۔ تمہید کے بعد: میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اسلام قبول کرلو، محفوظ رہوگے (اور) اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارا ڈبل اجر عطا فرمائیں گے، اور اگر تم نے روگردانی کی تو یقیناً تم پر رعایا کا گناہ ہوگا، اور اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ ہم ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور ہم ان کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم میں سے ایک دوسرے کو اللہ سے ورے آقا نہ بنائے، پس اگر وہ لوگ روگردانی کریں تو تم کہہ دو: کہ تم ہمارے اس اقرار کے گواہ رہو کہ ہم ماننے والے ہیں (سورۂ آل عمران آیت ۶۴)

ابوسفیان کہتے ہیں: جب ہرقل نے کہی وہ باتیں جو اس نے کہی اور خط پڑھ کر فارغ ہوا تو اس کے پاس بہت شور ہوا، پس آوازیں بلند ہوگئیں، اور ہم (دربار سے) نکال دیئے گئے، پس میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا جب ہم باہر کردیئے

گئے: بخدا! ابوکبشہ کے لڑکے کا معاملہ تو بڑا سنگین ہوگیا! اس سے تو رومیوں کا بادشاہ ڈرتا ہے! (ابوسفیان کہتے ہیں) پس مجھے برابر یقین رہا کہ عنقریب آپ غالب آجائیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام کی توفیق دی۔

تشریحات:

۱- ہرقل نے ابوسفیان سے دس گیارہ سوال کئے ہیں پھر ان کے ہر جواب پر تبصرہ کیا ہے، لیکن یہاں حدیث میں صرف نو جوابوں پر تبصرہ ہے، دو جوابوں پر تبصرہ آگے حدیث (نمبر ۲۸۰۴) میں آئے گا۔

۲- تمام سماوی ادیان کے ماننے والے شروع میں بے حیثیت لوگ ہوتے ہیں، اونچی ناک والے امراؤ شرفاء اس وقت قبول کرتے ہیں جب وہ پھیلنے لگتا ہے، اس وقت ان کو اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لئے منقاد ہونا پڑتا ہے، مگر یہ بات اکثری ہے، کلی نہیں۔ حضرت خدیجۃ الکبری اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما شرفاء میں سے تھے، مگر سب سے پہلے ایمان لائے ہیں۔

۳- انبیاء کے پیروکاروں کی پہلی جماعت دین پر مضبوطی سے جمتی ہے، ان میں عام طور پر ارتداد کا واقعہ پیش نہیں آتا، تاریخ میں دو چار ہی واقعات ایسے ملیں گے کہ کوئی شخص اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہوگیا، جیسے حضرت ام حبیبہؓ کا شوہر عبید اللہ بن جحش حبشہ جاکر نصرانی ہوگیا، مگر عام طور پر پہلی جماعت کے افراد مذہب سے نہیں پلٹتے، کیونکہ وہ مذہب کے صحیح جاننے والے ہوتے ہیں، پھر جب دین مکمل ہوجاتا ہے اور جماعت بھی بڑی ہوجاتی ہے اور ان کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں رہتا تو کچھ لوگ جہالت کی وجہ سے یا دنیاوی اغراض سے دین سے پھر جاتے ہیں، ہرقل نے یہی بات کہی ہے کہ اسلام قبول کرنے والوں کا اس مذہب پر جمے رہنا اور کسی کا الٹے پاؤں نہ پھرنا اس مذہب کے سچا ہونے کی دلیل ہے۔

قولہ: بَشَاشَتُهُ القلوبَ: لفظ بشاشت اردو میں بھی مستعمل ہے اور اس کے معنی ہیں: دل کے اطمینان کی کیفیت جس کا چہرے پر اثر ظاہر ہو، اور ت کو حذف کرکے بشاش بھی بولتے ہیں، کہتے ہیں: آپ بہت ہشاش بشاش نظر آرہے ہیں، بہر حال جب یہ کیفیت ہوجاتی ہے کہ ایمان کی خوشی چہرے پر نظر آنے لگے تو پھر وہ ایمان سے پلٹ نہیں سکتا، اور جب تک یہ کیفیت ظاہر نہیں ہوتی ایمان کمال تک نہیں پہنچتا، نہ اس کی کوئی گارنٹی ہے۔

قولہ: يأمركم بالصلاة والصدق: یہ حدیث کتاب الجہاد (حدیث نمبر ۲۹۴۱) میں بھی ہے، وہاں الصِّدق کی جگہ الصَّدَقة ہے، اور کتاب التفسیر (حدیث نمبر ۴۵۵۳) میں الزکاۃ ہے، حافظ رحمہ اللہ نے لفظ الزکاۃ کی بنیاد پر یہ بات کہی ہے کہ صحیح لفظ الصدقۃ ہے کیونکہ روایت بالمعنی کرتے ہوئے الزکاۃ کا ترجمہ الصِّدق نہیں کیا جاسکتا، ہاں الصدقۃ کیا جاسکتا ہے، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ دونوں لفظ صحیح ہیں، ایک راوی نے الصِّدق کا ذکر کیا، دوسرے نے الصدقۃ کا اور دونوں لفظوں کو جمع کرنے میں کوئی دشواری نہیں، اس لئے دونوں لفظ صحیح ہیں۔

قولہ: وقد كنتُ أعلم أنه خارج، ولم أكن أظن أنه منكم: ہرقل جب ابوسفیان کے جوابوں پر تبصرہ کرچکا تو

پہلی بات اس نے یہ کہی کہ میں بالیقین جانتا تھا کہ نبی آخر الزماں پیدا ہونے والے ہیں یعنی ان کے ظہور کا وقت قریب آ گیا ہے، مگر میرا خیال تھا کہ وہ بنی اسرائیل میں پیدا ہونگے، عربوں میں پیدا ہونگے ایسا میرا خیال نہیں تھا۔

جیسے ہندو بھی نبی آخر الزماں کے بارے میں خوب جانتے ہیں، ان کی ویدوں میں لفظ نراشیش سے آپ کی پیشین گوئی موجود ہے، یہ سنسکرت کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں ستودہ، تعریف کیا ہوا، یہی محمد کے معنی ہیں، مگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نراشیش نام کا کوئی شخص ہوگا اور وہ ہندوؤں میں پیدا ہوگا۔ اور ان کے پرانوں میں —— وید قدیم کتابیں ہیں اور پران بعد کی —— لفظ کلکی اوتار سے آپ کی خبر دی گئی ہے، ہندو برگزیدہ شخصیات (انبیاء) کو اوتار کہتے ہیں، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جب دنیا کے احوال حد سے زیادہ خراب ہو جاتے ہیں تو بھگوان بذات خود دنیا میں آتے ہیں، وہ باقاعدہ کسی عورت کے پیٹ سے جنم لیتے ہیں اور دنیا کو سنوار کر اپنی جگہ چلے جاتے ہیں، اور کلکی کے معنی ہیں: آخری، آج بھی ہندو کلکی اوتار کے منتظر ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ کلکی اوتار (آخری نبی) ہندوؤں میں پیدا ہونگے، مگر اللہ نے یہ فضیلت نہ نصاریٰ کو بخشی نہ ہندوؤں کو، بلکہ یہ نعمت عربوں کے نصیب میں آئی۔

قوله: فإن كان ما تقول حقا فسيملك موضعَ قدمَيَّ هاتين: دوسری بات ہرقل نے یہ کہی کہ اگر تم نے میرے سوالات کے جوابات صحیح دیئے ہیں تو وہ میرے پیروں کے نیچے کی زمین (بیت المقدس) کے مالک ہو جائیں گے، چنانچہ یہ پیشین گوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں پوری ہوئی، بیت المقدس فتح ہو کر اسلام کے زیر نگیں آ گیا۔

قوله: لو أني أعلم أني أخلص إليه لتجشمتُ لقاء ه: ہرقل نے تیسری بات یہ کہی کہ اگر میں نبی آخر الزماں تک پہنچ سکتا تو ہر طرح کی مشقت برداشت کرتا اور خدمت اقدس میں حاضر ہوتا، اور آپ کے پاؤں دھوتا یعنی ہر طرح کی خدمت کرتا، مگر میرے لئے ان تک پہنچنا ممکن نہیں، میری حکومت چلی جائے گی!

قوله: بسم الله الرحمن الرحيم: آنحضور ﷺ نے شاہانِ عجم کے نام جتنے خطوط روانہ فرمائے ہیں سب کی ابتداء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوئی ہے، اور یہی اسلامی طریقہ ہے، بعض لوگ بسم اللہ کی جگہ اس کا عدد ۷۸۶ لکھتے ہیں، یہ غیر اسلامی طریقہ ہے، وہ لوگ کہتے ہیں: اگر مکتوب الیہ خط کی حفاظت نہیں کرے گا تو اللہ کے نام کی توہین ہوگی، مگر یہ عذر صحیح نہیں، خط لکھنے والے کی ذمہ داری ہے بسم اللہ لکھنا، اور مکتوب الیہ کی ذمہ داری ہے اس کا احترام کرنا، اگر وہ احترام نہیں کرے گا تو وہ گنہ گار ہوگا، آنحضور ﷺ نے یہ والا نامے کافر بادشاہوں کو لکھے ہیں، کیا یہ امید تھی کہ وہ ان خطوط کا احترام کریں گے؟ اونچے طاق میں رکھیں گے؟ ہو سکتا تھا کہ نیچے پھینک دیں اور ایران کے بادشاہ نے پھاڑ کر نیچے پھینک بھی دیا تھا مگر آنحضور ﷺ نے ہر خط کے شروع میں پوری بسم اللہ لکھی ہے، یہی اسلامی طریقہ ہے۔

اور کچھ لوگ خط کے شروع میں **باسمہ تعالیٰ** لکھتے ہیں، یہ بھی ٹھیک نہیں، یہ بھی حضور ﷺ کے عمل کے خلاف ہے، مگر چونکہ یہ بسم اللہ ہی کے ہم معنی ہے اس لئے جائز ہے، مگر یہ بھی اسلامی طریقہ نہیں، اسلامی طریقہ پوری بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لکھنا ہے، صلح حدیبیہ کے معاہدے میں آپؐ نے پوری بسم اللہ لکھنے کا حکم دیا تھا۔ مشرکین نے اعتراض کیا، اور باسمك اللّٰھم لکھنے پر اصرار کیا تو آپؐ نے قبول فرمالیا۔

قوله: من محمد عبد الله ورسوله: اس میں اشارہ ہے کہ خط لکھنے والا اپنا نام پہلے لکھے، اور مکتوب الیہ کا بعد میں، حضرات صحابہ کا بھی یہی معمول تھا، جب وہ آپؐ کو خط لکھتے تھے تو پہلے اپنا نام لکھتے تھے (کذا فی شرح البخاری للنووی ص:۸۶) لیکن یہ ضروری اور واجب نہیں، رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہما کو ایک جگہ بھیجا، وہاں پہنچ کر دونوں حضرات نے آپؐ کی خدمت میں عریضہ لکھا۔ حضرت علیؓ نے تو آپؐ کا نام پہلے لکھا اور اپنا بعد میں، اور حضرت خالدؓ نے اپنا نام پہلے لکھا، جس سے معلوم ہوا کہ دونوں امر جائز ہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اور عبدالملک بن مروان کو خط لکھا تو پہلے حضرت معاویہ اور عبدالملک کا نام لکھا تھا۔ اسی طرح زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جب حضرت معاویہ کو خط لکھا تو انھوں نے بھی حضرت معاویہؓ کا نام پہلے لکھا تھا۔

(فتح الباری ۸:۱۶۸ بحوالہ سیرۃ المصطفیٰ ۲:۳۹۰)

قوله: إلى هرقل عظيم الروم: اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب کسی بڑے کو خط لکھا جائے تو مناسب القاب لکھے جائیں، اگرچہ وہ غیر مسلم ہو۔ اور آپ ﷺ نے لفظ مَلِك (بادشاہ) نہیں لکھا اس لئے کہ یہ لفظ اللہ کو پسند نہیں اور ملک الاملاک (شہنشاہ) تو اللہ کو نہایت ناگوار ہے (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۴۷۵۵)

قوله: سلامٌ على من اتبع الهدى: اس میں اشارہ ہے کہ غیر مسلم کو اسلامی سلام: السلام علیکم نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس طرح سلام کرے کہ نہ سانپ بچے نہ لاٹھی ٹوٹے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار میں اسی طرح سلام کیا تھا، انھوں نے کہا تھا ﴿وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى﴾: جو ہدایت کی پیروی کرے اس کو سلام! اور جو پیروی نہ کرے وہ دعا سے محروم!

قوله: أَدْعوك بِدِعاية الإسلام: میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں، یہ پورے جملہ کا ترجمہ ہے، أدعوك کا علاحدہ ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں، دِعَايَةَ: دعا یدعو کا مصدر ہے، دَعْوَةٌ بھی مصدر آتا ہے، اور دِعاية الإسلام میں اضافت ایسی ہے جیسے خاتَمُ فضَّةٍ میں یعنی اضافت بیانیہ ہے، پس جس طرح خاتَم اور فضَّة ایک ہیں دعاية اور اسلام ایک ہیں۔

قوله: أَسْلِمْ تَسْلَمْ: اسلام قبول کرلو محفوظ رہوگے (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی) —— قیصر نے آنحضور ﷺ کے اس ارشاد پر غور نہیں کیا، اگر وہ اسلام قبول کرلیتا تو آخرت تو سلامت رہتی ہی، دنیا (حکومت) بھی سلامت رہتی۔

قوله: يؤتك الله أجرك مرتين: اسلام قبول کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ڈبل ثواب دیں گے، ایک اجر سابق نبی پر ایمان لانے کا، اور دوسرا اجر نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لانے کا۔ بخاری ومسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین شخصوں کے لئے دوہرا اجر ہے، ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو گذشتہ نبی پر اور اس کی کتاب پر ایمان لایا، پھر نبی آخر الزماں پر بھی ایمان لایا (مشکوٰۃ حدیث ۱۱)

دوہرا اجر پانے کی دوسری وجہ: حدیث میں ہے: الدَّالُ علی الخیر کفاعله: بھلی بات کی طرف راہنمائی کرنے والا بھلی بات پر عمل کرنے والے کی طرح ہے، پس اگر بادشاہ ایمان لے آئے گا تو اس کے ساتھ بے شمار لوگ ایمان لے آئیں گے، کیونکہ: الناس علی دین ملوکھم: لوگ اپنے بادشاہوں کے طریقوں پر چلتے ہیں پس سب ایمان لانے والوں کا ثواب بھی اس کو ملے گا، اور اس صورت میں مَرَّتین (تثنیہ) عدد کے لئے نہیں ہوگا، بلکہ تکرار کے لئے ہوگا، جیسے ﴿ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ﴾: پھر آسمان کی طرف بار بار دیکھو، آسمان میں تمہیں کوئی دراڑ شگاف نظر نہیں آئے گا، یہاں تثنیہ تکرار کے لئے ہے عدد کے لئے نہیں ہے، اسی طرح یؤتك الله أجرك مرتين میں بھی تثنیہ تکرار کے لئے ہوگا۔

اب ترجمہ ہوگا: تمہیں بے حساب اجر ملے گا، جتنے لوگ تمہاری وجہ سے مسلمان ہونگے سب کا ثواب تم کو بھی ملے گا۔

اور اگر تم دین حق قبول کرنے سے اعراض کروگے تو تمام پبلک کا گناہ تمہارے سر ہوگا، اس لئے کہ بدی کی طرف بلانے والا اور اس کا سبب بننے والا گناہ کرنے والے کی طرح ہے، مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس شخص نے کسی بھلی بات کی طرف راہنمائی کی تو اس کو اس بھلائی پر عمل کرنے والوں کے بقدر ثواب ملے گا، اور ان عمل کرنے والوں کے ثواب میں سے کچھ کم نہ ہوگا، اور جس نے کسی گناہ کے کام کی طرف راہنمائی کی تو اس پر اس گناہ کرنے والوں کا وبال ہوگا، اور ان برائی کرنے والوں کے گناہ میں سے کچھ کم نہ ہوگا (مشکوٰۃ حدیث ۱۵۷)

قوله: إثم الْيَرِيْسِيِّيْنَ: اور ایک نسخہ میں إثم الأریسیین ہے۔ یہ کس زبان کا لفظ ہے اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ بات معلوم نہیں، بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس کے معنی کسان کے ہیں، چونکہ روم کی اکثریت کھیتی کرتی تھی اس لئے یہ لفظ استعمال کیا ہے، مگر صحیح بات یہ ہے کہ اس لفظ کی حقیقت معلوم نہیں، البتہ مرادی معنی پبلک (رعایا) ہیں۔

پھر حضور ﷺ نے سورہ آل عمران کی آیت (۶۴) لکھی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان ایک مشترک نقطہ ہے، اس پر آجاؤ، اور وہ نقطہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں، اور اللہ سے نیچے کسی کو رب نہ بنائیں، تمام ادیان سماویہ کا یہی مشترک نقطہ ہے، پس اس بیج سے جو شاخیں نکلیں گی وہ مختلف کیسے ہوسکتی ہیں؟

قوله: لقد أَمِرَ أَمْرُ ابْنِ أبی کبشة: أَمِرَ کے معنی ہیں: عَظُم، اور ابن ابی کبشہ سے آنحضور ﷺ مراد ہیں۔ اور ابوسفیان نے آپ کو ابوکبشہ کا لڑکا کیوں کہا، جبکہ آپ کی ددھیال اور ننھیال میں اس نام کا کوئی شخص نہیں گذرا؟ علماء نے اس کی مختلف توجیہیں کی ہیں، میرے نزدیک سب سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ آنحضور ﷺ سے پہلے عرب میں ابو کبشہ نام کا ایک شخص گذرا ہے، جس نے مورتیوں کی پوجا کی مخالفت کی تھی، اور اسلام کی بھی یہی تعلیم ہے، اس لئے ابوسفیان

نے بطور تشبیہ آپؐ کو ابو کبشہ کا بیٹا کہا ہے، جیسے بریلوی : دیوبندیوں کو وہابی کہتے ہیں حالانکہ اکابر دیوبند میں کوئی اس نام کا نہیں گذرا، اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب میں محمد بن عبدالوہاب نام کی ایک شخصیت گذری ہے، انھوں نے بدعات کی سخت مخالفت کی ہے، اور علماء دیوبند نے بھی یہی کام کیا ہے، اس لئے کہنے والوں نے ان کو بھی وہابی کہہ دیا، اسی طرح ابو کبشہ نے مورتی پوجا کی سخت مخالفت کی تھی، اور اسلام بھی مخالفت کرتا ہے، اس لئے ابوسفیان نے آپؐ کو ابو کبشہ کا بیٹا کہا، قرین صواب یہی بات مجھے نظر آتی ہے۔ واللہ اعلم

وَكَانَ ابْنُ النَّاطُوْرِ صَاحِبُ إِيْلِيَاءَ وَهِرَقْلَ سُقُفَّ عَلٰى نَصَارَى الشَّامِ، يُحَدِّثُ أَنَّ هِرَقْلَ حِيْنَ قَدِمَ إِيْلِيَاءَ أَصْبَحَ يَوْمًا خَبِيْثَ النَّفْسِ، فَقَالَ بَعْضُ بَطَارِقَتِهِ: قَدِ اسْتَنْكَرْنَا هَيْئَتَكَ، قَالَ ابْنُ النَّاطُوْرِ: وَكَانَ هِرَقْلُ حَزَّاءً، يَنْظُرُ فِي النُّجُوْمِ، فَقَالَ لَهُمْ حِيْنَ سَأَلُوْهُ: إِنِّيْ رَأَيْتُ اللَّيْلَةَ حِيْنَ نَظَرْتُ فِي النُّجُوْمِ مَلِكَ الْخِتَانِ قَدْ ظَهَرَ، فَمَنْ يَخْتَتِنُ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ؟ قَالُوْا: لَيْسَ يَخْتَتِنُ إِلَّا الْيَهُوْدُ فَلَا يُهِمَّنَّكَ شَأْنُهُمْ، وَاكْتُبْ إِلٰى مَدَائِنِ مُلْكِكَ، فَلْيَقْتُلُوْا مَنْ فِيْهِمْ مِنَ الْيَهُوْدِ.

فَبَيْنَاهُمْ عَلٰى أَمْرِهِمْ أُتِيَ هِرَقْلُ بِرَجُلٍ أَرْسَلَ بِهِ مَلِكُ غَسَّانَ، يُخْبِرُ عَنْ خَبَرِ رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، فَلَمَّا اسْتَخْبَرَهُ هِرَقْلُ قَالَ: اذْهَبُوْا فَانْظُرُوْا أَمُخْتَتِنٌ هُوَ أَمْ لَا؟ فَنَظَرُوْا إِلَيْهِ فَحَدَّثُوْهُ أَنَّهُ مُخْتَتِنٌ، وَسَأَلَهُ عَنِ الْعَرَبِ، فَقَالَ: هُمْ يَخْتَتِنُوْنَ، فَقَالَ هِرَقْلُ: هٰذَا مَلِكُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ قَدْ ظَهَرَ.

ثُمَّ كَتَبَ هِرَقْلُ إِلٰى صَاحِبٍ لَهُ بِرُوْمِيَةَ، وَكَانَ نَظِيْرَهُ فِي الْعِلْمِ، وَسَارَ هِرَقْلُ إِلٰى حِمْصَ، فَلَمْ يَرِمْ حِمْصَ حَتّٰى أَتَاهُ كِتَابٌ مِنْ صَاحِبِهِ يُوَافِقُ رَأْيَ هِرَقْلَ عَلٰى خُرُوْجِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم، وَأَنَّهُ نَبِيٌّ فَأَذِنَ هِرَقْلُ لِعُظَمَاءِ الرُّوْمِ فِيْ دَسْكَرَةٍ لَهُ بِحِمْصَ، ثُمَّ أَمَرَ بِأَبْوَابِهَا فَغُلِّقَتْ، ثُمَّ اطَّلَعَ فَقَالَ: يَا مَعْشَرَ الرُّوْمِ! هَلْ لَكُمْ فِي الْفَلَاحِ وَالرُّشْدِ، وَأَنْ يَثْبُتَ مُلْكُكُمْ، فَتُبَايِعُوْا هٰذَا النَّبِيَّ؟ فَحَاصُوْا حَيْصَةَ حُمُرِ الْوَحْشِ إِلَى الْأَبْوَابِ، فَوَجَدُوْهَا قَدْ غُلِّقَتْ، فَلَمَّا رَأٰى هِرَقْلُ نَفْرَتَهُمْ وَأَيِسَ مِنَ الْإِيْمَانِ، قَالَ: رُدُّوْهُمْ عَلَيَّ، وَقَالَ: إِنِّيْ قُلْتُ مَقَالَتِيْ آنِفًا أَخْتَبِرُ بِهَا شِدَّتَكُمْ عَلٰى دِيْنِكُمْ، فَقَدْ رَأَيْتُ، فَسَجَدُوْا لَهُ، وَرَضُوْا عَنْهُ، فَكَانَ ذٰلِكَ آخِرَ شَأْنِ هِرَقْلَ.

قَالَ أَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ: رَوَاهُ صَالِحُ بْنُ كَيْسَانَ، وَيُوْنُسُ، وَمَعْمَرٌ، عَنِ الزُّهْرِيِّ.

[انظر: ۵۱، ۲۶۸۱، ۲۸۰۴، ۲۹۴۱، ۲۹۷۸، ۳۱۷۴، ۴۵۵۳، ۵۹۸۰، ۶۲۶۰، ۷۱۹۶، ۷۵۴۱]

ترجمہ: اور ابن الناطور جو ایلیاء کا گورنر، ہرقل کا دوست اور شام کے نصاریٰ کا مذہبی پیشوا تھا بیان کرتا ہے کہ ہرقل جب ایلیاء آیا تو ایک دن وہ کبیدہ خاطر تھا، پس اس کے کسی مصاحب نے عرض کیا: ہم آج آپ کی حالت دیگر گوں پاتے ہیں! (کیا بات ہے؟) ابن الناطور کہتا ہے: اور ہرقل ماہر کاہن تھا، ستاروں میں غور کرتا تھا (اور آئندہ کے احوال کا پتہ

چلاتا تھا) پس جب لوگوں نے ہرقل سے اس کی متغیر حالت کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا: بیشک آج رات جب میں نے ستاروں کی چالوں میں غور کیا تو دیکھا کہ ختنہ کرنے والی قوم کا بادشاہ (ہم پر) غالب آگیا (مجھے بتاؤ!) کونسی قوم ختنہ کرتی ہے؟ حاضرین نے جواب دیا: یہود کے علاوہ کوئی ختنہ نہیں کرتا، پس ان کا معاملہ آپ کو فکر مند نہ کرے، آپ اپنے ملک کے تمام شہروں میں حکم بھیج دیں کہ وہاں جتنے یہودی ہیں ان کو قتل کردیں۔

پس اس درمیان کہ وہ اپنے معاملہ پر تھے یعنی ابھی مشورہ چل رہا تھا کہ ہرقل کے پاس ایک شخص لایا گیا جس کو غسّان کے بادشاہ نے بھیجا تھا جو آنحضور ﷺ کے احوال بیان کرتا تھا، پس جب ہرقل نے اس سے احوال دریافت کیے تو اس نے کہا: اس کو لے جاکر دیکھو: آیا ختنہ شدہ ہے یا نہیں؟ لوگوں نے اس کو دیکھا پھر ہرقل کو بتایا کہ وہ ختنہ شدہ ہے اور ہرقل نے اس سے عرب کے بارے میں دریافت کیا، اس نے کہا: وہ ختنہ کراتے ہیں، پس ہرقل نے (اپنے درباریوں سے) کہا: اس قوم کا بادشاہ یقیناً غالب آئے گا۔

پھر ہرقل نے اپنے ایک دوست (ضغاطر) کو لکھا جو رومیہ کا رہنے والا تھا اور کہانت میں ہرقل کا ہم پلہ تھا، اور ہرقل حمص کی طرف چل دیا، پس ابھی وہ حمص سے آگے بڑھنے نہیں پایا تھا کہ اس کے دوست کا خط آیا جس میں اس نے ہرقل کی رائے سے اتفاق کیا کہ نبی ﷺ پیدا ہو چکے ہیں اور وہ (برحق) نبی ہیں۔ چنانچہ ہرقل نے حمص میں اپنے دربار میں روم کے چودھریوں کو جمع کیا، پھر دربار کے دروازے بند کرنے کا حکم دیا، چنانچہ وہ بند کردیئے گئے، پھر وہ دربار میں آیا، اور خطاب کیا: رومیو! کیا تم کامیابی، ہدایت اور اپنی حکومت کی بقا چاہتے ہو؟ پس اس نبی کے ہاتھ پر بیعت کرلو (یہ سن کر) لوگ نیل گایوں کے بھاگنے کی طرح دروازوں کی طرف بھاگے، پس انھوں نے دروازے بند پائے۔ پس جب ہرقل نے ان کی دین سے بیزاری دیکھی اور وہ ان کے ایمان سے مایوس ہوگیا تو اس نے کہا: لوگوں کو میرے پاس واپس لاؤ، اور اس نے کہا: میں نے ابھی جو بات کہی اس کے ذریعہ میں تمہاری مذہب میں پختگی اور مضبوطی کی آزمائش کر رہا تھا، سو میں نے وہ دیکھ لی، پس سب نے اس کو سجدہ کیا اور اس سے راضی ہوگئے، پس یہ ہرقل کے آخری احوال ہیں۔

تشریحات

۱- ابوسفیان والا واقعہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے پورا ہو چکا، اب یہاں سے دوسرا واقعہ شروع ہو رہا ہے، اس واقعہ کو ابن الناطور سے کون روایت کرتا ہے؟ کتابوں میں لکھا ہے کہ ابن شہاب زہری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، یعنی اوپر والا واقعہ جو ابوسفیان کا بیان کیا ہوا ہے، اس کو امام زہری: عبید اللہ بن عبد اللہ سے، اور وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں اور اس واقعہ کو ابن الناطور سے براہ راست امام زہریؒ روایت کرتے ہیں، حافظؒ نے فتح الباری میں اور ابونعیم نے دلائل النبوہ میں لکھا ہے کہ عبد الملک بن مروان کے زمانہ حکومت میں امام زہری کی ابن الناطور سے دمشق میں ملاقات ہوئی اور انھوں نے خود ابن الناطور سے یہ واقعہ سنا۔ ابن الناطور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ

خلافت میں مسلمان ہوگئے تھے، مگر مجھے اس بات پر حیرت ہے، ابن شہاب زہریؒ پہلی صدی کے آخر کے ہیں اور ابن الناطور آنحضور ﷺ کے زمانہ میں تھا ہرقل کا دوست اور ایلیاء کا گورنر اور مذہبی پیشوا تھا پس اس وقت وہ عمر رسیدہ آدمی ہوگا، پھر اس کی ابن شہاب زہریؒ سے ملاقات کیسے ہوئی؟ اور ابن شہاب نے اس سے یہ واقعہ براہ راست کیسے سنا؟ یہ بات عقل باور نہیں کرتی، پس میری رائے یہ ہے کہ ابن الناطور نے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمان ہونے کے بعد حضرت ابن عباسؓ سے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ پس یہ بھی ابن عباسؓ کی روایت ہے اور ابن شہاب دونوں واقعے حضرت ابن عباس سے بہ واسطہ عبید اللہ روایت کرتے ہیں واللہ اعلم بالصواب۔

۲- اور ناطور کس زبان کا لفظ ہے؟ یہ معلوم نہیں، حاشیہ میں اس کے معنی حارث البُستان: مالی، باغباں لکھے ہیں، اور سُقُف: یا أُسقف: عیسائیوں کے یہاں ایک مذہبی عہدہ تھا، جیسے آج کل بشپ ایک عہدہ ہے۔

۳- اس روایت میں دو واقعے ہیں: ایک ابوسفیان والا، دوسرا ابن الناطور والا، ان میں پہلا واقعہ کونسا ہے، اور دوسرا کونسا؟ اس سلسلہ میں روایات میں اور شارحین میں بہت اختلاف ہے، اور میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا، اور اس کا فیصلہ کرنے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں۔

۴- بطارق: بِطْرِیق کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: مصاحب ـــــ حَزَّاء: کے لغوی معنی ہیں: زیرک، ذہین۔ اور اصطلاح میں حزّاء کاہن کو کہتے ہیں جس کے تابع مؤکل (جنات) ہوتے ہیں اور جو مستقبل کی پیشین گوئیاں کرتے ہیں ـــــ صاحبُ ایلیاء: ابن الناطور کی صفت ہے، پس وہ مرفوع ہے، اور اس کو علی الاختصاص منصوب بھی پڑھا گیا ہے ـــــ سُقُفًّا: یہی اصل اعراب ہے اس لئے کہ یہ کان کی خبر ہے اور اس کو الف کے ساتھ أُسقُفًا بھی پڑھا گیا ہے، اور بعض لوگوں نے مبتدا محذوف کی خبر بنا کر اس کو مرفوع پڑھا ہے ـــــ مَلِكُ الْخِتان بھی پڑھ سکتے ہیں یعنی ختنہ کا بادشاہ، اور مُلْكُ الْخِتان: بھی پڑھ سکتے ہیں، یعنی ختنہ کا ملک ہم پر غالب آگیا ـــــ دَسْكَرَة: عجمی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں: عظیم محل ـــــ فکان ذلك آخر شأن: ذلك کا مشار الیہ یہ پورا واقعہ ہے جو ابن الناطور نے بیان کیا ہے، یعنی ہرقل کا بس اتنا ہی معاملہ ہمارے علم میں ہے، آئندہ کیا ہوا؟ وہ مسلمان ہوا یا نہیں؟ اس کی موت اسلام پر ہوئی یا کفر پر؟ ہمیں معلوم نہیں، البتہ مسند احمد میں یہ روایت ہے کہ ہرقل نے تبوک سے ایک خط آنحضرت ﷺ کو لکھا تھا جس میں لکھا تھا کہ میں مسلمان ہوں، آپؐ نے فرمایا: یہ شخص جھوٹا ہے، ابھی تک اپنی نصرانیت پر قائم ہے، واللہ اعلم

(بحوالہ سیرت المصطفیٰ ۲: ۳۹۲)

ملحوظہ: صالح، یونس اور معمر کی روایتیں آگے آرہی ہیں، یہ روایت بخاری شریف میں بارہ جگہ آئی ہے، کہیں مفصل کہیں مختصر۔

﴿الحمد للہ! بدء الوحی کی تقریر کی ترتیب پوری ہوئی﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الإیمان

باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "بنی الإسلام علی خمس" وھو قول وفعل ویزید وینقص

ایمان کا مبنی پانچ اعمال ہیں اور ایمان قول وفعل ہے اور وہ گھٹتا بڑھتا ہے

بخاری کی ابتدا وانتہا ایمان کے بیان سے ہوئی ہے

یہ بات پہلے آچکی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ایمان کے بیان سے شروع کی ہے، اور ایمان ہی کے بیان پر ختم کی ہے، آخری کتاب: کتاب التوحید ہے۔ ایمان اور توحید ایک چیز ہیں۔ اور لفظوں کا اختلاف تفنن (نہج بدلنا) ہے، اور اعمال کا بیان درمیان میں لائے ہیں، اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے:

پہلی بات: اعمال کی اعتباریت کے لئے ایمان کی مقارنت شرط ہے۔ ایمان کے بغیر اعمال بے ثمرہ ہیں۔ سورۃ النحل (آیت ۹۷) میں ہے: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾: جو شخص کوئی نیک کام کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ صاحبِ ایمان ہو، کیونکہ کافر کے اعمال صالحہ آخرت میں مقبول نہیں۔ وہ سراب (چمکتی ریت) کی طرح ہیں۔ سورۃ النور (آیت ۳۹) میں ان کی یہی تمثیل آئی ہے۔

دوسری بات: ایمان میں استمرار ضروری ہے، اس میں لحہ بھر کا انقطاع گوارہ نہیں۔ سورۃ الزمر (آیت ۶۵) میں ہے: ﴿لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ، وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾: اگر تو شرک کرے گا تو تیرا کیا کرایا سب غارت ہو جائے گا، اور آخرت میں تو خسارے میں پڑ جائے گا۔

فائدہ: ایمان کی جزاء ابدی جنت اور شرک وکفر کی سزا ابدی جہنم اس لئے ہیں کہ یہ ابدی حقیقتیں ہیں، موت کے بعد بھی مستمر رہتی ہیں، اور اعمال منقطع ہو جاتے ہیں، نماز پڑھ کر فارغ ہوا، عمل پورا ہو گیا، زنا کر کے نمٹا عمل منقطع ہو گیا۔ اور مسلمانوں کے اعمال صالحہ آخرت میں اس کے ایمان کے تابع کر دیئے جائیں گے، اس لئے اس کی جزا بھی تا ابد ملتی رہے گی، اور اس کی برائیاں ایمان کے تابع نہیں کی جا سکتیں، کیونکہ وہ ہم جنس نہیں، بلکہ منافی ہیں۔ اس لئے ان کی سزا دنیا میں، قبر میں، میدانِ حشر میں اور جہنم میں ملے گی، پھر ان کی نجات ہوگی ——— اور کافر کے نیک کاموں کو کفر کے تابع نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ وہ ہم جنس نہیں، بلکہ منافی ہیں، اس لئے ان کا بدلہ دنیا ہی میں دیدیا جاتا ہے، جیسا کہ مسلم

شریف کی حدیث (نمبر ۲۸۰۸) میں آیا ہے۔اور کافر کی برائیاں اس کے کفر وشرک کے تابع کردی جائیں گی، اور وہ ان کی سزا جہنم میں تا ابد پائے گا۔

ایمان کے معنی:

ایمان کے لغوی معنی ہیں: تصدیق کرنا۔یعنی کسی کے اعتبار واعتماد پر اس کی بات کو سچا ماننا، اور اصطلاحی معنی ہیں: اللہ کے پیغمبروں نے جو ایسی حقیقتیں ہم کو بتلائی ہیں جو ہمارے حواس اور آلاتِ ادراک کی حدود سے ماوراء ہیں اور انھوں نے جو علم وہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں پہنچائی ہے ان سب کو سچ ماننا اور ان انبیاء کی تصدیق کرنا، اور ان کے لائے ہوئے دین کو قبول کرنا یہ شرعی ایمان ہے۔

ایمان شرعی کا تعلق درحقیقت ایسے امورِ غیب ہوتا ہے جن کو ہم آلاتِ احساس وادراک (آنکھ: ناک، کان وغیرہ) کے ذریعہ معلوم نہیں کرسکتے، اس لئے قرآنِ کریم میں ایمان کے ساتھ ﴿بِالْغَیْبِ﴾ کی قید آئی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ، ان کی صفات، رسولوں کی رسالت، ان پر وحی کی آمد اور مبدأ ومعاد کے تعلق سے انبیاء نے جو اطلاعات دی ہیں، ان سب کو ان کی سچائی کے اعتماد پر حق جان کر دل سے قبول کرنے کا نام اصطلاحِ شریعت میں ایمان ہے، اور پیغمبر کی اس قسم کی بتلائی ہوئی باتوں میں سے کسی ایک بات کو بھی نہ ماننا یا اس کو حق نہ سمجھنا اس کی تکذیب ہے، جو آدمی کو ایمان کے دائرے سے خارج کرکے کفر کی سرحد میں داخل کردیتی ہے۔

امورِ ایمان:

امورِ ایمان کو عقائدِ اسلام بھی کہا جاتا ہے، یہ عقائد اگر پھیلائے جائیں تو بہت ہیں، بہشتی زیور میں پچاس عقیدے بیان کئے ہیں اور اگر ان کو سمیٹا جائے تو وہ چھ عقیدے ہیں، جن کا ذکر حدیث جبرئیل میں آیا ہے اور جن کو ایمان مفصل میں لیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ پر، فرشتوں پر، اللہ کی کتابوں پر، اللہ کے رسولوں پر، قیامت کے دن پر، (مرنے کے بعد زندہ ہونے پر) اور بھلی بری تقدیر پر ایمان لانا، اور اگر مزید سمیٹا جائے تو صرف دو بنیادی عقیدے رہ جاتے ہیں جو کلمہ طیبہ میں لئے گئے ہیں یعنی توحید اور رسالتِ محمدی کا اقرار، پھر مزید سمیٹا جائے تو بنیادی عقیدہ لا إله إلا الله ہے، جس میں رسالتِ محمدی وغیرہ تمام عقائد شامل ہیں۔جیسے ایک انچ کا ربڑ لیں اور اس کو دونوں کناروں سے پکڑ کر کھینچیں، تو ایک بالشت لمبا ہوجائے گا پھر چھوڑ دیں تو ایک انچ رہ جائے گا، اسی طرح تمام عقائد سمٹ کر لا إله إلا الله میں آجاتے ہیں، اور وہی پھیل کر پچاس عقیدے بن جاتے ہیں۔

اسلام کے معنی:

اسلام کے لغوی معنی ہیں: سرافگندگی، یعنی خود کو کسی کے سپرد کردینا، بالکل اسی کے تابع اور فرمانبردار ہوجانا۔اور

اصطلاحی معنی ہیں: اللہ کی نازل کی ہوئی شریعت کو اپنا دستورِ زندگی بنانا، اس کے احکام کا مطیع ہونا۔ سورۃ الحج میں ہے: ﴿إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوْا﴾: اللہ ہی تمہارا ایک معبود ہے پس تم اسی کے مطیع ہو جاؤ۔ اور سورۃ النساء میں ہے: ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ﴾: اور اس سے بہتر کون ہے جس نے خود کو خدا کے سپرد کر دیا؟ اور سورۂ آل عمران میں ہے: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾: جو اسلام کے علاوہ کوئی دین چاہے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں بڑے گھاٹے میں رہے گا۔

غرض اسلام کی اصل روح اور حقیقت یہی ہے کہ بندہ خود کو کلی طور پر اللہ کے حوالہ کر دے، اور ہر پہلو سے ان کا مطیع وفرمانبردار بن جائے، انبیاء کی شریعتوں میں کچھ مخصوص بنیادی اعمال کا بھی حکم دیا گیا ہے، جو ایمان کے پیکر محسوس ہیں اور باطنی حقیقت کی نشو ونما اور اس کی بالیدگی کا مدار انہی مخصوص ارکان پر ہے، اس لئے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان کو دستورِ حیات بنائیں۔ انہی ارکان پر اسلام کا اطلاق کیا جاتا ہے، نبی ﷺ کی لائی ہوئی شریعت میں یہ ارکان پانچ ہیں: (۱) توحید ورسالت کی گواہی دینا یعنی منکروں کو یہ دو بنیادی عقیدے پہنچانا (۲) نماز پڑھنا (۳) زکوۃ دینا (۴) روزہ رکھنا (۵) اور بیت اللہ کا حج کرنا۔ انہی پانچ چیزوں کو ارکانِ اسلام کہا جاتا ہے۔

البتہ نصوص میں ایمان واسلام ایک دوسرے کی جگہ مستعمل ہوئے ہیں، عقائد پر اسلام کا اور اعمال پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے۔

ایک معرکۃ الآراء مسئلہ جو پوری کتاب الایمان کا موضوع ہے

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، جس میں اہل حق اور باطل فرقوں کے درمیان اختلاف ہوا ہے، بلکہ اہل حق کے درمیان بھی اختلاف ہے، اور اس مسئلہ کی تین تعبیریں ہیں:

۱- ایمان مرکب ہے یا بسیط؟ یعنی ایمان اجزاء دار ہے یا اس کا کوئی جز نہیں؟

۲- ایمان میں اعمال (قول وفعل) داخل ہیں یا نہیں؟ یعنی تصدیق قلبی تو بالاتفاق ایمان ہے۔ مگر قول: یعنی اللہ کی وحدانیت کا اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرنا، اور عمل: یعنی اقرار کے تقاضے کے مطابق عمل کرنا ایمان کے اجزاء ہیں یا نہیں؟

۳- مؤمنین کا ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں؟ یعنی تمام مؤمنین کا ایمان ایک درجہ میں ہے یا ان میں کمی بیشی ہوتی ہے؟

نوٹ: امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلے باب میں یہ تینوں تعبیریں جمع کی ہیں، پھر پوری کتاب الایمان میں اسی ایک مسئلہ پر ابواب قائم کئے ہیں، ہر باب میں ذیلی فوائد بھی آئیں گے، مگر بنیادی مسئلہ یہی چلتا رہے گا۔

غرض: اس مسئلہ میں امت میں بڑا اختلاف ہوا ہے۔ اس لئے اس مسئلہ کو تفصیل سے سمجھنا ضروری ہے، اور اس کو

کما حقہ سمجھنے کے لئے پہلے گمراہ فرقوں کی معرفت ضروری ہے۔

صحابہ کے بعد عقائد میں اختلاف شروع ہوا:

صحابۂ کرام کے آخری دور میں امت میں اختلاف شروع ہوا[1] مگر یہ اختلاف صحابہ میں نہیں ہوا، صحابہ کے درمیان عقائد میں کوئی اختلاف نہیں تھا، ایک سودس ہجری میں آخری صحابی کا انتقال ہوا، پھر علماء نے صحابہ کا جائزہ لے کر یہ بات بتلائی کہ صحابہ کے درمیان عقائد میں کوئی اختلاف نہیں ہوا[2] صحابہ کے درمیان مسائل میں اختلاف تھا، مگر وہ کوئی اہم بات نہیں تھی، خطرناک اختلاف عقائد کا اختلاف ہے، اور جو مشہور حدیث ہے کہ بنی اسرائیل کے بہتر فرقے ہوئے اور میری امت کے تہتر فرقے ہونگے ایک فرقہ جنت میں جائے گا باقی سب جہنم رسید ہونگے (مشکوۃ حدیث ۱۷۱) اس میں عقائد کی بنیاد پر ہونے والے اختلاف کا بیان ہے، اور جو بہتر فرقے ناری ہیں اگر وہ اسلام کے دائرے سے نکل گئے

---

(۱) جاننا چاہئے کہ خیر القرون یعنی دور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین زمانہ کی چوڑائی میں بھی ساتھ ساتھ ہیں اور لمبائی میں بھی۔ زمانہ کی لمبائی کو تو ہر شخص سمجھتا ہے کہ صحابہ کا دور ختم ہوا تو تابعین کا دور شروع ہوا، وہ ختم ہوا تو تبع تابعین کا دور شروع ہوا، مگر زمانہ کی چوڑائی میں بھی یہ تینوں ادوار ساتھ ساتھ چلتے تھے، کیونکہ صحابی وہ ہے جس نے حالتِ ایمان میں آنحضور ﷺ کی زیارت کی ہے، اور ایمان ہی پر اس کی وفات ہوئی ہے، اور حضور کے زمانہ میں سارے جزیرۃ العرب میں ایمان پھیل گیا تھا مگر جتنے لوگ مسلمان ہوئے تھے سب نے حضورؐ کی زیارت نہیں کی تھی، جس کی قسمت میں یہ سعادت تھی اس نے آپؐ کی زیارت کی تھی، پھر کوئی صحابی مثال کے طور پر سفر کرتے ہوئے کسی قبیلہ سے گذرا یا زکوۃ وصول کرنے کے لئے، یا گورنر بن کر گیا اور وہاں کے مسلمانوں نے اس کو دیکھا تو وہ تابعی بن گئے، یہ تابعی بھی حضور ﷺ کے زمانہ میں تھے، اور بعض مسلمان ایسے بھی تھے جنھوں نے کسی صحابی کو بھی نہیں دیکھا تھا بلکہ ان لوگوں کو دیکھا تھا جنھوں نے کسی صحابی کو دیکھا تھا، پس یہ تبع تابعی ہوئے، اور ایسے بھی مسلمان تھے جنھوں نے کسی تابعی کو بھی نہیں دیکھا تھا بلکہ تبع تابعین کو دیکھا تھا ان کا شمار چوتھے قرن میں ہوگا۔ اور فضیلت تین قرنوں کے لئے ہے، چوتھے قرن کے لئے کوئی فضیلت نہیں۔

(۲) یہ حکم استقرائی ہے، استقراء کے معنی ہیں: جائزہ لینا، پھر استقراء کی دو قسمیں ہیں: استقراء تام اور استقراء ناقص، استقراء تام قطعی ہوتا ہے، اور استقراء ناقص ظنّی، اور استقراء تام وہاں ہوتا ہے جہاں کسی کلی کے سارے افراد منقضی (ختم) ہو جائیں، اور جس کلی کے افراد مسلسل چل رہے ہوں اس کا استقراء تام نہیں ہوسکتا۔

جیسے ۱۱۰ ہجری میں صحابہ کا دور ختم ہوگیا، تب محدثین نے تمام صحابہ کی روایات کا جائزہ لیا تو یہ بات سامنے آئی کہ کسی صحابی نے جان بوجھ کر کسی روایت میں گڑ بڑ نہیں کی، اس لئے قاعدہ بنا دیا: **الصحابةُ کلُّهم عُدول**: سب صحابہ نقلِ دین میں قابل اعتماد ہیں، یہ ضابطہ استقراء تام سے بنا ہے اس لئے قطعی ہے، اسی طرح یہ بات کہ صحابہ میں عقائد میں اختلاف نہیں ہوا، استقراء تام سے کہی گئی ہے، اس لئے قطعی ہے۔

ہیں تو وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، اور اگر وہ اسلام کے سرکل کے اندر ہیں تو وہ اپنے غلط عقائد کا خمیازہ بھگتنے کے لئے جہنم میں جائیں گے، پھر ان کی نجات ہوگی۔

بہر حال صحابہ کے دور تک عقائد میں اختلاف نہیں ہوا، تابعین کے دور سے عقائد میں اختلاف شروع ہوا، اور سب سے پہلے دو فرقے وجود میں آئے: شیعہ اور خوارج، یہ دونوں فرقے سیاسی عوامل سے وجود میں آئے تھے، پھر انھوں نے مستقل مذہبی حیثیت اختیار کرلی۔

شیعہ فرقے کا تعارف:

شیعہ کے معنی ہیں: متبعین، پارٹی، اور اصطلاح میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پارٹی کو شیعہ کہا جاتا ہے، یہ پارٹی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہیں بنائی تھی، بلکہ ان کے نام پر بنائی گئی تھی، اور اس کے پیچھے سیاسی عوامل کارفرما تھے۔ پھر ان میں سے جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں غلو کیا وہ روافض کہلائے۔ رَفَض کے معنی ہیں: چھوڑنا، ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ آنحضور ﷺ کے بعد صرف چھ صحابہ مسلمان باقی رہے باقی سب مرتد ہوگئے، اس لئے وہ لوگ روافض کہلائے، پس شیعہ اور روافض کے درمیان عام خاص مطلق کی نسبت ہے، شیعہ عام ہے اور روافض خاص، ہر شیعہ کے لئے رافضی ہونا ضروری نہیں مگر ہر رافضی شیعہ ضرور ہوتا ہے اور فرقہ امامیہ شیعہ بھی ہے اور رافضی بھی۔

فرقہ امامیہ کے بنیادی عقیدے دو ہیں:

۱- حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بلافصل ہیں اور تین خلفاء کی خلافت صحیح نہیں، ان کے نزدیک وہ غاصب تھے، جبکہ اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ چار خلفاء جس ترتیب سے ہوئے ہیں اسی ترتیب سے خلافتیں برحق ہیں۔

۲- آنحضور ﷺ پر وحی منقطع نہیں ہوئی، آپؐ کے بعد بھی بارہ اماموں تک وحی جاری رہی اور ان پر تشریعی وحی بھی آتی رہی، اور ان کی وحی سے آنحضور ﷺ کی وحی منسوخ ہوسکتی ہے، مگر وہ امام پر نبی کا اطلاق نہیں کرتے، جبکہ اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت ﷺ خاتم النبیین ہیں، اور وحی نبوت کے خواص ولوازم میں سے ہے، اس لئے وحی کا سلسلہ بھی آپؐ پر ختم ہوگیا۔

خوارج کا تعارف:

جنگ صفین میں حضرت علیؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو، اور حضرت معاویہؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو حَکَم بنایا پھر فیصلہ میں حضرت عمروؓ نے چال چلی تو دونوں طرف کے کچھ لوگوں نے فیصلہ کی مخالفت کی اور کہا: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ﴾: اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں، یعنی پنچایت بٹھانا جائز نہیں، اور علی اور معاویہ حکم بنانے کی وجہ سے کافر ہوگئے جبکہ اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ اختلاف میں حکم بنانا اور فیصلہ سونپنا جائز ہے۔ بنو قریظہ کے معاملہ میں آنحضور ﷺ نے اور

بنوقریظہ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو حکم بنایا تھا۔

خوارج کے بنیادی عقائد:

۱-حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ، اصحابِ جمل وصفین یعنی جنگ جمل اور جنگ صفین کے شرکاء اور حکمین یعنی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ اور وہ سب لوگ جو تحکیم پر راضی تھے یا آج ہیں وہ سب کافر ہیں۔

۲-اسلامی حکومت کا سربراہ اگر ظالم وجابر ہو تو بغاوت واجب ہے۔

۳-مرتکب کبیرہ کافر ہے، یعنی جس نے کسی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا اور توبہ کئے بغیر مر گیا تو وہ کافر ہے، وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

معتزلہ کا تعارف:

شیعہ اور خوارج کے علاوہ ایک فرقہ معتزلہ کا ہے، جس کا تذکرہ آپ نے شرح عقائد میں پڑھا ہے، اس کا بانی واصل بن عطاء ہے جو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا شاگرد تھا[1]، اس فرقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ مرتکب کبیرہ نہ کافر ہے نہ مؤمن، بلکہ دونوں کے بیچ کا بیچولیا ہے۔

اس فرقہ کا دوسرا نام قدریہ ہے، یعنی منکرینِ تقدیر، اور ان کا یہ نام حدیث میں آیا ہے۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: القدريَّةُ مجوسُ هذه الأمة: قدریہ (منکرین تقدیر) اس امت کے مجوسی ہیں، اور ان کو مجوسی اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ بندے اپنے اعمال اختیاریہ کے خود خالق ہیں، پس انھوں نے بھی مجوس کی طرح دو خدا مانے، مجوس دو خدا کے قائل ہیں، خیر کا خالق یزداں کو اور شر کا خالقِ اہرمن کو مانتے ہیں، اسی طرح قدریہ (معتزلہ) بھی دو خدا مانتے ہیں: اللہ تعالیٰ کو اور بندوں کو، اس لئے ان کو اس امت کا مجوسی قرار دیا ہے۔

معتزلہ کے بنیادی عقائد

۱-صفات باری تعالیٰ کا انکار: اللہ تعالیٰ کی صفات دو طرح کی ہیں: ایک: وہ صفات ہیں جن کی مخلوق سے مشابہت

(۱) واصل بن عطاء (۸۰-۱۳۱ھ) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ (۲۱-۱۱۰ھ) کا شاگرد تھا، ایک مرتبہ حضرت حسن بصریؒ سے کسی نے سوال کیا کہ ہمارے زمانہ میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہے اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ کوئی گناہ مضر نہیں، آپ بتائیں کہ ہم کس کی بات مانیں؟ حضرت حسن بصریؒ سوچنے لگے، اتنے میں واصل بن عطاء جو حضرت حسنؒ کے درس میں شریک تھا بول پڑا کہ مرتکب کبیرہ نہ مؤمن ہے نہ کافر، اس طرح اس نے ایمان وکفر کے درمیان واسطہ ثابت کیا، جس پر حضرت حسنؒ نے فرمایا: اعْتَزَلَ عَنَّا: یہ ہماری جماعت (اہل حق) سے علاحدہ ہو گیا چنانچہ اسی روز سے واصل بن عطاء اور اس کے متبعین کو معتزلہ کہا جانے لگا یعنی اہل حق سے علاحدگی اختیار کرنے والا فرقہ (شرح عقائد)

نہیں، جیسے اللہ ایک ہیں، اللہ بے نیاز ہیں۔ دوسری: وہ صفات ہیں جو مخلوق سے مشابہت رکھتی ہیں جیسے اللہ سنتے ہیں، اللہ دیکھتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ہے، اللہ کا چہرہ ہے، اللہ رات کے آخری حصہ میں سمائے دنیا پر اترتے ہیں اور ہم بھی سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، ہمارا بھی ہاتھ ہے، چہرہ ہے اور ہم بھی اوپر سے نیچے اترتے ہیں، پس جو صفتیں مخلوق کے مشابہ نہیں وہ تو زیر بحث نہیں آئیں مگر جو صفتیں مخلوق کی صفات کے مشابہ ہیں وہ زیر بحث آئیں کہ ان صفات کا کیا مطلب ہے؟

صفات کے تعلق سے مختلف فرقے وجود میں آئے:

اور صفات متشابہات میں اختلاف کی وجہ سے مختلف فرقے وجود میں آئے:

۱- معتزلہ نے صفات باری تعالیٰ کا انکار کر دیا مگر صاف انکار نہیں کیا، بلکہ یہ کہا کہ اللہ کی صفات اللہ کی ذات کا عین ہیں یعنی صفاتِ باری کا نہ الگ کوئی مفہوم ہے نہ وجود، اللہ کی ذات ہی ان کی صفات کا منبع ہے، قرآن کے قدیم وحادث ہونے کا مسئلہ اسی پر متفرع ہے۔

اور مُعَطِّلَة نے گول مول صفات کا انکار نہیں کیا، بلکہ صاف کہا کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ متشابہات نہیں ہیں، کیونکہ ان سے اللہ تعالیٰ کا مخلوق کے مشابہ ہونا لازم آتا ہے درانحالیکہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی مشابہت سے پاک ہیں، پس انھوں نے اللہ تعالیٰ کو صفات سے معطّل کر دیا، اس لئے وہ معطلہ (اسم فاعل) کہلائے، اور یہ بھی معتزلہ ہی کا فرقہ ہے۔

ان کے برخلاف مُجَسِّمَة اور مُشَبِّهَة نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ہماری طرح جسم ہے، ہاتھ، پیر اور چہرہ ہے اور ان کی صفات مخلوق کی صفات کی طرح ہیں (مجسّمة اور مشبهة دونوں اسم فاعل واحد مؤنث ہیں یعنی اللہ کے لئے جسم ماننے والے اور اللہ کو مخلوق کے مشابہ قرار دینے والے) اور اہل السنہ والجماعہ کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو صفتیں قرآن وحدیث میں آئی ہیں: وہ سب صفتیں اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں مگر وہ مخلوق کی صفات کی طرح نہیں، رہی یہ بات کہ اللہ کی یہ صفات کیسی ہیں؟ تو اہل السنۃ نے کہا: ہم ان کی کیفیت نہیں جانتے، بس بالاجمال یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔

معتزلہ کے باقی عقائد:

۲- رویت باری تعالیٰ کا انکار: کیا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا ممکن ہے؟ معتزلہ اس کا انکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رویت باری تعالیٰ نہ دنیا میں ممکن ہے نہ آخرت میں بلکہ خود اللہ تعالیٰ بھی اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتے، اور اہل السنۃ والجماعہ کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں تو رویت باری تعالیٰ محال ہے اور یہ محال عقلی نہیں، محال عادی ہے، اور آخرت میں رویت باری تعالیٰ نہ صرف یہ کہ ممکن ہے بلکہ واقعی ہے، جنتی اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔

۳- کلام اللہ حادث ہے: اور جب کلام اللہ حادث ہے تو قرآنِ کریم میں جتنے اوامر ونواہی اور اخبار ہیں وہ سب حادث ہیں، ازل سے یہ امور طے نہیں، معتزلہ تقدیر الٰہی کے منکر ہیں۔

۴-بندے اپنے افعال اختیاریہ کے خود خالق ہیں، اسی وجہ سے ان کو مجوسی کہا گیا ہے۔

۵-کوئی چیز ازل سے طے نہیں، بلکہ معاملہ اچھوتا ہے، جب حادثات وواقعات رونما ہوتے ہیں تو اللہ کو بھی پتا چلتا ہے اور بندوں کو بھی۔ اسی عقیدے کی وجہ سے مسلمانوں نے ان کا نام قدریہ رکھا ہے۔ یعنی تقدیر کے منکر۔

۶-مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہے مگر کافر نہیں، بلکہ بیچ کے درجہ میں ہے۔ اور یہ مسئلہ ایمان کی بساطت وترکیب پر متفرع ہے۔

۷-اللہ پر عدل (انصاف کرنا) واجب ہے، یعنی اطاعت گذار بندوں کو ثواب دینا اور گنہ گار بندوں کو سزا دینا واجب ہے کیونکہ یہی عدل کا تقاضہ ہے، اسی طرح اچھی بات کا حکم دینا اور بری بات سے روکنا بھی واجب ہے۔ انھوں نے اپنا نام أصحاب العدل و التوحید رکھا ہے۔ اللہ پر عدل واجب کیا اس لئے عدل والے ہوئے، اور صفات کا انکار کیا اس لئے موحد ہوئے۔

۸-عقل کو نقل پر بالادستی حاصل ہے: عقل ونقل میں تعارض ہوجائے تو بالادستی کس کو حاصل ہے عقل کو یا نقل کو؟ معتزلہ کے نزدیک ایسی صورت میں عقل کو بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں: قرآن وحدیث کی جو باتیں ہماری عقل قبول کرے ان باتوں کو ہم تسلیم کریں گے، اور جو باتیں عقل کی سمائی میں نہ آئیں وہ اگر قرآن کی باتیں ہیں تو تاویل کرتے ہیں اور احادیث کو ضعیف بتا کر دامن جھٹک لیتے ہیں، اور اہل السنۃ والجماعہ کا عقیدہ ہے کہ جو بات قرآن میں آئی ہے یا صحیح حدیث سے ثابت ہے اس کو ماننا ضروری ہے، خواہ عقل کی سمائی میں آئے یا نہ آئے۔

۹-قرآن کے مخلوق ہونے کا عقیدہ: کلام بھی اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے، سب سے پہلے یہ صفت زیر بحث آئی، اور اسی مسئلہ کی وجہ سے علم التوحید والصفات کا نام علم کلام پڑ گیا۔ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾: اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے کلام فرمایا، تکلیماً: مفعولِ مطلق تاکید کے لئے ہے، اس میں کوئی تاویل نہیں ہوسکتی، پس اللہ تعالیٰ کے لئے صفتِ کلام ثابت ہوئی، اور اس صفت کا پیکر محسوس قرآنِ کریم ہے، دیگر صفات کا کوئی پیکر نہیں، جیسے اللہ تعالیٰ سمیع ہیں تو اس کی کوئی نظر آنے والی صورت نہیں یہی حال بصیر کا ہے، اس کا بھی کوئی پیکر محسوس نہیں، مگر صفتِ کلام کا پیکر محسوس ہے اس لئے یہ صفت زیر بحث آئی۔

معتزلہ نے کہا: قرآن اگرچہ اللہ کا کلام ہے، مگر یہ قدیم نہیں، حادث ہے، اور ان کے نزدیک صفتِ کلام کا مطلب کسی محل میں کلام پیدا کرنا ہے، قرآن بھی اللہ تعالیٰ قاری کی زبان پر پیدا کرتے ہیں، اس لئے وہ مخلوق (حادث) ہے۔

اور اہل السنۃ والجماعہ نے کہا: قرآنِ کریم چونکہ اللہ کی صفتِ کلام کا پیکر محسوس ہے، اس لئے وہ قدیم اور غیر مخلوق ہے۔ اگر قرآن حادث ہوگا تو اللہ کی صفتِ کلام کا حادث ہونا لازم آئے گا، اور اللہ کی کوئی صفت حادیث نہیں ہوسکتی، ورنہ اللہ تعالیٰ کا محلِ حوادث ہونا لازم آئے گا، جو باطل ہے۔

اہل حق کی دو جماعتیں: اشاعرہ اور ماتریدیہ:

۱-اشاعرہ: کے سرخیل امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ ہیں۔ آپ صحابی رسول حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی نسل سے ہیں، اس وجہ سے اشعری کہلاتے ہیں۔ آپ سن ۲۶۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے، والد صاحب کا بچپن میں انتقال ہوگیا تھا، والدہ نے اس وقت کے مشہور متکلم اور مذہب اعتزال کے پر جوش داعی ابوعلی جُبائی سے نکاح کرلیا، شیخ ابوالحسنؒ نے انہی کی آغوش میں تربیت پائی، ابوعلی جبائی کامیاب مدرس اور مصنف ضرور تھے مگر زبان وبیان پر خاص قدرت نہیں تھی، اور شیخ ابوالحسنؒ چرب زبان اور حاضر جواب تھے، ابوعلی جبائی مناظروں میں ان کو آگے بڑھا دیتے تھے، ظاہری قرائن بتلاتے تھے کہ وہ مذہب اعتزال کی حمایت واشاعت میں ابوعلی جبائی سے آگے نکل جائیں گے۔ مگر رب ذوالجلال کو ان سے قرآن وسنت کی اشاعت کا کام لینا تھا (ماخوذ از تاریخ دعوت وعزیمت)

چنانچہ وہ واقعہ پیش آیا جو آپ نے شرح عقائد میں پڑھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ ابوالحسن کو معتزلہ کے أصلح للعباد والے قاعدہ پر کچھ بے اطمینانی ہوئی، معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ بندوں کے حق میں جو مفید و بہتر کام ہو، اللہ تعالیٰ پر اس کا کرنا واجب ہے، شیخ کو اس اصول پر شرح صدر نہ تھا، چنانچہ انھوں نے اپنے مربی واستاذ ابوعلی جبائی سے پوچھا: آپ اُن تین بھائیوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں جن میں سے ایک مطیع وفرمانبردار مرا، دوسرا معصیت ونافرمانی میں مرا اور تیسرا احکام شرعیہ کا مکلّف ہونے سے پہلے ہی بچپن میں انتقال کرگیا؟ ابوعلی جبائی نے جواب دیا: پہلا جنت میں ثواب دیا جائے گا، دوسرا جہنم میں عذاب دیا جائے گا اور تیسرا نہ ثواب دیا جائے گا نہ عذاب۔

شیخ ابوالحسن اشعریؒ نے پوچھا: اگر تیسرا کہے کہ اے رب ذوالجلال! آپ نے مجھے مہلت کیوں نہ دی کہ میں بھی بڑا ہوکر آپ کے احکام پر عمل کرتا اور جنت میں داخل ہوتا، تو اللہ تعالیٰ کیا جواب دیں گے؟ ابوعلی جبائی نے **أصلح للعباد** کے اصول سے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ اس سے کہیں گے: مجھے معلوم تھا کہ تو بڑا ہوکر نافرمانی کرتا، اس لئے تیرے حق میں بہتر یہی تھا کہ تو بچپن ہی میں مرجائے، شیخ نے پوچھا: اگر دوسرا یہ سوال کرے کہ اے رب! آپ نے مجھے بچپن ہی میں کیوں نہ ماردیا تاکہ میں نہ آپ کے احکام کا مکلّف ہوتا اور نہ عاصی ونافرمان بن کر جہنم میں جاتا، تو اللہ تعالیٰ کیا جواب دیں گے؟ ابوعلی جبائی کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا، وہ لاجواب ہوگیا، پس شیخ ابوالحسن سمجھ گئے کہ معتزلہ کی باتیں صرف ذہانت کی باتیں ہیں، حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں، چنانچہ اسی دن سے شیخ کی طبیعت میں اعتزال کے خلاف ردعمل شروع ہوا، بالآخر انھوں نے جامع مسجد کے منبر سے برملا اعلان کیا کہ میں اب تک معتزلی تھا، میرے یہ یہ عقائد تھے، اب میں ان سے توبہ کرتا ہوں، اور آئندہ میرا کام اعتزال کی تردید اور ان کی کمزوریوں کو ظاہر کرنا ہوگا۔

۲-ماتریدیہ: کے سرخیل امام ابومنصور ماتریدی (متوفی ۳۳۳ھ) ہیں، ماتُرید: ماوراء النہر کی ایک بستی ہے، آپ نے بھی معتزلہ کے جو عقائد قرآن وسنت کے خلاف تھے ان کو برملا ظاہر کیا اور ان کی پرزور تردید کی اور حدیث وسنت کے

بیان کردہ اور جماعت صحابہ کے اختیار کردہ طریق کی حمایت واشاعت میں لگ گئے، شیخ ابومنصور ماتریدی فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے اور شیخ ابوالحسن شافعی، اس وجہ سے اصول وعقائد میں شوافع عموماً اشعری ہوتے ہیں، اور احناف ماتریدی، اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان بارہ مسائل میں اختلاف ہے جوسب فروعی (غیر اہم) مسائل ہیں۔ بنیادی کسی مسئلہ میں اختلاف نہیں، ان بارہ مسائل کو علامہ احمد بن سلیمان معروف بہ ابن کمال پاشا رحمہ اللہ (متوفی ۹۴۰ھ) نے ایک رسالہ میں جمع کیا ہے، وہ رسالہ رحمۃ اللہ الواسعہ جلد اول کے شروع میں بعینہٖ شائع کیا گیا ہے، اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

ان دونوں جماعتوں کو سب سے پہلے صفتِ کلام کی بحثوں سے واسطہ پڑا، معتزلہ نے یہ مسئلہ چھیڑ رکھا تھا، وہ چونکہ صفات باری کے منکر تھے، صفات کو عینِ ذات مانتے تھے یا ان کی تاویل کرتے تھے، اس لئے انھوں نے قرآنِ پاک کو اللہ کی صفت اور قدیم ماننے سے انکار کیا، اور کلام اللہ کو حادث کہا، متکلمین نے دیگر صفاتِ متشابہات کی طرح صفتِ کلام کی کلام نفسی سے تاویل کی، جو اہل السنہ کے امام حضرت احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو پسند نہ آئی، انھوں نے بغیر تاویل کے کلام اللہ کو اللہ کی صفت قرار دیا اور اس کو قدیم کہا، اس طرح ان کا الگ مسلک وجود میں آیا۔

اہل حق کی تیسری جماعت حنبلی (سلفی) کیسے وجود میں آئی؟

سلفیت بھی اشعریت وماتریدیت کی طرح اہل السنۃ کا ایک مکتب فکر ہے۔ اس کا امتیاز صفات میں تاویل نہ کرنا ہے، امام مالک اور سفیان بن عیینہ وغیرہ سے دریافت کیا گیا کہ استوی علی العرش کے کیا معنی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: اس کے معنی تو ہر کوئی جانتا ہے، ہاں اس کی کیفیت کوئی نہیں جانتا، اور اللہ کے عرش پر استوی کی جو بھی کیفیت ہے اس کو بغیر سمجھے ماننا ضروری ہے، یہی ایمان بالغیب ہے، اور اس سلسلہ میں کھود کرید کرنا بدعت ہے، سلف (صحابہ وتابعین) نے اس سلسلہ میں سوال نہیں کیا، بغیر کیفیت جانے ان کا ایمان مکمل تھا، پھر آج تم کیوں اس کے چکر میں پڑے ہو!

یہی سلفیت ہے، تنزیہ مع التفویض ہی سلف کا مسلک تھا۔ پھر جب معتزلہ نے صفتِ کلام کا مسئلہ چھیڑا، تو امام اہل السنہ حضرت احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ٹھیک یہی بات کہی کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور قدیم ہے۔ تفصیل کچھ نہیں! مگر ظاہر ہے کہ ایسی مجمل بات عقل کے سورماؤں کو مطمئن نہیں کرسکتی تھی، بے پینڈے کے لوٹے لڑھک جاتے ہیں، ان بیمار ذہنوں کے لئے خلف (اشاعرہ اور ماتریدیہ) نے تاویل کی راہ اختیار کی، یہ بھی درست راہ تھی، خود امام احمد رحمہ اللہ نے صفات کی بعض حدیثوں کی تاویل کی ہے۔

نوٹ: شروع میں امام احمد رحمہ اللہ کی کلامی اور فقہی رایوں کو حنبلیت کہا جاتا تھا، پھر یہ اصطلاح فقہی آراء کے لئے خاص ہوگئی، اور کلامی مسائل کے لئے سلفیت کی اصطلاح چل پڑی، مگر آج کی سلفیت امام احمد کی سلفیت سے مختلف ہے، آج کے سلفی تو تجسیم کی طرف مائل ہوگئے ہیں، اور یہ تبدیلی امام احمدؒ کے فوراً بعد آئی تھی، اور اسی کا خمیازہ امام بخاری رحمہ اللہ کو بھگتنا پڑا تھا، تفصیل مقدمہ میں گذری ہے۔

فرقہ مرجئہ کا تعارف:

مُرْجِئَۃ: اِرْجاء (باب افعال) سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں: مؤخر کرنا، پیچھے کرنا۔ اس فرقہ کا بانی کون ہے؟ یہ بات مشخص طور پر معلوم نہیں۔ اس فرقہ کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ طاعات تو مفید ہیں، مگر معاصی مضر نہیں! ان کا یہ قول ایمان کی تفسیر پر مبنی ہے، ان کے نزدیک ایمان صرف تصدیق قلبی کا نام ہے، اعمال اس کی حقیقت میں داخل نہیں، اور نجات کا مدار ایمان پر ہے، اس لئے طاعات تو مفید ہیں مگر معاصی مضر نہیں، مرتکب کبیرہ کی بھی مغفرت ہوجائے گی۔

مرجئہ ختم نہیں ہوئے:

آج غور کیا جائے تو اکثر مسلمانوں کا یہی حال ہے، انھوں نے ایمان پر تکیہ کر رکھا ہے، وہ اعمال صالحہ کو تو مفید سمجھتے ہیں، مگر معاصی سے ان کو قطعاً باک نہیں، نماز نہیں پڑھتے جو دین کا بنیادی ستون ہے، اور ہر برائی بے دھڑک کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ جنت ہمارے باپ کی جاگیر ہے، اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہیں، وہ ہمیں بال بال بخش دیں گے۔

اسلامی فرقے پانچ ہیں اور اختلاف کی بنیادیں چار ہیں:

ان کے علاوہ اور بھی بہت فرقے ہیں۔ علامہ مقریزی نے جو بہت بڑے مؤرخ ہیں لکھا ہے کہ اسلامی فرقے پانچ ہیں: اہل السنۃ والجماعۃ، شیعہ، خوارج، معتزلہ اور مرجئہ اور اختلاف کی بنیادیں چار ہیں: ۱- صفاتِ باری تعالیٰ کا اثبات وانکار ۲- جبر وقدر کا مسئلہ یعنی انسان مجبور محض ہے یا اپنے افعال اختیاریہ کا کسی درجہ میں اختیار رکھتا ہے؟ ۳- عقائد واعمال کا باہمی ارتباط کیا ہے؟ یعنی عقائد واعمال کے درمیان کوئی جوڑ ہے یا وہ بالکل ایک دوسرے سے الگ ہیں؟ ۴- اور بوقت تعارض بالادستی عقل کو حاصل ہے یا نقل کو؟ یہ چار بنیادیں ہیں جن پر اختلاف کا مدار ہے۔

فرقوں کے تعارف میں، خاص طور پر معتزلہ کے تعارف میں درازنفسی کی وجہ:

ایمان کی ترکیب وبساطت کی بحث سمجھنے کے لئے اسلامی فرقوں کا اتنا مفصل تعارف ضروری نہیں تھا۔ مگر چونکہ ابن ماجہ میں بھی ان فرقوں کا ذکر آئے گا، اس لئے درازنفسی سے کام لیا گیا۔ امید ہے کہ یہ باتیں آپ حضرات کے لئے مفید ہی ثابت ہونگی۔ اب ہم اصل مسئلہ کو لیتے ہیں۔ ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ مرکب ہے یا بسیط؟ اقوال وافعال ایمان کی ماہیت میں داخل ہیں یا نہیں؟ اور ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، اور بنیادی اقوال دو ہیں، اس لئے ایمان کی تعریفیں بھی دو ہیں:

ایمان کی پہلی تعریف:

ماتریدیہ اور جمہور محققین صرف تصدیق قلبی کو ایمان قرار دیتے ہیں، اور سرخسی، بزدوی اور بعض دیگر احناف تصدیق

قلبی اور اقرار لسانی کے مجموعہ کو ایمان کہتے ہیں، اور امام اعظم رحمہ اللہ نے الفقہ الاکبر[1] میں لکھا ہے: الإیمان هو الإقرار والتصدیق: لیکن امام اعظمؒ نے اس کی صراحت نہیں کی کہ اقرار: شرط ہے یا شطر، یعنی اقرار: ایمان کا حقیقی جزء ہے یا اضافی؟ محققین کا خیال ہے کہ اضافی جزء ہے، دنیا میں کسی کو مسلمان قرار دینے کے لئے اقرار ضروری ہے، ورنہ ایمان بسیط ہے اس کا کوئی جزء نہیں، پس ماتریدیہ کی تعریف میں اور سرخسی اور بزدوی کی تعریف میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ مؤمن ہونے کے لئے جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان تمام چیزوں کو دل سے مان لینے کا نام ایمان ہے، حدیث جبرئیل میں ہے کہ ایمان یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کو، اس کے فرشتوں کو، اس کی کتابوں کو، اس کے رسولوں کو، اس دنیا کے آخری دن کو اور بھلی بری تقدیر کو مانیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ ایمان صرف تصدیق قلبی کا نام ہے۔ کیونکہ حدیث میں ایمان کا صلہ ب آیا ہے اور اس صورت میں ایمان کے معنی تصدیق یعنی یقین کرنے کے ہوتے ہیں، اور اس حدیث میں مذکور چھ چیزیں جن کے ماننے کو ایمان قرار دیا گیا ہے مُؤْمَن به اور مُصَدَّق به کہلاتی ہیں، اس کی دوسری مختصر تعبیر الإیمانُ بماجاء به الرسول بھی ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی تمام تعلیمات کو دل سے مان لینے کا نام ایمان ہے، اگر ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی دل سے نہیں مانا تو وہ مؤمن نہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص ایمان لانے کے بعد مُؤْمن به میں سے کسی ایک چیز کا بھی دل سے انکار کردے تو وہ بھی مؤمن نہیں رہے گا، کافر ہوجائے گا۔

بساطتِ ایمان کی دلیلیں:

اور ایمان کے بسیط ہونے کی پہلی دلیل یہ ہے کہ متعدد آیتوں میں دل کو ایمان کا محل قرار دیا ہے، مثلاً: ﴿أُولٰئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الإِيْمَانَ﴾: یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان ثابت فرمایا [المجادلة ۲۲] اور یہ بات ظاہر ہے کہ دل میں صرف تصدیق پائی جاتی ہے پس وہی ایمان ہے۔

(۱) دورِ اول میں علم الکلام اور علم الفقہ ایک ساتھ تھے، اور دونوں کے مجموعے کو فقہ کہتے تھے، پھر علم کلام کو الفقہ الاکبر اور مسائل کو صرف فقہ کہنے لگے، پھر جب صفت کلام کی بحث شروع ہوئی تو عقائد کے مجموعہ کا نام علم الکلام پڑگیا، جیسے دورِ اول میں نحو وصرف ایک ساتھ تھے، دونوں کے مسائل ایک ساتھ بیان کئے جاتے تھے، الفیہ ابن مالک اور اس کی شرح ابن عقیل میں نحو وصرف کے مسائل ایک ساتھ ہیں، پھر جب دونوں کی تفصیلات بڑھیں تو نحو کو الگ فن کردیا اور صرف کو الگ، اسی طرح فقہ کی کتابوں میں عقائد ومسائل ایک ساتھ لکھے جاتے تھے جیسے مالا بد منہ میں پہلے اہل السنۃ والجماعہ کے عقائد کا بیان ہے پھر مسائل کا، اسی طرح بہشتی زیور میں پہلے پچاس عقیدے ہیں پھر مسائل شروع ہوئے ہیں، تعلیم الاسلام میں بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کی الفقہ الاکبر علم کلام کی کتاب ہے اور مطبوعہ ہے، اس کی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ بعض آیتوں میں ایمان کی دل کی طرف نسبت کی گئی ہے، یعنی ایمان کو دل کا فعل بتایا ہے، مثلاً: ﴿قَالُوْا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ﴾: وہ اپنے مونہوں سے کہتے ہیں: ہم ایمان لائے حالانکہ ان کے دلوں نے یقین نہیں کیا[المائدہ ۴۱] اس قسم کی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ ایمان دل کا فعل ہے اور دل کا فعل تصدیق ہے، پس وہی ایمان ہے۔

ایمان کی دوسری تعریف:

جمہور محدثین، اشاعرہ، معتزلہ اور خوارج کے نزدیک ایمان تین چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے یعنی تصدیق قلبی، اقرار لسانی اور عمل بدنی کا۔ ان حضرات نے بھی اپنے موقف کو قرآن وحدیث سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، پھر جب ان حضرات نے اعمال کو ایمان کا جزء قرار دیا تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوا کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں؟ اور تمام مؤمنین کا ایمان یکساں ہے یا متفاوت؟ کیونکہ اعمال متفاوت ہیں، پہلی جماعت کے نزدیک چونکہ اعمال: ایمان کا جز نہیں اس لئے انھوں نے کمی بیشی کا انکار کیا۔ اور کہا کہ ایک مؤمن کا ایمان اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا ایمان برابر ہے، اور تمام مؤمنین ایمان میں یکساں ہیں، کیونکہ اعمال: ایمان کا جز نہیں، اور نفس تصدیق میں کمی بیشی ممکن نہیں۔

اور اسی قول کی بنا پر احناف پر الزام لگا کہ یہ حضرات عمل کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، جیسے مرجئہ کہتے ہیں کہ اعمال صالحہ تو آخرت میں مفید ہونگے مگر اعمال سیئہ سے انسان کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا، مؤمنین کی تمام برائیاں معاف کردی جائیں گی، بلکہ بعض حضرات نے تو کھل کر امام اعظم رحمہ اللہ اور احناف کو مرجئہ کہہ دیا، حالانکہ امام اعظمؒ نے خود الفقہ الاکبر میں صراحت کی ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہماری نیکیاں تو مقبول ہیں اور ہماری برائیاں معاف ہیں جیسے مرجئہ کہتے ہیں[1]، اور دوسری جگہ فرمایا ہے: آسمان والوں اور زمین والوں کا ایمان مؤمن بہ کے اعتبار سے بڑھتا گھٹتا نہیں، البتہ تصدیق ویقین کے اعتبار سے بڑھتا گھٹتا ہے، یعنی تصدیق ویقین میں شدت وضعف کے اعتبار سے کمی بیشی ہوتی ہے، ورنہ تمام مؤمنین ایمان وتوحید میں یکساں ہیں، صرف اعمال میں کمی بیشی ہوتی ہے[2]

پھر جب یہ مسئلہ سامنے آیا کہ مرتکب کبیرہ مؤمن ہے یا نہیں؟ تو معتزلہ اور خوارج نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ ایمان سے خارج ہے کیونکہ ایمان تین اجزاء سے مرکب ہے اور مرکب کا کوئی جز فوت ہوجائے تو مرکب باقی نہیں رہتا، پس جب عمل صالح نہ رہا کیونکہ اس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا تو وہ ایمان سے خارج ہوگیا، اور احناف نے مرتکب کبیرہ کو

(۱) الفقہ الأکبر کی عبارت: ولا نقول: إنّ حَسَنَاتِنَا مَقْبُوْلَةٌ وسَيِّئَاتِنَا مَغْفُورةٌ كقول المُرجئة۔

(۲) الفقہ الأکبر کی عبارت: إيمانُ أهلِ السَّمَاء والأرضِ لَايزيدُ ولا يَنْقُصُ من جِهَةِ اليقين والتَّصديقِ، والمُؤْمنون مُسْتَوُوْنَ في الإيمان والتوحيد، مُتَفَاضِلُوْن في الأعمال۔

مؤمن قرار دیا۔ اسی طرح اشاعرہ اور تمام محدثین نے بھی مرتکب کبیرہ کو مؤمن قرار دیا، ایمان سے خارج نہیں کیا اور جب ان سے پوچھا گیا کہ مرتکب کبیرہ مؤمن کیسے ہوسکتا ہے؟ ایمان تو مرکب ہے؟ یعنی اعمال ایمان کا جز ہیں پس عمل کے فوت ہونے سے ایمان فوت ہوجانا چاہئے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ اعمال ایمان کا اصل جزء نہیں، بلکہ تکمیلی اور تزئینی جزء ہیں، اس لئے ان کے نہ رہنے سے ایمان فوت نہ ہوگا۔

الغرض: اس جگہ محدثین نے معتزلہ وخوارج کا ساتھ چھوڑ دیا اور احناف کے ساتھ ہوگئے، پس واضح ہوگیا کہ محدثین نے اعمال کو جس ایمان کا جز قرار دیا ہے وہ ایمان کامل ہے، اور احناف نے جو اعمال کو ایمان کا جزء قرار نہیں دیا وہ نفس ایمان کا جز قرار نہیں دیا، اس طرح جب حقیقت کھلی تو معلوم ہوا کہ اہل حق کے درمیان اختلاف حقیقی نہیں صرف لفظی ہے[1] ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے: وَلِذَا ذَهَبَ الإمامُ الرازيُّ و كثيرٌ من المتكلمين إلى أنَّ هذا الخلافَ لفظيٌّ: اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے بھی اس کی صراحت کی ہے کہ یہ اختلاف لفظی ہے، البتہ معتزلہ اور خوارج کے ساتھ جو اختلاف ہے وہ حقیقی ہے[2]

فائدہ: احناف کے نزدیک چونکہ اعمال: ایمان کا جز نہیں، اس لئے انھوں نے کہا: إيماني كإيمان جبرئيل: میرا ایمان جبرئیلؑ کے ایمان کے مانند ہے! اور المُؤمنون مُسْتَوُوْن في الإيمان: تمام مؤمنین ایمان میں مساوی ہیں! اور

(۱) لفظی نزاع: کئی طرح کا ہوتا ہے، مثلاً دومختلف باتوں کا محکوم علیہ (وہ چیز جس پر حکم لگایا جائے) علاحدہ علاحدہ ہو جیسے زید کے دولڑکے ہوں: ایک عالم اور دوسرا جاہل، پس اگر کوئی کہے کہ زید کا لڑکا بڑا عالم ہے اور دوسرا کہے کہ جاہل ہے اور دونوں کے پیش نظر الگ الگ لڑکے ہوں تو یہ لفظی نزاع کہلائے گا، کیونکہ جب حقیقت حال کھلے گی کہ زید کے دولڑکے ہیں ایک عالم اور ایک جاہل تو جھگڑا ختم ہوجائے گا۔

یا مثلاً: ایک لفظ کے دو معنی ہوں، کسی کے پیش نظر ان میں سے ایک معنی ہوں اور دوسرے کے پیش نظر دوسرے معنی اور وہ آپس میں بحث کریں تو یہ محض لفظی نزاع ہے، جب حقیقت حال سامنے آئے گی کہ اس لفظ کے دو معنی ہیں تو جھگڑا ختم ہوجائے گا۔

یا ایک چیز کی دو قسمیں ہوں، کچھ حضرات کے پیش نظر ایک قسم ہو اور دوسرے لوگوں کے پیش نظر دوسری قسم اور آپس میں اختلاف کریں تو یہ بھی لفظی نزاع ہے (تسہیل ادلۂ کاملہ ص: ۱۰۸)

(۲) جاننا چاہئے کہ مرجئہ، کرامیہ اور جہمیہ کے نزدیک بھی ایمان بسیط ہے، مگر ان کے درمیان بھی اختلاف ہے:

۱- مرجئہ کے نزدیک: ایمان کی حقیقت و ماہیت صرف تصدیق قلبی ہے، اقرار لسانی اور اعمال نہ ایمان کے لئے رکن ہیں نہ شرط، نہ اجزائے مقوّمہ نہ اجزائے مکملہ۔ بلکہ اعمال ایمان سے بے تعلق ہیں، بدعملی سے ایمان کی رونق میں کچھ فرق نہیں آتا نہ اس کا آخرت میں کوئی نقصان ہوگا۔

۲- اور جہمیہ کے نزدیک ایمان کی حقیقت صرف معرفت قلبی ہے، تصدیق ویقین بھی ضروری نہیں۔

۳- اور کرامیہ کے نزدیک صرف اقرار لسانی ایمان کی حقیقت ہے بشرطیکہ دل میں انکار نہ ہو۔

یہ کہنا اس لئے صحیح ہے کہ اعمال: ایمان کا جز نہیں اور نفس تصدیق میں کمی بیشی ممکن نہیں، اس لئے کہ تصدیق: مقولۂ کیف سے ہے نہ کہ مقولۂ کم سے۔ یعنی تصدیق ایک قلبی کیفیت کا نام ہے اور کیفیت میں شدت وضعف تو ممکن ہے، مگر کمی زیادتی ممکن نہیں، کمی زیادتی کمیات کا خاصہ ہے، کیفیت میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔

کمی زیادتی دوطرح سے ہوتی ہے: حقیقی اور مجازی، دو چیزوں کا عدد ومقدار میں متفاوت ہونا حقیقی کمی زیادتی ہے اور کیفیت یعنی شدت وضعف میں متفاوت ہونا مجازی کمی زیادتی ہے۔

حقیقی معنی کے اعتبار سے ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی، کیونکہ مؤمن بہ (جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے) محدود ومتعین ہیں، ان میں کمی بیشی کا امکان نہیں، البتہ کیفیت یعنی شدت وضعف کے اعتبار سے کمی بیشی ہونا ایسی بدیہی بات ہے کہ کوئی اس کا انکار نہیں کرسکتا۔

کیفیت میں تفاوت دو اعتباروں سے ہوتا ہے:

اول: مؤمَن بہ کی تصدیق کے اعتبار سے: کیونکہ یقین، یقین سب برابر نہیں، ایک ماؤشما کا یقین ہے اور ایک اولیاء کرام، انبیاء عظام اور فرشتوں کا یقین ہے ان سب یقینوں کو مساوی اور یکساں کوئی نہیں کہہ سکتا۔

دوم: اعمال کے اعتبار سے: اس اعتبار سے بھی مؤمنین کے درجات میں کمی بیشی ایک مسلّمہ حقیقت ہے، انبیاء کرام کا عمل اور ایک امتی کا عمل یکساں نہیں ہوسکتا، پھر امتیوں کے اعمال میں بھی حد درجہ تفاوت ہوتا ہے، لہٰذا اعمال کے اعتبار سے بھی مساوات کا دعوی نہیں کیا جاسکتا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کی بات سے غلط فہمی اور اس کا ازالہ:

امام اعظم رحمہ اللہ کی اس بات سے کہ تمام مؤمنین کا ایمان یکساں ہے، بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوگئی، جس کی وجہ سے امام صاحب نے اس کی وضاحت ضروری سمجھی، شرح الفقہ الاکبر میں ہے: امام اعظم رحمہ اللہ سے روایت کیا گیا کہ انھوں نے فرمایا: میرا ایمان حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ایمان کے مشابہ ہے، اور میں یہ نہیں کہتا کہ میرا ایمان جبرئیل علیہ السلام کے ایمان کے مانند ہے کیونکہ مثلیت (مانند ہونا) کے معنی ہیں: تمام صفات میں برابری اور مشابہت کے لئے یہ ضروری نہیں، بلکہ بعض اوصاف میں برابری کی بنا پر بھی مشابہ کہا جاسکتا ہے، بھلا ایسا کون شخص ہے جو ہر اعتبار سے افراد امت، ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کے ایمان کو برابر کہتا ہو؟![1]

---

(۱) رُوِی عن أبی حنیفةَ أنَّهُ قال: إیمانی کإیمانِ جبرئیل علیه السلام، ولا أقولُ: مِثلَ إیمان جبرئیلَ لِأنَّ المِثْلِیَّةَ تَقْتَضِی المُسَاوَاة فی کل الصِّفات، والتَّشْبِیْهُ لا یَقْتَضِیْهِ، بل یَکْفِیْ لإطلاقِه المُسَاوَاةُ فی بعضِه، فلا أحدٌ یُسَوِّیْ بین إیمانِ آحادِ الناسِ وإیمانِ المَلائِکَةِ والانبیاء علیهم السلام من کل وجهٍ (بحوالہ ایضاح الادلہ ص:۱۷۷)

مگر امام صاحب رحمہ اللہ کی اس وضاحت کے بعد بھی بعض لوگ ان کی بات کو نہیں سمجھے اور وہ برابر امام اعظمؒ کے قول کے غلط معنی بیان کر کے حضرت کو بدنام کرتے رہے، اس لئے امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا: میں إیمانی کإیمان جبرئیل کہنا پسند نہیں کرتا بلکہ اس کی جگہ آمَنْتُ بما آمَنَ به جبرئیلُ علیه السلام کہنا پسند کرتا ہوں ـــــــ امام محمد رحمہ اللہ کا یہ ارشاد در حقیقت لوگوں کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے ہے، ورنہ دونوں قولوں کا مطلب ایک ہے۔

غرض: إیمانی کإیمانِ جبرئیل: کہنا حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہے، اور ائمہ ثلاثہ اور محدثین کے نزدیک جائز نہیں، اور یہ اختلاف ایمان کے مرکب وبسیط ہونے پر مبنی ہے، جو حضرات ایمان کو مرکب مانتے ہیں یعنی اعمال کو ایمان کا جز قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک مذکورہ جملہ جائز نہیں کیونکہ اعمال کے اعتبار سے تفاوت ہوتا ہے، اور ایمان کو بسیط قرار دینے والوں کے نزدیک جائز ہے اس لئے کہ مُؤْمَن بہ سب کے حق میں یکساں ہے۔

أنا مؤمن إن شاء الله کہنے کا حکم:

دوسرا مسئلہ یہ اختلافی ہے کہ أنا مؤمنٌ إن شاء الله: کہنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کی تین صورتیں ہیں: اگر زمانۂ حال میں تردد کی بنا پر إن شاء الله بڑھائے تو جائز نہیں، اور زمانۂ آئندہ پر نظر کر کے إن شاء الله بڑھائے تو ابن تیمیہؒ کے علاوہ سب کے نزدیک جائز ہے، صرف ابن تیمیہؒ عدم جواز کے قائل ہیں، اور اگر بطور تبرک بڑھائے تو بالاتفاق جائز ہے۔

سوال: جب ایمان مقولۂ کیف سے ہے اور اس میں کمی زیادتی نہیں ہوسکتی تو پھر مساوات کیسے ہوگی؟ مساوات تو انہی چیزوں میں ہوتی ہے جن میں کمی بیشی کا امکان ہوتا ہے۔ لہٰذا احناف کا یہ کہنا کہ تمام مؤمنین ایمان میں مساوی ہیں، کیونکر صحیح ہوسکتا ہے؟

جواب: ایمان میں اگرچہ بالذات مساوات نہیں ہوسکتی، مگر محل ایمان یعنی مُؤمن بہ کے اعتبار سے برابری ہوسکتی ہے، اور احناف نے مؤمن بہ کے اعتبار سے ہی مساوات کو ثابت کیا ہے۔

کبھی شرعی معنی لغوی معنی سے علاحدہ ہوتے ہیں اور کبھی ایک ہوتے ہیں:

شریعت مطہرہ کی جتنی اصطلاحات ہیں جیسے صلوۃ، زکوۃ وغیرہ: وہ الفاظ پہلے سے عربی زبان میں مستعمل ہوتے ہیں، اور ان کے لغوی معنی ہوتے ہیں، پھر شریعت ان کو اپنی اصطلاح بناتی ہے۔ اور جب شریعت کسی لفظ کو اپنی اصطلاح بناتی ہے تو اس کے لغوی معنی برقرار رکھ کر اس کو نئے معنی میں استعمال کرتی ہے اور وہ نئے معنی: معنی مرادی کہلاتے ہیں، جیسے لفظ صلوٰۃ کے لغوی معنی ہیں: دعاء اور اصطلاحِ شریعت میں صلوۃ نام ہے: افعال مخصوصہ اور اذکار مخصوصہ کے مجموعہ کا۔ یہ صلوٰۃ کے مرادی معنی ہیں اور زکوٰۃ کے لغوی معنی ہیں: صفائی ستھرائی اور اصطلاح شریعت میں زکوٰۃ نام ہے: مال کے مخصوص حصہ کا جو سال میں ایک مرتبہ غرباء کے لئے نکالا جاتا ہے، یہ زکوٰۃ کے مرادی معنی ہیں۔

اور کبھی لفظ کے جولغوی معنی ہوتے ہیں وہی قرآن وحدیث میں برقرار رہتے ہیں، جیسے تحریمها التکبیر: کَبَّرَ تکبیرًا (باب تفعیل) کے معنی ہیں: اللہ کی عظمت وبڑائی بیان کرنا۔ حدیث میں بھی یہی معنی ہیں، چنانچہ احناف کے نزدیک ہر ذکر مشعر تعظیم سے نماز شروع کرنا جائز ہے، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک خاص لفظ اللہ اکبر سے نماز میں داخل ہونا ضروری ہے، کسی اور لفظ سے نماز شروع نہیں ہوسکتی، صرف امام شافعی رحمہ اللہ الأکبر کی گنجائش رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں: خبر پر الف لام داخل کرنے سے معنی میں زیادتی ہوتی ہے، اس لئے وہ اللہ اکبر کے حکم میں ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نزول قرآن کے وقت تکبیر کے لغوی معنی تھے، سورۃ المدثر میں ہے: ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾: اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کر، اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ، اور بتوں کو لات مار، کیونکہ جب بتوں سے کنارہ کشی اختیار کی جائے گی تبھی اللہ کی عظمت وبڑائی ظاہر ہوگی۔

غرض نزول قرآن کے وقت تکبیر کے یہی معنی تھے، اور ائمہ ثلاثہ جو معنی لیتے ہیں یعنی اللہ اکبر کہنا: وہ عرفی معنی ہیں جو بعد میں پیدا ہوئے ہیں، ان کو نصوص میں مراد نہیں لیا جائے گا۔ جیسے فقہاء کی اصطلاحات: فرض وواجب وغیرہ نصوص میں مراد نہیں لی جاتیں کیونکہ وہ بعد میں پیدا ہوئی ہیں۔

پس لفظ کے مرادی معنی کے لئے قوی دلیل چاہئے جیسے قرآن وحدیث میں لفظ صلوٰۃ آیا ہے، وہاں صرف لغوی معنی مراد نہیں بلکہ شرعی معنی یعنی افعال مخصوصہ اور اذکار مخصوصہ مراد ہیں، کیونکہ بے شمار احادیث میں صلوٰۃ کے یہی معنی آئے ہیں، لیکن اگر معنی مرادی کی کوئی دلیل نہیں تو پھر لغوی معنی ہی مراد لیں گے۔

ایمان کے علاحدہ کوئی شرعی معنی نہیں:

اب یہ قاعدہ یہاں جاری کریں۔ ایمان باب افعال کا مصدر ہے، اس کا مجرد: أَمِنَ يَأْمَنُ أَمْنًا (از سمع) ہے، اور اس کے معنی ہیں: مطمئن ہونا، اور باب افعال کا ہمزہ یا توصیرورت کے لئے ہے یا تعدیہ کے لئے۔ اول صورت میں معنی ہونگے: امن والا ہونا، یعنی کسی کو سچا جان کر اور اس کی بات کو مان کر مطمئن ہوجانا۔ اور ثانی صورت میں معنی ہونگے: جَعْلُ الغیر آمناً: کسی کو امن والا بنانا، یعنی کسی کی تصدیق کرکے اس کو تکذیب سے مامون وبے خوف کردینا۔

قرآن وحدیث میں یہ لفظ باب افعال سے استعمال ہوا ہے اور اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ شریعت نے ایمان کے کوئی نئے معنی تجویز کئے ہیں۔ اور ابن ماجہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو حدیث مروی ہے: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: الإیمانُ معرفةٌ بالقلبِ، وقولٌ بِاللِّسانِ، وعَمَلٌ بِالأَرْكَانِ (حدیث نمبر ۶۵) یہ روایت حد درجہ ضعیف ہے، بلکہ علامہ ابن جوزیؒ نے اس کو موضوع قرار دیا ہے، اس کے ایک راوی عبدالسلام بن صالح ابوالصلت کے ضعف پر تقریباً محدثین کا اتفاق ہے، اور اس کے علاوہ دوسری کوئی دلیل نہیں ہے جو اس بات پر دلالت کرے کہ شریعت نے ایمان کے نئے معنی تجویز کئے ہیں، اور جب اس کی کوئی دلیل نہیں تو ایمان کے لغوی معنی ہی قرآن وحدیث میں مراد

لئے جائیں گے۔ اور وہ معنی ہیں: تصدیق کرنا، اور تصدیق قلب کا فعل ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ایمان بسیط ہے، البتہ دنیا میں کسی کو مسلمان قرار دینے کے لئے اقرار ضروری ہے، اور اعمال: ایمان کے تکمیلی اور تزئینی اجزاء ہیں یعنی ایمان کامل کے اجزاء ہیں، نفس ایمان کے اجزاء نہیں۔

ایمان کی حقیقت میں اختلاف کی وجہ:

آخری بات: حضرت استاذ الاستاذ شیخ الہند قدس سرہ نے ایک بہت ہی قیمتی بات فرمائی ہے، وہ بات درس بخاری میں ہے، جو صاحب فتح الملہم علامہ شبیر احمد عثانی قدس سرہ کی درسی تقریر ہے، جو ڈابھیل سے چھپی ہے اور صرف ایک جلد چھپی ہے، حضرتؒ نے فرمایا: ایمان کی حقیقت و ماہیت میں جو اختلاف ہوا ہے وہ اختلاف: نظر (دلائل) کا اختلاف نہیں ہے نہ ثمرہ (نتیجہ) کا اختلاف ہے بلکہ وہ مقتضیات مقام کا اختلاف ہے۔ محدثین کا مقابلہ مرجئہ سے تھا اور مرجئہ اعمال کی حیثیت گھٹاتے ہیں، وہ ایمان کے ساتھ اعمال سیئہ کو مضر نہیں مانتے اس لئے محدثین کے لئے ضروری تھا کہ وہ اعمال کو مثبت و منفی ہر پہلو سے ایمان کا جز بنائیں، چنانچہ انھوں نے ایسا کیا۔ اور حنفیہ کا مقابلہ معتزلہ سے تھا اور معتزلہ اعمال کو ایمان کا حقیقی جز مانتے تھے، اور اسی وجہ سے مرتکب کبیرہ کو ایمان سے خارج کرتے تھے، پس حنفیہ کے لئے ضروری تھا کہ وہ اعمال کو ایمان کا جز نہ بنائیں، تاکہ مرتکب کبیرہ ایمان سے نکل نہ جائے۔

پہلی بات بھی نہایت قیمتی ہے:

اور پہلے جو بات میں نے کہی ہے وہ بھی نہایت قیمتی ہے، وہ بات حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہ نے فرمائی ہے کہ کبھی شریعت کسی لفظ کو لے کر اپنی علاحدہ اصطلاح بناتی ہے اور لفظ کو نئے معنی میں استعمال کرتی ہے، جیسے صلوٰۃ اور زکوٰۃ وغیرہ کے شریعت نے الگ معنی تجویز کئے ہیں۔ اور کبھی لفظ کو اس کے لغوی معنی میں باقی رکھ کر استعمال کرتی ہے۔ پس جہاں مضبوط اور قوی دلیل ہو کہ شریعت نے لفظ کو نئے معنی میں استعمال کیا ہے تو وہاں وہی نئے معنی مراد لیں گے، اور جہاں ایسی کوئی دلیل نہ ہو، وہاں لغوی معنی ہی مراد ہونگے، اور لفظ ایمان کے شریعت نے کوئی نئے معنی تجویز کئے ہیں اس کی کوئی دلیل نہیں، سوائے ابن ماجہ کی روایت کے جو حد درجہ ضعیف یا موضوع ہے، لہٰذا قرآن وحدیث میں جہاں بھی لفظ ایمان آیا ہے وہ لغوی معنی ہی میں مستعمل ہے اور ایمان کے لغوی معنی ہیں: تصدیق کرنا، کسی کو سچا مان کر اس کی بات پر بھروسہ کرنا، اور یہ قلب کا فعل ہے پس ایمان کا بسیط ہونا ثابت ہوا۔

ایمان کی ترکیب پر محدثین کے دلائل صریح نہیں:

اور محدثین ایمان کے مرکب ہونے پر جو دلائل پیش کرتے ہیں، جیسے امام بخاریؒ نے اٹھارہ نصوص پیش کی ہیں، اور ان کے ذریعہ محدثین کے موقف کو ثابت کیا ہے، وہ صریح دلائل نہیں، ان میں تاویل کی گنجائش ہے۔

٢- كتاب الإيمان

بسم الله الرحمن الرحيم

[١-] بَابُ قَوْلِ النبىِّ صلى الله عليه وسلم: "بُنِىَ الإِسْلاَمُ عَلٰى خَمْسٍ" وَهُوَ قَوْلٌ وَفِعْلٌ، وَيَزِيْدُ وَيَنْقُصُ

[١-] قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿لِيَزْدَادُوْا إِيْمَانًا مَع إِيْمَانِهِمْ﴾[الفتح: ٤]

[٢-] ﴿وَزِدْنَاهُمْ هُدًى﴾[الكهف: ١٣]

[٣-] ﴿وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدُوْا هُدًى﴾[مريم: ٧٦]

[٤-] ﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ﴾[محمد: ١٧]

[٥-] ﴿وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِيْمَانًا﴾ [المدثر: ٣١]

[٦-] وَقَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ: ﴿أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهِ إِيْمَانًا؟ فَأَمَّا الَّذِيْن آمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ إِيْمَانًا﴾[التوبة: ١٢٤]

[٧-] وَقَوْلُهُ: ﴿فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيْمَانًا﴾[آل عمران: ١٧٣]

[٨-] وَقَوْلُهُ: ﴿وَمَا زَادَهُمْ إِلاَّ إِيْمَانًا وَتَسْلِيْمًا﴾[الأحزاب: ٢٢]

[٩-] والحُبُّ فِىْ اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِىْ اللّٰهِ مِنَ الإِيْمَانِ.

[١٠-] وَكَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ إِلٰى عَدِىِّ بْنِ عَدِىٍّ: إِنَّ لِلإِيْمَانِ فَرَائِضَ وَشَرَائِعَ وَحُدُوْدًا وَسُنَنًا، فَمَنِ اسْتَكْمَلَهَا اسْتَكْمَلَ الإِيْمَانَ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَكْمِلْهَا لَمْ يَسْتَكْمِلِ الإِيْمَانَ، فَإِنْ أَعِشْ فَسَأُبَيِّنُهَا لَكُمْ حَتّٰى تَعْمَلُوْا بِهَا، وَإِنْ أَمُتْ فَمَا أَنَا عَلٰى صُحْبَتِكُمْ بِحَرِيْصٍ.

[١١-] وَقَالَ إِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلاَمَ: ﴿وَلٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ﴾[البقرة: ٢٦٠]

[١٢-] وَقَالَ مُعَاذٌ: اجْلِسْ بِنَا نُؤْمِنْ سَاعَةً.

[١٣-] وَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ: الْيَقِيْنُ الإِيْمَانُ كُلُّهُ.

[١٤-] وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: لاَيَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِيْقَةَ التَّقْوٰى حَتّٰى يَدَعَ مَا حَاكَ فِىْ الصَّدْرِ.

[١٥-] وَقَالَ مُجَاهِدٌ ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهِ نُوْحًا﴾[الشورى: ١٣]: أَوْصَيْنَاكَ يَا مُحَمَّدُ وَإِيَّاهُ دِيْنًا وَاحِدًا.

[١٦-] وَقَالَ ابنُ عبَّاسٍ: ﴿شِرْعَةً وَمِنْهَا جًا﴾[المائدة: ٤٨]: سَبِيْلاً وَسُنَّةً.

[١٧-] و﴿دُعَاؤُكُمْ﴾ [الفرقان: ٧٧]: إِيْمَانُكُمْ.

تشریح:

امام بخاری رحمہ اللہ کے استدلالات شروع کرنے سے پہلے دو باتیں جان لینی چاہئیں:

پہلی بات: محدثین کرام ایمان کی ترکیب پر جتنے دلائل پیش کرتے ہیں ان میں سے کوئی دلیل صریح نہیں، اوران کا استدلال اس طرح ہے کہ نصوص سے ثابت ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے، اور ظاہر ہے کمی بیشی بربناء اعمال ہوتی ہے، پس اعمال کا جز ایمان ہونا اور ایمان کا مرکب ہونا ثابت ہوا —— اور فقہاء کے دلائل صریح ہیں کہ نصوص میں جگہ جگہ قلب کو ایمان کا محل قرار دیا ہے، اور قلب میں صرف تصدیق ہوتی ہے، پس ایمان کا بسیط ہونا ثابت ہوا۔

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے باب میں اٹھارہ نصوص پیش کی ہیں، اوران سے محدثین کے موقف پر استدلال کیا ہے وہ نصوص دو قسم کی ہیں۔ایک نص میں مُؤْمَن بہ میں اضافہ کی وجہ سے کمی زیادتی کا ذکر ہے، اور یہ بات نزول قرآن کے زمانہ میں تھی، جب شریعت مکمل ہوگئی تو مُؤمَن بہ محدود و متعین ہوگیا اور اس میں کمی زیادتی کا امکان باقی نہیں رہا۔

اور باقی تمام نصوص میں کیفیت یعنی شدت وضعف کے اعتبار سے کمی بیشی کا ذکر ہے، مگر اس کا تعلق نفس ایمان سے نہیں ہے بلکہ ایمان کامل سے ہے، اور ایمان کامل میں کمی بیشی کا کوئی منکر نہیں —— جاننا چاہئے کہ نفس ایمان پر نجات کا مدار ہے اور ایمان کامل نجات اوّلی کا ضامن ہے۔

دوسری بات: امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک ایمان، اسلام، دین اور تقوی سب مترادف الفاظ ہیں، ایمان واسلام کا ایک دوسرے پر اطلاق تو نصوص میں بکثرت موجود ہے، امام بخاریؒ نے دین اور تقوی کو بھی اسی معنی میں لیا ہے، اسی ترادف پر امام صاحب کے تمام استدلالات موقوف ہیں، مگر یہ اصل ہی صحیح نہیں ایمان واسلام کو ایک کہنا صحیح نہیں، دونوں میں اگرچہ تباین کی نسبت نہیں، مگر تساوی کی نسبت بھی نہیں، دونوں میں فی الجملہ فرق ہے۔

پہلی دلیل: سورۃ الحجرات کی آیت (۱۴) ہے: ﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا، قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا، وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ بدّو کہتے ہیں: ہم ایمان لائے، آپؐ کہیں: تم ایمان نہیں لائے، ہاں یہ کہو: ہم نے ظاہری طور پر اطاعت قبول کی، اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔اس ارشاد سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک: ایمان واسلام ایک نہیں، بلکہ ان میں فرق ہے۔ظاہری اطاعت وانقیاد کا نام اسلام ہے اور پوری شریعت کو دل سے ماننے کا نام ایمان ہے، اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ایمان کا محل قلب ہے، پس ایمان بسیط ہوا کیونکہ دل میں صرف تصدیق ہوتی ہے۔

دوسری دلیل: حدیث جبرئیلؑ ہے، اس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دو الگ الگ سوال کئے ہیں: ما الإيمان؟ ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے چھ عقائد بتلائے، پھر انھوں نے دوسرا سوال کیا: ما الإسلام؟ اسلام کیا ہے؟ تو آپؐ نے پانچ اعمال بتلائے۔اگر ایمان واسلام ایک ہوتے تو دو سوالوں کی ضرورت نہیں تھی۔

نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان کا تعلق عقائد سے ہے اور عقائد کا محل قلب ہے۔ اور اسلام کا تعلق اعمال سے ہے اور اعمال کا محل جوارح (اعضاء) ہیں، پس دونوں کے درمیان فرق بدیہی طور پر ثابت ہوا۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے استدلالات

استدلال (۱): حضرت امام بخاریؒ کا پہلا استدلال حدیث: بُنی الإسلام علی خمسٍ سے ہے[1]، اس میں آنحضور ﷺ نے دین اسلام کو ایک بڑے محل سے تشبیہ دی ہے، پھر مشبہ بہ (محل) کے لوازم میں سے بناء (بنیاد) کو مشبہ (اسلام) کے لئے ثابت کیا ہے اور اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے (یہ صغری ہے) اور بناء (نیو) محل کا جز ہوتی ہے جیسے دیواریں اور چھت محل کا جز ہوتی ہیں (یہ کبریٰ ہے) پس پانچوں باتیں اسلام کا جزء ہوئیں، اور اسلام اور ایمان ایک ہیں (یہ اکبر ہے) پس وہ پانچوں باتیں ایمان کا بھی جزء ہوئیں، اس طرح ایمان کا مرکب ہونا ثابت ہوا۔

جواب: بیشک پانچوں باتیں اسلام کا جزء ہیں مگر اکبر قابل قبول نہیں یعنی یہ دعوی کہ ایمان اور اسلام ایک ہیں: محل نظر ہے۔ دونوں میں فی الجملہ فرق ہے پس حدیث سے ایمان کی ترکیب پر استدلال صحیح نہیں۔

قولہ: وهو قولٌ وفعلٌ: هو کا مرجع اسلام ہے۔ اور بخاری شریف کے ایک نسخہ میں فعلٌ کی جگہ عملٌ ہے، دونوں کا ایک ہی مطلب ہے کہ اسلام قول وفعل (عمل) کا نام ہے (یہ صغری ہے) اور قول وفعل عمل ہیں، قول لسانی عمل ہے اور افعال دیگر جوارح (اعضاء) کے اعمال ہیں۔ اور ایمان واسلام مترادف ہیں (یہ اکبر ہے) پس قول وفعل ایمان کے بھی اجزاء ہوئے اور ایمان کا مرکب ہونا ثابت ہوا۔

جواب: ایمان واسلام کو مترادف قرار دینا اور ان میں تساوی کی نسبت ماننا صحیح نہیں۔ دونوں میں فی الجملہ فرق ہے۔ اور اسلام قول وفعل کا نام ہے اس کا کوئی منکر نہیں۔ کسی بھی شخص پر مسلمان ہونے کا حکم اس وقت لگایا جائے گا جب وہ توحید ورسالت کا اقرار کرے، اور ایمان کی تکمیل اعمال سے ہوتی ہے۔

قولہ: يزيد وينقُص: یہ ضمیریں بھی اسلام کی طرف راجع ہیں، یعنی اسلام میں کمی بیشی ہوتی ہے، اور اسلام: ایمان کا مترادف ہے، پس ایمان میں بھی کمی بیشی ثابت ہوئی، اور ظاہر ہے کہ کمی بیشی بربناء اعمال ہوتی ہے پس اعمال ایمان کے اجزاء ہوئے اور ایمان کا مرکب ہونا ثابت ہوا۔

جواب: بیشک ایمان میں تفاوت ہوتا ہے، نیک صالح مسلمان کا ایمان اور تارک فرائض کا ایمان یکساں نہیں ہوسکتا، مگر بربناء اعمال جو تفاوت ہوتا ہے وہ نفس ایمان میں نہیں ہوتا، بلکہ ایمان کامل میں ہوتا ہے، اور ایمان کامل میں تفاوت

(۱) خَمسٍ کا معدود محذوف ہے أی خَمْسِ خِصَالٍ، اور یہ قاعدہ یاد رکھنا چاہئے کہ عدد کی تذکیر وتانیث میں معدود مفرد کا لحاظ ہوتا ہے۔ خصال: کا مفرد خَصْلَةٌ ہے، اس وجہ سے خمسٌ مذکر ہے۔

مسلّم ہے۔

استدلال (۲-۹): اب امام بخاری رحمہ اللہ قرآنِ کریم کی آٹھ آیتیں پیش کرتے ہیں، جن سے ایمان کی ترکیب پر استدلال کیا ہے:

پہلی آیت: سورۃ الفتح کی (آیت ۴) ہے ﴿لِیَزْدَادُوْا اِیْمَانًا مَعَ اِیْمَانِهِمْ﴾: تاکہ صحابہ کا ایمان بالائے ایمان ہوجائے۔ یعنی صلح حدیبیہ کو کھلی فتح بنایا تاکہ صحابہ کے ایمان میں ترقی ہو[1] پس ایمان میں کمی بیشی ثابت ہوئی۔

دوسری آیت: سورۃ الکہف کی (آیت ۱۳) ہے: ﴿وَزِدْنَاهُمْ هُدًى﴾: اور ہم نے اصحاب کہف کی ہدایت میں اضافہ کیا ـــــ اور امام بخاریؒ کے نزدیک ہدایت، تقوی، دین، اسلام اور ایمان سب مترادف ہیں اور اس آیت سے ہدایت میں زیادتی ثابت ہوئی، پس ایمان میں بھی زیادتی ثابت ہوئی۔

تیسری آیت: سورۂ مریم کی (آیت ۷۶) ہے: ﴿وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى﴾: اور اللہ جن کو راہ راست پر لاتا ہے ان کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے ـــــ اور ہدایت اور ایمان مترادف ہیں پس ایمان میں زیادتی ثابت ہوئی۔

چوتھی آیت: سورۂ محمد کی (آیت ۱۷) ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ﴾: جو لوگ راہ راست پر آگئے اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت میں اضافہ فرماتے رہتے ہیں۔ اور ان کو تقوی کی دولت سے نوازتے ہیں ـــــ اس میں بھی ہدایت (ایمان) میں زیادتی کا بیان ہے۔

پانچویں آیت: سورۃ المدثر کی (آیت ۳۱) ہے: ﴿وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِيْمَانًا﴾: اور مؤمنین کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، اس بات سے کہ جہنم میں عذاب کے انیس محکمے ہیں اور ہر محکمہ کا ایک فرشتہ ذمہ دار ہے[2] ـــــ اس میں بھی ایمان میں زیادتی کا بیان ہے۔

---

(۱) جب سورۃ الفتح کی ابتدائی آیات: ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا﴾ نازل ہوئی تو حضرات صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ تو آپؐ کے لئے ہوا، ہمارے لئے کیا ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿هُوَ الَّذِیْ أَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْا اِيْمَانًا مَعَ اِيْمَانِهِمْ﴾: اللہ وہ ہستی ہیں جنھوں نے مؤمنین کے دلوں میں اطمینان اتارا تاکہ ان کا ایمان اپنے سابقہ ایمان پر بڑھ جائے، اطمینان اتارا: یعنی باوجود خلاف طبع ہونے کے نبی ﷺ کے حکم پر جمے رہے، ضدی کافروں کی طرح ضد نہیں کی، اس کی برکت سے ان کے ایمان کا درجہ بڑھا، اور مراتب عرفان ویقین میں ترقی ہوئی (ماخوذ از فوائد عثانی)

(۲) سورۃ المدثر کی آیت ۳۰ ہے: ﴿عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ﴾: جہنم پر انیس فرشتے مقرر ہیں، یعنی دوزخ کے انتظام پر فرشتوں کا جو لشکر مقرر ہے اس کے انیس ذمہ دار ہیں اور سب سے بڑے ذمہ دار (داروغہ) کا نام مالک ہے، علماء نے انیس کے عدد کی حکمتوں پر بہت کچھ کلام کیا ہے، اور شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بھی تفسیر عزیزی میں اس پر مفصل گفتگو فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جہنم میں عذاب کی انیس قسمیں ہیں جن پر انیس ذمہ دار فرشتے مقرر ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ فرشتہ کی ←

چھٹی آیت: سورۃ التوبہ کی (آیت ۱۲۴) ہے: ﴿أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهِ إِيْمَانًا، فَأَمَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ إِيْمَانًا﴾: جب بھی کوئی نئی سورت نازل ہوتی ہے تو بعض منافقین غریب مسلمانوں سے تمسخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں: بتاؤ! اس سورت نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھادیا، سنو! جو لوگ ایمان دار ہیں: اس سورت نے ان کے ایمان میں اضافہ کیا ہے ——— چونکہ یہ آیت الگ انداز کی ہے، اس میں مؤمن بہ میں اضافہ کا بیان ہے اس لئے امام بخاریؒ نے قولہ عزّ وجل بڑھایا۔

ساتویں آیت: سورۂ آل عمران کی (آیت ۱۷۳) ہے: ﴿فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيْمَانًا﴾: پس ڈروان سے یعنی قافلہ والوں نے ان کو ڈرایا تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوا۔ جنگ احد کے بعد ایک قافلہ والوں نے مسلمانوں کو خوف زدہ کیا کہ اہل مکہ لشکر جرار لے کر آرہے ہیں، وہ تمہیں پیس کر رکھ دیں گے، پس بجائے خوف زدہ ہونے کے مسلمانوں کے ایمان میں اضافہ ہوا[1] ——— سورۃ التوبہ کی آیت سے الگ کرنے کے لئے اور سابقہ آیتوں سے جوڑنے کے لئے

← طاقت بہت بڑی ہے اور ایک فرشتہ وہ کام کرسکتا ہے جو لاکھوں آدمی مل کر نہیں کر سکتے، لیکن ہر فرشتہ کی یہ قوت اسی دائرہ میں محدود ہے جس کام کے کرنے کے لئے وہ مامور ہوا ہے، حضرت عزرائیلؑ لاکھوں آدمیوں کی جان ایک آن میں نکال سکتے ہیں مگر ماں کے پیٹ میں کسی مردہ بچہ میں جان نہیں ڈال سکتے، حضرت جبرئیل علیہ السلام آن واحد میں پیغام الٰہی لے کر آسکتے ہیں مگر بارش نہیں برسا سکتے، پس اگر ایک فرشتہ عذاب کے واسطے دوزخ پر مقرر ہوتا تو اس سے ایک ہی قسم کا عذاب دوزخیوں پر ہوسکتا تھا، دوسری قسم کا عذاب جو اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے ممکن نہ تھا ——— جب یہ آیت نازل ہوئی تو مشرکین ٹھٹھا کرنے لگے کہ ہم ہزاروں ہیں انیس ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔ اور ایک پہلوان بولا: سترہ کو تو میں اکیلا دبالونگا، باقی دو کا تم سب مل کر تیاپانچا کر دینا۔ اس پر یہ آیت اتری: ﴿وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً﴾: جہنم پر جو انیس افسر مقرر ہیں وہ آدمی نہیں ہیں فرشتے ہیں، جن کی قوت کا حال یہ ہے کہ ایک فرشتہ نے قوم لوط کی ساری بستی کو ایک بازو پر اٹھا کر پٹک دیا تھا۔

اور انیس کے عدد میں ایک طرف تو کافروں کی جانچ اور امتحان مقصود ہے کہ دیکھتے ہیں کہ کون اس کو سن کر ڈرتا ہے اور کون ہنسی مذاق اڑاتا ہے۔ اور دوسری طرف اہل کتاب پر آپؐ کی نبوت کی حقانیت پر دلیل قائم کرنا مقصود ہے، کیونکہ کتب سماویہ کے ذریعہ اہل کتاب پہلے سے جانتے تھے کہ جہنم پر انیس قسم کے فرشتے مقرر و متعین ہیں۔ آنحضور ﷺ کا اس کی خبر دینا جب کہ آپؐ امی تھے، کتب سماویہ کو جانتے نہیں تھے آپؐ کے سچا ہونے کی پکی دلیل ہے، اور یہ بات مؤمنین کے لئے بھی انشراح وطمانینت اور مسرت و بشاشت کا ذریعہ ہے جو بالیقین ان کے علم وعرفان میں اضافہ کا باعث بنے گا (ماخوذ از فوائد عثمانی)

(۱) اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ جب ابوسفیان احد سے مکہ واپس گیا تو راستہ میں خیال آیا کہ ہم نے بڑی غلطی کی، ہزیمت یافتہ اور زخم خوردہ مسلمانوں کو یونہی چھوڑ کر چلے آئے۔ اور مشورہ میں یہ طے پایا کہ پھر مدینہ واپس جا کر ان کا قصہ تمام کر دیں۔ آنحضور ﷺ کو جب اس کی خبر ہوئی تو آپؐ نے اعلان فرمایا کہ جو لوگ کل ہمارے ساتھ لڑائی میں حاضر تھے دشمن کا تعاقب کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ مسلمان زخم خوردہ ہونے کے باوجود اللہ و رسول کی پکار پر نکل پڑے اور حمراء الاسد (جو مدینہ منورہ سے آٹھ ←

وقولہ لائے ہیں۔

آٹھویں آیت: سورۃ الاحزاب کی (آیت ۲۲) ہے: ﴿وَمَا زَادَهُمْ إِلَّآ إِيمَانًا وَّتَسْلِيمًا﴾: اورنہیں زیادہ کیا ان کو مگر ایمان وانقیاد میں، یعنی جب عرب کے تمام قبائل ایک ساتھ مل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے تو اس صورت حال نے ان کے ایمان وانقیاد میں اضافہ کیا ـــــــ ان آیتوں میں ایمان میں اضافہ کا بیان ہے۔

جواب: سورۃ التوبہ والی آیت میں تو یہ بات صراحۃً موجود ہے کہ ایمان میں زیادتی احکام واخبار کے بڑھنے کی وجہ سے ہوئی تھی، یعنی جب بھی اللہ کا نیا کلام نازل ہوتا ہے تو مؤمنین کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، اور مُؤمَن بہ میں یہ اضافہ نزول وحی کے زمانہ تک ہوتا تھا اب وحی مکمل ہوچکی ہے اس لئے مُؤمن بہ میں اضافہ کی کوئی صورت نہیں۔

اس کی مزید تشریح یہ ہے کہ اسلام کے دور اول میں جتنا قرآن نازل ہوتا تھا بس اتنے پر ایمان لانا ضروری تھا، اسی طرح جو احکام نازل ہو چکے تھے ان پر ایمان لانا مکمل ایمان تھا، پھر جب نئی وحی آتی اور نئے احکام اترتے تو ان پر بھی ایمان لانا ضروری ہوتا اس طرح ان حضرات کا ایمان بڑھتا رہتا تھا، مگر وہ زیادتی نفس ایمان میں نہیں ہوتی تھی، بلکہ مؤمن بہ میں ہوتی تھی، یعنی ان چیزوں میں ہوتی تھی جن پر ایمان لانا ضروری تھا، مُؤمن بہ کی اسی زیادتی کو ایمان کی زیادتی قرار دیا گیا ہے ـــــــ پھر جب نبوت کا زمانہ ختم ہوگیا اور وحی مکمل ہوگئی تو اب مُؤمن بہ محدود و متعین ہوگیا اور اب سب لوگوں کے لئے انہی باتوں پر ایمان لانا ضروری ہوگیا، اب ان میں نہ زیادتی ہوسکتی ہے نہ کمی۔ لہٰذا مؤمن بہ کے اعتبار سے ایمان میں کمی زیادتی کا سوال ختم ہوگیا۔

اور باقی نصوص میں تصدیق کے مکملات اور کیفیت کے اعتبار سے اور شدت وضعف کے اعتبار سے ایمان میں کمی زیادتی کا بیان ہے اور اس کا کوئی منکر نہیں۔ نفس ایمان میں کمی زیادتی پر ان نصوص کی کوئی دلالت نہیں۔

استدلال (۱۰): نبی پاک ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے لئے کسی سے محبت کرنا اور اللہ کے لئے کسی سے بغض رکھنا ایمان کی وجہ سے ہے'' ـــــــ امام بخاریؒ کا استدلال اس حدیث سے اس طرح ہے کہ مِن تبعیضیہ ہے، پس یہ دونوں عمل ایمان کے اجزاء ہوئے۔

جواب: حدیث میں مِن تبعیضیہ ہے اس کی کوئی دلیل نہیں، من: اجلیہ بھی ہوسکتا ہے: أی مِن أجل الإیمان، یعنی

← میل ہے) تک کفار کا تعاقب کیا۔ جب ابوسفیان کو اس کی خبر ہوئی تو اس پر سخت رعب ودہشت طاری ہوئی اور وہ مع لاؤلشکر مکہ کی طرف بھاگا، اور ایک تجارتی قافلہ مدینہ آرہا تھا ابوسفیان نے اس کو کچھ دے دلا کر اس پر آمادہ کیا کہ وہ مدینہ پہنچ کر مشہور کرے کہ مکہ والوں نے بڑا بھاری لشکر اور سامان مسلمانوں کے استیصال کی غرض سے تیار کیا ہے تا کہ مسلمان مرعوب وخوفزدہ ہوں مگر یہ سن کر مسلمانوں کے دلوں میں خوف کی جگہ جوش ایمان بڑھ گیا اور وہ پکار اٹھے: ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾: ساری دنیا کے مقابلہ میں اکیلا خدا ہم کو کافی ہے!

یہ دو عمل ایمان کی وجہ سے ہیں، یعنی کامل ایمان کا ثمرہ ہیں۔

استدلال (۱۱): حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ (۱) نے اپنے دور خلافت میں جزیرہ ابن عمر کے گورنر عدی بن عدی کو خط لکھا کہ ایمان کے لئے کچھ فرائض، کچھ قوانین، کچھ حدود، اور کچھ سنتیں ہیں، پس جو ان پر پوری طرح عمل پیرا ہوگا اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا، اور جو ان پر پوری طرح عمل نہیں کرے گا اس کا ایمان مکمل نہیں (پھر حضرتؒ نے لکھا: ابھی بالاجمال لکھتا ہوں) پس اگر میں زندہ رہا تو آئندہ ان کی تفصیلات لکھوں گا، تاکہ تم ان پر عمل کرو، اور اگر میرا انتقال ہوگیا تو مجھے تمہارے ساتھ رہنے کی لالچ نہیں! ——— حضرت عمر رحمہ اللہ نے فرائض وواجبات اور حدود ومعاصی اور سنن ومستحبات کو ایمانی امور قرار دیا ہے، پس ایمان کا ذو اجزا (مرکب) ہونا ثابت ہوا۔

جواب: یہ سب امور ایمان کے اجزائے مکملہ ہیں اجزائے مقوّمہ نہیں، چنانچہ حضرت عمرؒ نے یہ نہیں فرمایا کہ ان امور کے نہ رہنے کی صورت میں ایمان جاتا رہے گا، بلکہ یہ فرمایا: ''جو ان امور پر پوری طرح عمل نہیں کرے گا اس کا ایمان مکمل نہیں ہوگا'' یعنی ایمان کا کمال ان امور پر موقوف ہے پس ثابت ہوا کہ یہ امور حقیقتِ ایمان میں داخل نہیں۔

استدلال (۱۲): سورۃ البقرۃ (آیت ۲۶۰) ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا: پروردگار! آپ بروز قیامت مردوں کو کس طرح زندہ کریں گے، مجھے اس کا ایک نمونہ دکھلا دیں، جواب ملا! کیا تمہیں ہماری قدرت پر یقین نہیں؟ کیف کے ذریعہ کبھی سوال ذات کے بارے میں ہوتا ہے اور کبھی صفات کے بارے میں، اس لئے کسی کو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معاذ اللہ احیاء موتی کے سلسلہ میں تردد تھا، چنانچہ خداوند قدوس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی جواب دلاکر اس تردد کو رفع فرمادیا، حضرت ابراہیمؑ نے عرض کیا: ﴿بَلٰی﴾ کیوں نہیں! احیاء موتی پر میرا پورا یقین ہے لیکن میں اطمینان قلب کے لئے مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں ——— حضرت ابراہیمؑ کو احیاء موتی پر یقین پہلے سے تھا، ﴿وَلٰکِنْ لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ﴾ سے ایمان میں زیادتی مطلوب تھی۔

(۱) حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ: عبد الملک بن مروان کے بعد ۹۹ھ میں خلیفہ بنے، اور ۱۰۱ھ میں وفات پائی، پس آپ کی خلافت کی مدت کل دو سال اور چند ماہ ہے، اس قلیل عرصہ میں آپ نے دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دیا۔ اس وجہ سے آپ کی خلافت کو خلفاء راشدین کی خلافت کا تتمہ قرار دیا گیا۔ آپ نے خلیفہ بنتے ہی بنوامیہ کی وہ جائدادیں ضبط کرلیں جو انھوں نے ناجائز طریقے پر حاصل کی تھیں اور وہ سب سامان بیت المال میں داخل کردیا، یہاں تک کہ اپنی اہلیہ سے بھی فرمایا: یہ جو قیمتی ہار تم نے اپنی گردن کی زینت بنا رکھا ہے اگر میری رفاقت چاہتی ہو تو اسے بیت المال میں داخل کردو، چنانچہ اہلیہ محترمہ نے وہ قیمتی ہار بیت المال میں داخل کردیا۔ آپ کے عدل وانصاف، خشیت الٰہی، تواضع وعاجزی، گریہ وزاری اور دنیا سے بےتعلقی اور آخرت کی تیاری کے ہزار ہا واقعات ہیں جو آپ کی سیرت میں ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔ آپ کی وفات زہر کی وجہ سے ہوئی، بنوامیہ نے آپ کو کھانے میں ملاکر زہر دیدیا، کیونکہ آپ نے ان کو صراط مستقیم کی دعوت دی تھی ۱۲

جواب: زیادتی ایمانی مطلوب نہیں تھی بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عین الیقین کے خواستگار تھے جو مشاہدہ پر موقوف تھا۔

جاننا چاہئے کہ اطمینان ویقین کے مختلف درجات ہیں۔ ابتدائی درجہ علم الیقین ہے، پھر مشاہدہ کے بعد ترقی ہوتی ہے اور عین الیقین کا درجہ حاصل ہوتا ہے، پھر تجربہ کے بعد جب ایمان کمال عروج پر پہنچ جاتا ہے تو حق الیقین حاصل ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام درجۂ عین الیقین اور حق الیقین کے خواستگار تھے۔

استدلال (۱۳): حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کسی سے فرمایا: ہمارے پاس بیٹھو ہم تھوڑی دیر ایمان لائیں، یعنی خدا اور سول کا تذکرہ کریں ـــــ حضرت معاذؓ نے مذاکرۂ ایمانی کو جو کہ ایک عمل ہے ایمان کہا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایمان ذو اجزاء ہے۔

جواب: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ دنیوی کاموں میں پڑ کر کچھ غفلت سی ہوگئی ہے، آؤ اللہ کا ذکر کریں تاکہ غفلت دور ہو، اور ایمان تازہ ہو، پس اس ارشاد میں ایمان کی ترکیب وبساطت کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔

استدلال (۱۴): حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: ''یقین پورا ایمان ہے'' ـــــ اس جملہ میں لفظ کل سے ایمان کی تاکید لائی گئی ہے اور لفظ کل سے تاکید ذو اجزاء کی لائی جاتی ہے پس ایمان کا ذو اجزاء ہونا ثابت ہوا۔

جواب: یہ نفس ایمان کی تاکید نہیں ہے، بلکہ ایمان کامل کی تاکید ہے۔ اور ایمان کامل کے ذو اجزاء ہونے کا کوئی منکر نہیں۔ علاوہ ازیں: امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا پورا قول ذکر نہیں کیا۔ ان کی پوری بات حاشیہ میں ہے کہ صبر آدھا ایمان ہے، اور یقین پورا ایمان ہے یعنی جب مصیبت آئے تو اس کو برداشت کرنا، سہنا اور ہمت سے کام لینا آدھا ایمان ہے، اور صبر پر جو ثواب کا وعدہ ہے اس کا یقین رکھنا پورا ایمان ہے، پس اس قول کا مسئلہ زیر بحث سے کچھ تعلق نہیں۔

استدلال (۱۵): حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے: بندہ تقوی کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا تا آنکہ وہ ان چیزوں کو چھوڑ دے جو دل میں کھٹک پیدا کرتی ہیں ـــــ معلوم ہوا کہ تقوی کے مختلف درجات ہیں اور تقوی اور ایمان ایک ہیں، پس ایمان کے بھی درجات ہوئے اور ایمان ذو اجزاء ہوا۔

جواب: تقوی اور ایمان ایک نہیں، تقوی کے لغوی معنی ہیں: بچنا، اور شرعی معنی ہیں: آخرت میں نقصان پہنچانے والی چیزوں سے کنارہ کش رہنا، پس تقوی کے مختلف درجات ہیں، ابتدائی درجہ کفر وشرک سے بچنا ہے، اور اعلی درجہ ماسوی اللہ سے صرف نظر کرنا ہے، اور ہر کام رضاء الٰہی کے لئے کرنا مقربین کا مقام ہے، اور دل میں کھٹکنے والی چیزوں کو چھوڑ دینا تقوی کا درمیانی درجہ ہے، اور حضرت ابن عمرؓ کا یہ ارشاد حدیث: دَعْ ما یُرِیْبُك إلى ما لا یُرِیْبُك کے قبیل سے ہے، پس اس کا بھی مبحث سے کچھ تعلق نہیں۔

استدلال (۱۶): حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے سورۃ الشوریٰ کی آیت (۱۳) ﴿شَرَعَ لَکُمْ مِنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا﴾ کی تفسیر میں فرمایا: اے محمدؐ ہم نے آپ کو اور ان کو (نوح علیہ السلام کو) ایک ہی دین کی وصیت کی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے بلکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک سب نبیوں پر ایک ہی دین (دینِ اسلام) نازل کیا ہے، البتہ شریعتیں مختلف رہی ہیں، کیونکہ شریعت میں زمانہ کے احوال کا لحاظ کیا جاتا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا، کیونکہ اس وقت بہن کے علاوہ عورتیں نہیں تھیں، پھر جب نسل انسانی بڑھی اور عورتیں زیادہ ہوگئیں تو بہن سے اور قریبی رشتہ داروں سے نکاح حرام کیا گیا۔

اور دین عقائد کا نام ہے۔ اور عقائد میں تبدیلی نہیں آتی، اللہ تعالیٰ یگانہ ہیں، ان کا کوئی ساجھی نہیں، انبیاء اور آسمانی کتابیں برحق ہیں۔ فرشتے واقعی مخلوق ہیں، ان باتوں میں کیا تبدیلی آسکتی ہے؟ چنانچہ دین ہمیشہ ایک رہا ہے۔

اور اس سے امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال اس طرح ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا دین اصول وفروع کا مجموعہ تھا، اسی طرح آنحضور ﷺ کا دین بھی اصول وفروع کا مجموعہ ہے، اس لئے فروع (اعمال) ایمان کا جز ہوئے، پس ایمان ذواجزا ہوا۔

جواب: اس آیت سے اور حضرت مجاہدؒ کی تفسیر سے اصولِ دین میں اتحاد اور فروع میں اختلاف ثابت ہوتا ہے، اور احناف اس کے قائل ہیں کہ اصلِ دین یعنی نفس ایمان بسیط ہے اس میں کمی بیشی کا کوئی احتمال نہیں۔ البتہ فروع (اعمال) میں کمی زیادتی ہوتی ہے جو ایمان کے اجزائے مکمّلہ ہیں نہ کہ اجزائے مقوّمہ۔

استدلال (۱۷): حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۃ المائدہ کی آیت (۴۸) ﴿لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾ میں شرعة: کی تفسیر: سنة (بڑے راستہ) سے کی ہے اور منھا جا کی تفسیر سبیلاً (چھوٹے راستے) سے کی ہے، عبارت میں لف ونشر مشوّش (غیر مرتب) ہے اور بڑے راستہ سے دین وعقائد مراد ہیں اور چھوٹے راستہ سے اعمال، یعنی تمام انبیاء کا دین ایک رہا ہے اور شریعتیں مختلف۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا اس سے استدلال اس طرح ہے کہ شرعة (دین وعقائد) اور منہاج (اعمال) ایک ہیں، پس اعمال ایمان کے اجزاء ہوئے ——— جواب یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک نہیں، ان میں فی الجملہ فرق ہے۔

استدلال (۱۸): حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۃ الفرقان کی آخری آیت: ﴿قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَاؤُکُمْ﴾ میں دعاء کی تفسیر ایمان سے کی ہے، اور دعا زبان کا عمل ہے، پس اعمال ایمان کی ماہیت میں داخل ہوئے۔

جواب: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ارشاد: دعاؤکم: إیمانکم میں دعاء سے دعوتِ ایمان مراد ہے، نماز کے بعد والی دعا مراد نہیں۔ دعا یدعو کے کئی مصدر آتے ہیں ان میں سے ایک دعاء بھی ہے، دوسرا مصدر دعوۃ ہے۔ اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کی طرف بلانا ابھی جاری ہے اس لئے عذاب ٹل رہا ہے، ورنہ موجب عذاب

(تکذیب) متحقق ہے اور عذاب کے لئے کوئی چیز مانع نہیں۔

سورۃ الفتح (آیت ۲۵) میں ہے: ﴿لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾: مکہ میں بہت سے مردوزن ایسے ہیں جنھوں نے ایمان چھپا رکھا ہے، اللہ کے علاوہ ان کا ایمان کوئی نہیں جانتا، اگر وہ مکہ سے ہٹ جاتے تو ہم اہل مکہ کو پیس کر رکھ دیتے، چنانچہ بدر میں جب کفار مکہ سے علاحدہ ہوگئے تو عذاب سے دوچار ہوگئے، تمام سرکش تہ تیغ کردیئے گئے۔

غرض حضرت ابن عباسؓ نے تفسیر باللازم کی ہے کہ اہل مکہ پر عذاب اس لئے نہیں آرہا کہ ان کو ابھی ایمان کی دعوت دی جارہی ہے اور ان کے ایمان کی امید ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو عذاب پہنچ جاتا کیونکہ موجب عذاب متحقق ہے، پس یہاں دعاء سے زبان کا عمل مراد نہیں، بلکہ نفس ایمان مراد ہے۔ اور آیت کا مبحث سے کچھ تعلق نہیں۔

[۸-] حدثنا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ مُوْسَى، قَالَ: أَنَا حَنْظَلَةُ بْنُ أَبِي سُفْيَانَ، عَنْ عِكْرِمَةَ بْنِ خَالِدٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: "بُنِيَ الإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ، وَالْحَجِّ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ" [انظر: ٤٥١٥]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر قائم کی گئی ہے: (۱) اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور اس بات کی گواہی دینا کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں (۲) اور نماز قائم کرنا (۳) اور زکات ادا کرنا (۴) اور بیت اللہ کا حج کرنا (۵) اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔

تشریح:

۱- یہ حنظلۃ بن ابی سفیان کی روایت ہے جس کو ان سے عبید اللہ بن موسیٰ عبسی نے روایت کیا ہے، اس میں حج کا تذکرہ پہلے ہے اور صوم رمضان کا بعد میں، مگر مسلم شریف (حدیث نمبر ۱۶) میں ابن عمرؓ کی اسی روایت میں جو سعد بن عُبیدہ کی سند سے مروی ہے، اس کے برعکس ہے یعنی صوم رمضان مقدم ہے اور حج مؤخر۔ اور اس روایت میں یہ بھی ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ حدیث یاد کرکے سنائی اور حج کو مقدم کردیا اور صوم رمضان کو مؤخر تو ابن عمرؓ نے ٹوکا اور فرمایا: لا، صِیامَ رمضان والحجِ، هكذا سمعته من رسول الله صلى الله عليه وسلم: اور حنظلۃ کی روایت میں بھی جو بواسطہ عبد اللہ بن نُمیر مروی ہے صوم رمضان کا ذکر مقدم ہے اور حج کا مؤخر۔ مگر امام بخاریؒ اس حدیث کی وجہ سے اپنی صحیح میں کتاب الحج پہلے لائے ہیں اور کتاب الصوم بعد میں۔ مگر تمام فقہاء ومحدثین کتاب الصوم کو کتاب الحج سے پہلے لاتے ہیں۔

۲- اس حدیث میں نبی ﷺ نے اسلام کو ایک ایسی عمارت سے تشبیہ دی ہے جو چند ستونوں پر قائم ہو۔ پس کسی

مسلمان کے لئے اس کی قطعاً گنجائش نہیں کہ وہ ان ارکان کے ادا کرنے میں غفلت برتے، کیونکہ یہ اسلام کے بنیادی ستون ہیں۔ اور مختلف روایات میں یہ بات آئی ہے کہ جس طرح وضو کی صحت کے لئے اعضاء مغسولہ کو کم از کم ایک بار بالاستیعاب دھونا اور کم از کم چوتھائی سر کا مسح کرنا ضروری ہے اسی طرح آخرت میں نجات اولی کے لئے اسلام کے ارکانِ خمسہ کی ادائیگی ضروری ہے، جو شخص گناہوں سے بچتے ہوئے ان اعمال پر عمل پیرا ہوگا وہ اگر دیگر طاعات نہ بھی کرے: اس کی نجات اوّلی ہوگی، وہ عذاب جہنم سے بچ جائے گا اور جنت کا حق دار ہوگا۔

۳- اور ان ارکانِ خمسہ کو اسلام کی رکنیت کے لئے اس وجہ سے خاص کیا ہے کہ یہ پانچوں اعمال لوگوں کی مشہور عبادتیں ہیں۔ تمام امتوں نے ان کو اختیار کیا ہے اور ان کا انتظام کیا ہے۔ یہود ہوں یا عیسائی، مجوس ہوں یا عرب جو دین ابراہیمی پر کسی درجہ میں قائم تھے سب ان طاعات کو اپنائے ہوئے تھے اگرچہ ان عبادتوں کی ادائیگی کے طریقوں میں ان میں اختلاف تھا، یہود کی نماز کا طریقہ اور تھا اور عیسائیوں کا اور۔ مگر سب نماز ادا کرتے تھے۔ یہی حال زکوٰۃ وغیرہ کا تھا، سب ملتوں کے ماننے والے غریبوں پر خرچ کرتے تھے، پس یہ متفق علیہ امور ہیں اس لئے ان کو رکنیت کے لئے خاص کیا گیا ہے، پھر ان طاعات خمسہ میں جو خوبیاں ہیں وہ دیگر طاعتوں میں نہیں ہیں اس لئے یہ طاعات رکنیت کے لئے خاص کی گئی ہیں۔

۴- توحید کا اقرار، رسالت محمدی کی تصدیق اور پوری شریعت کو تسلیم کرنا پھر ان دونوں باتوں کی دوسروں کو دعوت دینا اسلام کا بنیادی رکن ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ موافق و مخالف کے درمیان امتیاز کیا جا سکتا ہے، انہی کی بنیاد پر کسی کے مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور ان میں کوتاہی پر باز پرس کی جا سکتی ہے۔

۵- اور نوع بشری کی نیک بختی کا مدار اور نجات اخروی کا سرمایہ چار اخلاق ہیں: (۱) اخبات یعنی اللہ کے سامنے نیاز مندی (۲) طہارت یعنی پاکی اختیار کرنا (۳) سماحت یعنی فیاضی سے کام لینا (۴) عدل و انصاف برتنا ــــــ اور نماز کے ذریعہ اخبات و نظافت بدست آتے ہیں کیونکہ نماز کے لئے پاکی شرط ہے اور نماز بارگاہ خداوندی میں اعلی درجہ کی نیاز مندی ہے، اور زکوٰۃ ادا کرنے سے فیاضی اور عدل کی صفات بدست آتی ہیں، کیونکہ شرائط کا لحاظ کر کے زکوٰۃ کی ادائیگی اعلی درجہ کی فیاضی ہے، اور یہی انصاف کی بات بھی ہے کہ مالدار اللہ کی بخشی ہوئی دولت میں سے غریبوں کا حق ادا کرے۔

پھر انسانوں کے لئے کوئی ایسی عبادت بھی ضروری ہے جو اس کی خواہشات پر قہرمان ہو جس کے ذریعہ نفسانی خواہشات کو دبایا جا سکے اور ایسی عبادت روزہ ہے، اس مقصد کے لئے اس سے بہتر کوئی عبادت نہیں اس لئے روزہ کو چوتھا رکن قرار دیا۔

اور اللہ کی شریعتوں میں ایک بنیادی حکم یہ بھی رہا ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم کی جائے اور اسلام کے اہم شعائر چار ہیں: قرآن مجید، کعبہ شریف، نبی اور نماز، حج کی عبادت کعبہ شریف کی تعظیم کے لئے مقرر کی گئی ہے، نیز اس کا ایک اہم مقصد جذبۂ محبت کو مہمیز کرنا بھی ہے۔ ہر مؤمن کے دل میں محبت الٰہی کی چنگاری موجود ہے اس کو بھڑکا کر لاوا بنانا حج کی عبادت کا خاص مقصد ہے۔

فائدہ(۱): اسلام کے فرائض ان ارکانِ خمسہ کے علاوہ بھی ہیں جیسے: جہاد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر وغیرہ مگر جو اہمیت وخصوصیت ان پانچ باتوں کو حاصل ہے وہ اوروں کو حاصل نہیں۔ اس لئے اسلام کا رکن صرف انہی کو قرار دیا گیا۔

اور وہ خصوصیت واہمیت یہ ہے کہ یہ پانچ ارکان دین اسلام کے لئے بمنزلۂ پیکر محسوس کے ہیں، نیز یہی وہ خاص عبادتیں ہیں جو بالذات مطلوب ومقصود ہیں ان کی فرضیت کسی عارض کی وجہ سے اور کسی خاص حالت سے وابستہ نہیں۔ یہ مستقل اور دائمی فرائض ہیں، برخلاف جہاد اور امر بالمعروف وغیرہ کے کہ ان کی یہ حیثیت نہیں، وہ خاص حالات میں اور خاص موقعوں پر فرض ہیں۔

فائدہ(۲): لوگوں نے پہلے رکن کو یعنی توحید ورسالت کی گواہی کو جو سب سے اہم رکن ہے رکنیت سے خارج کر کے ایمانیات میں داخل کر دیا ہے، اس طرح لوگوں میں ارکان اربعہ مشہور ہو گئے، حالانکہ گواہی کورٹ میں مدعی علیہ کے سامنے دی جاتی ہے، جب کہ مدعی علیہ مدعی کے دعوی کا انکار کرے، اسی طرح ان دو باتوں کی گواہی ان لوگوں کے سامنے دینی ہے جو ان دو عقیدوں کے منکر ہیں، پھر جس طرح کورٹ میں گواہوں کا کام صرف گواہی دینا ہے اس پر فیصلہ قاضی کرتا ہے اسی طرح یہاں بھی مسلمانوں کی ذمہ داری غیر مسلموں تک یہ دو باتیں پہنچانا ہے، پھر فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کریں گے ﴿اللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾: اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کریں گے (الحج آیت ۶۹) پس فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں، ہمارا کام یہ ہے کہ جو لوگ یہ دو عقیدے نہیں مانتے ان کے سامنے گواہی دیدیں۔

لیکن اگر گواہ کوتاہی کریں، وہ گواہی کا فریضہ انجام نہ دیں تو قاضی کس بنیاد پر فیصلہ کرے گا؟ بلکہ ممکن ہے کسی درجہ میں گواہ بھی ماخوذ ہو جائیں کہ تم نے اپنا فریضہ کیوں ادا نہ کیا؟ اگر تم دین کی دعوت دوسروں تک پہنچاتے تو ممکن تھا وہ بھی اللہ کے بندے بن جاتے، اور جنت میں پہنچ جاتے، اس لئے یہ امت کی کوتاہی تصور کی جائے گی، مگر اب امت کا عجیب حال ہو گیا ہے، انھوں نے اس دعوت کو ارکان کی فہرست سے نکال دیا ہے اور ایمانیات میں داخل کر دیا ہے۔ فیا للعجب!

بلکہ امت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ مسلمان ہی کلمہ سے محروم ہو گئے، ہم ان تک بھی کلمہ نہیں پہنچا سکے۔ جو لوگ ان دو عقیدوں کا انکار کرتے ہیں ان تک ہم کلمہ کیا پہنچاتے؟ ہم اذان میں شہادتین ضرور پکارتے ہیں مگر ان کو سمجھتا کون ہے؟ جب کہ اس امت کا فریضہ ہے کہ ہر وہ انسان جو یہ دو عقیدے نہیں مانتا اس کے سامنے ان عقیدوں کی گواہی دے۔

توحید ورسالت کی گواہی کس طرح دی جائے؟

ہماری دکان میں ایک غیر مسلم ملازم ہے یا ہم ٹرین میں سفر کر رہے ہیں، ساتھ میں ایک غیر مسلم بیٹھا ہوا ہے، آپ بات چھیڑیں اور اس سے پوچھیں: آپ کا مذہب کیا ہے؟ وہ جواب دے گا: میرا مذہب یہ ہے، مثلاً کہے گا: میں ہندو ہوں۔ اب آپ اس سے اس کے مذہب کے بارے میں پوچھیں، جب وہ اپنی بات پوری کرے تو آپ کہیں: آپ

جانتے ہیں: میرا مذہب کیا ہے؟ وہ کہے گا: ہاں جانتا ہوں، آپ مسلمان ہیں، یا کہے گا: میں نہیں جانتا، پس آپ کہیں: میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ یہ ہے کہ معبود صرف اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں اسی کی بندگی کرتا ہوں، کسی اور کے سامنے سرِ نیاز خم نہیں کرتا، اور مکہ میں آج سے چودہ سو سال پہلے ایک شخصیت پیدا ہوئی تھی جس کا نام پاک محمد (ﷺ) تھا ان کو میں آخری نبی مانتا ہوں۔ وہ اللہ کے یہاں سے جو پیغام لائے ہیں اس پر میں چلتا ہوں۔ بس اتنی بات جب آپ نے اس کے سامنے رکھ دی تو آپ نے گواہی دیدی۔ اب اگر وہ سمجھ دار ہے، اللہ نے اس کے نصیب میں خیر رکھی ہے تو اس کے لئے لمحۂ فکر یہ پیدا ہوگا اور وہ اپنے عقیدوں کا ہمارے عقیدوں سے موازنہ کرے گا اور اللہ چاہیں گے تو وہ اور سوچے گا اور مطالعہ کرے گا اور اگر نہیں کرے گا تو ہم نے اپنا فریضہ ادا کردیا، گواہی بس اتنی ہی ہے مگر ہماری کوتاہی یہ ہے کہ بیس سال سے ایک ہندو ہماری فرم میں ملازم ہے، ہمارے کھیت میں کام کرتا ہے مگر ہم نے کبھی اس کو نہیں سمجھایا کہ اسلام کے بنیادی عقیدے یہ ہیں۔

اسی طرح امت میں عرصہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ متروک ہوگیا ہے، حالانکہ احیائے دین کے لئے تبلیغ ضروری ہے، حدیث میں ہے: بَلِّغُوا عنِّی ولو آیة: جس کو دین کی ایک بات بھی معلوم ہے وہ دوسروں تک پہنچائے، اور فریضۂ تبلیغ چھوڑ بیٹھنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آدھی امت دین سے بے خبر ہوکر رہ گئی ہے، فیَا لَلأسَف! ——— پس جو دین کا بول بالا دیکھنا چاہتا ہے وہ دعوت وتبلیغ کی محنت کے لئے تیار ہو جائے اس کے بغیر دین کا احیاء ممکن نہیں۔

فائدہ (۳): دورِ اول میں اسلام تیزی سے پھیلتا تھا اور اس کی تین وجوہ تھیں:

اول: ہر مسلمان اسلام کا داعی تھا، آج ہزاروں میں کوئی ایک داعی ہے، اکثر نے اسلام کے رکن اول توحید ورسالت کی گواہی کو اسلامیات سے نکال کر ایمانیات میں داخل کردیا ہے۔

دوم: تعصب کا دور نہیں تھا، آج معاملہ برعکس ہوگیا ہے۔ آج اگر ایک ہندو مسلمان ہوتا ہے تو پورے ملک میں ہنگامہ بپا ہو جاتا ہے، یہ عصبیت پہلے نہیں تھی۔ اور یورپ وامریکہ میں آج بھی نہیں ہے، اس لئے وہاں روز غیر مسلم اسلام میں داخل ہو رہے ہیں، ہندوستان میں بھی بہت سے غیر مسلم اسلام کی حقانیت پر پورا یقین رکھتے ہیں، مگر حالات سے مجبور ہیں، اقرار نہیں کرسکتے، یہی وہ بندے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ لپ بھر کر جہنم سے نکال کر جنت میں ڈالیں گے۔ بخاری ومسلم کی ایک طویل روایت میں مروی ہے کہ قیامت کے دن جب سفارش کرنے والوں کی سفارش ختم ہو جائے گی اور تمام گناہ گار مسلمان جہنم سے نکال لئے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اب میری باری ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تین لپ بھر کر جہنم سے جنت میں ڈالیں گے جو جنت میں عتقاء الرحمٰن کے نام سے پہچانے جائیں گے (مشکوۃ حدیث ۵۵۷۹)

پس کہاں اقرار پایا گیا اور کہاں اعمال پائے گئے؟ یہ تو وہ مسلمان ہیں، جنھوں نے کبھی کوئی عمل نہیں کیا اور ان کے ایمان کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

سوم: اب نومسلموں کو اپنانے کا سلسلہ نہیں رہا، دورِاول میں جب کوئی مسلمان ہوتا تھا تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا، وہ جس کے ہاتھ پر مسلمان ہوتا تھا اس کے خاندان اور قبیلہ کا فرد سمجھا جاتا تھا، اس کی دیکھ بھال، شادی بیاہ اور کاروبار کھڑا کرنے کی ذمہ داری اس قبیلہ کی ہوتی تھی، حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کی جُعفی نسبت اسی وجہ سے ہے کہ ان کے جدامجد مغیرہ نے قبیلۂ جعفی کے ایک شخص یمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔

غرض ان تین وجوہ سے اسلام جتنی تیزی سے پھیلنا چاہئے نہیں پھیل رہا، اگر یہ موانع نہ ہوتے تو اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد ہمارے وہم وگمان سے کہیں زیادہ ہوتی۔

بدنی عبادتیں دو اور مالی عبادت ایک کیوں ہے؟

حدیث مذکور میں دو عبادتیں بدنی ہیں: نماز اور روزہ، اور ایک عبادت مالی ہے: زکوٰۃ، اور حج مال وبدن سے مرکب ہے، یہ جمہور کی رائے ہے، اور حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک حج بھی بدنی عبادت ہے، چنانچہ ان کے نزدیک حج کی فرضیت کے لئے زاد وراحلہ شرط نہیں، وہ فرماتے ہیں کہ جو بھی شخص پیدل مکہ پہنچ جاسکتا ہے اس پر حج فرض ہے۔

خیر اب یہ جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے بدنی عبادتیں دو، اور مالی عبادت ایک کیوں رکھی ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے بدن میں روح رکھی ہے اور روح کی دو صفتیں (حالتیں) ہیں: ایک: ملکیت یعنی فرشتوں جیسی استعداد اور دوسری بہیمیت یعنی جانوروں جیسی استعداد، بالفاظ دیگر: ایک لمۂ خیر ہے دوسرا لمۂ شر (لمۃ: اثر) قرآن میں ہے: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا﴾: قسم ہے نفس (روح) کی اور اس نفس کو درست بنانے کی، یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کا نفس نہایت عمدہ بنایا ہے، ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا﴾: پس اللہ نے اس نفس کو اس کی نیکوکاری اور اس کی بدکاری الہام فرمائی۔ یہی روح کی دو صفتیں (ملکیت اور بہیمیت) ہیں، قرآن میں دوسری جگہ ہے: ﴿وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ﴾: ہم نے انسان کو دونوں راہیں سُجھادیں، نیکوکاری کی راہ بھی اور بدکاری کی راہ بھی، اب انسان کو اختیار ہے: نیکوکاری کی راہ پر چلے تو جنت میں جائے گا اور بدکاری کی راہ اپنائے گا تو جہنم رسید ہوگا۔

یہ جو اللہ نے انسان کو دوراہیں سجھائی ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی روح میں اللہ نے نیکی اور بدی کی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ اب ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت میں ایسے اعمال اور ایسی عبادتیں ہوں جو ملکیت (نیکوکاری) کو بڑھاوا دیں اور بہیمیت (بدکاری) کو لگام دیں، چنانچہ نماز رکھی گئی نیکوکاری کو بڑھاوا دینے کے لئے، لمۂ خیر کی ترقی کے لئے، اور روزہ رکھا گیا نفسانی تقاضے دبانے کے لئے، آدمی میں تقوی اور پرہیزگاری پیدا کرنے کے لئے، لمۂ شر کو دبانے کے لئے، اسی کو قرآن میں کہا گیا ہے ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ یعنی روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ تم پرہیزگار بنو۔

غرض روزہ لمۂ شر یعنی بہیمیت پر کنٹرول کرنے کے لئے ہے تاکہ آدمی میں تقوی اور پرہیزگاری پیدا ہو، اور نماز اس لئے ہے کہ آدمی میں نورانیت پیدا ہو، لمۂ خیر ابھرے، اللہ کا قرب حاصل ہو، اللہ کی یاد آئے، قرآن میں ہے: ﴿وَلَذِكْرُ

اللّٰہِ أَکْبَرُ﴾: اللہ کی یاد نماز کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ جب بندہ سجدہ کرتا ہے تو اللہ کے قدموں پر سجدہ کرتا ہے یعنی اتنا قریب ہو جاتا ہے۔

بہر حال نماز کا مقصد یہ ہے اور روزہ کا مقصود وہ ہے اور چونکہ ایسی کوئی بدنی عبادت نہیں تھی جس سے دونوں مقصد حاصل ہوں اس لئے بدنی عبادتیں دو اور مالی عبادت ایک رکھی، کیونکہ مال میں دو مقصد نہیں، مالی عبادت: زکوۃ ہے اور صدقۃ الفطر اور نفلی صدقات اسی لائن کی چیزیں ہیں۔

استدلال: امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال اوپر آچکا کہ اسلام اور ایمان ایک ہیں، اور جب اعمال خمسہ اسلام کے ارکان ہیں تو یہ پانچوں ایمان کے بھی ارکان ہوئے پس ایمان کا ذو اجزاء (مرکب) ہونا ثابت ہوا۔

جواب: ہم اوپر تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ ایمان واسلام ایک نہیں، اگرچہ عرف عام میں توسُّعا ایک کا دوسرے پر اطلاق ہوتا ہے، بلکہ ایمان بمنزلہ بیج کے ہے اور ارکانِ خمسہ اس کا پیکر محسوس ہیں، یعنی ایمان کے درخت پر نمودار ہونے والی پانچ شاخیں ہیں اس لئے حضرتؒ کا استدلال غور طلب ہے۔

ملحوظہ: شهادة: پر تینوں اعراب پڑھ سکتے ہیں۔ جملہ مستأنفہ قرار دیں تو مبتدا محذوف کی خبر بنا کر مرفوع پڑھیں گے۔ اور خمسٍ سے بدل بنائیں تو مجرور پڑھیں گے۔ اور أی حرف تفسیر پوشیدہ مانیں تو منصوب پڑھیں گے۔ إقام الصلوٰۃ اور إیتاء الزکوٰۃ وغیرہ پر بھی یہ تینوں اعراب پڑھ سکتے ہیں ـــــ اور خمسٍ کا مضاف الیہ خصالٍ محذوف ہے، خمسٍ کی تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے۔

بابُ أُمُوْرِ الإِیْمانِ

ایمانی اعمال کا بیان

حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے الفیض الجاری بشرح صحیح البخاری میں جو حضرت کی درسی تقریر ہے اور جس کو کسی طالب عالم نے عربی میں ضبط کیا ہے اور پینتیس سال پہلے حضرت مولانا عبد الاحد صاحب رحمہ اللہ استاذ حدیث دار العلوم دیوبند نے اس کو شائع کیا ہے اور اس پر میرا مقدمہ ہے: اس میں ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے عام باب قائم کرتے ہیں، پھر ذیلی ابواب لاتے ہیں، جن میں اس عام باب کی جزئیات ہوتی ہیں، اور ان میں افادۂ مزید بھی ہوتا ہے، وہ سب ابواب ایک ہی سلسلہ کی کڑی ہوتے ہیں، میں نے حضرت رحمہ اللہ کی اس بات پر اضافہ کیا ہے کہ امام بخاریؒ کبھی ایک سے زیادہ عام باب قائم کرتے ہیں، پھر ذیلی ابواب لاتے ہیں، یہاں بھی ایسا ہی کیا ہے۔ یہ دوسرا عام باب ہے اس کے بعد ذیلی ابواب شروع کریں گے۔

اس باب میں امام بخاریؒ نے دو آیتیں لکھی ہیں: پہلی آیت سورۃ البقرہ کی (آیت ۱۷۷) ہے: یہود و نصاریٰ قبلہ کے

سلسلہ میں باہم جھگڑتے تھے کہ ہمارا قبلہ یہ ہے اور تمہارا قبلہ یہ، اللہ عز وجل نے فرمایا: یہ بے فائدہ جھگڑا ہے، قبلہ مشرق کی طرف ہے یا مغرب کی طرف: یہ کوئی نیکی کا کام نہیں، نیکی کے کام یہ ہیں: اللہ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، آسمانی کتابوں پر اور نبیوں پر ایمان لانا۔ اور لوجہ اللہ اپنا مال رشتہ داروں پر، یتیموں پر، مسکینوں پر، مسافروں پر، مانگنے والوں پر اور غلاموں کو آزاد کرنے میں خرچ کرنا اور نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، عہد و پیمان کو پورا کرنا، سختی اور تکلیف میں صبر کرنا اور میدانِ جہاد میں ثابت قدم رہنا: یہ دین کے کام ہیں، جو لوگ یہ کام کرتے ہیں وہ سچے اور پرہیزگار لوگ ہیں۔

اور دوسری: اٹھارہویں پارے کی ابتدائی آیات ہیں جن میں اللہ عز وجل نے فرمایا ہے کہ جو لوگ سات کام کرتے ہیں وہی کامیاب ہوتے ہیں: (۱) نماز خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھتے ہیں (۲) لایعنی باتوں سے بچتے ہیں (۳) زکوٰتیں ادا کرتے ہیں (۴) اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں (۵) امانتوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں (۶) عہد و پیمان پورا کرتے ہیں (۷) اور نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں یعنی ان کے اوقات میں پڑھتے ہیں: جو لوگ یہ سات کام کرتے ہیں وہی آخرت میں کامیاب ہونگے اور جنت کے حقدار ہونگے وہ سدا جنت میں رہیں گے۔

پھر باب میں حدیث لائے ہیں کہ ایمان کے درخت کی ساٹھ سے زیادہ شاخیں ہیں اور شرم ولحاظ ایمان کی بہت اہم شاخ ہے۔

حضرت امام بخاریؒ نے دو آیتیں اور حدیث لکھ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ سب ایمانی امور ہیں یعنی ایمان کی باتیں ہیں، پس یہ سب ایمان کے اجزا ہوئے، اور ایمان کا ذو اجزاء (مرکب) ہونا ثابت ہوا۔

جواب: امام بخاریؒ نے جو عنوان باندھا ہے: باب أمور الإیمان: یہ عنوان محلِ نظر ہے، صحیح عنوان باب أمور البر: ہونا چاہئے۔ کیونکہ آیت پاک میں لفظ بِرّ آیا ہے، جو ایمان واسلام سے عام ہے، اور بِرّ (نیکی کے کام) کے تحت عقیدے بھی آتے ہیں اور اعمال بھی، پس آیت پاک میں مذکور عقائد واعمال بِرّ کے تو اجزا ہوئے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ایمان کے بھی اجزا ہوں! جو نیکی کے کام از قبیل عقائد ہیں وہ ایمان میں داخل ہیں اور جو از قبیل اعمال ہیں وہ اسلام میں داخل ہیں اور دونوں کا مجموعہ بِرّ ہے۔

اور سورۃ المؤمنون میں ﴿الَّذِیْنَ هُمْ﴾ موصول صلہ مل کر ﴿اَلْمُؤْمِنُوْنَ﴾ کی صفت ہیں، اور موصوف صفت میں نہ تو من کل الوجوہ اتحاد ہوتا ہے اور نہ من کل الوجوہ تغایر۔ آپ حضرات شرح عقائد میں پڑھ کر آئے ہیں کہ معتزلہ کہتے ہیں: اللہ کی صفات اللہ کا عین ہیں یعنی اللہ کی صفات اللہ کی ذات سے علاحدہ کوئی چیز نہیں، اور اہل السنہ والجماعہ کہتے ہیں: اللہ کی صفات نہ عینِ ذات ہیں نہ غیرِ ذات، بلکہ من وجہٍ اتحاد ہے اور من وجہ مغایرت جیسے ثوبٌ جمیلٌ میں ثوبٌ کی حقیقت الگ ہے اور جمال اس کا ایک زائد وصف ہے جو ثوبٌ کا نہ عین ہے نہ غیر، اسی طرح یہاں امور سبعہ مؤمنین کی صفتیں ہیں پس وہ ایک کیسے ہو جائیں گی؟ اس لئے حضرت کا یہ دعوی کہ امور سبعہ ایمان کے اجزاء ہیں، غور طلب ہے۔

[۳-] بَابُ أُمُوْرِ الإِيْمَانِ

[۱-] وَقَوْلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللهِ﴾ إِلٰى قَوْلِهِ ﴿الْمُتَّقُوْنَ﴾

[۲-] ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ الآية.

[۹-] حدثنا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْجُعْفِيُّ، قَالَ: ثَنَا أَبُوْ عَامِرٍ الْعَقَدِيُّ، قَالَ: ثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ بِلَالٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ دِيْنَارٍ، عَنْ أَبِيْ صَالِحٍ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قَالَ: "الإِيْمَانُ بِضْعٌ وَسِتُّوْنَ شُعْبَةً، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الإِيْمَانِ"

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایمان کی ساٹھ سے زیادہ شاخیں ہیں اور حیاء (شرم ولحاظ) ایمان کی اہم ترین شاخ ہے۔

تشریحات:

۱- قرآنِ کریم کی بہت سی آیتوں میں اور بہت سی حدیثوں میں امورِ ایمان کا بیان ہے۔ امام بخاریؒ ان میں سے دو جامع آیتیں اور ایک جامع حدیث لائے ہیں اور ان سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ یہ سب امورِ ایمان ہیں پس ایمان مرکب ہوا۔ مگر ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ یہ امورِ ایمان نہیں ہیں، بلکہ امورِ اسلام ہیں، اور ایمان واسلام میں فرق ہے۔

۲- بِضْعٌ: کا اطلاق تین سے نو تک ہوتا ہے ــــــ اور حدیث میں لفظ شعبة آیا ہے جس کے معنی ہیں: شاخ، ٹہنی، اور ترمذی کی روایت میں (حدیث نمبر ۲۶۱۲) بابٌ (دروازے) آیا ہے، اور مسلم شریف میں اس حدیث میں یہ اضافہ ہے: فأفضلها قولُ لا إلٰه إلا الله، وأدناها إماطة الأذى عن الطريق (حدیث نمبر ۵۸) یعنی ایمان کی اعلیٰ ترین شاخ (بہترین عمل) لا إلٰه إلا الله کہنا ہے یعنی اس کلمہ کا ذکر کرنا ہے اور کمترین شاخ (معمولی عمل) راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹادینا ہے۔ اور درمیان میں بہت سی شاخیں ہیں ان میں سے ایک اہم ترین شاخ حیاء (شرم ولحاظ) ہے۔

۳- نبی پاک ﷺ نے ایمان کامل کو کبھی سرسبز تناور درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہے، اور کبھی بڑے محل کے ساتھ۔ یہ تشبیہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ کمی بیشی کا تعلق ایمانِ کامل سے ہے، کیونکہ اگر درخت کے پتے جھڑ جائیں، پھل پھول گرجائیں، شاخیں نہ رہیں، صرف تنا باقی رہ جائے تو بھی درخت باقی رہتا ہے، اگرچہ وہ ناقص ہوتا ہے، اسی طرح جو شخص تمام مُؤْمَن بہ کو مانتا ہے مگر اعمالِ صالحہ نہیں کرتا بلکہ اعمالِ سیئہ کرتا ہے تو اس کا نفس ایمانی موجود ہے مگر وہ کامل ایمان نہیں، اس لئے اس ایمان کی وجہ سے نہ تو جنت کا دخول اوّلی نصیب ہوگا نہ وہ درجات عالیہ کا حق دار بنے گا۔

۴-بعض روایتوں میں ستون شعبة آیا ہے اور بعض میں سبعون شعبة، اس تعارض کے دو حل ہیں، اول: سبعون والی روایت اصل ہے کیونکہ ستون والی روایت خود بخود اس کے ضمن میں آجاتی ہے۔ دوم: پہلے آنحضور ﷺ کو وحی کے ذریعہ ایمان کی ساٹھ شاخوں کی خبر دی گئی، پھر اس میں اضافہ کیا گیا تو آپؐ نے سبعون فرمایا ــــ اور ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ ستون اور سبعون برائے عدد نہیں بلکہ برائے تکثیر ہیں یعنی ایمان کی بہت شاخیں ہیں۔

۵-شرم وحیاء: ایک بنیادی وصف ہے جس کا انسان کی سیرت سازی میں اور معاشرہ کو سنوارنے میں بہت زیادہ دخل ہے، یہی وصف انسان کو بہت سے برے کاموں سے اور بری باتوں سے روکتا ہے۔ اور فواحش ومنکرات سے اس کو بچاتا ہے، اور اچھے اور شریفانہ کاموں پر آمادہ کرتا ہے ــــ اور حیا: اس کیفیت کا نام ہے جس کی وجہ سے ہر نامناسب اور ناپسندیدہ کام سے آدمی کو انقباض ہوتا ہے اور وہ اس کے ارتکاب سے بچتا ہے ــــ پھر حیاء صرف انسانوں کی صفت نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت بھی ہے۔ ابوداؤد (حدیث ۴۰۱۲) میں ہے: إِنَّ اللّٰهَ حَيِيٌّ سِتِّيْرٌ، يُحِبُّ الْحَيَاءَ وَالسَّتْرَ: اللہ تعالیٰ بہت شرم کرنے والے، پردہ پوش ہیں، شرم اور پردہ پوشی کو پسند فرماتے ہیں۔ پس جب یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے تو ضروری ہے کہ مؤمن اس کو اپنے اندر پیدا کرے ــــ اور اللہ تعالیٰ کے حیاء دار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام کام شاندار اور پر حکمت ہوتے ہیں، کوئی کام نامناسب اور برا نہیں ہوتا، پس جس مؤمن میں یہ صفت ہوگی وہ بھی ہمیشہ اچھے کام کرے گا اور برے اور شرم ناک کاموں سے بچے گا ــــ غرض حیاء اور ایمان میں خاص مناسبت ہے اور دونوں میں گہرا تعلق ہے، جس طرح کا تعلق درخت اور اس کی شاخوں میں ہوتا ہے۔

اور حیا صرف ہم جنسوں سے نہیں کی جاتی بلکہ اصل حیا حق تعالیٰ سے کی جاتی ہے۔ ترمذی (أبواب البر والصلة) میں حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی حیا کرو جیسی اس سے حیا کرنی چاہئے، پھر آپؐ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ سر کی اور سر میں جو افکار وخیالات ہیں ان کی حفاظت کرو، اور پیٹ کی اور جو کچھ اس میں ہے ان کی نگرانی کرو، اور موت کے بعد قبر میں جو حالت پیش آئے گی اس کو یاد کرو، جس نے یہ سب کچھ کیا اس نے اللہ سے حیا کی جیسا کہ اس سے حیا کرنے کا حق ہے۔

۶-امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد اس حدیث سے یہ ثابت کرنا ہے کہ اعمال ایمان کا جز ہیں، مگر ہم نے شروع میں یہ بات عرض کی ہے کہ نصوص میں ایمان اور اسلام کا ایک دوسرے پر اطلاق ہوتا ہے، پس اس حدیث میں ایمان سے اسلام مراد ہے۔ علاوہ ازیں: ایمان کے دو معنی ہیں: حقیقی ایمان جس پر نجات کا مدار ہے اور کامل ایمان جو نجات اوّلی کا ضامن ہے، اور جس کی وجہ سے جنت کے بلند درجات ملتے ہیں اور اختلاف جو کچھ ہے وہ پہلے معنی میں ہے، دوسرے معنی میں کوئی اختلاف نہیں، سب اہل حق متفق ہیں کہ اعمالِ صالحہ ایمان کامل کا جز ہیں، پس حیاء بھی دوسرے معنی کے اعتبار سے ایمان کا جزء ہے۔

بابُ المُسْلِمِ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَیَدِهٖ

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں

حدیث: نبی پاک ﷺ نے فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کی زبان سے اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں، اور مہاجر وہ ہے جو ممنوعات شرعیہ کو چھوڑ دے۔

تشریحات:

۱- حدیث میں صرف زبان اور ہاتھ کی ایذاء رسانی کا تذکرہ اس لئے کیا گیا ہے کہ عام طور پر انہی دو اعضاء سے تکلیف پہنچائی جاتی ہے، ورنہ حدیث کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان کی شان یہ ہے کہ لوگوں کو اس سے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے۔

اور المسلمون کی قید اتفاقی ہے، ابن حبان کی روایت میں المسلمون کے بجائے الناس ہے یعنی ایک مسلمان کو تمام انسانوں کے لئے بے آزار ہونا چاہئے۔

اور اس حدیث میں جس ایذاء رسانی کو اسلام کے منافی قرار دیا گیا ہے وہ وہ ایذاء رسانی ہے جو بغیر کسی معقول وجہ کے ہو، مجرموں کو سزا دینا، ظالموں اور مفسدوں کی فساد انگیزی کا سد باب کرنا: مسلمانوں کا فرض منصبی ہے، اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو دنیا امن وراحت سے محروم ہو جائے گی۔

۲- اس حدیث میں ناقص کو کالعدم فرض کر کے کلام کیا گیا ہے ہر زبان میں بات کرنے کا یہ ایک طریقہ ہے، جیسے: مَن تَرَكَ الصَّلاةَ متعمِّدًا فقد كَفَرَ: تارکِ صلوٰۃ ناقص الایمان ہے اس لئے اس کے ایمان کو کالعدم فرض کر کے کافر کہا گیا ہے۔

کفر دو ہیں: ایک بڑا کفر جو حقیقی کفر ہے، دوسرا چھوٹا کفر جس کو فسق وفجور کہتے ہیں، امام بخاری رحمہ اللہ کی تعبیر کفرٌ دون کفر ہے یعنی تارک صلوٰۃ حقیقی کافر نہیں، وہ فاسق ہے مگر ناقص کو کالعدم فرض کر کے فقد کَفَرَ کہہ دیا، ایسا زجر وتوبیخ کے لئے کیا کرتے ہیں، یہاں بھی حدیث میں ایسا ہی کیا گیا ہے۔ جو مسلمان دوسروں کو تکلیف پہنچاتا ہے وہ مسلمان ہے مگر اس کے ایمان کو کالعدم فرض کر کے فرمایا کہ وہ مسلمان نہیں، مسلمان وہی ہے جس کی زبان سے اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

۳- حدیث میں دوسرا مضمون یہ ہے کہ ہجرت صرف یہ نہیں ہے کہ وطن چھوڑ کر دار الاسلام میں چلا آئے، بلکہ حقیقی ہجرت یہ ہے کہ وہ ممنوعات شرعیہ سے بچ جائے، اسی وجہ سے ہجرت اُس جگہ سے فرض ہے جہاں دین پر عمل کرنا مشکل ہے، اور جس دار الکفر میں دین پر عمل کرنے میں غیر معمولی پریشان نہ ہو وہاں سے ہجرت فرض نہیں، پس جو شخص ہجرت کر کے مدینہ آیا مگر اس نے ممنوعات شرعیہ کو نہیں چھوڑا تو اس کی ہجرت بے فائدہ ہے، حقیقی مہاجر وہ ہے جو ممنوعات شرعیہ کو چھوڑ دے۔

فائدہ: جاننا چاہئے کہ الفاظ اپنی دلالت اور خواص سے منفک نہیں ہوتے، پس المسلم اور المُهاجر کے جو معنی اوران کی جو خاصیتیں ہیں وہ ضرور ان میں پائی جانی چاہئیں۔ مُسلِم: کا مادہ ہے: سَلِمَ، جس کے معنی ہیں: محفوظ رہنا اور محفوظ کرنا، پس یہ معنی اور یہ خاصیت لفظ مسلم میں ضرور پائی جانی چاہئے، اس ضابطہ سے آنحضور ﷺ نے یہ حکم متفرع فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ محفوظ رہیں۔ اور جب دوسرے اس کی ایذاء رسانی سے محفوظ ہونگے تو وہ خود بھی دوسروں کی ایذاء رسانی سے محفوظ ہوجائے گا، کیونکہ یہ دنیا گنبد کی صدا ہے اس میں آدمی جو بولتا ہے وہی سنتا ہے۔

اور المهاجر کے معنی ہیں: چھوڑنے والا۔ آپؐ نے اس پر یہ حکم متفرع فرمایا کہ مہاجر وہ نہیں ہے جو وطن چھوڑ کر دارالاسلام میں آجائے بلکہ مہاجر کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ تمام ممنوعات شرعیہ کو چھوڑ دے، پس حقیقی مہاجر ممنوعات شرعیہ کو چھوڑنے والا ہے۔

استدلال: حدیث سے امام بخاریؒ کا استدلال واضح ہے کسی کو تکلیف نہ پہنچانا اور ممنوعات شرعیہ کو چھوڑ دینا ایک عمل ہے، اس کو اسلام کا جزء قرار دیا ہے اور اسلام اور ایمان ایک ہیں پس یہ ایمان کے بھی اجزا ہوئے۔

اور جواب وہی ہے کہ ایمان اور اسلام ایک نہیں، دونوں میں فرق ہے۔ علاوہ ازیں: یہ اعمال: ایمان کامل کے اجزاء ہیں اور اس کا کوئی منکر نہیں۔

[٤-] بَابٌ: الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ

[١٠-] حدثنا آدَمُ بْنُ أَبِيْ إِيَاسٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي السَّفَرِ، وَإِسْمَاعِيلَ، عَنِ الشَّعْبِيِّ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قَالَ: "الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ، وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ"

قَالَ أَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ: وَقَالَ أَبُوْ مُعَاوِيَةَ: حَدَّثَنَا دَاوُدُ بْنُ أَبِيْ هِنْدٍ، عَنْ عَامِرٍ، قَالَ: سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَمْرٍو، يُحَدِّثُ عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

وَقَالَ عَبْدُ الْأَعْلٰى: عَنْ دَاوُدَ، عَنْ عَامِرٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم [انظر: ٦٤٨٤]

وضاحت: امام بخاریؒ نے اس حدیث کی دو سندیں اور بھی لکھی ہیں، پہلی سند (ابومعاویہ والی) اس لئے لائے ہیں کہ اس میں عامر شعبیؒ کا حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے سماع مصرح ہے۔ اور دوسری سند (عبدالاعلی والی) اس لئے لائے ہیں کہ اس میں عبداللہ مطلق ہے، اور حدیث میں جب مطلق عبداللہ بولتے ہیں تو عبداللہ بن مسعودؓ مراد ہوتے ہیں، اس لئے یہ سند لاکر اشارہ کیا کہ یہاں عبداللہ سے ابن مسعود مراد نہیں، بلکہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ مراد ہیں۔

بابٌ: أَیُّ الإسلامِ أَفْضَلُ؟

کونسا اسلام بہتر ہے؟

حدیث: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ وغیرہ نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا کہ کونسا اسلام بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جس کی زبان سے اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں''

تشریحات:

۱-سوال میں مجاز بالحذف ہے، اسلام کے بارے میں نہیں، بلکہ اعمال اسلام کے بارے میں پوچھا گیا تھا، اور قرینہ جواب ہے۔ جس طرح سوال سے جواب سمجھا جاتا ہے، اسی طرح جواب سے بھی سوال کی نوعیت سمجھی جاتی ہے، پس سوال کی تقدیر عبارت ہے: أی خصال الإسلام أفضل؟(۱)

۲-یہ سوال پوچھنے والا کون تھا؟ یہاں روایت میں یہ ہے کہ صحابہ نے پوچھا تھا، اور مسلم شریف میں قلنا ہے، پس حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بھی سوال کرنے والوں میں شامل ہونگے۔ بلکہ معجم طبرانی اور صحیح ابن حبان میں صراحت ہے کہ سوال کرنے والے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ تھے۔

۳-احادیثِ شریفہ کا جائزہ لیا جائے تو اس قسم کے سوال متعدد صحابہ نے کئے ہیں اور آنحضور ﷺ نے ان کے مختلف جواب دیئے ہیں، مثلاً: کسی نے پوچھا: أیُّ الإسلام خیرٌ؟ تو آپؐ نے فرمایا: تُطْعِمُ الطَّعامَ وَتَقْرَأُ السلامَ علی مَن عَرَفْتَ ومَن لَمْ تَعْرِفْ۔ ایک حدیث میں ہے: سُئِلَ عن أَفْضَلِ الإیمان؟ آپؐ نے فرمایا: أن تُحِبَّ للّٰہ، وتُبْغِضَ للّٰہِ، وتُعْمِلَ لسانَكَ من ذکر اللّٰہ، ایک مرتبہ آپؐ نے خود حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: أیُّ عُرَی الإیمان أَوْثَقُ؟ (ایمان کے کنڈوں میں سے کونسا کنڈا سب سے مضبوط ہے؟) حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا: اللّٰہ ورسوله أعلم! آپؐ نے فرمایا: الحُبُّ فی اللّٰہ، والبُغْضُ فی اللّٰہ، والمُوالاۃُ فی اللّٰہ غرض جب سوال ایک ہے تو جواب مختلف کیوں ہے؟

---

(۱) بعض حضرات کے نزدیک تقدیر عبارت ہے: أیُّ ذوی الإسلام أفْضَلُ؟ اور یہ تقدیر بہتر ہے اس لئے کہ جواب میں صاحب اسلام کا ذکر ہے، اور دوسرا قرینہ یہ ہے کہ مسلم شریف کی اسی روایت میں: أیّ المسلمین أفضل ہے۔ اور أیُّ خصال الإسلام أفضل؟ کی تقدیر میں سوال وجواب میں مطابقت نہیں رہتی، سوال میں صفت کا ذکر ہے اور جواب میں موصوف کا، اور علامہ کرمانی رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جواب دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ساتھ ہی علت بھی ذکر کردی جائے۔ یہاں جواب میں خصلت کے ساتھ صاحب خصلت کا بھی ذکر کردیا، یعنی سلامتی: اسلام کے خصال میں سب سے اہم خصلت ہے۔ اور اس کی وجہ سے صاحب خصلت بھی افضل ہوجاتا ہے (ماخوذ از ایضاح البخاری ۱:۲۰۶)

جواب:

۱- سوال تقریباً ایک ہیں بعینہٖ ایک نہیں، اور سوال اگر ذرا بھی مختلف ہوجائے تو جواب مختلف ہوجاتا ہے۔

۲- سائل کے احوال کی رعایت کرکے آپؐ نے جوابات مختلف دیئے ہیں، مثلاً: ایک شخص ڈاڑھی منڈا ہے وہ پوچھتا ہے: سب سے اہم سنت کونسی ہے؟ تو جواب ہوگا: سب سے اہم سنت ڈاڑھی رکھنا ہے۔ دوسرے کی ڈاڑھی غیر مقلدوں جیسی ہے پس جواب ہوگا: ایک مشت سے زائد ڈاڑھی کاٹ لینا سب سے اہم سنت ہے۔ سوال دونوں کا ایک تھا، مگر دونوں کے احوال کی رعایت کرکے جوابات مختلف دیئے اسی طرح آنحضور ﷺ نے بھی سائل کے احوال کی رعایت کرکے جوابات مختلف دیئے ہیں۔

استدلال: حضرت امام بخاریؒ کا استدلال واضح ہے۔ آنحضور ﷺ نے ایذاء رسانی سے بچنے کو اسلام کا جزء قرار دیا ہے، اور اسلام اور ایمان ایک ہیں پس یہ عمل ایمان کا بھی جزء ہوا ——— اور جواب یہ ہے کہ اسلام اور ایمان ایک نہیں، علاوہ ازیں: یہ عمل ایمان کامل کا جزء ہے۔

[٥-] بَابٌ: أَيُّ الإِسْلَامِ أَفْضَلُ؟

[١١-] حدثنا سَعِيْدُ بْنُ يَحْيىَ بْنِ سَعِيْدٍ الأُمَوِيُّ القُرَشِيُّ، قَالَ: ثَنَا أَبِيْ، قَالَ: ثَنَا أَبُوْ بُرْدَةَ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِيْ بُرْدَةَ، عَنْ أَبِيْ بُرْدَةَ، عَنْ أَبِيْ مُوْسَى، قَالَ: قَالُوْا: يَارسولَ اللّٰهِ! أَيُّ الإِسْلَامِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: "مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ"

باَبٌ: إِطْعَامُ الطَّعَامِ مِنَ الإِسْلَامِ؟

غریبوں کو کھانا کھلانا اسلامی عمل ہے

حدیث: ایک شخص نے آنحضور ﷺ سے پوچھا: کونسا اسلام بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''غریبوں کو کھانا کھلانا اور لوگوں کو سلام کرنا، خواہ آپ ان کو پہچانتے ہوں یا نہ پہچانتے ہوں''

تشریحات:

۱- حدیث میں پیشہ ور فقیر مراد نہیں، ان میں سے بعض تو صاحب نصاب ہوتے ہیں، بلکہ حقیقی غریب مراد ہے، اس کو کھانا کھلانا بہترین عمل ہے، اور یہ مسئلہ شامی میں ہے کہ بھکاری کے سلام کا جواب دینا واجب نہیں، کیونکہ اس کا سلام بھی سوال ہے، اگر کچھ دینا ہے تو دیدو، ورنہ سلام کا جواب واجب نہیں۔

۲- اردو محاورہ ہے: سلام کرنا اور سلام کہنا، اور عربی محاورہ ہے: سلام پڑھنا۔ کسی کو سلام کہلوانا ہو تو کہیں گے: اقرأ

مِنّي السلامَ علیه اور سلام پہنچانا ہوتو کہیں گے: فلانٌ یقرأ علیكَ السلام۔

۳-مَن عَرفتَ ومَن لم تعرف میں ملّی معرفت وعدم معرفت مراد نہیں، بلکہ شخصی معرفت وعدم معرفت مراد ہے، ملّی معرفت تو ضروری ہے غیر مسلم کو اسلامی سلام کرنا جائز نہیں، اب مسلمانوں کا عجیب حال ہوگیا ہے۔ ملی معرفت بھی باقی نہیں رہی، راستے میں ایک شخص ملتا ہے، سوچتا ہوں کہ سلام کروں یا نہ کروں، کیونکہ مسلمان ہے: اس کی کوئی پہچان نہیں۔

استدلال: امام بخاریؒ کا استدلال واضح ہے: غریبوں کو کھانا کھلانا اور ہر مسلمان کو سلام کرنا بہترین اسلامی عمل ہے، پس یہ ایمان کا بھی جزء ہوا ـــــ اور جواب بھی واضح ہے کہ یہ دونوں عمل اسلام کے جزء ہیں ایمان کے نہیں، یا ایمان کامل کے جزء ہیں۔

[٦-] بَابٌ: إِطْعَامُ الطَّعَامِ مِنَ الإِسْلَامِ

[١٢-] حدثنا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ، قَالَ: ثَنَا اللَّيْثُ، عَنْ يَزِيْدَ، عَنْ أَبِي الْخَيْرِ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: أَيُّ الإِسْلَامِ خَيْرٌ؟ فَقَالَ: "تُطْعِمُ الطَّعَامَ، وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ" [انظر: ٢٨، ٦٢٣٦]

بابٌ: مِنَ الإِيْمَانِ أَنْ يُّحِبَّ لِأَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ

جو اپنے لئے پسند کرے وہ اپنے بھائی کے لئے پسند کرے: یہ بھی ایمانی عمل ہے

ایمان کے اصل مقام (نکتہ عروج) تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی خود غرض نہ ہو، قرآن کریم میں ہے: ﴿وَمَنْ يُوْقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾: جو لوگ خود غرضی سے بچائے گئے وہی کامیاب ہونے والے ہیں، اور خود غرضی کا علاج یہ ہے کہ آدمی اپنے لئے جو پسند کرے وہی دوسرے مسلمان کے لئے بھی پسند کرے۔

حدیث: نبی ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی (کامل) مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے"

تشریح: یہ حدیث صحیح ابن حبان میں بھی ہے، وہاں الفاظ ہیں: لایَبْلُغُ العبدُ حقیقةَ التقوی حتی یُحبَّ إلخ کوئی شخص تقوی کی حقیقت پا نہیں سکتا جب تک وہ پسند نہ کرے الی آخرہ۔ معلوم ہوا یہاں ایمان بمعنی تقوی ہے، کیونکہ جس طرح ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے ایک حدیث بھی دوسری حدیث کی تفسیر کرتی ہے ـــــ اور اس حدیث میں بھی ناقص کو کالعدم فرض کرکے کلام کیا گیا ہے، خود غرض آدمی مؤمن ہے مگر ناقص الایمان ہے، اس لئے لایُؤْمِنُ کہا۔

[۷-] بَابٌ: مِنَ الإِیْمَانِ أَنْ یُحِبَّ لِأَخِیْهِ ما یُحِبُّ لِنفْسِهِ

[۱۳-] حدثنا مُسَدَّدٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا یَحْیٰی، عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ أَنَسٍ رضی الله عَنْهُ، عَنِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم؛ وَعَنْ حُسَیْنٍ الْمُعَلِّمِ، قَالَ: حَدَّثَنَا قَتَادَةُ، عَنْ أَنَسٍ، عَنِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم قَالَ: "لَایُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنفْسِهِ"

وضاحت: اس حدیث کو حضرت قتادہ سے شعبہ اور حسین معلّم دونوں روایت کرتے ہیں، اور دونوں کی سندوں میں یہ فرق ہے کہ شعبہ نے قتادہ سے بصیغۂ عن روایت کیا ہے اور حسین معلّم نے حدثنا کہا ہے، لیکن چونکہ شعبہ مدلِّس نہیں اس لئے ان کا عنعنہ بمنزلۂ تحدیث ہے، البتہ حضرت قتادہ مدلس ہیں اس لئے ان کی معنعن روایت بغیر کسی توثیق کے قابل قبول نہیں ہوتی اور شعبہ توثیق کے لئے کافی ہیں۔

بابٌ: حُبُّ الرَّسُوْلِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الإِیْمَانِ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ایمانی عمل ہے

حدیث: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کی ماں، باپ اور اس کی اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں ——— دوسری حدیث میں والناس أجمعین بھی ہے یعنی جب تک تمام لوگوں سے زیادہ آپؐ سے محبت نہ ہوجائے کوئی مؤمن نہیں ہوسکتا۔

تشریح: دونوں حدیثوں کا مدعیٰ یہ ہے کہ تکمیل ایمان کے لئے ضروری ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہر چیز سے زیادہ ہو، ماں باپ سے، اولاد سے، مال ودولت سے، اپنی ذات سے اور تمام لوگوں سے اللہ اور ان کے دین کی محبت بڑھی ہوئی ہو، آگے حدیث آرہی ہے: ذَاقَ طَعْمَ الإیمانِ مَنْ رَضِیَ باللهِ رَبًّا وبالإسلام دینا وبمحمدٍ رسولاً: اس شخص نے ایمان کا مزہ چکھا جو اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر راضی ہوگیا، اور دوسری حدیث میں ہے: ثلاثٌ من کنَّ فیه وَجَدَ حلاوَةَ الإیمان: جس میں تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ چکھ لیا: مَن کان اللهُ وَرسولُه أحبَّ إلیه مِمَّا سِواهما: جس کو اللہ اور اس کے رسول تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں، ومَن أَحَبَّ عبدًا لایُحِبُّه إلا للهِ: اور وہ جس سے بھی محبت کرے لوجہ اللہ کرے، ومَن یکرَہ أن یُّعودَ فی الکفر بعد إذ أنقذَهُ اللهُ کما یَکْرَهُ أَن یُلْقٰی فی النار: اور جو کفر میں لوٹنے کو ایسا ناپسند کرے جیسا آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے ——— اور قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ﴾ (البقرۃ آیت ۱۶۵) ایمان والوں کو اللہ سے بہت زیادہ محبت ہوتی ہے، اور سورۃ التوبہ (آیت ۲۴) میں ارشاد پاک ہے: "آپ کہہ دیجئے! اگر تمہارے باپ، اولاد،

بھائی، عورتیں، برادری اور مال جو تم نے کمایا ہے، اور وہ تجارت جس کے بند ہونے کا تمہیں خطرہ ہے اور وہ حویلیاں جن کو تم پسند کرتے ہو اگر تم کو اللہ اور اس کے رسول سے، اور اللہ کی راہ میں لڑنے سے زیادہ محبوب ہوں تو تم اللہ کے حکم کا انتظار کرو، اور اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو راہ نہیں دیتے۔

ان آیات پاک اور احادیث شریفہ سے معلوم ہوا کہ اللہ و رسول اور دین سے محبت ہر چیز سے زیادہ ہونی چاہئے، بخاری ہی میں آگے یہ حدیث آرہی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں جب اپنا جائزہ لیتا ہوں تو آپ کی محبت کو ہر چیز سے بڑھا ہوا پاتا ہوں مگر اپنی ذات سے نہیں، یعنی مجھے اپنی ذات سے زیادہ محبت ہے، آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! تم اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ میری محبت تمہاری ذات سے بھی بڑھ نہ جائے، حضرت عمرؓ سر ڈال کر بیٹھ گئے تھوڑی دیر کے بعد عرض کیا: یا رسول اللہ! اب میں آپ کی محبت اپنی ذات سے بھی زیادہ پاتا ہو، آپ نے فرمایا: الآن یا عمر! اے عمر! اب ایمان کامل ہوا۔

اور محبت کی دو قسمیں ہیں: عقلی اور طبعی۔ عقلی محبت معنویات اور غائب سے ہوتی ہے، اور طبعی محبت محسوسات اور حاضر سے ہوتی ہے، اور قوی محبت عقلی ہے مگر انسان پر غلبہ طبعی محبت کا رہتا ہے، مؤمن کو اللہ و رسول اور دین سے جو محبت ہے وہ عقلی ہے۔ اور آل اولاد، ماں باپ اور مال و دولت سے جو محبت ہے وہ طبعی ہے عام حالات میں طبعی محبت غالب نظر آتی ہے، مگر جب کوئی موقعہ آتا ہے تو عقلی محبت غالب آجاتی ہے، کوئی شخص اللہ و رسول کی شان میں گستاخی کرے تو کوئی مسلمان اس کو برداشت نہیں کرسکتا، وہ مارنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، اگرچہ وہ گستاخی کرنے والا اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ دلیل ہے کہ محبت عقلی قوی ہے۔

ایک واقعہ: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکر جنگ بدر میں کفار کے ساتھ تھے، مسلمان ہونے کے بعد ایک مرتبہ انھوں نے حضرت ابو بکرؓ سے عرض کیا: ابا جان! بدر میں کئی مرتبہ آپ میری تلوار کی زد میں آگئے تھے مگر میں نے باپ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا: بیٹا! اگر تو میری تلوار کی زد میں ایک مرتبہ بھی آجاتا تو میں تجھے نہ چھوڑتا!

استدلال: امام بخاریؒ کا استدلال اس حدیث سے اس طرح ہے کہ محبت ایک عمل ہے جس کو ایمان کا جزء بتایا گیا ہے، پس اعمال: ایمان کا جزء ہوئے —— اور جواب وہی ہے کہ محبت نفس ایمان کا جزء نہیں، بلکہ کمال تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے، یعنی محبت: کامل ایمان کا جزء ہے، نفس ایمان کا جزء ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔

[۸-] بَابٌ: حُبُّ الرَّسُوْلِ صلی اللہ علیہ وسلم مِنَ الإِيْمَانِ

[۱۴-] حدثنا أَبُوْ الْيَمَانِ، قَالَ: ثَنَا شُعَيْبٌ، قَالَ: ثَنَا أَبُوْ الزِّنَادِ، عَنِ الأَعْرَجِ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، أَنَّ رسولَ اللهِ

صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: " وَالَّذِیْ نَفْسِی بِیَدِہِ لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی أَکُوْنَ أَحَبَّ إِلَیْہِ مِنْ وَالِدِہِ وَوَلَدِہِ "

[۱۵-] حدثنا یَعْقُوْبُ بْنُ إِبْرَاھِیْمَ، قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ عُلَیَّةَ، عَنْ عَبْدِ الْعَزِیْزِ بْنِ صُھَیْبٍ، عَنْ أَنَسٍ، عَنِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم، ح: وَحَدَّثَنَا آدَمُ بْنُ أَبِیْ إِیَاسٍ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: " لَایُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی أَکُوْنَ أَحَبَّ إِلَیْہِ مِنْ وَالِدِہِ وَوَلَدِہِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِیْنَ "

بابُ حَلَاوَةِ الإِیْمَانِ

ایمان کی چاشنی

حدیث: نبی ﷺ نے فرمایا: "تین باتیں جس شخص میں ہوں وہ ایمان کا مزہ پاتا ہے: (۱) اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس میں تمام ماسوا سے زیادہ ہو (۲) اور یہ بات ہو کہ جس سے بھی محبت کرے اللہ کے لئے کرے (۳) اور یہ بات ہو کہ کفر کی طرف پلٹنے کو، اِس کے بعد کہ اللہ نے اس کو کفر سے بچالیا، ایسا ناپسند کرے جیسا آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے۔

تشریح:

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کی حلاوت اسی آدمی کو محسوس ہوتی ہے جو اللہ ورسول کی محبت میں ایسا سرشار ہو کہ ہر چیز سے زیادہ اس کو اللہ ورسول سے محبت ہو، اور اس محبت کا اس کے دل پر ایسا قبضہ ہو کہ اگر وہ کسی اور سے بھی محبت کرے تو اللہ ہی کے لئے کرے، اور دین اسلام اس کو اتنا پیارا ہو کہ اس کے چھوڑنے کا خیال اس کے لئے آگ میں گرنے کی تکلیف کے برابر ہو۔

استدلال: امام بخاریؒ کا استدلال یہ ہے کہ پھل کی مٹھاس پھل کا جزء ہوتی ہے، جیسے گلاب کا عرق، رنگ اور خوشبو گلاب کا جزء ہوتی ہیں، پس جب ان تین باتوں سے ایمان کی حلاوت محسوس ہوتی ہے تو یہ چیزیں ایمان کا جزء ہوئیں، اور ایمان کا ذو اجزاء ہونا ثابت ہوا ——— اور جواب وہی ہے کہ یہ باتیں ایمان کامل کا جزء ہیں کیونکہ پھل میں مٹھاس پھل پکنے کے بعد آتی ہے یعنی درجۂ عروج پر پہنچنے کے بعد پیدا ہوتی ہے، اور ان امور کے ایمان کامل کا جزء ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔

[۹-] بَابٌ: حَلَاوَةُ الإِیْمَانِ

[۱۶-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰی، قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَھَّابِ الثَّقَفِیُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَیُّوْبُ، عَنْ أَبِیْ قِلَابَةَ، عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ، عَنِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم، قَالَ: " ثَلَاثٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الإِیْمَانِ:

أَنْ يَكُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ، وَأَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ" [انظر: ۲۱، ۶۰۴۱، ۶۹۴۱]

قوله: ثلاثٌ من كنَّ فيه: کُنَّ کی ضمیر ثلاث کی طرف اور فیہ کی ضمیر مَن کی طرف راجع ہے ــــ اور أن یُحِبَّ المرء: اللہ سے محبّ کی فرع اور اثر ہے، اور أن یکرہ أن یعود دین سے محبت کی فرع اور اثر ہے۔

فائدہ: امام بخاریؒ کا مقصد ان تمام ابواب میں اگرچہ محدثین کے موقف کو مدلل کرنا ہے کہ ایمان مرکب ہے، لیکن ساتھ ہی حضرت نے مرجئہ کی تردید بھی کی ہے کہ وہ لوگ اعمال کو بے حیثیت گردانتے ہیں، یہ ان کی گمراہی ہے، اعمال کے بغیر ایمان بے شاخوں اور بے پتوں کا درخت ہے، چنانچہ پہلے حدیث لاکر ارکانِ خمسہ کی اہمیت بتائی، پھر یہ بتایا کہ اسلام وایمان میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی مسلمان دوسرے کو ضرر نہ پہنچائے، پھر غریبوں کو کھانا کھلانے کا اور سلام کو رواج دینے کا تذکرہ کیا، پھر بتلایا کہ انسان کے اندر خیر اندیشی کا جذبہ اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب وہ ہر ایک کا بھلا چاہے، اور یہ تمام باتیں اسی کے اندر پائی جاتی ہیں جو اللہ ورسول اور دین سے حد درجہ محبت رکھتا، اور جو شخص ترقی کر کے یہ درجہ پالیتا ہے اس کو ایمان کی حلاوت محسوس ہونے لگتی ہے اور وہ اطاعت خداوندی میں سرشار اور معاصی سے بیزار ہو جاتا ہے، اور مقام تقوی تک پہنچ کر دونوں عالم میں بامراد ہوتا ہے۔

بابٌ: عَلَامَةُ الْإِيْمَانِ حُبُّ الْأَنْصَارِ

انصار سے محبت ایمان کی علامت ہے

حدیث: نبی ﷺ نے فرمایا: "انصار سے محبت مؤمن ہونے کی نشانی ہے اور انصار سے بغض وعداوت منافق ہونے کی نشانی ہے"

تشریح:

حدیث کا پہلا مطلب: حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ نے حدیث کا شان ورود یہ بیان کیا ہے کہ مہاجرین کا تعلق مُضر قبائل سے تھا اور انصار کا قحطانی قبائل سے، یہ دونوں بھائی تھے اور دونوں میں دشمنیاں تھیں اور خاندانی دشمنیوں کا ایک ہی حل ہے کہ جدا جدا ہو جائیں، چنانچہ قحطان وطن چھوڑ کر یمن چلا گیا اور مُضر حجاز (تہامہ) میں رہا۔ نبی ﷺ اور قریش مضری ہیں، اور انصار (اوس وخزرج) قحطانی۔ الگ الگ ہو جانے کے بعد بھی ان میں نفرتیں چلتی رہیں، پھر اسلام کا دور آیا۔ اسلام میں مہاجرین کا بڑا مقام ہے، سید الاولین والآخرین کا شمار مہاجرین میں ہے، اور انصار وہ ہیں جن کی وجہ سے اسلام پروان چڑھا، اور انھوں نے مسلمانوں کو مدینہ میں پناہ دی اس لئے اسلام میں انصار کی بھی بڑی اہمیت ہے، لیکن پرانی عداوتوں کی وجہ سے آنحضور ﷺ نے محسوس کیا کہ بعض مہاجرین کے دلوں میں اب

بھی انصار کی نفرت ہے، اس لئے آپ ؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ انصار سے محبت کرو، یہ کامل مؤمن ہونے کی نشانی ہے اور انصار سے بغض وعداوت مت رکھو یہ منافق یعنی اسلام میں غیر مخلص ہونے کی علامت ہے۔

دوسرا مطلب: اور عام طور پر علماء نے حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ انصار سے محبت دین کی فرع ہے اس لئے کہ وہ دین کی حمایت ونصرت کرنے والی اولین جماعت ہے۔ پس ان سے محبت ہونی چاہئے، جسے بھی دین سے محبت ہے وہ انصار سے محبت کرے، کیونکہ جب کسی سے محبت ہوجاتی ہے تو صرف اسی سے محبت نہیں ہوتی بلکہ اس کی آل اولاد، احباب ومتعلقات یہاں تک کہ اس کے گاؤں اور اس کے در ودیوار سے بھی محبت ہوجاتی ہے، مجنوں کا مشہور شعر ہے ـــــ لوگوں نے مجنوں کے نام پر بہت اشعار گڑھے ہیں اردو میں بھی، فارسی میں بھی اور عربی میں بھی وہ اشعار خود مجنوں کے نہیں ہیں لوگوں نے مجنوں کے نام پر بنائے ہیں:

أَمُرُّ على الدِّيار دِيارِ لَيْلٰی ۞ أُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارِ وَذَالجِدَارِ
وما حُبُّ الدِّيار شَغَفْنَ قَلْبِیْ ۞ ولكن حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَ

ترجمہ: میں لیلیٰ کے گاؤں سے گذرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اس دیوار کو......... گاؤں کی محبت نے میرے دل پر قبضہ نہیں کیا بلکہ اس لیلیٰ کی محبت نے میرے دل پر قبضہ کیا ہے جو اس گاؤں میں رہتی ہے۔

غرض جب کسی سے محبت ہوجاتی ہے تو اس کی ہر چیز سے محبت ہوجاتی ہے، اور جب کسی سے نفرت ہوجاتی ہے تو اس کی ہر چیز سے نفرت ہوجاتی ہے، اور یہ دونوں باتیں فطری ہیں۔ چنانچہ فرمایا انصار کی محبت ایمان کی نشانی ہے یعنی وہ ایمان سے ناشی ہے، اور انصار سے نفرت نفاق کی نشانی ہے یعنی وہ اسلام میں عدم اخلاص سے ناشی ہے۔

استدلال: جب انصار سے محبت ایمان کا جزء ہوئی، اور ان سے بغض رکھنا ایمان کے منافی ہوا، تو اعمال کا جزء ایمان ہونا ثابت ہوگیا، کیونکہ حب وبغض قلب کے افعال ہیں۔

جواب: مسجد کے مینارے مسجد کی علامت ہیں، مگر وہ مسجد کا جز نہیں، صرف علامت ہیں، چنانچہ بہت سی مسجدوں میں مینارے نہیں ہوتے، اگر مینارے مسجد کی ماہیت کا جزء ہوتے ان کے بغیر مسجد کا تحقق نہ ہوتا۔ اسی طرح حب انصار بھی ایمان کی علامت ہے مگر جزء نہیں، ہاں کمال ایمان کی دلیل ضرور ہے، اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

[۱۰-] بَابٌ: عَلاَمَةُ الإِيْمَانِ حُبُّ الأَنْصَارِ

[۱۷-] حدثنا أَبُو الْوَلِيْدِ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، قَالَ: أَخْبَرَنِی عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَبْرٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسَ ابْنَ مَالِكٍ، عَنِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم، قَالَ: " آيَةُ الإِيْمَانِ حُبُّ الأَنْصَارِ، وَآيَةُ النِّفَاقِ بُغْضُ الأَنْصَارِ"

[انظر: ۳۷۸٤]

بابٌ

یہ باب بغیر عنوان ہے، اور ایسا باب پہلی مرتبہ آیا ہے، مصری نسخے میں تو وحی کے بیان میں بھی ہر حدیث پر بے عنوان ابواب لگے ہوئے ہیں، مگر ہمارے نسخے میں وہاں ابواب نہیں ہیں، یہاں یہ پہلا بے عنوان باب آیا ہے۔

اور شارحینِ کرام نے پوری کتاب کا جائزہ لے کر ایسے ابواب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

ایک: جو کالفصل من الباب السابق ہوتے ہیں، جیسے حمد وصلوٰۃ کے بعد أما بعد فصل کرنے کے لئے آتا ہے۔ اور اس قسم کے ابواب کی علامت یہ ہے کہ باب کی حدیث کا اوپر والے باب سے گونہ تعلق ہو۔

دوسرے: مستقل ابواب ہوتے ہیں، اور ان کی علامت یہ ہے کہ باب کی حدیث کا گذشتہ باب سے کچھ تعلق نہ ہو، وہ نیا مضمون ہوتا ہے۔ ایسی جگہ امام بخاری رحمہ اللہ طلبہ کی تمرین کے لئے بے عنوان باب رکھ دیتے ہیں کہ خود باب لگاؤ، تاکہ طلبہ میں عنوان قائم کرنے کی صلاحیت پیدا ہو، شارحین بھی ایسی جگہ ترجمہ قائم کرتے ہیں، ہمیں بھی عنوان لگانے کی سعی کرنی چاہئے۔ یہاں پہلی قسم کا باب ہے۔ اوپر باب آیا ہے: علامة الإيمان حب الأنصار۔ اب اس باب میں اس کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ انصار کی اسلام کے تعلق سے سنہری خدمات ہیں، ان کا تقاضا ہے کہ ان سے محبت کی جائے، نفرت نہ رکھی جائے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ مکے میں جب آپ ﷺ کا کوئی ہمنوا نہ رہا، مسلمان اہل مکہ کے ظلم وستم سے پریشان ہو کر آپؐ کے حکم سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تو اس نازک وقت میں انصار نے آپؐ کا اور اسلام کا ساتھ دیا۔ انھوں نے منی کے پاس ایک گھاٹی میں آپؐ سے بیعت کی، اور آپؐ کو مدینہ چلنے کی دعوت دی۔ باب کی حدیث میں اسی کا بیان ہے، پس حدیث کا باب سابق سے گونہ تعلق ہو گیا، اور باب رکھ کر فصل کرنا اس لئے ضروری تھا کہ حدیث میں مستقل نیا مضمون ہے۔

حدیث: ابو ادریس خولانی رحمہ اللہ حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے جو جنگ بدر میں شریک ہوئے ہیں اور وہ گھاٹی والی رات کے بارہ ذمہ داروں میں سے ایک ہیں: روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبکہ آپؐ کے گرد صحابہ کی ایک جماعت تھی کہ مجھ سے بیعت کرو ان شرطوں پر کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، اور چوری نہیں کرو گے، اور زنا نہیں کرو گے، اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے، اور کسی پر ایسا بہتان نہیں لگاؤ گے جس کو تم اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان گھڑو، اور نیک کاموں میں نافرمانی نہیں کرو گے، پس تم میں سے جو ان شرطوں کو پورا کرے گا اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے، اور جو ان میں سے کسی بات کا ارتکاب کرے گا پس وہ دنیا میں سزا دیا گیا تو وہ سزا اس کے لئے کفارہ ہوگی۔ اور جس نے کسی بات کا ارتکاب کیا پھر اللہ نے اس کو چھپا لیا تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، اگر وہ چاہیں گے تو اس سے درگذر فرمائیں گے، اور اگر چاہیں گے تو اس کو سزا دیں گے (حضرت عبادہؓ کہتے ہیں) پس ہم نے آپؐ سے ان باتوں پر بیعت کی۔

تشریح:

حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی توصیف میں ایک بات تو یہ ذکر کی ہے کہ وہ بدری صحابی ہیں، بدری صحابہ کا امت میں بڑا مقام ہے، اور بارگاہ ایزدی سے بواسطۂ لسانِ نبوت ان کو اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ کا پروانہ ملا ہے اور آنحضور ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے: ''جو شخص جنگ بدر میں شریک ہوا وہ ہرگز جہنم میں نہیں جائیگا'' (مسند احمد)

اور حضرت عبادۃ رضی اللہ عنہ کی دوسری فضیلت یہ بیان کی ہے کہ وہ بیعتِ عقبہ ثانیہ میں نقیب (قوم کے ذمہ دار) مقرر کئے گئے تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے مسلسل دس سال تک اہل مکہ کو ایک خدا کی عبادت کی طرف بلایا اور کفر وشرک سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر چند خوش نصیب نفوس کے علاوہ عام طور پر لوگوں نے آپؐ کی مخالفت کی، اور آپؐ کو دعوت سے باز رکھنے کے لئے ہر ناجائز طریقہ اختیار کیا، یہاں تک کہ نبوت کے گیارہویں سال قبیلۂ خزرج کے کچھ لوگ حج کے لئے آئے۔ آنحضور ﷺ حج کے موقعہ پر مکہ آنے والے قبائل کو اسلام کی دعوت دیتے تھے، آپؐ ان لوگوں کے پاس تشریف لے گئے، اپنا تعارف کرایا، ان کو اسلام کی دعوت دی، اور قرآن پاک سنایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سینوں کو اسلام کے لئے کھول دیا، وہ اسی مجلس میں مسلمان ہوگئے، یہ چھ حضرات تھے (1)

یہ حضرات آپؐ سے رخصت ہوکر مدینہ منورہ پہنچے وہ جس مجلس میں بھی بیٹھتے آپؐ کا ذکر کرتے، چنانچہ مدینہ کا کوئی گھر اور کوئی مجلس آپؐ کے ذکر سے خالی نہ رہی، پھر اگلے سال یعنی نبوت کے بارہویں سال بارہ اشخاص آپؐ سے ملنے کے لئے مکہ آئے، پانچ تو ان چھ میں سے تھے باقی سات اور تھے۔ ان حضرات نے رات میں منی کے قریب ایک گھاٹی میں آپؐ سے ملاقات کی اور بیعت ہوئے، یہ پہلی بیعت تھی جس کو بیعت عقبہ اولیٰ کہتے ہیں، حضرت عبادہؓ ان بیعت کرنے والوں میں شامل تھے۔

---

(۱) ان حضرات سے آپؐ کی منی کے پاس اتفاقی ملاقات ہوئی تھی، اور اس موقعہ پر شاید بیعت نہیں لی تھی۔ مگر بعض حضرات نے اس کو بیعت عقبہ اولیٰ لکھا ہے، پس اگلے سال کی بیعت ثانیہ اور اس کے بعد کی بیعت ثالثہ ہوگی۔ اس پہلی ملاقات میں حضرت عبادہؓ نہیں تھے، اور وہ چھ حضرات یہ تھے: ۱-اسعد بن زرارہ ۲-عوف بن الحارث ۳-رافع بن مالک بن عجلان ۴-قطبۃ بن عامر ۵-عقبۃ بن عامر ۶-جابر بن عبداللہ بن رباب رضی اللہ عنہم (یہ مشہور جابر بن عبداللہ نہیں ہیں، اِن کے دادا کا نام حرام ہے)

اور اگلے سال جو بارہ اشخاص خاص ملاقات ہی کے لئے آئے تھے ان سے گھاٹی میں ملاقات کی تھی اور بیعت لی تھی، ان میں حضرت عبادہ شامل تھے، مگر اس موقعہ پر نقیب مقرر نہیں کئے تھے۔ پھر اس کے بعد والے سال ۷۵ اشخاص حاضر ہوئے تھے، ان میں بھی حضرت عبادہ شامل تھے، اور یہ ملاقات بھی گھاٹی میں ہوئی تھی۔ اس موقعہ پر بھی بیعت لی تھی، اور اسی موقعہ پر بارہ نقیب مقرر کئے گئے تھے، ان میں حضرت عبادہؓ بھی نقیب مقرر ہوئے تھے، پس باب کی حدیث میں کونسی بیعت کا ذکر ہے؟ دونوں احتمال ہیں، پہلی بیعتِ عقبہ بھی ہوسکتی ہے اور دوسری بھی، واللہ اعلم

جب یہ لوگ مدینہ واپس ہونے لگے تو آپ ؐ نے عبداللہ بن ام مکتومؓ اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما کو قرآن کی تعلیم کے لئے ان کے ساتھ بھیجا، ان حضرات نے مدینہ میں حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے مکان میں قیام کیا، اور مدینہ کے لوگوں میں دعوت کی محنت شروع کی، جس کے نتیجہ میں بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے، اور آئندہ سال یعنی نبوت کے تیرہویں سال حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مشہور قول کے مطابق پچھتر آدمی حج کے لئے مکہ آئے جن میں تہتر مرد اور دو عورتیں تھیں، انھوں نے بھی اُسی گھاٹی میں بیعت کی۔ یہ بیعتِ عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے، جب سب بیعت کر چکے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں سے بارہ نقیب منتخب فرمائے تھے، اسی طرح میں بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کے اشارے پر تم میں سے بارہ نقیب منتخب کرتا ہوں، اور ان بارہ سے مخاطب ہوکر یہ فرمایا کہ تم اپنی قوم کے کفیل اور ذمہ دار ہو، جیسے حواریین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کے ذمہ دار تھے (طبقات ابن سعد ۱: ۱۵۰) ان بارہ نقیبوں میں حضرت عبادہؓ بھی تھے۔ اور دونوں مرتبہ بیعت کا مضمون ایک ہی تھا۔

بیعت کے معنی:

بَیْعَۃٌ: باع یبیع بَیْعًا کا مصدر ہے، آخر میں عربی میں گول ۃ اور اردو میں لمبی ت لگاتے ہیں، اس کے معنی ہیں: فروخت کرنا، بیچنا۔ اور اصطلاحی معنی ہیں: اپنی جان کو برضاء ورغبت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ جنت کے عوض میں بیچنا۔ حضرات صحابہ نے آنحضور ﷺ کے ہاتھ پر مختلف بیعتیں کی ہیں، یہاں جس بیعت کا ذکر ہے وہ بیعت سلوک ہے، سورۂ ممتحنہ (آیت ۱۰) میں بھی اس بیعت کا ذکر ہے۔

بیعت سلوک: نوافلِ اعمال کرکے جنت کے بلند درجات حاصل کرنے کے لئے بیعت کی جاتی ہے، اور یہ بات جان لینی چاہئے کہ نجات اخروی کے لئے بیعت سلوک ضروری نہیں، ورنہ تمام صحابہ وصحابیات یہ بیعت کرتے، آخرت میں نجات کے لئے ایمان صحیح اور اعمالِ صالحہ کافی ہیں، اور جاہلوں کا یہ خیال کہ پیر کے بغیر نجات نہیں ہوسکتی صحیح نہیں۔

بیعت سلوک کے تعلق سے مختلف نظریے:

جاننا چاہئے کہ بیعتِ سلوک کے تعلق سے دنیا میں تین نظریے پائے جاتے ہیں:

پہلا نظریہ: غیر مقلدین، سلفیوں، نجدیوں اور مودودیوں کا ہے، ان کے نزدیک بیعتِ سلوک بے اصل ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں، بلکہ مودودی صاحب نے تو اس کو چھنیا بیگم کہا ہے، چھنیا بیگم افیم کو کہتے ہیں۔

دوسرا نظریہ: بریلویوں کا ہے، وہ کہتے ہیں: آخرت میں نجات کے لئے بیعت ضروری ہے، اور جس کا کوئی پیر نہیں: اس کا پیر شیطان ہے، بلکہ ان کے جاہل تو کہتے ہیں: گونگے پیر (قرآنِ کریم) سے نجات نہیں ہوگی، بولتا پیر (زندہ پیر) چاہئے۔

تیسرا نظریہ: علمائے دیوبند کا ہے، وہ کہتے ہیں: بیعتِ سلوک کا قرآن وحدیث سے ثبوت ہے، مگر نجات اخروی کے

لئے بیعت ضروری نہیں۔ نجات کا مدار ایمانِ صحیح اور اعمالِ صالحہ پر ہے۔ البتہ بیعتِ سلوک کے دو بڑے فائدے ہیں:

ایک: بیعت نوافل اعمال میں زیادتی اور اس کے ذریعہ جنت میں بلند درجات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ آدمی خود بھی نوافل اعمال کرسکتا ہے مگر تجربہ یہ ہے کہ وہ کامیاب نہیں ہوتا اگر خود کو کسی کے سپرد کردے تو یہ مقصد آسانی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

دوسرا: بیعت کے ذریعہ باطن کی صفائی کی جاسکتی ہے، جس طرح ہمارا ظاہر میلا ہوتا ہے اور اس کو صاف کرنا پڑتا ہے، اسی طرح باطن بھی میلا ہوتا ہے اور اس کی صفائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ باطن کا میل اخلاق رذیلہ ہیں جس کی صفائی آنحضور ﷺ کا فرضِ منصبی تھا، سورۃ البقرۃ (آیت ۱۲۹) میں آنحضور ﷺ کے چار فرائض بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے ایک: ﴿يُزَكِّيهِمْ﴾: ہے یعنی مسلمانوں کے باطن کو صاف کرنا اور ان کو اخلاق حسنہ سے آراستہ کرنا، اور آپ کا ارشاد ہے: بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ: میری بعثت اخلاق حسنہ کی تعلیم کے لئے ہوئی ہے، یہ مقصد بھی بیعت ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتا ہے۔

بیعتِ سلوک کی دفعات اور اس کی تفصیلات:

بیعتِ عقبہ ثانیہ میں آنحضور ﷺ نے صحابہ وصحابیات سے چھ عہد لئے تھے:

۱- اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے: شرک دو ہیں: ایک: شرک جلی ہے جس کو شرک اکبر بھی کہتے ہیں۔ یہ مشرکین کا شرک ہے۔ حدیث میں یہ شرک مراد نہیں کیونکہ بیعت کرنے والے سب مسلمان تھے، دوسرا شرک: شرک خفی ہے، اس کی بہت سی شکلیں ہیں، مثلاً: قبر کا طواف کرنا، قبروں کو سجدہ کرنا، ان کو چومنا، صاحب قبر کی منت ماننا، صاحب قبر کی نیاز کرنا وغیرہ سب شرک کی باتیں ہیں، مگر یہ نیچے کے درجہ کا شرک ہے، اور شرک کا ادنی درجہ نام ونمود ہے، جس طرح شرک جلی سے عمل باطل ہوجاتا ہے، ریاکاری سے بھی عمل خراب ہوجاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: میں شرکاء میں شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں، جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے علاوہ کو شریک کیا تو میں اس عمل سے بیزار ہوں۔ وہ عمل اسی شریک کے لئے ہے (مشکوۃ حدیث ۵۳۱۵) غرض: ہر طرح کے شرک سے بچنا چاہئے شرک جلی سے بھی اور شرک خفی سے بھی، مولانا محمد علی جوہرؒ نے کیا خوب کہا ہے:

توحید تو یہ ہے کہ خدا خود حشر میں کہہ دے ❁ یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے!

۲- چوری نہیں کروگے: شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے حجۃ البالغہ میں لکھا ہے کہ کچھ بندوں کو کمانے کی اچھی راہیں نہیں ملتیں اس لئے وہ بری راہوں کی طرف چل پڑتے ہیں، چوری کمانے کی ایسی ہی بری راہ ہے، جس طرح لڑنا اور مال غنیمت لوٹنا عربوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا: چوریاں کرنا بھی ان کا بہترین مشغلہ تھا، اس لئے آنحضور ﷺ نے دوسرا عہد یہ لیا کہ چوری نہیں کروگے۔

۳-زنا نہیں کروگے: عربوں میں زنا کوئی برائی نہیں تھی، جیسے یورپ اور امریکہ میں زنا کوئی برائی نہیں، ان کی سوچ یہ ہے کہ مرد اور عورت باہمی رضامندی سے جو چاہیں کریں سرکار کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔غرض: عربوں میں زنا عام تھا اس لئے تیسرا عہد زنا کے بارے میں لیا۔

۴-اولاد کو قتل نہیں کروگے: قتل اولاد کا بھی عربوں میں عام رواج تھا، لڑکوں کو رزق کے ڈر سے قتل کرتے تھے اور لڑکیوں کو عار کے خوف سے، اگر لڑکی زندہ رہے گی تو کسی کو داماد بنانا پڑے گا جو بڑی شرم کی بات ہے، حالانکہ خود دوسرے کی لڑکی گھر میں بسائے ہوئے تھے، وہ کوئی شرم کی بات نہیں تھی۔

قرآنِ کریم میں ایک جگہ ہے: ﴿وَلَاتَقْتُلُوْا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ﴾ اور دوسری جگہ ہے: ﴿مِنْ إِمْلَاقٍ﴾ یعنی سردست تنگی ہے، کھانے کے لئے کچھ نہیں پھر اولاد کو کہاں سے کھلائیں گے؟ اس لئے قتل کرتے تھے۔ یہ ﴿مِنْ إِمْلَاقٍ﴾ ہے، اور فی الحال تو تنخواہ سے گذارہ ہوجاتا ہے لیکن اگر بچے زیادہ ہوگئے تو تنخواہ ناکافی ہوجائے گی اس لئے بھی قتل کرتے تھے۔ یہ ﴿خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ﴾ ہے، دونوں وجوہ میں سے کسی بھی وجہ سے قتل کرنا جائز نہیں۔

جاننا چاہئے کہ قتل اولاد کے بہت سے درجات ہیں: پیدا ہونے کے بعد بچہ کو مار ڈالنا، روح پڑنے کے بعد حمل گرادینا، روح پڑنے سے پہلے حمل گرادینا، یہ سب قتل اولاد کی شکلیں ہیں اور سب سے ادنی شکل عزل ہے یعنی مانع حمل صورتیں اختیار کرنا۔ مسلم شریف میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عزل کے متعلق پوچھا گیا، آپؐ نے فرمایا: ذاك الوَأْدُ الْخفِيُّ: یہ چپکے سے بچہ کو زندہ درگور کرنا ہے (مشکوۃ حدیث ۳۱۸۹) اور جب قتل اولاد کے درجات مختلف ہیں تو احکام بھی مختلف ہونگے، تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں: تحفۃ الالمعی (۳: ۵۶۹-۵۷۱)

۵-اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان بہتان گھڑ کر نہیں لاؤگے: تفترونہ بین أیدیکم وأرجلکم: ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں: جھوٹ گھڑنا۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کا بچہ کسی کی طرف منسوب نہیں کروگے، مثلاً: شوہر والی عورت نے زنا کیا اور اس کے حمل کو شوہر کی طرف منسوب کیا، یا کسی مرد نے شوہر والی عورت سے زنا کیا اور حمل کو اس عورت کے شوہر کی طرف منسوب کردیا یہ افتراء ہے —— افتراء کی اور بھی بہت صورتیں ہیں: کہیں کوئی بچہ گرا پڑا ملا اس کو اٹھا کر پال لیا اور کہہ دیا کہ میرا بچہ ہے، یا اسپتال میں نرس سے مل کر چپکے سے دوسرے کا لڑکا رکھ لیا اور اپنی لڑکی اس کے گود میں ڈال دی۔ یہ افتراء کی نہایت گھناؤنی صورت ہے۔

۶-کسی نیک کام میں نافرمانی نہیں کروگے: معروف: وہ کام ہے جو شرعاً جائز ہے، اور منکر: وہ کام ہے جو شرعاً ناجائز ہے۔ اور مشہور حدیث ہے: لاطاعةَ لمخلوقٍ فی معصیة الخالق: اللہ کی نافرمانی والے کام میں کسی کی اطاعت جائز نہیں، صرف جائز کاموں میں بڑوں کی اطاعت کرنی چاہئے، پیر بھی معروف کا حکم دے تو اطاعت کرے ورنہ نہیں۔

اس کے بعد فرمایا: جو عہد و پیمان کا لحاظ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ثواب سے نوازیں گے اور لازوال نعمت جنت کا

وارث بنائیں گے، اور جو عہد و پیمان کا پاس نہیں کرے گا اور کسی گناہ کا ارتکاب کرے گا، تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، چاہیں گے تو سزا دیں گے: دنیا میں یا آخرت میں۔ اور چاہیں گے تو معاف کر دیں گے وہ بڑے بخشنے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔

مسئلہ: بیعتِ سلوک مرد و زن کے لئے یکساں ہے اور اس کی دفعات میں کمی بیشی کر سکتے ہیں، مثلاً ایک شخص غیبت کرتا ہے جب اس کو بیعت کریں گے تو کہیں گے: کہو: غیبت نہیں کروں گا، یا کسی علاقہ میں اغلام کی وبا عام ہے تو وہاں کے لوگوں سے یہ گناہ نہ کرنے کا بھی عہد لیں گے یا کسی جگہ میت کا ماتم کیا جاتا ہے تو وہاں کی عورتوں سے بیعت میں یہ حرکت نہ کرنے کا عہد لیں گے۔

حدود کفارات ہیں یا زواجر؟

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک حدود کفارۂ سیئات ہیں، یعنی حد جاری ہونے سے گناہ معاف ہو جاتا ہے، ان کا استدلال اسی حدیث سے ہے، اور احناف کے نزدیک حدود درحقیقت زواجر ہیں یعنی جھڑکنے والی سزائیں ہیں، وہ گناہوں سے باز رکھتی ہیں، ان سے گناہ معاف نہیں ہوتے، حاشیہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت لکھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حدود کفارہ ہیں یا نہیں؟ میں نہیں جانتا، اور چوری کی سزا والی آیت (المائدہ آیت ۳۸) میں ہے ﴿نکالاً مِنَ اللهِ﴾: یہ عبرتناک سزا ہے۔ معلوم ہوا کہ حدود سزا اور زواجر ہیں، کفارہ نہیں ہیں۔

علاوہ ازیں: اہل حق کا اجماع ہے کہ کبائر کے لئے توبہ شرط ہے، پس حد اسی وقت کفارہ بنے گی جب اس کے ساتھ سچی توبہ مل جائے، خواہ قولی توبہ ہو یا فعلی، قولی توبہ تو ظاہر ہے، اور فعلی توبہ یہ ہے کہ آدمی زندگی کا ورق پلٹ دے، یعنی برائی چھوڑ کر شریعت کی پابندی کرنے لگے تو ان شاء اللہ اس کا گناہ معاف ہو جائے گا۔

جب کسی پر حد جاری ہوتی ہے تو عادی مجرم کی بات تو الگ ہے مگر جس سے اتفاقاً گناہ ہو گیا ہے وہ آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم مصمم کر لیتا ہے، یعنی حدود کے ساتھ فعلی توبہ مل ہی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے حدود کو گناہوں کے لئے کفارہ کہا گیا ہے، ورنہ تمام کبائر کے لئے جو ضابطہ ہے وہی یہاں بھی ہے۔

اور ترمذی شریف میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص نے کسی جرم کا ارتکاب کیا، پھر پشیمان ہوا اور اپنے گناہ کا اعتراف کرنا چاہا اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہما سے مشورہ کیا دونوں نے اس کو جرم کا اعتراف کرنے سے روک دیا، اس سے معلوم ہوا کہ گناہ کی معافی حد پر موقوف نہیں، اصل توبہ ہے۔

غرض گناہ کبیرہ کے لئے بھی سچی پکی توبہ ضروری ہے اور توبہ سے ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے خواہ اس پر حد جاری ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، اور اگر توبہ کرنے سے پہلے مر گیا تو اللہ چاہیں گے تو سزا دیں گے اور معاف فرما دیں تو وہ بڑے

بخشنے والے ہیں۔

[-۱۱] بَابٌ

[-۱۸]حدثنا أَ بُو الْيَمَانِ، قَالَ: أَخبَرَنَا شُعَيْبٌ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، قَالَ: أَخْبَرَنِي أَ بُو إِدْرِيْسَ عَائِذُ اللّٰهِ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ: أَنَّ عُبَادَةَ بْنَ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ــــ وَكَانَ شَهِدَ بَدْرًا، وَهُوَ أَحَدُ النُّقَبَاءِ لَيْلَةَ الْعَقَبَةِ ــــ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ وَحَوْلَهُ عِصَابَةٌ مِنْ أَصْحَابِهِ: "بَايِعُوْنِيْ عَلٰى أَنْ لاَ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا، وَلاَ تَسْرِقُوْا، وَلاَ تَزْنُوْا، وَلاَ تَقْتُلُوْا أَوْلاَدَكُمْ، وَلاَ تَأْتُوْ بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ، وَلاَ تَعْصُوْا فِيْ مَعْرُوْفٍ، فَمَنْ وَفَى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ إِلَى اللّٰهِ، إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ، وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ" فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ.

[انظر: ۳۸۹۲، ۳۸۹۳، ۳۹۹۹، ٤٨٩٤، ٦٧٨٤، ٦٨٠١، ٦٨٧٣، ٧٠٥٥، ٧١٩٩، ٧٢١٣، ٧٤٦٨]

بابٌ: مِنَ الدِّيْنِ الْفِرَارُ مِنَ الْفِتَنِ

فتنوں سے بھاگنا دینداری ہے

جہاں رہ کر دین پر عمل کرنا مشکل ہو وہاں سے ہجرت کرنا فرض ہے، بس نکل کھڑا ہو، اللہ کی زمین بہت کشادہ ہے، اللہ پاک فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً﴾ (النساء۱۰۰) جو اللہ کی راہ میں وطن چھوڑے گا وہ زمین میں بہت جگہ اور کشائش پائے گا، جب روس میں کمیونسٹوں کا غلبہ ہوا اور وہاں دین پر عمل کرنا دشوار ہو گیا تو بہت سے اللہ کے بندے کسی چیز کی پرواہ کئے بغیر نکل کھڑے ہوئے۔ حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب بخاری رحمہ اللہ جو دارالعلوم دیوبند میں مدرس رہے ہیں اور میرے استاذ ہیں، اپنی ہجرت کے بڑے دلدوز واقعات سنایا کرتے تھے۔ دو ہزار آدمی ازبکستان سے نکلے تھے اور ہمالہ کا پہاڑ سر کر کے کشمیر پہنچے تھے، فرماتے تھے کہ صرف چھ سو آدمی کشمیر پہنچے، باقی سب راستے میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ گورنمنٹ نے ان کو اس وقت ایک پروانہ دیا تھا، اس میں کیا لکھا تھا؟ بالکل پڑھا نہیں جاتا تھا، مگر اس کاغذ کا ویلیو اتنا تھا کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں بس سکتے تھے، آخر میں حضرت مدینہ منورہ ہجرت کر کے چلے گئے، اور وہیں انتقال ہو گیا۔

اور جو لوگ وہیں رہ گئے تھے، ہجرت نہیں کی تھی ان کا یہ حال ہو گیا کہ سلام کا جواب بھی نہیں دے سکتے تھے۔ ایک مرتبہ میرا تاشقند، سمرقند کا سفر ہوا، جب ہم نماز پڑھتے تو سیکڑوں مرد اور عورتیں ہمارے گرد اکٹھا ہو جاتے، وہ کہتے تھے: ہمارے آباؤ اجداد بھی ایسا کرتے تھے۔

[۱۲-] بَابٌ مِنَ الدِّیْنِ الفِرَارُ مِنَ الْفِتَنِ

[۱۹-] حدثنا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ مَسْلَمَۃَ، عَنْ مَالِكٍ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِیْ صَعْصَعَۃَ، عَنْ أَبِیْہِ، عَنْ أَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدَرِیِّ، أَنَّہٗ قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: " یُوْشِكُ أَنْ یَکُوْنَ خَیرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ یَتَّبِعُ بِھَا شَعَفَ الْجِبَالِ، وَمَوَاقِعَ القَطْرِ، یَفِرُّ بِدِیْنِہٖ مِنَ الْفِتَنِ"

[انظر: ۳۳۰۰، ۳۶۰۰، ۶۴۹۵، ۷۰۸۸]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ زمانہ جلدی آرہا ہے کہ مسلمان کا بہترین مال وہ بکریاں ہونگی جن کو وہ لئے لئے پھرے گا پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور بارش کی جگہوں پر، وہ اپنا دین لے کر فتنوں سے بھاگے گا!

ترکیب: یُوشك: افعال مقاربہ میں سے ہے، اور جملہ أن یکون اسم وخبر کے قائم مقام ہے، اور خیرَ: کان کی خبر مقدم ہے، اور غَنَمٌ اسم مؤخر، چونکہ یَتَّبِعُ بِھا اس کی صفت آئی ہے اس لئے نکرہ کو اسم (مسندالیہ) بنانا صحیح ہوا ہے بر بناء تخصیص۔

اور خَیرٌ کو اسم بنا کر مرفوع اور غنماً کو خبر بھی بنا سکتے ہیں، گیلری والا نسخہ یہی ہے.........شَعَفٌ: شَعَفَۃٌ کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں: پہاڑ کی چوٹی.........اور اتَّبَعَہٗ کے معنی ہیں: پیچھے پیچھے چلنا اور اتَّبَعَ بھا کے معنی ہیں: لئے لئے چلنا ......مواقع: موقع کی جمع ہے: گرنے کی جگہ اور القَطْر کے یہاں معنی ہیں: بارش اور مواقع القطر سے مراد بیابان ہے۔

تشریح: اس حدیث میں آنحضور ﷺ نے بطور پیشین گوئی یہ بات فرمائی ہے کہ بہت جلدی وہ زمانہ آرہا ہے کہ فتنوں کا ایسا غلبہ ہوگا کہ شہر اور گاؤں میں رہنا دشوار ہوجائے گا، آدمی مجبور ہو کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور بیابانوں میں ٹھکانہ تلاش کرے گا، مثلاً: مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوجائے گی، گھر رہیں تو ضرور کسی کا ساتھ دینا ہوگا، اس لئے آدمی مجبور ہو کر پہاڑوں اور بیابانوں کو اپنا مسکن بنائے گا۔

استدلال: فتنوں سے بچنے کے لئے وطن چھوڑنا ایک عمل ہے جو دین کے تقاضہ سے ہوتا ہے پس یہ دین کا جزء ہوا۔ اور دین وایمان مترادف ہیں پس یہ ایمان کا بھی جزء ہوا۔

جواب: دین وایمان مترادف نہیں، یا یہ ایمان کامل کا جز ہے اس لئے کہ فتنوں کی وجہ سے وطن مؤمن کامل ہی چھوڑتا ہے۔

بابُ قَوْلِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم: " أَنَا أَعْلَمُکُمْ بِاللّٰہِ!" وَأَنَّ الْمَعْرِفَۃَ فِعْلُ الْقَلْبِ لِقَوْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی: ﴿ وَلٰکِنْ یُؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ﴾

علم ومعرفت دل کا فعل ہے اور ایمان کا جزء ہے

امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب میں ایک تو حدیث لکھی ہے جو باب میں آرہی ہے، اور سورۃ البقرہ کی آیت

(۲۲۵) لکھی ہے جو قسم سے متعلق ہے، دونوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ علم ومعرفت قلب کا فعل ہے اور ایمان کا جزء ہے۔

حدیث: صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ کو حکم دیتے تھے تو انہی کاموں کا حکم دیتے تھے جو ان کے بس میں ہوتے تھے یعنی جس پر وہ مداومت کر سکتے تھے (ایک مرتبہ) صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمارا حال آپ کے حال جیسا نہیں، اللہ نے آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کردیئے ہیں (پس آپ کے لئے تھوڑی عبادت بھی کافی ہے مگر ہمارے لئے تھوڑی عبادت کافی نہیں) پس آپ ناراض ہوجاتے یہاں تک کہ غصہ آپ کے چہرے سے محسوس ہوتا، پھر فرماتے: ''بیشک تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا، اور سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا میں ہوں!''

تشریح: اس حدیث میں دو مضمون ہیں:

۱- بندہ انہی اعمال پر مداومت کرسکتا ہے جن پر آسانی سے عمل کیا جاسکے۔ مشکل کام آدمی چند روز تو کرلیتا ہے پھر چھوڑ دیتا ہے، اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو ہمیشہ ایسے کاموں کا حکم دیتے تھے جو آسان ہوں، ایک مستحاضہ کو آپ نے روزانہ پانچ غسل بتائے اور تین غسل بھی، پھر فرمایا: ''یہ تین غسل والا عمل مجھے زیادہ پسند ہے'' کیونکہ وہ عمل کے اعتبار سے آسان ہے۔

بلکہ کوئی اپنی رائے سے سخت عمل شروع کردیتا تو آپ اس کو روک دیتے، اس وجہ سے عام صحابہ کو صوم وصال سے روک دیا، اور حضرت عبداللہ بن عمرو کو ہر دن روزہ رکھنے سے اور رات بھر نفلیں پڑھنے سے روک دیا۔ اور حضرت عثمان بن مظعون کو تبتل سے روک دیا، اور فرمایا: ''میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں، پھر بھی روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ رات میں نفلیں پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور ازواج سے تعلق بھی رکھتا ہوں''

غرض: ہمیشہ روزے رکھنا، رات بھر نفلیں پڑھنا اور بیوی سے بے تعلق رہنا دشوار عمل ہے۔ سادھو سنت، بشپ اور ننیں تجرد کی زندگی گذارتے ہیں، مگر درپردہ سب کچھ کرتے ہیں۔

۲- صحابہ آپ کا مذکورہ طرز عمل دیکھ کر عرض کرتے: یارسول اللہ! آپ تو مغفور لہٗ ہیں، آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ اللہ نے معاف کردیئے ہیں، اور اس کا اعلان بھی کردیا ہے، پس آپ کے لئے تو تھوڑی عبادت بھی بہت ہے، مگر ہمارے لئے تھوڑی عبادت کافی نہیں۔ اس بات پر آپ ناراض ہوجاتے، چہرے سے غصہ محسوس ہونے لگتا، اور فرماتے: ''میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں، اور تم سے زیادہ اللہ کو پہچانتا ہوں!'' یعنی کثرتِ عبادت کا منشا گنہ گار ہونا نہیں ہے، بلکہ معرفتِ خداوندی اس کا منشا ہے، اور وہ مجھے تم سے زیادہ حاصل ہے، پھر بھی میں اعتدال سے عبادت کرتا ہوں، تم غلو کیوں کرتے ہو!

پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے سورۃ البقرہ کی یہ آیت لکھی ہے: ﴿لَایُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْ أَیْمَانِکُمْ، وَلٰکِنْ

یُؤَاخِذُکُم بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ﴾: اللہ تعالیٰ تمہاری بیہودہ قسموں پر (جو تکیہ کلام کے طور پر کھائی گئی جاتی ہیں) پکڑ نہیں کریں گے بلکہ ان قسموں پر داروگیر کریں گے جو تمہارے دلوں نے کمائی ہے، یعنی جو قسمیں تم نے جان بوجھ کر کھائی ہیں ان پر مؤاخذہ ہوگا جان بوجھ کر قسم کھانا معرفت ہے، اور اس کی نسبت قلوب کی طرف کی گئی ہے، معلوم ہوا کہ معرفت دل کا فعل ہے، اور علم اور معرفت ایک چیز ہیں، پس علم بھی دل کا فعل ہوا۔

یہ امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال ہے مگر حضرت نے یہ واضح نہیں کیا کہ علم ومعرفت ایمان کا جزء کیسے ہیں؟ ایمان وتصدیق دل کا فعل ہیں، علم ومعرفت بھی دل کا فعل ہیں اور تقوی بھی دل کا فعل ہے، دل میں تو ہزاروں چیزیں ہوتی ہیں مگر اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ اعمال ایمان کا جزء ہیں؟ جب تک یہ بات واضح نہ ہو مدعی ثابت نہیں ہوسکتا۔

[۱۳-] بابُ قَوْلِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم: "أَنَا أَعْلَمُکُمْ بِاللّٰہِ!"

وَأَنَّ الْمَعْرِفَةَ فِعْلُ الْقَلْبِ لِقَوْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی: ﴿وَلٰکِنْ یُؤَاخِذُکُم بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ﴾

[۲۰-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ، قَالَ: أَنَا عَبْدَةُ، عَنْ هِشَامٍ، عَنْ أَبِیْهِ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: کَانَ رسولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم إِذَا أَمَرَهُمْ: أَمَرَهُمْ مِنَ الْأَعْمَالِ بِمَا یُطِیْقُوْنَ، قَالُوْا: إِنَّا لَسْنَا کَهَیْئَتِكَ یَارسولَ اللّٰہِ! إِنَّ اللّٰہَ قَدْ غَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ، فَیَغْضَبُ، حَتّٰی یُعْرَفَ الْغَضَبُ فِیْ وَجْهِهِ، ثُمَّ یَقُوْلُ: "إِنَّ أَتْقَاکُمْ وَأَعْلَمَکُمْ بِاللّٰہِ أَنَا"

سوال: تمام انبیاء معصوم ہیں، کسی سے گناہ کا صدور ممکن نہیں، اب دو سوال ہیں:

(الف) صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ اعلان کیوں کیا گیا، دوسرے انبیاء کے لئے یہ اعلان کیوں نہیں کیا گیا؟

(ب) جب گناہوں کا وجود ہی نہیں تو معافی کے اعلان کا کیا فائدہ؟

جواب: ایک تقریب پیدا ہوگئی تھی اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں یہ اعلان کیا گیا، اور دوسرے انبیاء کے لئے اعلان کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی، اس لئے اعلان نہیں کیا گیا، اور آپؐ کے لئے جو اعلان کیا گیا وہ بھی بالفرض ہے یعنی فرض کرو کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو وہ معاف ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ اعلان سورۃ الفتح میں ہے۔ اور سورۃ الفتح صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی ہے۔ صلح حدیبیہ کی دفعات مسلمانوں کی توقعات کے خلاف تھیں ان دفعات سے مسلمانوں کے جذبات اس قدر مجروح ہوئے تھے کہ وہ غم سے نڈھال تھے، اور سب سے زیادہ غم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تھا، انھوں نے خدمت نبوی میں حاضر ہوکر عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: کیوں نہیں! حضرت عمرؓ نے عرض کیا: کیا ہمارے

مقتول جنت میں اور ان کے مقتول جہنم میں نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: کیوں نہیں! انھوں نے عرض کیا: پھر ہم اپنے دین کی رسوائی کیوں برداشت کریں؟ حدیث لمبی ہے جو آگے آئے گی، واپسی میں راستہ میں سورۃ الفتح نازل ہوئی، اس میں صلح حدیبیہ کو فتح مبین قرار دیا اور ساتھ ہی اعلان کیا کہ آنحضور ﷺ نے جن شرائط پر صلح کی ہے اگر بالفرض کسی کے ذہن میں وسوسہ آئے کہ نبی ﷺ نے یہ صلح ٹھیک نہیں کی تو وہ سن لے: ہم نے اپنے نبی کی سب اگلی پچھلی کوتاہیاں معاف کردیں، پس کسی کو اس قسم کا وسوسہ دل میں نہیں لانا چاہئے۔ غرض تمام انبیاء معصوم ہیں مگر آنحضور ﷺ کے لئے ایک موقع آیا تھا اس لئے یہ اعلان کیا گیا، دیگر انبیاء کے لئے ایسی کوئی تقریب پیدا نہیں ہوئی تھی اس لئے اعلان نہیں کیا گیا۔

علاوہ ازیں: گناہوں کے چار درجات ہیں: معصیت (نافرمانی) سیئہ (برائی) خطیئة (غلطی) اور ذنب (کوتاہی) ذنب: گناہوں کا سب سے ادنی درجہ ہے، وہ کوتاہی جو آدمی کو عیب دار کردے ذنب کہلاتی ہے۔ اور یہ بات بھی لوگوں کے خیالات کے اعتبار سے تھی ورنہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں، ان سے ادنی درجہ کا گناہ بھی نہیں ہوسکتا، اور یہ اعلان صرف گمان کرنے والوں کے گمان کے اعتبار سے کیا گیا تھا۔

بابٌ: مَنْ كَرِهَ أَنْ يَّعُوْدَ فِيْ الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقٰى فِيْ النَّارِ مِنَ الإِيْمَانِ

کفر سے انتہائی درجہ نفرت ایمانی عمل ہے

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین باتیں جس میں ہوں اس نے ایمان کا مزہ چکھ لیا: جسے اللہ ورسول تمام ماسواء سے زیادہ محبوب ہوں، اور جو کسی سے محبت کرے تو اللہ ہی کے لئے کرے (یہ اللہ سے محبت کی فرع ہے) اور جو کفر میں لوٹنے کو اس کے بعد کہ اللہ نے اس کو دوزخ سے بچالیا آگ میں ڈالے جانے کی طرح ناپسند کرے (یہ دین سے محبت کی فرع ہے)

تشریح: یہ حدیث چار ابواب پہلے گذری ہے، اب تک مثبت پہلو سے اعمال کو ایمان کا جز ثابت کیا تھا، اب منفی پہلو سے اعمال کو ایمان کا جزء ثابت کرتے ہیں۔ کفر میں لوٹنے کو ناپسند کرنا بھی ایمان کا جزء ہے مگر یہ ایمانِ کامل کا جزء ہے یعنی ایمان میں پختہ ہونے کی نشانی ہے، نفس ایمان کا جزء ہونے پر حدیث کی کوئی دلالت نہیں۔

[١٤-] بابٌ: مَنْ كَرِهَ أَنْ يَّعُوْدَ فِيْ الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقٰى فِيْ النَّارِ مِنَ الإِيْمَانِ

[٢١-] حدثنا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم، قَالَ: "ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الإِيْمَانِ: مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَمَنْ أَحَبَّ عَبْدًا لَايُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ، وَمَنْ يَكْرَهُ أَنْ يَعُوْدَ فِيْ الْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْقَذَهُ اللّٰهُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقٰى فِيْ النَّارِ" [راجع:١٦]

بابُ تَفَاضُلِ أَهْلِ الإِيْمَانِ فِيْ الأَعْمَالِ

مؤمنین کے اعمال کا کم وبیش ہونا

کتاب الایمان کے شروع میں جو عام باب تھا اس کا ایک جزء تھا: یزید وینقص: ایمان گھٹتا بڑھتا ہے۔ اب اس کی تفصیل شروع کرتے ہیں۔

مؤمنین کے اعمال ایک درجہ کے نہیں، اور یہ بدیہی بات ہے، اور اعمال ہی ایمان کی کمی بیشی کا سبب ہیں پس ثابت ہوا کہ اعمال ایمان کا جزء ہیں، اور ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

مگر ہم بتا چکے ہیں کہ اعمال ایمانِ کامل کا جزء ہیں، اور ایمانِ کامل میں کمی بیشی ہوتی ہے، اس کا اہل حق میں سے کوئی انکار نہیں کرتا، پس اس باب میں مرجئہ کی تردید ہے، جو اعمال کی حیثیت گھٹاتے ہیں —— اس باب میں دو حدیثیں ہیں:

حدیث (۱): رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے، اور جہنمی جہنم میں۔ تو اللہ تعالیٰ (سفارش کرنے والوں سے) فرمائیں گے: تم ہر اس شخص کو جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان (یا خیر) ہے اس کو جہنم سے نکال لو، پس وہ جہنم سے نکالے جائیں گے درانحالیکہ وہ جل کر کوئلہ ہو چکے ہونگے، پھر ان کو نہر حیات میں ڈالا جائے گا، پس وہ اس میں سے نکلیں گے جیسے دانہ نالے کی جانب میں اگتا ہے، کیا نہیں دیکھتا تو کہ وہ پیلا لپٹا ہوا نکلتا ہے!''

تشریحات:

۱- جب بارش ہوتی ہے تو کوڑا نالے میں بہہ چلتا ہے، پھر پانی اس کو دونوں جانبوں میں نکال دیتا ہے، پس ایک دو دن میں بیج اس کوڑے میں اگ آتے ہیں، اس وقت ان کے پتے پیلے لپٹے ہوئے بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں؛ کوڑے کا ان میں کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ لوگ بھی جو جہنم میں جل کر کوئلہ ہو چکے ہونگے آبِ حیات سے نکل آئیں گے، ان کے بدن نہایت خوبصورت ہونگے، ان پر جہنم کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

پس یہ تروتازگی اور حسن وجمال میں تشبیہ ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ لوگ کتنی دیر میں اس نہر سے نکلیں گے؟ اس کی طرف حدیث میں کوئی اشارہ نہیں۔

۲- امام بخاری رحمہ اللہ کے دو استاذ الاستاذ ہیں: امام مالک اور وہیب۔ دونوں کی روایتوں میں تین فرق ہیں:

اول: امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے استاذ عمرو بن یحییٰ سے بصیغۂ عن روایت کی ہے، اور وہیب کی روایت میں تحدیث ہے۔

دوم: امام مالک کی روایت میں الحیا اور الحیاۃ کے درمیان شک ہے، اور وہیب کی روایت میں بغیر شک کے الحیاۃ ہے۔

سوم: امام مالکؒ کی روایت میں من إیمان ہے اور وہیب کی روایت میں من خیر۔

استدلال: امام مالک رحمہ اللہ کی روایت میں جو من إیمان ہے اس کو اصل مان کر امام بخاریؒ نے باب باندھا ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے، کسی کا ایمان رائی کے دانے کے برابر ہوتا ہے، کسی کا اس سے زیادہ، اور کسی کا پہاڑ جیسا! ۔

جواب:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل الفاظ کیا ہیں؟ یہ بات معلوم نہیں، اگر اصل لفظ من خیر ہے تو امام صاحب کا استدلال ختم! کیونکہ قرآنِ کریم کا تو ہر ہر کلمہ محفوظ ہے اس لئے ہر ہر کلمے سے استدلال درست ہے۔ مگر احادیث کی یہ صورت نہیں۔ صحابہ اور تابعین روایت بالمعنی کرتے تھے، پس اگر راویوں میں الفاظ حدیث میں کوئی اختلاف نہیں تو یہ ظن غالب قائم کیا جاسکتا ہے کہ یہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں، لیکن اگر کسی لفظ میں راویوں میں اختلاف ہوجائے تو اب کسی ایک لفظ پر اصرار مناسب نہیں، اور من خیر کا مطلب ہے کوئی بھی نیک کام، اور مؤمنین میں نیک کاموں میں کمی بیشی بدیہی ہے، اور جب ایمان کی تخصیص نہ رہی تو استدلال ختم ہوگیا۔

علاوہ ازیں: رائی کے دانے کے برابر سے کیا مراد ہے؟ ایمان مراد نہیں ہوسکتا ورنہ ایمان میں تجزی لازم آئے گی، حالانکہ تمام مُؤمَن به پر ایمان لانا ضروری ہے، اس لئے من ایمان سے من عمل مراد لینا ہوگا اور قرینہ من خیر بنے گا اور خیر: اعمال کا نام ہے، پس من ایمان سے بھی اعمال مراد ہونگے۔

علاوہ ازیں: ایمان ایک مخفی چیز ہے اس کو پیکر محسوس ہی سے پہچانا جاسکتا ہے، ترمذی شریف میں حدیث ہے: جب تم کسی کو دیکھو کہ پانچوں نمازیں پابندی سے مسجد میں پڑھتا ہے تو اس کے ایمان کی گواہی دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان ایک مخفی چیز ہے اس کو پیکر محسوس ہی سے پہچانا جاسکتا ہے، پس سفارش کرنے والے لوگ اور فرشتے اعمال ہی سے جہنم میں پہنچے ہوئے مؤمنین کو پہچانیں گے، ایک متفق علیہ روایت میں ہے کہ جب تمام سفارش کرنے والے سفارش کرلیں گے، اور ان کی سفارش سے لوگ جہنم سے نکال لئے جائیں گے تو پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اب رب العزت کی باری ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ مٹھی بھر کر ایسے لوگوں کو دوزخ سے نکالیں گے اور جنت میں ڈالیں گے جنھوں نے کبھی کوئی نیک عمل نہیں کیا، وہ لوگ جنت میں عتقاء الرحمٰن کے نام سے معروف ہونگے (مشکوٰۃ حدیث ۵۵۷۹) اس سے معلوم ہوا کہ ایمان ایک مخفی چیز ہے، اللہ کے علاوہ اس کو کوئی نہیں جان سکتا، اور سفارش کرنے والے لوگ اور فرشتے تو خیر یعنی اعمال ہی کے ذریعے پہچانیں گے، اس لئے بھی من ایمانٍ: من خیر کے معنی میں ہوگا، اور حدیث کا اس مسئلہ سے کہ اعمال ایمان کا جزء ہیں کوئی تعلق نہ ہوگا۔

سوال: من إیمانٍ کو من خیرٍ کے معنی میں کیسے لیا جاسکتا ہے؟ خیر سے تو اعمال مراد ہوتے ہیں، اور اعمال کا تعلق جوارح (اعضاء) سے ہوتا ہے، جبکہ حدیث میں فی قلبه آیا ہے۔ اور قلب میں ایمان ہی ہوتا ہے، پس من خیر کو من ایمان کے معنی میں لینا ہوگا۔

جواب: عمل کا تعلق دورانِ عمل اعضاء سے ہوتا ہے، پھر جب عمل پورا ہوجاتا ہے تو اس کا تعلق دل کے ساتھ ہوجاتا ہے، جیسے نماز اذکار مخصوصہ اور افعال مخصوصہ کا نام ہے، اذکار زبان کا عمل ہے اور افعال اعضاء کا۔ پھر جب نماز پوری ہوجاتی ہے تو دل کے ساتھ اس کا تعلق قائم ہوجاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ یہ بات بیان فرمائی ہے، شاہ صاحب کی تعبیر یہ ہے کہ اعمال جود میں آنے کے بعد ختم نہیں ہوجاتے بلکہ وہ نفس کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ اور نفس کے دامن سے چمٹ جاتے ہیں۔

مثلاً ایک بھینس بھاگتی ہے اس کے پاؤں کے نیچے بچہ آجاتا ہے اور مرجاتا ہے، پھر دوسرا اور تیسرا بچہ اسی طرح کچل جاتا ہے، مگر بھینس کو کوئی احساس نہیں ہوتا، جس بے دردی سے اس نے پہلے بچے کو کچلا ہے اسی بے دردی سے دوسرے اور تیسرے بچے کو بھی کچل دیتی ہے۔ اس کے برخلاف انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اگر اس کی گاڑی کے پہیے میں بچہ آجائے اور مرجائے تو زندگی بھر وہ کانٹا اس کے دل سے نہیں نکلتا، خواہ وہ دیت ادا کردے، یا مقتول کے ورثاء اس کو معاف کردیں!

یہ فرق کیوں ہے؟ اس لئے کہ بھینس کا عمل وجود میں آکر ختم ہوگیا اور انسان کا عمل ختم نہیں ہوا بلکہ اس کے نفس کی طرف لوٹ گیا، اور نفس کے دامن کے ساتھ چمٹ گیا۔ خیر کا تعلق بھی اسی طرح قلب کے ساتھ قائم ہوجاتا ہے۔

حدیث (۲): نبی ﷺ نے فرمایا: ''میں نے خواب میں لوگوں کو دیکھا کہ وہ میرے سامنے پیش کئے جارہے ہیں درانحالیکہ انھوں نے کرتے پہن رکھے ہیں، کسی کا کرتہ پستانوں تک پہنچا ہوا ہے، کسی کا اس سے نیچے ہے، اور میرے سامنے عمر بن الخطاب پیش کئے گئے درانحالیکہ انھوں نے ایسا کرتہ پہن رکھا ہے جس کو وہ گھسیٹ رہے ہیں! صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! آپؐ نے اس کی تعبیر کیا لی؟ آپؐ نے فرمایا: ''دین داری''

تشریح: کرتہ کی تعبیر دین داری متعین نہیں، بلکہ خواب میں لوگوں نے جس طرح چھوٹے بڑے کرتے پہن رکھے تھے اس تناظر میں اس کی تعبیر دین داری ہے۔

قولہ: ما یبلغ الثدی: ثُدِیّ: ثَدْیٌ کی جمع ہے: پستان۔ ہندو عورتیں پستان تک کرتی پہنتی ہیں، بعض لوگوں نے ایسے ہی چھوٹے کرتے پہن رکھے تھے۔

سوال: اس حدیث سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر فضیلت لازم آتی ہے، جبکہ باجماع امت حضرت ابوبکرؓ افضل ہیں۔

جواب: اس منظر میں حضرت ابوبکرؓ تھے اس کی کیا دلیل ہے؟ ممکن ہے وہ نہ ہوں، پس فضیلت کیسے لازم آئے گی؟ اور اگر وہ اس منظر میں تھے تو یہ جزئی فضیلت ہے، جو کلی فضیلت کے معارض نہیں ہوتی، جیسے زید دورے میں اول آیا مگر بکر کے ترمذی میں پچاس نمبر ہیں، اور زید کے ۴۵۔ پس ترمذی کے نمبرات کے اعتبار سے بکر کو فضیلت حاصل ہے، مگر یہ

جزئی فضیلت ہے، اور مجموعی نمبرات کے اعتبار سے زید اول آیا ہے، یہ کلی فضیلت ہے۔

استدلال: اور امام بخاری رحمہ اللہ کا اس حدیث سے استدلال واضح ہے کہ تمام مؤمنین اعمال میں یکساں نہیں، ان میں کمی بیشی ہے اور اعمال ایمان کا جزء ہیں، پس اس میں بھی کمی بیشی ہوگی ——— اور جواب یہ ہے کہ یہ کمی بیشی ایمانِ کامل میں ہے، نفسِ ایمان میں نہیں۔

[١٥-] بابُ تَفاضُلِ أَهْلِ الإِيْمَانِ فِي الأَعْمَالِ

[٢٢-] حدثنا إِسْمَاعِيْلُ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ، عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى المَازِنِيِّ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قَالَ: " يَدْخُلُ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ وَأَهْلُ النَّارِ النَّارَ، ثُمَّ يَقُوْلُ اللّٰهُ: أَخْرِجُوْا مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ، فَيُخْرَجُوْنَ مِنْهَا قَدِ اسْوَدُّوْا، فَيُلْقَوْنَ فِيْ نَهَرِ الْحَيَاءِ أَوِ: الْحَيَاةِ- شَكَّ مَالِكٌ - فَيَنْبُتُوْنَ كَمَا تَنْبُتُ الحِبَّةُ فِيْ جَانِبِ السَّيْلِ، أَلَمْ تَرَ أَنَّهَا تَخْرُجُ صَفْرَاءَ مُلْتَوِيَةً " قَالَ وُهَيْبٌ: حَدَّثَنَا عَمْرٌو: "الحَيَاةِ " وَقَالَ: " خَرْدَلٍ مِنْ خَيْرٍ "

[انظر: ٤٥٨١، ٤٩١٩، ٦٥٦٠، ٦٥٧٤، ٧٤٣٨، ٧٤٣٩]

[٢٣-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ عُبَيْدِ اللّٰهِ، قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ، عَنْ صَالِحٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ، أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا سَعِيْدٍ الْخُدْرِيَّ، يَقُوْلُ: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: " بَيْنَا أَنَا نَائِمٌ رَأَيْتُ النَّاسَ يُعْرَضُوْنَ عَلَيَّ، وَعَلَيْهِمْ قُمُصٌ: مِنْهَا مَا يَبْلُغُ الثُّدِيَّ، وَمِنْهَا مَا دُوْنَ ذٰلِكَ، وَعُرِضَ عَلَيَّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ، وَعَلَيْهِ قَمِيْصٌ يَجُرُّهُ " قَالُوْا: فَمَا أَوَّلْتَ ذٰلك يَارسولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: " الدِّيْنَ "

[انظر: ٣٦٩١، ٧٠٠٨، ٧٠٠٩]

قوله: مادون ذلك: یعنی پہلے کی بہ نسبت نیچا جیسے فوقیت کبھی اوپر کی طرف ہوتی ہے اور کبھی نیچے کی طرف ....**قوله: الدين:** أی أَوَّلتُ الدينَ۔

بابٌ: الْحَيَاءُ مِنَ الإيمان

شرم ایمانی عمل ہے

پہلے (کتاب الایمان باب۲ میں) یہ بات گذری ہے کہ حیاء وہ خوبی ہے جو آدمی کو بہت سی برائیوں سے روکتی ہے، اِس وجہ سے حیا کا ایمان سے خاص رشتہ ہے۔ اور حیا ہر حال میں مطلوب ہے، مگر شرعی امور میں حیا محمود نہیں، شرعی امور تو ہر حال میں کرنے ہیں۔ جیسے ایک شخص کی ماموں کی لڑکی سے منگنی ہوئی ہے، وہ ماموں کے گھر گیا، رات میں اس کو غسل

کی حاجت پیش آگئی اب وہ نہاتا نہیں اور فجر کی نماز قضا کرتا ہے، یہ حیا محمود نہیں، البتہ دنیوی امور میں حیا محمود ہے۔ کچھ لوگ اپنا حق مانگنے میں شرماتے ہیں یہ حیا محمود ہے، نبی پاک ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ آپؐ کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیادار تھے، چنانچہ آپؐ کوئی ناگواری کی بات دیکھتے تو منہ پر نہیں کہتے تھے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ ایک انصاری صحابی کے پاس سے گذرے، وہ اپنے بھائی کو شرم کے سلسلہ میں نصیحت کررہا تھا (امام بخاریؒ کی الادب المفرد میں ہے: وهو يُعاتب أخاه في الحياء: وہ اپنے بھائی کو حیا کے سلسلہ میں ملامت کررہا تھا، وہ کہہ رہا تھا: تو اتنا شرماتا ہے کہ اپنا نقصان کرلیتا ہے) نبی ﷺ نے اس کی بات سنی اور فرمایا: ''رہنے دے حیا ایمانی عمل ہے''

استدلال: امام بخاریؒ نے من تبعیضیہ لیا ہے پس حیاء ایمان کا جزء ہوئی، مگر من کے تبعیضیہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں من اجلیہ بھی ہوسکتا ہے یعنی حیا ایمان کی وجہ سے ہے، حیا ایمان کا تقاضہ ہے۔

[۱۶-] بابٌ: اَلْحَیَاءُ مِنَ الإِیمان

[۲۴-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ یُوْسُفَ، قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، عَنْ أَبِیْهِ، أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَرَّ عَلٰی رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ، وَهُوَ یَعِظُ أَخَاهُ فِی الْحَیَاءِ، فَقَالَ رسولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: "دَعْهُ فَإِنَّ الْحَیَاءَ مِنَ الإِیْمَانِ" [انظر: ۶۱۱۸]

بابٌ: ﴿فَإِنْ تَابُوْا، وَأَقَامُوْا الصَّلٰوةَ، وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ﴾

ایمان واعمال کے بعد کافر قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے

جب دنیا میں ایمان کے ساتھ اعمال کے بغیر رستگاری ممکن نہیں تو آخرت میں ایمان کے باوجود اعمال کے بغیر نجات کیسے ہوسکتی ہے؟ اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''پس اگر وہ (قیدی) توبہ کریں یعنی ایمان لے آئیں اور نماز پڑھیں اور زکوۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو'' (التوبہ آیت ۵) یعنی جب دنیا میں ایمان کے ساتھ اعمال ضروری ہیں تو آخرت میں بدرجۂ اولیٰ ضروری ہونگے، پس مرجئہ اور کرامیہ کا یہ خیال کہ آخرت میں طاعات تو مفید ہیں مگر معاصی مضر نہیں: غلط خیال ہے۔ کیونکہ اعمال سے ایمان قوی ہوتا ہے اور معاصی سے ایمان کمزور پڑتا ہے، اور ایمان کے ساتھ اعمال کے بغیر نہ دنیا میں رستگاری ممکن ہے نہ آخرت میں، پس ایمان میں کمی زیادتی ثابت ہوئی اور مرجئہ پر رد بھی ہوگیا۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں حکم دیا گیا ہوں کہ لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کریں، اور زکوۃ ادا کریں، پس جب انھوں نے یہ کام کئے

تو انھوں نے مجھ سے اپنے خون اور اپنے مال محفوظ کر لئے، مگر حق اسلام کی وجہ سے اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے"

تشریح: یہ حدیث بہت اہم ہے، اسی حدیث کی وجہ سے یہ پیروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، وہ لوگ اس حدیث کا مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک دنیا میں ایک بھی کافر ہے جنگ برابر جاری رکھی جائے، حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی ہے، حدیث کا یہ مطلب نہیں اس لئے حدیث کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے۔

اس حدیث میں جنگ کرنے کا نہیں بلکہ جنگ بندی کا بیان ہے۔ دشمن اگر جنگ کے دوران ایمان لے آئے تو فوراً جنگ بند کردینی ضروری ہے، خواہ اس نے مسلمانوں کو کتنا ہی نقصان پہنچایا ہو، جب وہ ایمان لے آیا تو وہ ہمارا دینی بھائی ہے، اب اس سے لڑنا جائز نہیں، اور جس طرح یہ حکم دشمن قوم کے لئے ہے: فرد کے لئے بھی ہے، اگر کوئی فرد دورانِ جنگ صدق دل سے کلمہ پڑھ لے تو اب اس کو قتل کرنا جائز نہیں۔ آگے یہ واقعہ آرہا ہے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے قبیلۂ جہینہ کے ایک آدمی کو قتل کیا، جس نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا تھا حالانکہ جب وہ حضرت اسامہ کی تلوار کی زد میں آیا تو اس نے کلمۂ طیبہ پڑھ لیا تھا، مگر حضرت اسامہؓ نے یہ خیال کیا کہ یہ جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھ رہا ہے، صدق دل سے مسلمان نہیں ہوا۔ جب اس واقعہ کی آنحضور ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپؐ نے حضرت اسامہؓ سے فرمایا: "کیا کلمہ پڑھنے کے بعد بھی تم نے اس کو قتل کردیا؟" آپؐ نے یہ جملہ بار بار فرمایا، حضرت اسامہؓ تمنا کرنے لگے کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا (بخاری حدیث ۴۲۶۹) اور بخاری ہی میں یہ واقعہ بھی آرہا ہے کہ ایک جنگ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کفار کو اسلام کی دعوت دی، انھوں نے أسلمنا کے بجائے صَبَأْنَا کہا، حضرت خالدؓ نے ان کا مطلب نہیں سمجھا، اور ان کو قتل کرنے کا حکم دیدیا۔ جب آنحضور ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: "اے اللہ! خالد نے جو کیا میں اس سے بری ہوں، میں نے اس کو ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا تھا" (بخاری حدیث ۴۳۳۹)

ان واقعات سے بخوبی یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ اگر دشمن جنگ کے دوران ایمان لے آئے تو فوراً جنگ بند کرنا ضروری ہے اب اس کو قتل کرنا جائز نہیں، مذکورہ حدیث کا صحیح مطلب یہی ہے۔

لیکن اگر یہ حدیث آدھی پڑھی جائے تو غلط فہمی ہوگی، جیسے ﴿لَاتَقْرَبُوْا الصَّلٰوۃَ﴾ پر رک جائیں اور ﴿وَأَنْتُمْ سُکَارٰی﴾ نہ پڑھیں تو مطلب کچھ سے کچھ ہوجائے گا۔ اسی طرح اس حدیث کو بھی آدھی پڑھ کر رک جائیں تو غلط فہمی ہوگی کہ نبی ﷺ کو جنگ کے ذریعہ دین پھیلانے کا حکم دیا گیا تھا، لیکن اگر حدیث پوری پیش نظر رکھی جائے تو یہ غلط فہمی ہرگز نہیں ہوگی، بلکہ صحیح مطلب سمجھ میں آجائے گا کہ حدیث میں جنگ کرنے کا نہیں بلکہ جنگ بندی کا حکم ہے۔

قولہ: یُقِیْمُوْا الصلوۃ اور یُؤْتُوْا الزکاۃ: بطور مثال ہیں، بدنی عبادت میں سے اہم کو لیا ہے اور مالی عبادت میں سے بھی اہم کو لیا ہے، اور حدیث شریف کی مراد پورا دین اسلام قبول کرنا ہے، محض کلمہ پڑھ لینا مراد نہیں۔

قولہ: إلا بحق الإسلام کا مطلب یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اگر لوگ کوئی ایسا جرم کریں جس کی سزا اللہ

کے قانون میں جان یا مال لینا ہو تو حکم خداوندی کے مطابق اس کو سزا دی جائے گی، ایمان لانے سے اور مسلمان کہلانے سے وہ قانونی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے۔

قولہ: حسابھم علی اللہ: کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کلمۂ اسلام پڑھ کر اپنا مؤمن ہونا ظاہر کرے ہم اس کو مؤمن مان کر جنگ بند کر دیں گے، اور اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ کریں گے، لیکن اگر حقیقت میں اس کی نیت میں کھوٹ ہے تو اس کا حساب آخرت میں اللہ تعالیٰ لیں گے، وہ عالم الغیب ہیں، دلوں کے رازوں سے واقف ہیں وہ اس کا پورا پورا حساب چکائیں گے۔

فائدہ(۱): ایمان لانے پر جنگ بند کرنا اس لئے ضروری ہے کہ جہاد کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی کے راستہ پر ڈالا جائے، اور ان کو عذاب ابدی سے بچایا جائے، پس جو شخص اللہ کے دین کو قبول کرلے اور اللہ کی بندگی کا اقرار کر کے آئین وشریعت پر چلنا منظور کرلے اس کے ساتھ جہاد کرنے کے کوئی معنی نہیں، اب جنگ موقوف کر دینا ضروری ہے۔

فائدہ(۲): جہاد کی نوبت اس وقت آتی ہے جب دعوتِ اسلام اور اللہ کی بندگی کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں، لوگ اللہ کے داعیوں کو دعوت کا موقع نہ دیں، یا مسلمانوں کو ستائیں اور دین پر عمل نہ کرنے دیں تو فتنہ فرو کرنے کے لئے تلوار اٹھانی پڑتی ہے، کیونکہ فتنہ پردازی جہاد میں قتل کرنے سے بدتر ہے ﴿وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (البقرہ آیت ۲۱۷) اور ضررِ راشد کو ہٹانے کے لئے ضررِ اخف کو اختیار کرنا بالکل معقول بات ہے۔

[۱۷-] بابٌ: ﴿فَإِنْ تَابُوْا، وَأَقَامُوْا الصَّلٰوةَ، وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾

[۲۵-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُوْ رَوْحٍ الْحَرَمِيُّ بْنُ عُمَارَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ وَاقِدِ ابْنِ مُحَمَّدٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبِيْ يُحَدِّثُ عَنِ ابْنِ عُمَرَ: أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: "أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَيُقِيْمُوْا الصَّلَاةَ، وَيُؤْتُوْا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَ هُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الإِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ"

بابُ مَنْ قَالَ: إِنَّ الإِيْمَانَ هُوَ الْعَمَلُ

ایمان اور عمل میں تساوی کی نسبت ہے

امام بخاری رحمہ اللہ کے ابواب کے سلسلہ میں ایک قاعدہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے حوالہ سے پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت کتاب کے شروع میں پہلے عام باب قائم کرتے ہیں پھر ذیلی ابواب لاتے ہیں۔ دوسرا قاعدہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ

حضرت کبھی دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلاتے ہیں، یعنی کسی دوسرے کی بات نقل کرتے ہیں جو صحیح نہیں ہوتی، مگر وہ بات حضرت کے لئے مفید ہوتی ہے۔ پوری کتاب میں جہاں بھی مَن قال آئے تو وہاں سمجھ لینا چاہئے کہ یہ حضرت کی اپنی بات نہیں ہے، نہ حضرت اس سے متفق ہیں، مگر وہ بات حضرت کے مفید مطلب ہے اس لئے اس کو لائے ہیں۔

اسی طرح جہاں بھی باب کے شروع میں هل: استفہامیہ آئے وہاں یہ مطلب ہوتا ہے کہ مسئلہ اختلافی ہے اور امام صاحبؒ یا تو کوئی فیصلہ نہیں کرسکے یا نہیں کرنا چاہتے، قارئین کے حوالے کرنا چاہتے ہیں کہ وہ خود فیصلہ کرلیں۔

بعض لوگ اعمال وایمان کے درمیان تساوی کی نسبت کے قائل ہوئے ہیں، امام بخاریؒ نے اب تک اعمال کو ایمان کا جزء ثابت کیا ہے، اور جزوکل کے درمیان عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہوتی ہے، مگر یہ فریق کہتا ہے کہ اعمال اور ایمان ایک ہی چیز ہیں ـــــ امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں تین آیتیں اور ایک حدیث لکھی ہے، جس سے اس قائل نے استدلال کیا ہے، پہلے ان کو سمجھ لینا چاہئے پھر جواب دیں گے۔

پہلی دلیل: سورۃ الزخرف کی آیت (۷۲) ہے: ﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾: جنتیوں سے کہا جائے گا: یہ جنت تمہارے ان کاموں کا بدلہ ہے جو تم دنیا میں کیا کرتے تھے، اور جنت درحقیقت ایمان کی جزاء ہے جیسے جہنم کفروشرک کی سزا ہے، پس ﴿بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ کے معنی ہیں: بما كنتم تؤمنون یعنی ایمان کی وجہ سے تمہیں جنت ملی ہے، اور ایمان کو عمل سے اس لئے تعبیر کیا کہ دونوں ایک ہیں۔

دوسری دلیل: سورۃ الحجر (آیت ۹۲) میں ہے: ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ ، عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾: تیرا پروردگار ضرور پوچھے گا سبھی سے، ان کاموں کے بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے، متعدد سلف نے جن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی ہیں اس آیت کی تفسیر لا إلٰه إلا الله کہنے سے کی ہے، یعنی قیامت کے دن ہر شخص سے پوچھا جائے گا کہ وہ لا إلٰه إلا الله کا قائل تھا یا نہیں؟ اور یہ ایمان ہے جس کو عمل سے تعبیر کیا گیا ہے، پس معلوم ہوا کہ اعمال اور ایمان میں تساوی کی نسبت ہے۔

تیسری دلیل: سورۃ الصافات (آیات ۵۵-۶۱) میں ہے: ایک جنتی اور اس سے تعلق رکھنے والے جہنمی میں باتیں ہونگی، جنتی کہے گا: تو دنیا میں مجھے بہت ورغلاتا تھا مگر مجھ پر خداوند کریم کا فضل ہوا کہ میں تیرے بہکاوے میں نہ آیا۔ اور اب موت نہیں آئے گی جو موت آنی تھی وہ آچکی، پس ہم ابدی راحت میں رہیں گے اور تم ابدی عذاب میں ﴿إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ بلاشبہ یہ بڑی کامیابی ہے، یہاں فوز عظیم: سے ایمان مراد ہے۔ پھر فرمایا: ﴿لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ﴾ اسی بڑی کامیابی کو حاصل کرنے کے لئے عمل کرنے والوں کو چاہئے کہ عمل کریں، یعنی ایمان لائیں، اور ایمان کو عمل سے اس لئے تعبیر کیا کہ اعمال اور ایمان ایک ہیں۔

چوتھی دلیل: آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا گیا: أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟ سب سے بہترین عمل کونسا ہے؟ آپؐ

نے فرمایا: ''اللہ ورسول پر ایمان لانا'' سب سے بہترین عمل ہے ــــ سوال عمل کے بارے میں تھا اور جواب ایمان کے ساتھ دیا، پس دونوں میں تساوی کی نسبت ثابت ہوئی۔

جواب: سورۃ الزخرف کی آیت ﴿بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ اپنی اصل پر ہے، ایمان کے معنی میں نہیں، کیونکہ آخرت میں مؤمن کے اعمال صالحہ اس کے ایمان کے تابع کردیئے جائیں گے، پس جنت اگرچہ حقیقت میں ایمان کا صلہ ہے مگر اعمال کا بھی صلہ ہے۔ چنانچہ قرآن وحدیث بھرے پڑے ہیں کہ اگر جنت چاہتے ہو تو ایمان کے ساتھ نیک اعمال کرو، کسی ایک جگہ بھی صرف ایمان پر جنت کو مرتب نہیں کیا، جہاں بھی جنت کا مژدہ سنایا ہے وہاں ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کا تذکرہ ضرور کیا ہے۔

سوال: نصوص قرآنیہ سے پتا چلتا ہے کہ جنت ایمان واعمال کا صلہ ہے، جبکہ آئندہ بخاری میں یہ حدیث آرہی ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہیں جائے گا۔ جو بھی جنت میں جائے گا فضل خداوندی کی وجہ سے جائے گا، صحابہ نے پوچھا: کیا آپ بھی یارسول اللہ! اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہیں جائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا: میں بھی نہیں جاؤنگا، مگر یہ کہ اللہ اپنی مغفرت ورحمت میں مجھے چھپالیں (بخاری حدیث ۶۴۶۷)

جواب: حصولِ جنت کے دو سبب ہیں، ایک قریب، دوسرا بعید۔ سبب قریب ایمان واعمال ہیں، اور سببِ بعید فضل خداوندی ہے، بخاری کی مذکورہ حدیث میں سببِ بعید کا بیان ہے اور اکثر نصوص میں سببِ قریب کا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ پوری کائنات صفات باری کا پَرتَو (اثر، عکس) ہے اور اس دنیا میں جو اسباب ہیں وہ مسببات کے لئے اسباب قریبہ ہیں اور سببِ بعید اللہ کی صفات ہیں، جیسے ہم کھانے سے شکم سیر ہوتے ہیں اور پانی سے سیراب۔ مگر یہ کھانا اور پینا شکم سیری اور سیرابی کے لئے اسباب قریبہ ہیں، اور اللہ کی صفتِ ارادہ ومشیت سبب بعید ہے۔ اللہ چاہیں گے تو ہم سیراب اور شکم سیر ہونگے ورنہ کھاتے کھاتے اور پیتے پیتے پیٹ پھٹ جائے گا، اور کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

غرض نصوص میں زیادہ تر سببِ قریب کا ذکر آتا ہے، لیکن حقیقی سبب اللہ کا فیصلہ ہے۔ بخاری شریف کی حدیث میں اس کا تذکرہ ہے، یعنی ایمان واعمال مغفرت کے لئے اسباب قریبہ ہیں اور سببِ حقیقی اللہ کی رحمت ومغفرت ہے۔

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ حصول جنت کے لئے جو اسباب قریبہ ہیں وہ برائے عمل ہیں ان کو اختیار کرنا ضروری ہے اور اللہ کی صفات اسباب بعیدہ ہیں ان کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے، جیسے: بارہویں پارے کی پہلی آیت ہے: ﴿وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِيْ الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا﴾: مخلوقات کا رزق اللہ کے ذمہ ہے، مگر ذرائع معاش بھی اختیار کرنے ضروری ہیں حدیث میں ہے: حلال روزی کمانا فرض کے بعد کا فرض ہے۔ اور جنگ احد میں آنحضور ﷺ نے اوپر تلے دو لوہے کے کرتے پہنے تھے حالانکہ آپؐ سید المتوکلین تھے، وجہ اس کی یہ تھی کہ احد کا معرکہ بڑا سخت تھا، اور یہ دنیا دار الاسباب ہے، یہاں اسباب اختیار کرنے ضروری ہیں، مگر اللہ پر بھروسہ بھی کرنا ہے کہ جو وہ چاہیں گے وہی ہوگا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ہے کہ جب تمام بھائی بشمول بنیامین مصر کے لئے روانہ ہوئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے وصیت کی کہ سب ایک ساتھ ایک دروازہ سے داخل مت ہونا، الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا تاکہ حاسدوں کی نظر میں نہ آجاؤ اور وہ تمہارے درپئے آزار نہ ہوجائیں، مگر ساتھ ہی حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوگا کہ تمہیں کوئی گزند پہنچے تو میری یہ تدبیر کچھ کام نہ آئے گی۔ اللہ جو چاہیں گے وہ ہوگا۔

سوال: جب تدبیر اللہ کے فیصلہ کو بدل نہیں سکتی تھی تو پھر تدبیر کیوں بتائی؟ یہ فعل عبث ہے اور سمجھ دار آدمی عبث کام نہیں کرتا؟

جواب: تدبیر تو کام نہ آئی مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنا ارمان پورا کرلیا، وہ ارمان تھا: اسباب اختیار کرنا۔ انبیاء خود بھی اسباب اختیار کرتے ہیں اور امت کو بھی اسباب اختیار کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ ایک بدّو نے پوچھا: میں اونٹ کا پاؤں باندھ کر اللہ پر بھروسہ کروں یا اس کو ویسے ہی چرنے کے لئے چھوڑ دوں اور اللہ پر بھروسہ کروں؟ آپؐ نے فرمایا: **اعْقِلْها وَتَوَكَّلْ**: اونٹ کا پاؤں باندھو پھر بھروسہ کرو۔

غرض آیتِ کریمہ اپنے ظاہر پر ہے، اس میں کوئی تاویل نہیں، اور اس میں اعمال کی ترغیب ہے، سورۃ الاعراف (آیت ۴۳) میں ہے کہ جنتی جنت میں بیٹھے باتیں کریں گے، وہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتے ہوئے کہیں گے: اگر خداوند کریم ہماری راہنمائی نہ کرتے تو ہم کبھی جنت میں نہیں پہنچ سکتے تھے، اللہ نے ہماری طرف انبیاء بھیجے، انھوں نے ہماری راہنمائی کی اور ہم جنت نشیں ہوئے۔ ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے ہونگے کہ آواز آئے گی: ﴿ **تِلْكُمُ الْجَنَّةُ الَّتِیْ أُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** ﴾: دنیا میں جو تم عمل کر کے آئے ہو، اس کی وجہ سے یہ جنت تمہیں ملی ہے، پس جنتیوں نے سببِ بعید ذکر کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سببِ قریب ذکر کر کے جنتیوں کو شاد کام کیا۔

بہر حال دنیا دار الاسباب ہے، یہاں اسباب اختیار کرنے ضروری ہیں، مگر ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی رکھنا ہے کہ اصل اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے، اور نصوص میں زیادہ تر اسباب قریبہ کا ذکر آتا ہے۔ مگر آخری سبب اللہ کا فیصلہ ہے، بخاری شریف کی حدیث میں اسی کا تذکرہ ہے۔

اور دوسری آیت بھی اپنے ظاہر پر ہے اس لئے کہ سلف نے اس کی تفسیر **لا إلٰه إلا الله** کہنے سے کی ہے اور یہ اللہ کی وحدانیت کا اقرار ہے، جو زبان کا ایک عمل ہے۔ علاوہ ازیں: اس سے صرف **لا إلٰه إلا الله** کہنا مراد نہیں بلکہ رسالت محمدی اور دین وشریعت پر عمل کیا ہے یا نہیں؟ ان سب کے بارے میں پوچھا جائے گا، پس کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: **الظَّاهِرُ أَنَّ الْمُرَادَ ﴿ لَنَسْأَلَنَّهُمْ ﴾ عَنْ أَعْمَالِهِمْ كلِّها، وَالتَّخْصِيصُ بقوله: لا إلٰه إلا الله دَعْوَى لادليلَ عليها**: اللہ پاک کے ارشاد: ﴿ **لَنَسْأَلَنَّهُمْ** ﴾ کی مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن لوگوں سے تمام اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا، صرف **لا إلٰه إلا الله** کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا، تخصیص کی کوئی دلیل نہیں۔

اور تیسری دلیل کو علامہ عینی رحمہ اللہ نے یہ کہہ کر رد کردیا ہے کہ جو لوگ ﴿فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ﴾ کو فَلْيُؤْمِنِ الْمُؤْمِنُوْنَ کے معنی میں لیتے ہیں ان کا دعوی بلا دلیل ہے جس کو قبول نہیں کیا جاسکتا یہ بات حاشیہ میں ہے، اور ھذا کا مشار الیہ فوز عظیم ہے اور اس سے مراد ایمان واعمال دونوں ہیں۔

اور حدیث میں جو اللہ ورسول پر ایمان لانے کو سب سے افضل عمل قرار دیا گیا ہے اس سے اللہ کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا اقرار کرنا مراد ہے۔ اور یہ زبان کا ایک عمل ہے۔ اور اس کو افضل عمل اس لئے کہا گیا ہے کہ دنیا میں اسی اقرار پر احکام جاری کئے جاتے ہیں۔ غرض حدیث میں تصدیق مراد نہیں بلکہ اقرار مراد ہے۔

[۱۸-] بابُ مَنْ قَالَ: إِنَّ الإِيْمَانَ هُوَ الْعَمَلُ

[۱-] لِقَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى: ﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ أُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ [الزخرف: ۷۲]

[۲-] وَقَالَ عِدَّةٌ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ فِيْ قَوْلِهِ تَعَالٰى ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ، عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾: عَنْ قَوْلِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ [الحجرات: ۹۲]

[۳-] وَقَالَ تَعَالٰى: ﴿لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ﴾ [الصافات: ۶۱]

[۲۶-] حدثنا أَحْمَدُ بْنُ يُوْنُسَ، وَمُوْسَى بْنُ إِسْمَاعِيْلَ، قَالَا: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ: حَدَّثَنَا ابْنُ شِهَابٍ، عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم سُئِلَ: أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: "إِيْمَانٌ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ" قِيْلَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: "الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" قِيْلَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: "حَجٌّ مَبْرُوْرٌ"

[انظر: ۱۵۱۹]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: کونسا عمل افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ ورسول پر ایمان لانا یعنی اقرار کرنا پوچھا گیا: پھر کونسا عمل افضل ہے؟ فرمایا: راہ خدا میں لڑنا، پوچھا گیا: پھر کونسا عمل افضل ہے؟ فرمایا: مقبول حج۔

تشریح: مبرور: بِرّ (نیکی) سے بنا ہے، اس کے معنی ہیں: مقبول۔ اور حج مقبول کی ایک ظاہری علامت ہے اور ایک باطنی۔ ظاہری علامت یہ ہے کہ حج مسائل کا لحاظ کر کے کیا گیا ہو۔ یعنی جو فرائض وواجبات، سنن ومستحبات ہیں ان پر پوری طرح عمل کیا ہو، اور جو ممنوعات ہیں ان سے اجتناب کیا ہو۔ اور علماء نے اس کی باطنی علامت یہ لکھی ہے کہ حج کے بعد زندگی بدل گئی ہو، اگر پہلے ڈاڑھی منڈاتا تھا، کاروبار میں گھپلا کرتا تھا، گالی گلوچ کرتا تھا تو حج کے بعد اس کی زندگی بدل جائے اور وہ نیک صالح بن جائے۔ اور اپنی بری زندگی کا ورق پلٹ دے۔

اور اگر پہلے وہ نیک تھا تو حج کے بعد اس کی نیکی میں اضافہ ہوجائے، اگر یہ علامت پائی جائے تو سمجھنا چاہئے کہ اسے حج مقبول نصیب ہوا۔ اور اگر حاجی کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئے، پہلے کی طرح شتر بے مہار رہے، گالی گلوچ کرتا

پھرے، نماز سے فاغل اور کاروبار میں مشغول رہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کا حج مقبول نہیں ہوا، اسے چاہئے کہ دوبارہ حج کرے اور زندگی سنوارے۔

بابٌ: إِذَا لَمْ يَكُنِ الإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيْقَةِ، وَكَانَ عَلَى الاِسْتِسْلَامِ أَوِ الْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿قَالَتِ الأَعْرَابُ آمَنَّا، قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا﴾ فَإِذَا كَانَ عَلَى الْحَقِيْقَةِ فَهُوَ عَلٰى قَوْلِهِ جَلَّ ذِكْرُهُ: ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الإِسْلَامُ﴾ الآية

کیا ایمان واعمال میں تباین کی نسبت ہے؟

یہ اوپر والے باب کا مقابل باب ہے، دوسرا فریق کہتا ہے: ایمان واعمال کے درمیان تباین کی نسبت ہے، چونکہ اوپر والا باب امام بخاریؒ کے مفید مطلب تھا اس لئے اس رائے کی تردید نہیں کی تھی، اور یہ دوسری رائے امام بخاری رحمہ اللہ کی رائے کے خلاف ہے اس لئے اس کی تردید کرتے ہیں۔

یہ فریق آیت پاک: ﴿قَالَتِ الأَعْرَابُ آمَنَّا﴾: سے استدلال کرتا ہے۔ اس آیت میں آنحضور ﷺ سے کہا گیا ہے کہ آپؐ بدوؤں سے کہہ دیں: آمنّا مت کہو أسلمنا کہو، یعنی یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لائے، بلکہ یہ کہو کہ ہم نے ظاہری انقیاد اور اطاعت قبول کی۔ ابھی تم مؤمن نہیں ہوئے، اس لئے کہ ایمان تمہارے دلوں میں نہیں اترا۔

اس آیتِ شریفہ سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ ایمان اور اسلام دو الگ الگ حقیقتیں ہیں، اسلام ظاہری اعمال کا نام ہے اور ایمان دل کے اعتقاد کا۔ پس ایمان واعمال میں تباین کی نسبت ہوئی۔

دوسری دلیل حدیث جبرئیل ہے، اس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دو مختلف سوال کئے ہیں، اور آپؐ نے جواب دیئے ہیں۔ ما الإیمان؟ کے جواب میں چھ عقیدے بتلائے ہیں اور ما الإسلام؟ کے جواب میں پانچ اعمال۔ یہ بھی دلیل ہے کہ دونوں کے درمیان تباین کی نسبت ہے۔

امام بخاریؒ کا جواب: اسلام کبھی مجازی معنی میں ہوتا ہے، اس وقت اسلام کے معنی ہوتے ہیں: استسلام، یعنی ظاہری انقیاد اور اطاعت قبول کرنا، یا معنی ہوتے ہیں: قتل کے خوف سے اقرار کرنا یعنی زبانی جمع خرچ کرنا۔

دونوں معنی میں فرق: ظاہری طور پر اطاعت قبول کرنے کے بعد جلوت وخلوت میں اس پر باقی رہنا استسلام کہلاتا ہے، جیسے منافقین دل میں کفر چھپاتے تھے مگر ظاہری طور پر پورے منقاد رہتے تھے، اور اگر قتل کے ڈر سے اقرار کیا اور ڈر ہٹا تو کتے کی دم ٹیڑھی ہوگئی، یہ قتل کے خوف سے اطاعت قبول کرنا ہے۔

غرض مذکورہ بالا آیت پاک میں اسلام حقیقی معنی میں نہیں ہے، بلکہ مجازی معنی میں ہے، اس لئے ایمان واسلام کے درمیان تباین کی نسبت نظر آرہی ہے، مگر حقیقی معنی کے اعتبار سے اسلام: ایمان کا مترادف ہے۔ دلیل سورۂ آل عمران کی

آیت (۸۵) ہے: ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللهِ الإِسْلَامُ﴾: اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر دین اسلام ہے۔ یہاں اسلام اپنے حقیقی معنی میں ہے اور آیت شریفہ سے صاف یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دین اور اسلام مترادف ہیں، پس ایمان اور اسلام بھی مترادف ہوئے، اور ان میں تساوی کی نسبت ہوئی۔

جواب: بلاشبہ دین اور اسلام مترادف ہیں مگر اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ اسلام اور ایمان بھی مترادف ہیں؟ دین تو ملت کا نام ہے اور ملت اعتقادات واعمال کا مجموعہ ہے، اور اسلام بھی اعتقاد واعمال کا مجموعہ ہے، چنانچہ ایمان کے بغیر اعمال بیکار ہیں پس آیت سے دین اور اسلام میں تو تساوی کی نسبت ثابت ہوتی ہے، مگر ایمان واسلام میں تساوی کی نسبت ثابت نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں: حدیث جبرئیل میں یہ تاویل نہیں چل سکتی، وہاں ایمان بھی حقیقی معنی میں ہے اور اسلام بھی۔ اور دونوں کے جواب مختلف ہیں، پس تساوی کی نسبت کہاں ہوئی؟

حدیث: جنگ حنین کے بعد جب آنحضور ﷺ نے جعرانہ میں مالِ غنیمت تقسیم فرمایا تو آپؐ نے نئے مسلمانوں کو جن کے دلوں میں ابھی اسلام راسخ نہیں ہوا تھا تالیف قلب کے لئے مال عطا فرمایا۔ اس موقع کا قصہ ہے، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ ایک جماعت کو بلا کر مال دیا۔ اس وقت حضرت سعدؓ آپؐ کے پاس تھے، آپؐ نے ایک شخص (جُعیل بن سراقہؓ) کو چھوڑ دیا انہیں کچھ نہ دیا۔ حالانکہ ان کی دینی حالت میرے نزدیک ان لوگوں سے زیادہ اچھی تھی جن کو آپؐ دے رہے تھے۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ جُعیل کو کیوں نہیں دیتے؟ قسم بخدا! میرا گمان یہ ہے کہ وہ مؤمن ہیں! آپؐ نے فرمایا: ''یا مسلمان ہیں'' میں تھوڑی دیر خاموش رہا پھر جُعیل کے بارے میں میں جو جانتا تھا وہ مجھ پر غالب آیا۔ چنانچہ میں نے دوبارہ عرض کیا: آپ فلاں کو کیوں نہیں دیتے؟ قسم بخدا! میرا گمان یہ ہے کہ وہ مؤمن ہیں، آپؐ نے پھر فرمایا: ''یا مسلمان ہیں'' پھر میں تھوڑی دیر خاموش رہا، پھر جُعیل کے بارے میں میرا علم مجھ پر غالب آیا، چنانچہ میں نے وہی بات پھر عرض کی، اور رسول اللہ ﷺ نے بھی وہی جواب دیا، پھر فرمایا: ''میں ایک شخص کو دیتا ہوں جبکہ دوسرا شخص مجھے اس کی بہ نسبت زیادہ پسند ہوتا ہے، اس اندیشہ سے کہ کہیں اللہ تعالیٰ اس کو جہنم میں اوندھے منہ نہ ڈال دیں'' ـــــ یعنی جو پکا مسلمان ہوتا ہے، اور جس کے دل میں اسلام راسخ ہو چکا ہوتا ہے، جس کے دین وایمان کے سلسلہ میں مجھے کوئی اندیشہ نہیں ہوتا اس کو نہیں دیتا اور اس کو اس کے ایمان کے حوالے کرتا ہوں، اور جو نیا مسلمان ہوا ہے اور ابھی اس کے دل میں اسلام کا پودا جما نہیں، اس کو دیتا ہوں تاکہ وہ ایمان پر جم جائے، ایسا نہ ہو کہ وہ الٹے پاؤں پھر جائے اور اپنی عاقبت خراب کرلے۔

تشریح:

۱- حضرت جُعیل بن سراقہ رضی اللہ عنہ کامل الایمان تھے۔ ان کی تالیف قلب کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے آنحضور

ﷺ نے ان کو مال عنایت نہیں فرمایا، بلکہ ان کو ایمان کے حوالے فرمایا۔

۲-اور أو مسلماً میں آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو ایک مسئلہ سمجھایا ہے کہ امور غیبیہ میں قطعی حکم نہیں لگانا چاہئے۔ کفر وایمان غیبی امور ہیں پس کسی کو قطعی طور پر کافر یا مسلمان نہیں کہنا چاہئے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس کی ظاہری حالت بتاتی ہے کہ وہ صاحب ایمان ہے۔ اور أو حرف عطف ہے یعنی دو باتوں میں تردید کرو کہ مؤمن ہے یا مسلم، قطعیت کے ساتھ مؤمن مت کہو۔

۳-اور صاحب قیل کا حدیث سے استدلال اس طرح ہے کہ أو أحد الأمرین کے لئے آتا ہے، پس مطلب یہ ہوگا کہ جعیل یا تو مؤمن ہیں یا مسلمان، پس دونوں کے درمیان تباین کی نسبت ثابت ہوئی۔

جواب: اور امام بخاری رحمہ اللہ کا جواب یہ ہے کہ یہاں مسلماً مجازی معنی میں ہے یعنی اس کے معنی استسلام کے ہیں۔ ظاہری انقیاد واطاعت مراد ہے اس لئے دونوں میں تباین نظر آرہا ہے ورنہ حقیقی معنی کے اعتبار سے اسلام اور ایمان مترادف ہیں۔

[۱۹-] بابٌ: إِذَا لَمْ يَكُنِ الإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيْقَةِ، وَكَانَ عَلَى الإِسْتِسْلَامِ أَوِ الْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿قَالَتِ الأَعْرَابُ آمَنَّا، قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا﴾ فَإِذَا كَانَ عَلَى الْحَقِيْقَةِ فَهُوَ عَلَى قَوْلِهِ جَلَّ ذِكْرُهُ: ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الإِسْلَامُ﴾ الآية

[۲۷-] حدثنا أَبُو الْيَمَانِ، قَالَ: أَخْبرَنَا شُعَيْبٌ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ عَامِرُ بْنُ سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ، عَنْ سَعْدٍ: أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم أَعْطَى رَهْطًا، وَسَعْدٌ جَالِسٌ، فَتَرَكَ رَسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم رَجُلاً، هُوَ أَعْجَبُهُمْ إِلَيَّ، فَقُلْتُ: يَارسولَ اللّٰهِ! مَالَكَ عَنْ فُلاَنٍ؟ فَوَ اللّٰهِ إِنِّيْ لَأَرَاهُ مُؤْمِنًا! فَقَالَ: "أَوْ مُسْلِمًا" فَسَكَتُّ قَلِيْلاً، ثُمَّ غَلَبَنِيْ مَا أَعْلَمُ مِنْهُ، فَعُدْتُ لِمَقَالَتِيْ، فَقُلْتُ: مَالَكَ عَنْ فُلاَنٍ؟ فَوَاللّٰهِ إِنِّيْ لَأَرَاهُ مُؤْمِنًا! فَقَالَ: "أَوْ مُسْلِمًا"، فَسَكَتُّ قَلِيْلاً، ثُمَّ غَلَبَنِيْ مَا أَعْلَمُ مِنْهُ، فَعُدْتُ لِمَقَالَتِيْ، وَعَادَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، ثُمَّ قَالَ: "يَا سَعْدُ إِنِّيْ لَأُعْطِى الرَّجُلَ، وَغَيْرُهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْهُ، خَشْيَةَ أَنْ يَكُبَّهُ اللّٰهُ فِي النَّارِ" وَرَوَاهُ يُوْنُسُ، وَصَالِحٌ، وَمَعْمَرٌ، وَابْنُ أَخِي الزُّهْرِيِّ، عَنِ الزُّهْرِيِّ. [انظر: ۱۴۷۸]

باب کا ترجمہ: جب اسلام کے حقیقی معنی مراد نہ ہوں، بلکہ ظاہری انقیاد اور قتل کا خوف مراد ہو (تو تباین کی نسبت سمجھ میں آئے گی) اور اسلام ان معانی میں آتا ہے، اللہ پاک کا ارشاد ہے: بدوؤں نے کہا: ہم ایمان لائے، آپ کہیں تم ایمان نہیں لائے، بلکہ کہو ہم نے ظاہری طور پر تابعداری قبول کی یا قتل کے ڈر سے سپر ڈالی (اس آیت میں اسلام کے مجازی

معنی ہیں، اس لئے تباین کی نسبت مفہوم ہوتی ہے) پس جب اسلام کے حقیقی معنی ہوں تو وہ (ایمان کا مترادف ہوگا) جیسے ارشاد پاک ہے: معتبر دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے (پس دین اور اسلام مترادف ہوئے، اور دین ہی کا نام ایمان ہے، پس اسلام اور ایمان بھی مترادف ہوئے) (عبارت میں تعقید ہے، غور کریں گے تب بات سمجھ میں آئے گی)

لغات: رھط: کا اطلاق تین سے دس تک ہوتا ہے......أَری: معروف کے معنی ہیں: آنکھ سے دیکھنا۔ اور أُری: مجہول کے معنی ہیں: گمان کرنا، اور ایمان آنکھ سے دیکھنے کی چیز نہیں اس کو صرف عقل سے پہچانا جا سکتا ہے، اس لئے مجہول پڑھنا بہتر ہے......... أوْ مسلما: بعض حضرات نے أَوَ پڑھا ہے، اس صورت میں واو عاطفہ، اور ہمزہ استفہام کے لئے ہوگا۔ مگر بڑے شراح أوْ حرف تردید پڑھتے ہیں۔

بابٌ: إِفْشَاءُ السَّلَامِ مِنَ الإِسلامِ

سلام کو رواج دینا اسلامی عمل ہے

ہر مسلمان کو سلام کرنا، خواہ معرفت ہو یا نہ ہو، ایک اسلامی عمل ہے، اور ایمان و اسلام مترادف ہیں، پس سلام کو رواج دینا ایمان کا جزء ہوا —— علماء نے لکھا ہے: سلام کا جواب دینا اگرچہ واجب ہے، اور سلام کرنا سنت ہے، مگر یہ ایسی سنت ہے جس کا ثواب واجب سے زیادہ ہے —— اور حدیث میں ہے: سلام کرنے میں پہل کرنے والا تکبر سے پاک ہوتا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۴۶۶۶) —— دوسری حدیث میں ہے: سلام کرنے میں پہل کرنے والا اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۴۶۴۶)

روایت: حضرت عمار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جس شخص نے اپنے اندر تین باتیں جمع کرلیں اس نے ایمان کو سمیٹ لیا: ۱- اپنے ساتھ انصاف کرنا ۲- جہاں کے لئے سلام خرچ کرنا یعنی ہر مسلمان کو سلام کرنا۔ ۳- تنگ دستی میں خرچ کرنا۔ حضرت عمارؓ نے سلام کے رواج دینے کو ایمان کا ایک حصہ قرار دیا ہے، معلوم ہوا کہ یہ عمل ایمان کا جزء ہے۔

اور باب کی حدیث ابھی گذری ہے۔ سائل پوچھتا ہے: کونسا اسلام بہتر ہے؟ آپؐ نے جواب میں دو عمل بتائے، معلوم ہوا کہ اعمال اسلام کا جزء ہیں۔ اور اسلام اور ایمان ایک ہیں۔ پس اعمال ایمان کے بھی اجزاء ہوئے۔

اور جواب یہ ہے کہ ایمان و اسلام ایک نہیں، دونوں میں فی الجملہ فرق ہے۔ نیز ایمان سے ایمان کامل مراد ہے، اور اعمال ایمان کامل کا جزء ہیں اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

تشریح: حضرت عمارؓ کے قول میں دو باتیں وضاحت طلب ہیں:

۱- اپنے ساتھ انصاف کرنا کیا ہے؟ دوسروں کے معاملہ میں انصاف کرنا تو ہر کوئی جانتا ہے اور کرتا ہے، اور اپنے اور اپنے متعلقین کے معاملہ میں انصاف کرنے کو بھی ہر کوئی جانتا ہے، مگر یہ کام مشکل ہے، قوی ایمان والا ہی یہ کام کرسکتا

ہے۔حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ جب خلیفہ ہوئے تو انھوں نے بنو امیہ کی ناجائز املاک بحکومت ضبط کرلیں، یہاں تک کہ اپنی اہلیہ کا قیمتی ہار بھی بیت المال میں داخل کرادیا۔اور دار العلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ نے اپنے پوتے کے معاملہ میں دو فیصد غیر حاضری کی بھی رعایت نہیں کی، اور اس کو سالانہ امتحان میں شریک نہیں کیا۔یہ ہے اپنی ذات کے ساتھ انصاف کرنا۔

۲- تنگ دستی میں خرچ کرنا بھی کامل ایمان کی دلیل ہے۔کشادگی میں تو سب خرچ کرتے ہیں، مگر ناداری کی حالت میں جوڑ کر خرچ کرنا جُہد المقل (غریب کی انتہائی کوشش) ہے، اور اس کی اللہ کے نزدیک بڑی قیمت ہے۔

[۲۰-] بابٌ: إِفْشَاءُ السَّلَامِ مِنَ الإِسلامِ

وَقَالَ عَمَّارٌ: ثَلَاثٌ مَنْ جَمَعَهُنَّ فَقَدْ جَمَعَ الإِيْمَانَ: الإِنْصَافُ مِنْ نَفْسِكَ، وَبَذْلُ السَّلَامِ لِلْعَالَمِ، وَالإِنْفَاقُ مِنَ الإِقْتَارِ.

[۲۸-] حدثنا قُتَيْبَةُ، قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ، عَنْ يَزِيْدَ بْنِ أَبِيْ حَبِيْبٍ، عَنْ أَبِي الْخَيْرِ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو: أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: أَيُّ الإِسْلَامِ خَيْرٌ؟ قَالَ: "تُطْعِمُ الطَّعَامَ، وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ" [راجع:۱۲]

بابُ كُفْرَانِ الْعَشِيْرِ، وَكُفْرٌ دُوْنَ كُفْرٍ

شوہر کی ناشکری ایمان کے منافی عمل ہے، اور کفر اور کفر برابر نہیں

اب منفی پہلو سے ابواب شروع ہو رہے ہیں، جب اعمال صالحہ ایمان کا جزء ہیں تو ان کی اضداد یعنی اعمال سیئہ ایمان کے منافی ہونگے، مثلاً: شوہر کے احسانات کی ناشکری ایک بہت برا عمل ہے جو ایمان کے منافی ہے اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کفر کا اطلاق کیا ہے۔اسی طرح نماز نہ پڑھنا بھی ایمان کے منافی عمل ہے، اس پر بھی کفر کا اطلاق آیا ہے، مگر یہاں بڑا کفر مراد نہیں، بلکہ چھوٹا کفر مراد ہے۔کفر کے بھی درجات ہیں، ایک: بڑا کفر ہے جو مشرکین کرتے ہیں، جس کی وجہ سے آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے، اور دوسرا کم درجہ کا کفر ہے جو فقہاء کی اصطلاح میں فسق کہلاتا ہے۔اور فاسق کا ایمان ناقص ہوتا ہے اور ناقص کو کبھی کالعدم فرض کرکے کلام کرتے ہیں، یہاں ناقص ایمان کو بالکل معدوم فرض کرکے کافر کہا گیا ہے، ورنہ حقیقت میں شوہر کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے اور نماز چھوڑنے کی وجہ سے اسلام سے خارج نہیں ہوجاتا۔

اور امام بخاری رحمہ اللہ نے باب میں کفر کی یہ تفصیل اس لئے کی کہ گیند معتزلہ اور خوارج کے پالے میں نہ چلی

جائے، آپ حضرات جانتے ہیں کہ محدثین، معتزلہ اور خوارج ایمان کو مرکب مانتے ہیں، مگر محدثین اعمال کو اجزائے مکمّلہ مانتے ہیں اور معتزلہ اور خوارج اجزائے مقوّمہ۔ اسی لئے مرتکب کبیرہ ان کے نزدیک ایمان سے خارج ہے، وہ اُن حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جن میں آنحضور ﷺ نے بعض گناہوں پر کفر کا اطلاق کیا ہے، وہ کہتے ہیں: ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ منافی ایمان اعمال اسلام سے خارج کردیتے ہیں، حضرت نے جواب دیا کہ اس حدیث میں بڑا کفر مراد نہیں بلکہ چھوٹا کفر مراد ہے، اور چھوٹے کفر سے آدمی ایمان سے نہیں نکلتا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے اس جواب سے یہ بات صاف ہوگئی کہ محدثین کرام: معتزلہ اور خوارج کے ساتھ نہیں، اور اعمال ایمان حقیقی کے اجزاء نہیں، بلکہ ایمان کامل کے اجزاء ہیں۔ اور اس میں اہل حق کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

حدیث: ایک مرتبہ عید کے دن آنحضور ﷺ نے پہلے مردوں میں تقریر فرمائی پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو لے کر عورتوں کے مجمع کے قریب تشریف لے گئے اور وہاں تقریر فرمائی، اس تقریر میں ایک بات یہ فرمائی کہ مجھے شب معراج میں جہنم دکھلائی گئی، میں نے جہنم میں عورتوں کی تعداد زیادہ دیکھی، کیونکہ وہ کفر کرتی ہیں۔ کسی عورت نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا عورتیں اللہ کا انکار کرتی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: شوہروں کا انکار کرتی ہیں یعنی ان کے احسانوں کا انکار کرتی ہیں۔ اگر آپ ان میں سے ایک کے ساتھ زمانہ بھر احسان کریں پھر وہ شوہر کی طرف سے کوئی کمی دیکھے تو کہے گی: میں نے تیری طرف سے کبھی کوئی بھلائی نہیں دیکھی۔

تشریح: عورتیں اکثر شوہر کا احسان بھول جاتی ہیں، شوہر زندگی بھر احسان کرے اور ایک بات ان کی مرضی کے خلاف ہوجائے تو زندگی بھر کے احسان پر پانی پھیر دے گی، کہے گی: میں نے تیرے گھر میں آکر کیا دیکھا ہے؟ چار چیتھڑے اور چار ٹھیکرے! اسی ناشکری کی وجہ سے عورتیں زیادہ تر جہنم میں جائیں گی۔

فائدہ: آنحضرت ﷺ کو چھ مرتبہ معراج ہوئی ہے، ایک بڑی معراج ہے جو جسمانی ہے باقی منامی معراجیں ہیں، ان میں سے کسی ایک میں آپؐ کو دوزخ دکھائی گئی ہے۔

[۲۱-] بابٌ: کُفْرَانِ الْعَشِیْرِ، وَکُفْرٌ دُوْنَ کُفْرٍ

فِیْهِ عَنْ أَبِیْ سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیه وسلم

[۲۹-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْلَمَةَ، عَنْ مَالِكٍ، عَنْ زَیْدِ بْنِ أَسْلَمَ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیه وسلم: " أُرِیْتُ النَّارَ، فَإِذَا أَکْثَرُ أَهْلِهَا النِّسَاءُ، یَکْفُرْنَ" قِیْلَ: أَیَکْفُرْنَ بِاللّٰهِ؟ قَالَ: " یَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ، وَیَکْفُرْنَ الإِحْسَانَ، لَوْ أَحْسَنْتَ إِلَی إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ، ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَیْئًا، قَالَتْ: مَا رَأَیْتُ مِنْكَ خَیْرًا قَطُّ "[انظر: ۴۳۱، ۷۴۸، ۱۰۵۲، ۳۲۰۲، ۵۱۹۷]

لغات: کفران: مصدر ہے، کفر یکفر (ن) کا کفرٌ بھی مصدر آتا ہے .... العشیر: شوہر، جمع عُشَرَاء
.... کفر دون کفر: یہ امام بخاریؒ کی اصطلاح ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کفر کفر سب برابر نہیں کوئی بڑا کفر ہے اور کوئی اس سے نیچے کا کفر ہے۔ اسی طرح امام بخاریؒ کی ایک دوسری اصطلاح آگے آرہی ہے: ظُلمٌ دونَ ظلمٍ: یعنی ظلم کے بھی درجات ہیں، ظلم کے معنی ہیں: حق تلفی کرنا۔ سب سے بڑا ظلم شرک ہے، کیونکہ اس میں اللہ کی حق تلفی ہے، پھر اس سے نیچے کی حق تلفیاں ہیں۔

ملحوظہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث آگے باب الحیض (حدیث نمبر ۳۰۴) میں آرہی ہے، چونکہ اس حدیث کی امام بخاریؒ کے پاس ایک ہی سند ہے اور حضرت حدیث مکرر نہیں لکھتے اس لئے یہاں وہ حدیث نہیں لکھی۔

بابٌ: الْمَعَاصِيْ مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ، وَلاَ يُكَفَّرُ صَاحِبُهَا بِارْتِكَابِهَا إِلَّا بِالشِّرْكِ

معاصی امور جاہلیت سے ہیں مگر ان کا مرتکب کافر نہیں

معاصی امور جاہلیت سے ہیں، اس لئے وہ ایمان کے منافی ہیں اور ان کی اضداد یعنی طاعات ایمان سے ہم آہنگ ہیں اور وہ ایمان کے اجزاء ہیں، یہاں کسی کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ جب معاصی ایمان کے منافی ہوئے تو ان کا مرتکب ایمان سے خارج ہوجانا چاہئے جیسا کہ معتزلہ اور خوارج کہتے ہیں، حضرت نے اس کی تردید میں صاف فرمایا کہ آدمی معاصی کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے کافر نہیں ہوجاتا، کافر صرف شرک کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اب پردہ کھلا کہ محدثین جو ایمان کو مرکب کہتے ہیں اور فقہاء جو بسیط کہتے ہیں یہ محض لفظی اختلاف ہے۔ کیونکہ فقہاء اعمال کو نفس ایمان کا جزء تو قرار نہیں دیتے مگر ایمان کامل کا جزء قرار دیتے ہیں اور محدثین کے نزدیک بھی اعمال ایمان کامل ہی کے اجزاء ہیں، اسی وجہ سے مرتکب کبیرہ ان کے نزدیک کافر نہیں، پس اہل حق کے درمیان اختلاف محض لفظی ہے، البتہ معتزلہ اور خوارج کے ساتھ اختلاف حقیقی ہے۔

یہاں باب میں دو دعوے ہیں، پہلا دعوی یہ ہے کہ معاصی جاہلیت کی باتیں ہیں اور وہ ایمان کے منافی ہیں اور دوسرا دعوی یہ ہے کہ مرتکب کبیرہ اسلام سے خارج نہیں۔

پہلے دعوے کی دلیل: آنحضور ﷺ کا وہ ارشاد ہے جو آپؐ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا، حضرت ابوذرؓ نے ایک شخص کو گالی دی، اس سے کہا: او کالی کے! اس پر آپؐ نے فرمایا: ''کیا تم نے اس کو ماں کی گالی دی! تم ایسے شخص ہو جس میں جاہلیت کی باتیں ہیں!'' اور ظاہر ہے جاہلیت کی بات ایمان کے منافی ہوتی ہے، پس اس کی ضد ایمان سے ہم آہنگ ہوگی۔

اور دوسرے دعوے کی پہلی دلیل: یہ ارشاد پاک ہے: ''بیشک اللہ تعالیٰ شرک کو تو معاف نہیں کریں گے، اور اس کے

علاوہ جس گناہ کو چاہیں گے بخش دیں گے (النساء آیت ۴۸) معلوم ہوا کہ مرتکب کبیرہ کی بھی بخشش ہوگی پس وہ کافر نہیں۔

دوسری دلیل: یہ ارشاد پاک ہے: ''اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ'' (الحجرات آیت ۹) مسلمانوں کا باہم جھگڑنا گناہ کبیرہ ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے دونوں جماعتوں کو مؤمنین کی جماعتیں کہا، معلوم ہوا کہ مرتکب کبیرہ اسلام سے خارج نہیں۔

حدیث: احنف بن قیسؒ جو مشہور جرنیل ہیں فرماتے ہیں: میں گھر سے نکلا تا کہ اس شخص کی (حضرت علی رضی اللہ عنہ کی) مدد کروں، راستہ میں میری حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، انھوں نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ میں نے جواب دیا: میں حضرت علیؓ کی مدد کے ارادہ سے نکلا ہوں، حضرت ابوبکرہؓ نے فرمایا: واپس لوٹ جاؤ اس لئے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جب دو مسلمان باہم بھڑیں اپنی تلواروں کے ساتھ تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم رسید ہونگے'' میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! قاتل کا جہنم میں جانا تو سمجھ میں آیا، مگر مقتول جہنم میں کیوں گیا؟ وہ تو مظلوم ہے، آپؐ نے فرمایا: ''اس لئے کہ وہ اپنے بھائی کو مارنے کا پختہ ارادہ کر کے گھر سے نکلا تھا'' مگر اس کا داؤ نہ چلا، وہ مارنے کے بجائے مارا گیا، اگر اس کا داؤ چل جاتا تو وہ ضرور اپنے بھائی کو مار ڈالتا، پس حقیقت میں وہ بھی قاتل ہے، اس لئے وہ بھی جہنم میں جائے گا۔

تشریح: جو باتیں دماغ میں وسوسہ کے طور پر آتی ہیں اور ان پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا وہ معاف ہیں ان پر کوئی مواخذہ نہیں، متفق علیہ روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِیْ مَا وَسْوَسَتْ به صُدُوْرُهَا مَالَمْ تَعْمَلْ بِه أَوْ تَتَكَلَّمْ: (مشکوۃ حدیث ۶۳) اللہ نے میری امت کی ان باتوں سے درگذر فرمایا ہے جو ان کے ذہنوں میں کوندتی ہیں جب تک وہ ان پر عمل نہ کریں یا اس کو منہ سے نہ نکالیں۔

البتہ غلط عقائد پر مؤاخذہ ہوگا اور ان باتوں پر بھی مؤاخذہ ہوگا جن کو عملی جامہ پہنانے کا پختہ ارادہ ہے، پھر چاہے وہ ان کو عملی جامہ نہ پہنا سکا ہو۔ سورۃ البقرہ کے آخری رکوع میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿وَإِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾: تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے، چاہے تم اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ: اللہ تعالیٰ ان پر ضرور تمہارا مؤاخذہ کریں گے۔ اس آیت کا مصداق باطل عقائد اور وہ اعمال ہیں جن کو کرنے کا عزم مصمم ہے۔

استدلال: اس حدیث سے استدلال اس طرح ہے کہ آنحضور ﷺ نے دونوں بھڑنے والوں کو مسلمان کہا ہے جب کہ مسلمانوں کا باہم جھگڑنا کبیرہ گناہ ہے۔

فائدہ: جاننا چاہئے کہ اس حدیث کا مصداق ذاتی اور انفرادی جھگڑے ہیں، اجتہادی خطاء کی بنا پر ہونے والے جھگڑے حدیث کا مصداق نہیں، مثلاً: حضرت علی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کے درمیان جو جنگ ہوئی تھی اس کی بنیاد اجتہادی خطا تھی، حضرت عائشہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کا مطالبہ یہ تھا کہ پہلے قاتلین عثمانؓ سے قصاص لیا

جائے، پھر ہم بیعت کریں گے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جواب یہ تھا کہ پہلے بیعت کرلو اور میری خلافت کو مستحکم بنا دو پھر میں قصاص لوں گا، مطالبہ بھی جائز تھا اور جواب بھی صحیح تھا، پس یہ جنگ اجتہادی غلطی کی بنا پر ہوئی تھی، اس لئے دونوں طرف کے لوگ ماجور اور مقتول شہداء ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دونوں طرف کے مقتولین کے بارے میں پوچھا گیا تھا تو آپ نے فرمایا: ہمارے مقتول اور ان کے مقتول سب جنت میں ہیں۔

حدیث (۲): حضرت معرورؒ کہتے ہیں: میری حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے ربذہ میں ملاقات ہوئی (یہ مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے) انھوں نے جیسا جوڑا پہن رکھا تھا ویسا ہی ان کے غلام نے بھی پہن رکھا تھا (جبکہ آقا اور غلام کے درمیان فرق ہوتا ہے) میں نے ان سے اس سلسلہ میں پوچھا: انھوں نے جواب دیا: میں نے ایک شخص کو گالی دی تھی، اور میں نے اس کو اس کی ماں کے ذریعہ عار دلائی تھی (کہا تھا: او کالی کے یعنی حبشن کے! آنحضور ﷺ نے یہ بات سن لی) آپؐ نے فرمایا: اے ابوذر! کیا تم نے اس کو اس کی ماں کے ذریعہ عار دلائی ؟! (اس کی ماں کالی تھی اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ اللہ نے اس کو ایسا بنایا تھا) تم ایک ایسے شخص ہو جس میں جاہلیت کی باتیں ہیں (پھر فرمایا:) تمہارے غلام باندی تمہارے خدام ہیں، اللہ نے تم کو ان کا مالک بنایا ہے، پس جس کا بھائی (غلام باندی) اس کے ہاتھ کے نیچے ہو تو چاہئے کہ وہ اس کو کھلائے وہ جو خود کھاتا ہے، اور اس کو پہنائے وہ جو خود پہنتا ہے، اور ان کو ایسا کام کرنے کا حکم نہ دے جو ان کو ہرا دے یعنی وہ اکیلا نہ کر سکے۔ پس اگر وہ ان کو ایسا حکم دے تو ان کی مدد کرے۔

تشریح: اسی حدیث کی بنا پر امام بخاریؒ نے معاصی کو امور جاہلیت سے شمار کیا ہے، پس معاصی ایمان کے منافی ہوئے، اور ان کی اضداد یعنی طاعات ایمان سے ہم آہنگ ہوئیں، پس ثابت ہوا کہ طاعات ایمان کا جزء ہیں (مگر وہ ایمان کامل کا جزء ہیں) —— اور اس حدیث کی وجہ سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کو اپنے جیسا جوڑا پہنا رکھا تھا —— اور غلاموں کو بھائی اولادِ آدم ہونے کی وجہ سے کہا ہے، جذبۂ ترحم ابھارنے کے لئے۔

[۲۲-] بابٌ: الْمَعَاصِيْ مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ، وَلَا يُكَفَّرُ صَاحِبُهَا بِارْتِكَابِهَا إِلَّا بِالشِّرْكِ

[۱-] لِقَوْلِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: "إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيْكَ جَاهِلِيَّةٌ"

[۲-] وَقَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَايَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ [النساء: ٤٨]

[۳-] ﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا﴾: فَسَمَّاهُمُ الْمُؤْمِنِيْنَ [الحجرات: ۹]

[۳۰-] حدثنا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ الْمُبَارَكِ، قَالَ: ثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ، قَالَ: ثَنَا أَيُّوْبُ، وَيُوْنُسُ، عَنِ الْحَسَنِ، عَنِ الْأَحْنَفِ بْنِ قَيْسٍ، قَالَ: ذَهَبْتُ لِأَنْصُرَ هٰذَا الرَّجُلَ، فَلَقِيَنِيْ أَبُوْ بَكْرَةَ، فَقَالَ: أَيْنَ تُرِيْدُ؟ قُلْتُ: أَنْصُرُ هٰذَا الرَّجُلَ، قَالَ: ارْجِعْ فَإِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: "إِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ

بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِي النَّارِ" قُلْتُ: يَا رسولَ اللهِ! هذَا الْقَاتِلُ، فَمَا بَالُ الْمَقْتُوْلِ؟ قَالَ: " إِنَّهُ كَانَ حَرِيْصًا عَلَى قَتْلِ صَاحِبِهِ" [انظر: ۶۸۷۵، ۷۰۸۳]

[۳۱-] حدثنا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ وَاصِلٍ الْأَحْدَبِ، عَنِ الْمَعْرُوْرِ، قَالَ: لَقِيْتُ أَبَا ذَرٍّ بِالرَّبَذَةِ، وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ، وَعَلَى غُلَامِهِ حُلَّةٌ، فَسَأَلْتُهُ عَنْ ذٰلِكَ. فَقَالَ: إِنِّيْ سَابَبْتُ رَجُلًا، فَعَيَّرْتُهُ بِأُمِّهِ، فَقَالَ لِي النبيُّ صلى الله عليه وسلم:" يَا أَبَا ذَرٍّ! أَعَيَّرْتَهُ بِأُمِّهِ؟ إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيْكَ جَاهِلِيَّةٌ! إِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ، جَعَلَهُمُ اللهُ تَحْتَ أَيْدِيْكُمْ، فَمَنْ كَانَ أَخُوْهُ تَحْتَ يَدِهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ، وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ، وَلَا تُكَلِّفُوْهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ، فَإِنْ كَلَّفْتُمُوْهُمْ فَأَعِيْنُوْهُمْ " [انظر: ۲۵۴۵، ۶۰۵۰]

بابٌ: ظُلْمٌ دُوْنَ ظُلْمٍ

سب ظلم برابر نہیں

جس طرح کفر کے مختلف درجات ہیں، شرک اور ظلم کے بھی مختلف درجات ہیں۔ظلم کے معنی ہیں: کسی کی حق تلفی کرنا، اور سب سے بڑا ظلم اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حق مارنا ہے، کیونکہ بندگی صرف اللہ کا حق ہے، پس جو شخص عبادت میں غیر اللہ کو شریک کرتا ہے یا صرف غیر اللہ کی بندگی کرتا ہے وہ اللہ کا حق مارتا ہے، پس اس سے بڑا ظالم کون ہوسکتا ہے؟ سورۂ لقمان میں ہے: ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾: اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا سب سے بڑا ظلم ہے، پھر اس سے کم درجے کے ظلم ہیں، جو کبیرہ گناہ ہیں۔ حدیث میں ہے: الظُلْمُ ظُلُماتٌ یومَ القیامۃ: ظلم قیامت کے دن تاریکیاں ہوگا (مشکوۃ حدیث ۵۱۲۳)

حدیث: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب سورۃ الانعام کی آیت (۸۲) نازل ہوئی کہ وہ بندے جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ ملایا نہیں، وہی بندے قیامت کے دن مامون ہونگے اور وہی دنیا میں راہ یاب ہیں ـــ یہ آیت صحابہ پر شاق گذری (انھوں نے کہا: کون ایسا ہے جس سے چھوٹا موٹا ظلم سرزد نہیں ہوا!) انھوں نے خدمت نبوی میں حاضر ہوکر عرض کیا: یارسول اللہ! ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے ظلم نہیں کیا! ہر شخص کچھ نہ کچھ ظلم کرتا ہے، پس قیامت میں نہ کوئی مامون ہوگا اور نہ دنیا میں راہ یاب، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آیت پاک میں چھوٹا ظلم مراد نہیں جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو، بلکہ وہ ظلم مراد ہے جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے بتایا ہے: ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾: یعنی ظلم سے شرک مراد ہے ـــــــ ثابت ہوا کہ ظلم اور ظلم میں فرق ہے۔

فائدہ: شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ نے الفوز الکبیر میں تحریر فرمایا ہے کہ صحابہ اور تابعین ہر اس واقعہ کے لئے جو آیت کا مصداق ہوسکتا ہو أنزل الله كذا کہتے تھے۔ پس سورۂ لقمان کی مذکورہ آیت پہلے سے نازل شدہ تھی،

آنحضور ﷺ نے اس کو بطور دلیل پیش فرمایا ہے مگر راوی نے أنزل اللہ کہہ دیا یعنی یہ شان نزول حقیقی نہیں، احتمالی ہے۔

[۲۳-] بابٌ: ظُلْمٌ دُوْنَ ظُلْمٍ

[۳۲-] حدثنا أَبُوْ الْوَلِيْدِ، حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، ح: قَالَ: وَحَدَّثَنِيْ بِشْرٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ، عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ سُلَيْمَانَ، عَنْ إِبْرَاهِيْمَ، عَنْ عَلْقَمَةَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ: لَمَّا نَزَلَتْ: ﴿الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا إِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ قَالَ أَصْحَابُ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: أَيُّنَا لَمْ يَظْلِمْ؟ فَأَنْزَلَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾

[انظر: ۳۳۶۰، ۳۴۲۸، ۳۴۲۹، ٤٦٢٩، ٤٧٧٦، ٦٩١٨، ٦٩٣٧]

بابُ عَلاَمَةِ الْمُنَافِقِ

منافق کی علامتیں

منافقت: کے معنی ہیں: دل میں کفر چھپانا اور بظاہر ایمان کا دعوی کرنا۔ پس منافق: وہ شخص ہے جو بناوٹی ایمان ظاہر کرتا ہے، دل میں یقین نہیں ہوتا صرف لوگوں کے ڈر سے یا کسی مصلحت سے مؤمن ہونے کا دعوی کرتا ہے۔

نبی ﷺ کے زمانہ میں لوگ تین طرح کے تھے: ایک: خالص مؤمن، دوسرے: خالص کافر، تیسرے: منافق: نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں کے احوال معلوم کرادیئے تھے، اس لئے اس وقت یہ تین فرقے تھے، مگر اب دو ہی فرقے ہیں: مؤمن اور کافر، یہ بات حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمائی ہے (مشکوۃ حدیث ٦٢) اور حضرت حذیفہؓ وہ صحابی ہیں جو منافقین کے ناموں کے سلسلہ میں حضور ﷺ کے راز دار تھے۔

اگرچہ آج بھی کبھی نفاق اعتقادی کا پتہ چل جاتا ہے، جیسے کسی کے بارے میں معتبر شہادت سے معلوم ہو کہ وہ مسلمانوں کے سامنے تو اسلام کا دعوی کرتا ہے مگر کافروں میں جا کر ان کی رسموں میں شرکت کرتا ہے۔ مندروں میں جا کر بتوں کے سامنے ڈنڈوت کرتا ہے تو وہ یقیناً منافق ہے۔

اعتقادی نفاق انسان کی بدترین حالت ہے، ان منافقین کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾: منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہونگے۔

علاوہ ازیں: بعض بری عادتیں اور بری خصلتیں ایسی ہیں جن کو منافقوں سے خاص مناسبت ہے، وہ دراصل انہی کی عادتیں اور خصلتیں ہیں، کسی صاحب ایمان میں ان کی پرچھائیں بھی نہیں ہونی چاہئے۔ اس باب میں منافقین کے انہی اخلاق وعادات کا بیان ہے، اگر بدقسمتی سے کسی مسلمان میں ان میں سے کوئی عادت پائی جائے تو اسے منافقانہ عادت کہا جائے گا، اور اگر کسی میں بدبختی سے منافقوں والی ساری عادتیں پائی جائیں تو وہ پورا منافق کہلائے گا، مگر ہوگا وہ مسلمان،

اور ایک مسلمان کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ وہ کفر وشرک اور اعتقادی نفاق کی گندگی سے بچے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ منافقانہ سیرت وکردار کی گندگی سے بھی اپنے کو محفوظ رکھے۔

حدیث (۱): نبی ﷺ نے فرمایا: منافق کی تین نشانیاں ہیں: (۱) جب بات کرے جھوٹ بولے (۲) جب وعدہ کرے خلاف کرے (۳) اور جب اس کو امانت سونپی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

حدیث (۲): نبی ﷺ نے فرمایا: چار عادتیں جس شخص میں ہوں وہ خالص (پکا) منافق ہے، اور اگر کسی میں ان میں سے ایک عادت ہو تو اس میں نفاق کی ایک عادت ہے، یہاں تک کہ وہ اس کو چھوڑ دے (۱) جب اس کو امانت سونپی جائے تو خیانت کرے (۲) اور جب بھی بات کرے جھوٹ بولے (۳) اور جب عہد وپیمان باندھے تو بے وفائی کرے (۴) اور جب جھگڑا کرے تو گالیاں بکے۔

تشریح:

۱- علماء کے نزدیک ان حدیثوں کا مصداق نفاق عملی ہے، کیونکہ نفاق اعتقادی نبی ﷺ کے زمانہ میں تھا، یعنی دور نبوت میں اس کا پتا چلتا تھا، اب عام طور پر اس کا پتا نہیں چلتا، پس ان دونوں روایتوں میں جو نشانیاں بیان کی گئی ہیں وہ عملی منافق کی ہیں۔

۲- جو شخص گاہ بہ گاہ جھوٹ بولتا ہے یا وعدہ خلافی کرتا ہے وہ حدیث کا مصداق نہیں، بلکہ وہ شخص مصداق ہے جو ان باتوں کا عادی ہے، نیز ان میں سے ہر ہر بات نفاق کی علامت ہے مگر کامل علامت ان کا مجموعہ ہے۔

۳- پہلی حدیث میں نفاق کی تین علامتوں کا بیان ہے اور دوسری میں چار کا، اور یہ تعارض نہیں، اس لئے کہ ذکر عدد نفی ماعدا کو مستلزم نہیں، ایسی صورت میں بڑے عدد کو لیا جائے گا، چھوٹا عدد خود بخود اس میں آجائے گا، اور اختلاف کو اس پر محمول کریں گے کہ جیسی وحی آتی گئی حضور ﷺ بتاتے گئے۔ پہلے تین کے بارے میں وحی آئی وہ بتائیں پھر دوسری وحی میں اضافہ ہوا تو آپؐ نے چار باتیں بتائیں۔

۴- دونوں روایتوں کی علامتوں کو جمع کیا جائے تو پانچ علامتیں ہو جاتی ہیں: کذب، خیانت، وعدہ خلافی، عہد شکنی۔ اور فجور۔

استدلال: کذب وفجور اور عہد شکنی وغیرہ ایمان کے منافی اعمال ہیں پس ان کی اضداد ایمان کا جزء ہونگی (مگر ایمان کامل کا جزء ہونگی)

[۲۴-] بابُ عَلاَمَةِ الْمُنَافِقِ

[۳۳-] حدثنا سُلَيْمَانُ أَبُو الرَّبِيعِ، قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا نَافِعُ بْنُ مَالِكِ بْنِ أَبِي

عَامِرٍ أَبُوْ سُهَيْلٍ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قَالَ: " آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ " .[انظر: ۲۶۸۲، ۲۷۴۹، ۶۰۹۵]

[۳۴-] حدثنا قَبِيْصَةُ بْنُ عُقْبَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ، عَنِ الأَعْمَشِ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مُرَّةَ، عَنْ مَسْرُوْقٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو، أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: " أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ، حَتَّى يَدَعَهَا: إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ " تَابَعَهُ شُعْبَةُ، عَنِ الأَعْمَشِ. [انظر: ۲۴۵۹، ۳۱۷۸]

وضاحت: دوسری حدیث میں امام بخاریؒ کے استاذ قبیصہ ہیں، انھوں نے سفیان ثوریؒ سے بچپن میں پڑھا ہے، اس لئے امام بخاریؒ نے متابع پیش کیا ہے کہ اس حدیث کو شعبہؒ نے بھی اعمشؒ سے روایت کیا ہے، پس یہ سفیان ثوریؒ کے لئے متابعت تامہ ہے، اور قبیصہ کے لئے متابعت قاصرہ، اور متابعت قاصرہ کا بھی اپنا ایک مقام ہے، پس جو اعتراض ہوسکتا تھا وہ رفع ہوگیا۔

بابٌ: قِيَامُ لَيْلَةِ الْقَدْرِ مِنَ الإِيْمَانِ

شبِ قدر کے نوافل ایمانی عمل ہیں

اب پھر مثبت ابواب شروع ہورہے ہیں۔ قیام کے معنی ہیں: سونے سے پہلے نفلیں پڑھنا۔ رمضان المبارک میں ایک تو سونے سے پہلے باجماعت نفلیں پڑھی جاتی ہیں، جن کا نام تراویح ہے اور خاص شبِ قدر میں سونے سے پہلے نفلیں پڑھنا قیامُ لیلۃ القدر کہلاتا ہے۔ اور یہ ایک مستقل نماز ہے اور اس کی خاص فضیلت ہے۔ جاننا چاہئے کہ رمضان کی ہر رات میں شبِ قدر ہونے کا احتمال ہے اس لئے صرف تراویح پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ روزانہ سونے سے پہلے تراویح کے علاوہ بھی کچھ نفلیں پڑھنی چاہئیں تاکہ دونوں فضیلتیں حاصل ہوجائیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ قیام لیل کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رات بھر نفلیں پڑھے اور بالکل نہ سوئے، اس کے لئے لفظ إحیاء (زندہ کرنا) آتا ہے جو شبِ عیدین کی فضیلت میں آیا ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَن أَحيَا لَيْلَةَ الْفِطْرِ وَلَيْلَةَ الأَضْحٰى لَمْ يَمُتْ قَلْبُه يَوْمَ تَمُوْتُ الْقُلُوْبُ: جس نے عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی راتوں کو زندہ کیا تو اس کا دل اس دن نہیں مرے گا جس دن دل مرجائیں گے (الترغیب والترہیب ۲: ۱۵۳) یہ حدیث ضعیف ہے۔

اور رمضان اور شبِ قدر کے بارے میں لفظ قام آیا ہے، اس لفظ کا مفہوم ہے: اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دیں سونے سے پہلے نفلیں پڑھے، رات بھر نفلیں پڑھنا اس لفظ کا مفہوم نہیں۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے شبِ قدر میں سونے سے پہلے نفلیں پڑھیں (ثواب کے) یقین

کے ساتھ اور ثواب کی اُمید کے ساتھ تو اس کے سابقہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

تشریح:

۱- اس حدیث میں آنحضور ﷺ نے مشکل کام کو آسان بنانے کا فارمولہ بیان فرمایا ہے۔ وہ فارمولہ ہے: إیمانا واحتسابًا: ایمان کے جو معروف معنی ہیں وہ یہاں مراد نہیں، یہاں ایمان کے معنی ہیں: ثواب کا یقین کرنا اور احتساب کے معنی ہیں: ثواب کی امید رکھنا، پس عطف تفسیری ہے اور دونوں لفظوں کا مطلب ہے: اللہ تعالیٰ نے اعمال پر جو ثواب کے وعدے کئے ہیں: اس پر پختہ یقین رکھنا اور اس کو نظروں کے سامنے لانا، مشکل کام کو آسان بنا دیتا ہے۔

۲- گناہ کے چار درجے ہیں: (۱) معصیة (نافرمانی) (۲) سیّئة (برائی) (۳) خطیئة (غلطی) (۴) ذنوب (نامناسب کام) نماز اور روزے وغیرہ سے کونسے گناہ معاف ہوتے ہیں؟ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ نے اس سلسلہ میں یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ نص میں جو لفظ آیا ہے وہ اور اس کے نیچے کے گناہ معاف ہونگے۔ اس سے اوپر کے گناہ معاف نہیں ہوں گے، جیسے یہاں حدیث میں لفظ ذنب آیا ہے، پس شب قدر میں نفلیں پڑھنے سے اسی درجہ کے گناہ معاف ہونگے اس سے اوپر کے درجے کے گناہ معاف نہیں ہونگے۔

جاننا چاہئے کہ جو کامل مؤمن ہوتا ہے اس کے نامۂ اعمال میں ذنوب ہی ہوتے ہیں وہ اس سے اوپر کے گناہ کرتا ہی نہیں۔ اور ذنوب حسنات سے خود بخود معاف ہو جاتے ہیں۔

استدلال: حدیث میں جو لفظ إیمانا آیا ہے اس سے امام بخاریؒ کا استدلال ہے کہ شب قدر کا قیام ایمان کا جزء ہے، مگر میں نے بتلایا کہ یہاں ایمان بمعنی تصدیق قلبی نہیں بلکہ جو ثواب کا وعدہ ہے اس پر یقین رکھنا مراد ہے۔

[۲۵-] بابٌ: قِيَامُ لَيْلَةِ الْقَدْرِ مِنَ الإِيْمَانِ

[۳۵-] حدثنا أَبُوْ الْيَمَانِ، قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُوْ الزِّنَادِ، عَنِ الأَعْرَجِ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: "مَنْ يَقُمْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ"

[انظر: ۳۷، ۳۸، ۱۹۰۱، ۲۰۰۸، ۲۰۰۹، ۲۰۱٤]

بابٌ: الجهادُ مِنَ الإِيْمَانِ

جہاد ایمانی عمل ہے

جہاد: قرآن وحدیث کی ایک خاص اصطلاح ہے، اس کے معنی ہیں: دین کی حفاظت اور سربلندی کے لئے دشمنانِ اسلام سے لڑنا۔ جَاهَدَ العَدُوَّ مُجَاهَدَةً وجِهَادًا کے معنی ہیں: دشمن سے لڑنا اور جَاهَدَ فِي الأَمْرِ: کے معنی ہیں: کسی کام

میں پوری طاقت لگانا، پوری کوشش کرنا، اسی سے مجاہدہ ہے۔

قرآن وحدیث میں یہ لفظ مختلف طرح استعمال کیا گیا ہے، کہیں صرف جہاد اور مجاہدہ آیا ہے کہیں اس کے ساتھ فی سبیل اللہ آیا ہے اور کہیں اس کے بعد اللہ یا اللہ کی طرف لوٹنے والی ضمیر آئی ہے۔ اسی طرح فی سبیل اللہ بھی کبھی تنہا آیا ہے، اور کبھی جہاد کے مادہ کے ساتھ آیا ہے، پس جہاں مجاہدہ کا مادہ مطلق آیا ہے یا اس کے بعد فی اللہ یا فینا آیا ہے، وہ آیتیں عام ہیں۔ مفسرین کرام ان جگہوں میں لفظ دین محذوف مانتے ہیں، جیسے ﴿جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ﴾ یعنی اللہ کے دین کے لئے پوری طاقت خرچ کرو، اور ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾: جو لوگ ہمارے دین کے لئے انتہائی کوشش کرتے ہیں: ہم ان کو اپنی راہیں سجھاتے ہیں۔ یہ آیات پاک دین کی ہر محنت کے لئے عام ہیں، کسی بھی لائن سے دین کی محنت کرنے والے اس کا مصداق ہیں، لیکن جہاں لفظ جہاد آیا ہے یا مجاہدہ کے مادہ کے ساتھ فی سبیل اللہ آیا ہے یا صرف فی سبیل اللہ آیا ہے جیسے مصارف زکوٰۃ کے بیان میں اور انفاق کی فضیلت کی آیت میں وہاں خاص اصطلاحی معنی مراد ہیں، اگرچہ حضرت تھانوی قدس سرہ نے انفاق کی فضیلت والی آیت میں عام معنی کئے ہیں یعنی ﴿الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اور ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ کی تفسیر میں بیان القرآن میں فی سبیل اللہ کو عام رکھا ہے۔ لیکن مصارف زکوٰۃ کی آیت (التوبہ آیت ۶۰) میں جو فی سبیل اللہ آیا ہے وہاں مفتی بہ قول یہ ہے کہ اس کا مصداق منقطع الغزات ہیں، یعنی وہ مجاہدین مراد ہیں جو دشمنان اسلام سے لڑنا چاہتے ہیں، مگر ان کے پاس اسباب نہیں، ان کو زکوٰۃ کے مال سے ہتھیار وغیرہ خرید کر دے سکتے ہیں۔ اگرچہ امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک منقطع الحاج آیت کا مصداق ہے مگر فتوی امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر ہے۔

بہر حال جہاں لفظ جہاد آیا ہے یا مجاہدہ کے مادہ کے ساتھ فی سبیل اللہ آیا ہے، وہاں خاص اصطلاحی معنی مراد ہیں۔ سورۃ التوبہ میں جہاں بھی اس قسم کی آیات آئی ہیں: وہاں حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلوی قدس سرہ نے اور ان کی اتباع میں حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے "لڑنا" ترجمہ کیا ہے۔ اور حدیث کی کتابوں میں جو ابواب الجہاد اور ابواب فضائل الجہاد آتے ہیں وہاں بھی یہی خاص اصطلاحی معنی مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ترمذی وغیرہ میں جب ابواب الجہاد شروع ہوتے ہیں تو فوراً ذہن خاص معنی ہی کی طرف سبقت کرتا ہے، اور کسی لفظ کو سن کر ذہن کا کسی معنی کی طرف سبقت کرنا: دلیل ہوتی ہے کہ وہی لفظ کے حقیقی معنی ہیں۔

بلکہ جب لفظ جہاد بولتے ہیں تو مسلمانوں ہی کا نہیں، غیر مسلموں کا بھی ذہن اسی خاص معنی کی طرف جاتا ہے، لیکن کچھ لوگوں نے ان آیات کو عام کر دیا ہے۔ اور عام نہیں کیا بلکہ اپنے کام کے لئے خاص کر دیا ہے۔ وہ اپنے کام ہی کو جہاد کہتے ہیں۔ دوسرے دینی کاموں کو جہاد نہیں کہتے۔ اور جب انھوں نے اپنے کام کو جہاد قرار دیا تو جہاد کے فضائل میں جو آیات پاک اور احادیث شریفہ آئی ہیں ان کو اپنے کام پر منطبق کرتے ہیں، ان کی یہ رائے صحیح نہیں، جہاد ایک

اسلامی اصطلاح ہے، جب قرآن وحدیث میں یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے قتال فی سبیل اللہ مراد ہوتا ہے۔

البتہ بعض کاموں کو جہاد کے ساتھ لاحق کیا گیا ہے، مگر ان کے لئے یہ الحاق ہی فضیلت ہے، جیسے حدیث میں ہے: **مَن خَرَجَ فِي طَلَبِ العلم فهو في سبيل الله حتى يَرْجِعَ**: اس میں نبی ﷺ نے طلب علم کو فی سبیل اللہ قرار دیا ہے، یہ الحاق طالب علم کی فضیلت ہے، اسی طرح دعوت وتبلیغ کے کام کو فی سبیل اللہ کے ساتھ لاحق کیا جاسکتا ہے، اور یہ الحاق ہی اس کی فضیلت ہوگی۔ قرآن وحدیث میں فضائل جہاد کی جو آیتیں اور حدیثیں ہیں وہ سب فضیلتیں نہ طالب علم پر منطبق کی جاسکتی ہیں نہ تبلیغ والوں پر، یہ خاص بات یاد رکھنی چاہئے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے ذمہ داری لی ہے اس شخص کی جو راہِ خدا میں اعدائے اسلام سے لڑنے کے لئے نکلا ——— اس کا نکلنا مجھ پر یقین اور میرے رسول کی تصدیق کی بنا پر ہو ——— تو میں اس کو غنیمت کے ساتھ لوٹاؤں گا یا اس کو جنت میں داخل کروں گا، پھر آپؐ نے فرمایا: اگر میری امت پر بھاری نہ ہوتا تو میں کسی سریہ سے پیچھے نہ رہتا، اور مجھے یہ پسند ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔

قوله: لايُخرِجُه إلا إيمانٌ بي أو تصديقٌ برسلي: یہ جملہ معترضہ ہے اور أوْ بمعنی واؤ ہے، گیلری میں واؤ لکھا ہوا بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ثواب یا مالِ غنیمت کے ساتھ لوٹانے کی اور شہید ہوگیا تو جنت میں داخل کرنے کی جو گارنٹی لی ہے: وہ وعدہ اس شرط پر موقوف ہے کہ اس نے اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے دشمنانِ اسلام سے جنگ لڑی ہو۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور مقصد تھا مثلاً: اپنی بہادری کا جوہر دکھانے کے لئے، مالِ غنیمت کے لالچ میں یا قوم کی حمایت ونصرت وغیرہ کے جذبے سے لڑا ہے تو اس کے لئے یہ فضیلت نہیں۔

اور امام بخاریؒ کا استدلال یہ ہے کہ أوْ بمعنی واؤ ہے جو مطلق جمع کے لئے ہے، پس **تصديقٌ برسلي**: یعنی اللہ کے رسول نے جہاد پر جو ثواب کے وعدے فرمائے ہیں ان کو سچا جان کر اور ان وعدوں پر یقین کرکے جہاد کے لئے نکلنا: ایمان کا جزء ہوا، اور جہاد ایک عمل ہے پس اعمال ایمان کے اجزاء ہوئے۔

قوله: مِنْ أَجْرٍ أو غنيمة: یہ أو مانعۃ الخلو کا ہے، یعنی اجر وثواب اور مالِ غنیمت دونوں جمع ہوسکتے ہیں، منتفی نہیں ہوسکتے۔

قوله: لولا أن أَشُقَّ: آنحضور ﷺ نے فرمایا: میری امت کے لئے دشواری ہے ورنہ میں ہر سریہ میں نکلتا، سریہ چھوٹے لشکر کو کہتے ہیں جس میں آنحضور ﷺ شامل نہیں ہوتے، اور دشواری یہ ہے کہ جب آپؐ سریہ میں نکلیں گے تو ہر شخص نکلنے کی کوشش کرے گا اور ہر شخص کے لئے ہر وقت نکلنے کا موقعہ نہیں ہوتا، مگر نکلیں گے ضرور! پس مشقت ہوگی۔

اور دوسری بات آپؐ نے یہ فرمائی کہ شہید کا اللہ کے یہاں جو مقام ومرتبہ ہے اس کی وجہ سے میری خواہش ہے کہ میں بار بار راہِ خدا میں قتل کیا جاؤں اور بار بار زندہ کیا جاؤں۔

[۲۶-] بابٌ: الجِهادُ مِنَ الإیْمَانِ

[۳۶-] حدثنا حَرَمِیُّ بْنُ حَفْصٍ: حَدَّثَنَا عَبْدُالْوَاحِدِ، حَدَّثَنَا عُمَارَةُ، حَدَّثَنَا أَبُوْ زُرْعَةَ بْنُ عَمْرِو بْنِ جَرِیْرٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا هُرَیْرَةَ، عَنِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: " انْتَدَبَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ لِمَنْ خَرَجَ فِیْ سَبِیْلِهِ - لاَ یُخْرِجُهُ إِلاَّ إِیْمَانٌ بِیْ أَوْ تَصْدِیْقٌ بِرُسُلِیْ- أَنْ أَرْجِعَهُ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ أَوْ غَنِیْمَةٍ، أَوْ أُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ، وَلَوْلاَأَنْ أَشُقَّ عَلٰی أُمَّتِیْ مَا قَعَدْتُ خَلْفَ سَرِیَّةٍ، وَلَوَدِدْتُ أَنِّیْ أُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، ثُمَّ أُحْیَا، ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أُحْیَا، ثُمَّ أُقْتَلُ" [انظر: ۲۷۸۷، ۲۷۹۷، ۲۹۷۲، ۳۱۲۳، ۷۲۲۶، ۷۲۲۷، ۷۴۵۷، ۷۴۶۳]

لغات اور ترکیب: اِنْتَدَبَ به للأمر: کے معنی ہیں: لبیک کہنا، بلانے پر حاضر ہوجانا، جو لوگ کانفرنسوں میں بلائے جاتے ہیں ان کو''مندوب'' کہتے ہیں۔ یہاں انتدب کے مرادی معنی ہیں: فوراً جواب دینا، ذمہ داری لینا...... أن أَرْجِعَه: بتاویل مصدر ہوکر انتدب کا مفعول ہے۔ اور درمیان میں جملہ معترضہ ہے...... أن أشقَّ میں أن مصدریہ ہے۔

ملحوظہ: حاشیہ میں ایک اعتراض لکھا ہے کہ أو: أحد الأمرین کے لئے آتا ہے، پس ایمان باللہ اور تصدیقِ رسالت میں سے کوئی ایک کافی ہے، حالانکہ ایسا نہیں دونوں پر ایمان لانا ضروری ہے، اور جواب اوپر آچکا کہ یہ أو بمعنی واؤ ہے، چنانچہ ایک نسخہ میں واؤ ہے اور وہی نسخہ گیلری میں لکھا ہے۔

بابٌ: تَطَوُّعُ قیامِ رَمَضَانَ من الإیمان

رمضان کی راتوں کے نوافل ایمانی عمل ہیں

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص رمضان میں ایمان واحتساب کے ساتھ نوافل پڑھے اس کے سابقہ گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔

تشریح: قیام رمضان کا دوسرا نام تراویح ہے، یہ دور مابعد کی اصطلاح ہے، قیام رمضان کا لفظی ترجمہ ہے: رمضان میں کھڑا ہونا۔ اور اصطلاحی معنی ہیں: رمضان میں عشاء کے بعد سونے سے پہلے نفلیں پڑھنا۔

رمضان میں دو نمازیں الگ الگ ہیں، ایک سونے سے پہلے ہے اس کا نام قیام رمضان (تراویح) ہے، اس کی جماعت کے ساتھ بیس رکعتیں سنت ہیں۔ اور ایک دوسری نماز ہے جو پورے سال پڑھی جاتی ہے اسے رمضان میں بھی پڑھنا ہے اور وہ تہجد کی نماز ہے۔ آنحضرت ﷺ عام طور پر آٹھ رکعت تہجد پڑھا کرتے تھے۔

استدلال: حدیث میں جو لفظ إیمانا آیا ہے اس سے امام بخاریؒ نے استدلال کیا ہے کہ قیام رمضان ایمان کا جزء ہے۔ اور میں نے ابھی بتایا کہ یہاں ایمان کے معروف معنی مراد نہیں، بلکہ جو ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے اس پر یقین رکھنا

مراد ہے، اور یہ مشکل عمل کو آسان بنانے کا ایک فارمولہ ہے۔

[۲۷-] بابٌ: تَطَوُّعُ قِيَامِ رَمَضَانَ مِنَ الإِيْمَانِ

[۳۷-] حدثنا إِسْمَاعِيْلُ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ: أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ:" مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ " [راجع: ۳۵]

بابٌ: صومُ رَمَضَانَ احْتِسَابًا مِنَ الإِيْمَانِ

بامید ثواب رمضان کے روزے رکھنا ایمانی عمل ہے

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے رمضان کے روزے رکھے یقین کے ساتھ اور ثواب کی امید کے ساتھ اس کے سابقہ گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔

تشریح: یہ سب حدیثیں ایک ہی شاکلہ (انداز) پر ہیں، اور ان تمام حدیثوں کا مدعیٰ یہ ہے کہ رمضان میں دن میں روزے رکھنا اور رات میں نفلیں پڑھنا بیگار نہیں ہے، بیگار کا مطلب ہے: مفت میں کام لینا، پرانے زمانے میں راجے مہاراجے لوگوں سے مفت کام لیتے تھے، اس کو بیگار کہتے تھے، اللہ تعالیٰ ہمارے خالق و مالک ہیں اور ہم ان کے بندے ہیں وہ جو حکم دیں ہمارے لئے اس کی تعمیل ضروری ہے۔ اور اس کا کوئی عوض نہ دیں تو مطالبہ کا ہمیں کوئی حق نہیں، مگر انھوں نے ہم سے بیگار نہیں لی۔ بلکہ یہ کہا کہ کام کرو ہم یہ ثواب دیں گے، یہ جو ثواب کے وعدے اللہ نے کئے ہیں ان کو نگاہوں کے سامنے رکھا جائے تو عبادتیں کرنا اور روزے رکھنا آسان ہوجائے گا —— امام بخاریؒ کا استدلال وہی ہے جو اوپر آچکا، اور جواب بھی وہی ہے جو پہلے آچکا۔

[۲۸-] بابٌ: صَوْمُ رَمَضَانَ احْتِسَابًا مِنَ الإِيْمَانِ

[۳۸-] حدثنا ابْنُ سَلَامٍ، قَالَ: أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُضَيْلٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيْدٍ، عَنْ أَبِيْ سَلَمَةَ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم:"مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ " [راجع: ۳۵]

بابٌ: الدِّيْنُ يُسْرٌ

دین آسان ہے

اوپر جو چار باب آئے ہیں ان کا مفاد یہ ہے کہ دین کے لئے ریاضاتِ شاقہ کی جائیں، انتہائی درجہ کی محنتیں کی

جائیں، ظاہر ہے شب قدر کی تلاش میں پورے مہینے سونے سے پہلے نفلیں پڑھنا، تراویح پڑھنا، پورے مہینے روزے رکھنا اور اعداء اللہ سے لوہا لینا: پُر مشقت کام ہیں۔ ان سے ذہن یہ بنتا ہے کہ دین مشکل ہے، ہر شخص اس پر عمل نہیں کرسکتا۔ اس وہم کو ہٹانے کے لئے یہ باب قائم کیا ہے کہ دین آسان ہے۔ اور ریاضاتِ شاقہ مخصوص حضرات کے لئے ہیں۔ شریعت ہر شخص سے ریاضتوں کا مطالبہ نہیں کرتی۔ اور جو فرائض وواجبات ہیں وہ بہت تھوڑے ہیں، ان کی وجہ سے دین کو مشکل نہیں کہہ سکتے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کتاب الصلوٰۃ میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ رکوع وسجود وغیرہ میں جو طویل اذکار مروی ہیں، وہ اذکار مخصوص حضرات کے لئے ہیں، عوام کے لئے مختصر ذکر: **سبحان ربی العظیم** اور **سبحان ربی الأعلی** ہے، اسی کو دوہرانے کا حکم ہے، اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ آنحضور ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ تکبیر تحریمہ کے بعد فوراً قراءت شروع نہیں کرتے، کچھ دیر خاموش رہتے ہیں، آپؐ اس دوران کیا پڑھتے ہیں؟ آپؐ نے ایک لمبی دعا بتلائی کہ یہ پڑھتا ہوں (مشکوٰۃ حدیث ۸۱۲) یہ حدیث دلیل ہے کہ طویل اذکار ہر شخص کے لئے نہیں ہیں، چنانچہ جب تک حضرت ابو ہریرہؓ نے دریافت نہیں کیا آپؐ نے نہیں بتایا۔ اس وجہ سے احناف اور حنابلہ ثنا کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ وہ مختصر ذکر ہے جو عوام کے مناسب ہے۔

اسی طرح آنحضور ﷺ اور حضرات صحابہ سال بھر بکثرت روزے رکھا کرتے تھے۔ زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت مال راہ خدا میں خرچ کرتے تھے، غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے تین سو اونٹ مع ساز وسامان کے اور ایک ہزار دینار بارگاہِ نبوی میں پیش کئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصف مال پیش کیا تھا، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کل مال آپؐ کے سامنے پیش کردیا تھا۔ یہ سب مخصوص حضرات کے احوال ہیں، عوام کے لئے تو رمضان کے روزے اور سال بھر میں ایک مرتبہ زکوٰۃ نکالنا کافی ہے۔

غرض اوپر کے ابواب سے ذہنوں میں جو شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ شریعت ریاضات شاقہ کا مطالبہ کرتی ہے اس باب سے اسی شبہ کو رفع کیا ہے کہ دین کا عمومی مزاج آسانی کا ہے۔ اور جو لوگ جنت کے درجات عالیہ کے آرزومند ہیں ان کو عام آدمی کی بہ نسبت زیادہ محنتیں کرنی چاہئیں مگر یہ ان کا ذاتی اور انفرادی معاملہ ہے، ہر شخص سے انتہائی درجہ کی محنتیں مطلوب نہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب میں ایک معلّق حدیث لکھی ہے جس کو سند کے ساتھ الادب المفرد میں لائے ہیں، نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ دین یکسو ہونے والی آسان ملت (اسلام) ہے''

وضاحت: حنیف: فعیلٌ کا وزن ہے۔ حَنَف کے معنی ہیں: مائل ہونا، جھکنا، اور حنیف کے معنی ہیں: باطل سے رخ پھیر کر حق کی طرف مائل ہونے والا، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لقب ہے: ﴿مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا

نَصْرَانِيًّا وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُسْلِمًا﴾ (آل عمران آیت ۶۷) ابراہیمؑ نہ یہودی تھے نہ نصرانی، بلکہ وہ ہمہ تن اللہ کی طرف متوجہ ہونے والے فرمانبردار تھے، اسی سے الحنيفية بنانا ہے، اور اس کا موصوف الملة محذوف ہے اور السَّمْحة: کے معنی ہیں: آسان۔ اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ توحید میں کسی اور سے کو لگانے کی قطعاً گنجائش نہیں، ہر باطل سے رُخ پھیر کر اللہ ہی کا ہو رہنا ضروری ہے۔ دوسری بات: یہ معلوم ہوئی کہ اعمال کے اعتبار سے دین آسان ہے یہی باب کا مدعی ہے۔

حدیث: نبی ﷺ نے فرمایا: بیشک دین آسان ہے، اور جو شخص دین میں تشدد اختیار کرے گا دین اس پر غالب آجائے گا۔ لہٰذا میانہ روی اختیار کرو اور قریب قریب چلو، اور خوش ہو جاؤ، اور صبح و شام اور رات کے کچھ آخری حصہ سے مدد حاصل کرو۔

تشریح:

اگر اس حدیث کو ناتمام پڑھا جائے تو مطلب غلط ہو جائے گا، کچھ لوگ صرف الدين يسرٌ: پڑھتے ہیں اور اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ کافروں کے ملک میں ڈاڑھی رکھنے میں دشواری ہے، لہٰذا ڈاڑھی منڈوا سکتے ہیں، بیوع باطلہ اور فاسدہ کر سکتے ہیں، سود لے سکتے ہیں اس لئے کہ دین آسان ہے۔ حدیث کا یہ مطلب قطعاً غلط ہے، اس کے صحیح مطلب دو ہیں:

پہلا مطلب: اللہ تعالیٰ نے جو شریعت نازل فرمائی ہے اس میں آسانی کا لحاظ کیا ہے، کسی حکم میں کوئی دشواری باقی نہیں چھوڑی۔ نماز فرض کی تو فرمایا: اگر تندرست ہوؤ تو کھڑے ہو کر نماز پڑھو۔ بیمار ہوؤ اور کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھو، اور بیماری سخت ہے، بیٹھ بھی نہیں سکتے تو لیٹ کر پڑھو۔ نماز میں رکوع وسجدہ کرو، نہیں کر سکتے تو اشارہ کرلو، آدمی پاگل ہو گیا، یا چوبیس گھنٹے سے زیادہ بیہوش رہا تو نماز معاف ہے۔ غرض ہر طرح کی آسانی ملحوظ رکھ کر اللہ تعالیٰ نے نماز کا حکم دیا ہے۔ رمضان میں روزے فرض کئے، مگر آدمی بیمار ہے یا سفر درپیش ہے تو رخصت دی کہ اگر ابھی روزے نہ رکھنا چاہو تو نہ رکھو بعد میں رکھ لینا۔ پھر فرمایا: ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾: اللہ تعالیٰ تم پر آسانی کرنا چاہتے ہیں، تنگی کرنا نہیں چاہتے، اس لئے روزے میں رخصت دی۔ غرض ایک مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم بھی نازل کیا ہے اس میں بندوں کے احوال کا لحاظ کر کے حکم نازل کیا ہے۔

اور دوسرا مطلب: یہ ہے کہ عموماً بندے انہی احکام کے مکلّف بنائے گئے ہیں جن پر وہ بسہولت عمل کر سکتے ہیں، ریاضاتِ شاقہ کا مکلّف نہیں کیا، حدیث آگے پڑھی جائے تو یہ مطلب متعین ہو جاتا ہے۔

قوله: ولن يُشَادَّ الدين: شَادَّ في الأمر کے معنی ہیں: غالب آنے کی کوشش کرنا، مقابلہ کرنا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر کوئی شخص دین پر غالب آنے کی کوشش کرے گا یعنی دین میں تشدد اختیار کرے گا تو وہ کامیاب نہیں ہوگا۔ دین

اس پر غالب آجائے گا اور اس کو ہرا دے گا، یعنی ریاضاتِ شاقہ کرو گے تو ان کو زیادہ دنوں تک نباہ نہ سکو گے، اتنے ہی اعمال سرلو جن کو بآسانی نباہ سکو۔ متفق علیہ روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے نزدیک محبوب وہ اعمال ہیں جو پابندی کے ساتھ کئے جائیں خواہ وہ تھوڑے ہوں'' (مشکوۃ حدیث ۱۲۴۲) خود حضور ﷺ کی شان میں آگے آرہا ہے کہ جب آپ کوئی عمل شروع کرتے تو اس پر مداومت فرماتے، اور بھاری عبادتوں پر مداومت مشکل ہے، مثلاً: جو طالب علم رات میں گیارہ بارہ بجے تک مطالعہ کرتا ہے پھر سوجاتا ہے وہ مسلسل اپنا عمل جاری رکھ سکتا ہے، اور جو رات میں چار بجے تک مطالعہ کرتا ہے وہ اپنا عمل مسلسل جاری نہیں رکھ سکتا، ہفتہ دو ہفتہ میں تھک جائے گا۔ اسی طرح نوافل اعمال کرنے چاہئیں، مگر بہت زیادہ نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ دین سے ٹکر لینا ہے جس میں آدمی کامیاب نہیں ہوسکتا۔

قولہ: فَسَدِّدُوْا وقاربوا: سَدَّدَ کے معنی ہیں: راہ راست کی طرف راہنمائی کرنا، فَسَدِّدوا: راہ راست پر چلو، مگر کبھی بالکل راہ راست پر چلنا دشوار ہوجاتا ہے تو فرمایا: وقارِبُوا: راہ راست سے قریب قریب رہو، دور مت ہٹ جاؤ، قَارَبَ مُقَارَبَةً کے معنی ہیں: کسی معاملہ میں غلو چھوڑ دینا اور اصل معاملہ سے قریب قریب رہنا۔ بعض شارحین کی رائے یہ ہے کہ فسدِّدوا وقاربوا: ہم معنی ہیں، دونوں کے معنی ہیں: راہ راست پر چلو، یعنی ریاضتوں والا راستہ مت اپناؤ، شریعت نے جو عام راستہ تجویز کیا ہے اسی پر رہو۔

لیکن میرا خیال یہ ہے کہ دونوں میں فرق ہے: سَدِّدُوْا: یہ ہے کہ آدمی بالکل سیدھے راستہ پر چلے، لیکن کبھی یہ بات بہت مشکل ہوجاتی ہے تو پھر حکم ہے قَارِبُوْا: یعنی راہ راست سے نزدیک رہو، دور مت ہٹ جاؤ۔

قولہ: وَابْشِرُوْا: بَشَر به، باب نصر کے معنی ہیں: خوش ہونا۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: یہ خیال مت کرو کہ اگر بہت زیادہ عبادتیں نہیں کریں گے تو آخرت میں گھاٹے میں رہیں گے، رحمت الٰہی سے پُر امید رہو، خوش ہوجاؤ کہ تمہارے تھوڑے اعمال بھی آخرت میں کافی ہوجائیں گے۔

قولہ: واستعینوا إلخ یہ تشبیہ ہے، عرب میں جب گھوڑوں اور اونٹوں پر سفر ہوتا تھا: دن کے شروع حصہ میں سفر کرتے تھے، پھر دس بجے رک جاتے تھے، اس وقت گرمی سخت ہوجاتی ہے۔ پھر جب گرمی کی شدت ٹوٹ جاتی تھی اور موسم ٹھنڈا ہوجاتا تھا تو دوبارہ سفر شروع کرتے تھے، پس غُدوۃ کے معنی ہیں: صبح میں سفر کرنا، اور رَوْحَة کے معنی ہیں: شام میں سفر کرنا، اور رات کے کچھ حصہ میں بھی سفر جاری رکھتے تھے، یہ شیئٌ من الدُّلْجَة ہے، پس حضور اکرم ﷺ نے اس تشبیہ کے ذریعہ سالکین کو جو اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے نوافل اعمال کرتے ہیں سمجھایا ہے کہ جس طرح مسافر غُدوۃ، روحہ اور شیئٌ من الدُّلجہ سے سفر میں مدد حاصل کرتا ہے اسی طرح آپ لوگوں کو بھی کچھ اوراد و وظائف صبح میں کرلینے چاہئیں، کچھ شام میں اور کچھ رات میں سونے سے پہلے یا سونے کے بعد تہجد میں کرلینے چاہئیں۔ اتنا کافی ہے اس سے زیادہ ریاضتوں کی ضرورت نہیں۔ یہ تھوڑا بہت ہوجائے گا، اگر پابندی سے کیا جائے۔

[٢٩-] بابٌ: الدِّيْنُ يُسْرٌ

قَالَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم: "أَحَبُّ الدِّيْنِ إِلَى اللهِ الْحَنِيْفِيَّةُ السَّمْحَةُ"

[٣٩-] حدثنا عَبْدُ السَّلَامِ بْنُ مُطَهَّرٍ، قَالَ: نَا عُمَرُ بْنُ عَلِيٍّ، عَنْ مَعْنِ بْنِ مُحَمَّدٍ الْغِفَارِيِّ، عَنْ سَعِيْدِ بْنِ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْمَقْبُرِيِّ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: " إِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُشَادَّ الدِّيْنَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ، فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا، وَابْشِرُوْا، وَاسْتَعِيْنُوْا بِالْغُدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ"

[انظر: ٥٦٧٣، ٦٤٦٣، ٧٢٣٥]

بابٌ: الصَّلٰوةُ مِنَ الإِيْمَانِ

نماز ایمانی عمل ہے

نماز ایک ایمانی عمل ہے یعنی ایمانِ کامل کے تقاضہ سے یہ عمل وجود میں آتا ہے، آج اسّی فیصد مسلمان نماز نہیں پڑھتے: کیا وہ مسلمان نہیں ہیں؟ ہیں، مگران کا ایمان ناقص ہے اس لئے نماز نہیں پڑھتے، اگر مؤمن کامل ہوتے تو ضرور پڑھتے، پس نماز جو ایک عمل ہے ایمان کامل کا جزء ہوا اور اتنی بات متفق علیہ ہے۔

پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک آیت کریمہ لکھی ہے۔ اس آیت کریمہ کے بارے میں پہلے دو باتیں سمجھنی چاہئیں پھر استدلال بیان کرونگا:

١- دوسرے پارے کے شروع میں تحویل قبلہ کے سلسلہ میں جو آیات پاک ہیں ان میں سے ایک آیت ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ إِيْمَانَكُمْ﴾: اس کا شانِ نزول حضرت براء رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ جب آنحضور ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپؐ اپنے ننھیال میں فروکش ہوئے، آپؐ کے جدامجد ہاشم کی شادی قبیلۂ بنوالنجار میں ہوئی تھی، اور میزبانِ رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا تعلق بنوالنجار سے تھا، مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد آپؐ نے سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، لیکن آپؐ کی شدید خواہش تھی کہ بیت اللہ کو قبلہ قرار دیا جائے۔

آنحضور ﷺ کی بعثت ملت ابراہیمی اسماعیلی پر ہوئی ہے۔ ابراہیمی یعقوبی بنی اسرائیل کہلاتے ہیں اور ان کا قبلہ بیت المقدس تھا، اور عرب ابراہیمی اسماعیلی ہیں اور ان کا قبلہ بیت اللہ تھا، اور مسجد اقصیٰ کو قبلہ مقرر کرنے میں ایک مصلحت یہ تھی کہ مدینہ منورہ کی بڑی آبادی یہودیوں کی تھی، ان کو اسلام سے قریب لانے کے لئے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا عارضی حکم دیا گیا تھا۔ مگر یہود بے بہبود قریب تو کیا آتے الٹا انھوں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ

محمدؐ آہستہ آہستہ دین یہود کی طرف آرہے ہیں، وہ عنقریب مذہب یہود کو قبول کرلیں گے۔

غرض تحویل قبلہ کا یہ مقصد پورا نہ ہوا تو سولہ یا سترہ مہینے کے بعد دوبارہ تحویل ہوئی، اس وقت آنحضور ﷺ بنوسلمہ کے ایک نوجوان صحابی بشیر بن براء کے جنازے میں شرکت کے لئے ان کے محلّہ میں تشریف لے گئے تھے، اور مسجد بنوسلمہ میں ظہر پڑھا رہے تھے، آپؐ نے دو رکعتیں پڑھائی تھیں کہ نماز میں وحی نازل ہوئی، اور آپؐ اور صحابہ شمال کی جانب سے جنوب کی طرف گھوم گئے۔ اور باقی دو رکعتیں کعبہ شریف کی طرف پڑھیں، مدینہ منورہ سے بیت المقدس شمال کی جانب ہے اور بیت اللہ جنوب کی جانب، اسی مسجد بنوسلمہ کو مسجد القبلتین کہتے ہیں، پھر آپؐ نے عصر کی نماز مسجد نبوی میں کعبہ شریف کی طرف منہ کرکے پڑھائی۔ ایک صحابی یہاں سے عصر پڑھ کر بنو حارثہ کی مسجد کے پاس سے گذرے وہاں لوگ سابقہ قبلہ کی طرف نماز پڑھ رہے تھے، انھوں نے گواہی دی کہ قبلہ بدل گیا ہے، چنانچہ سب نماز کے اندر بیت اللہ کی طرف گھوم گئے، پھر اگلے دن ایک صحابی مسجدِ نبوی میں فجر پڑھ کر قبا پہنچے جو مدینہ منورہ سے تین چار میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں تھا وہاں لوگ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے تھے، جب انھوں نے تحویل کی خبر دی تو وہ سب بھی نماز ہی کے اندر کعبہ شریف کی طرف پھر گئے۔

۲- یہ حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے اس کے ایک طریق میں یہ مضمون آیا ہے کہ تحویل قبلہ کے بعد آنحضور ﷺ سے دریافت کیا گیا: یارسول اللہ! جو لوگ تحویل قبلہ سے پہلے انتقال کرگئے یا شہید ہوگئے اور انھوں نے کعبہ شریف کی طرف ایک بھی نماز نہیں پڑھی ان کی نمازوں کا کیا ہوگا؟ یہ بالکل ویسا ہی سوال تھا جیسے جب تحریم خمر کی آیات نازل ہوئیں تو حضرات صحابہ نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! ان مسلمانوں کا کیا حال ہوگا جنھوں نے حکم تحریم سے پہلے شراب پی اور اسی حالت میں انتقال کرگئے، مثلاً بعض صحابہ جنگ احد میں شراب پی کر شریک ہوئے اور اسی حالت میں شہید ہوگئے۔

قرآن کریم میں جواب آیا: ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْا﴾: الآیۃ (المائدہ آیت ۹۳) اور یہاں قرآن نے جواب دیا: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ إِيْمَانَكُمْ﴾ جواب کا حاصل یہ ہے کہ وہ مؤمن بندے تھے، وہ بامراد ہونگے اور جنت میں جائیں گے اس لئے کہ جنت درحقیقت ایمان کا صلہ ہے، اس کے لئے اعمال ضروری نہیں، قبیلہ بنی عبدالاشہل کا ایک شخص جن کا نام عمرو بن ثابتؓ تھا اور جو اُصیرم کے لقب سے معروف تھے، جنگ احد کے دن اسلام لائے اور فوراً تلوار لے کر میدان کارزار میں اتر گئے اور شہید ہوگئے، رسول اللہ ﷺ نے ان کے جنتی ہونے کی بشارت دی (زرقانی ۱:۳۱۶) معلوم ہوا کہ جنت میں جانے کے لئے اعمال ضروری نہیں۔ اعمال کا موقع ملے تو اعمال ضروری ہیں، جب ان صحابہ کو کعبہ شریف کی طرف نماز پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا مگر وہ مؤمن تھے پس وہ جنت میں جائیں گے اس لئے کہ جنت درحقیقت ایمان کا صلہ ہے اور مؤمن کے اعمال اس کے ایمان کے تابع کردیئے جائیں گے۔

استدلال: امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہاں إیمانکم سے صلوٰتکم مراد ہے، یعنی جو نمازیں تم نے بیت

المقدس کی جانب پڑھی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ضائع نہیں کریں گے، پس اس آیت میں نماز کو ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے، معلوم ہوا کہ اعمالِ صالحہ ایمان کا جزء ہیں اور ایمان کی ماہیت میں داخل ہیں۔

یہ حضرت کا استدلال ہے اور جواب اوپر آچکا کہ یہاں ﴿إِيْمَانَكُمْ﴾ سے ایمان ہی مراد ہے نماز مراد نہیں۔ اور آیت کا حاصل یہ ہے کہ جنت درحقیقت ایمان کا صلہ ہے نماز وغیرہ طاعات پر جنت میں جانا موقوف نہیں، پس جو لوگ تحویل قبلہ سے پہلے انتقال کر گئے وہ بامراد ہونگے، کیونکہ وہ ایماندار تھے، اللہ ان کا ایمان ضائع نہیں کریں گے۔

مکی دور میں قبلہ کعبہ تھا یا بیت المقدس؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے یہ ہے کہ بیت المقدس قبلہ تھا پھر ہجرت کے بعد بھی سولہ، سترہ مہینے تک بیت المقدس ہی قبلہ رہا، مگر آنحضور ﷺ مکی دور میں اس طرح نماز پڑھتے تھے کہ بیت اللہ اور بیت المقدس دونوں سامنے آجاتے تھے (أخرجه ابن أبي شيبه والبيهقي في سننه)

مگر جمہور کی رائے یہ ہے کہ مکی دور میں قبلہ کعبہ شریف تھا، پھر ہجرت کے بعد مسجدِ اقصیٰ کو عارضی قبلہ مقرر کیا گیا تا کہ یہود جان لیں کہ دینِ یہود اور دینِ اسلام کا سرچشمہ ایک ہے، مگر یہ مقصد حاصل نہ ہوا تو دوبارہ تحویل ہوئی۔ اور کعبہ شریف کو قبلہ قرار دیا گیا۔

غرض: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ایک مرتبہ نسخ مانتے ہیں اور جمہور دو مرتبہ۔ جمہور کہتے ہیں: کعبہ شریف کے پاس نماز پڑھنے والا تو دونوں قبلوں کی طرف ایک ساتھ منہ کر سکتا ہے مگر آنحضور ﷺ اور صحابہ ہمیشہ بیت اللہ کے پاس ہی نمازیں نہیں پڑھتے تھے؟ گھروں میں بھی پڑھتے تھے، اور گھر میں پڑھنے والا دونوں قبلوں کو سامنے نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے عام طور پر جمہور نے حضرت ابن عباس کی رائے کو نہیں لیا۔

مگر امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی رائے کو ترجیح دی ہے، انھوں نے ﴿إِيْمَانَكُمْ﴾ کی تفسیر صلوتکم عند البیت سے کی ہے، اور بین السطور میں صلوتکم سے اوپر لکھا ہے: إلی بیت المقدس اور عند البیت کے نیچے لکھا ہے: صلوتکم بمکۃ یعنی تم نے مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے پاس جو نمازیں مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کر کے پڑھی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ضائع نہیں کریں گے، یہ تفسیر ابن عباسؓ کی رائے پر مبنی ہے۔

[۳۰-] بابٌ: الصَّلَاةُ مِنَ الإِيْمَانِ

وَقَوْلُ اللّٰهِ تَعَالٰى: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيْمَانَكُمْ﴾ يَعْنِيْ صَلَاتَكُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ.

[۴۰-] حدثنا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ، قَالَ: نَا زُهَيْرٌ، قَالَ: نَا أَبُوْ إِسْحَاقَ، عَنِ الْبَرَاءِ: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كَانَ أَوَّلَ مَا قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ نَزَلَ عَلٰى أَجْدَادِهِ — أَوْ قَالَ: أَخْوَالِهِ — مِنَ الأَنْصَارِ، وَأَنَّهُ صَلّٰى قِبَلَ بَيْتِ

الْمَقْدِسِ سِتَّةَ عَشَرَ شَهْرًا أَوْ سَبْعَةَ عَشَرَ شَهْرًا، وَكَانَ يُعْجِبُهُ أَنْ تَكُوْنَ قِبْلَتُهُ قِبَلَ الْبَيْتِ، وَإِنَّهُ صَلَّى أَوَّلَ صَلاَةٍ صَلاَّهَا صَلاَةَ الْعَصْرِ، وَصَلَّى مَعَهُ قَوْمٌ، فَخَرَجَ رَجُلٌ مِمَّنْ صَلَّى مَعَهُ، فَمَرَّ عَلَى أَهْلِ مَسْجِدٍ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ فَقَالَ: أَشْهَدُ بِاللّٰهِ لَقَدْ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قِبَلَ مَكَّةَ، فَدَارُوْا كَمَا هُمْ قِبَلَ الْبَيْتِ، وَكَانَتِ الْيَهُوْدُ قَدْ أَعْجَبَهُمْ إِذْ كَانَ يُصَلِّيْ قِبَلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ، وَأَهْلُ الْكِتَابِ، فَلَمَّا وَلَّى وَجْهَهُ قِبَلَ الْبَيْتِ أَنْكَرُوْا ذٰلِكَ.

قَالَ زُهَيْرٌ: حَدَّثَنَا أَبُوْ إِسْحَاقَ، عَنِ الْبَرَاءِ فِيْ حَدِيْثِهِ هٰذَا: أَنَّهُ مَاتَ عَلَى الْقِبْلَةِ قَبْلَ أَنْ تُحَوَّلَ رِجَالٌ، وَقُتِلُوْا، فَلَمْ نَدْرِ مَا نَقُوْلُ فِيْهِمْ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ إِيْمَانَكُمْ﴾ [البقرة: ١٤٣]

[انظر: ٣٩٩، ٤٤٨٦، ٤٤٩٢، ٧٢٥٢]

ترجمہ: حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو پہلے آپؐ اپنے نانھیال میں اترے (علی أجداده اور علی أخواله کا ایک مطلب ہے) اور آپؐ نے سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، اور آپ کو یہ بات پسند تھی کہ آپؐ کا قبلہ کعبہ شریف ہو۔ اور پہلی نماز جو آپؐ نے کعبہ شریف کی طرف پڑھی عصر کی نماز تھی، اور آپؐ کے ساتھ ایک جماعت نے نماز پڑھی (یعنی تحویل قبلہ کے بعد آپؐ نے مسجد نبوی میں پہلی نماز عصر کی پڑھائی) پس ایک شخص آپؐ کے ساتھ عصر پڑھ کر نکلا اور وہ ایک مسجد (مسجد بنی حارثہ) پر سے گذرا درانحالیکہ وہ رکوع میں تھے (اور ان کا رخ مسجد اقصیٰ کی طرف تھا) اس نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کعبہ شریف کی طرف نماز پڑھی ہے۔ پس وہ نماز ہی میں کعبہ شریف کی طرف گھوم گئے۔ اور جب آپؐ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے تو یہود اور دیگر اہل کتاب خوش تھے، پھر جب تحویل قبلہ کا حکم آ گیا اور آپ بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنے لگے تو ان کو برا لگا (اور انھوں نے کہنا شروع کیا کہ مسجد اقصیٰ میں کیا کیڑے پڑ گئے جو بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنے لگے)

دوسری سند سے اس حدیث میں یہ اضافہ ہے: تحویل قبلہ سے پہلے کچھ لوگ وفات پا گئے یا شہید ہو گئے، پس ہم نہ سمجھ سکے کہ ان کے متعلق کیا کہیں؟ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ''اللہ ایسا نہیں کہ تمہارا ایمان ضائع کر دے''

قولہ: علی أجداده: آنحضرت ﷺ کے پردادا ہاشم کا نکاح قبیلہ بنو النجار کی ایک خاتون سلمی بنت عمرو سے ہوا تھا، اور ماں جس خاندان کی ہوتی ہے وہ ننھیال کہلاتا ہے، پس دادی کا خاندان بھی ننھیال ہوا، اور ننھیال میں ماموں بھی ہوتے ہیں اس لئے أخواله کہا، اور ایک روایت میں نَزَلَ علی بنی النجار أخوالِ عبد المطلب ہے: آپؐ اپنے دادا عبد المطلب کے ننھیال میں اترے۔ یہ حقیقی تعبیر ہے۔

جاننا چاہئے کہ آپؐ کا ننھیال میں قیام ارادی نہیں تھا، بلکہ اتفاقی تھا، جب آپ قُبا سے روانہ ہوئے تھے تو ہر قبیلہ آرزو مند تھا کہ آپؐ اس کے مہمان بنیں، مگر آپؐ نے فرمایا: میری اونٹنی من جانب اللہ مامور ہے، جہاں اللہ کا حکم ہوگا، وہیں

رکے گی، اس کا راستہ چھوڑ دو، اور آپ نے خود بھی لگام اونٹنی کی گردن پر ڈال دی، ناقہ وادی یثرب سے نکل کر ایک باغ میں جو دو یتیموں کا تھا اور اجڑا ہوا تھا جا کر بیٹھ گئی۔ وہاں سے قریب بنو النجار کا محلہ تھا، کچھ دیر کے بعد اونٹنی اٹھی اور کچھ دور جا کر پھر واپس اسی جگہ آ کر بیٹھ گئی، اور اپنی گردن زمین پر ڈال دی، وہاں سے سب سے قریب حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مکان تھا وہ ناقہ پر سے کجاوہ لے کر گھر چل دیئے، آپ نے فرمایا: ''آدمی اپنے کجاوے کے ساتھ ہوتا ہے'' چنانچہ آپ نے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر میں قیام فرمایا اور وہ باغ جو یتیموں کا تھا خرید کر آپ نے وہاں مسجد نبوی بنائی۔

قوله: ستة عشر شهرا: آنحضور ﷺ ربیع الاول میں مدینہ منورہ پہنچے ہیں اور تحویل قبلہ آئندہ سال ماہ رجب میں ہوئی ہے، پس اگر دونوں ناقص مہینوں کو جوڑ کر ایک مہینہ بنالیا جائے تو سولہ مہینے بنتے ہیں اور دونوں کو مستقل شمار کیا جائے تو سترہ مہینے بنتے ہیں۔

قوله: وكان يُعْجِبُهُ: حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا قبلہ بیت اللہ تھا، اور آنحضور ﷺ ملت ابراہیمی اسماعیلی پر مبعوث کئے گئے تھے، اور قرآن کے اولین مخاطب عرب تھے، اور ان کا قبلہ بیت اللہ تھا اس لئے آپ کی خواہش تھی کہ بیت اللہ کو قبلہ مقرر کیا جائے۔

قوله: راكعون: یہ يُصَلُّونَ کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے اور حقیقی معنی میں بھی یعنی جب تحویل قبلہ کی خبر دی گئی تو لوگ رکوع میں تھے، اور اسی حالت میں وہ کعبہ شریف کی طرف گھوم گئے۔

قوله: أشهد بالله: یہاں سے یہ قاعدہ بنایا گیا ہے کہ خبر واحد محتف بالقرائن (قرائن سے گھری ہوئی) یقین کا فائدہ دیتی ہے، آنحضرت ﷺ کا تحویل کی تمنا کرنا صحابہ جانتے تھے، اس قرینہ کی وجہ سے جب ایک شخص نے اللہ کی قسم کھا کر گواہی دی تو لوگوں نے خبر مان لی اور فوراً کعبہ کی طرف گھوم گئے۔

مسئلہ: اگر تحری سے نماز پڑھ رہا تھا اور نماز کے درمیان تحری بدل گئی یا کسی نے صحیح قبلہ کی خبر دی، یا کسی اور طریقہ سے خطا ظاہر ہوئی، یا ٹرین گھوم گئی تو فوراً صحیح قبلہ کی طرف گھوم جانا ضروری ہے، اور نماز ہو جائے گی، اور گھومنا ممکن نہ ہو تو نماز ازسرنو پڑھے یہ مسئلہ بھی اسی حدیث سے لیا گیا ہے۔

قال زُهير: یہاں یہ حدیث معلق ہے مگر آگے (حدیث نمبر ۴۴۸٦) موصولاً آرہی ہے، زُہیر سے اس حدیث کو ابو نعیم نے اور ان سے امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

بابُ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ

آدمی کے اسلام کی خوبی

اب تک حضرت کا دعوی یہ تھا کہ اعمال ایمان کا جزء ہیں، اب فرماتے ہیں کہ اعمال کے اوصاف بھی اعمال کا جزء

ہیں اور اعمال ایمان کے اجزاء ہیں، پس اعمال کے اوصاف بھی ایمان کے اجزاء ہوئے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے دو وصف ذکر کئے ہیں: اس باب میں وصفِ حُسن کا ذکر کیا ہے اور اگلے باب میں وصفِ مداومت کا، مثلاً: نماز شاندار پڑھنا: نماز کا وصف ہے، اور تہجد پر مداومت کرنا: تہجد کا وصف ہے، یہ اوصاف بھی ایمان کے اجزاء ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلے ایک معلق حدیث لکھی ہے پھر مسند حدیث لائے ہیں، مضمون دونوں کا ایک ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کوئی شخص مسلمان ہوا پھر اس کا اسلام اچھا ہوا یعنی وہ سچا پکا مسلمان ہوا تو اللہ تعالیٰ اس کے وہ تمام گناہ معاف فرما دیتے ہیں جن کے قریب وہ گیا ہے، یعنی جن گناہوں کا ارتکاب کیا ہے، پھر اس کے بعد حساب کا نمبر ہے (اور ضابطہ یہ ہے کہ) نیکی کا بدلہ دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھایا جاتا ہے، اور برائی کی سزا اس کے برابر دی جاتی ہے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کی برائی سے درگذر فرمائیں۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی نے اپنے اسلام کو شاندار بنایا تو ہر وہ نیکی جس کو وہ کرے گا اس کا ثواب دس گنا سے سات سو گنا تک لکھا جائے گا، اور ہر وہ برائی جس کا وہ ارتکاب کرے گا اسی کے مانند لکھی جائے گی۔

تشریح: ان حدیثوں میں ایک بات تو یہ ہے کہ صدق دل سے اسلام قبول کرنے سے سابقہ تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إن الإسلامَ يَهْدِمُ ما كان قَبْلَهُ: اسلام قبول کرنے سے سابقہ گناہ منہدم ہوجاتے ہیں (مشکوۃ حدیث ۲۸)

اور دوسری بات: ثواب کا یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ نیکی کا ثواب کم سے کم دس گنا اور زیادہ سے زیادہ سات سو گنا لکھا جاتا ہے۔ اور برائی کا گناہ برائی کے مانند لکھا جاتا ہے، مگر اس میں ایک استثناء ہے: اگر اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں تو پھر بیڑا پار ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَآءُ﴾: اللہ تعالیٰ شرک کو تو معاف نہیں فرمائیں گے، اس کے علاوہ جس گناہ کو چاہیں گے بخش دیں گے۔

اور نیکیوں کے ضابطہ سے روزہ اور انفاق فی سبیل اللہ مستثنیٰ ہیں، روزے کا ثواب کم سے کم تو دس گنا ہے، مگر زیادہ کی کوئی مقدار متعین نہیں، حدیث میں ہے: قیامت کے دن جب بندہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو اس کے روزہ کا ثواب عنایت فرمائیں گے تو وہ خوش خوش ہوجائے گا (مسلم حدیث ۱۱۵۱) یعنی روزہ دار کے سان گمان سے بھی زیادہ ثواب عنایت فرمائیں گے۔

اور انفاق فی سبیل اللہ کا ثواب کم سے کم سات سو گنا ہے، تیسرے پارے کے شروع میں راہ خدا میں خرچ کرنے کی تمثیل آئی ہے: ایک آدمی نے گیہوں کا ایک دانہ بویا، اس میں سے سات بالیاں نکلیں، ہر بالی میں سو دانے ہیں، یعنی

انفاق فی سبیل اللہ کا ثواب کم سے کم سات سو گنا ضرور ملے گا، اور زیادہ کی کوئی حد نہیں ﴿واللّٰہُ یُضَاعِفُ لِمَنْ یَّشَاءُ﴾ موقع اور محل کے اعتبار سے انفاق فی سبیل اللہ کا ثواب بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے صحابہ نے راہ خدا میں جو ایک مُد یا نصف مُد جو خرچ کیا ہے بعد کے لوگ اگر احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کریں تو بھی وہ ان کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتے (مشکوٰۃ حدیث ۶۰۰۷) اور دوسری حدیث میں ہے کہ تندرستی میں ایک درہم خرچ کرنا مرض وفات میں سو درہم خرچ کرنے سے بہتر ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۷۰) معلوم ہوا کہ موقع اور محل کے اعتبار سے ثواب بڑھتا ہے۔

استدلال: یہاں حدیث میں حُسن اسلام کا ذکر ہے، اور اسلام وایمان مترادف ہیں پس یہ ایمان کی بھی صفت ہوئی، اور حسن میں درجات کا تفاوت مسلّم ہے پس ایمان میں بھی مراتب ہونگے۔ اور جواب یہ ہے کہ یہ ایمان کامل کی خاصیت ہے نفس ایمان گھٹتا بڑھتا نہیں۔

فائدہ: شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ علم وادراک دیدیا ہے کہ وہ بندوں کے نیک اعمال کی کیفیت کا اندازہ کر کے خود ہی ثواب لکھ دیتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں، مگر روزوں کے ثواب کا وہ بھی اندازہ نہیں کر سکتے، اس لئے وہ صرف روزے لکھ لیتے ہیں اور ثواب کا خانہ خالی چھوڑ دیتے ہیں۔ روزوں کا ثواب قیامت کے دن خود اللہ تعالیٰ ڈکلیر کریں گے۔

[۳۱-] بابُ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ

[۴۱-] قَالَ مَالِكٌ: أَخْبَرَنِی زَیْدُ بْنُ أَسْلَمَ، أَنَّ عَطَاءَ بْنَ یَسَارٍ أَخْبَرَهُ، أَنَّ أَبَا سَعِیْدِ الْخُدْرِیَّ أَخْبَرَهُ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم یَقُوْلُ: "إِذَا أَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسُنَ إِسْلَامُهُ یُكَفِّرُ اللّٰهُ عَنْهُ كُلَّ سَیِّئَةٍ كَانَ زَلَّفَهَا، وَكَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ الْقِصَاصُ: الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلٰی سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ، وَالسَّیِّئَةُ بِمِثْلِهَا، إِلَّا أَنْ یَتَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهَا"

[۴۲-] حدثنا إِسْحَاقُ بْنُ مَنْصُوْرٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ، قَالَ: أَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ، عَنْ هَمَّامٍ، عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم: "إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ إِسْلَامَهُ، فَكُلُّ حَسَنَةٍ یَعْمَلُهَا، تُكْتَبُ لَهُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلٰی سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ، وَكُلُّ سَیِّئَةٍ یَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهُ بِمِثْلِهَا"

وضاحت: زَلَفَ (ن) اور زَلَّفَ (تفعیل) دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں اور اس کے معنی ہیں: آگے کرنا...... القصاص: کے یہاں معنی ہیں: حساب وکتاب.......... قال مالك: یہ روایت معلق ہے اس لئے کہ امام بخاریؒ کی امام مالکؒ سے ملاقات نہیں۔

بابٌ: أَحَبُّ الدِّيْنِ إِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ أَدْوَمُهُ

اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند وہ اعمال ہیں جن پر مداومت کی جائے

باب کی تقدیر عبارت ہے: أَحَبُّ أَعْمَالِ الدين، اور یہ مبتدا ہے اور أَدْوَمُهُ خبر ہے۔

حدیث: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ان کے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، اس وقت ان کے پاس ایک عورت تھی، آپؐ نے پوچھا: یہ کون عورت ہے؟ حضرت عائشہؓ نے بتلایا: فلاں عورت ہے جس کی نماز کا بڑا چرچا ہے (اس خاتون کا نام حولاء بنت تُویت تھا) آپؐ نے فرمایا: بس رہنے دو! تم لازم پکڑو انہی اعمال کو جن کو تم نباہ سکو، خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ تنگ دل نہیں ہوتے جب تک تم تنگ دل نہ ہو جاؤ، اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ وہ اعمال ہیں جن پر آدمی مداومت کرے۔

تشریح:

جو بندہ پابندی کے ساتھ مسلسل عمل کرتا ہے وہ سرخ رُو ہوتا ہے، چاہے وہ عمل تھوڑا ہو، کچھوے اور خرگوش کا واقعہ مشہور ہے: ان کے درمیان دوڑ کی شرط ٹھہری، خرگوش چوکڑیاں بھرتا ہوا چلا اور کچھوے سے بہت آگے نکل گیا، پھر اس نے سوچا کہ ابھی کچھوا بہت پیچھے ہے، ایک درخت کے نیچے پڑ کر سو گیا، اور کچھوا آگے نکل گیا۔ اس واقعہ میں یہ سبق ہے کہ کچھوے کی رفتار اگرچہ دھیمی تھی مگر اس کے عمل میں تسلسل تھا اس لئے وہ کامیاب ہو گیا، اور خرگوش کے عمل میں تسلسل نہیں تھا اس لئے وہ ہار گیا۔

آنحضرت ﷺ نے مذکورہ حدیث میں ایک نصیحت تو یہ فرمائی ہے کہ اتنے ہی اعمال کو وظیفہ بناؤ جن کو نباہ سکو، اور مراد نوافل اعمال ہیں، فرائض وواجبات مراد نہیں، وہ تو سب کرنے ہیں، البتہ نوافل اعمال بقدر استطاعت کرنے چاہئیں اور ان پر مداومت کرنی چاہئے، ترمذی وغیرہ میں یہ روایت آئی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ کی ظہر کی سنتیں رہ گئیں آپؐ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں عصر کے بعد وہ سنتیں پڑھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اس واقعہ کے بعد جب بھی نبی ﷺ عصر کے بعد میرے گھر تشریف لائے تو آپؐ نے دو نفلیں پڑھیں۔ حضرت عائشہؓ کی اس حدیث پر زید بن ثابتؓ وغیرہ متعدد حضرات نے نقد کیا ہے مگر ہمیں حدیث کا طالب علم ہونے کی وجہ سے دونوں حدیثوں میں تطبیق دینی ہے، حضرت الاستاذ علامہ بلیاوی قدس سرہ نے ایک عجیب بات فرمائی کہ محبّ کو محبوب کا جس وقت وہ آتا ہے انتظار رہتا ہے۔ اگر محبوب کسی دن ناوقت آجائے تو اگلے دن اس وقت میں بھی محبّ کو انتظار رہے گا اور اللہ تعالیٰ محبّ ہیں اور آنحضور ﷺ محبوب ہیں، ایک دن آپؐ نے عصر کے بعد دو نفل پڑھے اور اللہ سے ملاقات کی، پس اب اللہ کو انتظار رہے گا کہ میرا محبوب روز اس وقت میں آئے، چنانچہ آپؐ نے اس واقعہ کے بعد ہمیشہ عصر کے

بعد دو نفلیں پڑھیں، اور یہ آپؐ کی خصوصیت تھی۔ حضرت عائشہؓ نے اس کی صراحت کی ہے (ابوداؤد ۱:۱۸۲)

غرض جب کوئی عمل شروع کیا جائے تو اس کو پابندی سے کرنا چاہئے، کبھی کرنا اور کبھی چھوڑ دینا مناسب نہیں، اور پابندی تھوڑے اعمال پر ہوسکتی ہے، بہت زیادہ اعمال تھوڑے دن تو آدمی کرسکتا ہے پھر تھک کر چھوڑ دیتا ہے۔ ایسا شخص اللہ کا محبوب نہیں بن سکتا، جو شخص شاہی دربار میں روزانہ متعین وقت پر حاضری دیتا ہے اور جو کبھی کبھی آتا ہے بادشاہ اس پر مہربان نہیں ہوسکتا۔ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر کسی چٹان پر موسلا دھار بارش پڑے تو چٹان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا، لیکن اگر قطرہ قطرہ مسلسل گرتا رہے تو وہ پتھر میں سوراخ کردے گا، اس لئے قرب خداوندی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عمل میں مداومت ہو، اگرچہ عمل قلیل ہو۔

پھر آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس وقت تک ملول نہیں ہوتے جب تک تم ملول نہ ہوجاؤ'' بندے کا رنجیدہ ہونا یہ ہے کہ وہ تھک ہار کر بیٹھ جائے اور عمل چھوڑ دے، اور اللہ کا رنجیدہ ہونا مشاکلۃً ہے، جیسے ﴿یُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ﴾ دھوکہ دینا اللہ کی شان نہیں، صرف مشاکلۃً ﴿وَهُوَ خَادِعُهُمْ﴾ کہا گیا ہے، پس اللہ کے رنجیدہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ثواب دینا بند کردیتے ہیں۔

پھر آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ وہ اعمال ہیں جن پر بندہ مداومت کرے'' جب بندہ روز معینہ وقت پر کوئی عبادت کرے گا تو اللہ کو اس کا انتظار رہے گا، اس لئے پابندی کے ساتھ عمل کرنا چاہئے خواہ تھوڑا ہو۔

استدلال: حضرت کا استدلال یہ ہے کہ عمل پر مداومت عمل کا وصف ہے، پس جس طرح اعمال ایمان کا جزء ہیں اعمال کے اوصاف بھی ایمان کے اجزاء ہیں۔

قولہ: مَهْ: بمعنی اُکْفُفْ اسم فعل ہے، اور خطاب حضرت عائشہؓ سے بھی ہوسکتا ہے کہ اس خاتون کی تعریف بند کرو، اور حولاء بنت تویتؓ سے بھی ہوسکتا ہے کہ زیادہ نفلیں مت پڑھو، زیادہ دن نباہ نہ سکوگی، بلکہ اپنی قوت وطاقت کے بقدر وظیفہ بناؤ۔

قولہ: تَذْكُرُ: مضارع معروف اور فاعل حضرت عائشہ ہیں، یعنی انھوں نے اس خاتون کا تعارف کرا کر یہ بھی کہا کہ یہ خاتون بڑی عبادت گذار ہیں، رات بھر نفلیں پڑھتی ہیں، اور گیلری والا نسخہ یُذْكَرُ: مضارع مجہول واحد مذکر غائب ہے، اب مطلب ہوگا کہ یہ وہ خاتون ہیں جن کی نمازوں کا بڑا چرچہ ہے۔

قولہ: کان أحب الدین إلیہ: إلیہ کا مرجع اللہ تعالیٰ بھی ہوسکتے ہیں، اس صورت میں یہ حدیث ہوگی، اور رسول اللہ ﷺ بھی ہوسکتے ہیں، اس صورت میں حدیث حتی تملوا تک ہوگی، اور کان: حضرت عائشہؓ کا قول ہوگا۔

[۳۲-] بابٌ: أَحَبُّ الدِّيْنِ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ أَدْوَمُهُ

[۴۳-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى، قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى، عَنْ هِشَامٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ أَبِيْ، عَنْ عَائِشَةَ: أَنَّ النَّبِيَّ

صلى الله عليه وسلم دَخَلَ عَلَيْهَا، وَعِنْدَهَا امْرَأَةٌ، فَقَالَ: "مَنْ هٰذِهِ؟" قَالَتْ: فُلاَ نَةٌ، تُذْكَرُ مِنْ صَلاَتِهَا، قَالَ: "مَهْ! عَلَيْكُم بِمَا تُطِيْقُوْنَ، فَوَاللّٰهِ لاَيَمَلُّ اللّٰهُ حَتَّى تَمَلُّوْا، وَكَانَ أَحَبُّ الدِّيْنِ إِلَيْهِ مَا دَاوَمَ عَلَيْهِ صَاحِبُهُ"

[انظر: ۱۱۵۱]

بَابُ زِيَادَةِ الإِيْمَانِ وَنُقْصَانِهِ

ایمان میں کمی بیشی کا بیان

پہلے کتاب الایمان کے شروع میں یہ بات گذر چکی ہے، وہاں الفاظ تھے:یَزِیْدُ ویَنْقُصُ، یہاں الفاظ دوسرے ہیں، امام بخاری رحمہ اللہ کبھی ایسا کرتے ہیں کہ ایک ہی باب الفاظ بدل کر دوبارہ لاتے ہیں، شراح اس کو تفنُّن (نہج بدلنا) کہتے ہیں۔

اور حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے حوالہ سے یہ بات بھی گذری ہے کہ فقہاء (احناف) کا مقابلہ معتزلہ سے تھا، اور محدثین کا مرجئہ سے۔ مرجئہ اعمال کو کچھ اہمیت نہیں دیتے، ان کا نظریہ تھا کہ ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ تو مفید ہیں مگر اعمال سیئہ مضر نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ برابر مرجئہ کی تردید کرتے آرہے ہیں،، وہ قارئین پر رنگ چڑھانے کے لئے ایک ہی بات بار بار نہج بدل کر کہہ رہے ہیں کہ نجات اوّلی کے لئے صرف ایمان کافی نہیں، اعمال بھی ضروری ہیں، اعمال کے بغیر ایمان کی مثال اس درخت کے تنے جیسی ہے جس پر کوئی شاخ ہو نہ پتہ، پھل ہو نہ پھول، ایسا درخت کس کام کا؟

آج دنیا میں اسّی فیصد مسلمان عملی طور پر مرجئہ ہیں، وہ اعمال صالحہ کو مفید سمجھتے ہیں، جب کوئی بڑا دن یا بڑی رات آتی ہے تو نوافل میں جُت جاتے ہیں، کیونکہ وہ اعمال صالحہ کو مفید سمجھتے ہیں مگر جھوٹ بولتے ہیں، وعدہ خلافی کرتے ہیں، ڈاڑھی منڈواتے ہیں، نماز نہیں پڑھتے، سود کھاتے ہیں اور نہ جانیں کیا کیا برائیاں کرتے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں معاصی مضر نہیں، اگر وہ گناہوں کو مضر سمجھتے تو ان کی زندگیوں کا یہ نقشہ نہ ہوتا۔

اور تکرار کی دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت رحمہ اللہ کوئی تقریب نکال کر حدیث کی سب صحیح سندیں کتاب میں لانا چاہتے ہیں، جیسے کتاب الاستسقاء میں ایک ہی حدیث حضرت نے پورے باب میں گھمائی ہے اور نئے نئے ابواب قائم کرکے حدیث کو بار بار لائے ہے، وہاں مقصد اُس حدیث کی تمام سندوں کو جمع کرنا ہے، اگر ایک ہی حدیث بار بار لاتے اور نئے ابواب قائم نہ کرتے تو قاری بوریت محسوس کرتا، اس مقصد سے بھی تفنن کرتے ہیں۔

یہاں ترجمۃ الباب میں پہلے سورۃ الکہف کی آیت (۱۳) اور سورۃ المدثر کی آیت (۳۱) لکھی ہے ان کے سلسلہ میں کلام کتاب الایمان کے شروع میں گذر چکا ہے۔ پھر سورۃ المائدہ کی آیت (۱۳) لکھی ہے، اس آیت میں چونکہ استدلال کا نہج بدلا ہوا ہے اس لئے پہلے قال لکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا'' یہ آیت حجۃ الوداع میں عرفہ کے دن نازل ہوئی ہے، اس آیت سے استدلال اس طرح ہے کہ إکمال (افعال) کا مادہ کمال ہے، اور ظاہر ہے کہ دین کا کمال دین کا وصف ہے، اور جس طرح اعمال ایمان کے اجزاء ہیں اسی طرح اوصاف بھی ایمان کے اجزاء ہیں، پس دین کا کمال بھی دین کا جزء ہوا، اور دین وایمان مترادف ہیں، پس یہ وصف ایمان کا بھی جزء ہوا۔ لہٰذا جو شخص احکام شرعیہ پر عمل پیرا نہیں، نماز ہی نہیں پڑھتا، روزے نہیں رکھتا، زکوٰتیں نہیں دیتا اس کے دین میں نقصان ہوگا، اور دین پر عمل کرے گا تو ایمان میں اضافہ ہوگا، پس ایمان میں کمی زیادتی ثابت ہوئی، اس آیت سے اسی طرح استدلال کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں: ''اگر کمال میں سے کوئی چیز چھوڑ دی جائے تو ایمان میں نقصان آئے گا'' یعنی مکمل دین پر عمل کرے گا تبھی ایمان کامل ہوگا اور کچھ اعمال چھوڑ دے گا تو دین ناقص رہ جائے گا۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن دوزخ سے تمام وہ لوگ نکال لئے جائیں گے جنھوں نے **لا إلٰہ إلا اللہ** کا اقرار کیا ہے اور ان کے دل میں جو کے دانے کے برابر ایمان ہے، گیہوں کے دانے کے برابر ایمان ہے، یا ذرہ بھر ایمان ہے''

تشریح:

۱۔ یہ حدیث چند ابواب پہلے (حدیث نمبر ۲۲) گذری ہے، وہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث تھی اور یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہے، اس کو حضرت انسؓ سے قتادہ رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں اور ان سے ہشام نے بھی روایت کیا ہے اور ابان نے بھی، اور دونوں کی روایتوں میں ایک فرق تو یہ ہے کہ ہشام نے قتادہ عن أنس کہا ہے۔ اور ابان کی روایت میں تحدیث کی صراحت ہے، قال أبان: حدثنا قتادة، حدثنا أنس چونکہ حضرت قتادہؒ مدلس تھے اور مدلس کا عنعنہ معتبر نہیں (۱) اس لئے امام بخاریؒ نے متابع پیش کر دیا، تاکہ اعتراض رفع ہو جائے۔ اور دوسرا فرق یہ ہے کہ

(۱) تدلیس (تفعیل) کے معنی ہیں: عیب چھپانا، دَلَّسَ البائعُ: سامان کا عیب چھپانا۔ اصطلاح میں تدلیس کے معنی ہیں: محدث کا حدیث کی روایت میں کسی راوی کا نام نہ لینا، بلکہ اس سے اوپر کے راوی کا نام لینا، اور لفظ ایسا اختیار کرنا جس میں سماع کا احتمال ہو، اس فعل کے مرتکب کو مدلِّس اور اس کی روایت کو مدلَّس اور راوی کے حذف کو سقط کہتے ہیں۔

تدلیس دو وجہ سے کی جاتی ہے:

ایک غرض فاسد سے، یعنی کسی محدث کا استاذ معمولی درجہ کا ہو اور استاذ کا استاذ عالی رتبہ ہو اور محدث کو اس معمولی استاذ سے روایت کرنے میں شرم محسوس ہوتی ہو تو وہ اس کو حذف کر دیتا تھا، اس مقصد سے تدلیس حرام ہے۔

دوم: کوئی محدث اختصار کے لئے استاذ کو حذف کرتا تھا جیسا کہ بعض اکابر محدثین نے ایسا کیا ہے، اس کی گنجائش ہے۔

اور تدلیس کی بہت سی صورتیں ہیں، مگر مشہور قسمیں تین ہیں: تدلیس الاسناد، تدلیس الشیوخ اور تدلیس التسویہ۔ ←

ہشام کی روایت میں من خیر ہے اور ابان کی روایت میں من إیمان ہے۔

۲- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں گیہوں کا دانہ جَو کے دانہ سے چھوٹا ہوتا تھا۔ زمینوں کے تفاوت سے غلوں میں دانے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں، ہمارے یہاں جَو اور گیہوں کے دانے تقریباً برابر ہوتے ہیں، بلکہ گیہوں کا دانہ ذرا بڑا ہوتا ہے۔

اور ذرّۃ کے بین السطور میں دو معنی لکھے ہیں: ایک: روشن دان سے دھوپ آرہی ہو اور آپ فرش پر ہاتھ ماریں تو دھوپ میں جو چیزیں نظر آئیں گی وہ ذرّے ہیں، اور دوسرے معنی لکھے ہیں: مکئی کا دانہ، مکئی کے دانے کو ذُرہ (ذال پر پیش اور راء مخفف) کہتے ہیں پس حدیث میں ذُرَہ بھی پڑھ سکتے ہیں، اور ذُرہ کے ایک معنی ہیں: چینا، یہ بھی ایک غلہ ہے اس کا دانہ سرسوں کے دانہ کے برابر ہوتا ہے، اس پر سے چھلکا نکلتا ہے، پھر اس کی مہری وغیرہ پکتی ہے، غرض چینا: گیہوں اور جو کے دانوں سے چھوٹا ہوتا ہے۔

استدلال: امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال یہ ہے کہ حدیث میں خیر بمعنی ایمان ہے، ابان کی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے، ان کی روایت میں من إیمان ہے، پس حدیث اس پر صاف دلالت کرتی ہے کہ ایمان وخیر میں تفاوت ہے، کسی کا ایمان جَو کے دانہ کے برابر ہوتا ہے، کسی کا گیہوں کے دانہ کے برابر اور کسی کا مکئی یا چینے کے دانے کے برابر اور کسی کا ذرّہ کے برابر۔ اور جو شخص پوری شریعت پر عمل کرتا ہے اس کا ایمان پہاڑ سے بھی بڑا ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

جواب یہ ہے کہ ایمان: خیر کے معنی میں بھی تو ہوسکتا ہے، یعنی یہ کمی بیشی اعمال میں ہوتی ہے یعنی ایمان کامل میں ہوتی ہے۔

← تدلیس الاسناد: یہ ہے کہ محدث کسی حدیث کو ایسے شخص سے روایت کرے جو اس کا ہم عصر ہے، مگر اس سے ملاقات نہیں ہوئی، یا ملاقات تو ہوئی ہے مگر اس سے کوئی حدیث نہیں سنی، یا حدیث تو سنی ہے مگر یہ حدیث جو بیان کر رہا ہے وہ نہیں سنی، یہ حدیث اس شیخ کے کسی معمولی یا ضعیف شاگرد سے سنی ہے اور اس واسطہ کو حذف کرکے شیخ سے اس طرح روایت کرتا ہے کہ سماع کا وہم پیدا ہوتا ہے، تدلیس کی یہ قسم مذموم اور ناجائز ہے۔

تدلیس الشیوخ: یہ ہے کہ محدث اپنے شیخ کا ذکر غیر معروف نام سے یا غیر معروف کنیت سے یا غیر معروف نسبت سے یا غیر معروف صفت سے کرے، تاکہ لوگ اس کو پہچان نہ سکیں، کیونکہ وہ ضعیف یا معمولی درجہ کا راوی ہے، تدلیس کی یہ صورت بھی نامناسب ہے، مگر ناجائز نہیں۔

تدلیس التسویہ: یہ ہے کہ محدث اپنے شیخ کو تو حذف نہ کرے البتہ حدیث کو عمدہ بنانے کے لئے اوپر کے کسی ضعیف یا معمولی راوی کو حذف کرے، اور وہاں ایسا لفظ رکھ دے جس میں سماع کا احتمال ہو۔ تدلیس کی یہ صورت حرام ہے (تحفہ الدرر ص: ۲۵-۲۷)

دوسری حدیث: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے دورِ خلافت میں ایک یہودی آیا، اس نے کہا: اے امیر المؤمنین! تمہاری کتاب میں ایک آیت ہے جس کو تم پڑھتے ہو مگر تمہیں اس کی قدر و قیمت معلوم نہیں، اگر وہ آیت ہم یہودیوں پر اترتی تو ہم اس دن جشن منایا کرتے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: وہ کونسی آیت ہے؟ اس نے کہا: ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ، وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا﴾ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ہم اس دن کو اور اس جگہ کو جہاں نبی ﷺ پر یہ آیت اتری ہے، خوب جانتے ہیں، جب یہ آیت اتری آپؐ وقوفِ عرفہ کئے ہوئے تھے اور وہ جمعہ کا دن تھا۔

تشریح:

یہودیوں کا دعوی ہے کہ دین موسوی دائمی ہے، وہ آفاقی دین کے دعوے دار تو نہیں، یعنی وہ یہ نہیں کہتے کہ یہودیت تمام انسانوں کے لئے ہے، ان کے نزدیک بھی یہودیت نسلی مذہب ہے، بنی اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کے لئے ہے، ان کے علاوہ کوئی یہودی نہیں بن سکتا، مگر وہ اپنے مذہب کو ابدی مانتے ہیں یعنی قیامت تک کے لئے مانتے ہیں، مگر تورات میں اس کی کوئی دلیل نہیں، یہ محض ان کا دعوی ہے۔ اس لئے وہ یہودی کہہ رہا ہے کہ اگر یہ آیت تورات میں ہوتی تو ہم اس دن جس دن وہ آیت اتری ہوتی فنکشن (جشن) منایا کرتے، اور تمہارے قرآن میں یہ آیت ہے، تم صبح و شام اس کو پڑھتے ہو مگر تمہارے نزدیک اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس یہودی کو جواب دیا کہ ہمیں کوئی جشن منانے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ جس دن آیت اتری ہے ہماری دو عیدیں جمع تھیں، ایک: جمعہ کا دن تھا جو مسلمانوں کی چھوٹی عید ہے۔ دوسری: عرفہ کا دن تھا جس میں ساری دنیا کے حاجی میدانِ عرفہ میں جمع ہوتے ہیں، پھر جمعہ کا دن تو ہمیشہ اس معین تاریخ میں نہیں آتا مگر عرفہ کا دن اس وقت سے آج تک ہمیشہ اسی معین تاریخ میں آتا ہے، اور قیامت تک اسی معین تاریخ میں آتا رہے گا، اس دن ساری دنیا کے حجاج مکہ مکرمہ کے اسی میدانِ عرفات میں اکٹھا ہوتے ہیں جہاں یہ آیت اتری تھی اور اتنا بڑا اجتماع ہوتا ہے کہ دنیا میں اتنا بڑا دوسرا کوئی اجتماع ممکن نہیں، پھر ہمیں الگ سے فنکشن منانے کی کیا ضرورت ہے؟

قولہ: إنَّ رجلاً من اليهود: یہ یہودی کون تھا؟ ایک رائے میں کعب احبار نے یہ بات کہی تھی، یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی، کعب احبارؒ تو مسلمان ہو گئے تھے، اور وہ صادق الایمان تھے، وہ اگرچہ تورات کی باتیں بیان کرتے تھے مگر وہ منافق نہیں تھے، مخلص مسلمان تھے۔ وہ حضرت عمرؓ سے ایسی بات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ یہ بات تو وہ کہے گا جو ابھی یہودی ہے، اور اس کو اپنے مذہب سے دلچسپی ہے، پھر اس شخص کا قرآن کو مسلمانوں کی کتاب کہنا، اور یہ کہنا کہ اگر ہم یہودیوں پر یہ آیت اترتی: یہ دلیل ہے کہ وہ کوئی دوسرا یہودی تھا[1] واللہ اعلم

(۱) حضرت کعبؒ ایک قول کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مسلمان ہوئے ہیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں مسلمان ہوئے ہیں (تہذیب ۸: ۴۳۸) اگر یہ دوسرا قول لیں تو حضرت کعبؒ کو مصداق بنایا جا سکتا ہے۔ یہ بات انھوں نے مسلمان ہونے سے پہلے کہی ہوگی۔

استدلال: امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے ایمان کی کمی بیشی پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ دین ۲۳ سال میں مکمل ہوا ہے، پس دین ۲۳ سال تک برابر بڑھتا رہا، پھر پایۂ تکمیل کو پہنچا، اور دین وایمان مترادف ہیں پس ثابت ہوا کہ ایمان بڑھتا رہا۔

اور جواب کتاب الایمان کے بالکل شروع میں سورۃ التوبہ کی آیت (۱۲۴) کے ضمن میں گذر چکا ہے کہ یہاں مُؤمَن بہ میں اضافہ ہوا ہے۔ یعنی ۲۳ سال تک جو ایمان میں اضافہ ہوتا رہا ہے وہ زیادتی احکام واخبار بڑھنے کی وجہ سے تھی، اس وقت جتنے احکام نازل ہوتے تھے وہی مکمل دین تھا، پھر جب کوئی نیا حکم نازل ہوتا تو اس کے ساتھ دین کامل ہوتا، غرض: پہلا دین ناقص نہیں تھا، جیسے شروع اسلام میں دو نمازیں فرض تھیں پس وہی کامل دین تھا پھر پانچ نمازیں فرض ہوئیں تو اب یہ کامل دین ہوا۔ اور مُؤمَن بہ میں اضافہ نزول وحی کے زمانہ میں ہوتا تھا، اب وحی مکمل ہو چکی اس لئے مؤمن بہ میں اضافہ کی کوئی صورت نہیں۔

[۳۳-] بابُ زِيَادَةِ الإِيْمَانِ وَنُقْصَانِهِ

[۱-] وَقَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى: ﴿ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى﴾ [الکھف: ۱۳]

[۲-] ﴿وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِيْمَانًا﴾ [المدثر: ۳۱]

[۳-] وَقَالَ: ﴿ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾: فَإِذَا تَرَكَ شَيْئًا مِنَ الْكَمَالِ فَهُوَ نَاقِصٌ.

[٤٤-] حدثنا مُسْلِمُ بْنُ إِبْرَاهِيْمَ، قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا قَتَادَةُ، عَنْ أَنَسٍ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قَالَ: "يُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَفِيْ قَلْبِهِ وَزْنُ شَعِيْرَةٍ مِنْ خَيْرٍ، وَيُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَفِيْ قَلْبِهِ وَزْنُ بُرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ، وَيُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ: لا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَفِيْ قَلْبِهِ وَزْنُ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ"

قَالَ أَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ: قَالَ أَبَانُ: حَدَّثَنَا قَتَادَةُ، حَدَّثَنَا أَنَسٌ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: "مِنْ إِيْمَانٍ" مَكَانَ "خَيْرٍ" [انظر: ٤٤٧٦، ٦٥٦٥، ٧٤١٠، ٧٤٤٠، ٧٥٠٩، ٧٥١٠، ٧٥١٦]

[٤٥-] حدثنا الحَسَنُ بْنُ الصَّبَّاحِ، سَمِعَ جَعْفَرَ بْنَ عَوْنٍ، حَدَّثَنَا أَبُوْ الْعُمَيْسِ، قَالَ: أَخْبَرَنَا قَيْسُ بْنُ مُسْلِمٍ، عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ أَنَّ رَجُلاً مِنَ الْيَهُوْدِ قَالَ لَهُ: يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! آيَةٌ فِيْ كِتَابِكُمْ تَقْرَءُوْنَهَا لَوْ عَلَيْنَا مَعْشَرَ الْيَهُوْدِ نَزَلَتْ لَا تَّخَذْنَا ذٰلِكَ الْيَوْمَ عِيْدًا، قَالَ: أَيُّ آيَةٍ؟ قَالَ: ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الإِسْلَامَ دِيْنًا﴾ قَالَ عُمَرُ: قَدْ عَرَفْنَا ذٰلِكَ الْيَوْمَ وَالْمَكَانَ الَّذِيْ نَزَلَتْ فِيْهِ عَلَى النبيِّ صلى الله عليه وسلم، وَهُوَ قَائِمٌ بِعَرَفَةَ يَوْمَ جُمُعَةٍ.

[انظر: ٤٤٠٧، ٤٦٠٦، ٧٢٦٨]

بابٌ: الزَّکَاۃُ مِن الإسلام

زکات اسلامی عمل ہے

اعمال اسلامی میں ایک زکوٰۃ بھی ہے پس جو مسلمان زکوٰۃ ادا نہیں کرتا وہ کامل مسلمان نہیں، ناقص مسلمان ہے۔ اور ایمان واسلام ایک ہیں پس ثابت ہوا کہ زکوٰۃ بھی ایمان کا جزء ہے۔

محدثین کا مقابلہ چونکہ مرجئہ کے ساتھ رہا ہے، اور آج اسّی فیصد مسلمان عملی طور پر مرجئی ہیں وہ اعمال کو تو مفید سمجھتے ہیں چنانچہ بڑے دنوں میں اور بڑی راتوں میں خوب عبادتیں کرتے ہیں اور برائی کو ایمان کے لئے مضر نہیں سمجھتے، چنانچہ ہر برائی کا برملا ارتکاب کرتے ہیں، نمازوں سے غفلت برتتے ہیں، زکوٰتیں ادا نہیں کرتے، اس لئے اعمال کی حیثیت زیادہ سے زیادہ بڑھا کر بیان کرنی چاہئے تا کہ بے عمل مسلمانوں کو ہوش آئے اور وہ اپنا محاسبہ کریں۔

امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں سورۃ البینہ کی ایک آیت لکھی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے شروع سورت سے مضمون سمجھنا ضروری ہے، اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ أَهْلِ الْکِتَابِ﴾ الآیۃ: الذین کفروا: لم یکن کا اسم ہے، اور من بیانیہ ہے، الذین کا بیان ہے، اور منفکین خبر ہے، ترجمہ: نہیں تھے وہ لوگ جنھوں نے نبی ﷺ کا انکار کیا خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے: اپنے حال سے جدا ہونے والے یہاں تک کہ ان کے پاس واضح دلیل آجائے۔

تمام انبیاء نبوت کے چاند تارے ہیں اور آقائے دو جہاں ﷺ آفتابِ نبوت ہیں، رات میں جب سورج نہیں ہوتا چاند تارے اپنی روشنی پھیلاتے ہیں لیکن جب سورج نکل آتا ہے تو چاند تارے بے نور ہو جاتے ہیں، وہ آسمان میں موجود ہوتے ہیں لیکن سورج کے نکلنے کے بعد ان کی روشنی پھیکی پڑ جاتی ہے۔ اور دور دورہ سورج کا شروع ہو جاتا ہے۔

قرآنِ کریم یہی کہہ رہا ہے کہ آج سے پہلے تو چاند تاروں سے کام چلتا تھا، لیکن اب تاریکی گھٹاٹوپ ہوگئی ہے اب چاند تاروں سے کام چلنے والا نہیں، اب ضروری ہے کہ آفتابِ نبوت طلوع ہو۔

یہ اس بات کا جواب ہے کہ آنحضور ﷺ کو سب سے آخر میں کیوں مبعوث فرمایا گیا؟ جواب یہ دیا گیا کہ اب سے پہلے بھی دنیا میں تاریکی چھائی تھی لیکن وہ تاریکی ہلکی ہوتی تھی، اس لئے چاند تاروں سے کام چل جاتا تھا لیکن جس دور میں آنحضور ﷺ مبعوث فرمائے گئے وہ ایسا دور تھا کہ تمام انسان گمراہی کی دل دل میں پھنس چکے تھے، اور تاریکی اتنی گہری ہوگئی تھی کہ چاند تاروں سے کام چلنے والا نہیں تھا، جب تک آفتابِ نبوت طلوع نہ ہو تاریکی چھٹنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو مبعوث فرمایا، جن کو قرآن نے ﴿سِرَاجًا مُنِیْرًا﴾ کہا ہے ﴿الْبَیِّنَۃَ﴾ سے خاص آنحضور ﷺ کی ذات اقدس مراد ہے، اور دلیل یہ ہے کہ آگے بدل آرہا ہے ﴿رَسُوْلٌ مِنَ اللّٰهِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُطَهَّرَۃً﴾ رسولٌ: میں تنوین تعظیم کے لئے ہے، یعنی جب تک اللہ کا بہت بڑا رسول کوئی کتاب لے کر نہ آئے گمراہی ختم

ہونے والی نہیں تھی، قرآنِ کریم کی ایک سو چودہ سورتیں ہیں ہر سورت ایک صحیفہ ہے۔ پہلے یہ صحیفے الگ الگ تھے، پھر ان کو کتابی شکل دی گئی ﴿فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ﴾ ان صحیفوں میں قیمتی مضامین ہیں، جن سے روشنی پھیلے گی اور تاریکی چھٹے گی۔ حالی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

اتر کر حراء سے سوئے قوم آیا ❁ اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

یعنی رسول قرآن ساتھ لے کر آیا تو گمراہی ختم ہوئی اور تاریکی چھٹی ﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِیْنَ أُوْتُوْا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَاجَاءَ تْهُمُ الْبَیِّنَةُ﴾: جب وہ بڑا رسول حاملِ قرآن بن کر آیا تو خاص طور پر اہل کتاب نے انکار کردیا، مشرکین نے بھی انکار کیا مگر ان پر زیادہ حیرت نہیں، اس لئے کہ وہ اللہ کی کتابوں سے اور نبیوں کی تعلیمات سے ناواقف تھے، لیکن جو لوگ اہل کتاب تھے، جن کے پاس اللہ کی کتابیں تھیں اور ان میں واضح ہدایتیں تھیں ان کا آنحضور ﷺ کی رسالت کا انکار کرنا زیادہ افسوس ناک تھا۔ اس آیت میں البینة سے مراد سابقہ کتابیں ہیں۔ اور تفرق سے مراد نبی ﷺ سے جدا ہونا ہے یعنی آپ کی رسالت کا انکار کرنا مراد ہے۔

گذشتہ کتابوں میں کیا ہدایات تھیں؟ ﴿وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ﴾ الآیة: ان کتب سماویہ میں اہل کتاب کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک خدا کی بندگی کریں درانحالیکہ وہ دین کو اللہ کے لئے خالص کرنے والے ہوں ﴿مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ﴾ پہلا حال ہے اور ﴿حُنَفَاءَ﴾ دوسرا حال ہے یعنی یہ بھی حکم تھا کہ تمام ادیانِ باطلہ سے یکسو ہو کر دین حق کی طرف مائل ہوجائیں۔ یہود کے دین میں گڑبڑ ہوگئی تھی، اس لئے ضروری تھا کہ وہ حضور ﷺ کی طرف متوجہ ہوجائیں، ﴿وَیُقِیْمُوْا الصَّلٰوةَ﴾ اور ان کو یہ بھی حکم تھا کہ نمازوں کا اہتمام کریں ﴿وَیُؤْتُوْا الزَّكَاةَ﴾ اور زکوتیں ادا کریں ﴿وَذٰلِكَ دِیْنُ الْقَیِّمَةِ﴾ ذلك: مبتداء ہے اور الدین القیمة: خبر ہے۔ یہ درحقیقت موصوف صفت ہیں، ان کو مرکب اضافی سے بدلا گیا ہے[1] فرمایا: اور یہ سیدھا دین ہے، یعنی جو احکام کتب سماویہ میں دیئے گئے ہیں وہی احکام قرآن میں ہیں، پس یہود کا قرآن کی تعلیمات سے روگردانی کرنا حیرت ناک ہے، اس کے بعد یہ مضمون ہے کہ تمام منکرین خواہ وہ مشرک ہوں یا اہل کتاب سب دوزخ میں جائیں گے، اور وہ بدترین خلائق ہیں اور نیک کام کرنے والے مؤمنین خیر البریّہ ہیں، ان کو ایمان اور اعمالِ صالحہ کی جزاء آخرت میں ملے گی۔ یہ پوری سورت کا خلاصہ ہے۔

(۱) کبھی مرکب توصیفی کو الٹ کر مرکب اضافی بناتے ہیں جیسے جسمٌ جمیلٌ سے جمیلُ الجسم، اور کبھی موصوف صفت کو بحالہ باقی رکھ کر موصوف کی صفت کی طرف اضافت کرتے ہیں، یہاں ایسا ہی کیا ہے، مگر ترجمہ موصوف صفت ہی کا کرتے ہیں اور ایسا عبارت کو سبک اور سہل بنانے کے لئے کرتے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ موصوف صفت میں مطابقت ضروری ہے جب صفت مؤنث ہے تو موصوف مذکر کیسے ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ملة پوشیدہ ہے۔ تقدیر عبارت ہے: ذلك دین الملة القیمة یعنی القیمة: الدین کی راست صفت نہیں، اس لئے موصوف صفت میں مطابقت ضروری نہیں۔

استدلال: امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال یہ ہے کہ ذلك کا مشارالیہ سابقہ ادیان کی باتیں ہیں، ان میں زکوۃ بھی ہے، اور اللہ نے فرمایا: ''یہ مستقیم دین ہے'' معلوم ہوا کہ زکوۃ دین کا ایک جزء ہے، اور دین وایمان ایک ہیں پس ثابت ہوا کہ اعمال ایمان کا جزء ہیں۔

فائدہ: کچھ متجددین کہتے ہیں کہ اہل کتاب: یہود ونصاری کافر نہیں اور ان کو کافر کہنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ وہ انبیاء کو مانتے ہیں، اللہ کی کتابوں کو مانتے ہیں، فرشتوں کو، قیامت کو اور جنت وجہنم کو مانتے ہیں، پس ان کو کافر کیسے کہہ سکتے ہیں؟ ان کی یہ بات غلط ہے، سورۃ البینہ میں دو جگہ اہل کتاب کو کافر کہا گیا ہے۔ پہلی آیت میں اور آیت ۶ میں۔ اور ان لوگوں کو اشکال اس وجہ سے ہوا ہے کہ انھوں نے کفر کے معنی اچھی طرح نہیں سمجھے، جس نبی کا زمانہ چل رہا ہے اس نبی کو نہ ماننے والا کافر ہے۔ البتہ لفظ کافر اب گالی بن گیا ہے اس لئے یہ لفظ استعمال نہ کیا جائے، اس کی جگہ کوئی اور لفظ مثلاً غیر مسلم کہا جائے۔

حدیث کا خلاصہ: یہ حدیث بخاری شریف میں متعدد جگہ آئی ہے اور دیگر کتب حدیث میں بھی معمولی اختلاف کے ساتھ آئی ہے۔ ان تمام روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دعوت وتبلیغ کے لئے صحابہ کی ایک جماعت ایک قبیلہ کی طرف بھیجی، انھوں نے محنت کی، سارا قبیلہ مسلمان ہونے کے لئے تیار ہوگیا، مگر پہلے انھوں نے داعیوں کی باتوں کی تصدیق کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ حضرت ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ کو نمائندہ بنا کر روانہ کیا، جس وقت وہ پہنچے ہیں آنحضور ﷺ کی مجلس ہو رہی تھی۔ انھوں نے کسی سے پوچھا: تم میں محمد کون ہیں؟ اس نے بتایا: وہ جو گورے رنگ کے حضرت ٹیک لگائے بیٹھے ہیں وہ محمد ہیں، وہ مجلس کو چیر کر آگے بڑھا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا، اور بات یہاں سے شروع کی کہ میں آپؐ سے کچھ باتیں دریافت کروں گا اور سخت لہجہ میں پوچھونگا، آپؐ مجھ پر ناراض نہ ہوں، آپؐ نے فرمایا: پوچھو جو پوچھنا ہے، اس نے سب باتیں پوچھیں، پھر اٹھ کر یہ کہتا ہوا چل دیا کہ آپؐ نے جو باتیں بتائی ہیں ان میں نہ کمی کرونگا نہ زیادتی یعنی بے کم وکاست قوم تک یہ باتیں پہنچاؤں گا۔

حدیث کا ترجمہ: حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کے پاس نجد کا ایک شخص آیا جو پراگندہ سر تھا، یعنی سفر کی وجہ سے اس کے بال گرد آلود بکھرے ہوئے تھے، وہ جب مسجد میں داخل ہوا تو کچھ گنگنا رہا تھا، ہم اس کی آواز کی بھنبھناہٹ سن رہے تھے اور ہم سمجھ نہیں رہے تھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، یہاں تک کہ وہ قریب آگیا۔ تب پتا چلا کہ وہ اسلام کے بارے میں پوچھ رہا ہے، آپؐ نے فرمایا: ''رات دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں'' اس نے پوچھا: کیا ان کے علاوہ بھی فرض ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''نہیں مگر یہ کہ تم نفل ادا کرو'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اور رمضان کے روزے فرض ہیں، اس نے پوچھا: کیا میرے ذمہ اس کے علاوہ بھی کچھ روزے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں مگر یہ کہ تم نفل روزے رکھو۔ راوی کہتا ہے: اور رسول اللہ ﷺ نے زکاۃ کا بھی ذکر کیا، اس نے پوچھا: کیا میرے ذمہ اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں مگر یہ کہ تم نفلی خیرات کرو۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے

ہیں: پس وہ شخص واپس جانے کے لئے مڑا درانحالیکہ وہ کہہ رہا تھا: خدا کی قسم! میں ان باتوں میں نہ کچھ بڑھاؤں گا اور نہ ان میں سے کچھ گھٹاؤں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر اس نے سچ کہا تو کامیاب ہوگیا!

سوال: اس حدیث میں نہ حج کا ذکر ہے اور نہ منہیات کا، پس کیا حج فرائض میں سے نہیں؟ اور منہیات سے بچنا ضروری نہیں؟

جواب: بخاری ہی میں آئندہ اسی حدیث (نمبر ۱۸۹۱) میں یہ بھی ہے: **فأخبرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشرائع الإسلام**: آپؐ نے اس کو اسلام کے سارے ہی احکام بتلائے، یہاں حدیث مختصر ہے۔

قولہ: لاأزید علی ھذا ولا أنقص کے علماء نے متعدد مطلب بیان کئے ہیں، میرے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ شخص قوم کا نمائندہ بن کر آیا تھا، اس لئے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے جو باتیں بتائی ہیں بے کم وکاست وہ باتیں اپنی قوم کو پہنچاؤں گا، ان میں نہ کمی کروں گا نہ زیادتی۔

اور آپؐ نے اس کو جو بشارت سنائی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے جس انداز سے گفتگو کی ہے اس سے آنحضور ﷺ نے اس کی قلبی کیفیت کا اندازہ کرلیا اور یہ بشارت سنائی۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

تامرد سخن نہ گفتہ باشد ❁ عیب و ہنرش نہفتہ باشد

جب تک آدمی بات نہیں کرتا اس کے عیب وہنر کا پتہ نہیں چلتا، جب کلام کرتا ہے تو اندازہ ہوجاتا ہے کہ کتنے پانی میں ہے؟ غرض حضرت ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ نے جس انداز سے گفتگو کی تھی اس سے حضور ﷺ ان کی قلبی کیفیت پر مطلع ہوگئے، اور اسی بنیاد پر یہ خوشخبری سنائی۔ واللہ اعلم

[٣٤-] بابٌ: الزَّكَاةُ مِنَ الإِسْلاَمِ

وَقَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ، حُنَفَاءَ، وَيُقِيْمُوا الصَّلاَةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ﴾[البينة:٥]

[٤٦-] حدثنا إِسْمَاعِيْلُ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ، عَنْ عَمِّهِ أَبِيْ سُهَيْلِ بْنِ مَالِكٍ، عَنْ أَبِيْهِ، أَنَّهُ سَمِعَ طَلْحَةَ بْنَ عُبَيْدِ اللّٰهِ يَقُوْلُ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم مِنْ أَهْلِ نَجْدٍ، ثَائِرَ الرَّأْسِ، نَسْمَعُ دَوِيَّ صَوْتِهِ، وَلاَ نَفْقَهُ مَا يَقُوْلُ، حَتّٰى دَنَا، فَإِذَا هُوَ يَسْأَلُ عَنِ الإِسْلاَمِ، فَقَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: " خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ " فَقَالَ: هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا؟ قَالَ: "لاَ، إِلاَّ أَنْ تَطَوَّعَ" قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: " وَصِيَامُ رَمَضَانَ" قَالَ: هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُ؟ قَالَ: " لاَ، إِلاَّ أَنْ تَطَوَّعَ" قَالَ: وَذَكَرَ لَهُ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم الزَّكَاةَ، قَالَ: هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا؟ قَالَ: "لاَ، إِلاَّ أَنْ تَطَوَّعَ" قَالَ:

فَأَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُوْلُ: وَاللّٰهِ لاَ أَزِيْدُ عَلَى هٰذَا وَلاَ أَنْقُصُ، قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: "أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ" [انظر: ۱۸۹۱، ۲۶۷۸، ٦٩٥٦]

وضاحت: ابوسُہیل حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے چچا ہیں اور بلند پایہ محدث ہیں۔ اور امام مالک کے دادا بھی بڑے محدث تھے۔

قولہ: أَنَّهُ سَمِعَ: أَنَّه کبھی عبارت میں لکھتے ہیں اور کبھی چھوڑ دیتے ہیں جیسے اوپر حدیث (۴۵) میں لکھا ہوا نہیں ہے، ایسی جگہ أَنَّهُ بڑھا کر پڑھ سکتے ہیں، جیسے حدثنا اور أخبرنا سے پہلے قال بڑھاتے ہیں۔

قولہ: دَوِيٌّ: بھنبھناہٹ، شہد کی مکھیوں کی آواز کو اردو میں بھنبھناہٹ اور عربی میں دَوِيٌّ کہتے ہیں۔

قولہ: ثائر الرأس: اس کو حال بھی بنا سکتے ہیں پس منصوب پڑھیں گے، اور مبتدا محذوف کی خبر بھی بنا سکتے ہیں پس مرفوع پڑھیں گے، تقدیر عبارت ہوگی: ھو ثائرُ الرأس۔

بابُ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ مِنَ الإِيْمَانِ

جنازہ کے ساتھ جانا ایمانی عمل ہے

جنازے کے ساتھ جانا ایمانی عمل ہے یعنی ایمان کے تقاضہ سے آدمی جنازہ کے ساتھ جاتا ہے۔ رشتہ داری کی بات الگ ہے ورنہ جنازے کے ساتھ جانے کی کس کو فرصت ہے؟ جو بندہ اپنی مصروفیات نظر انداز کرتا ہے اور جنازے کے ساتھ جاتا ہے وہ ایمان کے تقاضہ سے ہی ایسا کرتا ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص جنازہ کے ساتھ گیا یقین کرتے ہوئے اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے اور جنازہ کے ساتھ رہا یہاں تک کہ اس کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور اس کی تدفین سے فراغت ہوگئی تو وہ لوٹتا ہے ثواب کے دو قیراط کے ساتھ، ہر قیراط احد پہاڑ کے برابر ہوتا ہے۔ اور جس نے میت کی نماز جنازہ پڑھی پھر تدفین سے پہلے لوٹ گیا تو وہ ایک قیراط کے ساتھ لوٹتا ہے۔

تشریح:

۱- اتَّبع کے معنی ہیں: پیچھے چلنا ــــ جنازہ کے آگے چلنا افضل ہے یا پیچھے؟ اس میں اختلاف ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک آگے چلنا افضل ہے اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک پیچھے چلنا افضل ہے۔ یہ حدیث امام اعظم رحمہ اللہ کی دلیل ہے، اور یہ اختلاف درحقیقت نقطۂ نظر کا اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعیؒ کا خیال یہ ہے کہ جو لوگ جنازہ کے ساتھ جاتے ہیں وہ شافع (سفارشی) بن کر جاتے ہیں اور سفارش کرنے والا آگے چلتا ہے، اور امام اعظمؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ لوگ میت کو رخصت کرنے جاتے ہیں اور رخصت کرنے والے پیچھے چلتے ہیں، تفصیل کتاب الجنائز میں آئے گی۔

۲- حدیث شریف میں مسلم کی قید احترازی ہے، پس غیر مسلم کے جنازہ کے ساتھ جانا جائز نہیں، اگر چہ اس کے ساتھ روابط ہوں، ہاں تعزیت کے لئے اس کے گھر جاسکتے ہیں اور کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کے جنازہ کے ساتھ آئے تو اس کو منع نہیں کرنا چاہئے، وہ اس کا عمل ہے۔

۳- ایمانا و احتسابا: حدیثوں میں بار بار آیا ہے اور پہلے بتایا ہے کہ ایمان کے معروف معنی (تصدیق قلبی) مراد نہیں، بلکہ یقین کے معنی ہیں، اور احتساب کے معنی ہیں: ثواب کی امید رکھنا، اور یہ مشکل عمل کو آسان بنانے کا فارمولہ ہے، ظاہر ہے کاروبار چھوڑ کر اور دیگر مصروفیات کو نظر انداز کر کے جنازہ کے ساتھ جانا مشکل امر ہے، اور مشکل کام کو آسان بنانے کا فارمولہ یہ ہے کہ اس کام پر جو ثواب ملنے والا ہے اس کا یقین کیا جائے اور اس ثواب کو نظروں کے سامنے لایا جائے پس ہر مشکل کام آسان ہو جائے گا۔

۴- قیراط درہم کے چھٹے حصہ کو کہتے ہیں، مگر یہاں دنیا کا قیراط مراد نہیں، بلکہ آخرت کا قیراط مراد ہے، اور آخرت کا قیراط احد پہاڑ جتنا بڑا ہوگا، اور جو تدفین تک جنازہ کے ساتھ رہا اس کو دو قیراط ملیں گے، ایک قیراط جنازہ پڑھنے کا اور دوسرا قیراط تدفین میں شامل رہنے کا۔

پہلے طریقہ یہ تھا کہ جنازہ پڑھ کر لوگ خود قبر کھودتے تھے، پھر میت کو اتار کر خود ہی قبر بھرتے تھے، اس لئے اس کا علاحدہ ثواب رکھا گیا ہے، اگر سب لوگ نماز پڑھ کر چل دیں گے تو سارا کام میت کے پسماندگان کو کرنا پڑے گا، کوئی ان کا ہاتھ بٹانے والا نہ ہوگا۔ اب شہروں میں اگر چہ یہ صورت نہیں رہی، گورکن قبر تیار کرتا ہے اور وہی قبر بھرتا ہے، مگر دوسری مصلحتوں سے اب بھی حکم یہی ہے کہ دوسرا قیراط تدفین نمٹنے تک ساتھ رہنے کی صورت میں ملے گا۔

استدلال: امام بخاریؒ نے لفظ ایمانا سے استدلال کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جنازہ کے ساتھ جانے کو ایک ایمانی عمل قرار دیا ہے، پس وہ ایمان کا جزء ہوا۔ مگر میں نے اوپر بتایا ہے کہ یہاں ایمان اپنے معروف معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی یہاں یقین کرنے کے ہیں، یعنی جنازہ کے ساتھ جانے پر ثواب کا جو وعدہ کیا گیا ہے اس کا یقین کرنا مراد ہے۔

[۳۵-] بابٌ: اتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ مِنَ الإِيْمَانِ

[۴۷-] حدثنا أَحْمَدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَلِيٍّ الْمَنْجُوفِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا رَوْحٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَوْفٌ، عَنِ الْحَسَنِ، وَمُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ: "مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا، وَكَانَ مَعَهُ حَتَّى يُصَلَّى عَلَيْهَا، وَيُفْرَغَ مِنْ دَفْنِهَا، فَإِنَّهُ يَرْجِعُ مِنَ الأَجْرِ بِقِيْرَاطَيْنِ، كُلُّ قِيْرَاطٍ مِثْلُ أُحُدٍ، وَمَنْ صَلَّى عَلَيْهَا ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ أَنْ تُدْفَنَ، فَإِنَّهُ يَرْجِعُ بِقِيْرَاطٍ"

تَابَعَهُ عُثْمَانُ الْمُؤَذِّنُ قَالَ: حَدَّثَنَا عَوْفٌ، عَنْ مُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم نَحْوَهُ. [انظر: ۱۳۲۳، ۱۳۲۵]

وضاحت: اس حدیث کوعوف اعرابی سے رَوح اور عثمان المؤذن نے روایت کیا ہے، البتہ رَوح نے عوف کے دو استاذ ذکر کئے ہیں: حسن بصریؒ اور محمد بن سیرینؒ، اور عثمان المؤذن نے صرف محمد بن سیرن کا تذکرہ کیا ہے، یہ فرق ظاہر کرنے کے لئے متابع لائے ہیں۔

ملحوظہ: و کان معه: اس کو مذکر ومؤنث دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں، معه: پڑھیں تو مرجع مسلم ہوگا، اور معها پڑھیں توجنازة مرجع ہوگا......... یصلی اوریفرغ کو معروف ومجہول دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں......... مثل أحد کو اگر رفع پڑھیں تو یہ خبر ہوگا، اور کل قیراط مبتداء ہوگا، اور نصب پڑھیں تو منصوب بنزع خافض ہوگا، أی کمثل أُحُدٍ۔

بابُ خَوْفِ الْمُؤْمِنِ أَنْ يُحْبَطَ عَمَلُهُ وَهُوَ لاَيَشْعُرُ

مؤمن کو دھڑکا لگا رہنا چاہئے کہ کہیں اس کے اعمال غارت نہ ہوجائیں اور اس کو پتا بھی نہ چلے

اس باب میں دو مضمون ہیں، پہلے مضمون کی دلیل میں تین آثار لائے ہیں، پھر دوسرا مضمون ہے اس کی دلیل میں آیت لائے ہیں، اس کے بعد دو حدیثیں ہیں، ان میں سے پہلی حدیث دوسرے مضمون سے متعلق ہے اور دوسری حدیث پہلے مضمون سے متعلق ہے، یعنی لف ونشر مشوّش ہے۔

پہلا مضمون: مؤمن کو ہمیشہ دھڑکا لگا رہنا چاہئے کہ کہیں اس کے اعمال ضائع نہ ہوجائیں اور اسے پتا بھی نہ چلے، اور ظاہر ہے جب کسی مؤمن کے اعمال کسی گناہ کی وجہ سے غارت ہونگے تو اس کا ایمان کمزور پڑے گا، اور ایمان میں نقص آئے گا پس ثابت ہوا کہ ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے۔

قرآنِ کریم میں ہے: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَتَرْفَعُوْا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلاَ تَجْهَرُوْا لَهُ بِالْقَوْلِ﴾ الآية (الحجرات آیت ۲) اے مسلمانو! نبی ﷺ کے سامنے زور سے مت بولو، ہوسکتا ہے تمہارے اعمال غارت ہوجائیں اور تمہیں پتا بھی نہ چلے، اگر تمہارے زور سے بولنے کی وجہ سے حضور ﷺ کے قلبِ مبارک میں میل آگیا تو تمہارے اعمال ختم ہوجائیں گے اور تمہیں اس کا احساس بھی نہ ہوگا، معلوم ہوا کہ بعض گناہوں کی وجہ سے زندگی بھر کا کیا کرایا غارت ہوجاتا ہے، اس لئے ہمیشہ اپنے اعمال کے سلسلہ میں دھڑکا لگا رہنا چاہئے، مطمئن کبھی نہیں رہنا چاہئے۔

دلائل:

پہلا اثر: حضرت ابراہیم تیمی رحمہ اللہ جو لوگوں میں وعظ کہا کرتے تھے فرماتے ہیں: میں نے جب بھی اپنے قول کو اپنے عمل پر پیش کیا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میں اپنی بات کی تردید تو نہیں کررہا، یعنی میرا عمل میری تقریر اور وعظ کے خلاف تو نہیں۔ یہ مطلب مکذِّبًا: اسم فاعل پڑھنے کی صورت میں ہے۔ اور مُکَذَّبًا: اسم مفعول پڑھیں تو مطلب یہ ہوگا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں لوگ میری تکذیب تو نہیں کریں گے، وہ کہیں گے: مولوی کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ اور

لفظی ترجمہ ہوگا: کہیں میں جھٹلایا ہوا تو نہیں ہونگا۔ اور حاشیہ میں لکھا ہے کہ راجح اسم فاعل ہے ....غرض مؤمن کو ہمیشہ اپنے اعمال کے بارے میں دھڑ کا لگا رہنا چاہئے جیسے ابراہیم تیمی رحمہ اللہ کو لگا رہتا تھا۔

دوسرا اثر: ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ جو اکابر تابعین میں سے ہیں فرماتے ہیں: میں تیس صحابہ سے ملا ہوں، اور ان سے علم حاصل کیا ہے، اور حاشیہ میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی ان کی ملاقات ہوئی ہے اور ان سے بھی علم حاصل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ وہ تمام صحابہ اپنے بارے میں نفاق سے ڈرتے تھے یعنی نفاق عملی سے، یعنی ان سب کو یہ خوف لگا رہتا تھا کہ کہیں ہم عملی طور پر منافق تو نہیں ہیں، اور ان صحابہ میں سے کوئی یہ نہیں کہتا تھا کہ اس کا ایمان حضرت جبرئیل و میکائیل علیہما السلام کے ایمان جیسا ہے۔

اور امام اعظم رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے کہ إیمانی کإیمان جبرئیل کہنا تو جائز ہے، مگر مثل إیمان جبرئیل کہنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ مثلیت میں تمام صفات میں برابری ضروری ہے اور تشبیہ کے لئے یہ بات ضروری نہیں، بعض اوصاف میں برابری بھی کافی ہے۔

کہتے ہیں: زیدٌ کَالأسد یعنی زید وصف شجاعت میں شیر کی طرح ہے۔ لہٰذا ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ کا قول احناف کے خلاف نہیں، کیونکہ علی إیمان جبرئیل ومیکائیل کا مطلب ہے: میرا ایمان حضرت جبرئیل و میکائیل کے ایمان کے برابر ہے جس کے احناف بھی قائل نہیں۔

تیسرا اثر: حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ سے مؤمن ہی ڈرتا ہے اور اللہ سے منافق ہی بے خوف رہتا ہے............ما خافه کی ضمیر کا مرجع بین السطور میں منافق لکھا ہے وہ صحیح نہیں۔ صحیح مرجع اللہ ہے............ جب چاہو اس بات کا تجربہ کر سکتے ہو۔ جو شخص سچا پکا مؤمن ہوتا ہے اس کے دل کو دیکھو، اس کے دل میں خوف ہوگا کہ اللہ جانے مرنے کے بعد میرا کیا حشر ہوگا؟ میری بخشش ہوگی یا نہیں؟ اور جو نماز نہیں پڑھتا، روزہ نہیں رکھتا زکوٰۃ نہیں دیتا صرف نام کا مسلمان ہے اس کے دل کو ٹٹولو، اس کے دل میں کوئی خوف نہ ہوگا، وہ مطمئن ہوگا کہ جنت تو ہماری جاگیر ہے، اللہ ہمیں نہیں بخشیں گے تو کس کو بخشیں گے؟ ایسا شخص عملی منافق ہوتا ہے۔

دوسرا مضمون: وما یُحذَّر من الإصرار إلخ: کا عطف خوف المؤمن پر ہے۔

ترجمہ: اور اس باب میں ان چیزوں کا بھی بیان ہے جن سے مؤمن کو ڈرایا جاتا ہے، جیسے باہمی قتال پر اور گناہ پر اصرار کرنا، توبہ نہ کرنا یعنی دوسری چیز جس سے مؤمن کو ڈرنا چاہئے وہ گناہوں پر اصرار کرنا ہے، مؤمن کی شان یہ ہونی چاہئے کہ اگر اس سے کوئی گناہ ہو جائے تو فوراً اللہ کی طرف متوجہ ہو اور معافی طلب کرے، یہ انبیاء کی صفت ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے ایک لغزش ہوئی تو فوراً بارگاہِ الٰہی سے بخشش کے خواستگار ہوئے۔ گناہ پر اڑے نہیں، گناہ پر اڑنا شیطان کا کام ہے، وہ آج تک اپنی غلطی پر اڑا ہوا ہے۔ سورۂ آل عمران (آیت ۱۳۴ و ۱۳۵) میں متقیوں کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں:

وہ راہ خدا میں مال خرچ کرتے ہیں خوشی میں بھی اور تنگی میں بھی، اور جب کوئی ناگوار بات پیش آتی ہے تو غصہ پی جاتے ہیں اور لوگوں سے درگذر کرتے ہیں۔ پھر منفی پہلو سے ذکر کیا کہ جب ان سے کوئی بے حیائی کا کام ہو جاتا ہے یا وہ اپنے اوپر کوئی ظلم کر لیتے ہیں تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں۔ یہاں سے آنحضور ﷺ نے صلوۃ التوبہ مستنبط فرمائی۔ اگر کسی شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو پہلے صلوۃ التوبہ پڑھے، اللہ کو یاد کرنے کی سب سے اعلیٰ شکل نماز ہے، پھر اس گناہ کی معافی مانگے اور متقیوں کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنے گناہ پر اصرار نہیں کرتے، فوراً صلوۃ التوبہ پڑھ کر اللہ سے معافی مانگتے ہیں، معلوم ہوا کہ گناہوں پر اصرار نہ کرنا صلحاء کی صفت ہے۔

حدیث: زُبید کہتے ہیں: میں نے حضرت ابو وائل رحمہ اللہ سے مرجئہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ جو کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ طاعات تو مفید ہیں مگر معاصی مضر نہیں، ان کی یہ بات کہاں تک درست ہے؟ ابو وائل نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث سنائی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کو گالی دینا فسق (حد اطاعت سے نکلنا) ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے''

تشریح:

۱- ابو وائل شقیق بن سلمہ کبار محدثین میں سے ہیں اور حضرت ابن مسعودؓ کے خاص شاگرد ہیں۔ ان کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ مرجئہ کی بات غلط ہے اس لئے کہ آنحضور ﷺ نے مسلمان کو گالی دینے والے کو فاسق کہا ہے اور مسلمان کے قتل کرنے والے کو کافر کہا ہے۔ معلوم ہوا کہ معاصی ایمان کے ساتھ مضر ہیں۔

۲- دین کے دو دائرے ہیں: ایک چھوٹا دائرہ ہے اور وہ دینداری کا دائرہ ہے اس سے نکلنے والا فاسق ہے، اور دوسرا بڑا دائرہ ہے اور وہ دین کا دائرہ ہے اس سے نکلنے والا کافر ہے۔

معتزلہ اور خوارج وغیرہ گمراہ فرقوں نے اس قسم کی احادیث سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے نکل جاتا ہے، مگر اہل السنہ والجماعہ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ وعید کی حدیث ہے، اور یہاں ناقص کو کالعدم فرض کر کے کلام کیا گیا ہے، یعنی مسلمان کو قتل کرنے والا مسلمان ہے مگر اس کا ایمان ناقص ہے، اس لئے اس ناقص ایمان کو کالعدم فرض کر کے کافر کہہ دیا زجر و توبیخ کے موقعہ پر ایسا کرتے ہیں۔

مناسبت: یہ حدیث دوسرے مضمون سے متعلق ہے، آنحضور ﷺ نے لوگوں کو ڈرایا کہ مسلمان کو گالی مت دو ورنہ دینداری کے دائرے سے نکل جاؤ گے اور مسلمان کو قتل مت کرو ورنہ دین کے دائرہ سے بھی نکل جاؤ گے۔

حدیث (۲): حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ لیلۃ القدر کی اطلاع دینے کے لئے حجرہ سے باہر تشریف لائے، اس وقت دو مسلمان آپس میں لڑ رہے تھے۔ آپؐ ان کے درمیان صلح کرانے میں مشغول ہو گئے اور شبِ قدر کا علم ذہن سے نکل گیا۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا: میں اس لئے نکلا تھا کہ تمہیں لیلۃ القدر کی معین تاریخ بتلاؤں

مگر فلاں اور فلاں میں جھگڑا ہو رہا تھا، اس کی وجہ سے معین تاریخ کا علم اٹھالیا گیا۔ اور ہوسکتا ہے اسی میں تمہارے لئے بھلائی ہو، پس تلاش کرو تم شب قدر کو ساتویں، نویں اور پانچویں رات میں۔

تشریح: ایک رمضان میں آنحضور ﷺ کو شب قدر کی معین تاریخ بتلادی گئی تھی اور یہ تعیین خاص اسی رمضان کے لئے تھی، آپ صحابہ کو بتلانے کے لئے مسجد میں تشریف لائے آپؐ نے دیکھا کہ عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہما آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ حضرت کعبؓ کا عبداللہ بن ابی حدردؓ پر قرضہ تھا جس کا وہ مطالبہ کررہے تھے، اور حضرت عبداللہ تنگ دستی کا عذر کررہے تھے۔ آپؐ نے کعبؓ سے فرمایا: نصف معاف کردو، انھوں نے معاف کردیا پھر آپؐ نے عبداللہ کو نصف قرضہ فوری ادا کرنے کا حکم دیا۔ اس دوران آپؐ کے ذہن سے شبِ قدر کی تعیین نکل گئی۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا: میں اس لئے آیا تھا کہ تمہیں شب قدر کی اطلاع دوں مگر فلاں اور فلاں جھگڑ رہے تھے ان کے جھگڑے کی نحوست سے تعیین اٹھالی گئی، پھر فرمایا: شاید اسی میں تمہارے لئے خیر ہو، اگر معین رات بتادی جاتی تو اسی ایک رات میں لوگ عبادت کرتے، اب سب راتوں میں عبادت کریں گے، لہٰذا رمضان کی ہر رات میں شبِ قدر تلاش کرو خاص طور پر ستائیسویں، انتیسویں اور پچیسویں رات میں تلاش کرو۔

مناسبت: یہ حدیث پہلے مضمون سے متعلق ہے، دو آدمی جھگڑ رہے تھے، ان کی نحوست سے آنحضور ﷺ کے قلب اطہر سے شبِ قدر کی تعیین محو ہوگئی، معلوم ہوا کہ کچھ اعمال ایسے ہیں جن کی نحوست سے علم اٹھ جاتا ہے، اسی طرح عمل بھی حبط ہوجاتا ہے۔

[۳۶-] بابُ خَوْفِ الْمُؤْمِنِ أَنْ يَحْبَطَ عَمَلُهُ وَهُوَ لَايَشْعُرُ

[۱-] وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ التَّيْمِيُّ: مَا عَرَضْتُ قَوْلِي عَلَى عَمَلِيْ إِلَّا خَشِيْتُ أَنْ أَكُوْنَ مُكَذِّبًا.

[۲-] وَقَالَ ابْنُ أَبِيْ مُلَيْكَةَ: أَدْرَكْتُ ثَلَاثِيْنَ مِنْ أَصْحَابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم كُلُّهُمْ يَخَافُ النِّفَاقَ عَلَى نَفْسِهِ، مَا مِنْهُمْ أَحَدٌ يَقُوْلُ إِنَّهُ عَلَى إِيْمَانِ جِبْرِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ.

[۳-] وَيُذْكَرُ عَنِ الْحَسَنِ: مَا خَافَهُ إِلَّا مُؤْمِنٌ، وَلَا أَمِنَهُ إِلَّا مُنَافِقٌ.

وَمَا يُحَذَّرُ مِنَ الإِصْرَارِ عَلَى التَّقَاتُلِ وَالعِصْيَانِ، مِنْ غَيْرِ تَوْبَةٍ، لِقَوْلِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ: ﴿وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۳۵]

[۴۸-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ عَرْعَرَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ زُبَيْدٍ، قَالَ: سَأَلْتُ أَبَا وَائِلٍ عَنِ الْمُرْجِئَةِ، فَقَالَ: حَدَّثَنِيْ عَبْدُ اللهِ أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم: قَالَ: "سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ، وَقِتَالُهُ كُفْرٌ"

[انظر: ۶۰۴۴، ۷۰۷۶]

[٤٩-] حدثنا قُتَيبَةُ بْنُ سَعِيدٍ، حَدَّثَنا إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ، عَنْ حُمَيْدٍ، عَنْ أَنَسٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي عُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ أَنَّ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم خَرَجَ يُخْبِرُ بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ، فَتَلَاحَى رَجُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ، فَقَالَ: "إِنِّي خَرَجْتُ لِأُخْبِرَكُمْ بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ، وَإِنَّهُ تَلَاحَى فُلَانٌ وَفُلَانٌ، فَرُفِعَتْ، وَعَسَى أَنْ يَكُوْنَ خَيْرًا لَكُمْ، الْتَمِسُوْهَا فِي السَّبْعِ وَالتِّسْعِ وَالْخَمْسِ" [انظر: ۲۰۲۳، ٦٠٤٩]

بابُ سُؤَالِ جِبْرَئِيْلَ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم عَنِ الإِيْمَانِ وَالإِسْلَامِ وَالإِحْسَانِ وَعِلْمِ السَّاعَةِ

ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کا علم سب دین ہے

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک مرتبہ صحابہ کی موجودگی میں غیر معروف صورت میں آکر آنحضور ﷺ سے ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کے بارے میں پوچھا تھا۔ آنحضور ﷺ نے ان کو جوابات دیئے، پھر ان کے چلے جانے کے بعد آپؐ نے صحابہ سے فرمایا: جبرئیل اس لئے آئے تھے کہ تمہیں دین سکھائیں۔ جبرئیلؑ نے جو چار سوال کئے تھے وہ دین کا خلاصہ تھے، اور انھوں نے وہ سوال اس لئے کئے تھے کہ نبی اکرم ﷺ ان کا جو جواب دیں اس کو صحابہ محفوظ کرلیں۔ غرض حضور ﷺ نے ان چاروں سوالوں کے مجموعہ کو دین کہا ہے۔ علاوہ ازیں: وفد عبد القیس کے لئے ایمان کی تشریح کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے اعمال کو ایمان میں شامل کیا ہے۔

قوله: وما بَيَّنَ النبيُّ الخ میں واوٗ بمعنی مع ہے۔ یعنی صرف حدیث جبرئیل سے استدلال نہیں کیا بلکہ وفد عبد القیس کے لئے جو آنحضور ﷺ نے ایمان کی شرح کرتے ہوئے اعمال کو ایمان میں شامل کیا ہے اس کو بھی حدیث جبرئیل کے ساتھ ملانا ہے اور سورۂ آل عمران کی جو آیت لکھی ہے اس کو بھی ملانا ہے۔ تینوں مل کر دلیل بنیں گے۔

اور استدلال اس طرح ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جو چار باتیں پوچھی ہیں حضور ﷺ نے ان کو دین کہا ہے۔ اور دین وایمان ایک ہیں پس وہ چاروں باتیں ایمان کا جزء ہوئیں۔ اور وفد عبد القیس کی روایت میں آپؐ نے ایمان کی شرح میں اعمال کو لیا ہے پس اعمال ایمان کا جزء ہوئے اور قرآن نے فرمایا ہے: "اگر کوئی شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا" معلوم ہوا کہ اسلام اور دین ایک ہیں پس ثابت ہوا کہ اسلام، دین اور ایمان مترادف ہیں۔ یہی اس باب کا مدعی ہے۔

حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ایک دن رسول اللہ ﷺ مجمع میں تشریف فرما تھے۔ اچانک ایک شخص آیا اور اس نے پوچھا: ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، فرشتوں پر، اللہ سے ملاقات کرنے پر اور اس کے رسول پر یقین کرو اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا یقین کرو۔ اس نے دوسرا سوال کیا: اسلام کیا ہے؟

آپؐ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور نماز کا اہتمام کرو، اور فرض زکوٰۃ ادا کرو، اور رمضان کے روزے رکھو۔ اس نے پھر سوال کیا: احسان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے تو بلاشبہ وہ تمہیں دیکھ رہے ہیں، پھر اس نے سوال کیا: قیامت کب آئے گی؟ آپؐ نے فرمایا: جس سے پوچھا جارہا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ جاننے والا نہیں! ہاں میں قیامت کی نشانیاں بتاتا ہوں: (۱) جب باندی اپنی مالکہ کو جنے (۲) اور جب سیاہ اونٹوں کے چرانے والے عمارتوں میں تفاخر کریں۔ قیامت کا علم ان پانچ باتوں میں سے ایک ہے جن کو کوئی نہیں جانتا۔ پھر نبی ﷺ نے سورۂ لقمان کی آیت (۳۴) تلاوت فرمائی (جس میں ان پانچ باتوں کا ذکر ہے) پھر وہ سائل واپس چلا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: اس کو واپس لاؤ، پس لوگوں نے کچھ نہ دیکھا یعنی وہ نہ ملا۔ پس آپؐ نے فرمایا: یہ جبرئیل تھے اس لئے آئے تھے کہ لوگوں کو ان کا دین سکھلائیں۔
امام بخاریؒ فرماتے ہیں: آپؐ نے ان تمام چیزوں کو ایمان میں شامل فرمایا ہے۔

قولہ: ما الإیمان: یہ روایت مختلف سندوں سے مروی ہے اور سوالوں کی ترتیب میں تھوڑا فرق ہے، مشکوٰۃ شریف میں جو حدیث ہے اس میں اسلام کے بارے میں سوال پہلے ہے اور ایمان کے بارے میں بعد میں۔ صاحب مشکوٰۃ نے وہ حدیث مسلم شریف سے لی ہے۔ اور یہاں ایمان کے بارے میں سوال پہلے ہے اور یہی صحیح ترتیب ہے —— اور یہاں حدیث میں تمام ایمانیات مذکور نہیں۔ حدیث جبرئیل میں عام طور پر چھ ایمانیات کا ذکر آتا ہے، اور سب حدیثوں کو جمع کیا جائے تو سات باتیں ہوتی ہیں۔ انہی سات عقیدوں کو ایمان مفصل میں لیا گیا ہے۔

ایمانیات کی تفصیل:

۱- اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے موجود، وحدہ لاشریک لہٗ، خالق کائنات اور رب العالمین ہونے کا یقین کیا جائے اور ہر عیب ونقص سے اس کو پاک اور ہر صفت کمال سے اس کو متصف کیا جائے۔

۲- فرشتوں پر ایمان لانا یہ ہے کہ ان کے وجود کو تسلیم کیا جائے، اور یقین کیا جائے کہ وہ اللہ کی پاکیزہ اور محترم مخلوق ہیں، ہر شر اور نافرمانی سے پاک ہیں، ان کا کام اللہ کی بندگی اور ان کی جو ڈیوٹیاں ہیں ان کو بخوبی انجام دینا ہے، اور وہی اللہ کے پیغامات رسولوں تک پہنچاتے ہیں۔

۳- اور اللہ کی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ یقین کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً اپنے رسولوں کے ذریعہ ہدایت نامے بھیجے ہیں، ان میں سب سے آخری پیغام قرآن مجید ہے جو پہلی سب کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے، یعنی گذشتہ کتابوں کی تعلیم کا خلاصہ اور نچوڑ قرآنِ کریم میں لیا گیا ہے۔ پس یہ آخری کتاب سب سے مستغنی کرنے والی کتاب ہے۔

۴- اور اللہ کے رسولوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ اللہ نے اپنے بندوں کی راہنمائی کے لئے وقتاً فوقتاً اور مختلف علاقوں میں اپنے برگزیدہ بندوں کو اپنی ہدایت کا پیغام ودستور دے کر بھیجا ہے اور

انھوں نے پوری امانت ودیانت کے ساتھ خدا کا وہ پیغام بندوں کو پہنچایا ہے۔ اور لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی پوری پوری کوششیں کی ہیں۔ یہ سب پیغمبر اللہ کے برگزیدہ اور صادق بندے تھے، اس لئے ان رسولوں کی تصدیق کرنا، اور بحیثیتِ پیغمبران کا پورا پورا احترام کرنا ایمان کے شرائط میں سے ہے۔ نیز اس پر ایمان لانا بھی ضروری ہے کہ اس سلسلہ نبوت کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ختم کردیا گیا ہے۔ آپؐ خاتم الانبیاء اور اللہ کے آخری رسول ہیں۔ اب قیامت تک انسانوں کی نجات وفلاح آپؐ ہی کی ہدایت کی پیروی میں منحصر ہے۔

۵- اور اس دنیا کے آخری دن پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس حقیقت کا یقین کیا جائے کہ یہ دنیا ایک دن فنا کردی جائے گی، اور اُس آخری دن میں اللہ تعالیٰ جزاء وسزا کے فیصلے کریں گے، اور اس کے مطابق لوگ جنت اور جہنم میں جائیں گے، قیامت کا یہ عقیدہ سارے نظام دین کی بنیاد ہے، اگر کوئی اس کا قائل نہ ہو تو پھر کسی دین ومذہب اور تعلیمات وہدایات کو ماننے کی اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ——— اور بعث بعد الموت کا عقیدہ یوم آخر کے عقیدے میں شامل ہے۔

موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پہلی موت سے صرف جسم مرتا ہے، روح نہیں مرتی، وہ عالم برزخ میں چلی جاتی ہے، پھر جب اس دنیا کا آخری دن آئے گا تو اللہ تعالیٰ تمام اجسام کو زمین سے دوبارہ بنائیں گے، پھر ان کی طرف ان کی روحیں لوٹائیں گے۔ پس نئی زندگی شروع ہوجائے گی، پھر حساب وکتاب ہوگا، جزاء وسزا کے فیصلے ہونگے اور لوگ جنت وجہنم میں پہنچ کر دم لیں گے اور وہاں تا ابد نعمتوں میں یا عذاب میں رہیں گے۔

فرشتوں پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟

انسان چونکہ اللہ کے بندے ہیں اس لئے اللہ نے ان کو پیدا کرنے کے بعد ان کی جسمانی اور روحانی ضرورتوں کا انتظام کیا ہے، جسمانی ضرورتیں: جیسے بارش برسانا، زمین سے غلہ اگانا، گرمی سردی کا توازن قائم کرنا وغیرہ۔ اور روحانی ضرورتیں: ایمان وعمل صالح کی راہنمائی کرنا ہے، تاکہ بندے بہشت میں پہنچیں اور جہنم سے بچیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی جسمانی ضرورتوں کا انتظام تو بلا واسطہ کیا ہے، اور روحانی ضرورتوں کا انتظام نبوت کا سلسلہ قائم کرکے کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں انسانوں سے براہِ راست خطاب نہیں کرتے، یہ بات ان کی سکت سے باہر ہے، اس لئے وہ اپنے پیغامات فرشتوں کے واسطہ سے انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس بھیجتے ہیں اس لئے فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہے تاکہ یہ سوال پیدا نہ ہو کہ انبیاء کے پاس یہ ہدایتیں کس ذریعہ سے آئیں؟

گذشتہ نبیوں پر اور گذشتہ کتابوں پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟

اور گذشتہ نبیوں پر اور گذشتہ کتابوں پر ایمان لانا اس لئے ضروری ہے کہ یہ حضرات ایک ہی ہستی کے نمائندے ہیں اور ان

کی کتابیں ایک ہی سرچشمہ سے نکلی ہوئی نہریں ہیں، سب کا دین متحد ہے، اور وہ اسلام ہے ﴿إِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الإِسْلَامُ﴾ البتہ شریعتیں (آئین) مختلف ہیں، کیونکہ زمانہ کے تقاضے مختلف ہیں مگر سب شریعتیں اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی ہیں، پس خاتم النّبیین ﷺ پر نازل کیا ہوا دین بھی اور اللہ کی کتاب قرآن مجید اور آئین بھی اسی سرچشمہ سے آیا ہے، پس آخری دین اور شریعت کو ماننے کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ گذشتہ دین اور شریعتوں کو اور گذشتہ پیغمبروں کو بھی تسلیم کیا جائے۔

قولہ: بلقائه: اس کا مفاد ہے: آخرت پر ایمان لانا، کیونکہ اللہ سے ملاقات آخرت میں ہوگی۔ اور بلقائه اور بالبعث میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے، مرنے کے بعد زندہ تو ہر ایک کو ہونا ہے مگر اللہ سے صرف مؤمنین کی ملاقات ہوگی، قرآن میں ہے: ﴿إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوْبُوْنَ﴾ (المطففین آیت: ۱۵) کفار کو قیامت کے دن اللہ کے دیدار سے محروم کر دیا جائے گا، اور یہ ان کے لئے سزا ہوگی اور یہ محرومی اسی وقت سزا بن سکتی ہے جبکہ وہ اللہ کے دیدار کے امیدوار ہوں، جیسے عاشق سے کہا جائے کہ تیرے محبوب کا جلوہ تجھے نہیں دکھایا جائے گا، تو وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپے گا، اور جس کو کسی بندے سے تعلق ہی نہ ہو اس سے کہا جائے کہ تجھے فلاں آدمی نہیں دکھایا جائے گا تو وہ کہے گا: میرے پاپوش سے! مجھے دیکھ کر کیا کرنا ہے، غرض دیدار الٰہی سے محرومی اسی وقت سزا بن سکتی ہے جب کہ جہنمیوں کو اللہ سے ملنے کی اور اس کے دیدار کی انتہائی آرزو ہو۔

قولہ: أن تعبد الله: پہلے ابن عمرؓ کی حدیث گذری ہے وہاں تھا: شهادة أن لا إله إلا الله اور یہاں دوسرے الفاظ ہیں، کیونکہ یہ روایت بالمعنی ہے۔

قولہ: الزكاة المفروضة: طالب علم سوال کرتا ہے: المفروضة کی قید کیوں بڑھائی؟ جواب یہ ہے کہ برکت کے لئے بڑھائی ہے۔ عزیزو! حدیثیں تو روایت بالمعنی ہیں، اور جب کوئی حدیث روایت بالمعنی ہو کر مختلف سندوں سے آتی ہے تو تعبیرات کا اختلاف ہو ہی جاتا ہے، اس لئے حدیثوں میں ہر ہر لفظ کے بارے میں سوال نہیں کرنا چاہئے کہ اس لفظ کے بڑھانے میں کیا نکتہ ہے؟ ہاں قرآن میں یہ سوال کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس کا لفظ لفظ محفوظ ہے۔ اور قرآن علم و معانی کا سمندر ہے اور اس کے ہر ہر لفظ میں نکتے اور لطائف ہیں، جیسے یہاں حدیث میں حج کا ذکر نہیں آیا، اس لئے بعض حضرات نے کہہ دیا کہ حج اس وقت تک فرض نہیں ہوا تھا، یہ بات صحیح نہیں، کیونکہ ایک روایت میں صراحت ہے کہ یہ سوال آخر عمر میں ہوئے ہیں اور اسی حدیث کے دوسرے طریق میں حج کا ذکر آیا ہے، لہٰذا صرف ایک روایت میں حج کا ذکر نہ آنے کی وجہ سے یہ حکم لگا دینا درست نہیں۔ اس روایت میں تو بہت اختلاف ہے اور ایسا مقام کے اقتضاءات سے ہوتا ہے۔

قولہ: ما الإحسان: احسان: باب افعال کا مصدر ہے، اس کا مأخذ حُسن (خوبی) ہے پس احسان کے معنی ہیں: نکو کردن، یعنی اچھا بنانا، سائل نے تیسرا سوال کیا ہے کہ ارکانِ خمسہ کو اور دیگر اعمال کو عمدہ طریقہ پر ادا کرنے کی صورت کیا ہے؟ آپؐ نے اس کو دو طریقے بتائے: ایک اعلیٰ اور دوسرا ادنی۔

اعلیٰ طریقہ: اس دنیا میں اللہ کا دیدار ممکن نہیں، البتہ ''گویا'' کے درجہ میں ممکن ہے، یعنی استحضاری کیفیت اتنی بڑھ جائے گویا وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، پس اس حالت میں جو عبادت کرے گا وہ نہایت اعلی درجہ کی ہوگی، جیسے غلام آقا کے احکام کی تعمیل اس وقت کرے جب وہ سامنے ہو، اس وقت غلام خوش اسلوبی سے وظائف خدمت انجام دیتا ہے، یہی حال بندوں کا ہے، جس وقت بندہ یہ محسوس کرے کہ میں اپنے مولیٰ کے سامنے ہوں اور وہ میرے ہر کام اور ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے اس وقت اس کی بندگی میں ایک خاص شانِ نیازمندی پیدا ہوگی، اور اعمال نہایت عمدہ کیفیت کے ساتھ وجود میں آئیں گے۔

ادنی طریقہ: اور اگر یہ استحضاری کیفیت حاصل نہ ہو تو پھر اس عقیدہ کو تازہ کرلیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہے ہیں۔ سورۃ الانعام (آیت ۱۰۳) میں ہے: ﴿لَاتُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ، وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ، وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ یعنی اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہوسکتی مگر وہ سب نگاہوں کو محیط ہے، وہ بڑے باریک بیں باخبر ہیں، اس لئے کوئی چیز ان سے مخفی نہیں۔ جب اس عقیدے کے ساتھ عبادت کرے گا تب بھی عبادت شاندار ہوگی۔ جیسے مکتب کا مدرس استنجے کے لئے گیا اور روزن سے بچوں کو دیکھ رہا ہے، بچے اس کو نہیں دیکھ رہے، مگر بچوں کو یقین ہے کہ ان کی ہر حالت استاذ کی نگاہ میں ہے تو بھی بچے سکون کے ساتھ پڑھتے رہیں گے، دنگا فساد نہیں کریں گے، اسی طرح جب بندہ اس یقین کے ساتھ عبادت کرتا ہے کہ وہ اللہ کی نگاہ میں ہے تو بھی شاندار عبادت وجود میں آئے گی۔

فائدہ (۱): جاننا چاہئے کہ یہ حدیث نماز کے ساتھ خاص نہیں، حدیث میں تعبُد کا لفظ ہے جس کے معنی مطلق عبادت وبندگی کے ہیں، بلکہ ایک حدیث میں تخشی بھی آیا ہے، یعنی تم خدا سے اس طرح ڈرو کہ گویا اس کو دیکھ رہے ہو، اور ایک دوسری روایت میں تَعْمَل بھی آیا ہے، ان روایتوں سے واضح ہوا کہ احسان کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے۔

فائدہ (۲): فارسی کے دو لفظ ہیں: ایک: نیکوکردن یہ نیک سے بنا ہے یعنی اچھے اعمال کرنا۔ دوسرا: نِکوکردن یعنی عمدہ بنانا۔ احسان کا ترجمہ (بغیری کے) نکوکردن ہے، ابو داؤد میں حدیث (نمبر ۲۸۱۴ کتاب الضحایا) ہے: إن الله كتب الإحسانَ على كل شيئٍ: اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں عمدہ کرنا فرض کیا ہے، پس جب تم دشمن کو قتل کرو تو بہترین طریقہ پر قتل کرو، یعنی لاش نہ بگاڑو، اور جب تم جانور کو ذبح کرو تو بہترین طریقہ پر ذبح کرو اور چاہئے کہ تم میں سے ایک اپنی چھری تیز کرلے اور چاہئے کہ وہ اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احسان یعنی عمدہ کرنے کا تعلق ہر چیز سے ہے۔

فائدہ (۳): تصوف کے لئے قرآنِ کریم اور احادیث شریفہ میں یہی احسان کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ فرمایا: ﴿بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ﴾ ہاں جس نے خود کو خدا کے سپرد کردیا درانحالیکہ وہ نِکوکار بھی ہے تو اس کے لئے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے، اور دوسری جگہ ہے: ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ دِيْنًا مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ اور اس سے دین میں اچھا کون جس نے خود کو خدا کے سپرد کردیا، اور ساتھ ہی وہ نکوکار بھی ہے؟ یعنی اعمال بہترین طریقہ پر ادا کرتا ہے۔

اوراحادیث میں احسان کے علاوہ تصوف کے لئے زہد کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے، پھر جب لوگ خوش حال ہوگئے، اورشاندار کپڑے پہننے لگے مگر اللہ کے دیندار بندے صوف (اون) کے کپڑے ہی پہنتے رہے تو وہ صوفی اوران کا طریقہ تصوف کہلانے لگا، اور حاصل تینوں کا تصحیح نیت ہے۔یعنی احسان کا مقصد، زہد کی غرض اور تصوف کا حاصل یہ ہے کہ بندہ اپنی نیت درست کرلے، اور ہر عمل کو اللہ کے لئے خالص کرے۔ یہ اخلاص ہی تصوف کی جان ہے، اور وہی احسان سے مراد ہے۔

قولہ: ما المسئول: قیامت کا خاص وقت جس طرح سائل کو معلوم نہیں تھا نبی ﷺ کو بھی معلوم نہیں تھا، کیونکہ قیامت کا وقت ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ سورۂ لقمان کی آخری آیت میں ہے: ’’اللہ ہی کو قیامت کی خبر ہے، اور وہی بارش برساتے ہیں اور وہی جانتے ہیں جو کچھ بچہ دانی میں ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا؟ اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا؟ اللہ تعالیٰ ہی ان سب باتوں کو جاننے والے باخبر ہیں‘‘

شارحین کرام نے لکھا ہے کہ نبی ﷺ نے قیامت کے سوال کے جواب میں لا أدری! (میں نہیں جانتا) فرمانے کے بجائے: یہ پیرایۂ بیان اس لئے اختیار فرمایا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ کسی بھی سائل اور کسی بھی مسئول کو قیامت کا علم نہیں۔

قولہ:عن أشراطها: قیامت کی چھوٹی علامتیں اشراط کہلاتی ہیں اور اس کے لئے دوسرا لفظ آثار ہے۔ اور بڑی علامتوں کے لئے لفظ آیات ہے اور چھوٹی نشانیاں پہلے پائی جاتی ہیں اور بڑی نشانیاں بعد میں، جیسے بخار ہوتا ہے تو اس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، پھر بدن گرم ہوتا ہے، یہ بدن کا گرم ہونا بخار کی علامت ہے۔

آنحضور ﷺ نے قیامت کی دونشانیاں بیان فرمائی ہیں:

ایک: باندی اپنی مالکہ کو جنے۔ رَبَّۃٌ: رَبٌّ کا مؤنث ہے، معنی ہیں: مالک، آقا، سردار۔ اس جملہ کی شارحین نے مختلف تفسیریں کی ہیں، میرے نزدیک راجح تفسیر یہ ہے کہ بیٹی ماں پر حکم چلائے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب باندیاں تھیں اور مولیٰ اس سے صحبت کرتا تھا تو اس سے جواولاد ہوتی تھی وہ آزاد ہوتی تھی اور باندی ام ولد بن جاتی تھی، مگر باندی ہی رہتی تھی، اس لئے اولاد بڑی ہوکر ماں پر حکم چلاتی تھی کیونکہ ماں گھر کی لونڈی تھی، اور صرف لڑکے ہی حکم نہیں چلاتے تھے، لڑکیاں بھی چلاتی تھیں۔ پس حدیث کا مفاد یہ ہے کہ اولاد بدتمیز ہوجائے۔ ماں باپ کو نوکر سمجھنے لگے، آج کل اولاد کا عام طور پر یہی حال ہے اور اگر اولاد نے کچھ پڑھ لکھ لیا تو پھر ماں باپ کی ان کی نگاہوں میں کچھ وقعت نہیں رہتی۔ وہ ان سے نوکر جیسا معاملہ کرتے ہیں، یہ بات علامات قیامت میں سے ہے۔

دوسری علامت: سیاہ اونٹوں کے چرانے والے یعنی معمولی کاروبار کرنے والے عمارتیں بنانے میں تفاخر کرنے لگیں .... تَطَاوَلَ: ایک دوسرے سے دراز ہونا، لمبا ہونا، غرور وتکبر کرنا .... رُعَاۃ: راعی کی جمع ہے: چرواہا .... البُهم: اگر اس کو ابل کی صفت بنائیں تو مجرور پڑھیں گے اور ترجمہ ہوگا: کالے اونٹوں کے چرانے والے۔ سرخ

اونٹ اعلی درجہ کا مال سمجھا جاتا ہے، اور کالے اونٹ نکمے ہوتے ہیں۔ اور اگر رُعاۃ کی صفت بنائیں تو پھر البھم کو مرفوع پڑھیں گے اور ترجمہ ہوگا: اونٹ چرانے والے کالے یعنی حبشی۔

اور اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ دولت کی ریل پیل ہو جائے، انتہائی درجہ کے قلاش لوگ بھی تعمیرات میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے لگیں تو سمجھنا چاہئے کہ قیامت قریب ہے۔

قوله: في خَمْسٍ لا يعلمها: یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے۔ آنحضور ﷺ سید الاولین والآخرین ہیں، اور محبوب رب العالمین ہیں، اور ان کا علم پوری کائنات سے بڑھا ہوا ہے، ان کو بھی قیامت کا خاص وقت معلوم نہیں تھا، یہ بات بڑی عجیب ہے، اس کا جواب دیا کہ یہ کوئی عجیب بات نہیں، اس لئے کہ پانچ چیزیں ایسی ہیں جن کا علم بجز رب کائنات کے کسی کو نہیں، ان میں سے ایک قیامت کا علم بھی ہے۔

قوله: رُدُّوْه: یہاں روایت میں یہ ہے کہ سائل کے جانے کے بعد فوراً آپ نے اس کو واپس لانے کا حکم دیا۔ جب وہ نہیں ملا تو آپ نے فرمایا: وہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے، تمہیں دین سکھانے کے لئے آئے تھے یعنی اس لئے آئے تھے کہ وہ ایسے سوالات کریں جن کے جوابات میں پورے دین کا خلاصہ آجائے، اور صحابہ اس کو محفوظ کرلیں، اور کسی روایت میں ہے کہ آپ نے تین دن کے بعد خبر دی (ترمذی حدیث ۲۶۰۸) اور بعض روایتوں میں مَلِیًّا آیا ہے یعنی عرصہ کے بعد خبر دی (مشکوۃ شریف) یہ واقعہ کے متعلقات میں اختلاف ہے، اس کو چنداں اہمیت نہیں دینی چاہئے۔

قال أبو عبد الله: استدلال یہ ہیکہ حضرت جبرئیل نے جو سوال کئے ہیں ان میں عقائد بھی ہیں اور اعمال بھی۔ اور نبی ﷺ نے ان کے مجموعہ کو دین قرار دیا ہے، اور دین و ایمان ایک ہیں، پس ثابت ہوا کہ اعمال ایمان کا جزء ہیں۔

[۳۷-] بابُ سُؤَالِ جِبْرِيْلَ النَّبِيَّ صلى الله عليه سلم عَنِ الإِيْمَانِ وَالإِسْلاَمِ وَالإِحسانِ وَعِلْمِ السَّاعَةِ، وَبَيَانِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم لَهُ، ثُمَّ قَالَ: " جَاءَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلاَمُ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ" فَجَعَلَ ذٰلِكَ كُلَّهُ دِيْنًا. وَمَا بَيَّنَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم لِوَفْدِ عَبْدِ الْقَيْسِ مِنَ الإِيْمَانِ. وَقَوْلِهِ تَعَالىٰ: ﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلاَمِ دِيْنًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ﴾ [آل عمران: ۸۵]

[۵۰-] حدثنا مُسَدَّدٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ، قَالَ: أَخْبَرَنَا أَبُو حَيَّانَ التَّيْمِيُّ، عَنْ أَبِي زُرْعَةَ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: كَانَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم بَارِزًا يَوْمًا لِلنَّاسِ، فَأَتَاهُ رَجُلٌ، فَقَالَ: مَا الإِيْمَانُ؟ قَالَ: " الإِيْمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللهِ، وَمَلاَئِكَتِهِ، وَبِلِقَائِهِ، وَرُسُلِهِ، وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ" قَالَ: مَا الإِسْلاَمُ؟ قَالَ: "الإِسْلاَمُ أَنْ تَعْبُدَ اللهَ، وَلاَ تُشْرِكَ بِهِ، وَتُقِيْمَ الصَّلاَةَ، وَتُؤَدِّيَ الزَّكَاةَ الْمَفْرُوْضَةَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ" قَالَ: مَا الإِحْسَانُ؟ قَالَ: " أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ" قَالَ: مَتَى السَّاعَةُ؟ قَالَ: "مَا

الْمَسْئُوْلُ بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ، وَسَأُخْبِرُكَ عَنْ أَشْرَاطِهَا: إِذَا وَلَدَتِ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا، وَإِذَا تَطَاوَلَ رُعَاةُ الْإِبِلِ الْبُهْمِ فِي الْبُنْيَانِ فِي خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللّٰهُ" ثُمَّ تَلَا النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ الآية [لقمان: ٣٤] ثُمَّ أَدْبَرَ فَقَالَ: "رُدُّوْهُ" فَلَمْ يَرَوْا شَيْئًا، فَقَالَ: "هٰذَا جِبْرِيْلُ جَاءَ يُعَلِّمُ النَّاسَ دِيْنَهُمْ" قَالَ أَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ: جَعَلَ ذٰلِكَ كُلَّهُ مِنَ الْإِيْمَانِ. [انظر: ٤٧٧٧]

بابٌ

یہ باب بغیر ترجمہ کے ہے۔اور کالفصل من الباب السابق ہے، یعنی اس باب میں جو حدیث ہے اس کا تعلق اوپر والے باب سے ہے، کوئی نیا مضمون نہیں، البتہ فی الجملہ فرق ہے اس لئے باب قائم کیا۔

اور یہ حدیث پہلے آچکی ہے، قیصر روم ہرقل نے ابوسفیان سے دس یا گیارہ سوال کئے تھے، ہرقل نے ایک سوال یہ کیا تھا کہ تمہاری اس مدعی نبوت کے ساتھ جنگ ہوئی ہے؟ ابوسفیانؓ نے کہا: ہاں۔ پھر اس نے پوچھا: جنگ کا نتیجہ کیا رہا؟ ابوسفیان نے کہا: کنویں کا ڈول رہا، اگر اس کو دوالگ الگ سوال وجواب قرار دیں تو سوال گیارہ ہوجائیں گے، اور اگر ایک ہی سوال قرار دیں تو سوال دس رہ جائیں گے۔

غرض: ابوسفیان سے ہرقل نے دس یا گیارہ سوال کئے ہیں ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ جو لوگ اسلام قبول کرتے ہیں ان کی تعداد بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟ ابوسفیان نے کہا: بڑھ رہی ہے، اس پر ہرقل نے کہا: ایمان کی یہی شان ہے۔اس کو قبول کرنے والے روز بروز بڑھتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

اور دوسرا سوال ہرقل نے یہ کیا تھا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی شخص بربنائے ناراضگی اس دین سے پھرتا ہے یا نہیں؟ ابوسفیانؓ نے کہا: نہیں پھرتا! اس پر ہرقل نے کہا: ایمان کی یہی شان ہے، جب اس کی بشاشت (خوشی) دل میں پیوست ہوجاتی ہے تو نکلتی نہیں۔

اور دورِاول میں جو ارتداد کے چند واقعات پیش آئے ہیں مثلاً: عرینہ کے کچھ لوگ مسلمان ہوکر مدینہ منورہ آئے، ان کو مدینہ کی آب وہوا راس نہیں آئی، ان کو جوی بیماری ہوگئی، رسول اللہ ﷺ نے ان کو صدقات کے اونٹوں میں بھیج دیا اور فرمایا: ان کا دودھ اور موت پیو، پیا اور ٹھیک ہوگئے، پھر انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے چرواہے کو قتل کردیا اور تمام اونٹ لے کر چل دیئے، یہ ارتداد کا واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب ایمان کی بشاشت دلوں میں داخل نہیں ہوئی تھی، وہ لوگ مسلمان ہوتے ہی مرتد ہوگئے تھے، انھوں نے ابھی ایمان کی چاشنی نہیں چکھی تھی، اور ہرقل نے یہ کہا ہے کہ جس کے دل میں ایمان کی بشاشت داخل ہوجاتی ہے تو نکلتی نہیں۔اور یہ واقعات ایمان کی مٹھاس محسوس کرنے سے پہلے کے ہیں۔

استدلال: امام بخاری رحمہ اللہ کا حدیث سے استدلال اس طرح ہے کہ ہرقل نے جو دو تبصرے کئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ ایمان میں زیادتی ہوتی ہے اور ہر کمالے راز والے است! پس ثابت ہوا کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے۔اور

ترجمہ حضرت نے اس لئے نہیں رکھا کہ ہرقل کی مراد مؤمنین کا گھٹنا بڑھنا تھی، ایمان کا گھٹنا بڑھنا نہیں تھی، اس لئے استدلال کمزور تھا، چنانچہ حضرت نے ترجمہ ہی نہیں رکھا، صرف باب کہہ دیا، آگے قاری جانے!

قوله: كذلك الإيمان حتى يَتِمَّ: اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ جب بھی کوئی نیا نبی مبعوث ہوتا ہے تو شروع میں ایمان لانے والوں کی تعداد دن بدن بڑھتی ہے، یہاں تک کہ جماعت تشکیل پا جاتی ہے، اس وقت تک کوئی ایمان سے نہیں نکلتا۔ اس کے بعد کچھ لوگ تربیت نہ پانے کی وجہ سے یا جہالت کی وجہ سے ایمان سے پھر جاتے ہیں، جیسے کسی کے پاس پچیس بکریاں ہوں تو کوئی بکری ریوڑ سے نہیں نکلے گی، کیونکہ چرواہے کی ہر بکری پر نظر ہوگی، مگر جب ریوڑ بڑھ جائے اور بکریاں ہزار بارہ سو ہو جائیں تو مالک کی ہر بکری پر نظر نہیں رہ سکتی، اس لئے کوئی بکری ریوڑ سے نکل سکتی ہیں۔

اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ جب تک ملت چھوٹی ہوتی ہے تربیت کی طرف پوری توجہ ہوتی ہے، اس لئے کوئی ایمان سے نہیں پھرتا، لیکن جب ملت بہت بڑی ہو جاتی ہے تو پھر تربیت مشکل ہو جاتی ہے، مصلحین ہر ایک پر نظر نہیں رکھ سکتے، اس لئے جہالت کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے اور ارتداد کے واقعات پیش آتے ہیں مگر اس کی وجہ دین میں کوئی کمی نہیں ہوتی، بلکہ تربیت کی کمی ہوتی ہے۔

[۳۸-] بابٌ

[۵۱-] حدثنا إِبْرَاهِيْمُ بْنُ حَمْزَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ، عَنْ صَالِحٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ أَبُوْ سُفْيَانَ بْنُ حَرْبٍ: أَنَّ هِرَقْلَ قَالَ لَهُ: سَأَلْتُكَ: هَلْ يَزِيْدُوْنَ أَمْ يَنْقُصُوْنَ؟ فَزَعَمْتَ أَنَّهُمْ يَزِيْدُوْنَ، وَكَذٰلِكَ الإِيْمَانُ حَتّٰى يَتِمَّ، وَسَأَلْتُكَ: هَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ سَخْطَةً لِدِيْنِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيْهِ؟ فَزَعَمْتَ أَنْ لَا، وَكَذٰلِكَ الإِيْمَانُ حِيْنَ تُخَالِطُ بَشَاشَتُهُ الْقُلُوْبَ، لَا يَسْخَطُهُ أَحَدٌ. [راجع:۷]

بَابُ فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهِ

دین کو پاک صاف رکھنے کی اہمیت

یہاں استبرأ کا صلہ لام آیا ہے، اہل لغت صلہ میں صرف مِن لکھتے ہیں، مگر یہ حدیث دلیل ہے کہ لام بھی صلہ میں آتا ہے۔ استبرأ لدينه کے معنی ہیں: اپنے دین کو پاک صاف رکھنا، اور باب میں جو حدیث ہے اس کا حاصل پرہیز گاری ہے۔ نبی ﷺ نے پرہیز گاری کو دین قرار دیا ہے۔ اور دین اسلام اور ایمان مترادف ہیں، پس وَرَع (پرہیز گاری) بھی ایمان کا جزء ہوئی، یہی امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے، اور دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں، جن کے بارے میں بہت سے لوگ نہیں جانتے (ترمذی کی حدیث میں یہ بھی ہے: أَمِنَ الْحَلاَلِ هِيَ أَمْ مِنَ الْحَرَامِ؟: کیا وہ حلال ہیں یا حرام؟) پس جو شخص مشتبہ امور سے بچا اس نے اپنا دین اور اپنی آبرو پاک صاف رکھی، اور جو مشتبہ چیزوں میں پڑا وہ اس چرواہے کی طرح ہے جو سرکاری چراگاہ کے پاس جانور چراتا ہے، قریب ہے کہ وہ سرکاری چراگاہ میں جا پڑے، سنو! ہر بادشاہ کے لئے ریزرو چراگاہ ہوتی ہے، سنو! اور اللہ تعالیٰ کی محفوظ چراگاہ محرمات (حرام کئے ہوئے کام) ہیں، سنو! اور جسم میں گوشت کی ایک بوٹی ہے، جب تک وہ ٹھیک ہے سارا جسم ٹھیک ہے، اور جب وہ خراب ہو جاتی ہے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے، سنو! وہ بوٹی دل ہے۔

تشریح:

یہ حدیث نہایت اہم ہے، اور ایک اصولی ہدایت اپنے جلو میں لئے ہوئے ہے، اور بدءالوحی کے شروع میں بتایا تھا کہ امام ابوداؤدؒ نے پانچ لاکھ حدیثوں میں سے چار ایسی حدیثیں منتخب کی ہیں جو حفاظت دین کے لئے کافی ہیں، یہ حدیث ان میں سے ایک ہے، اس حدیث میں مؤمن کا ایک خاص مزاج بنایا گیا ہے۔ مؤمن کا مزاج یہ ہونا چاہئے کہ وہ محتاط زندگی گذارے، اور جن چیزوں کا حلال ہونا یقینی نہیں ان سے بچے تو دین پاک صاف رہے گا۔ تفصیل درج ذیل ہے:

ارشاد فرمایا: حلال واضح ہے پس اسے بے تکلف اختیار کرو، اور حرام بھی واضح ہے پس اس کے قریب بھی مت جاؤ، اور دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں، مشتبہ چیزیں کیا ہیں؟ اس کی تفصیل ادھر ادھر تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، خود حدیث میں اس کی وضاحت ہے۔ ترمذی (حدیث ۱۱۹۰ ابواب البیوع کی پہلی حدیث) میں ہے: أَمِنَ الْحَلاَلِ هِيَ أَمْ مِنَ الْحَرَامِ؟ یعنی مشتبہ چیزیں وہ ہیں جن کے بارے میں عام لوگ نہیں جانتے کہ وہ حلال ہیں یا حرام؟ بڑے علماء تو ان کے احکام جانتے ہیں مگر عام مسلمان جب وہ چیزیں پہلی مرتبہ ان کے سامنے آتی ہیں تو ان کے احکام سے واقف نہیں ہوتے، وہ چیزیں ان کے لئے مشتبہ ہیں۔ ایسی چیزوں کے بارے میں کچھ لوگوں کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ ابھی کر لو، جب عدم جواز کا فتوی آئے گا تو چھوڑ دیں گے۔ یہ ذہن غلط ہے، اس حدیث میں یہ اصولی ہدایت دی گئی ہے کہ ایسی مشتبہ چیزوں کے بارے میں مؤمن کا مزاج اور ذہن یہ ہونا چاہئے کہ ابھی بچو، جب جواز کا فتوی آئے گا اختیار کریں گے۔ اس صورت میں آدمی کا دین اور اس کی عزت محفوظ رہتی ہے، کیونکہ اگر حکم شرعی معلوم ہونے سے پہلے بے احتیاطی سے اس کو کر لیا، پھر عدم جواز کا فتوی آیا تو کیا کرو گے؟ ناجائز کا ارتکاب تو ہو چکا، اب کھایا ہوا پیٹ سے کیسے نکالو گے؟ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مشتبہ امور کو چھوڑ دیا اس نے اپنا دین اور اپنی آبرو محفوظ کر لی، کیونکہ ہر جائز کام کرنا ضروری نہیں، مگر ہر ناجائز کام سے بچنا ضروری ہے، اور جو شخص مشتبہ امور میں سے کسی امر میں گھسا تو وہ قریب ہے کہ حرام میں جا پڑے! جب مزاج میں دین کے تعلق سے بے باکی پیدا ہو گئی تو اب حرام کا ارتکاب کرنے میں کیا باک ہوگا؟

پھر اس مضمون کو آنحضور ﷺ نے ایک مثال سے سمجھایا ہے: جو شخص سرکاری چراگاہ کے آس پاس جانور چراتا ہے وہ قریب ہے کہ چراگاہ میں جا پڑے، چرواہا ذرا غافل ہوا کہ جانور ریزروا یریے میں جا گھسیں گے، اور پولیس اس کی خبر لے لی گی! اور جو چرواہا محتاط ہے، سرکاری چراگاہ سے ایک میل دور جانور رکھتا ہے، اگر وہ غافل بھی ہو گیا اور جانور آگے بڑھ گئے تو کہاں تک جائیں گے؟ چراگاہ تک نہیں پہنچیں گے۔

پس سنو! جس طرح حکومتیں سرکاری جانوروں کے لئے چراگاہ مخصوص کرتی ہیں جن میں پبلک کو جانور چرانے کی اجازت نہیں ہوتی، اسی طرح اللہ نے جو کام حرام کئے ہیں وہ اللہ کا محفوظ ایریا ہیں، مؤمنین کو اس کی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں، بلکہ احتیاط کی بات یہ ہے کہ مشتبہ امور سے بھی دور رہے، اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب تحقیق کے بعد اقدام کرے، جب تک کسی چیز کا حلال ہونا واضح نہ ہو جائے، اس سے کنارہ کش رہے، یہی مزاج اور یہی ذہن بنانا اس حدیث کا مقصود ہے۔

ایک دوسری حدیث میں اسی مضمون کو اس طرح سمجھایا ہے: دَعْ مَا یُرِیْبُكَ إِلَی مَالاَ یُرِیْبُكَ، فَإِنَّ الصدق طُمَأْنِینَةٌ وَالْكِذْبَ رِیْبَةٌ: جو بات کھٹک پیدا کرے اسے چھوڑ دو، اور بے کھٹک بات اختیار کرو، مثلاً سچ بولو اور جھوٹ سے بچو، کیونکہ سچ بولنے سے قلب کو اطمینان نصیب ہوتا ہے، اور جھوٹ بولنا دل کی بے چینی کا سبب بنتا ہے۔

پھر مزید وضاحت کے لئے ایک مثال پیش کی، فرمایا: جسم میں ایک بوٹی ہے جب وہ سنور جاتی ہے تو سارا جسم سنور جاتا ہے، اعضاء ٹھیک ٹھیک کام کرنے لگتے ہیں، اور جب وہ بوٹی خراب ہو جاتی ہے تو سارے اعضاء بگڑ جاتے ہیں، آنکھ خیانت کرنے لگتی ہے، قدم غلط جگہوں کی طرف اٹھنے لگتے ہیں، زبان غلط بولنے لگتی ہے، کان غلط سننے لگتے ہیں، ذہن غلط باتیں سوچنے لگتا ہے۔ غرض ہر عضو کا فعل بگڑ جاتا ہے اور وہ گوشت کی بوٹی جس پر بدن کے صلاح وفساد کا مدار ہے قلب ہے، اس کو سنوار لو بیڑا پار ہے!

فائدہ: عقل وفہم کا محل کہاں ہے؟ یہ بات آج تک کوئی طے نہیں کر سکا۔ قرآن وحدیث میں قلب اور فُؤاد کے الفاظ آئے ہیں۔ اور عام طور پر لفظ عقل استعمال کیا جاتا ہے، مگر عقل کا محل کہاں ہے؟ سر میں جو بھیجا ہے وہ عقل کا محل ہے یا دل اس کا محل ہے؟ آج تک یہ بات نہ کوئی طے کر سکا ہے نہ آئندہ طے کر سکے گا۔

[۳۹-] بابُ فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَأَ لِدِیْنِهِ

[۵۲-] حدثنا أَبُوْ نُعَیْمٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا زَكَرِیَّا، عَنْ عَامِرٍ، قَالَ: سَمِعْتُ النُّعْمَانَ بْنَ بَشِیْرٍ یَقُوْلُ: سَمِعْتُ رسولَ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم یَقُوْلُ: " اَلْحَلاَلُ بَیِّنٌ، وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ، وَبَیْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ، لاَ یَعْلَمُهَا كَثِیْرٌ مِنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَی الْمُشَبَّهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِیْنِهِ وَعِرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِی الشُّبُهَاتِ كَرَاعٍ یَرْعَی حَوْلَ الْحِمَی، یُوْشِكُ أَنْ یُوَاقِعَهُ، أَلاَ! وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًی، أَلاَ! إِنَّ حِمَی اللّٰهِ مَحَارِمُهُ، أَلاَ! وَإِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا

صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا! وَهِيَ الْقَلْبُ. [انظر: ۲۰۵۱]

بَابُ أَدَاءِ الْخُمُسِ مِنَ الإِيْمَانِ

مال غنیمت کا پانچواں حصہ مرکزی حکومت کو بھیجنا ایمانی عمل ہے

اس باب میں جو حدیث ہے وہ ذرا مشکل ہے، فی نفسہ تو مشکل نہیں، لیکن حضرت الامام کے استدلال کے اعتبار سے مشکل ہے، اور یہ حدیث بار بار آئے گی، اس لئے اس کو یہیں اچھی سمجھ لینا چاہئے۔

ابو جمرۃ حدیثیں پڑھنے کے لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آئے، یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب حضرت ابن عباسؓ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بصرہ کے گورنر تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے اندازہ لگایا کہ یہ ذہین طالب علم ہے، فارسی اچھی جانتا ہے اور بصرہ فارسی علاقہ ہے، اس لئے حضرت نے اس سے فرمایا: میرے پاس رک جا، مجھے جو وظیفہ ملتا ہے اس میں سے تجھے بھی کچھ دیدوں گا، اس زمانہ میں باقاعدہ تنخواہیں نہیں ملتی تھیں، لیکن حکومت کی طرف سے گورنروں کو، علماء کو اور دیگر دینی کام کرنے والوں کو وظیفے ملتے تھے، چنانچہ ابو جمرۃ یہ سوچ کر رک گئے کہ حضرت سے حدیثیں سننے کا خوب موقع ملے گا۔ حضرت ابن عباسؓ ان کو اپنے ساتھ اپنے تخت پر بٹھایا کرتے تھے۔ ابو جمرۃ حضرت ابن عباسؓ کے پاس دو ماہ ٹھہرے ہیں۔

اس زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک بڑھیا حضرت ابن عباس کے پاس آئی اور اس نے مسئلہ پوچھا کہ روغنی گھڑے کی نبیذ جائز ہے یا نہیں؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: جائز نہیں، بڑھیا کے جانے کے بعد ابو جمرۃ نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا: میں تو روغنی گھڑے کی نبیذ پیتا ہوں، اور یہ بھی کہا کہ اگر زیادہ پی لوں تو پیٹ میں گیس پیدا ہو جاتی ہے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: مت پی، یہ نہیں فرمایا کہ وہ نبیذ جائز نہیں۔ پھر حضرت ابن عباسؓ نے وفد عبد القیس کی حدیث سنائی (یہ تفصیل فتح الباری میں ہے)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: جب وفد عبد القیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا: کس قبیلہ کے لوگ ہو؟ یا فرمایا: کس قوم کے نمائندے ہو؟ انھوں نے کہا: ربیعہ کے ہیں، آپؐ نے فرمایا: آپ لوگوں کا آنا مبارک! یا فرمایا نمائندوں کا آنا مبارک! نہ رسوائی ہے نہ پشیمانی! انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم آپ تک محترم مہینوں (رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم) ہی میں پہنچ سکتے ہیں، اس لئے کہ ہمارے اور آپؐ کے درمیان قبائل مضر حائل ہیں (جن سے قبائل ربیعہ کی ہمیشہ جنگ رہتی تھی اس لئے وہ مضر کی بستیوں سے گذر کر دیگر مہینوں میں مدینہ منورہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے) پس آپ ہمیں کسی ایسی واضح بات کا حکم دیں جس کی طرف ہم ان لوگوں کو بلائیں جو ہمارے پیچھے ہیں اور ہم ان پر عمل کر کے جنت میں داخل ہوں، اور انھوں نے آپؐ سے شراب کے برتنوں کے بارے میں بھی پوچھا: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار برتنوں سے روکا، آپؐ نے ان کو ایک اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیا، پھر پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ ایک اللہ پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں! آپؐ نے فرمایا: ایک اللہ پر ایمان لانا یہ ہے کہ اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اور یہ کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ اور نماز کا اہتمام کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو، اور رمضان کے روزے رکھنا، اور مال غنیمت کا پانچواں حصہ مرکزی حکومت کو بھیجنا۔ اور نبی ﷺ نے ان کو شراب کے چار برتنوں سے روکا، روغنی گھڑے سے، تونبی سے، لکڑی کھود کر بنائے ہوئے برتن سے اور تارکول پھیرے ہوئے گھڑے سے، اور کبھی راوی نے المزفَّت کی جگہ المقیَّر کہا، معنی دونوں کے ایک ہیں، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان باتوں کو اچھی طرح یاد کرلو، اور جو لوگ پیچھے ہیں ان کو یہ باتیں بتاؤ۔

تشریح:

نزار بن معد بن عدنان کے دولڑکے تھے: ربیعہ اور مضر۔ دونوں کے درمیان اختلافات تھے، بعد میں دونوں بڑے قبائل بن گئے، عبد القیس ربیعہ کی ایک شاخ ہے جس کا وطن بحرین قطیف اور ہجر مقامات تھے اور آنحضور ﷺ کا نسب مضر سے ملتا ہے، اور پرانی عداوتیں اب تک نسلوں میں باقی تھیں اس لئے آنحضور ﷺ نے ان کی دلجوئی کے طور پر فرمایا: تمہارا آنا مبارک! نہ غمگین ہونے کی ضرورت ہے نہ پشیمان ہونے کی، پرانی باتیں بھولی بسری ہوگئیں۔

انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہماری مضر قبائل سے ہمیشہ جنگ رہتی ہے، ہم ہر وقت مدینہ منورہ نہیں آسکتے، صرف محترم مہینوں میں آسکتے ہیں، اس لئے آپ ہمیں جامع احکام بتائیں تا کہ ہم ان پر عمل کرکے جنت میں جائیں، اور پیچھے والوں کو بھی بتائیں، تا کہ وہ بھی ان پر عمل کریں اور جنت حاصل کریں۔

آنحضور ﷺ نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور شراب کے چار برتنوں سے منع کیا، سب سے پہلے ایک اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیا، پھر اس کی وضاحت فرمائی کہ ایک اللہ پر ایمان لانا یہ ہے کہ اس بات کی گواہی دی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بھیجو۔

سوال: یہ تو پانچ باتیں ہوگئیں جبکہ نبی ﷺ نے چار باتوں کا وعدہ فرمایا تھا؟

جواب: قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں: یہ پانچوں باتیں ایمان باللہ کی شرح ہیں یعنی یہ ایک ہی بات ہوئی، باقی تین باتیں یا تو راوی بھول گیا یا اس نے اختصاراً چھوڑ دیا۔

اور ابن بطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے جن چار باتوں کا وعدہ فرمایا تھا وہ شہادتین، اقامت صلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ اور صوم رمضان ہیں، پھر آپؐ نے ایک مزید بات بتلائی، جیسے ایک شخص نے نبی ﷺ سے پوچھا تھا کہ ہم جنگل میں اونٹ چرانے جاتے ہیں، اور چھاگل میں پینے کے لئے پانی لے جاتے ہیں پس اگر ذرا سا پاد نکل جائے تو کیا وضو

کئے بغیر نماز پڑھ سکتے ہیں کیونکہ پانی تھوڑا ہے؟ نبی ﷺ نے فرمایا: إذا فَسا أحدُکم فلْیَتوَضَّأْ ولا تَأْتُوا النِّساءَ فی أدبارھن: جب تم میں سے کوئی گوز مارے تو چاہئے کہ وضو کرے اور تم عورتوں سے پچھلی راہ میں صحبت مت کرو، یہ آخری بات ان صاحب نے نہیں پوچھی تھی، یہ بات نبی ﷺ نے از خود بتائی، کیونکہ: الشیئُ بالشیئِ یُذکر: بات سے بات نکلتی ہے، نبی ﷺ نے سائل کو ایک مزید بات بتلائی، اسی طرح یہاں بھی آپؐ نے چار باتوں کا وعدہ فرمایا تھا، پھر خیال آیا کہ ان کی مضر قبائل کے ساتھ جنگیں ہوتی رہتی ہیں اس لئے آپؐ نے ان کو ایک مزید بات بتلائی کہ تمہیں جو مال غنیمت حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ مرکزی حکومت کو بھیجو۔

اور امام نووی رحمہ اللہ نے ابن بطالؒ کی تائید فرمائی ہے، مگر محشی کو اس پر شرح صدر نہیں۔ اس کا اعتراض یہ ہے کہ اگر خمس ادا کرنے کو چار باتوں سے الگ کر دیا جائے گا تو حدیث باب سے بے جوڑ ہو جائے گی۔ امام بخاریؒ اس باب میں خمس کی ادائیگی کو ایمان کا جزء ثابت کرنا چاہتے ہیں، اگر اس کو علاحدہ کر دیا جائے گا تو حدیث کا باب سے ربط نہیں رہے گا، اس لئے محشی کی رائے میں چار باتیں یہ ہیں: اقامتِ صلوۃ، ایتائے زکوۃ، صوم رمضان اور ادائے خمس۔ اور آپؐ نے جو شروع میں ایمان باللہ کی شہادتین سے تفسیر فرمائی ہے وہ تمہید ہے، چار باتوں میں شامل نہیں، اس لئے کہ وہ لوگ مسلمان تھے، ان کو ایمان لانے کا حکم دینا بے معنی تھا۔

لیکن میرے نزدیک ابن بطال رحمہ اللہ کی رائے راجح ہے، اس لئے کہ آپؐ نے ان کو ایمان باللہ کا حکم دیا ہے، پھر وہ تمہید کیسے ہو سکتی ہے؟

اب دو باتیں حل طلب ہیں: ایک یہ کہ جب وہ مسلمان تھے تو ان کو ایمان کا حکم کیوں دیا؟ دوم: حدیث کا باب سے تعلق کیسے ہوگا؟

پہلی بات کا جواب: یہ ہے کہ ایمان باللہ کا حکم ان لوگوں کو پیش نظر رکھ کر دیا گیا ہے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ وفد عبد القیس نے آنحضور ﷺ سے عرض کیا تھا کہ ہمیں جامع بات بتائیں تا کہ ہم خود بھی اس پر عمل کریں اور جو پیچھے رہ گئے ہیں ان کو بھی اس بات کی دعوت دیں، جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ سب مسلمان نہیں ہوئے تھے، بعض ان میں سے کافر تھے، اس لئے آپؐ نے ان کو ملحوظ رکھ کر پہلا حکم ایمان باللہ کا دیا، پھر اس کی وضاحت فرمائی، یعنی اس وفد کو یہ حکم دیا کہ جو لوگ پیچھے رہ گئے ہیں اور ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے پہلے ان سے شہادتین کا اقرار لیا جائے، جب وہ شہادتین کا اقرار کر لیں تو پھر نماز، روزہ، زکوۃ اور ادائے خمس کا حکم دیا جائے، اور تم خود بھی اور وہ بھی اس پر عمل کریں۔

اور دوسری بات کا جواب: یہ ہے کہ اگر حدیث کا باب سے تعلق باقی نہیں رہتا تو اس کی ہم پر کیا ذمہ داری ہے؟ امام بخاریؒ نے حدیث جس طرح سمجھی ہے استدلال کیا ہے، ان کی رائے یہ ہے کہ ایمان باللہ تمہید ہے اور باقی چار باتیں اس کی تفسیر ہیں، پس انھوں نے اپنے فہم کے مطابق ترجمہ قائم کیا اور ادائے خمس کو ایمان کا جزء ثابت کیا۔ اور ابن بطال

رحمہ اللہ نے اپنی فہم کے مطابق حدیث کی شرح کی، ان کو حدیث کی دوسری شرح کرنے کا حق ہے اور ہمیں اس شرح کو قبول کرنے کا بھی حق ہے۔

شراب کے برتنوں کی تفصیل اور ان میں نبیذ بنانے کا حکم:

۱-حَنتَم: حَنتَمَۃ کی جمع ہے اس کے معنی ہیں: روغنی گھڑا۔

۲-الدُّبَّاء: سوکھا کدّو، جو برتن کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں اس کو تونبی کہتے ہیں۔ تونبا: ایک قسم کا تلخ کدو ہے جس کا چھلکا بہت موٹا ہوتا ہے اس کو فقیر سکھا کر کشکول بناتے ہیں، میں نے زامبیا میں یہ برتن بکتے ہوئے دیکھے ہیں۔

۳- النقیر: بمعنی منقور، نَقَرَ یَنقُر کے معنی ہیں: کریدنا، کھودنا، لوگ درخت کے تنے کرید کر برتن بناتے تھے، پھر اس میں نبیذ بناتے تھے۔

۴-المُزَفَّت: تارکول پھیرا ہوا گھڑا، اس کے لئے دوسرا لفظ مُقَیَّر ہے یہ قِیر سے ہے، سڑکوں پر جو تارکول ڈالتے ہیں وہ قیر ہے۔

آنحضور ﷺ نے ان چار برتوں میں نبیذ بنانے سے منع فرمایا، نَبِیْذ: فعیلٌ کا وزن ہے، اور مَنبُوْذٌ کے معنی میں ہے، اور نَبَذَ الشیئَ کے معنی ہیں: ڈالنا، پانی میں کوئی چیز ڈالی جائے جب وہ گل جائے اور اس کی شیرینی پانی میں آجائے مگر ابھی نشہ پیدا نہ ہوا ہو تو وہ نبیذ ہے اور وہ بالاتفاق حلال ہے۔

اور آنحضور ﷺ نے مذکورہ چار برتنوں میں نبیذ بنانے سے اس لئے منع فرمایا کہ اس میں جلدی نشہ پیدا ہوجاتا ہے، جب گھڑے پر تارکول پھیر دیا جاتا ہے یا اس کو رنگ دیا جاتا ہے تو اس کے مسامات بند ہوجاتے ہیں اور تونبی میں اور لکڑی کے برتن میں مسامات ہوتے ہی نہیں، اس لئے ان میں جلدی گرمی پیدا ہوجاتی ہے، اور پانی میں ڈالی ہوئی چیز جلدی سڑ جاتی ہے اور اس میں نشہ پیدا ہوجاتا ہے اور پتا نہیں چلتا کہ نشہ ہوگیا ہے، اس لئے آپؐ نے ان برتنوں میں نبیذ بنانے سے منع فرمایا، اور لوگوں کو حکم دیا کہ چمڑے کے مشکیزے میں نبیذ بنائیں اور اس کا منہ باندھ دیں اگر اس میں گیس پیدا ہوگی تو مشکیزہ پھولے گا اور پتا چل جائے گا کہ نشہ ہوگیا۔

اور جمہور کی رائے یہ ہے کہ ان برتنوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت پہلے تھی پھر ختم ہوگئی، مسلم شریف میں روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے لوگوں کو چند برتنوں سے منع کیا تھا اب جان لو کہ کوئی برتن نہ کسی چیز کو حلال کرتا ہے نہ حرام۔ البتہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے (مشکوۃ حدیث ۴۲۹۱)

اور دوسری رائے یہ ہے کہ ممانعت اب بھی باقی ہے، اور اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ ممانعت کی علت کیا ہے؟ جمہور کے نزدیک ممانعت کی علت یہ ہے کہ لوگوں کو شراب کے برتن دیکھ کر شراب یاد آئے گی، یعنی تذکّرِ خمر علت ہے۔ جیسے کوئی بیڑی چھوڑنا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ ماچس جیب میں نہ رکھے، کیونکہ جب بھی ماچس بجے گی بیڑی یاد آئے گی،

اسی طرح اگر شراب کے برتن گھر میں رہیں گے تو جب بھی ان پر نظر پڑے گی شراب یاد آئے گی۔ اس لئے آنحضور ﷺ نے شراب کے برتن استعمال کرنے کی ممانعت فرمادی، پھر جب طبیعتیں شراب سے ہٹ گئیں تو ممانعت ختم کردی گئی۔

اور دیگر حضرات کے نزدیک علت احتمالِ تخمر ہے یعنی ان برتنوں میں نبیذ بنانے سے اس لئے منع کیا کہ ان میں مسامات نہیں ہوتے اس لئے ان میں نبیذ جلدی بگڑ جاتی ہے، پس ان برتنوں کے حکم میں دھات کے تمام برتن ہونگے، اگر احتیاط سے ان برتنوں میں نبیذ بنائی جائے تو جائز ہے، ورنہ نہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بڑھیا کو روغنی گھڑے کی نبیذ سے اس لئے روکا تھا کہ ان کے نزدیک ممانعت کی علت احتمال تخمر ہوگی، اور ابو جمرہ کے نزدیک علت تذکر خمر ہوگی جو عرصۂ دراز گذر جانے کے بعد باقی نہیں رہی تھی، اس لئے وہ روغنی گھڑے کی نبیذ پیتے تھے۔

اور دوسری توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے بڑھیا کو اختیار اولیٰ کے طور پر منع کیا ہوگا یعنی روغنی گھڑے میں نبیذ بنانا جائز تو ہے مگر بہتر نہیں۔

اور بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ شاید ابن عباس کو وہ حدیث نہیں پہنچی ہوگی جس میں آنحضور ﷺ نے ان برتنوں میں نبیذ بنانے کی اجازت دی ہے، مگر مجھے یہ جواب پسند نہیں، میرے نزدیک راجح دوسری توجیہ ہے۔

فائدہ: آنحضور ﷺ نے لفظ أربعٌ اس لئے استعمال کیا ہے کہ یاد رکھنے میں آسانی ہو، اگر کسی موقع پر تین ہی باتیں یاد رہیں گی تو آدمی غور کرے گا کہ چوتھی بات کیا ہے؟ پھر ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ہر بات پر انگلی بند کی یعنی لفظ کے ساتھ اشارہ کو بھی شامل کیا تا کہ سمجھنے میں بھی مدد ملے، پھر مزید تاکید فرمائی کہ ان باتوں کو یاد رکھنا اور پیچھے والوں کو بتانا۔

[٤٠-] بابُ: أَدَاءِ الْخُمُسِ مِنَ الإِيْمَانِ

[٥٣-] حدثنا عَلِيُّ بْنُ الْجَعْدِ، قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ، عَنْ أَبِي جَمْرَةَ، قَالَ: كُنْتُ أَقْعُدُ مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ، فَيُجْلِسُنِيْ عَلَى سَرِيْرِهِ، فَقَالَ: أَقِمْ عِنْدِيْ حَتَّى أَجْعَلَ لَكَ سَهْمًا مِنْ مَالِيْ، فَأَقَمْتُ مَعَهُ شَهْرَيْنِ ثُمَّ قَالَ: إِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ لَمَّا أَتَوُا النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ:" مَنِ الْقَوْمُ أَوْ: مَنِ الْوَفْدُ؟" قَالُوْا: رَبِيْعَةُ، قَالَ: "مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ، أَوْ: بِالْوَفْدِ، غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَدَامَى" فَقَالُوْا: يَارسولَ اللهِ! إِنَّا لَا نَسْتَطِيْعُ أَنْ نَأْتِيَكَ إِلَّا فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ، وَبَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هٰذَا الْحَيُّ مِنْ كُفَّارِ مُضَرَ، فَمُرْنَا بِأَمْرٍ فَصْلٍ نُخْبِرْ بِهِ مَنْ وَرَاءَ نَا، وَنَدْخُلْ بِهِ الْجَنَّةَ، وَسَأَلُوْهُ عَنِ الْأَشْرِبَةِ، فَأَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ، وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ، أَمَرَهُمْ بِالإِيْمَانِ بِاللهِ وَحْدَهُ، قَالَ: "أَتَدْرُوْنَ مَا الإِيْمَانُ بِاللهِ وَحْدَهُ؟" قَالُوْا: اللهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ، قَالَ:" شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسولُ اللهِ، وَإِقَامُ الصَّلَاةِ، وَإِيْتَاءُ الزَّكَاةِ، وَصِيَامُ رَمَضَانَ، وَأَنْ تُعْطُوْا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخُمُسَ" وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ، عَنِ الْحَنْتَمِ، وَالدُّبَّاءِ، وَالنَّقِيْرِ، وَالْمُزَفَّتِ، وَرُبَّمَا قَالَ: الْمُقَيَّرِ - وَقَالَ:" احْفَظُوْهُنَّ وَأَخْبِرُوْا بِهِنَّ مَنْ وَرَاءِ كُمْ"

[انظر: ٨٧، ٥٢٣، ١٣٩٨، ٣٠٩٥، ٣٥١٠، ٤٣٦٨، ٤٢٦٩، ٦١٧٦، ٧٢٦٦، ٧٥٥٦]

وضاحت: الوفد: باحیثیت یابااقتدارلوگوں کے پاس کسی مقصد سے جانے والی منتخب افراد کی جماعت، ڈیلی گیشن۔ جمع وفود۔۔۔۔۔۔۔۔ مَرْحَبًا: أی أتَیْتُم مکانًا رَحْبًا: تم کشادہ جگہ آئے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خزایا: خزیان کی جمع ہے، رسوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نَدَامٰی: ندمان کی جمع ہے: پشیمان۔۔۔۔۔۔۔۔ شھادۃُ: مرفوع ہے کیونکہ ھی مبتداء محذوف کی خبر ہے، اور إقام وغیرہ مرفوع اور مجرور دونوں ہوسکتے ہیں، اگر ان کا عطف شھادۃ پر کیا جائے تو مرفوع ہونگے اور اگر عطف الإیمان پر کیا جائے تو مجرور ہونگے۔ امام بخاریؒ نے شھادۃ پر عطف کیا ہے، اس صورت میں حدیث کا مطلب ہوگا کہ اللہ پر ایمان لانے میں شہادتین اقامت صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ، صوم رمضان اور مال غنیمت میں سے خمس ادا کرنا: سب باتیں شامل ہیں پس حدیث کا تعلق باب سے ہوگیا کہ ادائے خمس ایمان کا جزء ہے، اور وہ عمل ہے پس ثابت ہوا کہ اعمال ایمان کا جزء ہیں۔

اور اگر عطف الإیمان پر کریں تو ایمان باللہ کی شرح صرف شہادتین ہونگی، باقی اعمال ایمان سے خارج ہونگے، اور حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ نبی ﷺ نے جن چار باتوں کا وعدہ فرمایا تھا ان میں سے باقی باتیں یہ ہیں۔ اس صورت میں حدیث سے باب ثابت نہیں ہوگا، یعنی اعمال کا جزءِ ایمان ہونا ثابت نہیں ہوگا۔ اور ادائے خمس کا حکم افادۂ مزید ہوگا۔

بابُ مَاجَاءَ أَنَّ الْأَعْمَالَ بِالنِّيَّةِ والْحِسْبَةِ

اقرار کے ساتھ نیت ضروری ہے

کچھ لوگ کہتے ہیں: ایمان نام صرف اقرار کا ہے، خواہ اس کے پیچھے دل کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس باب میں ان کی تردید کی ہے کہ صرف زبان سے اللہ کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا اقرار کر لینے سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہوجاتا، اقرار کے ساتھ عقدِ قلب چاہئے یعنی اسلام قبول کرنے کی نیت ہونی چاہئے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ اقرار اور نیت ایک دوسرے سے منفک ہوسکتے ہیں، ایک شخص زبان سے کلمہ پڑھ رہا ہے مگر دل میں ایمان لانے کا کوئی ارادہ نہیں تو وہ صرف اقرار ہے، اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ دل میں اسلام کی حقانیت کا اور اس کے دونوں عقیدوں پر پختہ یقین ہو، مگر کسی مجبوری میں زبان سے اقرار نہ کرسکے تو صرف عقدِ قلب اور نیت ہوگی اقرار نہیں ہوگا۔ اور دونوں جمع بھی ہوسکتے ہیں، جب دونوں جمع ہوجائیں تو وہ بالیقین مؤمن ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں، لیکن اگر دونوں منفک ہوجائیں تو کیا حکم ہے؟ امام بخاریؒ نے فرمایا: صرف قول ایمان نہیں، اس کے ساتھ عقد قلب ضروری ہے اس سے معلوم ہوا کہ اصل تصدیق ہے کیونکہ اگر صرف تصدیق بھی ایمان نہیں تو اس کے لئے باب قائم کرنا چاہئے تھا، حالانکہ ایسا کوئی باب قائم نہیں کیا، پس ایک مہینے سے جس مسئلہ میں جھگڑ رہے ہیں اس کا خود بخود فیصلہ ہوگیا کہ ایمان صرف تصدیق کا نام ہے۔

قولہ: الأعمالُ بالنیَّۃِ والحِسْبَۃ: یہ وہی حدیث ہے جو کتاب کے شروع میں گذری ہے اس کے ایک طریق میں

الحِسْبَة بھی ہے، مگر اس کی سند اس قابل نہیں تھی کہ اس کو بخاری شریف میں لاتے اس لئے باب میں یہ لفظ لے آئے۔

ایمان بھی قلب کا ایک عمل ہے، پس اس کے لئے بھی نیت ضروری ہے اور الحسبة کے معنی ہیں: ثواب کی امید رکھنا، یعنی ثواب کی امید رکھ کر ایمان قبول کیا جائے تو ایمان معتبر ہے اور اگر زبانی جمع خرچ کیا جائے اور ثواب کا کوئی ارادہ نہ ہو یعنی نیت نہ ہو تو وہ مؤمن نہیں،

قوله: لکل امرئ ما نوی: یہ بھی اسی حدیث کا ٹکڑا ہے۔ اگر ایمان لانے کی نیت ہے تو ایمان لانے کا ثواب ملے گا، اور اگر ایمان لانے کی نیت نہیں صرف زبانی جمع خرچ کیا ہے تو کوئی ثواب نہیں ملے گا۔ پھر فرماتے ہیں: یہ حدیث عام ہے، اس میں ایمان، وضو، نماز، زکوۃ، حج، روزہ اور سب معاملات داخل ہیں کیونکہ ایمان قلب کا عمل ہے اور باقی چیزیں جوارح کے اعمال ہیں۔

ملحوظہ: وضو، عبادتِ مقصودہ نہیں، اس لئے حنفیہ کے نزدیک وضو اور غسل اس حدیث کے تحت نہیں آتے، ان کے لئے نیت ضروری نہیں، اور شوافع کے نزدیک نیت ضروری ہے، ان کے نزدیک وہ بھی اس حدیث کے تحت ہیں، اور احکام سے مراد معاملات ہیں، اور ان میں سے بعض بالاتفاق نیت کے بغیر درست ہیں۔

قوله: ﴿قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾: یہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت (۸۴) ہے۔ اور شاکلۃ کے معنی ہیں: روش، افتادِ طبع، مزاج، جبلت۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر نیت سے کی ہے، یعنی جیسی نیت ہوگی ویسا عمل ہوگا۔ پس جس نے مسلمان ہونے کی نیت سے کلمہ پڑھا وہ مسلمان ہوا اور جس نے بس یونہی کلمہ پڑھا وہ مسلمان نہیں۔

قوله: نفقةُ الرجل: آدمی کا بیوی بچوں پر ثواب کی نیت سے خرچ کرنا صدقہ ہے، یعنی اس پر بھی ثواب ملے گا، اور اگر بغیر نیت کے محض اس وجہ سے خرچ کیا کہ ان پر خرچ کرنا شوہر کی اور باپ کی ذمہ داری ہے تو کوئی ثواب نہیں ملے گا۔ بامید ثواب خرچ کرے گا تبھی ثواب ملے گا۔ ہاں شرعی ذمہ داری سمجھ کر خرچ کرے تو ثواب ملے گا کیونکہ یہی نیت ہے۔

قوله: قال النبیُّ: یہ ارشاد نبی ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا تھا کہ اب مکہ سے ہجرت فرض نہیں رہی، کیونکہ مکہ دارالاسلام بن گیا، لیکن جہاد اور نیت جہاد قیامت تک باقی رہیں گے۔ لہٰذا اگر کوئی جہاد کا موقع آئے تو جہاد کے لئے ضرور مدینہ آئے، اور جب جہاد جاری نہ ہو تو جہاد کی نیت رکھے۔

[۴۱-] بابُ مَاجَاءَ أَنَّ الْأَعْمَالَ بِالنِّيَّةِ وَالْحِسْبَةِ

[۱-] وَلِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى، فَدَخَلَ فِيْهِ الإِيْمَانُ، وَالْوُضُوْءُ، وَالصَّلَاةُ، وَالزَّكَاةُ، وَالْحَجُّ، وَالصَّوْمُ، وَالْأَحْكَامُ.

[۲-] وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿ قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾ [الإسراء: ۸۴]: عَلٰى نِيَّتِهٖ.

[۳-] نَفَقَةُ الرَّجُلِ عَلٰى أَهْلِهٖ يَحْتَسِبُهَا صَدَقَةٌ.

[٤-] وَقَالَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم: "وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ"

[٥٤-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْلَمَةَ، قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِبْرَاهِيْمَ، عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وَقَّاصٍ، عَنْ عُمَرَ، أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ: " الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ، وَلِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ" [راجع:١]

[٥٥-] حدثنا حَجَّاجُ بْنُ مِنْهَالٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ عَدِيُّ بْنُ ثَابِتٍ، قَالَ: سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ يَزِيْدَ، عَنْ أَبِيْ مَسْعُوْدٍ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: "إِذَا أَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلَى أَهْلِهِ يَحْتَسِبُهَا فَهُوَ لَهُ صَدَقَةٌ". [انظر:٤٠٠٦، ٥٣٥١]

[٥٦-] حدثنا الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ، قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ عَامِرُ بْنُ سَعْدٍ، عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ، أَنَّهُ أَخْبَرَهُ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ:" إِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِيْ بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ إِلَّا أُجِرْتَ عَلَيْهَا، حَتّٰى مَا تَجْعَلُ فِيْ فِيْ امْرَأَتِكَ"

[انظر: ١٢٩٥، ٢٧٤٢، ٢٧٤٤، ٣٩٣٦، ٤٤٠٩، ٥٣٥٤، ٥٦٥٩، ٥٦٦٨، ٦٣٧٣، ٦٧٣٣]

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم جو کچھ بھی خرچ کرو جس سے تمہارا مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہو تو تمہیں اس پر ثواب دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں رکھو اس پر بھی ثواب ملے گا۔

طلبہ اس جملہ کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ پیار اور محبت میں بیوی کو کھلانا مراد ہے، یہ صحیح نہیں، جوانی کی تُرنگ میں ذہن اس مطلب کی طرف جاتا ہے، اس جملہ کا صحیح مطلب یہ ہے کہ بعض مرتبہ بیوی کسی بیماری کی وجہ سے خود نہیں کھا سکتی، تو شوہر اپنے ہاتھ سے اس کو کھلاتا ہے تو اس کا بھی ثواب ملے گا۔ اور کما کر لانے کا الگ ثواب ملے گا، یا بیٹا، بیٹی یا بہو وغیرہ نے کھلایا تو ان کو بھی ثواب ملے گا، اسی طرح شوہر بیمار پڑ گیا اور بیوی بچوں نے کھلایا تو ان کو بھی ثواب ملے گا۔

بَابُ قَوْلِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: الدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ: لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهِ وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ، وَقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿إِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهِ﴾

خیر خواہی ایمان کا جزء ہے

یہ حدیث نہایت اہم ہے، اس کو اسلامی تعلیمات کا چوتھائی قرار دیا گیا ہے بلکہ امام نووی رحمہ اللہ نے تو اس کو سارا ہی

دین قرار دیا ہے، پس حدیث کو غور سے پڑھیں اور اس پر عمل کریں۔

ایک مرتبہ نبی ﷺ نے خطاب عام میں تین مرتبہ فرمایا: دین خیر خواہی ہے! دین خیر خواہی ہے! دین خیر خواہی ہے! الدينُ النَّصيحة: زيدٌ عدلٌ کے قبیل سے ہے، اس میں مبالغہ ہے کہ خیر خواہی دین کا قوام ہے، یعنی دین کے وجود اور بقا کا مدار خیر خواہی پر ہے، اور جب نبی ﷺ کوئی اہم بات مجمع میں فرماتے تھے تو تین مرتبہ فرماتے تھے۔ جب آپؐ نے بار بار یہ بات فرمائی تو صحابہ نے پوچھا: لِمَنْ؟ یارسول اللہ! اے اللہ کے رسول! کس کی خیر خواہی؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ کی، اللہ کے رسول کی، حکومت کے سربراہوں کی، اور عام مسلمانوں کی۔ اور ایک حدیث میں ولکتابه بھی ہے یعنی قرآن کی۔

تشریح:

بعض الفاظ کے نسبتیں بدلنے سے معانی بدلتے ہیں جیسے صلوٰۃ کے معنی ہیں: انتہائی درجہ کا میلان، پھر نسبتوں کے بدلنے سے اس کی صورتیں بدلتی ہیں۔ اللہ کے تعلق سے اس کے معنی ہیں: مہربانی کرنا، اور بندوں کا اللہ تعالیٰ کی طرف آخری درجہ کا میلان نماز ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی طرف آخری درجہ کا میلان دعا ہے، اور فرشتوں سے تعلق سے صلوٰۃ کے معنی استغفار کے ہیں، اسی طرح خیر خواہی کی شکلیں نسبت کے بدلنے سے مختلف ہوتی ہیں۔

۱- اللہ تعالیٰ کی خیر خواہی: اللہ تعالیٰ پر صحیح ایمان لانا ہے یعنی اللہ کا وجود تسلیم کرنا، ان کی صفات کو ٹھیک ٹھیک ماننا، ان میں الحاد وکجروی اختیار نہ کرنا، ان کے رب ہونے کو ماننا، اور صرف انہی کی بندگی کرنا، بندگی میں کسی کو شریک نہ ٹھہرانا اور ان کے احکام کی اطاعت کرنا۔

۲- اللہ کے رسول کی خیر خواہی: ان پر ایمان لانا، ان کی تعظیم کرنا، ان سے بے حد محبت کرنا مگر ان کی شان میں غلو نہ کرنا، اور ان کے دین کو چار دانگ عالم پھیلانے کی محنت کرنا ہے۔

۳- امراء کی خیر خواہی: ان کے احکام کو سننا اور ان کی تعمیل کرنا۔ اور ان کا بہی خواہ رہنا اور شدید مجبوری کے بغیر ان سے بغاوت نہ کرنا ہے۔

۴- عام مسلمانوں کی خیر خواہی: ان کے فائدے کو سوچنا، ان کو بھلائی پہنچانے کی نیت رکھنا، لوگوں کو دین سکھانا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا ہے۔

۵- اللہ کی کتاب (قرآن مجید) کی خیر خواہی: اس کو پڑھنا، اس کو سمجھنا، اس کے معانی میں غور وفکر کرنا، اس کے احکام پر عمل پیرا ہونا اور اس کی دعوت کو عام کرنا ہے۔

اور یہ صورتیں ہم نے بطور مثال بیان کی ہیں، ان کے علاوہ خیر خواہی کی اور صورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔

پھر سورۃ التوبہ کی آیت (۹۱) کا ایک ٹکڑا لکھا ہے۔ پوری آیتِ کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ واقعی معذور ہیں یا بیمار ہیں یا تنگ دست ہیں اور وہ جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے تو ان پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وہ اللہ ورسول کے ساتھ خیر خواہی

کریں، یعنی منافقین کی طرح اسلام کی جڑیں نہ کھودیں، جہاد میں شرکت کرنے والوں کی ہمتیں پست نہ کریں بلکہ مقدور بھران کی اعانت ونصرت کریں، تو حق تعالیٰ کی بخشش ومہربانی سے توقع ہے کہ وہ درگذر فرمائیں گے۔

حدیث (۱): حضرت جریر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے نبی ﷺ سے تین باتوں پر بیعت کی ہے: (۱) نماز کا اہتمام کرنا (۲) زکوٰۃ ادا کرنا (۳) اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرنا۔

تشریح:

طبرانی میں حضرت جریر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے آزاد کردہ غلام کو حکم دیا کہ تین سو درہم میں ایک گھوڑا خرید لاؤ، وہ بازار گیا اور ایک گھوڑے کا سودا کر کے اس کے مالک کو ساتھ لے کر آیا تاکہ حضرت جریرؓ اس کو رقم ادا کریں۔ حضرت جریرؓ نے گھوڑا دیکھ کر گھوڑے والے سے کہا: تیرا گھوڑا تین سو درہم سے زیادہ قیمت کا ہے کیا تو اس کو چار سو درہم میں بیچتا ہے؟ اس نے خوش ہو کر کہا: جیسی آپ کی مرضی! یعنی اگر آپ چار سو درہم دیں تو مجھے کونسے برے لگیں گے۔ آپ نے فرمایا: تیرا گھوڑا چار سو درہم سے بھی زیادہ قیمت کا ہے کیا تو اس کو پانچ سو درہم میں بیچتا ہے؟ اس طرح وہ قیمت بڑھاتے ہوئے آٹھ سو تک لے گئے پھر آٹھ سو میں اس کو خرید لیا، کسی نے حضرت سے عرض کیا: آپ نے ایسا کیوں کیا؟ وہ تو تین سو میں بیچنے کے لئے تیار تھا؟ آپ نے فرمایا: میں نے نبی ﷺ سے اس پر بیعت کی ہے کہ ہر مسلمان کے لئے بھلائی چاہوں گا اس شخص کا گھوڑا میرے نزدیک تین سو سے زیادہ قیمت کا تھا اگر میں تین سو میں خریدتا تو یہ خیر خواہی کے منافی ہوتا۔ اس لئے اس کے گھوڑے کی جو واقعی قیمت تھی وہ میں نے اس کو دی، اللہ اکبر! خیر خواہی کا کیا جذبہ تھا، یہ آخری درجہ کی خیر خواہی ہے۔

حدیث (۲): جب حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کا جو کوفہ کے گورنر تھے انتقال ہوا تو حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ لوگوں میں تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے، سب سے پہلے اللہ کی حمد وثنا کی پھر فرمایا: لوگو! ایک اللہ سے ڈرنے کو لازم پکڑو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور باوقار اور سنجیدہ رہو (دونوں کا عطف باتقاء اللہ پر ہے) یہاں تک کہ اگلا امیر آجائے، یعنی جب تک نیا امیر نامزد نہ ہو جائے سنجیدگی اختیار کرو اور دنگے فساد سے بچو، اگلا امیر تمہارے پاس بہت جلد آنے والا ہے۔ پھر فرمایا: اپنے امیر کے لئے دعاء مغفرت کرو، اس لئے کہ وہ عفو ودرگذر کو پسند کرتے تھے، اس لئے ہمیں بھی دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ عفو ودرگذر کا معاملہ فرمائیں، پھر فرمایا: أما بعد! (یہ نہج بدلا) میں نبی ﷺ کے پاس آیا، اور میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں اسلام پر بیعت کرنا چاہتا ہوں یعنی مسلمان ہونے کے لئے آیا ہوں، اور بیعت اسلام کرنا چاہتا ہوں پس آپؐ نے مجھ سے شہادتین کے علاوہ کچھ اور باتوں پر بھی بیعت لی، ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرنا، پس میں نے ان باتوں پر بیعت کی، اور اس مسجد کے رب کی قسم میں نے ابھی جو بات کہی ہے کہ نئے امیر کے آنے تک باوقار اور سنجیدہ رہو، فساد نہ مچاؤ، یہ بات تمہاری خیر

خواہی میں کہی ہے، اس کے بعد حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے لئے دعاء مغفرت کی اور منبر سے اتر آئے۔

تشریح: حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوفہ کے گورنر تھے، ۵۰ ہجری میں ان کا انتقال ہوا، ان کے بعد حضرت معاویہؓ نے زیاد کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔

اور عفو ودرگذر اللہ کی صفت ہے اور حدیث میں ہے: تَخَلَّقُوْا بأخلاق اللّٰہ: اللہ کی صفتیں اپنے اندر پیدا کرو، چنانچہ عفو ودرگذر کرنا حضرت مغیرہؓ کی خاص شان تھی، اس لئے حضرت جریرؓ نے فرمایا ہمیں بھی ان کے لئے دعائے مغفرت کرنی چاہئے۔

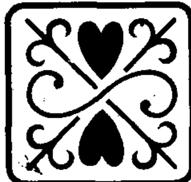
[۴۲-] بابُ قَوْلِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم: " الدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ: لِلّٰہِ، وَلِرَسُوْلِہِ، وَلِأَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ، وَعَامَّتِھِمْ" وَقَوْلِہِ تَعَالٰی: ﴿ إِذَا نَصَحُوْا لِلّٰہِ وَلِرَسُوْلِہِ﴾[التوبہ: ۹۱]

[۵۷-] حدثنا مُسَدَّدٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا یَحْیٰی، عَنْ إِسْمَاعِیْلَ، قَالَ: حَدَّثَنِیْ قَیْسُ بْنُ أَبِیْ حَازِمٍ، عَنْ جَرِیْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ، قَالَ: بَایَعْتُ رسولَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلٰی إِقَامِ الصَّلاَۃِ، وَإِیْتَاءِ الزَّکَاۃِ، وَالنُّصْحِ لِکُلِّ مُسْلِمٍ. [انظر: ۵۲۴، ۱۴۰۱، ۲۱۵۷، ۲۷۱۴، ۲۷۱۵، ۷۲۰۴]

[۵۸-] حدثنا أَبُوْ النُّعْمَانِ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُوْ عَوَانَۃَ، عَنْ زِیَادِ بْنِ عِلاَقَۃَ، قَالَ: سَمِعْتُ جَرِیْرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰہِ یَقُوْلُ یَوْمَ مَاتَ الْمُغِیْرَۃُ بْنُ شُعْبَۃَ، قَامَ فَحَمِدَ اللّٰہَ وَأَثْنٰی عَلَیْہِ، وَقَالَ: عَلَیْکُم بِاتِّقَاءِ اللّٰہِ وَحْدَہُ لاَشَرِیْکَ لَہُ، وَالْوَقَارِ وَالسَّکِیْنَۃِ حَتّٰی یَأْتِیَکُم أَمِیْرٌ، فَإِنَّمَا یَأْتِیْکُمُ الآنَ، ثُمَّ قَالَ: اسْتَعْفُوْا لِأَمِیْرِکُمْ، فَإِنَّہُ کَانَ یُحِبُّ الْعَفْوَ، ثُمَّ قَالَ: أَمَّا بَعْدُ: فَإِنِّیْ أَتَیْتُ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم، قُلْتُ: یَارسولَ اللّٰہِ! أُبَایِعُکَ عَلَی الإِسْلاَمِ، فَشَرَطَ عَلَیَّ: "وَالنُّصْحِ لِکُلِّ مُسْلِمٍ" فَبَایَعْتُہُ عَلٰی ھٰذَا، وَرَبِّ ھٰذَا الْمَسْجِدِ إِنِّیْ لَنَاصِحٌ لَکُمْ، ثُمَّ اسْتَغْفَرَ وَنَزَلَ.

قولہ:یقول یوم مات: یوم مات مقولہ نہیں، مقولہ آگے قال کے بعد آرہا ہے، اور فصل ہوجانے کی وجہ سے قال مکرر لائے ہیں۔

﴿الحمد للہ! کتاب الایمان کی تقریر کی ترتیب پوری ہوئی﴾



کتابُ العِلْمِ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ

علم کی فضیلت کا بیان

اب علم کا بیان شروع کر رہے ہیں، اس لئے کہ آگے پوری کتاب میں اعمال وغیرہ کا بیان آرہا ہے، اور اعمال کو صحیح طرح سے ادا کرنے کے لئے علم ضروری ہے، اس لئے ایمان کے بعد علم کا بیان لائے ہیں۔

یہاں ایک سوال ہے کہ ایمان بھی تو ایک عمل ہے چنانچہ حضرت نے پیچھے بار بار کہا ہے کہ ایمان قلب کا ایک عمل ہے پس جب ایمان قلب کا عمل ہے تو کتاب العلم کو کتاب الایمان سے پہلے لانا چاہئے تھا، ایمان کے بارے میں علم ہوگا جبھی لوگ ایمان لائیں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں: وہبی (فطری) اور کسبی۔ وہبی علم وہ ہے جو انسان کی جبلّت (فطرت) میں ودیعت رکھا گیا ہے، وہ علم ایمان سے مقدم ہے اسی لئے مجنون پر اور بچے پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ اس لئے کہ ان کو فطری علم حاصل نہیں۔ اور علم اکتسابی وہ ہے جسے بندہ خود اپنے اختیار سے حاصل کرتا ہے، وہ علم ایمان سے مؤخر ہے، یہاں علم اکتسابی مراد ہے اس لئے اسے ایمان کے بعد لایا گیا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس باب میں دو آیتیں لکھی ہیں، پہلی آیت سورۂ مجادلہ کی (آیت ۱۱) ہے، ارشاد پاک ہے: اللہ تعالیٰ بلند کرتے ہیں تم میں سے ان لوگوں کے درجات جو ایمان لائے ہیں اور علم رکھتے ہیں —— یَرفع: مضارع جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے، اور ساکن کو جب ملاتے ہیں تو اس کو کسرہ کی حرکت دیتے ہیں۔ قاعدہ ہے: الساکن إذا حُرِّكَ حُرِّكَ بالکسر، اس لئے یہاں مضارع کو جر دیا ہے۔

پوری آیت کا خلاصہ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا إِذَا قِیْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ﴾ اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ بیٹھنے کی جگہوں میں گنجائش پیدا کرو ﴿فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ تو گنجائش پیدا کرو،

اللہ تمہارے لئے گنجائش پیدا کریں گے۔ عربوں کے بیٹھنے کا طریقہ اور ہے اور ہمارے بیٹھنے کا طریقہ اور ہے۔ عرب حلقہ بنا کر بیٹھتے ہیں تا کہ ہر ایک کے ساتھ مواجہہ ہو، پھر جب مجلس میں کوئی نیا آدمی آتا ہے تو میر مجلس کہتا ہے: تفسَّحوا: گنجائش پیدا کرو، پس سب لوگ تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹیں گے اور ایک آدمی کی جگہ نکل آئے گی۔ یہ ہے کشادگی پیدا کرنا۔ ہمارے یہاں مجلس میں بیٹھنے کا طریقہ وہ ہے جس انداز پر آپ حضرات بیٹھے ہیں، ایسی صورت میں جب کہا جائے: تفسَّحوا تو سب تھوڑا تھوڑا آگے بڑھیں، پیچھے جگہ نکل آئے گی اور آنے والا وہاں بیٹھ جائے گا۔ ﴿وَإِذَا قِيلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا﴾ اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ۔ یعنی اگر کوئی ذی حیثیت آدمی مجلس میں آئے اور کسی سے کہا جائے کہ تم یہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھ جاؤ تو اس کو اٹھ جانا چاہئے۔ آگے اس کی تعلیل ہے: ﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ أُوْتُوْا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾ تم میں سے جو مؤمنین ہیں یعنی کامل الایمان ہیں یا ذی علم ہیں اللہ تعالیٰ ان کے درجات بڑھاتے ہیں۔

اس آیت سے کمال ایمان کی بھی فضیلت ثابت ہوئی اور کمال علم کی بھی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی آیت کی ترتیب کے مطابق ایمان کو مقدم کیا ہے، اور علم کا بیان بعد میں لائے ہیں۔

دوسری آیت سورۂ طٰہٰ کی (آیت ۱۱۴) ہے: فرمایا: اور دعا کیجئے: اے میرے پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما! علم کوئی قابل فضیلت چیز تھی جبھی دعا کرنے کا حکم ہے۔ لہٰذا اس آیت سے بھی علم کی فضیلت ثابت ہوئی۔

اشکال: یہاں طلبہ یہ سوال کرتے ہیں کہ امام بخاریؒ اس باب میں کوئی حدیث کیوں نہیں لائے؟

پہلا جواب: دو آیتیں لائے کیا یہ کافی نہیں۔ جب قرآن مجید کی دو آیتیں لائے ہیں تو پھر حدیث کی کیا ضرورت ہے؟ کتاب العلم تو حدیثوں سے بھری پڑی ہے، کوئی ضروری ہے کہ ہر باب میں حدیث لائیں۔

دوسرا جواب: آگے کتاب العلم میں باب ۲۲ بعینہ یہی آرہا ہے، وہاں حاشیہ میں تکرار باب کا ایک جواب یہ دیا ہے کہ کتاب العلم کے شروع میں اکثر نسخوں میں باب نہیں ہے، کتاب العلم کے بعد دو آیتیں لکھی ہیں، اور امام بخاری رحمہ اللہ کی بخاری شریف میں جو عادت ہے اس سے ہم آہنگ یہی بات ہے۔ آپ ہر کتاب کے شروع میں ایسی آیت یا آیات لکھتے ہیں جس کی تفسیر کتاب کی جملہ احادیث ہوتی ہیں۔ یہاں بھی جو دو آیتیں لکھی ہیں وہ کتاب العلم کی پیشانی ہیں، اور کتاب العلم کی ساری حدیثیں ان کی تفسیر ہیں۔

۳- كتابُ العِلْمِ

بسم الله الرحمن الرحيم

[۱-] بابُ فَضْلِ الْعِلْمِ

[۱-] وَقَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى: ﴿ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ أُوْتُوْا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

خَبِيْرٌ﴾ [المجادلة: ۱۱]
[۲-] وَقَوْلِهِ: ﴿رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾[طه: ۱۱۴]

فائدہ: یہاں تسمیہ لکھنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ متقدمین کے یہاں ہر کتاب الگ الگ کاپی میں لکھنے کا رواج تھا وہ کتاب الایمان الگ کاپی میں لکھتے تھے، کتاب العلم، کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوٰۃ وغیرہ الگ الگ کاپیوں میں، پھر سب کو یکجا کردیا کرتے تھے۔ امام بخاریؒ نے بھی کتاب الایمان الگ کاپی میں اور کتاب العلم الگ کاپی میں لکھی ہوگی اس لئے یہاں بسم اللہ ہے۔

بابُ مَنْ سُئِلَ عِلْمًا، وَهُوَ مُشْتَغِلٌ فِيْ حَدِيْثِهِ، فَأَتَمَّ الْحَدِيْثَ، ثُمَّ أَجَابَ السَّائِلَ

کوئی شخص بات میں مشغول تھا اور کسی نے مسئلہ پوچھا پس اس نے فارغ ہوکر جواب دیا تو یہ جائز ہے

کوئی شخص سبق پڑھا رہا ہے، وعظ کہہ رہا ہے، یا کسی سے گفتگو کررہا ہے، درمیان میں کوئی بے سلیقہ آدمی سوال کرے یا مسئلہ پوچھے تو کیا کرنا چاہئے؟ سبق اور وعظ روک کر پہلے مسئلہ بتانا چاہئے یا سبق پڑھاتے رہیں، وعظ کہتے رہیں، جب فارغ ہوجائیں تو مسئلہ بتائیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات حالات کے تابع ہے، اگر پوچھنے والا ایمرجنسی پوچھ رہا ہے تو پہلے مسئلہ بتانا چاہئے، اور زیادہ جلدی نہیں ہے تو سبق اور وعظ جاری رکھ سکتے ہیں، جب سبق پورا ہوجائے مسئلہ بتائیں۔ جیسے کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے، اور ماں نے یا باپ نے پکارا تو کیا کرے؟ یہاں بھی یہی مسئلہ ہے۔ اگر ماں باپ کمزور ہیں اور انہیں کوئی فوری ضرورت پیش آگئی ہے اور وہ جانتے بھی ہیں کہ بیٹا نماز پڑھ رہا ہے پھر بھی پکار رہے ہیں یعنی ایمرجنسی پکار رہے ہیں تو فوراً نماز توڑ کر جواب دے، اور اگر قرائن سے اندازہ ہو کہ ایمرجنسی آواز نہیں بلکہ ان کو پتا بھی نہیں کہ بیٹا نماز پڑھ رہا ہے تو نماز پوری کرے پھر جواب دے۔ اسی طرح زیر بحث مسئلہ بھی حالات کے تابع ہے۔

حدیث: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: دریں اثناء کہ نبی ﷺ ایک مجلس سے خطاب فرمارہے تھے، ایک بدّو آیا۔ اس نے آتے ہی سوال کیا: قیامت کب آئے گی؟ آپؐ بیان فرماتے رہے (فوراً جواب نہیں دیا) کسی نے کہا: نبی ﷺ نے اس کی بات سنی ہے مگر اس کے سوال کو ناپسند کیا (اس لئے جواب نہیں دیا) دوسرے نے کہا: آپؐ نے اس کی بات نہیں سنی، یہاں تک کہ آپؐ نے اپنی بات پوری فرمائی، پھر آپؐ نے فرمایا: قیامت کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے؟ اس نے عرض کیا: حاضر ہوں اے اللہ کے رسول! آپؐ نے فرمایا: ''جب امانتیں ضائع کی جائیں تو قیامت کا انتظار کر'' امانتیں ضائع کرنے کا کیا مطلب ہے؟ یہ بات اس بدو کی سمجھ میں نہیں آئی تو اس نے پھر پوچھا:

امانت کیسے ضائع ہوتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جب معاملہ نااہل کو سونپا جائے تو قیامت کا انتظار کر''

تشریح: اس حدیث میں قیامت کی ایک نشانی یہ بیان کی گئی ہے کہ عہدے نااہلوں کو سونپے جائیں۔ اور یہ حدیث عام ہے، سرکاری عہدوں کے ساتھ خاص نہیں، انجمنوں کے عہدوں تک یہ حدیث عام ہے، عہدہ بھی ایک امانت ہے، اس لئے وہ اہل ہی کو سونپنا چاہئے، نااہل کو عہدہ سونپنا امانت کو ضائع کرنا ہے۔ ایسی صورت میں قیامت کا انتظار کرنا چاہئے یعنی اب دنگے فساد اور فتنہ برپا ہوگا، جب نااہل کو صدر یا سکریٹری بنادیا جائے گا تو جھگڑے ہونگے اور واقعی اہل کو عہدہ سونپا جائے گا تو کوئی جھگڑا اور فساد نہیں ہوگا، آنحضور ﷺ نے پہلے عہدہ کو لفظ امانت سے تعبیر کیا، مگر جب سائل سمجھا نہیں تو آپؐ نے وہی بات الفاظ بدل کر فرمائی۔

اس حدیث میں دو باتیں سمجھنی ہیں:

اول: نبی ﷺ نے سائل کا جواب فوراً نہیں دیا کیونکہ سوال ایمرجنسی نہیں تھا، اور سائل مجلس میں بیٹھ گیا تھا۔

دوم: نبی ﷺ سے متعدد صحابہ نے یہی سوال کیا ہے، اور آپؐ نے سائل کا منشا جان کر مختلف جواب دیئے ہیں، مثلاً: حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بھی یہی سوال کیا تھا: متی الساعة؟ آپؐ نے اندازہ کیا کہ سائل قیامت کا معین وقت جاننا چاہتا ہے اس لئے آپؐ نے جواب دیا کہ قیامت کو متعین طور پر کوئی نہیں جانتا۔ جس طرح سائل نہیں جانتا، مسئول بھی نہیں جانتا، اور اس حدیث میں بدو نے بھی یہی سوال کیا ہے۔ حضور ﷺ نے اندازہ کیا کہ یہ قرب قیامت کی نشانیوں کے بارے میں پوچھ رہا ہے چنانچہ آپؐ نے آثار قیامت میں سے ایک نشانی بتائی، اور ایک اور شخص نے بھی یہی سوال کیا تھا، آپؐ نے اس سے پوچھا: تو نے قیامت کے لئے کیا تیاری کی ہے؟ اس نے جواب دیا: یارسول اللہ! میرے پاس نہ بہت نمازیں ہیں، نہ بہت روزے، البتہ مجھے اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہے، آپؐ نے فرمایا: آدمی آخرت میں اس کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے۔ ایک اور شخص نے بھی یہی سوال کیا تھا۔ آپؐ نے اندازہ کیا کہ یہ شخص جزا کے بارے میں پوچھ رہا ہے یعنی اعمال کا بدلہ کب ملے گا۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا: جس کی موت آگئی اس کی قیامت شروع ہوگئی یعنی اس کی جزاء وسزا شروع ہوگئی۔ غرض آنحضور ﷺ نے ایک ہی سوال کے سائل کے منشا کو پیش نظر رکھ کر مختلف جواب دیئے ہیں۔

[٢-] بَابُ مَنْ سُئِلَ عِلْمًا، وَهُوَ مُشْتَغِلٌ فِيْ حَدِيْثِهِ، فَأَتَمَّ الْحَدِيْثَ، ثُمَّ أَجَابَ السَّائِلَ

[٥٩-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ سِنَانٍ، قَالَ: ثَنَا فُلَيْحٌ، ح: وَحَدَّثَنِيْ إِبْرَاهِيْمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ: ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُلَيْحٍ قَالَ: ثَنَا أَبِيْ قَالَ: حَدَّثَنِيْ هِلَالُ بْنُ عَلِيٍّ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، قَالَ: بَيْنَمَا النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم فِيْ مَجْلِسٍ يُحَدِّثُ الْقَوْمَ، جَاءَهُ أَعْرَابِيٌّ فَقَالَ: مَتَى السَّاعَةُ؟ فَمَضَى رَسُوْلُ اللهِ صلى الله

عليه وسلم يُحَدِّثُ، فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: سَمِعَ مَا قَالَ فَكَرِهَ مَا قَالَ، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: بَلْ لَمْ يَسْمَعْ، حَتّٰى إِذَا قَضٰى حَدِيْثَهُ قَالَ: "أَيْنَ أُرَاهُ السَّائِلُ عَنِ السَّاعَةِ؟" قَالَ: هَا أَنَا يَارسولَ اللّٰهِ! قَالَ: "فَإِذَا ضُيِّعَتِ الْأَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ" قَالَ: كَيْفَ إِضَاعَتُهَا؟ قَالَ" إِذَا وُسِّدَ الْأَمْرُ إِلٰى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ"

قوله: أين أُراه السائلُ: أُراه (بضم الهمزة) کے معنی ہیں: أَظُنُّ اور بفتح الہمزہ کے معنی ہیں: آنکھ سے دیکھنا، حدیث میں دونوں ہو سکتے ہیں اور السائلُ پر اعراب حکائی ہے۔

بابُ مَنْ رَفَعَ صَوْتَهُ بِالْعِلْمِ

علمی بات زور سے کہنا

زیادہ زور سے بولنا (چلانا) کوئی اچھی بات نہیں، قرآن میں ہے: ﴿إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾ اور ہونٹوں میں بولنا بھی اچھا نہیں، صاف اور درمیانی آواز میں بولنا چاہئے، لیکن اگر کوئی ضرورت ہو تو زور سے بول سکتے ہیں۔ حدیث میں یہ واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ لوگ سفر کر رہے تھے، راستہ میں عصر کی نماز کا وقت آگیا، لشکر کا اگلا حصہ پانی پر پہنچ کر جلدی جلدی وضو کرنے لگا کیونکہ نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا، جلدی کی وجہ سے بعض کی ایڑیاں خشک رہ گئیں، حضور ﷺ پیچھے سے آئے اور اونٹ پر سے تین مرتبہ پکار کر کہا: ویلٌ للأعقاب من النار: ان لوگوں کے لئے جہنم کی وعید ہے جنھوں نے ایڑیاں دھونے میں کوتاہی کی ہے، اس میں مجاز بالحذف ہے، تقدیر عبارت ہے: ویل للمقصِّرین فی غَسل الأعقاب من النار: یعنی جو لوگ ایڑیاں دھونے میں کوتاہی کرنے والے ہیں ان کے لئے دوزخ کی وعید ہے ....اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت زور سے بول سکتے ہیں۔

[۳-] بابُ مَنْ رَفَعَ صَوْتَهُ بِالْعِلْمِ

[۶۰-] حدثنا أَبُو النُّعْمَانِ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُوْ عَوَانَةَ، عَنْ أَبِيْ بِشْرٍ، عَنْ يُوْسُفَ بْنِ مَاهَكَ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو، قَالَ: تَخَلَّفَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم فِيْ سَفْرَةٍ سَافَرْنَاهَا، فَأَدْرَكَنَا وَقَدْ أَرْهَقَتْنَا الصَّلَاةُ وَنَحْنُ نَتَوَضَّأُ، فَجَعَلْنَا نَمْسَحُ عَلٰى أَرْجُلِنَا، فَنَادٰى بِأَعْلٰى صَوْتِهِ: "وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ" مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا.

[انظر: ۹۶، ۱۶۳]

ترجمہ: عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ ایک ایسے سفر میں ہم سے پیچھے رہ گئے جو ہم نے کیا، پس آپؐ نے ہمیں پایا درانحالیکہ ہم پر نماز چھا رہی تھی، یعنی نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا اور ہم (جلدی) وضو کر رہے

تھے، پس ہم نے اپنے پاؤں ہلکے دھوئے (یہاں مسح غسل خفیف کے معنی میں ہے) تو آپؐ نے بآواز بلند دو یا تین مرتبہ فرمایا: وضو میں خشک رہ جانے والی ایڑیوں کے لئے جہنم کی وعید ہے۔

تشریح: شیعہ امامیہ کے نزدیک وضو میں پاؤں کا وظیفہ مسح ہے، اور ان کا استدلال ﴿اَرْجُلِكُمْ﴾ میں کسرہ والی قراءت سے ہے۔ جب آگے یہ مسئلہ آئے گا تو ہم جواب دیں گے کہ جب أرجلکم کا تعلق امسحوا کے ساتھ ہوگا تو مسح کے معنی غسل خفیف کے ہونگے، اس کی دلیل یہ حدیث ہے۔ یہاں لفظ مسح: غسل خفیف ہی کے معنی میں ہے اس کو یاد رکھنا چاہئے۔

بابُ قَوْلِ الْمُحَدِّثِ: حَدَّثَنَا وَأَخْبَرَنَا وَأَنْبَأَنَا

تحدیث کے وقت حدثنا، أخبرنا اور أنبأنا یکساں ہیں

کتاب العلم کے شروع میں علم کی فضیلت کا باب آیا ہے، پھر دوسرا باب تھا: مَن سُئِلَ علما یہ باب اس لئے تھا کہ علم سوال کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے، پس جو علم کا طالب ہے چاہئے کہ وہ سوال کرے، دور اول میں جب کتابیں نہیں تھیں پڑھنے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ استاذ درسگاہ میں آکر بیٹھ جاتا پھر طلبہ سوال کرتے اور استاذ جواب دیتا۔ اُس زمانہ میں یہی علم حاصل کرنے کا طریقہ تھا۔ پھر یہ باب لائے کہ مفتی صاحب علمی بات بوقت ضرورت پکار کر کہہ سکتے ہیں۔ اب چوتھا باب یہ لائے ہیں کہ استاذ جو جواب دے اس کے لئے استناد ضروری ہے، قرآنِ کریم کا ثبوت تو تواتر طبقہ سے ہے، لیکن احادیث شریفہ کی یہ صورت نہیں، اس لئے احادیث شریفہ میں خاص طور پر سند چاہئے، دور اول میں مختلف طرح سے روایت بیان کی جاتی تھی، مثلاً: تحدیث، اخبار، انباء، سماعت، مناولہ، مکاتبہ اور قراءت علی الشیخ وغیرہ سب علم منتقل کرنے کی شکلیں تھیں۔ امام بخاریؒ نے اس باب میں ان تمام شکلوں کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ لیکن یہ ساری گفتگو مصنّفین کتب حدیث کے زمانہ تک تھی۔ اب کتاب کا حوالہ کافی ہے، جب کتابیں نہیں تھیں بلکہ رودررو حدیثیں بیان کی جاتی تھیں یہ اس زمانہ تک کی بحث ہے۔

جاننا چاہئے کہ تحدیث کا سلسلہ اسی طرح شروع ہوا کہ نبی ﷺ ارشاد فرماتے اور صحابہ سنتے تھے۔ پھر صحابہ بیان کرتے اور تابعین سنتے تھے۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا اس کا نام ''تحدیث'' ہے، جب صحابہ تابعین کے سامنے حدیث بیان کریں گے تو کہیں گے حدَّثنا رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ اور تابعی نے جس صحابی سے سنا ہے اس کا نام لیگا اور کہے گا: حدثنا أبو هريرة۔ پھر جب تبع تابعین کا دور آیا تو محدثین نے اپنی کتابیں لکھیں جیسے امام مالک رحمہ اللہ نے موطا مالک لکھی۔ اب امام مالکؒ حدیثیں خود نہیں پڑھتے تھے بلکہ ایک معین طالب عالم جو پہلے موطا حضرت سے پڑھ چکا ہوتا تھا وہی پڑھتا تھا اور باقی سب سنتے تھے۔ جب یہ نیا طریقہ شروع ہوا تو اختلاف ہوا کہ یہ جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ اب تک تو استاذ پڑھتا تھا اور طالب علم سنتے تھے، اب طالب علم پڑھتا ہے اور استاذ سنتا ہے۔ پس یہ طریقہ جائز ہے

یا نہیں؟ شروع شروع میں اختلاف رہا۔ بہت سے لوگوں نے اس کو ناجائز کہا مگر رفتہ رفتہ اختلاف مضمحل (پاش پاش) ہوگیا۔ اور سب نے مان لیا کہ یہ صورت بھی جائز ہے، پھر یہ اختلاف ہوا کہ یہ جو نیا طریقہ چلا ہے اس کے لئے طالب علم آگے کیا لفظ کہے گا؟ اس کے لئے لفظ أخبرنا تجویز پایا، یعنی اگر طالب علم نے حدیث پڑھی ہے اور استاذ نے سنی ہے تو طالب علم آگے أخبرنا کہہ کر حدیث بیان کرے گا، اور اگر طالب علم نے خود نہیں پڑھا بلکہ کسی اور طالب علم نے پڑھا ہے اور اس نے سنا ہے تو قُرِئَ علیه و أنا أسْمَع کہے گا۔ پھر یہ اختلاف بھی آگے چل کر مضمحل ہوگیا۔ اور طے پایا کہ خواہ استاذ نے پڑھا ہو یا طالب علم نے اور خواہ پڑھا ہو یا سنا ہو ہر صورت میں حدثنا کہہ سکتے ہیں۔ نیز أخبرنا، أنبأنا اور سمعتُ بھی کہہ سکتے ہیں۔ چاروں لفظوں کے معنی یکساں ہیں اور سب کا مطلب یہ ہے کہ سند متصل ہے اور ایک پانچواں لفظ عن ہے، پہلے اس میں بھی اختلاف تھا لیکن بعد میں اس کو بھی مذکورہ چار لفظوں میں شامل کرلیا گیا۔ یہ بھی اتصال پر دلالت کرتا ہے۔ البتہ اگر راوی مدلّس ہو یعنی اس کے اندر استاذ کا نام چھپانے کا عیب ہو تو اس کے عنعنہ کو اتصال پر محمول نہیں کریں گے۔

مناولہ اور مکاتبہ کا حکم:

مناولہ: یہ ہے کہ شیخ اپنی اصل کتاب یا اس کی نقل تلمیذ کو دے یا تلمیذ شیخ کی کتاب نقل کر کے شیخ کے روبرو پیش کرے اور دونوں صورتوں میں شیخ کہے: میں اس کتاب کو فلاں سے روایت کرتا ہوں اور میں آپ کو اپنی سند سے روایت کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔

شرط: مناولہ سے روایت کرنے کے لئے شرط یہ ہے کہ تلمیذ کا اصل کتاب پر یا اس کی نقل پر قبضہ ہو۔ اگر محض اجازت دی ہو اور تلمیذ کا اصل کتاب یا اس کی نقل پر قبضہ نہ ہو تو وہ مناولہ نہیں۔ پھر مناولہ کی دو قسمیں ہیں: با اجازت اور بے اجازت، اول بالاتفاق معتبر ہے اور ثانی میں اختلاف ہے۔

اور مکاتبہ یہ ہے کہ شیخ اپنی حدیثیں لکھ کر کسی کے پاس بھیجے پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں با اجازت اور بے اجازت۔ اول معتبر ہے اور اگر روایت کی اجازت نہیں دی تو پھر بالاتفاق اس سے روایت کرنا درست نہیں۔

ملحوظہ: مگر یہ سب باتیں اس زمانہ کی ہیں جب کتابیں قلمی تھیں اور زبانی روایت کی جاتی تھیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب معتبر کتابوں سے حدیثیں بیان کی جاتی ہیں، اس لئے اب یہ محض ایک مسئلہ ہے۔

[٤-] بابُ قَوْلِ الْمُحَدِّثِ: حَدَّثَنَا وَأَخْبَرَنَا وَأَنْبَأَنَا

[١-] وَقَالَ لَنَا الْحُمَيْدِيُّ: كَانَ عِنْدَ ابْنِ عُيَيْنَةَ حَدَّثَنَا وَ أَخْبَرَنَا وَأَنْبَأَنَا وسَمِعْتُ وَاحِدًا.

[٢-] وَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ: حَدَّثَنَا رَسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم، وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ.

[٣-] وَقَالَ شَقِيْقٌ، عَنْ عَبْدِ اللهِ: سَمِعْتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كَلِمَةً كَذَا.

[٤-] وَقَالَ حُذَيْفَةُ: حَدَّثَنَا رَسُولُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم حَدِيْثَيْنِ.
[٥-] وَقَالَ أَبُو الْعَالِيَةِ: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم فِيْمَا يَرْوِیْ عَنْ رَبِّهٖ.
[٦-] وَقَالَ أَنَسٌ: عَنِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم، يَرْوِيْهِ عَنْ رَبِّهٖ.
[٧-] وَقَالَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ: عَنِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم، يَرْوِيْهِ عَنْ رَبِّكُمْ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى.

تشریح: اس باب کے تحت سب سے پہلے حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کا قول لائے ہیں کہ چار لفظ: حدثنا، أخبرنا، انبأنا اور سمعتُ ہم معنی ہیں۔ پھر چھ روایتوں کے ابتدائی حصے لائے ہیں، صحابہ کرام نے نبی ﷺ سے جو حدیثیں سنی تھیں ان کو کبھی حدثنا کہہ کر، کبھی سمعتُ کہہ کر اور کبھی بصیغۂ عن روایت کیا ہے۔ نمبر دو میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حدثنا کہا ہے، اور نمبر تین میں سمعتُ استعمال کیا ہے۔ اسی طرح روایت نمبر ۴ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے لفظ حدثنا استعمال کیا ہے۔ اور باقی روایتوں میں حضرات ابن عباس، انس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے لفظ عن استعمال کیا ہے۔ ان روایات سے ثابت ہوا کہ یہ الفاظ ایک ہی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

لغت: الصادق کے معنی ہیں: سچا۔ اور المصدوق کے معنی ہیں: جس کو لوگ سچا سمجھیں، اور کلمةَ کذا میں کلمة کی مابعد کی طرف اضافت ہے، اور کذا اسم کنایہ ہے، یعنی ایک بات میں نے حضورؐ سے سنی ہے۔

ملحوظہ: حدیث کی دو قسمیں ہیں: حدیث نبوی اور حدیث قدسی، جس حدیث کے شروع میں قال الله تبارك وتعالیٰ، یا عن الله تبارك وتعالیٰ، یا اس کے مانند کوئی جملہ ہو وہ حدیث قدسی کہلاتی ہے۔ اور باقی حدیثیں احادیث نبویہ کہلاتی ہیں، تفصیل مقدمہ میں دیکھیں۔

[٦١-] حدثنا قُتَيْبَةُ، قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيْلُ بْنُ جَعْفَرٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم: "إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا، وَإِنَّهَا مَثَلُ الْمُسْلِمِ، فَحَدِّثُوْنِيْ مَا هِيَ؟" فَوَقَعَ النَّاسُ فِيْ شَجَرِ الْبَوَادِيْ، قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: وَوَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ أَنَّهَا النَّخْلَةُ، فَاسْتَحْيَيْتُ، ثُمَّ قَالُوْا: حَدِّثْنَا مَا هِيَ يَا رسولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: "هِيَ النَّخْلَةُ" [انظر: ٦٢، ٧٢، ١٣١، ٢٢٠٩، ٤٦٩٨، ٥٤٤٤، ٥٤٤٨، ٦١٢٢، ٦١٤٤]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے۔ اور وہ درخت مسلمان کی مثال ہے۔ بتاؤ وہ درخت کونسا ہے؟ پس لوگ جنگل کے درختوں میں کھو گئے یعنی غور کرنے لگے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں: میرے دل میں آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے لیکن مجلس میں اکابر صحابہ موجود تھے اس لئے میں شرما گیا اور خاموش رہا۔ جب کوئی بوجھ نہ سکا تو صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ بتلائیں: وہ کونسا درخت ہے؟ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا: ''وہ کھجور کا درخت ہے''

تشریح: یہ حدیث یہاں مختصر ہے۔ اس کا پورا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ صحابہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؐ کے پاس جُمَّار لایا گیا، جُمَّار کیا ہے؟ اللہ جانے کیا ہے! لوگوں نے اس کا ترجمہ ''کھجور کا گوند'' کیا ہے۔ آپؐ نے اسے حاضرین کے سامنے رکھ دیا۔ سب کھانے لگے، پھر آپؐ نے سورۂ ابراہیم کی آیت (۲۴) پڑھی: ﴿كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ. تُؤْتِيْ أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا﴾ پھر آپؐ نے حاضرین سے فرمایا: ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے کبھی نہیں جھڑتے، وہ درخت مسلمان کی مثال ہے۔ بتاؤ! وہ کونسا درخت ہے؟ سب سوچنے لگے۔ مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: میں سمجھ گیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے مگر مجلس میں حضرات شیخین اور دیگر اکابر صحابہ موجود تھے اس لئے مجھے شرم آئی اور میں خاموش رہا۔ جب کسی کی سمجھ میں نہ آیا تو انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ہی بتلائیں: وہ کونسا درخت ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: وہ کھجور کا درخت ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں: بعد میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میرے ذہن میں جواب آ گیا تھا مگر چونکہ مجلس میں اکابر صحابہ موجود تھے اس لئے میں خاموش رہا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر تم بتا دیتے تو مجھے اتنی خوشی ہوتی کہ دنیا بھر کی نعمتیں پاکر بھی مجھے اتنی خوشی نہ ہوتی۔

اس حدیث کے ضمن میں چند باتیں سمجھنی چاہئیں:

پہلی بات: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ذہن اس طرح منتقل ہوا تھا کہ اس وقت جمار کھایا جا رہا تھا، نیز حضور ﷺ نے سورۂ ابراہیم کی جو ایک آیت پڑھی تھی اس کا مصداق کھجور کا درخت تھا۔ ان دو قرینوں سے حضرت ابن عمرؓ سمجھ گئے کہ وہ کھجور کا درخت ہے، اور دیگر صحابہ کا ذہن اس لئے منتقل نہیں ہوا کہ آپؐ نے فرمایا تھا: ''اس کے پتے کبھی نہیں جھڑتے'' اور کھجور کے پتے نہیں ہوتے بلکہ اس کی ٹہنیاں ہوتی ہیں۔ اردو میں بھی ان کو پتے نہیں کہتے، اور عربی میں ان کو سَعَف کہتے ہیں وَرَق نہیں کہتے۔ اور چونکہ حضور ﷺ نے وَرَق لفظ استعمال کیا تھا، اس لئے دوسرے صحابہ کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ پھر جب آپؐ نے جواب دیا تو پتا چلا کہ آپؐ نے ورق لفظ مجازاً استعمال کیا تھا۔

دوسری بات: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جو ادب کا لحاظ کیا ہے وہ اچھی بات ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات ٹھیک نہیں ہوتی لیکن کسی خاص موقعہ پر اگر ادب ملحوظ نہ رکھیں تو یہ بھی اچھی بات ہے۔ اگر حضرت ابن عمرؓ جواب دیتے تو حضور ﷺ کے دل میں ان کی قدر بڑھتی۔ آپؐ دعا دیتے اور بیٹے کی فضیلت باپ کے لئے بھی فضیلت ہوتی۔ اس لئے حضرت ابن عمرؓ کے بولنے میں گوناگوں فوائد تھے، اور ان کی خاموشی میں صرف ایک فائدہ تھا کہ بڑوں کا ادب ملحوظ رہا، اس لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر تم جواب دیتے تو میرے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہوتا۔

آگے بخاری شریف میں یہ واقعہ آئے گا کہ حضرت عمرؓ اپنے دورِ خلافت میں اکابر صحابہ کی مجلس میں حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہما کو بھی شریک کرتے تھے۔ حالانکہ اس وقت وہ بالکل نوجوان تھے، ان کی عمر کم وبیش بیس سال تھی، ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے دبے لفظوں میں اعتراض بھی کیا کہ ابن عباس کی عمر کے ہمارے بھی لڑکے ہیں، حضرت عمرؓ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر کسی موقع پر حاضرین سے سوال کیا کہ سورۂ نصر کے نزول کا منشا کیا ہے؟ سب نے کہا: اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے خوشخبری سنائی ہے کہ اب اسلام کا دائرہ وسیع ہوگا۔ لوگ جوق جوق اسلام میں داخل ہونگے، لہٰذا مسلمانوں کو خوش ہونا چاہئے کہ ان کی محنتوں کا پھل حاصل ہوا۔ حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ سے پوچھا: کیا تم بھی یہی کہتے ہو؟ ابن عباسؓ نے فرمایا: نہیں، میرے نزدیک اس سورت کا منشا آنحضور ﷺ کو ان کی وفات کی اطلاع دینا ہے کہ آپؐ کی دنیوی زندگی پوری ہونے والی ہے اب آپ آخرت کی تیاری شروع کریں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں بھی یہی کہتا ہوں (بخاری حدیث ٣٦٢٧) سب حضرات کی سمجھ میں آ گیا کہ ابن عباس اکابر کی مجلس میں شریک ہونے کے قابل ہیں۔ اگر اس وقت حضرت ابن عباسؓ ادب کا لحاظ کرتے اور سوال کا جواب نہ دیتے تو ان کی فضیلت اکابر صحابہ کے سامنے کیسے ظاہر ہوتی؟ اسی طرح اگر حضرت ابن عمرؓ جواب دیتے تو حضور ﷺ کے دل میں ان کی وقعت پیدا ہوتی، آپؐ خوش ہوتے اور دعائیں دیتے۔ اور یہ بات حضرت عمرؓ کے لئے بھی فضیلت ہوتی۔

تیسری بات: آنحضور ﷺ نے مسلمان کو کھجور کے درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہے: وجہ شبہ کیا ہے؟ علماء نے متعدد وجوہ بیان کی ہیں۔ بعض کہتے ہیں: تشبیہ افادیت میں ہے، مؤمن بارہ ماسی کھجور کی طرح ہر وقت لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ اس زمانہ میں کھجور ہی بارہ ماسی ہوتی تھی۔ اب تو بہت سے درخت بارہ ماسی ہوگئے ہیں، اور یہ بات اس آیت سے مفہوم ہوتی ہے جو اس موقعہ پر آپؐ نے تلاوت فرمائی تھی، ﴿تُؤْتِیْ أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا﴾ یعنی جس طرح کھجور کا درخت بارہ ماسی ہوتا ہے سال بھر اس کا پھل کھایا جاتا ہے مسلمان بھی سرچشمۂ خیر ہوتا ہے، مخلوق خدا ہمیشہ اس سے فیضاب ہوتی رہتی ہے۔

اور بعض نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ کھجور کی جڑیں مضبوط اور گہری ہوتی ہیں، اور اس کا تنہ بلند ہوتا ہے بالکل یہی حال مؤمن کا ہوتا ہے کہ ایمان اس کے قلب میں رچا بسا ہوتا ہے اور اعمال خیر اوپر چڑھتے ہیں ﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ، وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ﴾ یہ تشبیہ ﴿أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِيْ السَّمَاءِ﴾ سے سمجھی گئی ہے۔ اور بھی وجوہ بیان کی گئی ہیں جو کتابوں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

مناسبت: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں فرمایا ہے کہ اس حدیث کے بعض طرق میں حَدِّثونی آیا ہے اور بعض میں أخبرونی اور بعض میں أنبئونی، ظاہر ہے یہ الفاظ صحابہ نے بدلے ہیں۔ حضور ﷺ نے تو ان میں سے کوئی ایک لفظ استعمال کیا ہے، معلوم ہوا کہ صحابہ کے نزدیک یہ سب الفاظ ہم معنی تھے، یہی حدیث کی باب سے مناسبت ہے۔

بابُ طَرْحِ الإِمَامِ الْمَسْئَلَةِ عَلَى أَصْحَابِهِ لِيَخْتَبِرَ مَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ

طلبہ سے سوال کرنا تا کہ ان کی علمی لیاقت کا اندازہ ہو

بات آگے بڑھاتے ہیں: سبق کے دوران استاذ کو طالب علموں سے غافل نہیں رہنا چاہئے، طالب علم کبھی ذہنی طور پر غیر حاضر ہو جاتا ہے جب استاذ ایسا محسوس کرے تو فوراً کوئی ایسی بات پوچھ لے جس سے پتا چل جائے کہ وہ درسگاہ میں موجود ہے یا دماغ غیر حاضر ہے۔

علاوہ ازیں طالب علموں سے وقتاً فوقتاً سوال بھی کرتا رہے تا کہ ان کی علمی لیاقت کا اندازہ ہو، مگر اب جماعتیں اتنی بڑی ہوگئیں ہیں کہ درسگاہ وعظ کی مجلس بن گئی ہے۔ اس صورت میں ہم تمہاری کیا تربیت کر سکتے ہیں؟ اور کس طرح جانچ سکتے ہیں؟ پہلے جماعتیں چھوٹی ہوتی تھیں، استاذ جب پڑھاتا تھا تو طالب علم سوال کرتے تھے، بحث ومباحثہ ہوتا تھا، پھر جماعتیں بڑی ہوگئیں تو طلبہ پرچہ لکھ کر بھیجنے لگے، پھر جہالت چھا گئی تو اب جو پرچہ آتا ہے اس میں طالب علم مسئلہ پوچھتا ہے، کتاب سے متعلق کوئی اشکال نہیں کرتا، حالانکہ سبق سے متعلق کوئی اشکال ہو تو وہ کرنا چاہئے۔ امام بخاریؒ کے اس باب کا مقصد یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً طلبہ سے سوال کرنا چاہئے تا کہ طالب علموں کی استعداد کا اندازہ ہوتا رہے۔

اس باب میں وہی حدیث ہے جو آپ نے ابھی پڑھی۔ اس میں آنحضور ﷺ نے صحابہ سے سوال کیا تھا کہ بتاؤ وہ کونسا درخت ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے اور وہ مسلمان کی مثال ہے؟

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ طلبہ سے اندھا سوال نہیں کرنا چاہئے، ایسا سوال کرنا چاہئے کہ جواب کے کچھ قرائن ہوں۔ آنحضور ﷺ نے جب سوال کیا تھا تو آپ جمّار کھا رہے تھے جو کھجور کا گوند ہے۔ پھر آپؐ نے سورۂ رعد کی آیت پڑھی تھی پھر سوال کیا تھا۔ یہ دو جواب کے قرینے تھے، اور انہی قرائن سے ابن عمرؓ صحیح جواب تک پہنچ گئے تھے۔

ایسا سوال جو بالکل اندھا ہو اغلوطات کے قبیل سے ہوتا ہے، ابو داؤد شریف میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اغلوطات سے یعنی چیستانوں سے منع فرمایا (مشکوۃ حدیث ۲۴۳) ایسے سوال سے کند ذہنی پیدا ہوتی ہے، بلکہ ایسا سوال پوچھنا چاہئے جس کے ساتھ کوئی قرینہ ہو اور وہ سوال ذرا دقیق ہو، تا کہ طلبہ کی استعداد کا پتہ چلے اور ان کو سوچنا بھی پڑے اس سے صلاحیت بڑھتی ہے۔

[٥-] بابُ طَرْحِ الإِمَامِ الْمَسْئَلَةِ عَلَى أَصْحَابِهِ لِيَخْتَبِرَ مَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ

[٦٢-] حدثنا خَالِدُ بْنُ مَخْلَدٍ، قَالَ: ثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ بِلَالٍ، قَالَ: ثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ دِينَارٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: " إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا، وَإِنَّهَا مَثَلُ الْمُسْلِمِ، حَدِّثُونِي مَا

هِيَ؟" قَالَ: فَوَقَعَ النَّاسُ فِيْ شَجَرِ الْبَوَادِيْ، قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: فَوَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ أَنَّهَا النَّخْلَةُ، فَاسْتَحْيَيْتُ ثُمَّ قَالُوْا: حَدِّثْنَا يَارسولَ اللّٰهِ! مَاهِيَ؟ قَالَ:" هِيَ النَّخْلَةُ" [راجع: ٦١]

لغت: مَثَل (بفتحتین) اورمِثْل (بكسر الميم وسكون المثلثة) دونوں پڑھ سکتے ہیں، اور دونوں کے معنی ہیں: مانند، مشابہ، نظیر۔ مَثَل کے ایک معنی کہاوت کے بھی ہیں وہ یہاں مرادنہیں۔

بابُ الْقِرَاءَ ةِ وَالْعَرْضِ عَلَى الْمُحَدِّثِ

استاذ کے سامنے حدیث پڑھنا

قراءت علی المحدث اورعرض علی المحدث ایک ہیں، یعنی طالب عالم کا استاذ کے سامنے حدیث پڑھنا اور پیش کرنا۔ پہلے بتایا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے جوطریقہ چلا آرہا تھا وہ یہ تھا کہ استاذ پڑھتا تھا اور طالب علم سنتا تھا، لیکن جب محدثین نے اپنی کتابیں لکھیں اور جماعتیں بڑی ہوگئیں تو سب سے پہلے امام مالک رحمہ اللہ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ طالب علم پڑھتا تھا اور حضرت سنتے تھے، پس لوگوں میں چہ می گوئیاں شروع ہوئیں، اور جب بھی کوئی نئی بات شروع ہوتی ہے تو چہ می گوئیاں ہوتی ہیں، چنانچہ اختلاف ہوگیا کہ حدیثیں بیان کرنے کا یہ جونیا طریقہ شروع ہوا ہے وہ جائز بھی ہے یا نہیں؟ اکابر محدثین کے نزدیک یہ طریقہ جائز تھا، امام بخاری رحمہ اللہ کی رائے بھی یہی ہے کہ استاذ کا حدیث پڑھنا اور شاگرد کا سننا یا شاگرد کا حدیث پڑھنا اور پیش کرنا اور استاذ کا سننا دونوں جائز ہیں اور دونوں کا ایک ہی درجہ ہے۔

پھر یہ بحث شروع ہوئی کہ ان میں سے اولیٰ کیا ہے؟ ایک رائے یہ تھی کہ استاذ کا پڑھنا اولیٰ ہے، کیونکہ استاذ ٹھیک پڑھے گا اور طالب علم غلطی کرسکتا ہے، اور ہوسکتا ہے استاذ اصلاح نہ کرسکے، اس لئے استاذ کا پڑھنا اولیٰ ہے۔ دوسری رائے یہ تھی کہ طالب علم کا پڑھنا بہتر ہے، کیونکہ طالب علم غلطی کرے گا تو استاذ تصحیح کرے گا اور استاذ غلطی کرے گا تو طالب علم تصحیح نہیں کرسکتا۔ غرض یہ اختلاف نقطۂ نظر کا اختلاف تھا اور دونوں ہی رائیں اپنی جگہ درست ہیں۔

اس باب میں چند آثار ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ طالب علم کا پڑھنا درست ہے۔ تفصیل عبارت کے بعد آئے گی۔

[٦-] بابُ الْقِرَاءَ ةِ وَالْعَرْضِ عَلَى الْمُحَدِّثِ

[١-] وَرَأَى الْحَسَنُ، وَالثَّوْرِيُّ، وَمَالِكٌ الْقِرَاءَ ةَ جَائِزَةً.

[٢-] وَاحْتَجَّ بَعْضُهُمْ فِي الْقِرَاءَ ةِ عَلَى الْعَالِمِ بِحَدِيْثِ ضِمَامِ بْنِ ثَعْلَبَةَ أَنَّهُ قَالَ لِلنَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم: آللّٰهُ أَمَرَكَ أَنْ نُصَلِّيَ الصَّلٰوةَ؟ قَالَ:" نَعَمْ"، قَالَ: فَهٰذِهِ قِرَاءَ ةٌ عَلَى النبيِّ صلى الله عليه وسلم، أَخْبَرَ ضِمَامٌ قَوْمَهُ بِذٰلِكَ فَأَجَازُوْهُ.

[٣-] وَاحْتَجَّ مَالِكٌ بِالصَّكِّ، يُقْرَأُ عَلَى الْقَوْمِ، فَيَقُوْلُوْنَ: أَشْهَدَنَا فُلَانٌ.

[٤-] وَيُقْرَأُ عَلَى الْمُقْرِئِ فَيَقُوْلُ الْقَارِئُ: أَقْرَأَنِي فُلَانٌ.

[٥-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ: ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ الْوَاسِطِيُّ، عَنْ عَوْفٍ، عَنِ الْحَسَنِ قَالَ: لَابَأْسَ بِالْقِرَاءَةِ عَلَى الْعَالِمِ.

[٦-] وحدَّثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ مُوْسَى، عَنْ سُفْيَانَ، قَالَ: إِذَا قُرِئَ عَلَى الْمُحَدِّثِ فَلَا بَأْسَ أَنْ يَقُوْلَ: حَدَّثَنِي.

[٧-] قَالَ: وَسَمِعْتُ أَبَا عَاصِمٍ يَقُوْلُ عَنْ مَالِكٍ وَسُفْيَانَ: الْقِرَاءَةُ عَلَى الْعَالِمِ وَقِرَاءَتُهُ سَوَاءٌ.

۱-حضرت حسن بصری، سفیان ثوری اور مالک رحمہم اللہ فرماتے ہیں: (جس طرح تحدیث جائز ہے) قراءت علی المحدث اورعرض علی المحدث بھی جائز ہے۔

۲-حمیدی رحمہ اللہ نے قراءت علی المحدث اور عرض علی المحدث کے جواز پر ایک حدیث سے استدلال کیا ہے، آنحضور ﷺ نے حضرت ضِمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ کے قبیلہ کی طرف چند دُعات بھیجے، انھوں نے قبیلہ کو جو باتیں بتائیں حضرت ضمام ان کی تصدیق کے لئے خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، انھوں نے وہ باتیں حضور ﷺ کے سامنے پیش کیں آپؐ نے تصدیق فرمائی، یہی قراءت اورعرض علی المحدث ہے، معلوم ہوا کہ یہ طریقہ بھی جائز ہے۔
(یہ حدیث تفصیل سے باب میں آرہی ہے)

قولہ: فَأَجَازُوْہ: یعنی حضرت ضمامؓ نے جب تصدیق کرکے ساری باتیں اپنی قوم سے بیان کیں تو قوم نے ان کو مان لیا۔

۳- پہلے الصَّكّ کے معنی تھے: دستاویز، اب یہ لفظ چیک کے لئے خاص ہوگیا ہے۔ ایک شخص نے کسی سے مکان خریدا، اس کا دستاویز لکھا گیا، منشی نے وہ دستاویز سب کو سنایا، بائع اور مشتری کو بھی اور گواہوں کو بھی، بیس سال بعد مکان کے سلسلہ میں بائع اور مشتری میں جھگڑا ہوا تو گواہ کورٹ میں گواہی دے سکتے ہیں، کیونکہ ان کو لکھا ہوا دستاویز پڑھ کر سنایا گیا ہے، یہ قراءت علی المحدث کی نظیر ہے، اس لئے کہ گواہوں نے خود اس دستاویز کو نہیں پڑھا بلکہ منشی نے پڑھ کر سنایا ہے۔

اور معاملات دینیات کی بہ نسبت اہم ہیں، اسی لئے گواہی کی ضرورت معاملات میں پڑتی ہے، دینیات میں گواہی کی ضرورت نہیں ہوتی، اور حدیث روایت کرنا دیانت کے قبیل سے ہے، پس جب معاملات میں قراءت علی الشہود معتبر ہے تو قراءت علی المحدث کیوں معتبر نہیں؟ وہ بدرجۂ اولیٰ معتبر ہونی چاہئے۔

۴-ایک طالب علم نے کسی قاری کو قرآن پڑھ کر سنایا جب طالب علم فارغ ہوگا اور دوسروں کو پڑھائے گا تو کہے گا: اقْرَأَنِي فلانٌ: فلاں نے مجھے قرآن پڑھایا۔ حالانکہ قاری صاحب نے نہیں پڑھا، اس نے خود پڑھا ہے مگر اس کے باوجود وہ أقرأني فلانٌ کہہ سکتا ہے، اور قرآن کی اہمیت حدیثوں کی بہ نسبت زیادہ ہے، پس جب قرآن میں عرض علی القاری کی

بنیاد پر أقرأني فلان کہہ سکتا ہے تو حدیثوں میں عرض علی المحدث کی بنیاد پر حدَّثني فلان کیوں نہیں کہہ سکتا؟

قولہ: المقرئ: (پڑھانے والا) یہ عربی انداز ہے، اردو میں قاری کہتے ہیں، عربی میں قاری نہیں کہتے، کیونکہ قاری کے معنی ہیں: پڑھنے والا، پڑھانے والے کے لئے لفظ المقرئ ہے۔

۵- حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: طالب علم استاذ کے سامنے حدیث پڑھے تو اس میں کوئی حرج نہیں، ایسا کرسکتے ہیں (باب کے شروع میں حضرت حسن بصریؒ کی رائے آئی ہے، اب اس کو سند کے ساتھ بیان کیا ہے)

۶- سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب محدث کے سامنے حدیثیں پڑھی گئیں اور طالب علم نے سنیں تو وہ حدثني فلان کہہ کران حدیثوں کو بیان کرسکتا ہے۔

۷- امام مالک اور سفیان ثوری رحمہما اللہ فرماتے ہیں: طالب علم استاذ کو حدیثیں پڑھ کر سنائے، یا استاذ پڑھے اور طالب علم سنے دونوں کا ایک ہی درجہ ہے۔

ملحوظہ: ابو عاصم: امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ نہیں، اس لئے سند میں انقطاع ہے۔

[۶۳/۱-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ، عَنْ سَعِيْدٍ، هُوَ الْمَقْبُرِيُّ، عَنْ شَرِيْكِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ أَبِيْ نَمِرٍ، أَنَّهُ سَمِعَ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ، يَقُوْلُ: بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ مَعَ النبيِّ صلى الله عليه سلم فِيْ الْمَسْجِدِ، دَخَلَ رَجُلٌ عَلٰى جَمَلٍ، فَأَنَاخَهُ فِي الْمَسْجِدِ، ثُمَّ عَقَلَهُ، ثُمَّ قَالَ لَهُمْ: أَيُّكُمْ مَحَمَّدٌ؟ وَالنَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم مُتَّكِئٌ بَيْنَ ظَهْرَانَيْهِمْ، فَقُلْنَا: هٰذَا الرَّجُلُ الْأَبْيَضُ الْمُتَّكِئُ، فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ: يَا ابْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم: "قَدْ أَجَبْتُكَ" فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ: إِنِّيْ سَائِلُكَ فَمُشَدِّدٌ عَلَيْكَ فِي الْمَسْأَلَةِ، فَلَا تَجِدْ عَلَيَّ فِيْ نَفْسِكَ، فَقَالَ: "سَلْ عَمَّا بَدَا لَكَ" فَقَالَ: أَسْأَلُكَ بِرَبِّكَ وَرَبِّ مَنْ قَبْلَكَ، آللّٰهُ أَرْسَلَكَ إِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ؟ فَقَالَ: "اللّٰهُمَّ! نَعَمْ" فَقَالَ أَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ، آللّٰهُ أَمَرَكَ أَنْ تُصَلِّيَ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ؟ قَالَ: "اللّٰهُمَّ نَعَمْ" قَالَ: أَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ، آللّٰهُ أَمَرَكَ أَنْ تَصُوْمَ هٰذَا الشَّهْرَ مِنَ السَّنَةِ؟ قَالَ: "اللّٰهُمَّ نَعَمْ" قَالَ: أَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ، آللّٰهُ أَمَرَكَ أَنْ تَأْخُذَ هٰذِهِ الصَّدَقَةَ مِنْ أَغْنِيَائِنَا، فَتَقْسِمَهَا عَلٰى فُقَرَائِنَا؟ فَقَالَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم: "اللّٰهُمَّ نَعَمْ" فَقَالَ الرَّجُلُ: آمَنْتُ بِمَا جِئْتَ بِهِ، وَأَنَا رَسُوْلُ مَنْ وَرَائِيْ مِنْ قَوْمِيْ، وَأَنَا ضِمَامُ بْنُ ثَعْلَبَةَ أَخُوْ بَنِيْ سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ.

رَوَاهُ مُوْسَى، وَعَلِيُّ بْنُ عَبْدِ الْحَمِيْدِ، عَنْ سُلَيْمَانَ، عَنْ ثَابِتٍ، عَنْ أَنَسٍ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم بِهٰذَا.

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: دریں اثنا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے

ایک شخص اونٹ پر سوار ہوکر (احاطۂ) مسجد میں آیا، اس نے اپنا اونٹ (احاطۂ) مسجد میں بٹھایا پھر اس کا پیر باندھ دیا، پھر اس نے لوگوں سے پوچھا: تم میں محمد کون ہیں؟ درانحالیکہ نبی ﷺ لوگوں کے درمیان ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، ہم نے کہا: وہ جو گورے آدمی ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں وہی محمد ﷺ ہیں، اس شخص نے آپ سے کہا: اے ابن عبد المطلب! نبی ﷺ نے فرمایا: میں نے تمہیں جواب دیا یعنی میں حاضر ہوں کہو کیا کہنا ہے؟ اس شخص نے کہا: میں آپؐ سے کچھ باتیں پوچھوں گا اور پوچھنے میں سختی کروں گا، آپ ناراض نہ ہوں، آپؐ نے فرمایا: جو چاہو پوچھو، اس نے کہا: میں آپؐ کو آپ کے رب کی اور آپؐ سے پہلے گذرے ہوئے لوگوں کے رب کی قسم دیتا ہوں! کیا اللہ نے آپؐ کو تمام لوگوں کی طرف مبعوث فرمایا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ نَعَم، یعنی اللہ گواہ ہے اسی نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اس نے کہا: میں آپؐ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں: کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ لوگ دن رات میں پانچ نمازیں پڑھیں، آپؐ نے فرمایا: اللّٰھم نعم: جی ہاں اللہ گواہ ہے! اس نے کہا: میں آپؐ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں: کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ لوگ سال میں اس ایک ماہ (رمضان) کے روزے رکھیں؟ آپؐ نے فرمایا: اللّٰھم نعم، اس نے کہا: میں آپؐ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں: کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ زکوٰۃ ہمارے مالداروں سے لیں اور ہمارے غریبوں پر خرچ کریں؟ آپؐ نے فرمایا: اللّٰھم نعم، پس اس شخص نے کہا: میں اُن تمام باتوں پر ایمان لایا جو آپؐ لے کر آئے ہیں، اور میں اپنے پیچھے والی اپنی قوم کا نمائندہ ہوں اور میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے، قبیلہ بنی سعد بن بکر کا آدمی ہوں۔

اس حدیث کو موسیٰ بن اسماعیل نے اور علی بن عبد الحمید نے سلیمان سے اور انھوں نے ثابت سے اور انھوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے نبی ﷺ سے اس کے مانند روایت کیا ہے۔

تشریحات:

۱- سعید: مقبری اس لئے کہلاتے تھے کہ ان کا گھر قبرستان کے پاس تھا، یہ مطلب نہیں کہ وہ گورکن تھے۔

۲- حضرت ضمام بن ثعلبہؓ بنی سعد بن بکر قبیلہ کے تھے۔ یہ وہی قبیلہ ہے جس میں آنحضور ﷺ نے دودھ پیا ہے۔ وہ قوم کے وافد بن کر آئے تھے اور کہاں آئے تھے؟ مدینہ منورہ میں آئے تھے یا مکہ میں آئے تھے؟ یا جعرانہ میں آئے تھے؟ یا طائف میں آئے تھے؟ یقین سے اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے، البتہ پہلے حدیث (نمبر ۴۶) آئی ہے کہ نجد سے ایک صاحب آئے تھے، اللہ جانیں وہ واقعہ اور یہ واقعہ ایک ہے یا الگ الگ؟ بظاہر الگ واقعات معلوم ہوتے ہیں۔

اور مسجد سے مسجد نبوی مراد ہونا ضروری نہیں، بلکہ جب حضور ﷺ سفر کرتے تھے تو جہاں آپؐ کا خیمہ ہوتا تھا اس کے قریب کوئی جگہ ہموار کر کے عارضی مسجد بنالی جاتی تھی، سب صحابہ نمازیں وہیں آکر پڑھتے تھے، اس کو بھی مسجد کہتے تھے، لہٰذا مسجد کے قرینہ سے ایسا سمجھنا کہ مسجد نبوی میں آئے ہونگے ایسا ضروری نہیں۔ اور یہ ایسا اختلاف ہے جس کے فیصلہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

۳-مسلم شریف (حدیث نمبر۱۲) میں اسی روایت میں حج کا بھی ذکر ہے، پس یہ قاعدہ یاد رکھنا چاہئے کہ جو حدیث بار بار مختلف سندوں سے آتی ہے کہیں مختصر کہیں مفصل، وہاں کسی ایک معین روایت کو سامنے رکھ کر سوال نہیں کرنا چاہئے، مجموعۂ روایات میں غور کرنا چاہئے۔

۴-آمنتُ بما جئتَ به: یہاں یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت ضمامؓ ابھی ایمان لائے ہوں اور یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے ایمان لا چکے ہوں اور اب تجدید ایمان کی ہو۔

۵-مذکورہ حدیث کو موسیٰ بن اسماعیل اور علی بن عبدالحمید نے روایت کیا ہے، پھر امام بخاریؒ نے موسیٰ کی جس حدیث کا حوالہ دیا ہے اس کو سند کے ساتھ لائے ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب موسیٰ بن اسماعیل کی حدیث فوراً لائے ہیں تو پھر اس کا حوالہ کیوں دیا ہے؟ بعض حضرات کہتے ہیں: یہ حدیث عام طور پر بخاری شریف کے نسخوں میں نہیں ہے، صرف فربری کے نسخہ میں ہے۔ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ الاستاذ سلیمان بن المغیرۃ اس درجہ کے راوی نہیں کہ ان کی روایت بخاری میں لائی جائے، اس لئے امام بخاری نے تعلیقاً روایت ذکر کی۔ مگر علامہ عینی رحمہ اللہ نے ان کی گرفت کی ہے کہ امام بخاریؒ سلیمان بن المغیرہ کی روایت بابٌ یَرُدُّ المصلی من مَرَّ بین یدیه (حدیث ۵۰۹) میں لائے ہیں، پھر یہاں لانے میں کیا پریشانی ہے؟ علامہ عینی کی گرفت بہت مضبوط ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ حضرت نے بعد میں یہ حدیث بڑھائی ہو، کیونکہ فربری نے سب سے آخر میں بخاری شریف پڑھی ہے، اس زمانہ میں اساتذہ کتابوں میں کمی بیشی کرتے رہتے تھے، بہرحال آگے جو حدیث آرہی ہے وہ یہی حدیث ہے جو اوپر آئی ہے۔

[۶۳/۲-] حَدَّثَنَا مُوْسَى بْنُ إِسْمَاعِيْلَ، قَالَ: ثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ الْمُغِيْرَةِ، قَالَ: ثَنَا ثَابِتٌ، عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: نُهِيْنَا فِيْ الْقُرْآنِ أَنْ نَسْأَلَ النبيَّ صلى الله عليه وسلم، وَكَانَ يُعْجِبُنَا أَنْ يَجِيْءَ الرَّجُلُ مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ الْعَاقِلُ، فَيَسْأَلُهُ وَنَحْنُ نَسْمَعُ، فَجَاءَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ، فَقَالَ: أَتَانَا رَسُوْلُكَ فَأَخْبَرَنَا أَنَّكَ تَزْعَمُ أَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ أَرْسَلَكَ؟ قَالَ: صَدَقَ، فَقَالَ: فَمَنْ خَلَقَ السَّمَآءَ؟ قَالَ: اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ، قَالَ: فَمَنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالْجِبَالَ؟ قَالَ: اللّٰهُ عَزَوَجَلَ، قَالَ: فَمَنْ جَعَلَ فِيْهَا الْمَنَافِعَ؟ قَالَ: اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ، قَالَ: فَبِالَّذِيْ خَلَقَ السَّمَاءَ وَخَلَقَ الْأَرْضَ وَنَصَبَ الْجِبَالَ وَجَعَلَ فِيْهَا الْمَنَافِعَ! آللّٰهُ أَرْسَلَكَ؟ قَالَ: نَعَمْ! قَالَ: زَعَمَ رَسُوْلُكَ أَنَّ عَلَيْنَا خَمْسَ صَلَوَاتٍ وَزَكٰوةً فِيْ أَمْوَالِنَا، قَالَ: صَدَقَ، قَالَ: بِالَّذِيْ أَرْسَلَكَ! آللّٰهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا؟ قَالَ: نَعَمْ! قَالَ: وَزَعَمَ رَسُوْلُكَ أَنَّ عَلَيْنَا صَوْمَ شَهْرٍ فِيْ سَنَتِنَا، قَالَ: صَدَقَ، قَالَ: فَبِالَّذِيْ أَرْسَلَكَ آللّٰهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: وَزَعَمَ رَسُوْلُكَ أَنَّ عَلَيْنَا حِجَّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلاً، قَالَ: صَدَقَ، قَالَ: فَبِالَّذِيْ أَرْسَلَكَ آللّٰهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَوَ الَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ! لَا أَزِيْدُ عَلَيْهِنَّ شَيْئًا وَلَا أَنْقُصُ، فَقَالَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم، إِنْ صَدَقَ لَيَدْخُلَنَّ الْجَنَّةَ.

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم قرآن میں اس بات سے روک دیئے گئے تھے کہ نبیؐ سے کچھ پوچھیں، اور ہمیں یہ بات پسند تھی کہ کوئی عقلمند دیہاتی آتا۔ پس وہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کرتا اور ہم سنتے (اور فائدہ اٹھاتے) پس ایک بدّو آیا اور اس نے آپؐ سے کہا: ہمارے پاس آپ کا قاصد آیا اور اس نے ہمیں بتلایا کہ آپ کہتے ہیں: اللہ عز وجل نے آپ کو مبعوث فرمایا ہے، آپؐ نے فرمایا: قاصد نے ٹھیک کہا، اس نے پوچھا: یہ بتایئے آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ نے، اس نے پوچھا: اچھا یہ بتایئے کہ زمین کو اور پہاڑوں کو کس نے بنایا؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ نے، اس نے پوچھا: زمین اور پہاڑوں میں منافع کس نے پیدا کئے؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ نے، پھر اس نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آسمان کو پیدا کیا، زمین کو پیدا کیا، پہاڑوں کو جمایا۔ اور اس میں کارآمد چیزیں بنائیں کیا واقعی اللہ نے آپؐ کو مبعوث فرمایا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: آپؐ کا قاصد کہتا ہے کہ ہم پر پانچ نمازیں فرض ہیں اور ہمارے مالوں میں زکوٰۃ فرض ہے، آپؐ نے فرمایا: اس نے ٹھیک کہا۔ اس نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو مبعوث فرمایا! کیا اللہ نے آپؐ کو ان کا حکم دیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، اس نے کہا: آپؐ کا قاصد کہتا ہے کہ ہر سال میں ایک ماہ کے روزے فرض ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اس نے ٹھیک کہا، اس نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو مبعوث کیا! کیا واقعی اللہ نے آپؐ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے پوچھا: اور آپؐ کا قاصد یہ بھی کہتا ہے کہ ہم پر بیت اللہ کا حج فرض ہے جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو، آپؐ نے فرمایا: اس نے ٹھیک کہا (میں نے پہلے مسلم کا حوالہ دیا تھا اور اس حدیث کا حوالہ اس لئے نہیں دیا تھا کہ یہ حدیث بخاری میں ہے بھی یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے) اس نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو مبعوث فرمایا ہے کیا واقعی اللہ نے آپؐ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، پھر اس نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو حق دے کر مبعوث فرمایا ہے نہ میں ان باتوں میں کچھ اضافہ کروں گا، اور نہ ان میں کچھ کمی کرونگا (یعنی بے کم وکاست یہ باتیں قوم کو پہنچاؤں گا) پس نبی ﷺ نے فرمایا: اگر اس نے سچ کہا تو وہ جنت میں جائے گا۔

تشریح:

سورۃ المائدہ (آیت ۱۰۱) ہے: اے ایمان والو! ایسی باتیں مت پوچھو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں۔ اس آیت کا شانِ نزول حدیث میں یہ آیا ہے کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے، اور آپؐ نے بہت لمبی تقریر فرمائی پھر لوگوں سے کہا: ''جس کو جو پوچھنا ہے پوچھے!'' حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہما نے کھڑے ہوکر دریافت کیا کہ یارسول اللہ! میرا باپ کون ہے؟ ان کے ابا کے بارے میں لوگوں میں چہ می گوئیاں ہوتی تھیں، آپؐ نے فرمایا: تیرے ابا حذیفہ ہیں (بخاری حدیث ۵۴۰) اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، اس میں صحابہ کو تنبیہ کی گئی کہ رسول اللہ ﷺ سے لایعنی اور فضول سوال مت کیا کرو، اگر خدانخواستہ آپؐ حذیفہ کے علاوہ کسی اور کا نام

بتاتے تو ہمیشہ کے لئے ان پر بٹا لگ جاتا۔

اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ نے چپ سادھ لی۔ کیونکہ کونسا سوال یعنی ہے اور کونسا لایعنی، اس کا فیصلہ مشکل ہے، مگر صحابہ علم کے رسیا تھے۔ اس لئے ان کی آرزو تھی کہ دیہات سے کوئی عقلمند آدمی آتا اور سوال کرتا تو ان کے لئے علم کے دروازے کھلتے، دیہاتی آداب مجلس سے زیادہ آشنا نہیں ہوتے۔ وہ بے خوف اور نڈر ہو کر بات کرتے ہیں، اس لئے صحابہ چاہتے تھے کہ دیہات سے کوئی آدمی آئے اور وہ عقلمند بھی ہو، تاکہ وہ کوئی کام کی بات پوچھے، اور حضور ﷺ اس کا جواب دیں تو صحابہ فائدہ اٹھائیں، اسی زمانہ میں حضرت ضمام آئے ہیں اور مذکورہ سوال کئے ہیں، پھر آیت کے نزول سے صحابہ پر جو سہم اور خوف طاری ہو گیا تھا وہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا اور صحابہ خود آپؐ سے پوچھنے لگے۔

قولہ: لا أَزِيْدُ: پہلے میں نے بتایا ہے کہ حضرت ضمام بن ثعلبہؓ اپنی قوم کے نمائندے تھے پس ان کے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے جو باتیں بتائی ہیں بے کم وکاست قوم کو پہنچاؤں گا، ان میں اپنی طرف سے نہ کوئی اضافہ کروں گا اور نہ کمی کروں گا۔

اور بعض شارحین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ میں بس اتنے ہی احکام پر عمل کروں گا، جو آپؐ نے بتلائے ہیں، نہ ان سے زیادہ عمل کروں گا اور نہ ان سے کم، میرے نزدیک یہ مطلب صحیح نہیں، اور حضور ﷺ نے ان کو جنت کی بشارت ان کی قلبی حالت پر مطلع ہونے کی وجہ سے سنائی ہے۔

بَابُ مَا يُذْكَرُ فِيْ الْمُنَاوَلَةِ، وَكِتَابِ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْعِلْمِ إِلَى الْبُلْدَانِ

مناولہ اور مکاتبہ کا بیان

حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے ابواب البخاری کے سلسلہ میں ایک قیمتی بات ارشاد فرمائی ہے، آئندہ بار بار اس کی ضرورت پیش آئے گی اس لئے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے۔

حضرت نے فرمایا: امام بخاری رحمہ اللہ کبھی ایک باب قائم کرتے ہیں پھر وہ تنگی محسوس کرتے ہیں پس باب بڑھا دیتے ہیں، کیونکہ جو بات بڑھائی ہے اس کے دلائل حدیثوں میں ہیں اور پہلی بات کے دلائل نہیں ہیں، اس لئے امام بخاریؒ یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ پھر جب دوسرے جزء کو دلائل سے ثابت کریں گے تو پہلا جزء خود بخود ثابت ہو جائے گا۔

اور میں نے پہلے بتایا ہے کہ مناولہ یہ ہے کہ شیخ اپنی اصل کتاب یا اس کی نقل تلمیذ کو دے اور اس سے روایت کرنے کی اجازت بھی دے تو یہ مناولہ مقرونہ بالا جازۃ ہے، اس سے روایت کرنا جائز ہے، حدثنا کہہ کر بھی روایت کر سکتے ہیں اور أخبرنا اور أنبأنا کہہ کر بھی، جیسے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے سنی ہوئی حدیثیں لکھی تھیں اور اس کا نام صحیفۂ صادقہ رکھا تھا، ان کی وفات کے بعد ان کا پوتا شعیب اس صحیفہ سے روایت کرتا تھا، حضرت عبداللہؓ

نے پوتے کو صحیفہ خود دیا تھا یا دادا کی وفات کے بعد شعیب ازخود اس صحیفہ سے روایت کرتے تھے؟ اس میں اختلاف ہے، اسی لئے شیخین رحمہما اللہ اس سند سے کوئی روایت صحیحین میں نہیں لائے۔ اس کے علاوہ مناولہ کی اور کوئی مثال نہیں۔ امام بخاریؒ نے مناولہ کے ساتھ مکاتبہ کو بھی ملایا ہے۔ کیونکہ اس کے دلائل حدیثوں میں موجود ہیں، پھر جب مکاتبہ ثابت ہوجائے گا تو مناولہ خود بخود ثابت ہوجائے گا۔

اور مکاتبہ یہ ہے کہ کوئی محدث اپنی حدیثیں لکھ کر کسی شخص کو بھیجے، پھر اگر روایت کرنے کی اجازت بھی دے تو وہ مکاتبہ مقرونہ بالاجازۃ ہے اور اس سے روایت کرنا بالاتفاق جائز ہے، اور اگر محض حدیثیں لکھ کر بھیجی ہیں، اجازت نہیں لکھی تو یہ مکاتبہ مجردہ ہے اور اس صورت میں روایت کرنے میں اختلاف ہے۔

[۷-] بَابُ مَا يُذْكَرُ فِي الْمُنَاوَلَةِ، وَكِتَابِ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْعِلْمِ إِلَى الْبُلْدَانِ

[۱-] وَقَالَ أَنَسٌ: نَسَخَ عُثْمَانُ الْمَصَاحِفَ. فَبَعَثَ بِهَا إِلَى الآفَاقِ.

[۲-] وَرَأَى عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ، وَيَحْيَى بْنُ سَعِيْدٍ، وَمَالِكٌ ذٰلِكَ جَائِزًا.

[۳-] وَاحْتَجَّ بَعْضُ أَهْلِ الْحِجَازِ فِي الْمُنَاوَلَةِ بِحَدِيْثِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم حَيْثُ كَتَبَ لِأَمِيْرِ السَّرِيَّةِ كِتَابًا، وَقَالَ: " لَا تَقْرَأْهُ حَتّٰى تَبْلُغَ مَكَانَ كَذَا وَكَذَا" فَلَمَّا بَلَغَ ذٰلِكَ الْمَكَانَ قَرَأَهُ عَلَى النَّاسِ، وَأَخْبَرَهُمْ بِأَمْرِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

تشریح:

۱- مناولہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے، اس کے معنی ہیں: ایک دوسرے کو دینا، مگر کبھی باب مفاعلہ میں مشارکت نہیں ہوتی، یہاں مناولہ میں مشارکت نہیں، یہاں معنی ہیں: استاذ کا تلمیذ کو اپنی اصل کتاب یا اس کی نقل دینا، پھر اگر اجازت بھی دی ہے تو وہ مناولہ مقرونہ بالاجازۃ ہے اور وہ بحکم تحدیث ہے۔ اور اجازت نہیں دی تو وہ مناولہ مجردہ ہے اور اس سے روایت کرنے میں اختلاف ہے۔

۲- اسی طرح مکاتبہ بھی باب مفاعلہ کا مصدر ہے اور یہاں بھی اشتراک نہیں، یعنی استاذ کا حدیثیں لکھ کر کسی تلمیذ کو بھیجنا، اس کی بھی دو قسمیں ہیں: مقرونہ بالاجازۃ اور غیر مقرونہ، اول بہ حکم تحدیث ہے اور ثانی سے روایت میں اختلاف ہے۔

۳- یہاں اصل باب مناولہ کے بارے میں ہے مگر اس کے دلائل حدیثوں میں نہیں تھے اس لئے حضرت رحمہ اللہ نے اس کے ساتھ مکاتبہ مقرونہ بالاجازۃ کو ملایا۔ اس کے دلائل حدیثوں میں ہیں اور ان کے ضمن میں مناولہ کا بھی ثبوت ہوجائے گا۔

۴- کتابُ أهل العلم میں اضافت الی الفاعل ہے اور بالعلم: کتاب (مصدر) سے متعلق ہے۔

قوله: نَسَخَ عثمانُ: آنحضور ﷺ کے بعد لوگوں نے مختلف طرح سے قرآن لکھ رکھے تھے، کسی نے نزول کی ترتیب سے، کسی نے لوحِ محفوظ کی ترتیب سے، کسی نے حاشیہ میں کچھ تفسیری کلمات بھی لکھ رکھے تھے اس سے اختلاف پیدا ہوا۔ چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جنگ آرمینیہ وغیرہ سے لوٹ کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ اس سے پہلے کہ امت قرآن میں مختلف ہو جائے آپ اس کی خبر لیں، چنانچہ حضرت عثمانؓ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بنائی اور ان کو لغت قریش کے مطابق چند مصاحف تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس کمیٹی نے پانچ مصاحف تیار کئے، ایک مصحف حضرت عثمانؓ نے اپنے پاس مدینہ منورہ میں رکھا اور باقی مصحف مختلف شہروں میں بھیج دیئے اور حکم بھیجا کہ مسلمان اسی سے نقلیں لیں، نیز یہ بھی حکم بھیجا کہ لوگوں نے جو مختلف قرآن لکھے ہیں وہ پایۂ تخت کو بھیج دیئے جائیں، جب سب قرآن آ گئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو جلوا دیا۔ اس طرح حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو موجودہ قرآن پر جمع کر دیا۔

حضرت عثمانؓ نے جو قرآن لکھ کر بھیجے تھے یہی مکاتبہ ہے۔ اور جب یہ مکاتبہ قرآن کے حق میں معتبر ہے تو حدیثوں کے حق میں بدرجۂ اولیٰ معتبر ہے۔

قوله: رأى عبدُ الله: عبداللہ بن عمر عمری، یحییٰ بن سعید انصاری اور امام مالک رحمہم اللہ نے مکاتبہ کو جائز قرار دیا ہے۔ یہاں عبداللہ بن عمر سے کون مراد ہے؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر صحابی رسول مراد ہیں، مگر ان سے اس سلسلہ میں کوئی روایت مروی نہیں۔ ایک اور عبداللہ بن عمر ہیں جو عمری کہلاتے ہیں، یہ دو بھائی تھے: عبداللہ بن عمر عمری اور عبید اللہ بن عمر عمری۔ عبید اللہ حدیث شریف کے بہت مضبوط راوی ہیں، اور عبداللہ ذرا کمزور ہیں۔ یہ دونوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عاصم کے پوتے ہیں، علامہ عینی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہاں یہی عبداللہ عمری مراد ہیں، اور حافظؒ کی رائے یہ ہے کہ ابن عمرؓ مراد ہیں، علماء نے علامہ عینی کی رائے کو ترجیح دی ہے، حافظ ابن حجرؒ کا اعتراض یہ ہے کہ حضرت یحییٰ بن سعید اور امام مالک بڑے درجہ کے محدث وفقیہ ہیں اور عبداللہ عمری اس درجہ کے نہیں، پھر ان کا نام پہلے کیوں آیا؟ پس ماننا چاہیے کہ یہ ابن عمر صحابی رسول ہیں اسی لئے پہلے نام آیا ہے، مگر یہ کوئی زیادہ مضبوط دلیل نہیں۔ عبداللہ بن عمر عمری بھی فقیہ ہیں اور ناموں میں ان سب باتوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے، اس لئے حافظ صاحبؒ کا اعتراض زیادہ وزنی نہیں۔

قوله: وَاحْتَجَّ بَعْضُ أَهْلِ الْحِجَازِ: محدث حمیدی رحمہ اللہ نے مناولہ کے جواز پر ایک حدیث سے استدلال کیا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ نبی پاک ﷺ نے آٹھ آدمیوں پر مشتمل ایک سریہ روانہ فرمایا، اور امیر لشکر عبداللہ بن جحشؓ کو ایک خط دیا، اور ہدایت کی کہ مکہ کے راستہ پر چلو، دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد خط کھول کر ساتھیوں کو سنانا، پھر اگر کوئی ساتھی واپس لوٹنا چاہے تو اس کو واپس بھیج دینا، چنانچہ سریہ روانہ ہوا، اور دو دن کے بعد خط کھول کر پڑھا گیا اس میں لکھا تھا کہ تمہیں طائف اور مکہ کے درمیانی علاقہ میں ٹھہرنا ہے اور مکہ والوں کی نقل وحرکت پر نظر رکھنی ہے اور ہمیں مطلع

کرتے رہنا ہے، یہ جنگ بدر سے پہلے کا واقعہ ہے، مکہ والے جنگ کی تیاریاں کر رہے تھے اس لئے حضور ﷺ نے ان کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے کے لئے آٹھ آدمیوں کا یہ سریہ روانہ کیا تھا۔ یہی مناولہ ہے اور اس کو مکاتبہ بھی کہہ سکتے ہیں، معلوم ہوا کہ مناولہ اور مکاتبہ معتبر ہے۔ اور حمیدی رحمہ اللہ نے اس حدیث سے جو استدلال کیا ہے وہ درست ہے مگر اس استدلال میں ایک کمزوری ہے کہ یہاں حدیث روایت کرنے کا کوئی مسئلہ نہیں، یہ تو امیر لشکر کو ان کے مفوضہ کام سے متعلق ایک تحریر دی ہے پس اس کو مناولہ اور مکاتبہ کے معروف معنی میں نہیں لے سکتے۔

سوال: آنحضور ﷺ نے سریہ کو اسی وقت کیوں نہیں بتا دیا کہ تمہیں فلاں جگہ پر اور فلاں کام پر جانا ہے؟

جواب: بعض حضرات نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اگر اسی وقت یہ بات بتا دی جاتی تو شاید بعض حضرات اس خطرناک مہم پر جانے میں پس وپیش کرتے، لیکن جب نکل کھڑے ہوئے اور دو دن کی مسافت طے کر چکے تو اب ہمت کر کے آگے بڑھتے رہیں گے۔

مگر میرے نزدیک یہ جواب صحیح نہیں۔ اس لئے کہ وہ صحابہ تھے، اسلام کے لئے کسی بھی قربانی سے پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے، وہ اسلام کے سچے اور پکے سپاہی تھے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ بات آوٹ نہ ہو جائے اور مکہ والوں تک اس کی خبر نہ پہنچ جائے۔ اگر روانہ ہونے سے پہلے ہی بتا دیا جاتا تو کوئی نہ کوئی اپنے گھر والوں سے اس کا تذکرہ کر دیتا، پس بات آوٹ ہو جاتی اور خبر مکہ تک پہنچ جاتی، اس مصلحت سے آپؐ نے اس وقت نہیں بتایا، بلکہ مہر بند خط دیا اور دو دن کی مسافت طے کر لینے کے بعد پڑھنے کا حکم دیا، اب بات لیک ہونے کا احتمال نہیں رہا۔

حدیث: صلح حدیبیہ کے بعد نبی ﷺ نے شاہانِ عجم کے نام جو دعوتی خطوط روانہ فرمائے تھے ان میں ایک خط ایران کے بادشاہ کسریٰ کے نام بھی تھا، حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کو یہ والا نامہ دے کر روانہ فرمایا تھا اور یہ ہدایت دی تھی کہ یہ خط بحرین کے گورنر مُنذر کو دیدینا اور اس سے کسریٰ تک پہنچانے کی درخواست کرنا۔ چنانچہ بحرین کے گورنر نے وہ والا نامہ کسریٰ تک پہنچایا، کسریٰ کے دربار میں وہ خط پڑھا گیا جب اس نے آنحضور ﷺ کا نام اپنے نام سے پہلے دیکھا تو آگ بگولہ ہو گیا اور خط لے کر چاک کر دیا۔ درحقیقت وہ اُن تین واقعات سے بوکھلایا ہوا تھا جو اس والا نامہ کے پہنچنے سے پہلے پیش آئے تھے، ایک واقعہ تو یہ پیش آیا تھا کہ فارس کا آتش کدہ جو ایک ہزار سال سے جل رہا تھا ایک دن اچانک بجھ گیا، اور یہ ان کے اعتقاد میں بڑی نحوست کی بات تھی، اور دو خواب تھے، ایک خواب تو خود بادشاہ نے دیکھا تھا کہ اس کے محل کی چودہ برجیاں گر پڑیں، اور دوسرا خواب موبذان نے دیکھا تھا کہ عرب کی طرف سے اونٹ آرہے ہیں اور وہ ایران کے گھوڑوں کو دباتے جا رہے ہیں، اور دریائے دجلہ سے پار ہو کر تمام ممالک میں پھیل گئے ہیں۔ ان واقعات کی وجہ سے وہ پریشان تھا۔ اسی دوران آنحضور ﷺ کا والا نامہ پہنچا، اس میں آپؐ کا نام نامی پہلے دیکھ کر کسریٰ کا پارہ چڑھ گیا اور اس نے والا نامہ کو پھاڑ دیا اور زمین پر پھینک دیا، آنحضور ﷺ کو جب اس کی خبر ہوئی تو

آپؐ نے فرمایا: ”جس طرح اس نے میرا خط پھاڑا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ اس کے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کردیں!“ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بادشاہ نے جو خواب دیکھا تھا کہ محل کی چودہ برجیاں گر گئی ہیں اس کی تعبیر یہ تھی کہ چودہ بادشاہوں تک ایران کی حکومت رہے گی، پھر ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایران مکمل فتح ہو گیا۔

استدلال: امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جو والا نامہ بھیجا تھا وہی مکاتبہ ہے، اگر مکاتبہ معتبر نہیں تو پھر والا نامہ بھیجنے کا کیا فائدہ؟ پس ثابت ہوا کہ مکاتبہ معتبر ہے اور اسی کے حکم میں مناولہ ہے۔

[٦٤-] حدثنا إِسْمَاعِيْلُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ إِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ، عَنْ صَالِحٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ: أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بَعَثَ بِكِتَابِهِ رَجُلًا، وَأَمَرَهُ أَنْ يَدْفَعَهُ إِلَى عَظِيْمِ الْبَحْرَيْنِ، فَدَفَعَهُ عَظِيْمُ الْبَحْرَيْنِ إِلَى كِسْرَى، فَلَمَّا قَرَأَهُ مَزَّقَهُ، فَحَسِبْتُ أَنَّ ابْنَ الْمُسَيَّبِ قَالَ: فَدَعَا عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم أَنْ يُمَزَّقُوْا كُلَّ مُمَزَّقٍ. [انظر: ٢٩٣٩، ٤٤٢٤، ٧٢٦٤]

[٦٥-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ مُقَاتِلٍ أَبُو الْحَسَنِ، قَالَ: ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ، قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ، عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ أَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ، قَالَ: كَتَبَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم كِتَابًا، أَوْ: أَرَادَ أَنْ يَكْتُبَ، فَقِيْلَ لَهُ: إِنَّهُمْ لَا يَقْرَؤُوْنَ كِتَابًا إِلَّا مَخْتُوْمًا، فَاتَّخَذَ خَاتَمًا مِنْ فِضَّةٍ، نَقْشُهُ: مُحَمَّدٌ رسولُ اللّٰهِ، كَأَنِّيْ أَنْظُرُ إِلَى بَيَاضِهِ فِيْ يَدِهِ، فَقُلْتُ لِقَتَادَةَ: مَنْ قَالَ: نَقْشُهُ مُحَمَّدٌ رسولُ اللّٰهِ؟ قَالَ: أَنَسٌ.

[انظر: ٢٩٣٨، ٥٨٧٠، ٥٨٧٢، ٥٨٧٤، ٥٨٧٥، ٥٨٧٧، ٧١٦٢]

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص (عبد اللہ بن حذافہ سہمیؓ) کو خط دے کر روانہ فرمایا، اور ان کو حکم دیا کہ وہ والا نامہ بحرین کے گورنر (منذر بن ساوی) کو دیدیں، چنانچہ بحرین کے گورنر نے وہ والا نامہ کسریٰ تک پہنچایا، جب کسریٰ نے اس کو پڑھا تو اس کو پھاڑ دیا۔ ابن شہاب زہری کہتے ہیں: میرا خیال ہے کہ ابن المسیبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایرانیوں کے لئے بددعا فرمائی کہ ان کا ملک پوری طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔

تشریح:

حضرت سعید رحمہ اللہ مدینہ کے فقہائے سبعہ میں سے ہیں ان کے والد کا نام مسیّب ہے، اس کو اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں۔ مُسَیِّب: اسم فاعل کے معنی ہیں: بتوں کے نام پر جانور چھوڑنے والا۔ اور اسم مفعول کے معنی ہیں: بتوں کے نام پر چھوڑا ہوا۔ اور حضرت سعید کے دادا کا نام حَزْن (غم) تھا وہ صحابی ہیں، آنحضور ﷺ نے ان

کا نام سہل رکھا تھا مگر انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے اپنے ماں باپ کا رکھا ہوا نام پسند ہے، آپؐ نے فرمایا: تم جانو! حضرت سعیدؒ فرماتے ہیں: دادا کے نام کا اثر آج بھی خاندان میں موجود ہے، غرض ممکن ہے حزن رضی اللہ عنہ نے زمانۂ جاہلیت میں بتوں کی منت مانی ہو اور بیٹے کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا ہو اس لئے ان کا نام مسیَّب (اسم مفعول) پڑ گیا ہو۔

دوسری حدیث کا ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے ایک خط لکھا یا فرمایا: خط لکھنے کا ارادہ کیا تو آپؐ سے عرض کیا گیا کہ عجمی لوگ مہر کے بغیر خط قبول نہیں کرتے، چنانچہ آپؐ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس پر محمد رسول اللہ کندہ کرایا، گویا میں اس کی چمک اب بھی آپ کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں، یعنی وہ منظر اب بھی نگاہوں کے سامنے ہے۔ شعبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے اپنے استاذ حضرت قتادہؒ سے پوچھا: نقشُه محمدٌ رسولُ اللّٰہِ: یہ جملہ کس کا ہے؟ پوچھنا اس لئے پڑا کہ قتادہ رحمہ اللہ تدلیس کرتے تھے اور عام طور پر اس روایت میں یہ جملہ نہیں، اس لئے حضرت شعبہ نے خیال کیا کہ شاید قتادہ رحمہ اللہ نے یہ جملہ کسی اور سے سنا ہوگا، اس لئے پوچھا۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ جملہ بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کا ہے ــــــ قال أنسٌ سے پہلے ایک قال پوشیدہ ہے أی قال: قال أنس، اور اگر پوشیدہ نہ مانیں تو پھر قال کا فاعل قتادہ ہونگے، اور أنسٌ: من قال کا جواب ہوگا۔

بابُ مَنْ قَعَدَ حَيْثُ يَنْتَهِي بِهِ الْمَجْلِسُ، وَمَنْ رَأَى فُرْجَةً فِي الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيْهَا

بعد میں آنے والا پیچھے بیٹھے، البتہ آگے جگہ ہو تو بڑھ سکتا ہے

اگر درسگاہ میں طلبہ نے آگے جگہ چھوڑ رکھی ہے تو بعد میں آنے والا آگے بڑھ سکتا ہے، اور آگے جگہ نہ ہو تو مجلس کے آخر میں بیٹھ جانا چاہئے، سبق چھوڑ کر چلا جانا محرومی کی بات ہے، ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

حدیث: یہاں مختصر آئی ہے پورا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ نبی پاک ﷺ کی مجلس ہو رہی تھی، تین شخص آئے، مجلس میں صرف ایک آدمی کی جگہ تھی چنانچہ ایک آدمی آگے بڑھا اور مجلس میں بیٹھ گیا، اور دو چل دیئے، کچھ دور جا کر ان میں سے ایک لوٹ آیا، اور مجلس میں پیچھے بیٹھ گیا، دوسرا واپس نہیں آیا، آنحضور ﷺ نے یہ منظر دیکھا، جب مجلس ختم ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: کیا میں تمہیں ان تین آدمیوں کا حال بتاؤں؟ ایک نے اللہ کی طرف ٹھکانہ پکڑا تو اللہ نے اس کو ٹھکانہ دیا، یعنی وہ اللہ کا اچھا بندہ ہے۔ اور دوسرا شرمایا پس اللہ بھی شرمائے یعنی اس کی غلطی نظر انداز کر دی اور تیسرے نے اعراض کیا تو اللہ نے بھی اس سے اعراض کیا یعنی وہ علم سے محروم رہا۔

[۸-] بابُ مَنْ قَعَدَ حَيْثُ يَنْتَهِي بِهِ الْمَجْلِسُ، وَمَنْ رَأَى فُرْجَةً فِي الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيْهَا

[٦٦-] حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيْلُ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ، عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِيْ طَلْحَةَ: أَنَّ أَبَا مُرَّةَ مَوْلَى

عَقِيْلِ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ، أَخْبَرَهُ، عَنْ أَبِيْ وَاقِدِ اللَّيْثِيِّ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بَيْنَمَا هُوَ جَالِسٌ فِيْ الْمَسْجِدِ، وَالنَّاسُ مَعَهُ، إِذْ أَقْبَلَ ثَلاَثَةُ نَفَرٍ، فَأَقْبَلَ اثْنَانِ إِلٰى رَسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، وَذَهَبَ وَاحِدٌ، قَالَ: فَوَقَفَا عَلٰى رَسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَرَأَى فُرْجَةً فِيْ الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيْهَا، وَأَمَّا الآخَرُ فَجَلَسَ خَلْفَهُمْ، وَأَمَّا الثَّالِثُ فَأَدْبَرَ ذَاهِبًا، فَلَمَّا فَرَغَ رَسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ: " أَلاَ أُخْبِرُكُمْ عَنِ النَّفَرِ الثَّلاَثَةِ: أَمَّا أَحَدُهُمْ فَأَوَى إِلَى اللّٰهِ فَآوَاهُ اللّٰهُ، وَأَمَّا الآخَرُ فَاسْتَحْيَا فَاسْتَحْيَا اللّٰهُ مِنْهُ، وَأَمَّا الآخَرُ فَأَعْرَضَ فَأَعْرَضَ اللّٰهُ عَنْهُ" [انظر: ٤٧٤]

ترجمہ: ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: دریں اثنا کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں بیٹھے تھے اور لوگ آپؐ کے پاس تھے کہ تین شخص آئے پس دو رسول اللہ ﷺ کے پاس آگئے یعنی مجلس میں بیٹھ گئے اور ایک چلا گیا۔ راوی کہتا ہے: وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی مجلس کے پاس ٹھہرے، پھر ان میں سے ایک نے حلقہ میں کشادگی دیکھی تو وہ آگے بڑھ کر بیٹھ گیا، اور دوسرا پیچھے بیٹھا، اور تیسرا چلا گیا، جب رسول اللہ ﷺ فارغ ہوئے تو آپؐ نے فرمایا: کیا میں تمہیں ان تینوں کی حالت نہ بتلاؤں؟ ان میں سے ایک نے اللہ کی طرف ٹھکانہ پکڑا، پس اللہ نے اس کو ٹھکانہ دیا، اور دوسرا شرمایا تو اللہ اس سے شرمائے یعنی اسے بھی علم سے نواز دیا، اور تیسرے نے اعراض کیا تو اللہ نے بھی اس سے اعراض کیا۔

بابُ قَوْلِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: " رُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ"

کبھی حدیث پہنچایا ہوا سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے

رُبَّ: تقلیل کے لئے بھی آتا ہے اور تکثیر کے لئے بھی، پھر کبھی اس کے ساتھ ما ملاتے ہیں اس صورت میں رُبّ مشدد بھی ہوتا ہے اور مخفف بھی۔ اور ما کے بغیر صرف مشدد ہوتا ہے۔ یہاں رُبّ تقلیل کے لئے ہے۔ اور یہ باب لاکر حضرت رحمہ اللہ نے طلبہ کو نصیحت فرمائی ہے کہ پڑھ کر پڑھاؤ، جو پڑھا ہے اس کو لے کر بیٹھے نہ رہو، اگر ایسا نہیں کروگے تو علم ضائع ہوجائے گا۔ بعض مرتبہ طالب علم کا حافظ کمزور ہوتا ہے وہ پڑھا ہوا بھول جاتا ہے اور علم ضائع ہوجاتا ہے۔ اور اگر علم آگے بڑھا دیا جائے گا تو ہوسکتا ہے اس کا شاگرد اس سے مضبوط حافظہ والا ہو، پس علم ضائع نہ ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کبھی مُبلَّغ یعنی جس کو حدیث پہنچائی گئی ہے حدیث سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے'' یعنی علم کو آگے بڑھانے کے بے شمار فائدے ہیں، ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ علم محفوظ ہوجاتا ہے، ضائع نہیں ہوتا۔

علم میں بخیلی ایک قدیم مزاج رہا ہے، کیونکہ ہر نفیس چیز میں آدمی بخیلی کرتا ہے، اور علم سے زیادہ نفیس چیز کوئی نہیں، اس لئے علم کے سلسلہ میں بخیلی کرنا عام مزاج رہا ہے، فن طب میں ایک رسالہ قبریہ ہے، کہتے ہیں: اس کا نام رسالہ قبریہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ ایک حکیم نے اس میں نبض کی تفصیلات لکھی تھیں اور زندگی بھر کسی کو اس رسالہ کی ہوا نہیں لگنے دی،

بلکہ مرتے وقت وصیت کی کہ یہ رسالہ میرے ساتھ دفن کیا جائے، چنانچہ اس رسالہ کو اس کے ساتھ دفن کر دیا گیا مگر ایک آدمی جانتا تھا اس نے قبر کھول کر وہ رسالہ نکال لیا اس لئے وہ رسالہ قبریہ کہلایا۔

غرض علم کے سلسلہ میں بخیلی برتنا ایک قدیم بیماری ہے، لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ اگر علم خرچ کیا جائے گا تو خزانہ خالی ہو جائے گا، حالانکہ سونے چاندی کے خزانے میں اور علم کے خزانے میں فرق ہے، سونے چاندی کا خزانہ خرچ کرنے سے گھٹتا ہے اور علم کا خزانہ بڑھتا ہے، چنانچہ سب سے پہلے اسلام ہی نے علم سے اجارہ داری ہٹائی، اور علم کو عام کرنے کا حکم دیا، اور فرمایا: اگر تم سے کوئی علمی بات پوچھی جائے اور وہ بات تم جانتے ہو تو اسے بتاؤ ورنہ قیامت کے دن آگ کی لگام پہنائی جائے گی، اسی قبیل کی یہ حدیث بھی ہے، آنحضور ﷺ نے فرمایا: جو بات تم نے مجھ سے سنی ہے اسے اپنی ذات تک مت رکھو، اُسے آگے بڑھاؤ، ہوسکتا ہے جس کو تم حدیث پہنچاؤ اس کا حافظہ تم سے قوی ہو، پس وہ اس کو اچھی طرح محفوظ رکھے گا، اور حدیث ضائع ہونے سے بچ جائے گی۔

[۹-] بابُ قَوْلِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: "رُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ"

[٦٧-] حدثنا مُسَدَّدٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا بِشْرٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ عَوْنٍ، عَنِ ابْنِ سِيْرِيْنَ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِيْ بَكْرَةَ، عَنْ أَبِيْهِ: قَالَ ذَكَرَ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم: قَعَدَ عَلٰى بَعِيْرِهِ، وَأَمْسَكَ إِنْسَانٌ بِخِطَامِهِ أَوْ: بِزِمَامِهِ، ثُمَّ قَالَ: "أَيُّ يَوْمٍ هٰذَا؟" فَسَكَتْنَا حَتّٰى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيُسَمِّيْهِ سِوَى اسْمِهِ، قَالَ: "أَلَيْسَ يَوْمُ النَّحْرِ؟" قُلْنَا: بَلٰى، قَالَ: "فَأَيُّ شَهْرٍ هٰذَا؟" فَسَكَتْنَا حَتّٰى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيُسَمِّيْهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ فَقَالَ: "أَلَيْسَ بِذِي الْحِجَّةِ؟" قُلْنَا: بَلٰى، قَالَ: "فَإِنَّ دِمَاءَ كُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا، فِيْ شَهْرِكُمْ هٰذَا، فِيْ بَلَدِكُمْ هٰذَا، لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ، فَإِنَّ الشَّاهِدَ عَسَى أَنْ يُبَلِّغَ مَنْ هُوَ أَوْعٰى لَهُ مِنْهُ"

[انظر: ١٠٥، ١٧٤١، ٣١٩٧، ٤٤٠٧، ٤٦٦٢، ٥٥٥٠، ٧٠٧٨، ٧٤٤٧]

ترجمہ: یہ حدیث حجۃ الوداع کے موقع کی ہے۔ دس ذی الحجہ میں جو یوم النحر ہے آپؐ نے یہ تقریر فرمائی ہے، آپؐ اونٹنی پر سوار تھے، جلو میں ایک لاکھ سے زیادہ پروانے تھے، حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے اونٹنی کی لگام تھام رکھی تھی، آپؐ نے لوگوں سے پوچھا: بتاؤ آج کونسا دن ہے؟ ابوبکرہؓ کہتے ہیں: ہم خاموش رہے، ہم نے یہ خیال کیا کہ آپؐ اس دن کا کوئی اور نام رکھیں گے، آپؐ نے فرمایا: کیا آج یوم النحر نہیں؟ ہم نے کہا: بیشک، آج یوم النحر ہے، آپؐ نے پھر پوچھا: یہ کونسا مہینہ ہے؟ ہم خاموش رہے، ہم نے خیال کیا کہ آپؐ اس مہینہ کا کوئی اور نام رکھیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا یہ ذی الحجہ نہیں؟ ہم نے کہا: کیوں نہیں! (اور آگے حدیث (نمبر ۱۷۴۱) میں یہ بھی ہے کہ آپؐ نے پوچھا: یہ کونسی جگہ ہے؟ صحابہ خاموش رہے، آپؐ نے فرمایا: کیا یہ محترم شہر مکہ مکرمہ نہیں؟ صحابہ نے کہا: کیوں نہیں؟) پھر آپؐ نے فرمایا: "بیشک

تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبرو، تمہارے درمیان ایک دوسرے پر حرام ہیں اس دن، اس مہینے اور اس جگہ کی حرمت کی طرح'' پھر آپؐ نے فرمایا: ''چاہئے کہ پہنچائے حاضر غائب کو، اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ پہنچائے اس شخص کو جو اس سے زیادہ یاد رکھنے والا ہے''

قوله: قال: ذكر النبي صلى الله عليه وسلم: یہ جملہ کچھ بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے، اصل بات یہ ہے کہ ایک مجلس میں حضرت ابوبکرہؓ نے کئی حدیثیں بیان کی ان میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے۔ عبدالرحمٰن کہتے ہیں: ابا نے نبی ﷺ کا ذکر کیا یعنی مرفوع حدیثیں بیان کیں ان میں سے آنے والی حدیث بھی ہے، پس یہ مستقل جملہ ہے۔

اور اونٹنی کی لگام خود حضرت ابوبکرہؓ نے تھام رکھی تھی، مگر راوی کبھی خود کو غائب کر دیتا ہے...... اور **خطام** اور **زِمام**: ہم معنی ہیں، اور بعض لوگوں نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ اونٹ کی ناک میں جو ڈنڈی ہوتی ہے وہ خطام ہے اور اس میں جو رسّی بندھی ہوتی ہے وہ زمام ہے۔

اور غائبین سے مراد وہ حضرات ہیں جو اس سال حج میں نہیں آئے، اور وہ بھی مراد ہوسکتے ہیں جو حج میں آئے ہیں، مگر مجلس میں موجود نہیں۔

بابٌ: العِلْمُ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ

قول وعمل سے پہلے علم حاصل کرنا چاہئے

گذشتہ باب تھا کہ علم حاصل کر کے دوسروں تک پہنچاؤ، اس سے علم محفوظ رہے گا، اب یہ باب ہے کہ پہلے علم حاصل کرو، پھر دوسروں تک پہنچاؤ اور خود بھی اس پر عمل کرو۔ یہاں قول سے مراد تبلیغ ہے یعنی دوسروں تک علم پہنچاؤ، اگر خود ٹھیک سے علم حاصل نہیں کیا تو دوسروں تک کیا پہنچائے گا اور کس طرح عمل کرے گا؟

کتاب العلم کے شروع میں میں نے بتایا تھا کہ علم کی دو قسمیں ہیں: وہبی (فطری) اور کسبی۔ وہبی علم ایمان سے مقدم ہے، اسی لئے مجنون اور بچے ایمان کے مکلّف نہیں، کیونکہ ان کو فطری علم حاصل نہیں اور اکتسابی علم وہ ہے جو بندہ خود حاصل کرتا ہے، یہ ایمان سے مؤخر ہے، آدمی پہلے ایمان لاتا ہے، پھر علم دین حاصل کرتا ہے، اگر ایمان ہی نہیں لایا تو علم دین کیوں حاصل کرے گا؟ جو واقعی مؤمن ہے وہی علم دین حاصل کرتا ہے، غرض یہاں اکتسابی علم مراد ہے، اس لئے اس کو ایمان سے مؤخر کیا ہے، اور اس باب کا مقصد یہ ہے کہ تبلیغ سے پہلے علم حاصل کرنا ضروری ہے۔

دلائل:

۱- سورۂ محمد کی آیت (۱۹) ہے: ﴿فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ﴾: پس جان لے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس میں علم کا ذکر پہلے ہے، اور لا إلٰه إلا الله جو قول ہے اس کا ذکر بعد میں ہے، پس معلوم ہوا کہ علم: قول وعمل سے پہلے ہے۔

۲- ابوداؤد اور ترمذی کی حدیث ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں'' (مبتدا ءخبر کے درمیان ضمیر فصل حصر کے لئے آئی ہے) انبیاء نے ان کو علم کا وارث بنایا ہے۔ پس جس نے علم دین حاصل کیا اس نے انبیاء کی میراث وافر مقدار میں حاصل کی۔

علماء کو میراث میں جو علم ملا ہے وہ علم اکتسابی ہے، پس پہلے علم حاصل کرے پھر تبلیغ کرے اور اس پر عمل کرے، علم حاصل کئے بغیر کیسے تبلیغ کرے گا؟ اور کیسے عمل کرے گا؟ معلوم ہوا کہ پہلے علم ہے پھر قول وعمل ہے۔

۳- مسلم شریف کی حدیث ہے: نبی ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی ایسے راستہ پر چلا جس پر چلنے کے ذریعہ (ضمیر کا مرجع سلوک ہے جو سَلَكَ سے نکلتا ہے) علم حاصل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دیتے ہیں، یہ طلب علم کی فضیلت ہے، اور طلب علم کی یہ فضیلت اس لئے ہے کہ جب وہ علم حاصل کرے گا تو خود بھی اس پر عمل کرے گا اور دوسروں کو بھی عمل کرائے گا، اور یہ دونوں باتیں جنت میں جانے کا سبب ہیں، اور سبب کا سبب بھی سبب ہوتا ہے، پس عمل موقوف ہوا علم پر، اور علم موقوف ہے تحصیل علم پر، اسی طرح تبلیغ موقوف ہے علم پر، اور علم موقوف ہے تحصیل علم پر۔ پس جو فضیلت علم کی ہے وہی فضیلت تحصیل علم کی بھی ہے۔

۴- سورۂ فاطر کی آیت ۲۸ ہے: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ یعنی اللہ سے اس کے بندوں میں سے اللہ کی معرفت رکھنے والے بندے ہی ڈرتے ہیں، یہاں علماء لغوی معنی میں ہے، عرفی معنی میں نہیں، یعنی جو بھی بندے اللہ کی معرفت رکھتے ہیں، اللہ کو پہچانتے ہیں وہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں، اور جو اللہ تعالیٰ کو نہ جانتے ہیں نہ پہچانتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے کیوں ڈریں گے؟

مثال: میں کبھی راستے میں چل رہا ہوتا ہوں، سامنے سے دو طالب علم آتے ہیں، جب ان کی نظر مجھ پر پڑتی ہے تو ان کی چال بدل جاتی ہے، وہ احترام کے ساتھ سلام کر کے گذرتے ہیں، اور ایک اور شخص ہے جو کوٹ پتلون پہن کر سگریٹ پیتا ہوا آرہا ہے، وہ بھی مجھے دیکھتا ہے، اس کی چال میں کوئی فرق نہیں آتا، وہ میرے کندھے سے کندھا ٹکرا کر چلتا ہے اور سگریٹ کا دھواں میرے منہ پر چھوڑتا ہے، یہ فرق کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ طالب علم جانتے ہیں کہ میں استاذ ہوں، اور وہ کوٹ پتلون والا نہیں جانتا کہ میں کون ہوں؟ اس لئے وہ کوئی احترام نہیں کرتا۔

اس مثال سے سمجھنا چاہئے کہ جن کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے، جو اللہ کو جانتے ہیں وہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں، یعنی اللہ کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں اور جو اللہ کو نہیں جانتے، ان کا مقام ومرتبہ نہیں پہچانتے وہ اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

اور امام بخاری رحمہ اللہ کا اس آیت سے استدلال اس طرح ہے کہ علم مقدم ہے اور خشیت مؤخر، خشیت کے معنی ہیں: اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے سے ڈرنا، یہ قلب کا ایک عمل ہے، اور خشیت اسی میں ہوتی ہے جس کو اللہ کی معرفت

حاصل ہوتی ہے، وہی اللہ کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں۔ پس علم مقدم ہوا اور اطاعت یعنی عمل مؤخر ہوا، اور یہی باب کا مقصد ہے۔

۵- سورۂ عنکبوت کی آیت ۴۳ ہے: ﴿وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُوْنَ﴾: اور ان مثالوں کو بس علم والے ہی سمجھتے ہیں۔ اس سے اوپر اللہ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے: جو شخص اللہ کے علاوہ کسی کو حمایتی بناتا ہے اس کی مثال مکڑی کے جالے کی سی ہے جو ہلکے سے اشارے سے ٹوٹ جاتا ہے، حالانکہ حامی اور مددگار ایسا ہونا چاہئے جو آڑے وقت میں کام آئے۔ پھر فرمایا: ﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ﴾: ہم یہ مثالیں لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ ہوش کے ناخن لیں۔ ﴿وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُوْنَ﴾ مگر ان مثالوں کو جاننے والے ہی بوجھتے ہیں۔ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بیان کئے ہوئے مضامین کو سمجھنے کے لئے عقل وفہم یعنی علم ضروری ہے، معلوم ہوا کہ علم عمل سے مقدم ہے۔

۶- سورۃ الملک کی آیت (۱۰) ہے کہ قیامت کے دن جہنمی کہیں گے: اگر ہم نے دنیا میں انبیاء کی باتیں سنی ہوتیں اور سمجھی ہوتیں تو آج ہمیں دوزخ کا منہ دیکھنا نہ پڑتا، معلوم ہوا کہ دین پر عمل علم پر موقوف ہے۔ یہی باب کا مدعیٰ ہے۔

۷- سورۃ الزمر کی آیت (۹) میں اللہ پاک نے ایک سوال کیا ہے: بتاؤ! جو لوگ دین کی بات جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے وہ برابر ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے برابر نہیں ہو سکتے، جو دین کی بات جانتا ہے وہ دین پر عمل کرے گا اور دین دوسروں تک پہنچائے گا اور جو جانتا نہیں وہ کیا عمل کرے گا اور کیا پہنچائے گا؟ پس ثابت ہوا کہ قول وعمل سے پہلے علم ضروری ہے۔

۸- چند ابواب کے بعد حدیث آرہی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو جس کے ساتھ خیر منظور ہوتی ہے اس کو اللہ تعالیٰ دین کا فہم عطا فرماتے ہیں۔

واقعہ: امام محمد رحمہ اللہ کی سوانح میں ایک واقعہ لکھا ہے: جب آپ کا انتقال ہوا تو کسی نے آپ کو خواب میں دیکھا۔ اس نے پوچھا: پس مرگ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا: فرشتوں نے مجھے اللہ کے دربار میں پیش کیا، اللہ نے مجھ سے فرمایا: محمد! اگر مجھے تیرے ساتھ خیر منظور نہ ہوتی تو میں تجھے اپنے دین کا فہم عطا نہ فرماتا! پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو جنت میں لے جاؤ! اس واقعہ کی روشنی میں حدیث کو سمجھو! جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو خیر منظور ہوتی ہے اس کو اللہ تعالیٰ دین کی سمجھ بوجھ عطا فرماتے ہیں، اور جب دین کی سمجھ بوجھ حاصل ہوگئی تو وہ خود بھی عمل کرے گا اور دوسروں کو بھی پہنچائے گا۔ پس قول وعمل بعد میں ہوئے اور دین کی سمجھ سوجھ پہلے ہوئی، یہی اکتسابی علم ہے جو مقدم ہے، پس مدعیٰ ثابت ہوگیا۔

۹- طبرانی میں روایت ہے: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إنما العلم بالتعلم: علم سیکھنے ہی سے آتا ہے (إنما حصر کے لئے ہے) علم خود بخود نہیں آجاتا، معلوم ہوا کہ سیکھنا یعنی علم حاصل کرنا

مقدم ہے اور قول وعمل مؤخر۔

۱۰- حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ شام میں تھے، وہ یہ فتوی دیتے تھے کہ دراہم ودنانیر کو جمع کر کے رکھنا جائز نہیں، اور دلیل میں سورۂ توبہ کی آیت (۳۴) پیش کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں، اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے!'' شام کے گورنر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے، وہ فرماتے تھے: یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں ہے، مگر حضرت ابوذرؓ نہیں مانتے تھے، وہ فرماتے تھے کہ آیت اہل کتاب کے ساتھ خاص نہیں، عام ہے، مسلمان بھی اس کا مصداق ہیں۔

جب حضرت ابوذرؓ یہ مسئلہ بیان کرتے تو لوگوں میں ہیجان ہوتا، کیونکہ مالدار ہمیشہ کم ہوتے ہیں، غریبوں کی کثرت ہوتی ہے، غرباء جہاں کسی مالدار کو دیکھتے، زور سے یہ آیت پڑھتے، مالدار حضرت معاویہؓ سے شکایت کرتے۔ حضرت معاویہؓ سمجھاتے، مگر حضرت ابوذرؓ نہیں مانتے تھے، ان کا مقام حضرت معاویہؓ سے بلند تھا، اس لئے وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خط لکھا۔ اور ساری صورتِ حال بیان کی۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ کو اپنے پاس بلالیا، چنانچہ وہ مدینہ منورہ آگئے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کعب احبار کو تیار کیا تھا کہ جب حضرت ابوذرؓ آئیں تو تم ان سے گفتگو کرنا، کعب احبار تابعی ہیں، حضرت ابوبکر یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اسلام لائے ہیں۔ وہ ذی علم آدمی تھے۔ جب حضرت ابوذرؓ آئے تو انھوں نے مسئلہ چھیڑا، پوچھا: حضرت! دنانیر ودراہم جمع کرنے کا کیا حکم ہے؟ حضرت ابوذرؓ نے جواب دیا: جائز نہیں اور آیت پڑھی: ﴿وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّةَ﴾ کعب احبارؒ نے کہا: حضرت! جب دنانیر ودراہم کو جمع کر کے نہیں رکھ سکتے تو پھر شریعت نے زکوٰۃ کس چیز میں فرض کی ہے؟ زکوٰۃ حولانِ حول کے بعد فرض ہوتی ہے، سونا چاندی سال بھر تک باقی رہیں تب زکوٰۃ فرض ہوگی؟ اس سوال کا حضرت ابوذرؓ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، وہ ڈنڈا لے کر کھڑے ہوئے، اور کعب احبارؒ کو مارنے کے لئے دوڑے، کعب احبار حضرت عثمانؓ کے گرد گھوم رہے تھے اور حضرت ابوذرؓ ان کے پیچھے دوڑ رہے تھے، بالآخر ڈنڈا مار ہی دیا آدھا کعب کو لگا اور آدھا حضرت عثمانؓ کو۔

جب حضرت عثمانؓ نے دیکھا کہ ان کو قائل کرنا مشکل ہے تو حکم دیا کہ آپ ربذہ میں رہیں (یہ مدینہ منورہ سے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے) تاکہ مجھے کوئی مسئلہ پوچھنا ہو یا کوئی مشورہ کرنا ہو تو آسانی سے آپ کو بلا سکوں، چنانچہ وہ امیر المؤمنین کے حکم سے ربذہ چلے گئے۔ اور باقی زندگی وہیں رہے۔

حضرت عثمانؓ نے ان کو فتوی دینے سے روک دیا تھا۔ اسی زمانہ کا قصہ ہے: حضرت ابوذرؓ حج کے لئے گئے، اور رمی جمرات سے فارغ ہو کر ایک طرف کھڑے ہو گئے اور یہی مسئلہ بیان کرنا شروع کیا، کسی نے ان کو یاد دلایا کہ آپ کو امیر المؤمنین نے فتوی دینے سے روک دیا ہے، اس کا حضرت ابوذرؓ نے جو جواب دیا وہ اس روایت میں آیا ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم تلوار اس جگہ رکھ دو، اور اپنی گدی کی طرف اشارہ کیا، پھر میرا خیال یہ ہو کہ میں نافذ کرسکوں گا یعنی بیان کرسکوں گا اس بات کو جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے اس سے پہلے کہ تم مجھ پر تلوار چلا دو تو میں ضرور اس بات کو بیان کروں گا۔ یعنی میں نے جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے اس کو میں ضرور بیان کروں گا، خواہ تم مجھے قتل کردو۔

استدلال: امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال کلمۃً سمعتُھا سے ہے، اس طرح کہ رسول اللہ ﷺ سے سننا یعنی علم حاصل کرنا مقدم ہے اور قول یعنی اس کو بیان کرنا مؤخر ہے۔

۱۱- حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضور ﷺ نے ایک طویل تقریر فرمائی، اس تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ موجود ہیں وہ میری بات غائبین تک پہنچادیں۔

استدلال: حاضرین نے آنحضور ﷺ سے سن کر علم حاصل کیا، اب قول یعنی تبلیغ کا نمبر ہے، معلوم ہوا کہ علم قول سے مقدم ہے۔

۱۲- سورۂ آل عمران کی آیت (۷۹) ہے: ﴿کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ﴾ یہ جمع ہے، اس کا مفرد رَبَّانِیٌّ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رَبَّانِیٌّ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: حکیم بنو، عالم بنو، فقیہ بنو۔ ان تینوں میں ترتیب اس طرح ہے: پہلا مرحلہ عالم بننے کا ہے پھر دوسرا مرحلہ فقیہ بننے کا اور آخری مرحلہ حکیم بننے کا۔

عالم وہ ہے جو دین یعنی مسائل جانتا ہے اور جو شخص مسائل کو ان کی حقیقتوں (دلائل) کے ساتھ جانتا ہے وہ فقیہ ہے، اور جو مسئلہ کی علت بھی جانتا ہے وہ حکیم ہے۔ یہ آخری درجہ ہے اس سے آگے کوئی درجہ نہیں ﴿وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا﴾: جس کو حکمت مل گئی اس کو خیر کثیر مل گئی۔

بہر حال حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: ربانی ہونے کے تین درجے ہیں اور وہ تدریجاً حاصل ہوتے ہیں، پہلے آدمی عالم بنتا ہے، پھر فقیہ اور آخر میں حکیم بنتا ہے۔

استدلال: جب آدمی عالم بنے گا، فقیہ بنے گا، حکیم بنے گا تبھی تبلیغ کرے گا اور عمل کرے گا، معلوم ہوا کہ علم قول وفعل سے مقدم ہے۔

بعض حضرات نے رَبَّانِیّ کے معنی کئے ہیں: طالب علموں کی چھوٹی باتوں کے ذریعہ تربیت کرنا، پھر بڑی باتیں بیان کرنا۔ شروع میں موٹی موٹی باتیں بیان کی جائیں، پھر جب ان کی استعداد پختہ ہوجائے، اور ان میں علوم اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے تب دقیق باتیں بیان کی جائیں، جس شخص میں یہ مہارت ہوتی ہے، اور جو اس طرح طالب علموں کی تربیت کرتا ہے وہ ربانی ہے، اس لئے کہ اگر ابتداء ہی سے طالب علم کے سامنے دقیق مضامین بیان کئے جائیں گے تو اس کے پلے کچھ نہیں پڑے گا، بلکہ وہ بھاگ جائے گا۔

ایک واقعہ: مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کے پاس میرٹھ میں امروہہ کا ایک طالب علم پڑھنے کے لئے آیا، اس کا نام احمد حسن تھا۔ اس نے حضرت سے شمسِ بازغہ شروع کی، حضرت کے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ جب طالب علم عبارت پڑھ لیتا تو حضرت فرماتے: اس مسئلہ میں قاسم کی رائے یہ ہے، کتاب نہیں سمجھاتے تھے، کیونکہ اس زمانہ میں طلبہ کتاب حل کر کے سبق میں آتے تھے، اس لئے جو عبارت پڑھی گئی ہے اس مسئلہ میں حضرت اپنی رائے بیان کرتے، مگر وہ طالب علم کتاب ہی سمجھے ہوئے نہیں ہوتا تھا، قاسم کی رائے اس کے پلّے کیا پڑتی! چنانچہ چند دن کے بعد وہ بھاگ گیا۔ حضرت نے دوسرے طالب علموں سے پوچھا: احمد حسن کہاں ہے؟ طلبہ نے بتایا، وہ گھر چلا گیا، اور جاتے وقت وہ یہ کہہ رہا تھا کہ میری سمجھ میں کتاب ہی نہیں آتی، اور حضرت فرماتے ہیں: قاسم کی رائے یہ ہے، ان کی رائے کو میں کیا سمجھوں؟ حضرت رحمہ اللہ امروہہ تشریف لے گئے اور اس بچہ کو یہ کہہ کر واپس لائے کہ اب کتاب سمجھاؤں گا قاسم کی نہیں سناؤں گا، وہی بچہ بڑا ہو کر حضرت نانوتوی قدس سرہ کے علوم کا وارث بنا۔

غرض طالب علموں کو ابتداء میں موٹی موٹی باتیں بتانی چاہئیں، پھر جب ان کی استعداد پختہ ہو جائے تو دقیق باتیں بیان کرے، جس شخص میں یہ کمال ہوتا ہے وہ ربانی کہلاتا ہے۔ مگر امام بخاریؒ کا استدلال اس تفسیر پر موقوف ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کی ہے، اس لئے یُقال سے حضرت رحمہ اللہ نے دوسرے قول کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے۔

خلاصۂ بحث: اس پورے باب کا حاصل یہ ہے کہ علم: قول وفعل پر مقدم ہے، علم وہبی بھی اور علم اکتسابی بھی، بلکہ علم وہبی تو ایمان پر بھی مقدم ہے، البتہ علم اکتسابی ایمان سے مؤخر ہے۔

[۱۰-] بابٌ: العِلْمُ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ

[۱-] لِقَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ﴿ فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ﴾ [محمد: ۱۹] فَبَدَأَ بِالْعِلْمِ.

[۲-] وَأَنَّ الْعُلَمَاءَ هُمْ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ، وَرَّثُوا الْعِلْمَ، مَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ.

[۳-] وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَطْلُبُ بِهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ طَرِيْقًا إِلَى الْجَنَّةِ.

[٤-] وَقَالَ:﴿ إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ [فاطر: ۲۸]

[٥-] وَقَالَ: ﴿وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُوْنَ﴾ [العنكبوت:٤٣]

[٦-] وَقَالَ:﴿وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْ أَصْحَابِ السَّعِيْرِ﴾[الملك: ۱۰]

[۷-] وَقَالَ:﴿ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [الزمر: ۹]

[۸-] وَقَالَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم: "مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ"

[۹-] وَ"إِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ"

[۱۰-] وَقَالَ أَبُوْ ذَرٍّ: لَوْ وَضَعْتُمُ الصَّمْصَامَةَ عَلٰى هٰذِهِ - وَأَشَارَ إِلٰى قَفَاهُ - ثُمَّ ظَنَنْتُ أَنِّیْ أُنْفِذُ كَلِمَةً سَمِعْتُهَا مِنَ النبیِّ صلی الله علیه وسلم قَبْلَ أَنْ تُجِيزُوْا عَلَیَّ لَأَنْفَذْتُهَا.

[۱۱-] وَقَوْلُ النبیِّ صلی الله علیه وسلم: لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ.

[۱۲-] وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: ﴿كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ﴾ [آل عمران: ۷۹] حُكَمَاءَ، عُلَمَاءَ، فُقَهَاءَ، وَيُقَالُ: الرَّبَّانِیُّ الَّذِیْ يُرَبِّیْ النَّاسَ بِصِغَارِ الْعِلْمِ قَبْلَ كِبَارِهِ.

بابُ مَا كَانَ النَّبِیُّ صلی الله علیه وسلم يَتَخَوَّلُهُمْ بِالْمَوْعِظَةِ وَالْعِلْمِ: كَیْ لَا يَنْفِرُوْا

روز روز نصیحت نہ کی جائے تا کہ لوگ ملول نہ ہوجائیں

تَخَوَّلَ خَالًا (تفعُّل) کے معنی ہیں: ماموں بنانا۔ اور تَخَوَّلَ فلانٌ کے معنی ہیں: دیکھ بھال کرنا، نگرانی کرنا، اور تَخَوَّلَ فُلَانًا بِالْمَوْعِظَةِ کے معنی ہیں: پند ونصیحت کے ذریعہ نگرانی کرنا، نگہداشت کرنا، ذہنی تربیت کرنا.........بالموعظة والعلم: عطف تفسیری ہے، لفظ علم بڑھا کر امام بخاریؒ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہاں صرف دلوں کو نرم کرنے والی باتیں ہی مراد نہیں، بلکہ علمی باتیں بھی مراد ہیں۔ اور کَیْ لَایَنْفِرُوْا: علت ہے یعنی رسول اللہ ﷺ روز روز نصیحت اس لئے نہیں فرماتے تھے کہ صحابہ ملول نہ ہوجائیں، اکتا نہ جائیں۔ بڑے سے بڑا عالم بھی اگر روز وعظ کہے گا تو لوگ اکتا جائیں گے، پھر صحابہ تو اہل وعیال والے اور کام دھندے والے لوگ تھے، اگر حضور ﷺ ہر وقت ان کو لئے رہتے تو دوسرے کام کیسے چلتے! اس لئے آنحضور ﷺ روز روز نصیحت نہیں کرتے تھے، بلکہ گاہ بہ گاہ وعظ فرماتے تھے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اب تک طلبہ کو نصیحت کی تھی اب اساتذہ کو نصیحت کررہے ہیں کہ طلبہ کی ذہنی تربیت کرنی چاہئے، ان کی نگہداشت کرنی چاہئے، ان کو تحصیل علم میں مشغول رکھنا چاہئے، مگر ان پر ناقابل برداشت بوجھ نہیں ڈالنا چاہئے، ورنہ وعظ ونصیحت اور تعلیم وتعلّم کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا، طلبہ تنفر ہوکر بھاگ جائیں گے۔

حدیث (۱): حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی پاک ﷺ گاہ بہ گاہ وعظ ونصیحت کے ذریعہ ہماری نگہداشت فرمایا کرتے تھے۔ ہمارے اکتا جانے کو ناپسند کرتے ہوئے۔

تشریح:

آنحضور ﷺ حضراتِ صحابہ کے نشاط وملال اور حوائج وفراغت کا لحاظ فرما کر تعلیم وتذکیر فرمایا کرتے تھے۔ اس حدیث میں ہمارے لئے یہ سبق ہے کہ نشاط اور فراغت کے اوقات میں تعلیم دینی چاہئے، تا کہ علم کے ساتھ طالبین علم کی

دلچسپی قائم رہے، ہر وقت کی تعلیم طالب علم کو دل برداشتہ کر کے تعلیم سے متنفر کر دے گی۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم وتذکیر میں اگرچہ صحابہ کے اکتا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، مگر اکتانا بہرحال بشریت کا تقاضہ ہے، اس لئے آپ ﷺ نے یہ سنت جاری فرما کر امت کے لئے ایک معتدل راہ تجویز فرما دی، تاکہ مربی حضرات اس کا لحاظ کریں۔

حدیث (۲): حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آسانی کرو، تنگی مت کرو، اور خوشخبری سناؤ، نفرت مت دلاؤ۔

تشریح:

آنحضور ﷺ جب صحابہ کو دعوت کے کام کے لئے یا گورنر بنا کر یا کسی اور مقصد سے کسی علاقہ کی طرف بھیجتے تھے تو خاص طور پر یہ نصیحت فرماتے تھے کہ لوگوں پر آسانی کرنا، ان کو تنگی میں مت ڈالنا، ان کو بشارتیں سنانا، ڈرا کر بدکا نہ دینا۔

جاننا چاہئے کہ صرف بشارتیں بے باکی پیدا کرتی ہیں، آج کل واعظین عام طور پر بشارتیں سناتے ہیں، جب کسی بڑی رات میں یا بڑے دن میں وعظ کہتے ہیں تو بشارتیں ہی بشارتیں سناتے ہیں، اس سے لوگ بے باک ہو جاتے ہیں، وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ بس آج رات عبادت کرلو بیڑا پار ہے۔ اور صرف ڈراوا اللہ کی رحمت سے مایوس کرتا ہے، پس انذار و تبشیر ساتھ ساتھ ہونے چاہئیں، قرآن کریم کا یہی اسلوب ہے جب کسی مناسبت سے کفار کا ذکر آتا ہے اور ان کو دوزخ کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو مؤمنین کو ضرور بشارت سنائی جاتی ہے، اور اگر کہیں مؤمنین کو بشارتیں سنائی جاتی ہیں تو وہاں کفار کو ضرور عذاب سے ڈرایا جاتا ہے، پس بَشِّروا ولا تُنَفِّروا کا یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہئے کہ صرف بشارتیں سناؤ، بلکہ مطلب یہ ہے کہ صرف ڈراؤ نہیں، بلکہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ چلاؤ، تاکہ اعتدال پیدا ہو۔

فائدہ: یہاں بعض شارحین نے ایک اعتراض اٹھایا ہے کہ بَشِّرُوْا کے مقابل لَاتُنْذِرُوْا آنا چاہئے، لَاتُنَفِّرُوْا کیوں آیا؟ پھر بڑی محنت سے جواب دیا ہے، مگر یہ کوئی خاص اعتراض نہیں، کیونکہ تبشیر کا مقابل بے شک انذار ہے، مگر انذار کے لئے تنفیر لازم ہے، پس ملزوم کی جگہ اگر لازم کو ذکر کیا تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے، ایسا تو کیا جاتا ہے۔

[۱۱-] بابُ مَا كَانَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم يَتَخَوَّلُهُمْ بِالْمَوْعِظَةِ وَالْعِلْمِ: كَيْ لاَ يَنْفِرُوْا

[۶۸-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: أَنَا سُفْيَانُ، عَنِ الأَعْمَشِ، عَنْ أَبِيْ وَائِلٍ، عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: كَانَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ فِي الأَيَّامِ، كَرَاهَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا. [انظر: ۷۰، ۶۴۱۱]

[۶۹-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيىَ بْنُ سَعِيْدٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ أَبُوْ التَّيَّاحِ، عَنْ أَنَسٍ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قَالَ: "يَسِّرُوْا وَلاَ تُعَسِّرُوْا، وَبَشِّرُوْا وَلاَ تُنَفِّرُوْا"

[انظر: ۶۱۲۵]

بابُ مَنْ جَعَلَ لِأَهْلِ الْعِلْمِ أَيَّامًا مَعْلُومَةً

تعلیم کے لئے وقت کی تعیین چاہئے

شیخ الہند قدس سرہ نے ابواب بخاری کے سلسلہ میں ایک قاعدہ یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک باب میں متعدد حدیثیں لائی جاسکتی ہیں، ایسی جگہوں میں امام ابوداؤد رحمہ اللہ باب قائم کرکے سب حدیثیں ایک ہی باب میں لے آتے ہیں۔ اور امام ترمذی رحمہ اللہ کوئی ایک حدیث لاتے ہیں اور باقی کا حوالہ دے دیتے ہیں۔ اور امام بخاریؒ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر حدیث پر نیا ترجمہ قائم کرتے ہیں تاکہ افادہ مزید ہوجائے، اس باب میں بھی وہی حدیث لائے ہیں جو اوپر آچکی ہے، البتہ نیا ترجمہ قائم کرکے اساتذہ اور واعظین کو نصیحت فرمائی ہے کہ وقت کی تعیین کے بغیر تعلیم و تذکیر نہیں کرنی چاہئے، لوگوں کو پہلے سے معلوم ہونا چاہئے کہ کب وعظ ہوگا، کب سبق ہوگا، تاکہ سب آجائیں، کوئی محروم نہ رہے۔

اور اہل علم سے مراد طلبہ ہیں، ان کو مجاز مایؤول کے اعتبار سے اہل العلم کہا ہے، جیسے آپ حضرات کو مولوی بمعنی عالم مجاز مایؤل کے اعتبار سے کہتے ہیں، مولوی (اللہ والے) تو تم بالفعل ہو، مگر عالم بالفعل نہیں ہو، بالقوۃ ہو۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ مَولیٰ: اللہ کی صفت ہے قرآن میں ہے: ﴿نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِيْرُ﴾ اور وہ لفظ جس کے آخر میں ی یای سے بدلا ہوا الف ہو، جب اس کے آخر میں یائے نسبتی لگاتے ہیں تو ی کو واؤ سے بدل دیتے ہیں، جیسے دہلی سے دہلوی، مولیٰ کے آخر میں جب یائے نسبت لگائیں گے تو کہیں گے: مَوْلَوِی یعنی اللہ والے، پس تم اللہ کے فضل سے بالفعل اللہ والے ہو لیکن ابھی عالم نہیں بنے، اور عرف میں لفظ مولوی بمعنی عالم استعمال کرتے ہیں، پس یہ مجاز مایؤل ہے، اسی طرح باب میں طلبہ کو جو أهل العلم کہا ہے وہ مجاز مایؤل ہے۔

حدیث: ابو وائل کہتے ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہفتہ میں جمعرات کے دن لوگوں کو نصیحت فرمایا کرتے تھے، ان سے کسی نے کہا: اے ابوعبدالرحمٰن! ہمارا جی چاہتا ہے کہ آپ ہمیں روزانہ نصیحت فرمائیں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: سنو! مجھے ایسا کرنے سے یہ بات روکتی ہے کہ میں تمہیں تنگی میں ڈالنا نہیں چاہتا، میں تمہاری وعظ ونصیحت کے ذریعہ اسی طرح نگہداشت کرتا ہوں جس طرح نبی ﷺ ہماری نگہداشت کیا کرتے تھے، یعنی آپ بھی روزانہ وعظ ونصیحت نہیں فرماتے تھے، ہمارے اکتا جانے کے اندیشہ سے۔

تشریح: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہفتہ میں ایک دن تعلیم و تذکیر فرمایا کرتے تھے، ایک طالب علم نے عرض کیا: حضرت: س سے ہمیں سیری نہیں ہوتی، سبق میں اضافہ ہونا چاہئے، حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: ہوسکتا ہے تم میں سے بعض کی یہ خواہش ہو اور وہ دل سے اضافہ کے خواہش مند ہوں مگر میں اس کے خلاف مصلحت سمجھتا ہوں، روزانہ کی تعلیم میں طلبہ کی ملالت اور تنگ دلی کا اندیشہ ہے، کہیں وہ پریشان ہوکر بھاگ نہ جائیں۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کے

نشاط وفراغت کا لحاظ کر کے تعلیم فرمایا کرتے تھے، آپؓ کو یہ بات ناپسند تھی کہ تعلیم میں صحابہ پر تنگی ہو، لہٰذا جس طرح نبی ﷺ تعلیم میں شوق ورغبت کی رعایت فرماتے تھے، میں بھی اس کی رعایت کرتا ہوں۔

[۱۲-] بَابُ مَنْ جَعَلَ لِأَهْلِ الْعِلْمِ أَيَّامًا مَعْلُوْمَةً

[۷۰-] حدثنا عُثْمَانُ بْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا جَرِيْرٌ، عَنْ مَنْصُوْرٍ، عَنْ أَبِيْ وَائِلٍ، قَالَ: كَانَ عَبْدُ اللّٰهِ يُذَكِّرُ النَّاسَ فِيْ كُلِّ خَمِيْسٍ، فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ! لَوَدِدْتُ أَنَّكَ ذَكَّرْتَنَا كُلَّ يَوْمٍ، قَالَ: أَمَا إِنَّهُ يَمْنَعُنِيْ مِنْ ذٰلِكَ أَنِّيْ أَكْرَهُ أَنْ أُمِلَّكُمْ، وَإِنِّيْ أَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم يَتَخَوَّلُنَا بِهَا، مَخَافَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا.

وضاحت: إِنَّہُ میں ضمیر شان ہے اور أَنِّيْ أَكْرَہ جملہ بتاویل مصدر ہو کر یَمْنَعُنِی کا فاعل ہے۔

بابٌ: مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ

دین کا فہم اس کو ملتا ہے جس کے ساتھ خیر منظور ہوتی ہے

طالب علم کو کب تک پڑھنا چاہئے؟ تحصیل علم کی آخری حد کیا ہے؟ جب اتنا پڑھ لے کہ دین کی سمجھ پیدا ہو جائے تو آخری حد آ گئی، اب کام شروع کرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ابھی گذرا ہے کہ ربانی کا ابتدائی درجہ عالم ہونا ہے، جب طالب علم کتب متداولہ پڑھ کر فارغ ہو جائے تو عالم بن گیا، مگر ابھی آخری حد نہیں آئی، ابھی آگے پڑھنا ہے، ابھی فقیہ بننا ہے، یہ فقاہت عام طلبہ کے لئے آخری حد ہے، اس کے بعد حکمت کا درجہ ہے، مگر یہ مقام جلدی حاصل نہیں ہوتا، فقاہت تک پہنچنا تو آسان ہے، مگر حکمت جس کے مقدر میں ہوتی ہے اسی کو ملتی ہے۔

حدیث: نبی ﷺ نے فرمایا: ''جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو خیر (بھلائی) منظور ہوتی ہے اس کو اللہ تعالیٰ دین کا فہم عطا فرماتے ہیں۔ اور میں صرف بانٹنے والا ہوں، دینے والے اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور اس امت کی ایک جماعت برابر دینِ حق پر قائم رہے گی، مخالفین ان کو کچھ ضرر نہیں پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ جائے''

تشریح:

اس حدیث میں تین مضمون ہیں۔ اور تینوں باہم مربوط ہیں:

۱- جو عالم دین بنتا ہے وہ اللہ کی عنایت سے بنتا ہے، اپنی محنت سے کوئی کچھ حاصل نہیں کر سکتا، پہلے امام محمد رحمہ اللہ کا یہ واقعہ گذرا ہے کہ ان کو بعد از وفات کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ آپ کے ساتھ اللہ نے کیا معاملہ کیا؟ امام محمدؒ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''محمد! اگر مجھے تیرے ساتھ خیر منظور نہ ہوتی تو میں تجھے اپنا علم نہ دیتا''

۲- جو بات پہلے جملہ سے اشارۃً مفہوم ہوتی ہے وہی بات دوسرے جملہ میں صراحۃً ہے کہ میں صرف بانٹنے والا ہوں، دینے والے اللہ تعالیٰ ہیں۔ اگر استاذ کے بس میں ہوتا تو وہ تمام تلامذہ کو علم گھونٹ کر پلا دیتا۔ مگر استاذ کے بس میں کچھ نہیں، استاذ صرف پڑھاتا ہے، پھر کس کو علم کتنا ملے گا، یہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ سے لو لگاؤ، اس سے مانگو، اس دربار سے کوئی خالی ہاتھ نہیں آتا۔

البتہ ایسا ہوسکتا ہے کہ طالب علم نے خوب محنت کی ہو، اللہ تعالیٰ سے لو بھی لگائی ہو، مگر اس کا ذہن کمزور ہو اس لئے وہ فقیہ نہ بن سکا، مگر وہ بھی محروم نہیں رہے گا، اس لئے کہ مئے خانہ کا محروم بھی محروم نہیں! اللہ تعالیٰ اس کے علم میں نورانیت پیدا فرمائیں گے، اور اس سے ایسے ایسے کام لیں گے کہ بڑے بڑے علماء، فقہاء اور حکماء اس پر رشک کریں گے۔

۳- پھر نبی ﷺ نے فرمایا: ''اس امت میں ایک جماعت برابر دین حق پر جمی رہے گی، مخالفین ان کو ضرر نہیں پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے''

هذه الأمة: کا مصداق کسی نے مجاہدین کو قرار دیا ہے، کسی نے محدثین کو، کسی نے فقہاء کو اور کسی نے علماء کو۔ میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ اس کا مصداق اہل السنہ والجماعہ ہیں۔ مشہور حدیث ہے کہ اس امت کے تہتر فرقے ہونگے، ان میں سے ایک ناجی اور باقی پاجی (گمراہ) ہونگے۔ ظاہر ہے وہ گمراہ فرقے اس حدیث کا مصداق نہیں ہوسکتے، اور ایک فرقہ جو ناجی ہوگا وہ اہل السنہ والجماعہ ہے، پس وہی حدیث کا مصداق ہیں۔ اور علماء، فقہاء، محدثین، مجاہدین، حکماء اور امراء سب اس میں آگئے، اور أَمْرُ اللهِ سے قیامت اور قرب قیامت مراد ہے۔

اور اس آخری جزء کا ماقبل سے جوڑ یہ ہے کہ جو امت دین حق پر جمے گی وہ علماء حق کی محنتوں کے نتیجہ میں جمے گی، پس تینوں اجزاء میں ربط یہ ہوا کہ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر چاہتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں، اور ہر شخص کو فقاہت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، مگر دینے والے اللہ تعالیٰ ہیں، جس کی قسمت میں ہوگا اس کو فقاہت مل جائے گی۔ اور جس کی قسمت میں نہیں ہوگا وہ بھی محروم نہیں رہے گا۔ اور یہی علماء، فقہاء، صلحاء اور محدثین امت پر محنتیں کریں گے، اس کے نتیجہ میں ایک جماعت ہمیشہ دین حق پر جمی رہے گی، مخالفین کی ریشہ دوانیاں ان کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گی۔

فائدہ (۱): اسلام کی کتابِ دعوت دو ہیں: قرآنِ کریم اور قرآن کریم کا پیکر محسوس یعنی امت قائمہ علی الحق۔ اور دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، جب تک قرآن رہے گا امت حقہ بھی رہے گی، اور قرب قیامت میں جب قرآن نہیں رہے گا تو اس کا پیکر محسوس بھی نہیں رہے گا۔

اس کو ایک مثال سے سمجھیں: جب بڑی بلڈنگ بنانی ہوتی ہے تو پہلے ایک ماڈل تیار کرتے ہیں جس کو دیکھ کر معمار بلڈنگ بناتے ہیں۔ امت حقہ قرآن مجید کا ماڈل ہے، اس کی روشنی میں قرآن کو سمجھنا ہے، اگر یہ ماڈل ہی نہیں رہے گا تو قرآن چیستاں بن جائے گا، اور ہر شخص من مانی تفسیر کرے گا، پس ضروری ہے کہ جب تک قرآن موجود رہے اس کا پیکر

محسوس بھی موجود رہے۔

فائدہ(۲): دوراول میں اکثر مسلمان قرآن کا پیکر محسوس تھے، ان کا عمل قرآن کے مطابق تھا، ان کو دیکھ کر غیر مسلم متاثر ہوتے تھے، اس لئے تیزی سے اسلام پھیلتا تھا، اب مسلمانوں کا عمل غیر مسلموں کو متاثر نہیں کرتا، کیونکہ ان کا عمل قرآن کے مطابق نہیں رہا، اس لئے کوئی غیر مسلم مسلمانوں کے عمل سے متاثر ہوکر اسلام قبول نہیں کرتا۔ بعض غیر مسلم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں، پھر حلقہ بگوش اسلام ہوجاتے ہیں، لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں، زیادہ تر ماڈل دیکھتے ہیں، امت مسلمہ کو دیکھتے ہیں، اور بدک جاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں اگر یہی لوگ قرآن کی دعوت کا نمونہ ہیں تو ہم میں اور ان میں کچھ فرق نہیں، پھر مسلمان ہونے سے کیا فائدہ؟

[۱۳-] بابٌ: مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ

[۷۱-] حدثنا سَعِيْدُ بْنُ عُفَيْرٍ، قَالَ: ثَنَا ابْنُ وَهْبٍ، عَنْ يُوْنُسَ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ: قَالَ حُمَيْدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ: سَمِعْتُ مُعَاوِيَةَ خَطِيْبًا، يَقُوْلُ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: "مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ، وَإِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ، وَلَنْ تَزَالَ هٰذِهِ الْأُمَّةُ قَائِمَةً عَلٰى أَمْرِ اللّٰهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ" [انظر: ۳۱۱۶، ۳۶۴۱، ۷۳۱۲، ۷۴۶۰]

بابُ الْفَهْمِ فِي الْعِلْمِ

علم کو سمجھنا ضروری ہے

یہ باب بھی گذشتہ سے پیوستہ ہے۔ اور اس باب کا حاصل یہ ہے کہ استاذ نے جو کچھ بتایا ہے اس پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اس میں غور وتدبر کرنا چاہئے، دماغ لڑانا چاہئے، رٹ کر یاد کرلینا اور غور نہ کرنا چھوٹے بچوں کے لئے تو مناسب ہے مگر منتہی طلبہ کے لئے یہ بات ٹھیک نہیں۔ وہ اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں، اپنے علم میں جلا پیدا کرنا چاہتے ہیں، اپنے علم کو نکھارنا چاہتے ہیں تو استاذ نے جو کچھ بتایا ہے اسے یاد کریں، پھر اس میں غور وفکر کریں، اگر کوئی اشکال پیش آئے تو اس کو حل کریں، اس سے علم بڑھے گا اور استعداد پختہ ہوگی۔

حدیث: مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں ایک مرتبہ سفر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھا۔ ہم مدینہ منورہ جارہے تھے، پورے راستہ میں حضرت ابن عمرؓ نے کوئی حدیث بیان نہیں کی، صرف ایک حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جُمّار (کھجور کا گوند) لایا گیا، آپؐ نے صحابہ سے پوچھا: بتاؤ! وہ کونسا درخت ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے، اور وہ درخت مسلمان کی مثال ہے؟ میرے ذہن میں جواب آگیا، مگر مجلس میں سب سے چھوٹا تھا اس لئے

مجھے شرم آئی اور میں خاموش رہا، نبی ﷺ نے فرمایا: وہ کھجور کا درخت ہے (یہ حدیث تفصیل سے پہلے گذر چکی ہے)

استدلال: اس حدیث میں ہے کہ جب آپؐ نے سوال کیا تو سب صحابہ جنگل کے درختوں میں کھو گئے تھے، یہی علمی بات کو سوچنا سمجھنا ہے۔

[۱٤-] بابُ الْفَهْمِ فِي الْعِلْمِ

[۷۲-] حدثنا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: ثَنَا سُفْيَانُ، قَالَ: قَالَ لِي ابْنُ أَبِي نَجِيحٍ: عَنْ مُجَاهِدٍ قَالَ: صَحِبْتُ ابْنَ عُمَرَ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلَمْ أَسْمَعْهُ يُحَدِّثُ عَنْ رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم إِلَّا حَدِيْثًا وَاحِدًا، قَالَ: كُنَّا عِنْدَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم فَأُتِيَ بِجُمَّارٍ فَقَالَ: " إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً مَثَلُهَا كَمَثَلِ الْمُسْلِمِ" فَأَرَدْتُ أَنْ أَقُوْلَ: هِيَ النَّخْلَةُ، فَإِذَا أَنَا أَصْغَرُ الْقَوْمِ فَسَكَتُّ، فَقَالَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم: "هِيَ النَّخْلَةُ" [راجع: ٦١]

بابُ الْإِغْتِبَاطِ فِي الْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ

علم وحکمت میں رشک کرنا

اس باب کا حاصل یہ ہے کہ اگر طلبہ ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ابنائے عصر کے ساتھ مسابقت کریں، جب تک اقران کے ساتھ مقابلہ نہیں کرے گا غایت تک نہیں پہنچ سکے گا۔ مظاہر علوم سہارن پور میں میرا ملاحسن میں ایک طالب علم کے ساتھ مقابلہ ہوگیا، چنانچہ میں رات بھر پڑھتا تھا، ملاحسن کا ایک ایک حاشیہ میں نے رٹ ڈالا تھا۔ پھر کبھی کسی سے مقابلہ نہیں ہوا مگر اس وقت سے محنت کی عادت پڑگئی۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے بھی کسی جگہ لکھا ہے کہ اقران کے ساتھ جب تک مسابقت نہ ہو آدمی ترقی نہیں کرسکتا۔ پس اگر تمہیں علم میں ترقی کرنی ہے تو ہم عصروں کے ساتھ پڑھنے میں ریس کرو، یہی چیز آگے بڑھاتی ہے۔

اور اغتباط کے معنی ہیں: رشک کرنا۔ اور حسد وغبطہ میں فرق یہ ہے کہ کسی کی نعمت کے زوال کی تمنا کرنا حسد (جلنا) ہے پھر خواہ وہ نعمت اسے ملے یا نہ ملے، حسد حرام ہے، یہ فتنوں کی جڑ ہے، جب کسی سے حسد ہوجاتا ہے تو آدمی اس کو نیچا دکھانے کے لئے ہر کردنی ناکردنی کرتا ہے۔ اور ایسے ایسے حربے استعمال کرتا ہے کہ خدا کی پناہ! اور غبطہ (رشک) یہ ہے کہ کسی کی نعمت دیکھ کر تمنا کرے کہ کاش مجھے بھی یہ نعمت مل جائے، مگر اس کی نعمت کے زوال کی تمنا نہ کرے، یہی ریس کرنا ہے جو مطلوب ہے۔ ارشاد پاک ہے: ﴿وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ اور اس میں یعنی جنت کی نعمتوں میں چاہئے کہ ریس کریں ریس کرنے والے، یعنی دینی کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کریں۔ غرض علم کے لئے مقابلہ مفید ہے اور علم ہی کے لئے نہیں ساری صلاحیتوں کے لئے مقابلہ مفید ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد:

تَفَقَّهُوْا قَبلَ أَنْ تُسَوَّدُوْا: سردار بنائے جانے سے پہلے دین کی سمجھ حاصل کرلو۔ سَوَّدَهُ (تفعیل) کے معنی ہیں: سردار بنانا۔ تُسَوَّدُوْا: فعل مجہول ہے۔ علماء کرام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ذمہ داری آنے سے پہلے علم حاصل کرلو، جب ذمہ داری آپڑتی ہے، شادی ہوجاتی ہے، بچے ہوجاتے ہیں، کسی عہدے پر فائز ہوجاتا ہے یا کاروبار شروع کردیتا ہے تو علم حاصل کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

دوسرا مطلب: جو پہلے مطلب سے قریب ہے: یہ ہے کہ حکومت کے عہدے بہرحال تقسیم ہونگے، پس سرکاری عہدہ وہی شخص قبول کرے جو دین کی سمجھ حاصل کرچکا ہے، اگر ابھی دین کی سمجھ حاصل نہیں تو عہدہ قبول کرنے سے پہلے فقاہت کے زیور سے آراستہ ہوجاؤ۔

اس کی نظیر: ترمذی شریف میں حضرت عمرؓ کا قول ہے: لایَبِعْ فی سوقنا من لم یتفقه فی الدین: جس نے دین کی سمجھ حاصل نہیں کی وہ ہمارے بازار میں کاروبار نہ کرے یعنی بازار میں دوکان اسی وقت کھولنی چاہئے جب بیع وشراء کے ضروری مسائل سے واقف ہوجائے۔

اس کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اور سردار بنائے جانے کے بعد بھی علم حاصل کرو، کیونکہ صحابہ کرام نے بڑی عمروں میں علم حاصل کیا تھا یعنی حضرت عمرؓ کا قول اختیار اولیٰ پر محمول ہے۔ ان کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذمہ داریاں سرپے آجانے کے بعد کوئی علم حاصل نہیں کرسکتا، صحابہ نے تمام ذمہ داریوں کے ساتھ علم حاصل کیا ہے۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد یہاں اس لئے لائے ہیں کہ فقاہت مسابقت ہی سے حاصل ہوتی ہے اور مسابقت فراغت کے زمانہ ہی میں ہوسکتی ہے، آدمی فارغ البال ہو تو پڑھنے میں ریس کرسکتا ہے۔ مشغولیت کے بعد مقابلہ نہیں کرسکتا۔ لہٰذا ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں لگ جاؤ، منزل پالوگے۔

حدیث: نبی ﷺ نے فرمایا: حسد جائز نہیں، مگر دو باتوں میں:

ایک: وہ بندہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے، پھر اس کو راہ خدا میں مال اڑانے پر مسلط کیا ہے پس وہ دونوں ہاتھوں سے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اس پر رشک کرنا چاہئے یعنی یہ تمنا کرے کہ کاش میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں بھی اسی طرح راہ خدا میں خرچ کرتا، پس اسے حسن نیت کا ثواب مل جائے گا۔

دوسرا: وہ بندہ ہے جس کو اللہ نے دین کی سمجھ عطا فرمائی ہے، پس وہ اس کے ذریعہ لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے اور ان کو تعلیم دیتا ہے۔ اس پر بھی رشک کرنا چاہئے۔ یعنی اس جیسا بننے کی کوشش کرنی چاہئے اور یہی مسابقت ہے۔

تشریح:

۱- اس باب میں یہ حدیث لاکر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہاں حسد بمعنی غبطہ ہے حقیقی حسد کسی حال میں جائز

نہیں، وہ تمام شرور وفتن کی جڑ ہے، البتہ غبطہ کی گنجائش ہے، بلکہ مذکورہ دوصورتوں میں محمود ہے۔

۲- مال دودھاری تلوار ہے، احتیاط سے استعمال کی جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اپنا سر پھوڑے گی، اسی طرح مال مفید بھی ہے اور مضر بھی۔ قرآن مجید میں صرف دو چیزوں کو قِیَامًا لِلنَّاسِ (لوگوں کے لئے سہارا) کہا گیا ہے، کعبہ شریف کو اور مال کو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ﴾ (المائدہ آیت ۹۷) اللہ تعالیٰ نے بزرگی والے گھر کعبہ شریف کو لوگوں کے لئے سہارا بنایا ہے، یعنی دنیا کی آبادی اسی وقت تک ہے جب تک کعبہ برقرار ہے، پھر جب اللہ کا ارادہ اس کارخانۂ عالم کو ختم کرنے کا ہوگا تو سب سے پہلے کعبہ شریف اٹھالیا جائے گا۔ بخاری میں آئندہ حدیث آرہی ہے کہ ایک سیاہ فام حبشی کعبہ شریف کی اینٹ اینٹ اکھاڑ دے گا، اس کے بعد پھر کعبہ آباد نہ ہوگا اور قیامت قائم ہوجائے گی۔

دوسری چیز جسے لوگوں کی بقاء کا سامان قرار دیا گیا ہے مال ہے۔ سورۂ نساء (آیت ۵) میں ہے: ﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا﴾: جن لوگوں کی تربیت میں یتیم بچے ہوں ان سے کہا جارہا ہے کہ اگر بالغ ہونے کے بعد بھی وہ بچے ناسمجھ ہوں تو ان کا مال ان کو مت دو، کیونکہ مال کو اللہ تعالیٰ نے مایۂ زندگی بنایا ہے، وہ لوگوں کے لئے سہارا ہے۔ اگر ناسمجھوں کو دوگے تو وہ اناپ شناپ اڑادیں گے۔

پس جیسے ستون چھت کے لئے سہارا ہیں مال بھی لوگوں کے لئے سہارا ہے، جب مال نہیں رہتا تو آدمی ہمت ہار جاتا ہے۔

بہر حال مال مہتم بالشان چیز ہے مگر وہ دودھاری تلوار ہے۔ اگر ٹھیک سے کمایا اور ٹھیک طور پر خرچ کیا تو ٹھیک ہے ورنہ مال فتنہ ہے۔ حضرت کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر امت کے لئے آزمائش ہے اور میری امت کی آزمائش مال ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۱۹۴) اور سورۃ التغابن (آیت ۱۵) میں ہے: ﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ مال اور اولاد آزمائش ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ مال اور اولاد کے ذریعہ لوگوں کو جانچتے ہیں کہ کون اولاد کی اچھی تربیت کرتا ہے اور کون مال کو راہِ خدا میں خرچ کرتا ہے۔

[۱۵-] بابُ الإغْتِبَاطِ فِي الْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ

وَقَالَ عُمَرُ رضي الله عنه: تَفَقَّهُوْا قَبْلَ أَنْ تُسَوَّدُوْا. قَالَ أَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ: وَبَعْدَ أَنْ تُسَوَّدُوْا، وَقَدْ تَعَلَّمَ أَصْحَابُ النبيِّ صلى الله عليه وسلم بَعْدَ كِبَرِ سِنِّهِمْ.

[۷۳-] حدثنا الْحُمَيْدِيُّ. قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ، قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ أَبِيْ خَالِدٍ - عَلَى غَيْرِ مَا حَدَّثَنَاهُ الزُّهْرِيُّ - قَالَ: سَمِعْتُ قَيْسَ بْنَ أَبِيْ حَازِمٍ قَالَ: سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ النبيُّ صلى الله

عليه وسلم:" لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٍ آتَاهُ اللّٰهُ مَالاً، فَسَلَّطَهُ عَلٰى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ، وَرَجُلٍ آتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ، فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا" [انظر: ۱۴۰۹، ۷۱۴۱، ۷۳۱۶]

قوله: علی غیر ما حدثناه الزھریُّ: سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں: یہ حدیث میں نے امام زہری رحمہ اللہ سے بھی سنی ہے، اور اسماعیل بن ابی خالد سے بھی، مگر اسماعیل کی حدیث امام زہریؒ کی حدیث سے مختلف ہے......... اختلاف کیا ہے؟ سند میں اختلاف ہے یا متن میں؟ معلوم نہیں، حاشیہ میں لکھا ہے کہ سفیان کی حدیث جو ابن شہاب زہری سے مروی ہے وہ کسی کتاب میں موجود نہیں، اس لئے اختلاف کی نوعیت سمجھنا مشکل ہے۔ رجل: مبتدا محذوف کی خبر بھی ہوسکتا ہے، پس اس کو مرفوع پڑھیں گے اور اثنتین سے بدل بھی ہوسکتا ہے پس وہ مجرور ہوگا......... **فی اثنتین: أی فی خصلتین:** دو باتوں میں۔

بَابُ مَا ذُكِرَ فِي ذَهَابِ مُوْسَى فِي الْبَحْرِ إِلَى الْخَضِرِ

تحصیل علم کے لئے سمندر کا سفر کرنا

کبھی تحصیل علم کے لئے سفر ناگزیر ہوجاتا ہے، پس سفر کرسکتے ہیں اور سمندری سفر بھی کرسکتے ہیں، دور اول میں سمندر کا سفر خطرناک سمجھا جاتا تھا، بغیر انجن کی بوٹیں ہوا کے رحم وکرم پر چلتی تھیں، کبھی ڈوب بھی جاتی تھیں اور کبھی کہیں سے کہیں نکل جاتی تھیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ دریا کا سفر نہ کرے مگر حاجی یا غازی یا عمرہ کرنے والا (مشکوۃ حدیث ۳۸۳۸) یعنی نہایت اہم ضرورت ہی سے دریا کا سفر کیا جائے، بے ضرورت خطرہ نہ مولا جائے، اور تحصیل علم کے لئے سفر کرنا جائز ہے، کیونکہ یہ بھی نہایت اہم ضرورت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے لئے پہلے خشکی کا سفر کیا، پھر ان کے ہمراہ بحری سفر کیا۔ اور وہی علمی سفر تھا، اس سے پہلے جو خشکی کا سفر کیا تھا وہ اس سفر کی تمہید تھا، اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے تقدیم وتاخیر کی ہے إلی الخضر کو جو حقیقت میں مقدم ہے بعد میں لائے، اور فی البحر کو پہلے لائے، کیونکہ وہی علمی سفر تھا اور باب کا مقصد بھی یہی ہے، تحصیل علم کے لئے بحری سفر کا جواز بیان کرنا مقصود ہے اس لئے فی البحر کو پہلے لائے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سورۃ الکہف میں دو رکوع میں آیا ہے۔ یہاں حدیث کا صرف وہ ٹکڑا لائے ہیں جس میں بحری سفر کا ذکر ہے۔

واقعہ کی ابتداء: ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں مؤثر وعظ کہا، جس سے آنکھیں نم ہوگئیں، اور دل پگھل گئے، لوگوں نے پوچھا: اس وقت سب سے بڑا عالم کون ہے؟ آپؑ نے فرمایا: میں ہوں! اللہ کو یہ جواب پسند نہ آیا، وحی آئی کہ میرا ایک بندہ دو دریاؤں کے سنگم پر ہے وہ آپ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:

خدایا! مجھے اس کا پتہ نشان بتادیا جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک مچھلی لو، دریاؤں کے سنگم پر جہاں مچھلی گم ہوجائے وہاں وہ بندہ ملے گا، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے مچھلی لے کر سفر شروع کیا۔

مجمع البحرین کی تعیین مشکل ہے، اگر یہ واقعہ قیام مصر کے زمانہ میں پیش آیا ہے تو سوڈان میں خرطوم شہر کے پاس جہاں دریائے نیل کی دوشاخیں ملتی ہیں: وہ جگہ مراد ہے۔ مگر جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ یہ واقعہ وادیٔ سینا کی اسارت کے زمانہ کا ہے، پس بحر قلزم کی دوشاخیں: خلیج عقبہ اور خلیج سویز جہاں ملتی ہیں: وہ جگہ مراد ہے۔

اس سفر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کے خادم یوشع بن نون بھی تھے۔ دونوں منزل بہ منزل بڑھتے رہے، یہاں تک کہ مجمع البحرین پر پہنچ گئے۔ اور ایک پتھر پر سر رکھ کر سو گئے۔ اور ستا کر آگے کی راہ لی، اور مچھلی والا تھیلا دونوں وہیں بھول گئے۔ یہ مچھلی کھانے کے لئے نہیں تھی۔ بطور علامت تھی کہ جہاں وہ گم ہوجائے وہیں وہ بندۂ خدا ملے گا۔

ان حضرات کے روانہ ہونے کے بعد مچھلی زندہ ہوکر سمندر میں چلی گئی، اور جس راستہ سے گئی تھی وہاں سرنگ نما سوراخ بن گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت تکان محسوس ہوا، جب وہ منزل مقصود سے آگے بڑھے'' یعنی بامقصد کام سے آدمی نہیں تھکتا، بے مقصد محنت تھکا دیتی ہے۔

رہی یہ بات کہ موسیٰ علیہ السلام کو تو پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ منزل مقصود سے آگے جارہے ہیں پھر ان کو تکان کیسے محسوس ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نفس الامری بات کا قلب نبوت پر انعکاس ہوا، جس سے طبیعت متاثر ہوئی۔ جیسے رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ جہری نماز پڑھا رہے تھے، پیچھے کسی نے سراً قراءت کی، نماز کے بعد آپؐ نے پوچھا: کیا کسی نے میرے پیچھے پڑھا؟ ایک شخص نے کہا: جی ہاں! آپؐ نے فرمایا: میں سوچ رہا تھا: قرآن پڑھنے میں مجھ سے جھگڑا کیوں کیا جارہا ہے، یعنی امر منکر کا قلب نبوت پر اثر پڑا اور آپؐ کے لئے قراءت دشوار ہوگئی۔

القصہ: جب اگلی صبح کو موسیٰ علیہ السلام نے ناشتہ مانگا تو خادم نے کہا: ہم جب اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں اس مچھلی کو بھول گیا، یہ حسن ادب تھا کہ بھولنے کو اپنی طرف منسوب کیا۔ مخدوم کو اس میں شامل نہ کیا۔ ویسے سامان کا ذمہ دار بھی خادم ہی ہوتا ہے، اگرچہ اس میں مخدوم کی بھی کچھ نہ کچھ ذمہ داری ہوتی ہے۔

اور شیطان ہی نے مجھے بھلادیا کہ میں اس کو یاد کروں، یعنی میں غفلت کی وجہ سے نہیں بھولا، بلکہ کم بخت شیطان نے بھلادیا، اور ایسا بھلادیا کہ اس پورے وقت میں اس کا خیال ہی نہیں آیا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اسی جگہ کی ہمیں تلاش تھی، وہی مقام ہماری منزل تھا، ہمیں وہیں رک جانا تھا، چنانچہ دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے واپس لوٹے، پس اسی جگہ جہاں پہلے قیام کیا تھا، حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے عرض کیا: کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں کہ آپ مجھے اس رشد وہدایت کی تعلیم دیں جس کی آپ کو تعلیم دی گئی ہے؟ یہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعلیمی سفر شروع ہوگا (تفصیل: میری تفسیر ہدایت القرآن میں ہے)

حدیث: حضرت ابن عباسؓ اور حر بن قیسؓ کے درمیان موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کے بارے میں بحث ہوئی کہ حضرت موسیٰ کس سے ملنے گئے تھے؟ ابن عباسؓ نے کہا: وہ حضرت خضر سے ملنے گئے تھے۔ حر کسی اور کا نام لیتے تھے، اسی وقت ان کے پاس سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ گذرے، حضرت ابن عباسؓ نے ان کو بلایا، اور کہا: میرے اور ان کے درمیان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کے بارے میں اختلاف ہو رہا ہے جن سے ملاقات کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے راہ دریافت کی تھی، کیا آپؓ نے نبی ﷺ سے اس بارے میں کچھ سنا ہے؟ حضرت ابیؓ نے فرمایا: ہاں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ دریں اثناء کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے ساتھ تھے کہ ان کے پاس ایک شخص آیا۔ اس نے پوچھا: کیا آپ کسی کو جانتے ہیں جو آپ سے بھی بڑا عالم ہو؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: نہیں! ـــــ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ جواب واقعہ کے مطابق تھا۔ اس لئے کہ حضرت موسیٰ اولوالعزم پیغمبر تھے۔ اور پیغمبر کے علم کے مقابلہ میں غیر پیغمبر کا علم کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ جواب پیغمبرانہ شان کے خلاف تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کو چاہئے تھا کہ علم اللہ کے حوالے کرتے اس لئے ان کی گرفت ہوئی۔

چنانچہ حضرت موسیٰ کے پاس وحی آئی: کیوں نہیں! ہمارا ایک بندہ خضر ہے وہ تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے عرض کیا: مجھے اس کا پتہ نشان بتایا جائے، اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایک مچھلی کو علامت بنایا اور ان سے کہا گیا کہ جب مچھلی گم ہو جائے تو لوٹ جانا، وہیں تمہاری ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مچھلی والے تھیلے پر ہمیشہ نظر رکھتے تھے، پھر جب دونوں مچھلی والا تھیلا بھول گئے، اور آگے نکل گئے اور رات دن چلنے کے بعد خادم کو یاد آیا تو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ارے! جب ہم اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں اس مچھلی کو بھول گیا، اور شیطان ہی نے مجھے بھلایا کہ میں اس کو یاد کروں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اسی جگہ کی ہمیں تلاش تھی، چنانچہ دونوں اپنے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے واپس لوٹے۔ دونوں نے حضرت خضر کو اس جگہ پایا، پھر ان دونوں کا وہ معاملہ ہوا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

تشریح:

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کس سے ملنے گئے تھے؟ حضرت ابن عباس اور حضرت حر بن قیس رضی اللہ عنہما کے درمیان یہ مسئلہ زیر گفتگو آیا۔ حضرت ابن عباسؓ کی رائے تھی کہ حضرت خضر علیہ السلام سے ملنے گئے تھے۔ اور حضرت حر کی رائے کچھ اور تھی، حضرت ابن عباسؓ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو بلایا، تاکہ ان سے اس سلسلہ میں دریافت کریں۔ اس موقع پر حضرت ابی بن کعبؓ نے مذکورہ حدیث سنائی۔ جس سے حضرت ابن عباس کی تائید ہوئی۔

ایک اور اختلاف سعید بن جبیر اور نوف بکالی کے درمیان ہوا ہے، یہ دونوں تابعی ہیں، اور نوف بکالی: کعب احبار کی بیوی کے لڑکے ہیں، وہ اختلاف یہ تھا کہ قرآن مجید میں جس موسیٰ کا واقعہ ہے وہ مشہور پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں

جن کے والد کا نام عمران ہے، یا کوئی اور موسیٰ ہیں؟ سعید بن جبیر کہتے تھے کہ وہ بنی اسرائیل والے پیغمبر حضرت موسیٰ تھے جن کے والد کا نام عمران ہے، اور نوف بکالی کہتے تھے: وہ ایک دوسرے موسیٰ تھے جن کے باپ کا نام میشان تھا۔ سعید بن جبیر نے یہ بات حضرت ابن عباسؓ سے ذکر کی تو انھوں نے نوف کی تردید کی اور فرمایا: اللہ کا دشمن جھوٹ بولتا ہے، یہ روایت آگے بخاری ہی میں آرہی ہے (حدیث ۱۲۲) غرض دونوں واقعے الگ الگ ہیں۔

۲- حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو مچھلی ساتھ لی تھی وہ کھانے کے لئے نہیں تھی بلکہ نشانِ راہ کے طور پر تھی، اور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات اسی جگہ ہوئی تھی جہاں مچھلی گم ہوئی تھی، جب دونوں حضرات اپنے نشانِ قدم دیکھتے ہوئے اس جگہ آئے جہاں مچھلی گم ہوئی تھی تو انھوں نے ایک شخص کو دیکھا جو کپڑا اوڑھے لیٹا ہے، حضرت موسیٰ نے اس کو سلام کیا، اس شخص نے کہا: آپ کے علاقہ میں سلام کہاں سے آیا؟ یعنی یہ علاقہ تو غیر مسلموں کا ہے، آپ کون ہیں؟ موسیٰ نے کہا: میں موسیٰ ہوں، اس بندے نے پوچھا: بنی اسرائیل کے موسیٰ؟ موسیٰ نے کہا: ہاں، اس بندے نے کہا: اے موسیٰ! آپ اللہ کے علوم میں سے ایک ایسا علم سکھلائے گئے ہیں جس کو میں نہیں جانتا، یعنی شریعت کا علم، اور میں اللہ کے علوم میں سے ایک ایسا علم سکھلایا گیا ہوں جس کو آپ نہیں جانتے یعنی تکوینیات کا علم۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں، اس مقصد سے کہ آپ مجھے اُس رشد وہدایت کی تعلیم دیں جس کی آپ کو تعلیم دی گئی ہے، چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک شرط کے ساتھ ان کو اجازت دیدی، اس کے بعد بحری سفر شروع ہوا جو تعلیمی سفر تھا، یہ تفصیلی روایت آئندہ بخاری (حدیث ۱۲۲) میں بھی آرہی ہے اور ترمذی میں بھی ہے (دیکھئے: تحفۃ الالمعی ۷: ۳۳۱-۳۳۵)

۳- خَضِر (خاء کا زبر اور ضاد کا زیر) اور خِضْر (خاء کا زیر اور ضاد کا زبر) کے معنی ہیں: سبزہ زار، سرسبز مقام، اور آئندہ بخاری میں حدیث (نمبر ۳۴۰۲) آرہی ہے کہ اس بندے کو خضر اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ سفید سوکھی ہوئی زمین پر بیٹھے تھے تو وہ یکایک سرسبز ہوکر لہلہانے لگی۔

۴- اور اس میں اختلاف ہے کہ آپ انسان تھے یا فرشتے؟ پھر انسان تھے تو ولی تھے یا نبی؟ اور کیا اب تک وہ حیات ہیں یا وفات پاچکے ہیں؟ نصوص میں اس سلسلہ میں کوئی صراحت نہیں۔ اور علماء ومفسرین کی آراء مختلف ہیں، اور قرین قیاس یہ ہے کہ آپ انسان نہیں تھے بلکہ خاص قسم کے فرشتے تھے۔ جن کو رجال الغیب کہا جاتا ہے۔ رجال اس لئے کہ زمینی فرشتے عناصر کی بھاپ سے پیدا ہوتے ہیں۔ آسمانی فرشتوں کی طرح نور سے پیدا نہیں ہوتے، اور غیب اس لئے کہ وہ عام طور پر نظر نہیں آتے، کیونکہ وہ لطیف مادہ سے پیدا کئے جاتے ہیں۔

قوله: فکان يَتَّبِعُ أَثَرَ الحُوتِ فِي البَحْرِ: اس جملہ کا صحیح مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس تھیلے پر جس میں مچھلی تھی ہمیشہ نظر رکھتے تھے، کیونکہ وہ مچھلی نشانِ راہ کے طور پر تھی، بعض حضرات نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مچھلی تھیلے میں سے نکل کر سمندر میں چلی گئی، اور سمندر میں سرنگ بن گئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کا

خادم دونوں اس سرنگ میں داخل ہوئے اور کسی جزیرے میں پہنچے، وہاں حضرت خضر سے ملاقات ہوئی۔

مگر صحیح بات وہ ہے جو آئندہ حدیث (۱۲۲) میں آرہی ہے اور جو میں نے اوپر بیان کی ہے کہ دونوں اپنے نشانِ قدم دیکھتے ہوئے اس چٹان کے پاس آئے جہاں تھیلا بھول گئے تھے، وہاں ایک بندہ کپڑا اوڑھے ہوئے لیٹا تھا، وہی حضرت خضر تھے، اور جس جگہ سے مچھلی پانی میں گئی تھی وہاں اللہ تعالیٰ نے پانی کا بہاؤ روک دیا، اور پانی طاق کی طرح بن گیا، وہ طاق مچھلی کے لئے سرنگ تھا اور موسیٰ اور ان کے خادم کے لئے حیرت زا تھا، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پانی اس طرح کیوں رکا تھا؟ جواب یہ ہے کہ وہ حضرت خضرؑ کے لئے علامت کے طور پر رکا تھا، چنانچہ وہ اسی جگہ موسیٰ کے انتظار میں ٹھہر گئے، یا وہ موسیٰ کے لئے علامت کے طور پر رکا تھا کہ لوٹ کر موسیٰ اسی جگہ آجائیں، وہیں اس بندے سے ملاقات ہوگی مگر اتفاق کہ وہ بندہ وہاں پہلے پہنچ گیا۔

ربط: اوپر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد آیا ہے کہ سردار بنائے جانے سے پہلے علم حاصل کرلو اور امام بخاریؒ نے اس کی وضاحت کی تھی کہ قبل السیادہ علم حاصل کرنا بھی جائز ہے اور بعد السیادۃ بھی۔ حضرات صحابہ نے کبرسنی میں علم حاصل کیا ہے، اس پر کوئی کہہ سکتا تھا کہ صحابہ کا کبرسنی میں علم حاصل کرنا ایک مجبوری تھی، ان کو عالم جوانی میں کوئی معلّم نہیں ملا تھا اس لئے جب انھوں نے اسلام قبول کیا، اور آنحضور ﷺ سے متعلق ہوئے تب علم حاصل کیا، لہٰذا یہ بات بعد السیادۃ تحصیل علم کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتی۔ اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ یہ حدیث لائے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے پیغمبر صاحبِ کتاب رسول تھے، انھوں نے تحصیل علم کے لئے سفر فرمایا ہے معلوم ہوا کہ حصول علم کی راہ میں سیادت مانع نہیں ہونی چاہئے۔

[۱۶-] بابُ مَا ذُكِرَ فِيْ ذَهَابِ مُوْسَى فِي الْبَحْرِ إِلَى الْخَضِرِ

وَقَوْلِهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: ﴿هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَى أَنْ تُعَلِّمَنِ﴾ الآيَةَ [الكهف:٦٦]

[٧٤-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ غُرَيْرٍ الزُّهْرِيُّ، قَالَ: ثَنَا يَعْقُوْبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ، قَالَ: ثَنَا أَبِيْ، عَنْ صَالِحٍ، يَعْنِيْ ابْنَ كَيْسَانَ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، حَدَّثَهُ أَنَّ عُبَيْدَ اللهِ بْنَ عَبْدِ اللهِ، أَخْبَرَهُ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّهُ تَمَارَى هُوَ وَالْحُرُّ بْنُ قَيْسِ بْنِ حِصْنٍ الْفَزَارِيُّ فِيْ صَاحِبِ مُوْسَى: قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: هُوَ خَضِرٌ، فَمَرَّ بِهِمَا أُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ، فَدَعَاهُ ابْنُ عَبَّاسٍ، فَقَالَ: إِنِّيْ تَمَارَيْتُ أَنَا وَصَاحِبِيْ هٰذَا فِيْ صَاحِبِ مُوْسَى الَّذِيْ سَأَلَ مُوْسَى السَّبِيْلَ إِلَى لُقِيِّهِ: هَلْ سَمِعْتَ النبيَّ صلى الله عليه وسلم يَذْكُرُ شَأْنَهُ؟ قَالَ: نَعَمْ، سَمِعْتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: "بَيْنَمَا مُوْسَى فِيْ مَلَأٍ مِنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ، إِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ، فَقَالَ: هَلْ تَعْلَمُ أَحَدًا أَعْلَمَ مِنْكَ؟ قَالَ مُوْسَى: لَا، فَأَوْحَى اللهُ إِلَى مُوْسَى: بَلَى عَبْدُنَا خَضِرٌ، فَسَأَلَ مُوْسَى السَّبِيْلَ إِلَيْهِ، فَجَعَلَ اللهُ لَهُ الْحُوْتَ آيَةً، وَقِيْلَ لَهُ:

إِذَا فَقَدْتَ الْحُوْتَ فَارْجِعْ فَإِنَّكَ سَتَلْقَاهُ، فَكَانَ يَتَّبِعُ أَثَرَ الْحُوْتِ فِي الْبَحْرِ، فَقَالَ لِمُوْسَى فَتَاهُ:﴿أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ، وَمَا أَنْسَانِيْهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ﴾ قَالَ:﴿ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلَى آثَارِهِمَا قَصَصًا﴾ فَوَجَدَا خَضِرًا فَكَانَ مِنْ شَأْنِهِمَا مَا قَصَّ اللّٰهُ تَعَالَى فِيْ كِتَابِهِ"

[انظر:۷۸، ۱۲۲، ۲۲۶۷، ۲۷۲۸، ۳۲۷۸، ۳۴۰۰، ۳۴۰۱، ۴۷۲۵، ۴۷۲۶، ۴۷۲۷، ۶۶۷۲، ۷۴۷۸]

بابُ قَوْلِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم: اللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ

اے اللہ! ابن عباس کو قرآن سکھا!

امام بخاری رحمہ اللہ اب طلبہ کو ایک خاص بات بتارہے ہیں وہ یہ ہے کہ تحصیل علم کے لئے جہاں فہم وذکاوت، انابت الی اللہ، مسابقت اور اسفار وغیرہ ضروری ہیں، اساتذہ کی دعا لینا بھی ضروری ہے۔ اس کے بغیر مقصد میں سو فیصد کامیابی نہیں ہوتی۔ اور دعا لینے کا طریقہ یہ ہے کہ اساتذہ کی خدمت کی جائے، غایت درجہ احترام کیا جائے، ان کے حکم کو واجب الامتثال سمجھا جائے، اور ان کے حکم کی خلاف ورزی نہ کی جائے، اگر کسی دن طالب علم کی خدمت اور فرمانبرداری سے خوش ہوکر استاذ کے دل سے دعا نکل گئی تو بیڑا پار ہے۔ ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سمجھ اور احترام سے خوش ہوکر آنحضور ﷺ نے ان کو سینے سے لگا کر دعا دی تھی: اے اللہ! اس کو قرآن مجید کا فہم عطا فرما، چنانچہ دعائے نبوی کی برکت سے ابن عباس کو فہم قرآن میں بڑا مقام حاصل ہوا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی اس کے قائل تھے۔

مگر یہ دعا آسانی سے حاصل نہیں ہوتی، اس کے لئے اساتذہ کی خدمت کرنی پڑتی ہے، ان کی فرمانبرداری کرنی پڑتی ہے، پھر خدمت واطاعت کے نتیجہ میں کسی استاذ کے دل سے دعا نکل گئی تو بیڑا پار ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو جو مخصوص دعا ملی تھی اس سلسلہ میں حدیثوں میں دو واقعے آئے ہیں:

ایک واقعہ: یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ آنحضور ﷺ کی رات کی عبادت دیکھنے کے لئے اپنی خالہ ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر رک گئے تھے، جب رات میں آپؐ نے تہجد شروع کیا تو ابن عباس نے بھی وضو کرکے آنحضور ﷺ کی اقتدا کی، ابن عباس بائیں طرف کھڑے ہوئے، آپؐ نے اشارہ سے ان کو دائیں طرف لے لیا، مگر وہ ذرا پیچھے کھڑے ہوئے، جب آپؐ نے نماز پوری کی تو ان سے ساتھ کھڑے نہ ہونے کی وجہ دریافت کی، انھوں نے عرض کیا: آپؐ کے برابر کھڑا ہونا کیسے روا تھا، آپؐ اللہ کے رسول ہیں، آپؐ نے یہ جواب پسند کیا اور دعا دی۔ یہ حدیث بخاری شریف میں متعدد جگہ آئی ہے اور اس تفصیل کے ساتھ مسند احمد میں ہے۔

دوسرا واقعہ: یہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ بیت الخلاء تشریف لے گئے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وضو کے لئے پانی رکھ دیا، جب آپؐ بیت الخلاء سے نکلے اور وضو کا پانی تیار دیکھا تو پوچھا: کس نے پانی رکھا ہے؟ بتایا گیا

کہ عبداللہ نے رکھا ہے، آپ ﷺ خوش ہوئے اور سینہ سے لگا کر دعا دی (یہ واقعہ بخاری حدیث ۱۴۳ میں آرہا ہے)

پہلا واقعہ احترام کے قبیل سے ہے اور یہ واقعہ خدمت کے قبیل سے، ان دو موقعوں میں سے کسی ایک موقع پر آنحضور ﷺ نے ابن عباسؓ کو مذکورہ دعا دی ہے۔

[۱۷-] بابُ قَوْلِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم: اللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَابَ

[۷۵-] حدثنا أَبُوْ مَعْمَرٍ، قَالَ: ثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ، قَالَ: ثَنَا خَالِدٌ، عَنْ عِکْرِمَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: ضَمَّنِیْ رَسولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم، وَقَالَ: "اللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَابَ". [انظر: ۱۴۳، ۳۷۵۶، ۷۲۷۰]

بَابٌ مَتَی یَصِحُّ سَمَاعُ الصَّغِیْرِ؟

تحمل حدیث کے لئے کتنی عمر ضروری ہے؟

آغاز تعلیم کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں، جب بھی بچے میں شعور پیدا ہو تعلیم شروع کرا سکتے ہیں، عام طور پر بچوں میں شعور پانچ چھ سال میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح تحمل حدیث کے لئے بھی عمر کی کوئی قید نہیں، جب بھی شعور پیدا ہو حدیث پڑھ سکتا ہے۔

پہلے میں نے بتایا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ باب میں جہاں بھی ھل استفہامیہ لاتے ہیں وہاں مسئلہ کا فیصلہ قارئین کے حوالے کرتے ہیں کہ روایتیں پڑھ کر خود فیصلہ کرو، متی کا بھی یہی معاملہ ہے۔

یہاں باب میں دو حدیثیں لائے ہیں، پہلی حدیث حضرت ابن عباسؓ کی ہے اور دوسری حضرت محمود بن الربیعؓ کی۔

حدیث (۱): حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر میں ایک گدھی پر سوار ہو کر منی میں پہنچا، اس وقت میں قریب البلوغ تھا، نبی ﷺ منی میں دیوار کے علاوہ کی طرف نماز پڑھا رہے تھے، یعنی آپؐ کے سامنے دیوار نہیں تھی کوئی سترہ تھا، میں بعض صف کے سامنے سے گذرا، پھر میں نے گدھی کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اور میں صف میں کھڑا ہو گیا، پس مجھ پر کسی نے نکیر نہیں کی۔

تشریح: یہ حضرت ابن عباسؓ نے ایک دوسری حدیث پر تنقید کی ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ اگر نمازی کے سامنے سے گدھا یا کتا یا عورت گذر جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ اس حدیث پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی تنقید کی ہے اور یہاں حضرت ابن عباسؓ نے تنقید کی ہے کہ گدھے کے نمازی کے سامنے سے گذرنے سے نماز کیسے فاسد ہوگی؟ میرا اپنا مذکورہ واقعہ ہے اگر گدھے کے سامنے سے گذرنے سے نماز فاسد ہوتی تو لوگ مجھ پر نکیر کرتے، حالانکہ کسی نے نکیر نہیں کی (مزید تفصیل کتاب الصلوٰۃ میں آئے گی)

اس واقعہ سے یہ استدلال کرنا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اس وقت بالغ نہیں ہوئے تھے۔ پس تحمل حدیث کے لئے بلوغ شرط نہیں۔

حدیث (۲): ایک مرتبہ آنحضور ﷺ حضرت محمود بن الربیع کے گھر تشریف لے گئے، اس وقت ان کی عمر صرف پانچ سال تھی، آپؐ نے وضو کے لئے پانی طلب کیا، گھر میں کنواں تھا اس میں سے ڈول بھر کر پانی لایا گیا، آپؐ نے وضو فرمایا، پھر چلو بھر کر پانی منہ میں لیا اور کلی محمودؓ کے منہ پر ڈالی۔ محمودؓ کہتے ہیں: مجھے وہ بات یاد ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پانچ سال کی عمر میں بھی تحمل حدیث درست ہے۔ تحمل حدیث کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں، جب بھی بچے میں شعور پیدا ہوجائے سماع معتبر ہے۔

[۱۸-] بَابٌ مَتَى يَصِحُّ سَمَاعُ الصَّغِيْرِ؟

[۷۶-] حدثنا إِسْمَاعِيْلُ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُتْبَةَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: أَقْبَلْتُ رَاكِبًا عَلَى حِمَارٍ أَتَانٍ، وَأَنَا يَوْمَئِذٍ قَدْ نَاهَزْتُ الاحْتِلاَمَ، وَرَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم يُصَلِّيْ بِمِنًى إِلَى غَيْرِ جِدَارٍ، فَمَرَرْتُ بَيْنَ يَدَيْ بَعْضِ الصَّفِّ، وَأَرْسَلْتُ الأَتَانَ تَرْتَعُ، وَدَخَلْتُ فِي الصَّفِّ فَلَمْ يُنْكِرْ ذٰلِكَ عَلَيَّ أَحَدٌ. [انظر: ۴۹۳، ۸۶۱، ۱۸۵۷، ۴۴۱۲]

[۷۷-] حَدَّثَنِيْ مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُوْ مُسْهِرٍ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ مُحَمَّدُ بْنُ حَرْبٍ، قَالَ: حَدَّثَنِي الزُّبَيْدِيُّ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ، قَالَ: عَقَلْتُ مِنَ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم مَجَّةً مَجَّهَا فِيْ وَجْهِيْ، وَأَنَا ابْنُ خَمْسِ سِنِيْنَ: مِنْ دَلْوٍ. [انظر: ۱۸۹، ۸۳۹، ۱۱۸۵، ۶۳۵۴، ۶۴۲۲]

قوله: إلى غير جدار: دیوار کے علاوہ کی طرف یعنی سامنے سترہ تھا دیوار نہیں تھی، آگے ابواب السترۃ میں اس حدیث پر پہلا باب یہی باندھا ہے .... حمار: عام ہے اس لئے أتان بڑھایا یعنی وہ مادہ تھی، پھر بھی کسی نے نکیر نہیں کی .... مَجَّة: کلی، مَجَّهَا: ڈالا اس کو .... من دلو کا تعلق مجة کے ساتھ ہے یعنی آپؐ نے کلی بالٹی سے بھری تھی۔

بَابُ الْخُرُوْجِ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ

تحصیل علم کے لئے گھر سے نکلنا

اوپر بحری سفر کا باب آیا تھا، یہ خشکی کے سفر کا باب ہے، یعنی طلب علم کے لئے بحری سفر بھی کر سکتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بحری سفر کیا تھا اور خشکی کا سفر بھی کر سکتے ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ ایک حدیث کے لئے عبداللہ بن

اُنیس رضی اللہ عنہ کے پاس مدینہ منورہ سے شام تشریف لے گئے، جو اس زمانہ میں ایک مہینہ کی مسافت تھی، رہی یہ بات کہ وہ کونسی حدیث تھی جس کو حاصل کرنے کے لئے حضرت جابرؓ نے ایک ماہ کی مسافت طے کی تھی؟ یہ بات یقین سے معلوم نہیں، علماء نے درجہ احتمال میں متعدد حدیثیں لکھی ہیں، جو حاشیہ میں ہیں دیکھ لیں۔

[۱۹-] بابُ الْخُرُوْجِ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ

وَرَحَلَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ إِلَى عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أُنَيْسٍ فِيْ حَدِيْثٍ وَاحِدٍ.

[۷۸-] حدثنا أَبُوْ الْقَاسِمِ خَالِدُ بْنُ خَلِيٍّ قَاضِيْ حِمْصَ، قَالَ: ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ حَرْبٍ، قَالَ الْأَوْزَاعِيُّ: أَخْبَرَنَا الزُّهْرِيُّ، عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ تَمَارَى هُوَ وَالْحُرُّ بْنُ قَيْسِ بْنِ حِصْنٍ الْفَزَارِيُّ فِيْ صَاحِبِ مُوْسَى، فَمَرَّ بِهِمَا أُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ فَدَعَاهُ ابْنُ عَبَّاسٍ، فَقَالَ: إِنِّيْ تَمَارَيْتُ أَنَا وَصَاحِبِيْ هٰذَا فِيْ صَاحِبِ مُوْسَى الَّذِيْ سَأَلَ السَّبِيْلَ إِلَى لُقِيِّهِ: هَلْ سَمِعْتَ رَسُولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَذْكُرُ شَأْنَهُ؟ فَقَالَ أُبَيٌّ: نَعَمْ، سَمِعْتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم يَذْكُرُ شَأْنَهُ، يَقُوْلُ: "بَيْنَمَا مُوْسَى فِيْ مَلَأٍ مِنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ إِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ: هَلْ تَعْلَمُ أَحَدًا أَعْلَمَ مِنْكَ؟ قَالَ مُوْسَى: لَا، فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَى مُوْسَى: بَلٰى، عَبْدُنَا خَضِرٌ، فَسَأَلَ السَّبِيْلَ إِلَى لُقِيِّهِ، فَجَعَلَ اللّٰهُ لَهُ الْحُوْتَ آيَةً، وَقِيْلَ لَهُ: إِذَا فَقَدْتَ الْحُوْتَ فَارْجِعْ فَإِنَّكَ سَتَلْقَاهُ، فَكَانَ مُوْسَى يَتَّبِعُ أَثَرَ الْحُوْتِ فِي الْبَحْرِ، فَقَالَ فَتَى مُوْسَى لِمُوْسَى: ﴿أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ، وَمَا أَنْسَانِيْهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ﴾ قَالَ مُوْسَى: ﴿ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ، فَارْتَدَّا عَلَى آثَارِهِمَا قَصَصًا﴾ فَوَجَدَا خَضِرًا، فَكَانَ مِنْ شَأْنِهِمَا مَا قَصَّ اللّٰهُ فِيْ كِتَابِهِ" [راجع: ۷۴]

ملحوظہ: یہ حدیث دو ابواب پہلے آئی ہے، ترجمہ وتشریح وہاں ملاحظہ کریں۔ اور تفصیل سے یہ روایت آگے (حدیث ۱۲۲) آرہی ہے۔

بابُ فَضْلِ مَنْ عَلِمَ وَعَلَّمَ

دین پڑھنے پڑھانے کی اہمیت

علم دین پڑھ کر یونہی نہیں چھوڑ دینا چاہئے، بلکہ جو پڑھا ہے اسے دوسروں تک پہنچانا چاہئے۔ جو شخص علم دین پڑھ کر دوسروں کو پہنچاتا ہے، اس کی حدیث میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ اور اس باب کی حدیث اہم ہے، اس کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے:

حدیث: نبی ﷺ نے فرمایا: اس ہدایت اور علم کی مثال جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے موسلا دھار

بارش جیسی ہے۔ جو کسی زمین پر برسی، اس زمین کا ایک حصہ زرخیز تھا، اس نے پانی پیا، پس اس نے سبز وخشک گھاس اور بہت زیادہ ہری گھاس اگائی، اور دوسرا حصہ چٹیل تھا اس نے پانی روک لیا، پس اللہ نے اس کے ذریعہ لوگوں کو نفع پہنچایا، انھوں نے پیا، پلایا اور کھیتوں کو سیراب کیا، اور اس زمین کا ایک حصہ چٹیل میدان تھا نہ اس نے پانی روکا اور نہ گھاس اگائی، پس یہ اس شخص کی مثال ہے جس نے اللہ کے دین کی سمجھ حاصل کی اور اللہ نے اس کو نفع پہنچایا اس علم وہدایت سے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے، پس اس نے دین سیکھا اور دوسروں کو سکھلایا (حدیث کا یہی حصہ باب سے متعلق ہے) اور یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے سرنہیں اٹھایا اس دین کی طرف اور اللہ کی اس ہدایت کو قبول نہیں کیا جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں۔

حل عبارت: ما موصولہ ہے اور به کی ضمیر ما کی طرف راجع ہے۔ اور من الهدى والعلم: ما کا بیان ہے۔ اور ہدایت اور علم دین ایک ہیں، فرق صرف اعتباری ہے —— نَقِيَّة (نون کا زبر، قاف کا زیر اور ی مشدد) کے لغوی معنی ہیں: صاف ستھرا، مراد زرخیز زمین ہے یہ کان کا اسم مؤخر ہے اور منها خبر مقدم ہے .... الكلأ: وہ گھاس جس کو جانور رغبت سے کھاتے ہیں، تر بھی اور خشک بھی، جیسے چری اور جوار باجرے کی گھاس، یہ گھاس خشک ہو کر زرد نہیں پڑتی۔ .... العُشب: وہ گھاس جو تر ہو تو جانور کھاتے ہیں اور جب خشک ہو جاتی ہے تو بیکار ہو جاتی ہے، جانور اسے نہیں کھاتے، یہ گھاس خشک ہو کر پیلی پڑ جاتی ہے، ایسی گھاس جنگل میں برسات کے زمانہ میں بہت اگتی ہے اور گیہوں وغیرہ کا کھیت جب نیارتے ہیں تو جو خودرو گھاس ہوتی ہے اس کو چن لیتے ہیں، وہ جب تک ہری رہتی ہے جانور کھاتے ہیں، خشک ہونے کے بعد بیکار ہو جاتی ہے، یہ عُشب ہے، اور وہ بے حساب پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کی صفت الكثير لائے ہیں .... أَجَادِب: جَدْب کی خلافِ قیاس جمع ہے، بنجر نشیب والی زمین جو نہ پانی چوسے نہ گھاس اگائے، مگر پانی روک لے .... قِيعَانٌ: قَاع کی جمع چٹیل میدان۔

تشریح:

اس حدیث میں تمثیل ہے۔ آنحضور ﷺ جو رشد وہدایت لے کر آئے ہیں اس کی مثال موسلا دھار بارش جیسی ہے جب وہ برستی ہے تو زمین کی تین قسمیں ہو جاتی ہیں:

ایک: زرخیز زمین: جو پانی جذب کرتی ہے اور کلأ اور بہت عُشب اگاتی ہے۔

دوم: بنجر مگر نشیب والی زمین: وہ پانی نہیں پیتی، نہ گھاس اگاتی ہے، مگر پانی روکتی ہے، جس سے دنیا فائدہ اٹھاتی ہے۔

سوم: چٹیل سپاٹ زمین: جس پر سے پانی بہہ جاتا ہے۔

تطبیق: جو بندے ایمان لائے، اور انھوں نے دین وشریعت کا علم حاصل کیا، پھر خود بھی اس پر عمل کیا اور دوسروں کو بھی وہ علم پہنچایا تو وہ پہلی قسم کی زمین کی طرح ہیں۔ اور كَلَأ کا مصداق وہ علماء ہیں جن سے لوگ ان کی حیات میں بھی فائدہ اٹھاتے

ہیں اوران کی وفات کے بعد بھی، ان کے تلامذہ، تصنیفات اور دیگر علمی کاموں سے دیر تک امت فیضیاب ہوتی ہے۔

اور وہ علماء جن کا فیض ان کی زندگی تک رہتا ہے، وفات کے بعد منقطع ہو جاتا ہے اور امت کے صلحاء عُشب کا مصداق ہیں، ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اس لئے اس کی صفت کثیر لائے ہیں۔

اور وہ بندے جو ایمان لائے، اور دین کا فہم حاصل کیا، پھر دوسروں تک دین پہنچایا مگر خود اس پر عمل نہیں کیا وہ أجادب (بنجر، مگر نشیب والی زمین) جیسے ہیں۔ آنحضور ﷺ کے عہد مبارک میں اس قسم کے مسلمان نہیں تھے اس لئے آپؐ نے ان کا تذکرہ چھوڑ دیا ہے۔

اور وہ بندے جنھوں نے ایمان ہی قبول نہیں کیا، وہ چٹیل سپاٹ زمین کی طرح ہیں کہ بارش برسی مگر انھیں کچھ حاصل نہ ہوا، نہ خود فیضاب ہوئے، نہ دوسروں تک فیض پہنچایا۔

جاننا چاہئے کہ آنحضور ﷺ نے صرف پہلے اور تیسرے طائفہ کو مشخص کیا ہے، بیچ والے طائفہ کو چھوڑ دیا ہے، اس لئے شارحین بہت پریشان ہوئے ہیں، ہر شارح نے حدیث کی الگ شرح کی ہے، جیسے سورۃ الاعراف (آیات ۱۶۳-۱۶۶) میں ایک واقعہ آیا ہے، یہود سنیچر کے دن مچھلی پکڑنے کا حیلہ کرتے تھے۔ اس دن مچھلیاں پانی پر تیرتی تھیں، باقی دنوں میں چھپ جاتی تھیں۔ اور یہود کے لئے سنیچر کے دن کام کرنا حرام تھا، چنانچہ انھوں نے یہ حیلہ کیا کہ سمندر کے قریب کھڈے کھود لئے اور ان تک پانی کا راستہ بنالیا، پھر جب سمندر میں جوار بھاٹا آتا تو نالی کے راستے سے پانی کھڈوں میں بھر جاتا اور ساتھ ہی مچھلیاں بھی آجاتیں، پھر اتوار میں ان کو پکڑ لیتے۔

جب بعض یہود نے یہ حیلہ شروع کیا تو لوگ تین حصوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک حیلہ کرنے والے، دوم: نصیحت کرنے والے جو ان کو سمجھاتے تھے کہ ایسا مت کرو، سوم: خاموش رہنے والے، جو نہ اس عمل میں شریک تھے نہ ان لوگوں کو منع کرتے تھے، بلکہ نصیحت کرنے والوں کو سمجھاتے تھے کہ ان کے ساتھ مغزپچی کیوں کرتے ہو، یہ ماننے والے نہیں۔

پھر جب عذاب آیا تو حیلہ کرنے والوں کو ذلیل بندر بنا دیا گیا، اور ناصحین عذاب سے بچ گئے، اور خاموش رہنے والوں کا تذکرہ قرآن نے چھوڑ دیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ بھی عذاب سے محفوظ رہے، اور قرآن نے ان کا تذکرہ اس لئے چھوڑ دیا کہ ان کے عمل کا استحسان (پسندیدگی) ثابت نہ ہو۔ اسی طرح وہ مؤمن جو دین پڑھے ہوئے ہیں، دوسروں تک دین پہنچاتے بھی ہیں مگر خود اس پر عمل نہیں کرتے اگر ان کا تذکرہ کیا جاتا تو ان کے عمل کا استحسان ثابت ہوتا، حالانکہ شریعت کی نظر میں ان کا عمل قابل ستائش نہیں۔

فائدہ: کچھ لوگ دین کا علم حاصل کرتے ہیں، پھر لوگوں کو فیض بھی پہنچاتے ہیں مگر خود ایمان قبول نہیں کرتے جیسے **المعجم المفهرس لألفاظ الحديث الشريف** کا مصنف یہودی تھا، اس نے سات جلدوں میں یہ کتاب لکھی ہے جو مطبوعہ ہے یہ حدیث کی چودہ کتابوں کا انڈیکس (فہرست) ہے اس سے ایک دنیا استفادہ کرتی ہے مگر وہ یہودی مرا، ایسے

لوگ کس قسم میں داخل ہونگے؟ اس سلسلہ میں میرا رجحان یہ ہے کہ ان کا شمار اجادب میں کیا جاسکتا ہے، اگرچہ آنحضور ﷺ کے پیش نظر اس قسم کے لوگ نہیں تھے، بلکہ وہ لوگ تھے جو مؤمن ہیں، علم دین پڑھے ہوئے ہیں، دوسروں کو پڑھاتے ہیں مگر خود عمل نہیں کرتے، ان کو ایک فضیلت (ایمان کی) حاصل ہے۔ اور یہ غیر مسلم ہے، اس لئے اس کو اس قسم میں شامل نہیں کرنا چاہئے حقیقت میں وہ ایک دوسری حدیث کا مصداق ہے، قال: إن الله ينصر هذا الدين بالرجل الفاجر: کبھی اللہ تعالیٰ دین اسلام کی خدمت بدکار آدمی سے بھی لے لیتے ہیں۔

[۲۰-] بابُ فَضْلِ مَنْ عَلِمَ وَعَلَّمَ

[۷۹-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ، قَالَ: ثَنَا حَمَّادُ بْنُ أُسَامَةَ، عَنْ بُرَيْدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، عَنْ أَبِي بُرْدَةَ، عَنْ أَبِي مُوْسَى، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قَالَ: "مَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهِ مِنَ الْهُدَى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيْرِ، أَصَابَ أَرْضًا، فَكَانَ مِنْهَا نَقِيَّةٌ، قَبِلَتِ الْمَاءَ، فَأَنْبَتَتِ الْكَلأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيْرَ. وَكَانَتْ مِنْهَا أَجَادِبُ، أَمْسَكَتِ الْمَاءَ، فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ، فَشَرِبُوْا، وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا، وَأَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةً أُخْرَى، إِنَّمَا هِيَ قِيْعَانٌ، لَا تُمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلأً.

فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ، وَنَفَعَهُ بِمَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهِ، فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَأْسًا، وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللّٰهِ الَّذِيْ أُرْسِلْتُ بِهِ"

قَالَ أَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ: قَالَ إِسْحَاقُ، عَنْ أَبِيْ أُسَامَةَ: وَكَانَ مِنْهَا طَائِفَةٌ قَيَّلَتِ الْمَاءَ.

قَاعٌ: يَعْلُوْهُ الْمَاءُ، وَالصَّفْصَفُ: الْمُسْتَوِيُ مِنَ الْأَرْضِ.

وضاحت: یہ حدیث اسحاق بن راہویہ کی سند سے بھی مروی ہے۔ اس میں قَبِلَتِ الْمَاءَ کی جگہ قَيَّلَتِ الْمَاءَ ہے، اللہ جانیں یہ کیا لفظ ہے۔ عام طور پر شارحین اس کو تصحیف قرار دیتے ہیں، صحیح لفظ قبلت ہے، کتابت میں ایسی غلطیاں ہوجاتی ہیں۔ ایک طالب علم نے شعبہ اور سفیان ثوری رحمہما اللہ سے پڑھا تھا، اس کی کاپی میں شعبة کا سبعة ہوگیا، اور سفیان کا سبعین۔ پس جب وہ روایت کرتا تو عن سبعة و سبعين کہتا جو تصحیف تھی۔

جاننا چاہئے کہ بخاری شریف میں جہاں بھی اسحاق مطلق آتا ہے تو اسحاق بن راہویہ مراد ہوتے ہیں (فتح)

قیعان: کا مفرد قاعٌ ہے، اور قاع: ایسے میدان کو کہتے ہیں جس پر پانی چڑھ کر آگے گذر جائے یعنی چٹیل سپاٹ میدان، یہ لفظ سورۂ طٰہٰ میں آیا ہے: ﴿فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا﴾: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ساری زمین کو چٹیل ہموار میدان بنادیں گے، الصَّفْصَفَ کے معنی ہیں: ہموار زمین۔

فائدہ: امام بخاری رحمہ اللہ کی عادت ہے کہ حدیث میں کوئی مشکل لفظ آتا ہے تو اس کے معنی بیان کرتے ہیں، پھر

اگر وہ لفظ قرآنِ کریم میں آیا ہے تو جس آیت میں وہ لفظ آیا ہے اس میں اگر کوئی اور لفظ مشکل ہوتا ہے تو اس کے بھی معنی بیان کرتے ہیں۔

بابُ رَفْعِ الْعِلْمِ وَظُهُوْرِ الْجَهْلِ

علم کے اٹھنے اور جہل کے پھیلنے کا بیان

پڑھنے کے بعد پڑھانا اس لئے ضروری ہے کہ اگر یہ سلسلہ جاری نہیں رہے گا تو علم اٹھ جائے گا اور جہالت پھیل جائے گی۔ آج پورا ملک علماء سے بھرا پڑا ہے، مگر جگہ جگہ غیر مقلدین کا فتنہ سر ابھار رہا ہے۔ قادیانی اچھل کود کر رہے ہیں، جماعت اسلامی کے لوگ دندناتے پھر رہے ہیں۔ رضا خانی لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں مگر کوئی فاضل ان سے لوہا لینے والا نہیں، کوئی ایسا نہیں جو ان کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرے، ہاں چند حضرات ہیں، مگر وہ ایک انار سو بیمار کی مثال ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے فضلاء فارغ ہو جاتے ہیں، زندگی بھر کسی موضوع کے پیچھے لگے نہیں رہتے، اس صورتِ حال نے گمراہ فرقوں کو پھیلنے کا موقع دیا اس لئے فارغ اور فاضل کا تصور ذہن سے نکال دو اور کام میں لگو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو علم اٹھ جائے گا اور زمین گمراہی سے بھر جائے گی۔

حضرت ربیعۃ الرائے جو بہت بڑے محدث وفقیہ ہیں اور امام مالک رحمہ اللہ کے استاذ ہیں: فرماتے ہیں: جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کچھ بھی علم دیا ہے اس کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ضائع کرے، اور خود کو ضائع کرنا یہ ہے کہ پڑھ کر فارغ ہو جائے پس جو تھوڑا بہت علم حاصل کیا تھا وہ بھی ضائع ہو جائے گا۔ لہٰذا یہاں سے نکلنے کے بعد پڑھنا جاری رکھو، قطرہ قطرہ دریا شود، پڑھتے رہو گے تو بڑھتے رہو گے۔ اور لوگوں کو فیض پہنچاؤ، فیض پہنچانے کی بہت سی شکلیں ہیں، کسی عربی مدرسہ میں پڑھانا ہی ضروری نہیں، اور بھی طریقے ہیں، کسی بھی طریقے سے اپنا علمی سفر جاری رکھو۔

حدیث (۱): رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ علم اٹھالیا جائے اور جہالت جم جائے، اور شراب پی جائے اور زنا عام ہو جائے۔

حدیث (۲): حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں تمہیں ایک ایسی حدیث سناتا ہوں جو میرے بعد تمہیں کوئی نہیں سنائے گا، میں نے نبی پاک ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: قیامت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ (۱) علم کم ہو جائے (۲) جہل ظاہر ہو جائے (۳) زنا پھیل جائے (۴) عورتیں زیادہ ہو جائیں اور مرد کم ہو جائیں، یہاں تک کہ پچاس عورتوں کا ذمہ دار ایک مرد ہو۔

تشریح:

پہلے اشراط اور آیات کا فرق بتایا تھا کہ قیامت کی بڑی نشانیوں کو آیات کہتے ہیں اور چھوٹی نشانیوں کو اشراط، ان

حدیثوں میں چند چھوٹی نشانیوں کا ذکر ہے.........اور یرفع العلم، ویثبت الجهل میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اسی طرح تشرب الخمر، ویظهر الزناء: میں بھی ربط ہے۔

یہ دونوں حدیثیں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہیں، پہلی حدیث میں أن یُرفع العلم ہے اور دوسری میں أن یقل العلم، یہ روایت بالمعنی ہے، دورِ اول میں روایت بالمعنی ہوتی تھی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بصرہ میں وفات پانے والے صحابہ میں آخری صحابی ہیں، اس لئے آپؓ نے فرمایا کہ نبی ﷺ سے یہ حدیث سننے والا اب میرے علاوہ کوئی باقی نہیں رہا۔

اور پچاس عورتوں کا ذمہ دار ایک مرد ہوگا، اس کی کیا صورت ہوگی یہ بات ابھی نہیں بتائی جاسکتی۔ یا تو مرد جنگوں میں مارے جائیں گے، اس لئے یہ صورتِ حال ہوجائے گی یا لڑکیوں کی شرح پیدائش بڑھ جائے گی، یا کوئی اور وجہ ہوگی، بہر حال وقت پر ہی اس کی وجہ معلوم ہوگی۔ قبل از وقت کچھ کہنا مشکل ہے۔

[۲۱-] بابُ رَفْعِ الْعِلْمِ وَظُهُوْرِ الْجَهْلِ

وَقَالَ رَبِيْعَةُ: لاَيَنْبَغِيْ لِأَحَدٍ عِنْدَهُ شَيْئٌ مِنَ الْعِلْمِ أَنْ يُضَيِّعَ نَفْسَهُ.

[۸۰-] حدثنا عِمْرَانُ بْنُ مَيْسَرَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ، عَنْ أَبِيْ التَّيَّاحِ، عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: " إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ: أَنْ يُرْفَعَ الْعِلْمُ، وَيَثْبُتَ الْجَهْلُ، وَيُشْرَبَ الْخَمْرُ، وَيَظْهَرَ الزِّنَاءُ " [انظر: ۸۱، ۵۲۳۱، ۵۵۷۷، ۶۸۰۸]

[۸۱-] حدثنا مُسَدَّدٌ، قَالَ: ثَنَا يَحْيىَ بْنُ سَعِيْدٍ، عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: لَأُحَدِّثَنَّكُمْ حَدِيْثًا لاَ يُحَدِّثُكُمْ أَحَدٌ بَعْدِيْ، سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: " مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ: أَنْ يَقِلَّ الْعِلْمُ، وَيَظْهَرَ الْجَهْلُ، وَيَظْهَرَ الزِّنَاءُ، وَتَكْثُرَ النِّسَاءُ، وَيَقِلَّ الرِّجَالُ حَتّٰى يَكُوْنَ لِخَمْسِيْنَ امْرَأَةً الْقَيِّمُ الْوَاحِدُ " [راجع: ۸۰]

بابُ فَضْلِ الْعِلْمِ

علم کی فضیلت کا بیان

یہاں ایک اشکال ہے: کتاب العلم کے شروع میں بالکل یہی باب آچکا ہے، پھر یہ باب مکرر کیوں لائے؟ حاشیہ میں اس کے دو جواب دیئے ہیں:

پہلا جواب: کتاب العلم کے شروع میں جو باب ہے وہ بعض نسخوں میں ہے، اکثر نسخوں میں نہیں ہے، اور یہ

جواب راجح ہے اس لئے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر کتاب کے شروع میں آیات لکھتے ہیں۔ اور پوری کتاب کی حدیثیں انہی آیات کی تفسیر ہوتی ہیں، کتاب العلم کے شروع میں بھی امام بخاریؒ نے دو آیتیں لکھی ہیں وہاں باب نہیں ہے۔

اور دوسرا جواب: یہ ہے کہ وہاں علماء کی فضیلت کا بیان تھا اور یہاں علم کی فضیلت کا بیان ہے، وہاں حضرت رحمہ اللہ نے جو دو آیتیں لکھی ہیں ان میں علماء کی فضیلت ہے، اور اب علم کی فضیلت بیان کرتے ہیں، اور اتنا معمولی فرق امام بخاریؒ کے نزدیک نیا باب قائم کرنے کے لئے کافی ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دریں اثناء کہ میں سویا ہوا تھا میرے پاس دودھ کا ایک پیالہ لایا گیا، میں نے اس کو پیا یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ سیرابی میرے ناخنوں سے نکل رہی ہے (یہ عربی محاورہ ہے اور اردو محاورہ ہے: میرا رواں رواں سیراب ہوگیا) پھر میں نے اپنا بچا ہوا عمر کو دیدیا۔ صحابہ نے پوچھا: اس کی تعبیر کیا ہے اے اللہ کے رسول! آپؐ نے فرمایا: علم!

تشریح:

آنحضور ﷺ کے بعد امت میں سب سے اونچا علمی مقام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے، اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جزئی فضیلت ہے اس سے ان کی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر برتری لازم نہیں آتی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ نے ازالۃ الخفاء میں ایک مستقل رسالہ اقوالِ عمر کے نام سے لکھا ہے اگر اس کو علاحدہ کردیا جائے تو دو سو صفحے کی کتاب تیار ہو جائے گی۔ اتنی زیادہ رائیں حضرت عمرؓ سے مروی ہیں اگرچہ روایت حدیث میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما بڑھے ہوئے ہیں، مگر وہ ان کا اپنا علم نہیں، بلکہ آنحضور ﷺ کے ارشادات ہیں۔

اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے حدیثیں بھی کم مروی ہیں اور فقہی آراء بھی۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آپؓ کا انتقال جلدی ہوگیا ہے، اس لئے ان سے مرویات کم ہیں، تاہم اگر یہ بات کہیں کہ یہ حضرت عمرؓ کی جزئی فضیلت ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اس لئے کہ جزئی فضیلت کلی فضیلت سے معارض نہیں ہوتی۔

اور پہلے میں نے اس کی مثال دی ہے کہ ایک طالب علم دورے میں اول آیا مگر ترمذی شریف میں اس کے پینتالیس نمبر ہیں اور ایک دوسرے طالب علم کے پچاس نمبر ہیں مگر وہ اول نہیں آیا تو یہ جزئی فضیلت ہے اور کلی فضیلت اس کو حاصل ہے جو اول آیا ہے۔

باب سے مناسبت: آنحضور ﷺ نے اپنا بچا ہوا دودھ یعنی علم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عنایت فرمایا، اس سے علم کی فضیلت ثابت ہوئی۔

[۲۲-] بابُ فَضْلِ الْعِلْمِ

[۸۲-] حدثنا سَعِيْدُ بْنُ عُفَيْرٍ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ اللَّيْثُ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ عُقَيْلٌ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ حَمْزَةَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ، أَنَّ ابْنَ عُمَرَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: " بَيْنَمَا أَنَا نَائِمٌ أُتِيْتُ بِقَدَحِ لَبَنٍ، فَشَرِبْتُ حَتّٰى إِنِّيْ لَأَرَى الرِّيَّ يَخْرُجُ فِيْ أَظْفَارِيْ، ثُمَّ أَعْطَيْتُ فَضْلِيْ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ" قَالُوْا: فَمَا أَوَّلْتَهُ يَارسولَ اللّٰهِ؟ قَالَ:" الْعِلْمَ" [انظر: ۳٦۸۱، ۷۰۰٦، ۷۰۰۷، ۷۰۲۷، ۷۰۳۲]

قولہ: العلمَ: بربنائے مفعول منصوب ہے أی أَوَّلْتُ الْعِلْمَ۔

باب الْفُتْيَا وَهُوَ وَاقِفٌ عَلٰى ظَهْرِ الدَّابَّةِ أَوْ غَيْرِهَا

سواری وغیرہ کی پیٹھ سے فتوی دینا

مسئلہ بتاتے وقت سائل اور مسئول کا ایک لیول پر ہونا ضروری نہیں۔ اگر سائل زمین پر ہو اور مفتی اونٹ وغیرہ پر، تو اس میں کچھ حرج نہیں، یا سائل بلند جگہ ہو اور مفتی نیچے تو اس میں بھی کچھ حرج نہیں۔

حدیث: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ منی میں لوگوں کے لئے کھڑے ہوئے تا کہ لوگ آپؐ سے مسائل پوچھیں، چنانچہ آپؐ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا: مجھے خیال نہیں رہا اور میں نے قربانی سے پہلے سر منڈا لیا؟ آپؐ نے فرمایا: اب قربانی کرلو کوئی حرج نہیں۔ دوسرا شخص آیا اس نے کہا: مجھے خیال نہیں رہا اور میں نے رمی سے پہلے قربانی کرلی، آپؐ نے فرمایا: اب رمی کرلو کوئی حرج نہیں! حضرت عبداللہ فرماتے ہیں: اس دن نبی ﷺ سے جس نے بھی تقدیم وتاخیر کے بارے میں پوچھا آپؐ نے یہی جواب دیا کہ جو کام رہ گیا ہے وہ کرلو، کوئی حرج نہیں۔

تشریح:

ذی الحجہ کی دس تاریخ کو منی میں چار کام کرنے ہوتے ہیں: پہلے رمی، پھر قربانی، پھر سر منڈا کر یا زلفیں بنوا کر احرام کھولنا، پھر طواف زیارت کرنا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ مناسک اسی ترتیب سے ادا فرمائے ہیں۔ اور یہی ترتیب صحابہ کو بتائی گئی تھی۔ اب اختلاف ہوا کہ ان میں ترتیب واجب ہے یا سنت؟

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک قارن اور متمتع پر رمی، ذبح اور حلق میں ترتیب واجب ہے، تقدیم وتاخیر کی صورت میں دم واجب ہوگا، اور طواف زیارت میں ترتیب واجب نہیں، البتہ مسنون یہ ہے کہ مناسک ثلاثہ کے بعد طواف زیارت کرے، اور مفرد پر چونکہ قربانی واجب نہیں اس لئے اس پر صرف رمی اور حلق میں ترتیب واجب ہے، احناف کے

یہاں فتوی اسی پر ہے، اور ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے نزدیک مذکورہ چاروں مناسک میں ترتیب سنت ہے، پس تقدیم وتاخیر کی صورت میں کوئی دم واجب نہیں۔

مذکورہ حدیث سے جمہور نے استدلال کیا ہے اور امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر دونوں سائل مفرد تھے تو ان پر قربانی واجب نہیں تھی، پس ان کے لئے رمی سے پہلے قربانی اور قربانی سے پہلے حلق جائز تھا۔

علاوہ ازیں لاحرج والی روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے (رواہ البخاری، مشکوۃ حدیث ٢٦٥٦) پھر ابن عباسؓ کا فتوی تھا: مَنْ قَدَّمَ شَيْئًا مِنْ حَجِّه أَوْ أَخَّرَه فَلْيُهْرِقْ لِذٰلِكَ دَمًا: یعنی جو مناسک میں تقدیم وتاخیر کردے اس کو چاہئے کہ دم دے (اعلاء السنن ١٠: ٥٩) لہٰذا اب لاحرج والی روایت میں تاویل ضروری ہوگی اس لئے کہ راوی اپنی روایت کے خلاف فتوی نہیں دے سکتا۔

اور تاویل یہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں تشریع کے وقت کی ترخیص ہے، جب کوئی نیا مسئلہ بتایا جاتا ہے تو فوری طور پر جو الجھن پیش آتی ہے اس میں شریعت سہولت دیتی ہے، ترمذی (حدیث ١٤٩٦) میں حدیث ہے: حضور اقدس ﷺ نے عید قربان کے دن تقریر فرمائی اور (پہلی مرتبہ) یہ مسئلہ بیان کیا کہ تم میں سے کوئی قربانی نہ کرے جب تک عید کی نماز نہ ہوجائے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میرے ماموں کھڑے ہوئے، انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ ایسا دن ہے جس میں گوشت ناپسند ہوجاتا ہے، یعنی شروع میں تو لوگ رغبت سے گوشت کھاتے ہیں مگر جب ہر طرف گوشت ہوجاتا ہے تو طبیعت گوشت سے ہٹ جاتی ہے، اس لئے میں نے جلدی قربانی کرلی تاکہ گھر والے اور پڑوسی رغبت سے گوشت کھائیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آپ اپنی قربانی دوبارہ کریں'' انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے پاس بکری کا ایک بچہ ہے جو گھر کی بکری کے دودھ سے پلا ہے، وہ قصائی کی دو بکریوں سے اچھا ہے، تو کیا میں اس کی قربانی کرسکتا ہوں؟ آپؐ نے اجازت دی اور فرمایا: لاتُجْزِئُ جَذَعَةٌ بعدك: یہ سہولت صرف آپ کے لئے ہے، آپ کے بعد کسی اور کے لئے جذع (ایک سال سے کم عمر کی بکری) کی قربانی جائز نہیں۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جب نیا قانون بنتا ہے اس وقت جو الجھن پیش آتی ہے اس میں شریعت سہولت دیتی ہے، یہی تشریع کے وقت کی ترخیص ہے۔

اسی طرح اگرچہ مناسک کی ترتیب سمجھا دی گئی تھی مگر عدم مزاولت سے خلاف ورزی ہوگئی، تو آپؐ نے درگذر فرمایا اور کفارہ کا حکم نہیں دیا (مزید تفصیل کتاب الحج میں آئے گی)

[٢٣-] بابُ الْفُتْيَا وَهُوَ وَاقِفٌ عَلٰى ظَهْرِ الدَّابَّةِ أَوْ غَيْرِهَا

[٨٣-] حدثنا إِسْمَاعِيْلُ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عِيْسَى بْنِ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ، عَنْ

عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم وَقَفَ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ بِمِنًى لِلنَّاسِ يَسْأَلُوْنَهُ، فَجَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ: لَمْ أَشْعُرْ فَحَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَذْبَحَ؟ قَالَ: "اذْبَحْ وَلَا حَرَجَ" فَجَاءَ آخَرُ فَقَالَ: لَمْ أَشْعُرْ فَنَحَرْتُ قَبْلَ أَنْ أَرْمِيَ؟ قَالَ: "ارْمِ وَلَا حَرَجَ" قَالَ: فَمَا سُئِلَ النبيُّ صلی الله علیه وسلم عَنْ شَيْءٍ قُدِّمَ وَلَا أُخِّرَ إِلَّا قَالَ: افْعَلْ وَلَا حَرَجَ. [انظر: ١٢٤، ١٧٣٦؛ ١٧٣٧، ١٧٣٨، ٦٦٦٥]

بابُ مَنْ أَجَابَ الْفُتْيَا بِإِشَارَةِ الْيَدِ وَالرَّأْسِ

ہاتھ یا سر کے اشارہ سے مسئلہ بتانا

فتوی دینے کے لئے منہ سے بولنا ضروری نہیں، آنکھ سے، ہاتھ سے یا سر کے اشارۂ مفہمہ سے بھی جس کو مستفتی سمجھ لے جواب دے سکتے ہیں۔اس باب میں تین حدیثیں ہیں:

حدیث(۱): حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے حجۃ الوداع کے موقع پر سوالات کئے گئے، ایک شخص نے پوچھا: میں نے رمی سے پہلے قربانی کرلی تو آپؐ نے ہاتھ کے اشارہ سے فرمایا: کوئی حرج نہیں، دوسرے شخص نے پوچھا: میں نے قربانی سے پہلے سر منڈالیا؟ آپؐ نے اشارہ فرمایا: کوئی حرج نہیں۔

تشریح: اشارے قوموں کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں، جیسے ہمارے یہاں اگر کوئی انگوٹھا دکھائے تو گالی سمجھی جاتی ہے، اور یورپ اور امریکہ میں شکریہ ہے، پس حضور اقدس ﷺ نے کس طرح اشارہ فرمایا تھا یہ بات میں نہیں سمجھا جاسکتا، کیونکہ اس سلسلہ میں حدیث میں کوئی اشارہ نہیں۔

حدیث(۲): حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (آئندہ) "علم اٹھالیا جائے گا، اور جہالت اور فتنے پھیل جائیں گے، اور ہرج بڑھ جائے گا" صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ہرج کیا ہے؟ آپؐ نے اس طرح ہاتھ سے اشارہ کیا، پس ہاتھ کو ٹیڑھا کیا گویا آپؐ قتل مراد لے رہے ہیں۔

لغت: هَرَجَ الْقَوْمُ يَهْرِجُ هَرْجًا: لوگوں کا فتنہ وفساد اور قتل وقتال میں مبتلا ہونا۔ اردو میں اس کو ہرج مرج یعنی شورش وبلوی کہتے ہیں۔

تشریح: اور علم اٹھالئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ علم کی گرم بازاری ختم ہوجائے گی۔ لوگ فتنوں میں پڑجائیں گے، اور فتنے بڑھ کر بلوے کی شکل اختیار کرلیں گے، صحابہ کرامؓ ہرج کی مراد نہیں سمجھے تھے اس لئے سوال کیا، آپؐ نے ہاتھ ٹیڑھا کرکے جواب دیا کہ قتل مراد ہے یہی ٹکڑا باب سے متعلق ہے۔

[٢٤-] بابُ مَنْ أَجَابَ الْفُتْيَا بِإِشَارَةِ الْيَدِ وَالرَّأْسِ

[٨٤-] حدثنا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ، قَالَ: ثَنَا وُهَيْبٌ، قَالَ: ثَنَا أَيُّوْبُ، عَنْ عِكْرِمَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ النبيَّ

صلی اللہ علیه وسلم سُئِلَ فِیْ حَجَّتِهِ، فَقَالَ: ذَبَحْتُ قَبْلَ أَنْ أَرْمِیَ؟ فَأَوْمَأَ بِیَدِهِ، قَالَ:" وَلَا حَرَجَ" وَقَالَ: حَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَذْبَحَ؟ فَأَوْمَأَ بِیَدِهِ: " وَلَا حَرَجَ" [انظر: ١٧٢١، ١٧٢٢، ١٧٢٣، ١٧٣٤، ٦٦٦٦]

[٨٥-] حدثنا الْمَکِّیُّ بْنُ إِبْرَاهِیْمَ، قَالَ: أَنَا حَنْظَلَةُ، عَنْ سَالِمٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا هُرَیْرَةَ، عَنِ النبیِّ صلی اللہ علیه وسلم، قَالَ:" یُقْبَضُ الْعِلْمُ، وَیَظْهَرُ الْجَهْلُ وَالْفِتَنُ، وَیَکْثُرُ الْهَرْجُ" قِیْلَ: یَارسولَ اللّٰهِ! وَمَا الْهَرْجُ؟ فَقَالَ: هٰکَذَا بِیَدِهِ، فَحَرَّفَهَا کَأَنَّهُ یُرِیْدُ الْقَتْلَ.

[انظر: ١٠٣٦، ١٤١٢، ٣٦٠٨، ٤٦٣٥، ٤٦٣٦، ٦٠٤٧، ٦٥٠٦، ٧٠٦١، ٧١١٥، ٧١٢١]

حدیث(۳):صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بڑی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئی درانحالیکہ وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا: لوگوں کا کیا حال ہے؟ انھوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ پس اچانک لوگ کھڑے تھے یعنی نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا: سبحان اللہ! یعنی میں نماز پڑھ رہی ہوں، کیسے بولوں! میں نے پوچھا: کوئی نشانی ظاہر ہوئی ہے؟ انھوں نے سر کے اشارہ سے کہا: ہاں! پس میں بھی نماز میں کھڑی ہوگئی، یہاں تک کہ مجھ پر غشی طاری ہوگئی، یعنی گرمی کی شدت کی وجہ سے بے ہوش ہونے کے قریب ہوگئی، میں اپنے سر پر پانی ڈالتی تھی (نماز کے بعد نبی ﷺ نے تقریر فرمائی) پہلے اللہ عزوجل کی حمد وثنا کی پھر فرمایا: ''کوئی چیز باقی نہیں رہی جس کو میں نے (معراج میں) نہیں دیکھا تھا، مگر میں نے اس کو اس جگہ دیکھ لیا یہاں تک کہ جنت وجہنم کو بھی دیکھ لیا، پھر میری طرف وحی کی گئی کہ تم اپنی قبروں میں آزمائشوں میں مبتلا کئے جاؤ گے دجال کے فتنہ کی طرح یا اس کے لگ بھگ! راوی کہتا ہے: مجھے لفظ مثل اور قریب میں شک ہے کہ حضرت اسماءؓ نے کونسا لفظ بولا تھا اس (مقبور) سے پوچھا جائے گا: ان (محمد ﷺ) کے بارے میں تو کیا جانتا تھا؟ پس رہا مؤمن یا فرمایا موقن —— راوی کو شک ہے کہ حضرت اسماء نے کونسا لفظ کہا تھا —— تو وہ کہے گا: یہ محمد ﷺ ہیں، جو اللہ کے رسول ہیں۔ ہمارے پاس واضح نشانیاں اور ہدایت لے کر آئے، پس ہم نے ان کی دعوت قبول کی اور ہم نے ان کی پیروی کی۔ وہ محمد ﷺ ہیں، یہ بات بطور تاکید تین مرتبہ کہے گا۔ پس اس سے کہا جائے گا: آرام سے سوجا، ہم پہلے سے جانتے تھے کہ تو ان پر یقین رکھتا ہے۔

اور رہا منافق یا کہا مُرتاب —— راوی کہتا ہے: مجھے نہیں معلوم کہ حضرت اسماءؓ نے کونسا لفظ بولا تھا —— کہے گا، میں کچھ نہیں جانتا، میں نے لوگوں کو کچھ کہتے سنا تھا سو میں نے بھی کہا تھا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔

تشریح:

۱- اس حدیث میں تقدیم وتاخیر ہے، واقعہ کی صحیح نوعیت یہ ہے کہ مدنی دور میں سورج گہن ہوا جس میں سورج

آدھے سے زیادہ پکڑا گیا، یہ گہن صبح تقریباً آٹھ نو بجے کے درمیان ہوا تھا اور مغرب سے پہلے جیسی صورت ہوتی ہے ویسی صورت ہوگئی۔ یہ واقعہ سن ۱۰ ہجری کا ہے۔

جب سورج گہن شروع ہوا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کرایا: الصلوٰۃ جامعۃ: یعنی جامع مسجد چلو جماعت ہورہی ہے، یہ اعلان سن کر مدینہ امنڈ آیا۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بھی آئیں، اس وقت مسجد نبوی میں جماعت ہورہی تھی۔ حضرت عائشہؓ اپنے حجرہ سے اقتداء کررہی تھیں، حضرت اسماءؓ نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا: کیا بات پیش آئی؟ یہ بےوقت کی نماز کیسی؟ حضرت عائشہؓ نے منہ سے سبحان اللہ کہا یعنی میری نیت بندھ رہی ہے، کیسے بولوں؟ اور شہادت کی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

حضرت اسماءؓ نے پوچھا: کیا کوئی نشانی ظاہر ہوئی ہے؟ حضرت عائشہؓ نے سر کے اشارہ سے کہا: ہاں، (یہی ٹکڑا باب سے متعلق ہیں) حضرت اسماءؓ بھی شریک جماعت ہوگئیں چونکہ گرمی شدید تھی، اس وجہ سے ان پر بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہوئی تو ان کے برابر برتن میں پانی رکھا تھا وہ اس میں سے پانی لے کر اپنے اوپر ڈالتی تھیں تاکہ گرمی سے کچھ راحت ملے، اور بے ہوشی آگے نہ بڑھے۔

۲- نماز کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر تقریر فرمائی جس میں ایک بات یہ فرمائی کہ سورج اور چاند کسی کی موت یا حیات کی وجہ سے نہیں گہناتے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ مخلوق کو دکھاتے ہیں، اور یہ بات خاص طور پر اس لئے فرمائی کہ زمانۂ جاہلیت سے یہ تصور چلا آرہا تھا کہ جب کوئی بڑا حادثہ پیش آتا ہے تو کائنات بھی سوگ مناتی ہے، جس دن سورج گہنایا تھا اس سے ایک دن پہلے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ کا انتقال ہوا تھا، اس لئے لوگوں میں یہ باتیں چلیں کہ آج سورج نے سوگ منایا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باطل خیال کی تردید فرمائی۔ یہ مضمون یہاں نہیں ہے کسوف کی دیگر حدیثوں میں ہے۔

۳- اور دوسرا مضمون یہ بیان فرمایا کہ ہر شخص قبر میں آزمائش سے دوچار ہوگا، جیسے خروج دجال کے وقت ہر شخص آزمائش میں مبتلا ہوگا، جب دجال کا ظہور ہوگا تو وہ ایسی ایسی کرامتیں دکھائے گا کہ مؤمنین مشکل میں پڑجائیں گے، قبر کی آزمائش بھی اسی طرح کی ہولناک آزمائش ہے، جب میت قبر میں رکھ دی جاتی ہے تو دو فرشتے آتے ہیں منکر نکیر، منکر کے معنی ہیں: اوپرا، نامانوس۔ اور نکیر: فعیل کا وزن ہے وہ بھی مُنْکَر (اسم مفعول) کے معنی میں ہے۔ اس طرح فرشتے کافر میت کے پاس آتے ہیں، ان کی آنکھیں نیل گوں ڈراونی ہوتی ہیں اور یہ آدھا مضمون ہے، دوسرا آدھا مضمون یہ ہے کہ مسلمان میت کے پاس فرشتے نہایت خوبصورت مانوس شکل میں آتے ہیں ان کے نام مُبشِّر اور بشیر ہیں۔ مُبشِّر (اسم فاعل) کے معنی ہیں: خوشخبری سنانے والا، اور بشیر (فعیل کا وزن) مُبشِّر ہی کے معنی میں ہے، وہ میت سے تین سوال کرتے ہیں: تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرائی جاتی ہے اور پوچھا جاتا ہے

کہ یہ بزرگ کون ہے؟

جاننا چاہئے کہ قبر کی دنیا میں آڑ اور پہاڑ نہیں، اور فاصلے بھی نہیں، یہ سب چیزیں ہماری اس دنیا میں ہیں، پس ہر میت اپنی جگہ سے حضور اقدس ﷺ کی زیارت کرے گی۔

پھر مؤمن تمام سوالوں کے جواب صحیح صحیح دے گا، آنحضور ﷺ کے بارے میں کہے گا: یہ محمد ﷺ ہیں، اور یہ اللہ کے رسول ہیں، ہمارے پاس رشد وہدایت لے کر آئے، ہم نے ان کی دعوت قبول کی، اور ان کی پیروی کی۔

اور کافر یا منافق کو جب آپؐ کی زیارت کرائی جائے گی تو وہ ہر سوال کے جواب میں ہاہا کرے گا اور جواب دے گا: میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، لوگ ان کو اللہ کا رسول کہتے تھے: میں بھی کہتا تھا۔ یہ جواب قرینہ ہے کہ حدیث میں صحیح لفظ منافق ہے اس لئے کہ وہی منافقانہ محمد رسول اللہ کہتا تھا۔

۴- قبر میں کافر سے سوال ہوگا یا نہیں؟ بعض کی رائے ہے کہ کافر سے سوال نہیں ہوگا، مرتے ہی اس پر عذاب شروع ہوجائے گا، کیونکہ حدیثوں میں لفظ منافق آیا ہے، مگر صحیح بات یہ ہے کہ کافر سے بھی سوال ہوگا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ذریعہ جو دین بھیجا ہے اگلی دنیا میں داخلہ امتحان ہوگا کہ آدمی اس دین کو لے کر آیا ہے یا تہی دست آیا ہے، پس ہر شخص سے سوال ہوگا۔ واللہ اعلم

فائدہ: آنحضور ﷺ نے جب صلوٰۃ کسوف پڑھائی تو غیب کے درمیان جو پردے حائل تھے سب ہٹا دیئے گئے، چنانچہ جدار قبلی میں جنت وجہنم آپؐ کو نظر آئیں، بخاری میں حدیث (نمبر ۱۰۵۲) آرہی ہے، آنحضور ﷺ کبھی نماز میں قبلہ کی طرف بڑھے اور ہاتھ بڑھایا گویا کچھ لینا چاہتے ہیں اور کبھی پیچھے ہٹ آئے، یہاں تک کہ پہلی صف سے مل گئے۔ نماز کے بعد صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! یہ کیا کیفیت تھی؟ آپؐ نے فرمایا: نماز میں میرے سامنے جنت اور جہنم پیش کی گئیں۔ جب جنت سامنے آئی تو میں آگے بڑھا تاکہ تمہارے لئے انگور کا ایک خوشہ لے لوں۔ اگر میں خوشہ لے لیتا تو تم رہتی دنیا تک اس کو کھاتے۔ پھر جب میرے سامنے جہنم آئی تو مجھے اتنی گرمی محسوس ہوئی کہ میں پیچھے ہٹ آیا۔

نوٹ: یہ حدیث آگے بار بار آئے گی، یہاں اچھی طرح سمجھ لیں۔

[۸۶-] حدثنا مُوْسَى بْنُ إِسْمَاعِيْلَ، قَالَ: ثَنَا وُهَيْبٌ، قَالَ: ثَنَا هِشَامٌ، عَنْ فَاطِمَةَ، عَنْ أَسْمَاءَ، قَالَتْ: أَتَيْتُ عَائِشَةَ وَهِيَ تُصَلِّيْ، فَقُلْتُ: مَا شَأْنُ النَّاسِ؟ فَأَشَارَتْ إِلَى السَّمَاءِ، فَإِذَا النَّاسُ قِيَامٌ، فَقَالَتْ: سُبْحَانَ اللّٰهِ، قُلْتُ: آيَةٌ، فَأَشَارَتْ بِرَأْسِهَا: أَيْ نَعَمْ، فَقُمْتُ حَتّٰى عَلَانِيَ الْغَشْيُ، فَجَعَلْتُ أَصُبُّ عَلٰى رَأْسِيَ الْمَاءَ، فَحَمِدَ اللّٰهَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم وَأَثْنٰى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: " مَا مَنْ شَيْءٍ لَمْ أَكُنْ أُرِيْتُهُ إِلَّا رَأَيْتُهُ فِيْ مَقَامِيْ هٰذَا، حَتّٰى الْجَنَّةَ وَالنَّارَ، فَأُوْحِيَ إِلَيَّ أَنَّكُمْ تُفْتَنُوْنَ فِيْ قُبُوْرِكُمْ مِثْلَ أَوْ: قَرِيْبًا - لَا أَدْرِيْ أَيَّ ذٰلِكَ قَالَتْ أَسْمَاءُ - مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ، يُقَالُ: مَا عِلْمُكَ بِهٰذَا الرَّجُلِ؟ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ أَوْ: الْمُوْقِنُ - لَا أَدْرِيْ

أَيُّهُمَا قَالَتْ أَسْمَاءُ – فَيَقُوْلُ: هُوَ مُحَمَّدٌ، هُوَ رَسُولُ اللهِ، جَاءَ نَا بِالْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى، فَأَجَبْنَاهُ وَاتَّبَعْنَاهُ، هُوَ مُحَمَّدٌ – ثَلاَثًا – فَيُقَالُ: نَمْ صَالِحًا، قَدْ عَلِمْنَا إِنْ كُنْتَ لَمُوْقِنًا بِهِ، وَأَمَّا الْمُنَافِقُ أَوِ الْمُرْتَابُ – لاَ أَدْرِيْ أَيَّ ذٰلِكَ قَالَتْ أَسْمَاءُ – فَيَقُوْلُ: لاَ أَدْرِيْ! سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ شَيْئًا فَقُلْتُهُ"

[انظر: ١٨٤، ٩٢٢، ١٠٥٣، ١٠٥٤، ١٠٦١، ١٢٣٥، ١٣٧٣، ٢٥١٩، ٢٥٢٠، ٧٢٨٧]

بَابُ تَحْرِيْضِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ عَلٰى أَنْ يَّحْفَظُوْا الإِيْمَانَ وَالْعِلْمَ وَيُخْبِرُوْا مَنْ وَرَاءَ هُمْ

وفد عبدالقیس کو نبی ﷺ نے ترغیب دی کہ ایمان وعلم کی باتیں محفوظ کریں اور قبیلہ کے لوگوں کو پہنچائیں

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ مدرسہ میں جو کچھ پڑھتے ہیں وہ ان کی جاگیر نہیں، امانت ہے، پس ضروری ہے کہ اس کو امت تک پہنچائیں۔ حضور اقدس ﷺ نے وفد عبدالقیس کو چار باتوں کا حکم دیا تھا اور شراب کے چار برتنوں کی ممانعت کی تھی، پھر فرمایا کہ میری ان باتوں کو اچھی طرح یاد کرلو، اور قبیلہ کے جو لوگ پیچھے ہیں ان کو پہنچاؤ، تحصیل علم کا یہی مقصد ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ﴾ چاہئے کہ ہر قبیلہ میں سے کچھ لوگ دین کی سمجھ حاصل کرنے کے لئے نکلیں، پھر علم حاصل کر کے قبیلہ کی طرف لوٹیں، اور ان کو عذاب آخرت سے ڈرائیں، تاکہ وہ دین کی مخالفت سے باز آجائیں، اور آخرت کی تیاری میں لگ جائیں۔ یہ علماء کا فرض منصبی ہے۔

اور پہلے میں نے بتایا ہے کہ امام بخاریؒ کے نزدیک وفد عبدالقیس کی حدیث میں ایمان اصل ہے اور باقی چار باتیں اسی کی وضاحت ہیں، اس لئے حضرت رحمہ اللہ ترجمہ میں لفظ ایمان لائے ہیں اور باقی باتوں کو علم میں شامل کیا ہے۔

روایت: حضرت مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ اور ان کے چچازاد بھائی دین سیکھنے کے لئے مدینہ منورہ آئے، بیس دن قیام کیا پھر جب نبی ﷺ نے محسوس کیا کہ ان کو گھر یاد آرہا ہے تو آپؐ نے ان کو لوٹنے کی اجازت دی اور تاکید فرمائی کہ تم نے جو علم حاصل کیا ہے گھر جا کر قبیلہ والوں کو وہ علم سکھلانا۔

[٢٥-] بَابُ تَحْرِيْضِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ عَلٰى أَنْ يَّحْفَظُوْا الإِيْمَانَ وَالْعِلْمَ وَيُخْبِرُوْا مَنْ وَرَاءَ هُمْ

وَقَالَ مَالِكُ بْنُ الْحُوَيْرِثِ: قَالَ لَنَا النبيُّ صلى الله عليه وسلم: " ارْجِعُوْا إِلٰى أَهْلِيْكُمْ، فَعَلِّمُوْهُمْ"

[٨٧-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا غُنْدَرٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ أَبِيْ جَمْرَةَ، قَالَ: كُنْتُ أُتَرْجِمُ

بَيْنَ ابْنِ عَبَّاسٍ وَبَيْنَ النَّاسِ، فَقَالَ: إِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ أَتَوُا النبيَّ صلى الله عليه وسلم، فَقَالَ:" مَنِ الْوَفْدُ؟ أَوْ: مَنِ الْقَوْمُ؟" قَالُوْا: رَبِيْعَةُ، فَقَالَ:" مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ أَوْ: بَالْوَفْدِ غَيْرَ خَزَايَا وَلاَ نَدَامیٰ"، قَالُوْا: إِنَّا نَأْتِيْكَ مِنْ شُقَّةٍ بَعِيْدَةٍ، وَبَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هٰذَا الْحَيُّ مِنْ كُفَّارِ مُضَرَ، وَلاَ نَسْتَطِيْعُ أَنْ نَأْتِيَكَ إِلاَّ فِيْ شَهْرٍ حَرَامٍ، فَمُرْنَا بِأَمْرٍ نُخْبِرُ بِهِ مَنْ وَرَاءَ نَا، نَدْخُلُ بِهِ الْجَنَّةَ، فَأَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ، وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ، أَمَرَهُمْ بِالإِيْمَانِ بِاللّٰهِ وَحْدَهُ، قَالَ: " هَلْ تَدْرُوْنَ مَا الإِيْمَانُ بِاللّٰهِ وَحْدَهُ؟" قَالُوْا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ، قَالَ:" شَهَادَةُ أَنْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلَ اللّٰهِ، وَإِقَامُ الصَّلاَةِ، وَإِيْتَاءُ الزَّكَاةِ وَصَوْمُ رَمَضَانَ، وَتُعْطُوْا الْخُمُسَ مِنَ الْمَغْنَمِ" وَنَهَاهُمْ عَنِ الدُّبَّاءِ، وَالْحَنْتَمِ، وَالْمُزَفَّتِ، قَالَ شُعْبَةُ: رُبَّمَا قَالَ:" النَّقِيْرِ، وَرُبَّمَا قَالَ:" الْمُقَيَّرِ" قَالَ:" احْفَظُوْهُ وَأَخْبِرُوْهُ مَنْ وَرَاءَ كُمْ" [راجع: ۵۳]

وضاحت: یہ حدیث ترجمہ اور تفصیل کے ساتھ پہلے (نمبر ۵۳ پر) گذر چکی ہے............ابوجمرہؒ کہتے ہیں: میں حضرت ابن عباسؓ اور لوگوں کے درمیان ترجمان تھا یعنی جب کوئی فارسی بولنے والا آتا تو میں ترجمانی کے فرائض انجام دیتا......شُقَّةٌ بعيدةٌ: شُقة کے معنی ہیں: مسافت، یعنی ہم دور علاقے سے آئے ہیں، وفد عبدالقیس بحرین سے آیا تھا۔

قال شعبةُ: جن چار برتنوں میں نبیذ بنانے سے منع کیا تھا وہ یہ ہیں: دباء: تونبی، سوکھی لوکی۔ حنتم: ہرے رنگ کا گھڑا۔ مزفَّت: تارکول پھیرا ہوا گھڑا۔ چوتھا برتن کیا تھا؟ شعبہؒ کہتے ہیں: ابوجمرۃ نے کبھی نقیر کہا یعنی لکڑی کھود کر بنایا ہوا برتن، اور کبھی مقیّر کہا یعنی تارکول پھیرا ہوا برتن، مگر صحیح لفظ پہلا ہے، اسی صورت میں چار برتن ہوتے ہیں، کیونکہ مقیّر اور مزفَّت ایک ہیں۔ اور حدیث (۵۳) میں نقیر ہی ہے۔

بابُ الرِّحْلَةِ فِيْ الْمَسْأَلَةِ النَّازِلَةِ

پیش آمدہ مسئلہ کی وجہ سے سفر کرنا

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی مسئلہ پیش آئے اور اس کا حکم معلوم نہ ہو، اور مقامی طور پر اس کا حکم بتلانے والا کوئی نہ ہو تو سفر کر کے ایسے عالم کے پاس جانا چاہئے جو اس کا حکم بتائے۔

پہلے باب آیا ہے: بابُ الخروج في العلم: وہ باب اور یہ باب ایک ہیں، پس یہ تکرار ہے؟ جواب: تکرار نہیں اس لئے کہ گذشتہ باب کا مقصد تھا: علم حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا، اور اس باب کا حاصل ہے: پیش آمدہ مسئلہ کا حکم معلوم کرنے کے لئے سفر کرنا، پس دونوں میں فرق ہو گیا، جیسے ایک شخص علم حاصل کرنے کے لئے دارالعلوم میں آ کر داخل ہوا، یہ الخروج في العلم ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ گاؤں میں ایک مسئلہ پیش آیا، اس کا حکم بتانے والا گاؤں میں کوئی نہیں تھا، اس لئے دو چار آدمی دیوبند دارالافتاء میں مسئلہ معلوم کرنے کے لئے آئے یہ الرحلة في المسئلة النازلة

ہے، پس دونوں بابوں میں عام وخاص مطلق کی نسبت ہے، گذشتہ باب عام تھا اور یہ باب خاص ہے، اتنے معمولی فرق سے بھی امام بخاریؒ باب قائم کرتے ہیں۔

حدیث: حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے ابو اہاب کی لڑکی سے نکاح کیا جب شادی کی شہرت ہوئی تو ایک کالی عورت ان کے پاس آئی، اس نے کہا: عقبہ تو نے کس سے نکاح کرلیا، میں نے تجھے اور جس سے تو نے نکاح کیا ہے دونوں کو دودھ پلایا ہے۔ عقبہؓ نے کہا: یہ بات میں نہیں جانتا، نہ آج سے پہلے تو نے یہ بات بتائی، پھر وہ سوار ہوکر رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ گئے، اور آپؐ سے مسئلہ دریافت کیا، آپؐ نے فرمایا: اس کو کیسے نکاح میں رکھو گے جبکہ وہ یہ بات کہہ رہی ہے؟ چنانچہ حضرت عقبہ نے اس عورت کو علاحدہ کردیا اور دوسری عورت سے نکاح کیا۔

تشریح: جب نکاح کی شہرت ہوئی تو ایک حبشن آئی اور اس نے کہا: میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے، پس تم دونوں بھائی بہن ہو اور تمہارا نکاح درست نہیں۔ حضرت عقبہؓ مسئلہ دریافت کرنے کے لئے مدینہ پہنچے، اور آپ سے عرض کیا: میں نے فلاں عورت سے نکاح کیا، اب ایک حبشن کہتی ہے: میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے، اور یارسول اللہ! وہ جھوٹی ہے، پس نبی ﷺ نے رخ پھیرلیا، انھوں نے دوسری طرف سے آکر یہی بات کہی تو آپؐ نے پھر رخ پھیرلیا، ان کو احساس نہ ہوا کہ آپؐ کیوں اعراض کررہے ہیں؟ جب تیسری مرتبہ یہی بات عرض کی تو آپؐ نے رخ نہیں پھیرا بلکہ فرمایا: جب وہ کہتی ہے کہ اس نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے تو تم اس کو نکاح میں کیسے رکھو گے؟ اسے چھوڑ دو! یہ تفصیل آگے حدیث (نمبر ۵۱۰۴) میں آرہی ہے۔

مذاہبِ فقہاء: ثبوتِ رضاعت میں ایک عورت کی گواہی کافی ہے یا نہیں؟ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک: رضاعت میں ایک عورت کی گواہی کافی ہے بشرطیکہ وہ خود مرضعہ (دودھ پلانے والی) ہو اور دوسرے گواہ کی جگہ اس سے قسم لی جائے گی، اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک: دو مردوں کی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی یا چار عورتوں کی گواہی ضروری ہے، اس سے کم شہادت کافی نہیں۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک دو عورتوں کی گواہی کافی ہے۔ غرض ائمہ ثلاثہ نے رضاعت میں صرف عورتوں کی گواہی کا اعتبار کیا ہے اور حنفیہ کا اصول یہاں بھی وہی ہے جو معاملات میں ہے یعنی ثبوت رضاعت کے لئے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ضروری ہے، تنہا عورتوں کی گواہی سے حرمت ثابت نہیں ہوگی۔

اور مذکورہ حدیث سے امام احمد رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے، مگر ان کا استدلال محل نظر ہے، کیونکہ یہاں نہ تو مرضعہ قاضی کے سامنے آئی اور نہ گواہی دی، صرف حضرت عقبہؓ نے اس کی اطلاع دی ہے، پس یہ حدیث کسی بھی امام کا مستدل نہیں، اور یہ مسئلہ منصوص نہیں اجتہادی ہے۔

اور آنحضور ﷺ نے حضرت عقبہؓ کو علاحدگی اختیار کرنے کا حکم دیانۃً دیا تھا قضاءً نہیں دیا تھا، جب ایک عورت کہہ رہی ہے کہ اس نے دونوں کو دودھ پلایا ہے تو اب شک پیدا ہوگیا، اور حدیث ہے: دَعْ مَا یُرِیْبُكَ إِلٰی مالا یُرِیْبُكَ:

جو بات بے کھٹک ہو اسے اختیار کرو اور کھٹک والی بات چھوڑ دو، پس دینداری کا تقاضہ یہ ہے کہ اس عورت کو الگ کر دیا جائے، دنیا میں عورتیں بہت ہیں کسی اور سے نکاح کرے، دینداری کے نقطۂ نظر سے یہ بات ضروری ہے۔ اگر چہ قضاء ضروری نہیں۔

مناسبت: حدیث کا باب سے ربط واضح ہے۔ حضرت عقبہ کو ایک مسئلہ پیش آیا تھا، گاؤں میں کوئی اس کا حل بتانے والا نہیں تھا پس وہ سفر کر کے مدینہ منورہ آئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت کیا، یہی باب ہے۔

[۲۶-] بابُ الرِّحْلَةِ فِي الْمَسْأَلَةِ النَّازِلَةِ

[۸۸-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ مُقَاتِلٍ أَبُو الْحَسَنِ، قَالَ: أَنَا عَبْدُ اللّٰهِ، قَالَ: أَنَا عُمَرُ بْنُ سَعِيْدِ بْنِ أَبِيْ حُسَيْنٍ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أَبِيْ مُلَيْكَةَ، عَنْ عُقْبَةَ بْنِ الْحَارِثِ، أَنَّهُ تَزَوَّجَ ابْنَةً لِأَبِيْ إِهَابِ بْنِ عَزِيْزٍ، فَأَتَتْهُ امْرَأَةٌ فَقَالَتْ: إِنِّيْ قَدْ أَرْضَعْتُ عُقْبَةَ، وَالَّتِيْ تَزَوَّجَ بِهَا، فَقَالَ لَهَا عُقْبَةُ: مَا أَعْلَمُ أَنَّكِ أَرْضَعْتِنِيْ وَلَا أَخْبَرْتِنِيْ، فَرَكِبَ إِلٰى رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بِالْمَدِيْنَةِ فَسَأَلَهُ، فَقَالَ رَسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: " كَيْفَ وَقَدْ قِيْلَ؟" فَفَارَقَهَا عُقْبَةُ وَنَكَحَتْ زَوْجًا غَيْرَهُ. [انظر: ۲۰۵۲، ۲۶٤۰، ۲۶۵۹، ۲۶۶۰، ۵۱۰٤]

قاعدہ: راویوں میں جہاں بھی عبداللہ مطلق آتا ہے تو عبداللہ بن المبارک مراد ہوتے ہیں، اور صحابہ میں عبداللہ بن مسعودؓ مراد ہوتے ہیں۔

بابُ التَّنَاوُبِ فِي الْعِلْمِ

باری باری علم حاصل کرنا

صحابہ عام طور پر بڑی عمروں میں مسلمان ہوئے تھے، اور ان کے کاروبار تھے، کوئی تجارت کرتا تھا، کوئی کھیتی باڑی کرتا تھا، کوئی باغبانی کرتا تھا، اس لئے انھوں نے علم حاصل کرنے کے لئے باریاں مقرر رکھی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی ایک انصاری صحابی کے ساتھ باری مقرر تھی، ایک دن وہ انصاری حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر رہتے اور حضرت عمرؓ اونٹ چراتے یا دوسرے کام کرتے، شام میں وہ ساتھی دن بھر کے احوال سے حضرت عمرؓ کو باخبر کرتا، پھر اگلے دن حضرت عمرؓ خدمتِ نبوی میں حاضر رہتے اور انصاری کام کرتے، شام میں حضرت عمرؓ دن بھر کے احوال سے ان کو مطلع کرتے، یہی تحصیل علم کے لئے باری مقرر کرنا ہے۔

حدیث: حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی قبیلہ بنی امیہ بن زید میں رہتے تھے، یہ قبیلہ مدینہ کے عوالی میں رہتا تھا۔ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باری باری حاضر ہوتے تھے، ایک دن وہ حاضر رہتا اور

ایک دن میں حاضر رہتا۔ جب میں حاضر رہتا تو ان کو دن بھر کی وحی وغیرہ سے باخبر کرتا، اور جب وہ حاضر رہتے تو وہ بھی ایسا ہی کرتے، ایک دن میرے انصاری ساتھی اپنی باری کے دن گھر لوٹے اور زور سے میرا دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا: کیا وہ گھر میں ہیں؟ میں گھبرایا ہوا نکلا، انھوں نے کہا: بہت بڑا حادثہ پیش آ گیا، پھر میں حفصہؓ کے پاس آیا وہ رو رہی تھیں، میں نے پوچھا: کیا تم کو رسول اللہ ﷺ نے طلاق دیدی؟ اس نے کہا: مجھے معلوم نہیں۔ پھر میں نبی ﷺ کے پاس آیا اور میں نے کھڑے کھڑے پوچھا: کیا آپؐ نے اپنی ازواج کو طلاق دیدی؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں! پس میں نے زور سے کہا: اللہ اکبر!

تشریح: بنونضیر اور بنو قریظہ کی فتوحات کے بعد جب نبی ﷺ کی آمدنی بڑھ گئی تو ازواج مطہرات نے آنحضور ﷺ سے نفقہ میں اضافہ کا مطالبہ کیا، آپؐ کو اس مطالبہ سے رنج ہوا، کیونکہ آمدنی بڑھی تھی تو ساتھ ہی مسلمانوں کی ضروریات بھی بڑھی تھیں، اسلام تیزی سے پھیلنا شروع ہوا تھا اور نو مسلموں کی معاشی کفالت حضور ﷺ کی ذمہ داری تھی۔

علاوہ ازیں: اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کے لئے جو معیارِ زندگی پسند فرمایا تھا اس سے بھی یہ مطالبہ میل نہیں کھاتا تھا۔ چنانچہ آپؐ ناراض ہو کر اس بالا خانہ میں فروکش ہو گئے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ پر بنا ہوا تھا۔

اس واقعہ سے پورے مدینہ میں کہرام مچ گیا، اور اس دن باری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پڑوسی عتبان بن مالک کی تھی وہ گھبرائے ہوئے حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضرت عمرؓ گھبرا کر باہر نکلے تو انھوں نے کہا: ایک بہت بڑا حادثہ پیش آ گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: کیا غسان نے حملہ کر دیا ہے؟ ان دنوں غسان کے مدینہ پر حملہ کرنے کی افواہ بڑی تیزی سے گشت کر رہی تھی اس نے کہا: نہیں، اس سے بھی بڑا واقعہ پیش آیا ہے۔ نبی ﷺ نے اپنی تمام ازواج کو طلاق دیدی ہے، اس خبر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پریشان ہو گئے اور انھوں نے بڑی بے چینی سے رات کاٹی، صبح سویرے مسجدِ نبوی میں پہنچے اور سب سے پہلے اپنی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے، اس وقت وہ رو رہی تھیں، ان سے پوچھا: کیا نبی ﷺ نے تم ازواج کو طلاق دیدی؟ انھوں نے کہا: مجھے معلوم نہیں، وہ مسجد میں تشریف لائے، مسجد میں صحابہ بیٹھے رو رہے تھے، انھوں نے آپؐ کے غلام سے کہا: عمر کے لئے اجازت طلب کر، وہ اندر گیا اور باہر آیا اور کہا: میں نے نبی ﷺ سے تمہارا تذکرہ کیا مگر آپؐ نے مجھ سے کچھ نہیں فرمایا۔ حضرت عمرؓ منبر کے پاس جہاں چند لوگ بیٹھے رو رہے تھے آ کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد پھر غلام کے پاس آئے اور کہا: عمر کے لئے اجازت طلب کر، آپؐ پھر خاموش رہے، حضرت عمرؓ پھر منبر کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ پھر بے چینی بڑھی تو پھر غلام کے پاس آئے اور اس سے کہا: عمر کے لئے اجازت طلب کر اور یہ بھی کہا کہ آنحضور ﷺ سے یہ بھی عرض کرنا کہ حفصہ کی طرفداری میں نہیں آیا۔ اگر حکم ہو گا تو اس کا سر پیش کروں گا، یہ بات زور سے کہی، تاکہ آنحضور ﷺ سن لیں۔ اس بار آپؐ نے اجازت دیدی، حضرت عمرؓ نے حجرہ میں داخل ہو کر کھڑے کھڑے سوال کیا: یا رسول اللہ! کیا آپؐ نے ازواج کو طلاق دیدی؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں! آپؐ نے فرطِ مسرت میں بآواز بلند اللہ اکبر کہا تاکہ مسجد میں جو لوگ

رور ہے تھے ان کو تسلی ہو جائے۔ اور وہ مطمئن ہو کر گھر جائیں، یہ حدیث بہت طویل ہے، بخاری شریف میں متعدد بار آئی ہے، کتاب المظالم میں تفصیلی روایت ہے۔

[۲۷-] بابُ التَّنَاوُبِ فِي الْعِلْمِ

[۸۹-] حدثنا أَبُو الْيَمَانِ، قَالَ: أَنَا شُعَيْبٌ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، ح: قَالَ: وَقَالَ ابْنُ وَهْبٍ: أَنَا يُوْنُسُ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي ثَوْرٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ عُمَرَ رضی الله عنه قَالَ: كُنْتُ أَنَا وَجَارٌ لِيْ مِنَ الْأَنْصَارِ فِيْ بَنِيْ أُمَيَّةَ بْنِ زَيْدٍ، وَهِيَ مِنْ عَوَالِي الْمَدِيْنَةِ، وَكُنَّا نَتَنَاوَبُ النُّزُوْلَ عَلٰى رَسُولِ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم، يَنْزِلُ يَوْمًا وَأَنْزِلُ يَوْمًا، فَإِذَا نَزَلْتُ جِئْتُهُ بِخَبَرِ ذٰلِكَ الْيَوْمِ مِنَ الْوَحْيِ وَغَيْرِهِ، وَإِذَا نَزَلَ فَعَلَ مِثْلَ ذٰلِكَ، فَنَزَلَ صَاحِبِيْ الْأَنْصَارِيُّ يَوْمَ نَوْبَتِهِ، فَضَرَبَ بَابِيْ ضَرْبًا شَدِيْدًا فَقَالَ: أَثَمَّ هُوَ؟ فَفَزِعْتُ فَخَرَجْتُ إِلَيْهِ، فَقَالَ: قَدْ حَدَثَ أَمْرٌ عَظِيْمٌ، فَدَخَلْتُ عَلٰى حَفْصَةَ فَإِذَا هِيَ تَبْكِيْ، فَقُلْتُ: أَطَلَّقَكُنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم؟ قَالَتْ: لَا أَدْرِيْ، ثُمَّ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ صلی الله علیه وسلم فَقُلْتُ وَأَنَا قَائِمٌ: أَطَلَّقْتَ نِسَاءَكَ؟ قَالَ: لَا، فَقُلْتُ: اللّٰهُ أَكْبَرُ.

[انظر: ۲٤٦٨، ٤٩١٣، ٤٩١٥، ٥١٩١، ٥٢١٨، ٥٨٤٣، ٧٢٥٦، ٧٢٦٣]

وضاحت: اس حدیث کی امام بخاری رحمہ اللہ نے دو سندیں ذکر کی ہیں، ایک: شعیب عن الزہری اور دوسری یونس عن الزہری۔ مگر وہ ٹکڑا جس سے ترجمۃ الباب کا تعلق ہے صرف شعیب کی روایت میں ہے، یونس کی روایت میں اس کا ذکر نہیں (عمدۃ)

لغت: تَنَاوُب: باب تفاعل کا مصدر ہے اس کے معنی ہیں: باری باری آنا .... اور عوالی وہ بستیاں کہلاتی ہیں جو مدینہ منورہ کی مشرقی جانب میں تھیں، بنو امیہ کا محلّہ اسی جگہ واقعہ تھا، وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی ایک گھر تھا۔

بابُ الْغَضَبِ فِي الْمَوْعِظَةِ وَالتَّعْلِيْمِ إِذَا رَأَى مَا يَكْرَهُ

تعلیم و تذکیر کے وقت اگر کوئی نامناسب بات سامنے آئے تو غصہ کرسکتا ہے

متعدد آیات و روایات میں ہے کہ طلبہ کے ساتھ نرمی برتنی چاہئے، ان کے ساتھ خیر خواہی اور حسنِ سلوک کرنا چاہئے۔ ارشاد پاک ہے: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾: آپؐ اپنا بازو مؤمنین کے لئے جھکا دیں، یہ مثبت پہلو ہے اور منفی پہلو سے فرمایا: ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾: اگر آپؐ درشت خو اور سخت مزاج ہوتے تو صحابہ آپؐ کے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے [آل عمران ۱۵۹]

ان آیات وروایات سے کسی کو یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ طالب علم خواہ کیسی ہی بے تمیزی کرے اس کو ڈانٹنا نہیں چاہئے، اس پر غصہ نہیں ہونا چاہئے، اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ یہ باب لائے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو ڈانٹ ڈپٹ کر سکتے ہیں، یہ بھی تربیت کا ایک انداز ہے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے گلستان میں فرمایا ہے:

وقتے بلطف گوی ومدارا و مردمی ❁ باشد کہ در کمندِ قبول آوری دلے

وقتے بقہر گوئی کہ صد کوزۂ نبات ❁ گہ گہ چناں بکار نیاید کہ حنظلے

(کسی وقت نرمی، مہربانی اور ہمدردی سے ❁ کسی کے دل کو قبولیت کی پھندے میں لانا چاہئے

اور کبھی سخت بات کہنے کے ذریعہ کیونکہ مصری کی سوڈلیاں ❁ کبھی کبھی ایسا کام نہیں کرتیں جو ایک اندرائن کرتی ہے)

غرض غصہ بھی اپنے وقت پر مفید ہوتا ہے، اور غصہ صفتِ محمودہ ہے۔ اللہ کو بھی غصہ آتا ہے، اللہ کے رسول کو بھی غصہ آتا تھا، پس غصہ صفتِ محمودہ ہے۔ اللہ ورسول میں صفت مذمومہ نہیں ہوسکتی۔ جب غصہ صفتِ محمودہ ہے تو اس سے گاہ بہ گاہ کام لینا چاہئے۔ پس اس باب کا حاصل یہ ہے کہ اگر ضرورت ہو تو طالب علم پر غصہ بھی کیا جاسکتا ہے، مگر نفسانیت سے غصہ نہیں کرنا چاہئے، ایسا غصہ طالب علم کو بگاڑ دیتا ہے —— اور اس باب میں تین حدیثیں ہیں:

حدیث (۱): ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! نہیں قریب ہوں میں کہ جماعت میں شریک ہوؤں فلاں صاحب کے لمبی نماز پڑھانے کی وجہ سے، ابو مسعودؓ کہتے ہیں: پس میں نے نبی ﷺ کو موعظت میں اس دن سے زیادہ غضبناک کبھی نہیں دیکھا، آپؐ نے فرمایا: لوگو! تم جماعت سے متنفر کرنے والے ہو، جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے چاہئے کہ وہ ہلکی نماز پڑھائے، اس لئے کہ جماعت میں بیمار، کمزور اور حاجت مند ہوتے ہیں۔

تشریح:

۱- حضرت معاذ رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے قبیلہ کی مسجد میں امامت کرتے تھے، اور طویل قراءت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ نبی پاک ﷺ نے عشاء کی نماز تاخیر سے پڑھائی، اس لئے حضرت معاذؓ اپنے قبیلہ کی مسجد میں تاخیر سے پہنچے، پھر انھوں نے نماز میں سورۂ بقرہ شروع کردی اور اس زمانہ میں قرآن میں رکوع نہیں تھے اس لئے جب سورت ختم ہوگی تبھی رکوع کریں گے۔ چنانچہ ایک صحابی جو دن بھر کے تھکے ہوئے تھے برداشت نہ کرسکے، انھوں نے نماز توڑ دی اور تنہا نماز پڑھ کر جا کر سوگئے، لوگوں نے کہنا شروع کیا: فلاں منافق ہوگیا۔ اگلے دن وہ صحابی آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت معاذؓ بھی اتفاق سے موجود تھے، انھوں نے سارا قصہ بیان کیا، حضور اکرم ﷺ حضرتِ معاذ پر سخت غضبناک ہوئے اور فرمایا: معاذ! کیا تم لوگوں کو آزمائش میں ڈال دوگے! یہ تفصیل بخاری (حدیث ۷۰۵) میں ہے اور مجمع الزوائد (۲:۷۲) میں ہے: ''آئندہ یا تو میرے ساتھ نماز پڑھو، یا ہلکی نماز پڑھاؤ'' .... پھر آپؐ نے کسی اور موقع پر یہ بات خطاب عام میں بھی فرمائی کیونکہ مدینہ میں مسجد نبوی کے

علاوہ نو مسجدیں اور بھی تھیں۔

۲- اس حدیث میں اماموں کو ہلکی نماز پڑھانے کا حکم ہے، کیونکہ جماعت میں بیمار، بوڑھے اور حاجت مند سبھی طرح کے لوگ ہوتے ہیں، پس سب کی رعایت کرکے نماز پڑھانی چاہئے۔

۳- فقہ کی کتابوں میں مسنون قراءت کی جو مقدار بیان کی گئی ہے یعنی فجر وظہر میں طوال مفصل، عصر وعشاء میں اوساط مفصل اور مغرب میں قصار مفصل، یہ مقدار حدیثوں کی روشنی میں تجویز کی گئی ہے، اور اتنی مقدار پڑھنا ہلکی قراءت ہے، عمومی احوال میں مسجد کی جماعت میں اس سے کم قراءت نہیں کرنی چاہئے۔

۴- تخفیف کا تعلق قراءت سے ہے، رکوع وسجود سے نہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہلکی مگر کامل ہوتی تھی، یعنی قراءت مختصر فرماتے تھے مگر رکوع وسجود تام کرتے تھے (یہ حدیث آئندہ آرہی ہے)

۵- فعل کاد: البیلا فعل ہے۔ محل نفی میں اثبات کرتا ہے اور محل اثبات میں نفی کرتا ہے، جیسے کنتُ أَمْشِي فی المکان الزَّلِقِ و کِدتُّ أَنْ أَزِلَّ: میں پھلسن کی جگہ میں چل رہا تھا اور قریب تھا کہ پھسل جاؤں، یعنی نہیں پھسلا۔ یہاں کدتُّ محل اثبات میں ہے اس لئے فعل کی نفی کی۔ اور کنتُ أَمْشِيْ فی الطریق الواضحة وما کِدتُّ أَنْ أَزِلَّ: میں صاف راستہ پر چل رہا تھا اور قریب نہیں تھا کہ پھسل جاؤں یعنی پھر بھی پھسل گیا، یہاں کدتُ محل نفی میں ہے اس لئے فعل کا اثبات کیا باب کی حدیث میں لا أکادُ محل نفی میں ہے اس لئے اثبات کرے گا اور یہ مطلب ہوگا کہ وہ صحابی جماعت میں شریک ہوتے تھے۔

[۲۸-] بابُ الْغَضَبِ فِي الْمَوْعِظَةِ وَالتَّعْلِيْمِ إِذَا رَأَى مَا يَكْرَهُ

[۹۰-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ كَثِيْرٍ، قَالَ: أَخْبَرَنَا سُفْيَانُ، عَنِ ابْنِ أَبِيْ خَالِدٍ، عَنْ قَيْسِ بْنِ أَبِيْ حَازِمٍ، عَنْ أَبِيْ مَسْعُوْدٍ الْأَنْصَارِيِّ، قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: يَارسولَ اللهِ! لاَ أَكَادُ أُدْرِكُ الصَّلاَةَ مِمَّا يُطَوِّلُ بنا فُلاَنٌ، فَمَا رَأَيْتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم فِيْ مَوْعِظَةٍ أَشَدَّ غَضَبًا مِنْ يَوْمِئِذٍ، فَقَالَ: " يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّكُمْ مُنَفِّرُوْنَ، فَمَنْ صَلَّى بِالنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ، فَإِنَّ فِيْهِمُ الْمَرِيْضَ وَالضَّعِيْفَ وَذَا الْحَاجَةِ" [انظر: ۷۰۲، ۶۱۱۰، ۷۱۵۹]

حدیث (۲): حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لقطہ (گری پڑی چیز) کا حکم دریافت کیا، آپؐ نے فرمایا: اس کا تسمہ یا فرمایا: اس کا برتن اور اس کی تھیلی محفوظ رکھو، پھر ایک سال تک تشہیر کرو، پھر اس کو خرچ کرلو، پھر اگر مالک آجائے تو اپنے پاس سے دو۔ ایک شخص نے عرض کیا: اگر گم شدہ اونٹ مل جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپؐ کو غصہ آگیا، یہاں تک کہ آپؐ کا رخسار یا چہرہ سُرخ ہوگیا، آپؐ نے فرمایا: تجھے اس سے کیا لینا ہے؟ اس کے ساتھ اس کا مشکیزہ ہے اور اس کا جوتا ہے یعنی نہ دھوپ میں اس کے پیر جلتے ہیں اور نہ پیاس اس کو ستاتی

ہے، اس کے پاس پانی کا اسٹاک ہے، وہ خود پانی پر پہنچتا ہے اور درخت کھاتا ہے، اس کو چھوڑ دے یہاں تک کہ اس کا مالک اس سے ملاقات کرے۔ ایک اور شخص نے عرض کیا: گم شدہ بکری کا کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وہ تیرے لئے ہے یا تیرے بھائی کے لئے یا بھیڑیئے کے لئے۔

تشریح: اس حدیث میں تقدیم تاخیر ہے، گم شدہ بکری کا حکم پہلے دریافت کیا گیا تھا اور اونٹ کا بعد میں.........

اور اس حدیث میں دو مسئلے ہیں:

پہلا مسئلہ: گری پڑی چیز پانے کے بارے میں ہے۔ اگر کوئی چیز ایسی جگہ پڑی ہو جہاں اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور غالب گمان یہ ہو کہ مالک وہاں اس کو تلاش کرتا ہوا آئے گا تو اس کو اٹھانا نہیں چاہئے، مثلاً درسگاہ میں کسی کی کتاب رہ گئی اس کو اٹھانا نہیں چاہئے۔ جب طالب علم درسگاہ میں آئے گا خود اپنی کتاب اٹھائے گا، اور اگر غالب گمان یہ ہو کہ مالک اس کو وہاں تلاش کرتا ہوا نہیں آئے گا اور وہ محفوظ جگہ ہے، چیز کے ہلاک ہونے کا اندیشہ نہیں تو اختیار ہے چاہے اٹھائے چاہے نہ اٹھائے، اور اگر اس کے ضائع ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو تو اس کو اٹھالینا واجب ہے۔

پھر اگر معمولی چیز ہے مثلاً ایک کھجور ہے تو اس کے مالک کو تلاش کرنا ضروری نہیں، اور اگر وہ قیمتی چیز ہے تو اس کے مالک کو تلاش کرنا ضروری ہے، اور مالک تلاش کرنے کی مدت مالیت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں حدیث میں ایک سال تک تشہیر کرنے کا حکم ہے۔ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ کے عہد مبارک میں ایک تھیلی ملی تھی جس میں سو دینار تھے، آپؐ نے ان کو تین سال تک تشہیر کرنے کا حکم دیا تھا (ترمذی حدیث ۱۳۵۷) ان حدیثوں کی بناء پر علماء نے فرمایا ہے کہ پڑی ہوئی چیز کی اس وقت تک تشہیر کرنا واجب ہے جب تک غالب گمان ہو کہ اس کا مالک اس کو تلاش کر رہا ہوگا۔

دوسرا مسئلہ: اگر جنگل میں کوئی گم شدہ بکری ملے تو اس کو پکڑ لینا چاہئے، ورنہ درندہ اس کو پھاڑ کھائے گا، اور اونٹ کو نہ پکڑے اس کو درندوں سے کوئی خطرہ نہیں، اس لئے کہ عرب کے پہاڑ خشک ہیں وہاں بھیڑیئے تو ہوتے ہیں شیر نہیں ہوتے، اور اونٹ کو بھیڑیئے سے کوئی خطرہ نہیں، علاوہ ازیں اس کے ساتھ اس کا مشکیزہ اور اس کا جوتا ہے، یعنی وہ کئی دن کا پانی اسٹاک کر لیتا ہے اور حسب ضرورت نکال کر کام میں لاتا ہے اور اس کے پاؤں دھوپ میں جلتے نہیں۔ اور کھانے کی اسے کوئی پریشانی نہیں اس کی گردن اتنی لمبی ہے کہ اونچے سے اونچے درخت کے پتے کھا سکتا ہے، پس اس کے بھوک پیاس سے ہلاک ہونے کا خطرہ نہیں۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بکریوں کا ریوڑ بڑا ہوتا ہے، اگر اتفاق سے کوئی بکری پیچھے رہ گئی تو پتا نہیں چلے گا۔ اور کوئی جنگل جا کر اس کو تلاش نہیں کرے گا، اور اونٹ تھوڑے ہوتے ہیں، اگر ایک اونٹ بھی کم آیا تو پتہ چل جائے گا اور مالک اس کو تلاش کرنے کے لئے جنگل جائے گا۔ پس اگر کوئی شخص اس کو پکڑ کر گھر لے آیا تو مالک بے چارہ رات بھر پریشان پھرے گا۔

مگر آج کل کے احوال اور ہیں، اب کوئی چیز کہیں محفوظ نہیں حتی کہ مسجد میں بھی محفوظ نہیں، پس گم شدہ اونٹ بھی گھر لے آنا چاہئے تا کہ چور نہ پکڑ لے جائیں۔

لقطہ کا حکم: امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک اگر پڑی چیز اٹھانے والا خود غریب ہے تو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے۔ اور مالدار (صاحبِ نصاب) ہے تو خیرات کردے، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مالدار بھی اپنے استعمال میں لاسکتا ہے۔ پھر اگر مالک آجائے تو اس کو صورتِ حال بتائے وہ منظور کرے تو فبہا ورنہ اپنے پاس سے ضمان دے۔ اور صدقہ کا ثواب اٹھانے والے کو ملے گا۔

مناسبت: پڑی چیز کو اٹھالینے کا حکم مال کو ہلاک ہونے سے بچانا ہے، پس جہاں لقطہ کے تلف ہونے کا امکان ہو وہاں لقطہ اٹھالینا واجب ہے، اور جہاں یہ اندیشہ نہ ہو بلکہ گمان غالب یہ ہو کہ مالک تلاش کرتا ہوا اس تک پہنچ جائے گا اس لقطہ کو اٹھانا جائز نہیں، سائل نے اس نقطہ پر نظر نہیں کی اور گم شدہ اونٹ کا حکم دریافت کیا، اس پر آپ کو غصہ آگیا، اس لئے کہ سائل نے مقصد التقاط کے سمجھنے میں لاپرواہی کا ثبوت دیا تھا۔

[۹۱-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُوْ عَامِرٍ الْعَقَدِيُّ، قَالَ: ثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ بِلَالٍ الْمَدِيْنِيُّ، عَنْ رَبِيْعَةَ بْنِ أَبِيْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ يَزِيْدَ مَوْلَى الْمُنْبَعِثِ، عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ، أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم سَأَلَهُ رَجُلٌ عَنِ اللُّقَطَةِ، فَقَالَ: "اعْرِفْ وِكَاءَ هَا - أَوْ قَالَ: وِعَاءَ هَا - وَعِفَاصَهَا، ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً، ثُمَّ اسْتَمْتِعْ بِهَا، فَإِنْ جَاءَ رَبُّهَا فَأَدِّهَا إِلَيْهِ"

قَالَ: فَضَالَّةُ الإِبِلِ؟ فَغَضِبَ حَتّٰى احْمَرَّتْ وَجْنَتَاهُ - أَوْ قَالَ: احْمَرَّ وَجْهُهُ - فَقَالَ: " مَالَكَ وَلَهَا؟ مَعَهَا سِقَاؤُهَا وَحِذَاؤُهَا، تَرِدُ الْمَاءَ وَتَرْعَى الشَّجَرَ، فَذَرْهَا حَتّٰى يَلْقَاهَا رَبُّهَا"

قَالَ: فَضَالَّةُ الْغَنَمِ؟ قَالَ:" لَكَ أَوْ لِأَخِيْكَ أَوْ لِلذِّئْبِ " [انظر: ۲۳۷۲، ۲۴۲۷، ۲۴۲۸، ۲۴۲۹، ۲۴۳۶، ۲۴۳۸، ۵۲۹۲، ۶۱۱۲]

قولہ: المدينيُّ: دورِ اول میں مدینہ منورہ کے علاوہ آٹھ شہر اور تھے جن کے ساتھ لفظ مدینہ لگتا تھا، جیسے مدینۃ السلام، جب ان شہروں کی طرف نسبت کرتے تھے تو ی کے ساتھ مدینی کہتے تھے، اور مدینہ منورہ کی طرف نسبت کرتے تھے تو ی کے بغیر مدنی کہتے تھے۔ یہ قاعدہ انساب کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے، مگر یہ قاعدہ دورِ مابعد کے لئے ہے۔ کتب حدیث میں جو رُوات آتے ہیں وہ دورِ ماقبل کے ہیں اس وقت مدینہ طیبہ کی طرف بھی مدینی نسبت کرتے تھے اور مدنی بھی، جیسے امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ علی بن المدینیؒ کے آباؤ اجداد مدینہ منورہ کے تھے اور حضرت خود بصرہ جابسے تھے، ان کی نسبت مدینی ہے۔ اور سلیمان بن بلال بھی مدینہ طیبہ کے تھے، حوض میں نسبت مدینی ہے اور گیلری میں مدنی، یہ

دونوں ایک ہی ہیں، مدنی پہلے کی نسبت ہے، اور مدنی بعد کی۔

قولہ: لُقَطَة: صحیح تلفظ قاف کے زبر کے ساتھ ہے۔ اردو میں قاف کے سکون کے ساتھ بولتے ہیں۔

پرانے زمانے میں دراہم ودنانیر چھوٹی تھیلی میں بند کر کے بڑی تھیلی میں رکھتے تھے۔ پھر کسی ڈوری سے اس کا منہ باندھ دیتے تھے، یہ ڈوری جس سے تھیلی کا منہ باندھا ہے اس کو اردو میں تسمہ اور عربی میں وکاء کہتے ہیں، اور بڑی تھیلی وعاء ہے اور چھوٹی تھیلی عِفَاص ہے، پس اگر کوئی تھیلی یا بٹوا ملے جس میں روپے ہوں تو پہلے اس کی تشہیر کرے پھر استعمال کرلے یا صدقہ کردے، اور تسمہ اور تھیلی اپنے پاس محفوظ رکھے، اگر مالک آجائے تو اس سے علامت پوچھے، اگر وہ ٹھیک ٹھیک علامت بتائے اور ظن غالب ہو جائے کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے تو ضمان دے۔

حدیث (۳): حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ سے کچھ ایسے سوالات کئے گئے جن کو آپؐ نے ناپسند کیا، پس جب لوگوں نے آپؐ پر سوالات کی بوچھار کردی تو آپؐ کو غصہ آگیا، آپؐ نے فرمایا: ''جو چاہو پوچھو'' ایک شخص نے عرض کیا: میرے ابا کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: تمہارے ابا حذافہ ہیں، دوسرا شخص کھڑا ہوا اس نے بھی یہی سوال کیا: آپؐ نے فرمایا: تمہارے ابا سالم ہیں، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چہرۂ انور میں غصہ کے آثار دیکھے تو سامنے آکر دوزانو بیٹھ گئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! ہم ایسے سوالات سے توبہ کرتے ہیں۔

تشریح: ایک موقع پر نبی ﷺ سے بے تکے سوالات پوچھے گئے۔ آپؐ کو اس سے ناگواری ہوئی اور ہر سوال پر آپؐ کا غصہ بڑھتا گیا، آپؐ نے غصہ میں فرمایا: آج جو تمہیں پوچھنا ہے پوچھ لو، صحابہ سہم گئے اور خاموش ہوگئے۔ آپؐ نے کچھ دیر کے بعد فرمایا: پوچھتے کیوں نہیں؟ پوچھو! لوگ خاموش رہے، جب آپؐ نے تیسری بار یہی بات فرمائی تو ایک صحابی کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! میرا باپ کون ہے؟ وہ حضرت حذافہ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ تھے، لوگ انہیں نسب کے بارے میں مطعون کرتے تھے، اور کہا کرتے تھے: تم حذافہ کے نہیں ہو۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: تمہارا باپ حذافہ ہے۔ ایک دوسرے صحابی کے بارے میں بھی اسی قسم کی باتیں ہوتی تھیں۔ انھوں نے بھی اپنے باپ کے بارے میں دریافت کیا: آپؐ نے فرمایا: تمہارا باپ سالم ہے یعنی جس باپ کی طرف تم منسوب ہو وہی تمہارا باپ ہے، پھر جب حضرت عبداللہ بن حذافہ گھر پہنچے تو ان کی والدہ نے ان کو لیا کہ تو نے مجھے بدنام کرنے کا سامان کیا، اگر آپؐ کسی اور کا نام لیتے تو مجھ پر قیامت تک کے لئے دھبہ لگ جاتا۔

پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چہرۂ مبارک میں غصہ کے آثار دیکھے تو اپنی جگہ سے اٹھ کر آپؐ کے سامنے دوزانو بیٹھے اور عرض کیا: ہم ان بے تکے سوالات سے توبہ کرتے ہیں اور دو مرتبہ یا تین مرتبہ فرمایا: ہم اللہ کی ربوبیت، اسلام کی حقانیت اور محمد ﷺ کی رسالت پر راضی ہیں۔ چنانچہ آپؐ کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا......... معلوم ہوا کہ اگر استاذ

طلبہ میں کسی طرح کی بے تمیزی محسوس کرے تو اسے غصہ کرنے کا حق ہے۔

[۹۲-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ، قَالَ: ثنا أَبُوْ أُسَامَةَ، عَنْ بُرَيْدٍ، عَنْ أَبِیْ بُرْدَةَ، عَنْ أَبِیْ مُوْسیٰ، قَالَ: سُئِلَ النبیُّ صلی الله علیه وسلم عَنْ أَشْيَاءَ كَرِهَهَا، فَلَمَّا أُكْثِرَ عَلَيْهِ غَضِبَ، ثُمَّ قَالَ لِلنَّاسِ:" سَلُوْنِیْ عَمَّا شِئْتُمْ" قَالَ رَجُلٌ: مَنْ أَبِیْ؟ قَالَ:" أَبُوْكَ حُذَافَةُ" فَقَامَ آخَرُ فَقَالَ: مَنْ أَبِیْ يَارسولَ اللّٰهِ؟ فَقَالَ:" أَبُوْكَ سَالِمٌ مَوْلیٰ شَيْبَةَ" فَلَمَّا رَأَی عُمَرُ مَا فِیْ وَجْهِهِ قَالَ: يَارسولَ اللّٰهِ، إِنَّا نَتُوْبُ إِلَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ. [انظر: ۷۲۹۱]

بَابُ مَنْ بَرَكَ عَلیٰ رُكْبَتَيْهِ عِنْدَ الإِمَامِ أَوِ الْمُحَدِّثِ

امیر یا محدث کے سامنے دوزانو بیٹھنا

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو استاذ کے سامنے باادب دوزانو بیٹھنا چاہئے، بے ادب محروم گشت از فضل رب! جس طالب علم میں ادب نہیں ہوتا، اس کو نہ علم آتا ہے نہ اس کے علم میں برکت ہوتی ہے، اس لئے ہمیشہ استاذ کا احترام کرنا چاہئے خواہ وہ علوم آلیہ: منطق وفلسفہ، نحو وصرف اور ادب وغیرہ پڑھاتا ہو یا علوم عالیہ: قرآن وحدیث اور فقہ وغیرہ پڑھاتا ہو۔

اور حضرت الاستاذ علامہ سید فخر الدین احمد صاحب مرادآبادی قدس سرہ نے مقصد ترجمہ یہ بیان کیا تھا کہ نماز کی چار حالتیں ہیں: قیام، رکوع، سجدہ اور قعدہ، رکوع اور سجدہ کسی حال میں غیر اللہ کے لئے جائز نہیں، پس کوئی خیال کرسکتا تھا کہ قعدہ کی ہیئت میں یعنی دوزانو استاذ کے سامنے بیٹھنا بھی جائز نہ ہوگا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب لاکر بتایا کہ بڑوں کے سامنے خواہ وہ دنیا کے بڑے ہوں جیسے امیر المؤمنین یا دین کے بڑے ہوں جیسے محدث وفقیہ اور استاذ: ان کے سامنے دوزانوں بیٹھنا جائز ہے، جیسے کسی کے سامنے باادب کھڑا رہنا جائز ہے اسی طرح قعدہ کی ہیئت بنا کر دوزانوں بیٹھنا بھی جائز ہے۔

حدیث: وہی ہے جو ابھی گذری کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ سے بے تکے سوال بہت پوچھے گئے، آپ کو غصہ آگیا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور آپ کے سامنے دوزانو بیٹھے، اور تین بار کہا کہ ہم اللہ کی ربوبیت پر، اسلام کی حقانیت پر اور محمد ﷺ کی رسالت پر راضی ہیں، چنانچہ آپ کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا اور آپ خاموش ہوگئے۔

[۲۹-] بَابُ مَنْ بَرَكَ عَلیٰ رُكْبَتَيْهِ عِنْدَ الإِمَامِ أَوِ الْمُحَدِّثِ

[۹۳-] حدثنا أَبُوْ الْيَمَانِ، قَالَ: أَنَا شُعَيْبٌ، عَنِ الزُّهْرِیِّ، قَالَ: أَخْبَرَنِیْ أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ: أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم خَرَجَ فَقَامَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ حُذَافَةَ، فَقَالَ: مَنْ أَبِیْ؟ فَقَالَ:" أَبُوْكَ حُذَافَةُ" ثُمَّ أَكْثَرَ أَنْ يَقُوْلَ:" سَلُوْنِیْ" فَبَرَكَ عُمَرُ عَلیٰ رُكْبَتَيْهِ فَقَالَ: رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا، وَبِالإِسْلَامِ دِيْنًا، وَبِمُحَمَّدٍ صلی الله علیه

وسلم نَبِيًّا، ثلاثًا، فَسَكَتَ.

[انظر: ٥٤٠، ٧٤٩، ٤٦٢١، ٦٣٦٢، ٦٤٦٨، ٦٤٨٦، ٧٠٨٩، ٧٠٩٠، ٧٠٩١، ٧٢٩٤، ٧٢٩٥]

بابُ مَنْ أَعَادَ الْحَدِيْثَ ثَلاَثًا لِيُفْهَمَ عَنْهُ

بات تین مرتبہ دوہرانا تاکہ اچھی طرح سمجھ لی جائے

معلم اور واعظ کو اہم اور دقیق بات ایک سے زیادہ مرتبہ بیان کرنی چاہئے، خواہ بلفظہ دوہرائے یا بالفاظ دیگر تاکہ طلباء اور عوام بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ اور ترجمۃ الباب میں ثلاثا کی قید عمومی احوال کے اعتبار سے ہے۔ نبی ﷺ دورانِ تقریر جب کوئی اہم بات ارشاد فرماتے تو عام طور پر تین بار دوہراتے، موقعہ کی رعایت سے اس میں کمی بیشی کی بھی گنجائش ہے۔ اگر دو مرتبہ بیان کرنا کافی ہو تو دو مرتبہ بیان کرے اور زیادہ کی ضرورت ہو تو زیادہ تکرار کرے، کیونکہ تکرار کا مقصد یہ ہے کہ معلم اور واعظ کی بات اچھی طرح سمجھ لی جائے۔ پس جہاں ضرورت ہو مکرر مضمون بیان کرنا چاہئے۔

باب میں دو روایتیں بے سند ہیں:

۱- حضور اقدس ﷺ ایک مرتبہ صحابہ کے درمیان ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، آپؐ نے فرمایا: کیا میں تم سے کبیرہ گناہ بیان نہ کروں؟ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ضرور بیان کیجئے۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، اور والدین کے ساتھ بدسلوکی کرنا، پھر آپؐ سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا: ''سنو! اور جھوٹی بات'' یہ بات آپؐ بار بار فرماتے رہے، تاکہ اس کی اہمیت ذہن نشین ہو۔

۲- حجۃ الوداع کے موقعہ پر آنحضور ﷺ نے منی میں ایک طویل تقریر فرمائی، اس تقریر کے آخر میں لوگوں سے پوچھا: هل بَلَّغتُ؟ کیا میں نے دین تمہیں پہنچا دیا؟ یہ تین مرتبہ پوچھا: ایک مرتبہ سامنے والوں سے اور دو مرتبہ دائیں بائیں والوں سے۔ سب نے اقرار کیا: ہاں یا رسول اللہ! آپؐ نے پورا دین پہنچا دیا، پھر آپؐ نے شہادت کی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا، پھر وہ انگلی سارے مجمع پر گھمائی اور فرمایا: اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ: اے اللہ! گواہ رہیں!

حدیث (۱): حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کوئی بات ارشاد فرماتے تو تین مرتبہ دوہراتے، تاکہ وہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے۔ اور جب کسی قوم کے پاس تشریف لے جاتے اور سلام کرتے تو تین مرتبہ سلام کرتے۔

تشریح: آنحضور ﷺ ہر بات تین مرتبہ نہیں دوہراتے تھے بلکہ جس بات کی اہمیت ظاہر کرنی ہوتی تھی اسی کو تین مرتبہ دوہراتے تھے تاکہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں، اسی طرح جب آپؐ کسی کے گھر تشریف لے جاتے تو اجازت طلبی کے

لئے وقفہ وقفہ سے تین مرتبہ سلام کرتے۔ اگر صاحبِ خانہ جواب دیتا تو ٹھیک، ورنہ واپس لوٹ جاتے۔

اور علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ نبی ﷺ کا یہ طریقہ بڑے مجمع کو سلام کرنے کی صورت میں تھا۔ جب ایک سلام سب کو نہیں پہنچ سکتا تھا تو آپؐ سامنے اور دائیں بائیں الگ الگ سلام کرتے تھے۔ پھر علامہ نے فرمایا: مَن تأَمَّلَ هَدْيَه عَلِمَ أَنَّ الأَمْرَ ليس كذلك، وَأَنَّ تكرارَ السَّلَامِ مِنْهُ كَانَ أَمْرًا عَارِضًا فِيْ بَعْضِ الأحيان: جوشخص سیرت پاک میں غور کرے گا وہ جان لے گا کہ تین مرتبہ سلام کرنا معمول نبوی نہیں تھا، اور کبھی آپؐ کا مکرر سلام کرنا ایک عارضی بات تھی پس حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ سلام کی تکرار اجازت طلبی کے وقت ہوتی تھی۔

حدیث (۲): عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ ایک ایسے سفر میں ہم سے پیچھے رہ گئے جو ہم نے آپؐ کے ساتھ کیا، پس آپؐ نے ہمیں اس حال میں پایا کہ ہم پر عصر کی نماز چھا رہی ہے، یعنی عصر کا وقت تنگ ہو رہا ہے۔ ہم نے (جلدی جلدی) وضو کیا اور اپنے پاؤں کو ہلکا دھویا، تو آپؐ نے دو مرتبہ یا تین مرتبہ پکار کر فرمایا: ''وضو میں خشک رہ جانے والی ایڑیوں کے لئے جہنم کی وعید ہے!'' .... یہ حدیث پہلے گذر چکی ہے۔

[۳۰-] بابُ مَنْ أَعَادَ الْحَدِيْثَ ثَلَاثًا لِيُفْهَمَ عَنْهُ

[۱-] فَقَالَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم: " أَلَا وَقَوْلُ الزُّوْرِ" فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا.

[۲-] وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: قَالَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم:" هَلْ بَلَّغْتُ"؟ ثَلَاثًا.

[۹۵-] حدثنا عَبْدَةُ، قَالَ: ثَنَا عَبْدُ الصَّمَدِ، قَالَ: ثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ الْمُثَنَّى، قَالَ: ثَنَا ثُمَامَةُ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَنَسٍ، عَنْ أَنَسٍ رضى الله عنه، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: أَنَّهُ كَانَ إِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ، وَإِذَا أَتَى عَلٰى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلَاثًا. [انظر: ٦٢٤٤]

[۹۶-] حدثنا مُسَدَّدٌ، قَالَ: ثَنَا أَبُوْ عَوَانَةَ، عَنْ أَبِيْ بِشْرٍ، عَنْ يُوْسُفَ بْنِ مَاهَكَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: تَخَلَّفَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم فِيْ سَفَرٍ سَافَرْنَاهُ، فَأَدْرَكَنَا وَقَدْ أَرْهَقْنَا الصَّلَاةَ، صَلَاةَ الْعَصْرِ، وَنَحْنُ نَتَوَضَّأُ، فَجَعَلْنَا نَمْسَحُ عَلٰى أَرْجُلِنَا، فَنَادٰى بِأَعْلٰى صَوْتِهِ:" وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ" مَرَّتَيْنِ أَوْثَلَاثًا. [راجع: ٦٠]

ترکیب: لیفهم: کو مجرد سے بھی پڑھ سکتے ہیں اور مزید سے بھی، مجرد سے پڑھیں گے تو معروف پڑھیں گے اور باب افعال سے معروف و مجہول دونوں پڑھ سکتے ہیں .... ثلاثًا أى قاله ثلاثا ...... وقد أَرْهَقْنَا الصلاةَ: ہم نے نماز مؤخر کی تھی یعنی عصر کی نماز میں دیر ہو رہی تھی، اور گیلری میں أَرْهَقَتْنَا الصلاةُ ہے یعنی نماز ہم پر چھا رہی تھی یعنی نماز میں تاخیر ہو گئی تھی، مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہے۔

ملحوظہ: یہاں مصری نسخہ میں ایک حدیث زائد ہے، ہمارے نسخہ میں وہ حدیث نہیں ہے، اس لئے اس کو حذف کیا ہے اور اس کا نمبر شمار (۹۴) بھی حذف کیا ہے تا کہ نمبروں کا فرق نہ ہو جائے۔

بابُ تَعْلِيمِ الرَّجُلِ أَمَتَهُ وَأَهْلَهُ

باندی اور بیوی کو تعلیم دینا

ہر شخص کو اپنی فیملی کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دینی چاہئے، اس سلسلہ میں طلبہ میں بھی تھوڑی کمی ہے، جب وہ چھٹیوں میں گھر جائیں تو بھائی بہن اور ماں باپ کو لے کر بیٹھیں اگر وہ (قرآن پڑھنا نہیں جانتے) تو ان کو ناظرہ پڑھائیں، اور اگر وہ قرآن پڑھنا جانتے ہیں مگر صحیح نہیں پڑھتے تو ان کا قرآن صحیح کرائیں، وہ بے نمازی ہیں تو ان کو نمازی بنائیں، ان کی دینی تربیت کریں، جبھی تمہارے پڑھنے کا فائدہ ہے۔

اسی طرح تمہاری شادی ہوئی، اور بیوی غیر تعلیم یافتہ آئی، یا اس کی تعلیم ناقص ہے تو اس کی تعلیم کی طرف توجہ دو، جاہل ماں کی گود میں اور پڑھی ہوئی ماں کی گود میں پلنے والی اولاد میں آسمان زمین کا فرق ہوتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اسی مقصد سے یہ باب لائے ہیں، اور أمتہ کو مقدم اس کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے کیا ہے۔ کیونکہ باندی ثانوی درجہ کی بیوی ہوتی ہے اور آزاد عورت اول درجہ کی، اس لئے بیوی کا ذکر پہلے آنا چاہئے تھا، مگر قرآن و حدیث میں اہمیت ظاہر کرنے کے لئے کبھی تقدیم و تاخیر کرتے ہیں، بیوی کی طرف تو آدمی شاید توجہ کرے مگر باندی کی طرف کون توجہ کرتا ہے، وہ تو گھر کی نوکرانی ہے، اس لئے اس کو مقدم کیا تا کہ اس کی تعلیم کی اہمیت ظاہر ہو۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین شخصوں کو دوہرا ثواب ملتا ہے: ایک: وہ اہل کتاب جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور محمد ﷺ پر بھی ایمان لایا۔ دوسرا: وہ غلام جو اللہ کا بھی حق ادا کرتا ہے اور اپنے آقاؤں کا بھی۔ تیسرا: وہ شخص جس کے پاس کوئی باندی ہے جس سے وہ صحبت کرتا ہے پس اس نے اس کی تربیت کی اور اچھی تربیت کی، اور اس کو تعلیم دی اور اچھی تعلیم دی، پھر اس کو آزاد کیا اور اس سے نکاح کر لیا تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے۔

تشریح:

سب سے پہلے یہ جاننا چاہئے کہ حدیث کا مقصود ترغیب دینا ہے اہل کتاب (یہود و نصاری) کو نبی ﷺ پر ایمان لانے کی، غلام کو اللہ کا حق ادا کرنے کی اور باندی کے مالک کو باندی کو آزاد کر کے نکاح کرنے کی: اس عمل کا ان کو دوہرا ثواب ملے گا۔ کیونکہ یہ کام بہت بھاری ہیں، اس لئے اجر بقدر مشقت کے ضابطہ سے ان کا ثواب بڑھ جاتا ہے۔

مشرک کے لئے ایمان لانا اتنا بھاری نہیں جتنا اہل کتاب کے لئے ایمان لانا بھاری ہے۔ اس کا اپنے نبی پر اور اس کی کتاب پر ایمان ہوتا ہے، اس کے ساتھ اعتقادی وابستگی ہوتی ہے، اس کو چھوڑ کر خاتم النبیین ﷺ پر ایمان لانا بہت

مشکل ہے۔اور غلام آقا کا حق ادا کرنے پر تو مجبور ہے، اس کے حق کی ادائیگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرنا مشکل کام ہے۔اسی طرح جس کے پاس باندی ہے اور وہ اس کو بیوی کے طور پر استعمال کرتا ہے، اسے کیا پڑی ہے کہ اس کو دینی تعلیم دے اور اسلامی تربیت کرے، پھر آزاد کر کے اس سے نکاح کرے؟ یہ مشکل امر ہے، اس لئے ان تینوں کو ان کے عمل کا دوہرا ثواب ملتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حدیث میں مذکور تینوں شخصوں کے دو دو عمل ہیں: اہل کتاب کا اپنے نبی پر ایمان لانا، پھر حضور ﷺ پر ایمان لانا، غلام کا حقِ مولیٰ ادا کرنا اور حق اللہ ادا کرنا، باندی کے مالک کا باندی سے استفادہ کرنا اور اس کی دینی تربیت کر کے نکاح کرنا: پس تینوں کو دوہرا اجر کس عمل پر ملے گا؟ چار احتمال ہیں:

۱- دونوں عملوں پر ایک ایک اجر ملے گا، مگر یہ احتمال صحیح نہیں، کیونکہ جب عمل دو ہیں تو اجر بھی دو ہونگے، اس میں نئی بات کیا ہوئی؟

۲- دونوں عملوں میں سے ہر عمل کا دوہرا ثواب ملے گا۔ یہ احتمال بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے یہودیت منسوخ ہوگئی، اور نبی ﷺ کی بعثت سے عیسائیت منسوخ ہوگئی، پھر ان پر ایمان لانے کا اجر کیسے ملے گا؟ علاوہ ازیں: اس صورت میں چار اجر ہو جائیں گے جبکہ حدیث میں دو اجروں کی صراحت ہے۔

۳- ان تینوں شخصوں کو زندگی بھر ہر عمل کا دوہرا ثواب ملے گا، یہ احتمال بھی بداہۃً باطل ہے، ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو تو حسنات پر ایک ایک ثواب ملے اور اہل کتاب صحابہ کو دوہرا ثواب یہ بات عقل کے خلاف ہے۔

۴- ان تینوں کو صرف دوسرے عمل پر دوہرا ثواب ملے گا، یہی احتمال صحیح ہے، یعنی اہل کتاب کو نبی ﷺ پر ایمان لانے کا دوہرا اجر ملے گا، کیونکہ یہ کام ان کے لئے بھاری ہے، اسی طرح غلام کو حق اللہ ادا کرنے پر ڈبل ثواب ملے گا، اور باندی کے مالک کو باندی سے نکاح کرنے پر دوہرا اجر ملے گا۔

سوال (۱): آخری آدمی کے چار کام ہیں: (۱) باندی کی اچھی تربیت کرنا (۲) اچھی تعلیم دینا (۳) آزاد کرنا (۴) اور نکاح کرنا۔ اگر اس کو بھی دو ہی اجر ملیں گے تو اس کا نقصان ہوگا؟

جواب: یہ چاروں کام درحقیقت ایک ہیں، اس لئے چاروں کاموں کے مجموعہ پر دوہرا ثواب ملے گا۔

سوال (۲): جب اہل کتاب کو ایمان لانے پر دوہرا ثواب ملے گا تو ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر ان کی فضیلت لازم آئے گی؟

جواب: یہ اہل کتاب کی جزئی فضیلت ہے اور جزئی فضیلت کلی فضیلت کے معارض نہیں ہوتی۔ یعنی ایمان لانے کا ثواب تو اہل کتاب صحابہ کو زیادہ ملے گا، مگر ایمان لانے کے بعد مؤمن زندگی بھر جو اعمال کرے گا ان کا ثواب ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو اتنا بڑھا ہوا ملے گا کہ اہل کتاب صحابہ ان دونوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔

آخری بات: حضرت عامر شعبی رحمہ اللہ نے حدیث بیان کر کے طالب علم سے فرمایا: میں نے تجھے یہ حدیث بغیر کسی عوض کے دیدی، پہلے اس سے معمولی بات کے لئے سفر کر کے مدینہ منورہ جانا پڑتا تھا، تجھے کوفہ میں بیٹھے ہوئے یہ حدیث مل گئی۔ حضرت عامر شعبیؒ کوفہ کے رہنے والے تھے، بڑے مجتہد اور حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے معاصر تھے، ان کے مزاج میں دُعابہ یعنی دل لگی تھی، پس ہوسکتا ہے حضرت نے طالب علم کی چٹکی لی ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کو تنبیہ کی ہو کہ حدیث یاد رکھنا، بے مشقت ملی ہے اس لئے بھول نہ جانا۔

ملحوظہ: جب باندیوں کا دور تھا تو آقا ہر باندی سے صحبت نہیں کرتا تھا، بلکہ کسی ایک کو صحبت کے لئے خاص کرتا تھا ایسی باندی کو سُرِّیّة کہتے تھے، مذکورہ حدیث میں اسی سریہ کا تذکرہ ہے۔

[۳۱-] بابُ تَعْلِيْمِ الرَّجُلِ أَمَتَهُ وَأَهْلَهُ

[۹۷-] حدثنا مُحَمَّدٌ، هُوَ ابْنُ سَلَامٍ قَالَ: أَنَا الْمُحَارِبِيُّ، قَالَ: نَا صَالِحُ بْنُ حَيَّانَ، قَالَ: قَالَ عَامِرٌ الشَّعْبِيُّ: حَدَّثَنِي أَبُوْ بُرْدَةَ، عَنْ أَبِيْهِ، قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: "ثَلَاثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ: رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهِ وَآمَنَ بِمُحَمَّدٍ، وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوْكُ إِذَا أَدَّى حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ مَوَالِيْهِ، وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهُ أَمَةٌ يَطَأُهَا، فَأَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ تَأْدِيْبَهَا، وَعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيْمَهَا، ثُمَّ أَعْتَقَهَا، فَتَزَوَّجَهَا فَلَهُ أَجْرَانِ"

ثُمَّ قَالَ عَامِرٌ: أَعْطَيْنَاكَهَا بِغَيْرِ شَيْءٍ، قَدْ كَانَ يُرْكَبُ فِيْمَا دُوْنَهَا إِلَى الْمَدِيْنَةِ.

[انظر: ۲۵٤٤، ۲۵٤۷، ۲۵۵۱، ۳۰۱۱، ۳٤٤٦، ۵۰۸۳]

بابُ عِظَةِ الإِمَامِ النِّسَاءَ وَتَعْلِيْمِهِنَّ

امیر کا عورتوں کو نصیحت کرنا اور ان کو تعلیم دینا

اس باب کا مقصد واضح ہے۔ صرف مردوں ہی کی تعلیم و تربیت کی فکر نہیں کرنی چاہئے بلکہ عورتوں کی بھی تعلیم و تربیت کی فکر کرنی چاہئے، وہ امت کا آدھا حصہ ہیں، اور اگلی نسل انہی کی گود میں پرورش پائے گی، پس اگر عورتوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دی جائے تو آنے والی نسل کی بھی اچھی تربیت ہوگی۔ اور خود عورتوں کے لئے بھی دنیا وآخرت میں بھلائی کی بات ہوگی، لہٰذا ان کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔

تعلیم کو تو آپ حضرات سمجھتے ہیں: باقاعدہ مکتب قائم کئے جائیں جہاں لڑکیاں پڑھیں، اور اب دار العلوم بھی قائم ہونے لگے ہیں، وہ بھی اسی مد میں آتے ہیں، اور موعظت یہ ہے کہ گاہ گاہ عورتوں کے لئے وعظ کا انتظام کیا جائے، مثلاً: مدرسہ کا جلسہ ہو تو عورتوں کا بھی انتظام کیا جائے وہ پردہ کے پیچھے سے تقریریں سنیں یا کسی جگہ مستقل عورتوں کو جمع کیا جائے اور دین کی باتیں بتائی جائیں، یہ موعظت ہے۔

موعظت کے سلسلہ میں کوتاہی چل رہی ہے، جب مدرسہ کے جلسے ہوتے ہیں عورتوں کے لئے انتظام کرتے ہیں مگر ہر گاؤں میں بڑا مدرسہ نہیں ہے پس چاہئے کہ مہینہ مین ایک دن خاص عورتوں کا اجتماع کیا جائے اور اس میں بیان ہو، اللہ کے فضل سے تبلیغ والے اس طرف متوجہ ہیں وہ عورتوں کا الگ اجتماع کرتے ہیں، لیکن یہ بات صرف تبلیغ کی حد تک نہیں رہنی چاہئے، ہر بستی میں جہاں بھی علماء ہیں یہ سلسلہ شروع کیا جائے، کیونکہ جو بڑی عمر کی عورتیں ہیں وہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے مکتب یا مدرسہ میں نہیں جاسکتیں، اس لئے ان کو وعظ ونصیحت کے ذریعہ سنبھالنا ضروری ہے۔

اور لڑکیوں کو تعلیم دینے کے لئے جو دار العلوم قائم کرتے ہیں وہ اچھا کام ہے، مگر مردوں کے ذریعہ لڑکیوں کو تعلیم دینا صحیح نہیں، اسلامی تاریخ میں اس کی مثال نہیں، عورتوں نے مردوں کا تو پڑھایا ہے، ازواج مطہرات سے صحابہ استفادہ کرتے تھے مگر مردوں نے عورتوں کو پڑھایا ہو اس کی کوئی مثال نہیں اور عورتوں پر مردوں کو قیاس کرنا درست نہیں، اگر درست ہوتا تو اب تک اس کا رواج کیوں نہیں ہوا؟ مردوں سے تعلیم دلانے کے بے شمار مفاسد ہیں، ہر کوئی سمجھتا ہے، ان کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ایسے اساتذہ سے جو لڑکیوں کو پس پردہ پڑھاتے ہیں: پوچھا ہے کہ تمہارے دلوں کا کیا حال ہے؟ انھوں نے بتایا کہ ان کے دلوں کا حال اچھا نہیں، پس دوسری طرف بھی یہی حال ہوگا۔ اور پردہ کے پیچھے سے گاہ بہ گاہ مردوں کا عورتوں کو وعظ ونصیحت کرنا جائز ہے، اس میں کوئی مفسدہ نہیں، اسی طرح لڑکیوں کا دار الاقامہ بھی بے اصل ہے، لڑکیاں دن میں آئیں اور شام کو گھر چلی جائیں اسی حد تک مدارس عربیہ قائم کرنے چاہئیں۔

اور خاص بات یہ یاد رکھنی چاہئے کہ لڑکیوں کو عربی تعلیم اچھی طرح دینی چاہئے، آج کل مدارس جو تعلیم دیتے ہیں وہ محض ایک رسم ہے، ان کا نصاب بھی تین سالہ یا پانچ سالہ کردیا گیا ہے جبکہ لڑکوں کو سات یا آٹھ سال میں کمال حاصل نہیں ہوتا، لڑکیاں کیسے باکمال بن جائیں گی؟ لڑکیوں کو تعلیم ضرور دی جائے مگر خاطر خواہ تعلیم دی جائے، تاکہ آگے عورتیں تعلیم کے سلسلہ میں خود کفیل بنیں، ورنہ ہمیشہ مردوں ہی کے ذریعہ تعلیم دلانی ہوگی جو درست نہیں۔

علاوہ ازیں: پردے کے پیچھے سے جو تعلیم دی جاتی ہے وہ نصف تعلیم ہوتی ہے۔ جیسے خط اور ٹیلیفون کی ملاقات نصف ملاقات ہوتی ہے، پوری تعلیم تو بالمشافہہ ہی دی جاسکتی ہے، اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے کہ تعلیم دینے والی خواتین ہوں۔

اور میرے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ جو مرد پس پردہ تعلیم دیتے ہیں وہ اردو شرح لے کر بیٹھتے ہیں اور اس میں سے پڑھ کر سناتے ہیں یعنی وہ خود کتاب سمجھے ہوئے نہیں ہوتے، پھر طالبات کیا سمجھ لیں گی؟

حدیث: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر کے دن عیدگاہ میں خطبہ دیا، عیدگاہ میں عورتیں بھی تھیں، آپؐ نے محسوس کیا کہ آپؐ نے عورتوں کو نہیں سنایا، یعنی عورتوں تک آواز نہیں پہنچی، چنانچہ آپ عورتوں کے قریب تشریف لے گئے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔ آپ نے عورتوں کے قریب جا کر الگ سے عورتوں کو وعظ ونصیحت فرمائی، اور خاص طور پر صدقہ کرنے کی ترغیب دی، چنانچہ عورتیں بالیاں اور انگوٹھیاں ڈالنے لگیں، اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ اپنے

کپڑے میں ان کو لینے لگے۔

تشریح: اس حدیث پر امام بخاریؒ نے جو باب باندھا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں میں امام ہی وعظ کہے گا یا امام کا مقرر کیا ہوا آدمی وعظ کہے گا۔ حدیث میں ہے: "وعظ نہ کہے مگر امیر یا مامور یعنی جس کو امام نے وعظ کہنے پر مقرر کیا ہے یا گھمنڈی (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ حدیث نمبر ۲۴۰)

[۳۲-] بابُ عِظَةِ الإِمَامِ النِّسَاءَ وَتَعْلِيْمِهِنَّ

[۹۸-] حدثنا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ أَيُّوْبَ، قَالَ: سَمِعْتُ عَطَاءَ بْنَ أَبِيْ رَبَاحٍ، قَالَ: سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ، قَالَ: أَشْهَدُ عَلَى النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم، أَوْ قَالَ عَطَاءٌ: أَشْهَدُ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم خَرَجَ، وَمَعَهُ بِلاَلٌ، فَظَنَّ أَنَّهُ لَمْ يُسْمِعِ النِّسَاءَ، فَوَعَظَهُنَّ وَأَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ، فَجَعَلَتِ الْمَرْأَةُ تُلْقِيْ الْقُرْطَ وَالْخَاتَمَ، وَبِلاَلٌ يَأْخُذُ فِيْ طَرَفِ ثَوْبِهِ.

وَقَالَ إِسْمَاعِيْلُ: عَنْ أَيُّوْبَ، عَنْ عَطَاءٍ. قَالَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَشْهَدُ عَلَى النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

[انظر: ۸٦۳، ۹٦۲، ۹٦٤، ۹۷۵، ۹۷۷، ۹۷۹، ۹۸۹، ۱٤۳۱، ۱٤٤۹، ٤۸۹۵، ۵۲٤۹، ۵۸۸۰، ۵۸۸۱، ۵۸۸۳، ۷۳۲۵]

وضاحت: اس حدیث کی دو سندیں ہیں: ایک: شعبہ، عن ایوب، عن عطاء، عن ابن عباس۔ اور دوسری: اسماعیل، عن ایوب، عن عطاء عن ابن عباس، شعبہ والی سند میں أشهد على النبي اور أشهد على ابن عباس میں شک ہے۔ یعنی یا تو حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ میں حضور ﷺ پر گواہی دیتا ہوں، یا عطاء نے کہا کہ میں ابن عباسؓ پر گواہی دیتا ہوں، اور اسماعیل والی سند میں جزم کے ساتھ أشهد على النبيِّ ہے......... عِظَةٌ: مصدر ہے، وعظ (ض) وَعْظًا وعِظَةً کے معنی ہیں: وعظ ونصیحت کرنا.......... حضرت عطاء: ابن عباس کے خاص شاگرد ہیں اور امام اعظم رحمہ اللہ کے استاذ ہیں۔

بابُ الْحِرْصِ عَلَى الْحَدِيْثِ

حدیث کی بے پناہ خواہش

علوم دینیہ (عالیہ) چھ ہیں: قرآن، حدیث، فقہ اور تینوں کے اصول: اصول تفسیر، اصولی حدیث اور اصول فقہ۔ ان میں اول نمبر کس کا ہے؟ فقہ کا اول نمبر نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ قرآن وحدیث کا نچوڑ اور خلاصہ ہے اور فقہاء کا نکالا ہوا ہے، اور علم تفسیر کا بھی اول نمبر نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ مفسرین کے اقوال کا مجموعہ ہے، انھوں نے جو قرآن سے سمجھا ہے وہ تفسیر میں بیان کیا ہے، اور احادیث شریفہ حضور اقدس ﷺ کے ارشادات ہیں، اس لئے اول نمبر حدیثوں کا ہے۔ قرآنِ کریم بیشک اول نمبر ہے مگر قرآنِ کریم کوئی فن نہیں، وہ سارے علوم کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب

قائم کیا کہ حدیثیں حاصل کرنے کی کوشش کرو، ان کے پیچھے دوڑو کیونکہ وہی علوم شرعیہ میں اول نمبر پر ہیں۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: یارسول اللہ! قیامت کے دن آپ کی شفاعت کے ساتھ سب سے زیادہ کامیاب کون ہوگا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ابو ہریرہ! میرا گمان تھا کہ تم سے پہلے کوئی شخص مجھ سے یہ سوال نہیں کرے گا، کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں حدیثوں کی بے پناہ خواہش ہے، سب سے زیادہ نیک بخت قیامت کے دن میری شفاعت سے وہ شخص ہوگا جس نے دل کی تھاہ سے یا فرمایا: دل کے اخلاص سے لا إلٰہ إلا اللہ کہا۔

تشریح:

۱- سوال کرنے والے خود حضرت ابو ہریرہؓ تھے، راوی کبھی خود کو غائب کر دیتا ہے، جب حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ سوال کیا تو آنحضور ﷺ نے فرمایا: میرا گمان یہ تھا کہ تم ہی سب سے پہلے یہ سوال کروگے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور تمہارے بارے میں میرا یہ گمان اس لئے تھا کہ تم حدیثوں کے معاملہ میں بہت حریص ہو۔ معلوم ہوا کہ آدمی کو سب سے زیادہ خواہش حدیثوں کی ہونی چاہئے۔

مدارس میں سب سے زیادہ حدیثیں پڑھائی جاتی ہیں، مگر ہمارے فضلاء سب سے زیادہ حدیث میں کمزور ہوتے ہیں، ملک ہی میں نہیں پوری دنیا میں غیر مقلدین کا فتنہ سر ابھار رہا ہے ان کے پاس مسئلہ کے ایک رخ کی چندرٹی رٹائی حدیثیں ہوتی ہیں، اور کچھ نہیں مگر ہمارا کوئی فاضل ان سے لوہا نہیں لیتا إلا ماشاء اللہ! پس آدمی کو حدیث کا حریص ہونا چاہئے، زندگی بھر حدیث کی کوئی کتاب مطالعہ میں رہنی چاہئے، اور روزانہ ایک گھنٹہ قرآن کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے، تفسیروں کا مطالعہ کرو اور قرآن کو سمجھو، یہ محنت برابر جاری رہنی چاہئے، جگہ جگہ تفسیر قرآن کے اور تعلیم حدیث کے حلقے قائم کرو، اس سے لوگوں کو بھی فائدہ پہنچے گا اور اپنا بھی مطالعہ وسیع ہوگا، اللہ توفیق دیں (آمین)

۲- حدیث میں لفظ أَسْعَدُ: اسم تفضیل ہے، یہ یا تو سعید کے معنی میں ہے، تفضیلی معنی میں نہیں ہے۔ اس صورت میں سائل کے سوال کا مطلب یہ ہوگا کہ یارسول اللہ! قیامت کے دن آپ کی شفاعت کس کو حاصل ہوگی؟ آپؐ نے جواب دیا: ہر اس شخص کو حاصل ہوگی جس نے صدق دل سے کلمہ پڑھا ہے یعنی سچا مسلمان ہے۔

اور اگر أسعد کو تفضیلی معنی میں لیا جائے تو جواب نبوی علی اسلوب الحکیم ہوگا، اور سائل کو تنبیہ ہوگی کہ تمہارا سب سے زیادہ شفاعت کے حقدار کے بارے میں سوال کرنا مناسب نہیں، مطلق سوال کرو کہ شفاعت کس کو نصیب ہوگی؟ پس جان لو کہ ہر کلمہ گو کو میری شفاعت نصیب ہوگی، کوئی مسلمان میری شفاعت سے محروم نہیں رہے گا۔

[۳۳-] بابُ الْحِرْصِ عَلَى الْحَدِيْثِ

[۹۹-] حدثنا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ سُلَيْمَانُ، عَنْ عَمْرِو بْنِ أَبِيْ عَمْرٍو، عَنْ سَعِيْدِ بْنِ

أَبِیْ سَعِیْدٍ الْمَقْبُرِیِّ، عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ، أَنَّهُ قَالَ: قِیْلَ: یَارسولَ اللّٰهِ، مَنْ أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِكَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ؟ قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم: " لَقَدْ ظَنَنْتُ یَا أَبَا هُرَیْرَةَ أَنْ لَّا یَسْأَلَنِیْ عَنْ هٰذَا الْحَدِیْثِ أَحَدٌ أَوَّلَ مِنْكَ، لِمَا رَأَیْتُ مِنْ حِرْصِكَ عَلَی الْحَدِیْثِ: أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِهِ أَوْ: نَفْسِهِ " [انظر: ٦٥٧٠]

بابٌ: کَیْفَ یُقْبَضُ الْعِلْمُ

علم کیسے اٹھایا جائے گا؟

قرب قیامت میں علم اٹھالیا جائے گا، اور علم اٹھالینے کا طریقہ یہ نہیں ہوگا کہ مولانا صاحب رات میں سوئے، صبح اٹھے تو سب علم بھول گئے، بلکہ علماء اٹھالئے جائیں گے اور ان کی جگہ لینے والا کوئی نہیں ہوگا، پس لوگ جاہلوں کو پیشوا بنالیں گے، ان سے دین کی باتیں پوچھیں گے، وہ الٹے سُلٹے مسئلے بتائیں گے، اس طرح وہ خود بھی گمراہ ہونگے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے سب سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے، انھوں نے اپنے دورِ خلافت میں مدینہ منورہ کے گورنر اور قاضی ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ مدینہ منورہ میں اساتذہ جو حدیثیں بیان کرتے ہیں ان کو لکھ کر میرے پاس بھیج دو، مجھے علم کے مٹ جانے کا اور علماء کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے (خاص طور پر عبدالرحمٰن بن اسعد بن زُرارہ کی بیٹی) عَمرۃ (متوفیہ ۹۸ھ) اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پوتے قاسم (متوفی ۱۲۰ھ) کی حدیثیں جو وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں لکھ کر بھیجو)

قوله: ولا یقبل إلا حدیثُ النبی: یہ امام بخاری رحمہ اللہ کا اضافہ ہے، امام صاحب نے دو باتیں بڑھائی ہیں:

۱- صرف مرفوع حدیثیں ہی حدیث کی کتابوں میں لی جائیں، موقوف ومقطوع روایات نہ لی جائیں۔

۲- علماء علم کو پھیلائیں، اس کو رواج دیں، اور اپنا حلقہ قائم کریں، پڑھانے بیٹھیں، تاکہ جو علم سے ناواقف ہیں وہ واقف ہوجائیں، کیونکہ علم پر زوال اس وقت آئے گا جب وہ راز بن جائے گا، مخصوص حلقوں ہی میں پڑھنے پڑھانے کا رواج رہ جائے گا، عام لوگوں کو علم کی ہوا نہ لگنے دی جائے گی، پس علم ختم ہوجائے گا۔

اور پہلی بات کی تفصیل یہ ہے کہ تدوین حدیث کے چار دور ہیں۔ پہلے اور دوسرے دور میں احادیث مرفوعہ، موقوفہ اور مقطوعہ: سب حدیث کی کتابوں میں لی جاتی تھیں۔ پہلے دور کی موطا مالک اور دوسرے دور کی عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ کی کتابیں اس کی شاہد عدل ہیں۔ لیکن تدوین حدیث کے تیسرے دور میں یہ خیال پیدا ہوا کہ حدیث کی کتابوں میں صرف مرفوع صحیح احادیث لی جائیں۔ موقوف اور مقطوع احادیث نہ لی جائیں، یہ خیال سب سے پہلے حضرت امام

شافعی رحمہ اللہ کو آیا اور بعد کے محدثین بالواسطہ یا بلا واسطہ آپ کے شاگرد تھے اس لئے یہ خیال عام ہوگیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ سب سے زیادہ اس خیال سے متأثر ہوئے ہیں، چنانچہ انھوں نے اپنی صحیح میں صرف مرفوع صحیح حدیثیں لی ہیں، حسن اور ضعیف حدیثیں نہیں لیں۔ مگر امام مسلم رحمہ اللہ نے جو امام بخاری رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں استاذ سے اختلاف کیا اور صحیح مسلم میں صحیح کے ساتھ حسن روایتیں بھی لیں، ضعیف نہیں لیں۔ اور دیگر محدثین نے ضعیف روایتیں بھی لیں، کیونکہ بوقتِ ضرورت فقہاء ضعیف روایات سے بھی استدلال کرتے ہیں۔

البتہ احادیث موقوفہ اور مقطوعہ یعنی صحابہ اور تابعین کے اقوال وافعال کو تیسرے اور چوتھے دور کی کتابوں میں نہیں لیا گیا، جبکہ پہلے اور دوسرے دور کی کتابوں میں ان کو بھی لیا گیا تھا، کیونکہ ان کے بغیر فقہ کی تدوین ممکن نہیں، امام بخاری رحمہ اللہ بھی باب میں ان روایات کو لانے پر مجبور ہوئے ہیں۔

قولہ: وَلْيُفْشُوْا الْعِلْمَ: اور چاہئے کہ علماء علم پھیلائیں، یہ أفشی یُفشی (باب افعال) سے امر کا صیغہ ہے، اس کے معنی ہیں: رواج دینا، پھیلانا۔ علم کو پھیلانے کی کیا شکل ہے؟ ولیجلسوا حتی یُعلَّم من لا یعلم: اور چاہئے کہ علماء درس کی مجلسیں قائم کریں، تاکہ سکھلایا جائے وہ شخص جو دین کی باتیں نہیں جانتا۔ فإن العلم لا یَهلِك حتی یکون سِرًّا: اس لئے کہ علم اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک وہ راز نہ بن جائے، جب علم پرائیویٹ ہوجائے گا اور اس پر لوگوں کی اجارہ داری قائم ہوجائے گی تو علم باقی نہیں رہے گا، جیسے ہندوؤں کے یہاں مذہبی علم صرف برہمن سیکھ سکتا ہے اور کوئی نہیں سیکھ سکتا، اس لئے ان کا علم ضائع ہوگیا۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی دو باتیں اس طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے خط کے مضمون کے ساتھ ملائی ہیں کہ دھوکہ لگتا ہے کہ یہ بھی حضرت عمرؒ کی باتیں ہیں۔ اور ہمارے نسخے میں اگرچہ علاء کی سند لاکر وضاحت فرمادی ہے کہ حضرت عمر کا قول ذهاب العلماء تک ہے، مگر یہ بات عربی نسخوں میں نہیں ہے، اس لئے شارحین کرام بہت پریشان ہوئے ہیں۔ صرف علامہ عینیؒ نے الأظهر کہہ کر یہ بات بیان کی ہے کہ یہ آخری دو باتیں امام بخاریؒ کی ہیں۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ علم کو چھیننے کے طور پر نہیں سمیٹیں گے کہ اس کو لوگوں سے چھین لیں، بلکہ وہ علم کو قبض کریں گے علماء کو قبض کرنے کے ذریعہ، یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا (یا کسی عالم کو باقی نہیں چھوڑیں گے) تو لوگ نہایت نادانوں کو سردار بنالیں گے، پس ان سے مسائل پوچھے جائیں گے، اور وہ علم کے بغیر فتوے دیں گے، اس طرح وہ خود بھی گمراہ ہونگے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

تشریح: اس حدیث کا سبق یہ ہے کہ علم کو دین کی حفاظت کے لئے پڑھو پڑھاؤ۔ اور خوب محنت سے علم حاصل کرو، ورنہ صورت حال بگڑ جائے گی، اور اس حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ فتوی ایک اہم ذمہ داری ہے، اس کے لئے

کافی علم کی ضرورت ہے۔

ترکیب: انتزاعاً: یا تو لایقبض کا مفعول مطلق ہے: من غیر لفظه: اس صورت میں جملہ ینتزعه: انتزاعاً کی صفت ہوگا، اور نوعیت انتزاع کی وضاحت کرے گا، اور یہ بھی احتمال ہے کہ انتزاعا: بعد میں آنے والے فعل کا مفعول مطلق ہو۔ اس صورت میں ینتزعه: جملہ حالیہ ہوگا، یعنی اللہ تعالیٰ لوگوں سے علم دین کو اس طرح نہیں اٹھائیں گے کہ لوگوں کے درمیان سے اس کو اچک لیں، بلکہ عالم اسباب میں اس کی شکل یہ ہوگی کہ علماء یکے بعد دیگرے اٹھتے چلے جائیں گے، پس لوگ جاہلوں کو بڑا بنالیں گے، ان سے مسائل پوچھیں گے، وہ علم کے بغیر اپنی رائے سے فتوے دیں گیں، خود بھی گمراہ ہونگے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

[۳٤-] بابٌ: كَيْفَ يُقْبَضُ الْعِلْمُ

وَكَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ إِلَى أَبِي بَكْرِ بْنِ حَزْمٍ: انْظُرْ مَا كَانَ مِنْ حَدِيْثِ رَسُولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فَاكْتُبْهُ، فَإِنِّيْ خِفْتُ دُرُوْسَ الْعِلْمِ وَذَهَابَ الْعُلَمَاءِ.

وَلَا يُقْبَلُ إِلَّا حَدِيْثُ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم، وَلْيُفْشُوْا الْعِلْمَ، وَلْيَجْلِسُوْا حَتّٰى يُعَلَّمَ مَنْ لَا يَعْلَمُ، فَإِنَّ الْعِلْمَ لَا يَهْلِكُ حَتّٰى يَكُوْنَ سِرًّا.

حَدَّثَنَا الْعَلَاءُ بْنُ عَبْدِ الْجَبَّارِ، حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ مُسْلِمٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ بِذٰلِكَ يَعْنِيْ حَدِيْثَ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ إِلَى قَوْلِهِ: ذَهَابَ الْعُلَمَاءِ.

[۱۰۰-] حدثنا إِسْمَاعِيْلُ بْنُ أَبِيْ أُوَيْسٍ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: " إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ، وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ، حَتّٰى إِذَا لَمْ يَبْقَ عَالِمٌ اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوْا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوْا وَأَضَلُّوْا "

قَالَ الْفِرَبْرِيُّ: حَدَّثَنَا عَبَّاسٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ، قَالَ: حَدَّثَنَا جَرِيْرٌ، عَنْ هِشَامٍ نَحْوَهُ. [انظر: ۷۳۰۷]

وضاحت: دُروس: دَرَسَ (ن) کا مصدر ہے، دَرْس کی جمع نہیں۔ دَرَسَ الرسمُ: مٹنا......... لم يُبقِ عالماً: اگر باب افعال سے پڑھیں تو عالماً منصوب ہوگا۔ گیلری میں یہی لکھا ہے، پس ترجمہ ہوگا: یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کسی عالم کو باقی نہیں چھوڑیں گے۔ اور باب سمع سے لم يَبْقَ پڑھیں تو عالمٌ مرفوع ہوگا، اور ترجمہ ہوگا: یہاں تک کہ کوئی عالم باقی نہیں رہے گا۔

سند کی بحث: کتبِ حدیث کی ایک قسم مستخرج ہے۔ مستخرج: اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کسی دوسری کتاب کی

احادیث کو اپنی سند سے روایت کیا ہو جس میں مصنف کا واسطہ نہ آیا ہو، جیسے اسماعیلی کا مستخرج بخاری شریف پر، اور ابوعوانہ کا مستخرج مسلم شریف پر۔ یہاں فربری رحمہ اللہ نے بھی جو بخاری شریف کے راوی ہیں ایسا ہی کیا ہے۔ انھوں نے اپنی سند دوسرے طریق سے ہشام سے ملائی ہے اس میں امام بخاریؒ کا واسطہ نہیں آیا، اسی کا نام استخراج ہے، اس سے کتاب کی سند کی تائید ہوتی ہے کیونکہ ہشام سے یہ حدیث اور طریق سے بھی مروی ہے۔

بابٌ: هَلْ يُجْعَلُ لِلنِّسَاءِ يَوْمٌ عَلٰى حِدَةٍ فِي الْعِلْمِ

عورتوں کی تعلیم کے لئے الگ دن مقرر کرنا چاہئے

علی حدة: اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، صرف رسم الخط کا فرق ہے۔ عربی میں علی کو الگ اور حدة کو الگ لکھتے ہیں اور اردو میں ملا کر علاحدہ لکھتے ہیں۔

اس باب میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر عورتوں کی تعلیم کے لئے مخصوص ایام متعین کردیئے جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، بلکہ ایسا کرنا چاہئے، جیسے تبلیغی جماعت کا نظام ہے کہ ہفتہ میں ایک دن عورتوں کا اجتماع رکھتے ہیں، اور ان کو دین کی باتیں بتاتے ہیں۔

حدیث: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: خواتین نے آنحضور ﷺ سے عرض کیا: آپؐ کی مجلس میں مرد ہم پر غالب آگئے یعنی مرد آپؐ کو گھیرے رہتے ہیں، ہمیں استفادہ کا موقع نہیں ملتا، لہٰذا آپؐ ہمارے لئے کوئی دن مقرر فرمائیں (جس میں ہم آپؐ سے استفادہ کریں) چنانچہ آپؐ نے ان سے ایک دن کا وعدہ فرمایا۔ اس دن آپؐ نے ان سے ملاقات کی، پس ان کو نصیحت فرمائی، اور ان کو کچھ احکام بتائے، اس دن آپؐ نے عورتوں سے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ نہیں ہے تم میں سے کوئی عورت جس کے تین (نابالغ) بچے گذر جائیں مگر ہونگے وہ بچے اس کے لئے جہنم کی آگ سے آڑ، ایک عورت نے عرض کیا: دو بچے گذرے ہوں تو؟ آپؐ نے فرمایا: دو بھی، دوزخ سے حجاب بن جائیں گے۔

تشریح:

۱- مرد وزن ننانوے فیصد احکام میں مشترک ہیں، صرف ایک فیصد صنفی احکام مختلف ہیں۔ جیسے عورتوں کو ماہواری آتی ہے اور مردوں کی ڈاڑھی نکلتی ہے، پس صنفی احکام کے اختلاف کی وجہ سے ہر روز عورتوں کی الگ مجلس کرنی ضروری نہیں، جب مردوں کے سامنے وعظ کہیں گے تو عورتیں بھی پردہ میں بیٹھ کر سنیں گی، البتہ گاہ بہ گاہ عورتوں کے لئے مخصوص وعظ ضروری ہے، جس میں عورتوں کے مخصوص احکام بیان کئے جائیں۔

۲- جاننا چاہئے کہ حدیث میں مذکور فضیلت صرف ماں کے لئے نہیں، باپ کے لئے بھی ہے، بچپن میں فوت شدہ بچے ماں باپ کے لئے دوزخ سے آڑ بنیں گے، اور جس کا ایک بچہ فوت ہوا ہو اس کے لئے بھی یہ فضیلت ہے۔ (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۵۵)

البتہ چند شرطیں پائی جائیں تب یہ فضیلت حاصل ہوگی:

۱- بچہ زمانۂ طفولت میں فوت ہوا ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: لم یبلغوا الحِنْثَ: وہ بچے بلوغ تک نہ پہنچے ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بچپن میں ماں باپ کا التفات بچوں کی طرف کامل ہوتا ہے اور بچوں کا التفات بھی ماں باپ کی طرف کامل ہوتا ہے۔ اور شادی کے بعد جانبین سے التفات کم ہونے لگتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ اولاد ماں باپ سے دور ہو اور دنیا آباد ہو۔ بچپن میں جانبین کا ایک دوسرے کی طرف جیسا التفات ہوتا ہے اگر بلوغ کے بعد بھی وہی حالت باقی رہے تو آج ساری دنیا ایک گھر میں بسی ہوئی ہوتی، نہ ماں باپ اولاد کو دور جانے دیتے اور نہ اولاد ماں باپ سے دور جاتی۔ پھر دنیا کیسے آباد ہوتی؟ اس لئے قادر مطلق نے انسان کی فطرت میں یہ بات ودیعت فرمائی کہ جب بچے کے بال و پر آجاتے ہیں تو وہ اڑنے کی کوشش کرتا ہے، اور جب بچہ دور چلا گیا، اور اس کا التفات کم ہو گیا تو ماں باپ کا التفات بھی کم ہو جاتا ہے۔ غرض: بچپن میں ماں باپ کا التفات زیادہ ہوتا ہے اس لئے فوت ہونے پر صدمہ بھی زیادہ پہنچتا ہے جس پر وہ صبر کرتے ہیں اس لئے یہ بشارت ہے۔

۲- یہ فضیلت اس کے لئے ہے جو اس وقت صبر کرے جب پہلی بار مصیبت دل سے ٹکرائے، بعد میں تو ہر کسی کو صبر آ ہی جاتا ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''صبر صدمہ کی ابتداء میں ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۷۵۸) اس حدیث کا شان ورود یہ ہے کہ ایک بار آپؐ قبرستان کے قریب سے گذرے، آپؐ نے ایک عورت کو قبر پر روتے ہوئے دیکھا اس کا بیٹا فوت ہو گیا تھا، وہ اس کی قبر پر رو رہی تھی، آپؐ نے اس کو صبر کی تلقین فرمائی۔ اس نے آپؐ کو پہچانا نہیں اور کہا: جاؤ میاں! جو مصیبت مجھ پر آئی ہے اگر تم پر آتی تو میں جانتی کہ تم کیسا صبر کرتے ہو! آپؐ وہاں سے آگے بڑھ گئے بعد میں کسی نے اس عورت کو بتایا کہ وہ آنحضرت ﷺ تھے اب وہ اپنا غم بھول گئی۔ دوڑی ہوئی آپؐ کے گھر پہنچی، آپؐ گھر پر موجود نہیں تھے۔ وہ بیٹھ کر رونے لگی، جب آپؐ تشریف لائے تو اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے آپؐ کو پہچانا نہیں تھا، آپؐ نے فرمایا: الصبر عند الصدمة الأولى: جس وقت صدمہ پہنچے اسی وقت صبر کرنے کا ثواب ہے۔ بعد میں تو سب کو صبر آ ہی جاتا ہے (بخاری حدیث ۱۲۸۳)

۳- فضائل کی روایات پلاستر والے مکان پر پینٹ کرنے کی مثال ہیں، جس کا ایمان کا ڈھانچہ ہی تیار نہ ہو، اس کے لئے کوئی فضیلت نہیں۔ روایات میں رمضان میں مرنے کے فضائل آئے ہیں پس کیا وہ فضائل غیر مسلم کے لئے بھی ہیں؟ ظاہر ہے اس کے لئے وہ فضیلت نہیں کیونکہ اس کے ایمان کا ڈھانچہ ہی تیار نہیں پس کیا وہ ہوا میں پینٹ کرے گا! اسی طرح

مکان تو تیار ہے مگر اس پر پلاستر ہوا ہوا نہیں تو اس پر پینٹ کیا کھلے گا، یہ بے عمل اور بد عمل مؤمن کی مثال ہے۔ ان کو فضائل کی روایات کا فائدہ نہیں پہنچے گا، فضائل کی روایتیں حقیقت میں صالحین کے لئے ہیں، انہی کو کامل فائدہ پہنچے گا۔

[۳۵-] بابٌ: هَلْ يُجْعَلُ لِلنِّسَاءِ يَوْمٌ عَلٰى حِدَةٍ فِي الْعِلْمِ

[۱۰۱-] حدثنا آدمُ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، قَالَ: حَدَّثَنِي ابْنُ الْأَصْبَهَانِيِّ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا صَالِحٍ ذَكْوَانَ، يُحَدِّثُ عَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: قَالَتِ النِّسَاءُ لِلنَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم: غَلَبَنَا عَلَيْكَ الرِّجَالُ، فَاجْعَلْ لَنَا يَوْمًا مِنْ نَفْسِكَ، فَوَعَدَهُنَّ يَوْمًا لَقِيَهُنَّ فِيْهِ، فَوَعَظَهُنَّ وَأَمَرَهُنَّ. فَكَانَ فِيْمَا قَالَ لَهُنَّ: "مَا مِنْكُنَّ امْرَأَةٌ تُقَدِّمُ ثَلَاثَةً مِنْ وَلَدِهَا إِلَّا كَانَ لَهَا حِجَابًا مِنَ النَّارِ" فَقَالَتِ امْرَأَةٌ: وَاثْنَيْنِ؟ فَقَالَ: "وَاثْنَيْنِ".

[انظر: ۱۲۴۹، ۷۳۱۰]

[۱۰۲-] حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ، قَالَ: ثَنَا غُنْدَرٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْأَصْبَهَانِيِّ، عَنْ ذَكْوَانَ، عَنْ أَبِي سَعِيْدٍ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم بِهٰذَا.

وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْأَصْبَهَانِيِّ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا حَازِمٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: "ثَلَاثَةٌ لَمْ يَبْلُغُوا الْحِنْثَ"

[انظر: ۱۲۵۰]

وضاحت: مذکورہ حدیث عبدالرحمٰن بن الاصبہانی: ابوصالح ذکوان سے بھی روایت کرتے ہیں اور ابو حازم سے بھی، ذکوان نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور ابو حازم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں لم يبلغوا الحنث بڑھا ہوا ہے........ غندر کا نام محمد بن جعفر ہے، غندر ان کا لقب ہے، یہ بہت اچھے راوی ہیں۔ غندر کے معنی ہیں: جھکی، یہ ابن جریج کے سبق میں بہت سوالات کرتے تھے، ایک دن ابن جریج نے جھلا کر کہا: ما تريد يا غُنْدَرُ؟: ارے جھکّی کیا چاہتا ہے؟ اس دن سے انھوں نے اپنا لقب غندر رکھ لیا، پہلے دارالعلوم میں جمعرات کے دن اساتذہ کی نگرانی میں انجمنیں ہوتی تھیں، ایک طالب علم تک بندی کرتا تھا، وزن قافیہ کچھ نہیں جانتا تھا، الٹے سیدھے اشعار کہتا تھا، ایک مرتبہ اس نے اپنی نظم سنائی، شیخ الہند قدس سرہ نے فرمایا: أنت چُغْدُ الشعراء: چغد فارسی لفظ ہے، اس کے معنی ہیں: الّو، اس طالب علم نے اپنا تخلص چغدر رکھ لیا، اسی طرح محمد بن جعفر نے اپنا تخلص غندر رکھ لیا تھا۔

اور امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ محمد بن بشار کا لقب بُندار تھا، شاید یہ بنڈل کی عربی ہو۔ کہتے ہیں: ان کے پاس علاقہ کی تمام حدیثیں جمع تھیں، وہ حدیثوں کے اسٹاکسٹ تھے، حدیثوں کے ان کے پاس بنڈل کے بنڈل تھے، اس لئے ان کا لقب بندار پڑ گیا۔

بَابُ مَنْ سَمِعَ شَيْئًا فَلَمْ يَفْهَمْهُ فَرَاجَعَهُ حَتّٰى يَعْرِفَهُ

کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی، تو دوبارہ پوچھے اور سمجھ کر چھوڑے

اگر سبق میں کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کو سمجھے بغیر نہیں چھوڑنا چاہئے، سبق کے بعد استاذ کے پاس جائے اور اس کو دوبارہ سمجھے، اور اگر استاذ نہ سمجھا سکے تو کسی اور عالم کے پاس جائے اور بات کو اچھی طرح سمجھے، کوئی بات سمجھے بغیر نہ چھوڑے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا مزاج یہ تھا کہ جب وہ کوئی حدیث سنتیں، اور بات سمجھ میں نہ آتی تو وہ آنحضور ﷺ سے رجوع کرتیں، اور بات سمجھ کر چھوڑتیں، ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کا حساب ہوگا اس کا بیڑا غرق ہوگا (من حوسب عُذِّب) حضرت عائشہؓ نے سوال کیا: یارسول اللہ! قرآن میں ہے: ﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيْرًا﴾ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کا آسان حساب ہوگا یعنی وہ حساب کے بعد نجات پائیں گے اور آپ فرمارہے ہیں کہ جس کا بھی حساب ہوگا وہ سزا دیا جائے گا یہ تعارض ہے؟ آپؐ نے فرمایا: حساب لینے کی دو صورتیں ہیں: ایک: سرسری حساب لینا اور ایک حساب میں مناقشہ کرنا۔ سرسری حساب لینا یہ ہے کہ گناہ پیش کردیئے جائیں اور یہ نہ پوچھا جائے کہ یہ گناہ تو نے کیوں کیا؟ یہ آسان حساب ہے۔ یہ بندہ نجات پائے گا، اور جس شخص سے مناقشہ کیا جائے اور پوچھا جائے کہ یہ گناہ تو نے کیوں کیا؟ اس کی لٹیا ڈوبی!

[۳۶-] بَابُ مَنْ سَمِعَ شَيْئًا فَلَمْ يَفْهَمْهُ فَرَاجَعَهُ حَتّٰى يَعْرِفَهُ

[۱۰۳-] حدثنا سَعِيْدُ بْنُ أَبِيْ مَرْيَمَ، قَالَ: أَنَا نَافِعُ بْنُ عُمَرَ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ ابْنُ أَبِيْ مُلَيْكَةَ، أَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم كَانَتْ لَا تَسْمَعُ شَيْئًا لَا تَعْرِفُهُ إِلَّا رَاجَعَتْ فِيْهِ حَتّٰى تَعْرِفَهُ، وَأَنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: "مَنْ حُوْسِبَ عُذِّبَ" قَالَتْ عَائِشَةُ: فَقُلْتُ: أَوَ لَيْسَ يَقُوْلُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ: ﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا﴾ [الانشقاق:۸]؟ قَالَتْ: فَقَالَ: " إِنَّمَا ذٰلِكَ الْعَرْضُ، ولٰكِنْ مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ يَهْلِكُ". [انظر: ۴۹۳۹، ۶۵۳۶، ۶۵۳۷]

ترجمہ: ابوملیکہ کہتے ہیں: حضرت عائشہؓ نہیں سنتی تھیں کوئی بات جس کو وہ نہیں سمجھ پاتی تھیں، مگر اس کو مکرر دریافت کرتی تھیں، یہاں تک کہ اس کو سمجھ لیتیں۔ ایک مرتبہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جس کا حساب لیا گیا وہ سزا دیا گیا'' حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: کیا اللہ عزوجل نے یہ نہیں فرمایا کہ عنقریب وہ آسان حساب لیا جائے گا؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ اعمال پیش کرنا ہے، لیکن جس سے حساب میں مناقشہ کیا گیا وہ ہلاک ہوا''

بابٌ: لِيُبَلِّغِ الْعِلْمَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ

حاضر غائب کو علم پہنچائے

یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، اور العلم مفعول اول ہے، الشاهدُ: فاعل ہے اور الغائب: مفعول ثانی ہے۔
پہلے یہ بات بتلائی ہے کہ آپ جو علم حاصل کر رہے ہیں وہ آپ کی جاگیر نہیں، آپ کے پاس امانت ہے، آپ کا علم امت کا سرمایہ ہے، اگر آپ نے یہ علم اپنے ہی پاس رکھا، دوسروں تک نہ پہنچایا تو آپ نے امت کے حق میں خیانت کی۔ سورۃ النساء (آیت ۵۸) میں اللہ تعالیٰ نے امانتیں ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ جس سے کوئی علمی بات پوچھی گئی، جس کو وہ جانتا تھا، مگر نہیں بتائی تو قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام دی جائے گی، پس ہر شخص کو اللہ تعالیٰ نے جو تھوڑا بہت علم دیا ہے وہ دوسروں تک پہنچائے خواہ کسی شکل میں پہنچائے۔

جب یزید بادشاہ بنا تو عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ نے اس کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، وہ مکہ چلے گئے، وہاں اپنے لئے بیعت لی، یزید نے مدینہ کے گورنر عمرو بن سعید لطیم الشیطان کو لکھا کہ وہ بزور عبداللہ کو بیعت پر مجبور کرے، چنانچہ اس نے مکہ لشکر روانہ کرنا شروع کیا، جب وہ لشکر روانہ کر رہا تھا تو ابوشریح عدوی رضی اللہ عنہ اس کے پاس گئے اور اس کو درج ذیل حدیث سنائی:

حدیث: ابوشریح عدویؓ نے عمرو بن سعید سے کہا جب وہ مکہ لشکر روانہ کر رہا تھا: اے امیر! آپ مجھے اجازت دیں میں آپ سے وہ بات بیان کروں جو رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دوسرے دن اپنی تقریر میں فرمائی تھی جس کو میرے کانوں نے سنا، میرے دل نے محفوظ کیا، میری آنکھیں آپؐ کو دیکھ رہی تھیں، جب آپؐ تقریر فرما رہے تھے۔ آپؐ نے اللہ کی تعریف کی، اس کی ثنا بیان کی، پھر فرمایا: ''مکہ مکرمہ کو اللہ تعالیٰ نے محترم قرار دیا ہے کسی آدمی نے اس کو محترم قرار نہیں دیا۔ پس کسی ایسے شخص کے لئے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر یقین رکھتا ہو: جائز نہیں کہ وہ حرم میں خون بہائے، یا حرم کے کسی درخت کو کاٹے، پس اگر کوئی نبی ﷺ کے حرم میں قتال کرنے کی وجہ سے جواز پر استدلال کرے (فتح مکہ کے دن نبی ﷺ مکہ کے بالائی حصہ سے داخل ہوئے تھے، وہاں جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی، اور حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ زیریں حصہ سے داخل ہوئے تھے، وہاں جن لوگوں نے مزاحمت کی ان میں سے کچھ لوگ مارے گئے تھے) تو تم اس سے کہنا: بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس کی اجازت دی تھی، اور تجھے اجازت نہیں دی۔ اور میرے لئے بھی حرم میں قتال کی اجازت دن کے ایک خاص حصہ میں (طلوع شمس سے عصر تک) تھی، اور آج اس کی حرمت لوٹ آئی گذشتہ کل کی حرمت کی طرح، یعنی اب میرے لئے بھی حرم میں قتال جائز نہیں، اور چاہئے کہ حاضرین غائبین تک یہ بات پہنچادیں (یہی جملہ باب سے متعلق ہے) ابوشریح سے طالب علموں نے پوچھا: عمرو بن سعید نے آپ کی بات کا کیا

جواب دیا؟ آپؓ نے فرمایا: اس نے کہا: اے ابوشریح! میں یہ باتیں آپ سے زیادہ جانتا ہوں، حرم کسی نافرمان (باغی) کو پناہ نہیں دیتا اور نہ خون کر کے بھاگے ہوئے کو پناہ دیتا ہے۔ اور نہ کوئی جنایت (یا چوری) کر کے بھاگے ہوئے کو پناہ دیتا ہے۔ طالب علموں نے پوچھا: جب عمرو بن سعید نے یہ بات کہی تو آپؓ نے کیا جواب دیا؟ ابوشریح نے فرمایا: میں نے کہا: جب حضور ﷺ نے یہ تقریر فرمائی تھی تو میں وہاں موجود تھا اور تو موجود نہیں تھا، اور نبی ﷺ نے ہم کو یہ حکم دیا تھا کہ حاضرین غائبین تک میری بات پہنچائیں سو میں نے پہنچادی، پھر میں چلا آیا۔

تشریح:

۱-عمرو بن سعید کے نزدیک حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ حکومت کے باغی تھے۔ اس وجہ سے وہ ان کے خلاف لشکرکشی کررہا تھا، حالانکہ ابن الزبیرؓ نے یزید کے ہاتھ پر بیعت ہی نہیں کی تھی۔ پس بغاوت کے کیا معنی؟ اور نہ انھوں نے کوئی جنایت کی تھی نہ کسی کو قتل کیا تھا نہ چوری کی تھی پھر ان کے خلاف لشکرکشی کا کیا جواز تھا؟

۲-اگر کوئی شخص جنایت کر کے حرم میں گھس جائے تو اسے وہاں سزا دی جائے گی یا نہیں؟ جواب: اگر اس نے کوئی مالی جرم کیا ہے، جیسے کسی کا مال غصب کیا ہے یا بالقصد مال تلف کیا ہے یا کوئی مادون النفس جرم کیا ہے مثلاً کسی کا ہاتھ کاٹا ہے تو اسے بالاجماع حرم میں سزا دی جائے گی، اور غصب کیا ہوا مال واپس دلایا جائے گا، اور اگر کسی کو عمداً قتل کیا ہے تو اختلاف ہے، ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک اس سے حرم میں قصاص لیا جائے گا۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک حرم میں قصاص نہیں لیا جائے گا، البتہ اس کا حقہ پانی بند کر دیا جائے گا، تاکہ وہ مجبور ہو کر باہر نکلے یا مر جائے۔

احناف کی دلیل سورۂ آل عمران کی آیت ۹۷ ہے: ﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ آمِنًا﴾: جو حرم میں داخل ہوگیا وہ مامون ہوگیا۔ اس آیت کے عموم سے بالاجماع دو شخص مخصوص ہیں: مالی جرم کرنے والا، اور مادون النفس جنایت کرنے والا، اب اگر عمداً قتل کرنے والے کی بھی تخصیص کی جائے گی تو آیت کا کچھ مصداق باقی نہیں رہے گا، جیسے: متروک التسمیہ ناسیاً بالاجماع حلال ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک متروك التسمیه متعمداً بھی حلال ہے۔ احناف کہتے ہیں: اگر یہ جانور بھی حلال ہوگا تو آیت: ﴿وَلَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾ (سورۃ الانعام آیت ۱۲۱) کا کچھ مصداق باقی نہیں رہے گا، آیت ایسی مونگ پھلی ہو جائے گی جس میں گری نہیں ہوگی۔ احناف کے نزدیک جب نص کا ایک فرد باقی رہ جائے تو تخصیص جائز نہیں۔ اسی طرح مذکورہ آیت میں مالی جرم کرنے والے اور مادون النفس جنایت کرنے والے کی بالاجماع تخصیص کی گئی ہے پس اب قتل عمد کرنے والے کی تخصیص نہیں ہو سکتی، اگر کی جائے گی تو آیت کا کچھ مصداق باقی نہیں رہے گا۔

اور احناف نے حضور ﷺ کے ارشاد: ولا یحل لامرئ یؤمن باللہ والیوم الآخر أن یسفك بها دمًا: سے بھی استدلال کیا ہے یعنی جو کسی کو عمداً قتل کر کے حرم میں چلا جائے اسے وہاں قتل نہیں کیا جائے گا، ورنہ حرم میں خون بہانا لازم آئے گا۔ اور ائمہ ثلاثہ نے عمرو بن سعید کے قول: ولا فارًّا بدمٍ سے استدلال کیا ہے، ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بہ کجا؟

۳-حرم کے احکام دوسری جگہوں سے مختلف ہیں، وہاں شکار کرنا جائز نہیں، پالتو جانور بکری، گائے، مرغی وغیرہ کو ذبح کر سکتے ہیں مگر شکار کو حرم میں مارنا جائز نہیں۔ اگر کوئی شکار کو ذبح کرے گا تو وہ مردار ہوجائے گا، چاہے اللہ کا نام لے کر ذبح کرے۔ اور جزاء (بدلہ) واجب ہوگی البتہ پانچ جانور اس سے مستثنیٰ ہیں (تفصیل کتاب الحج میں آئے گی) اور یہ حکم محرم غیر محرم سب کے لئے ہے، اسی طرح حرم کی خودرو گھاس اور جنگلی درخت کاٹنا جائز نہیں، البتہ جو درخت انسان اگاتے ہیں جیسے: آم، سیب، کیلا، گیہوں وغیرہ ان کو کاٹنا جائز ہے، خواہ وہ خود اگا ہو یا کسی نے اگایا ہو، اسی طرح خودرو گھاس یا درخت یا اس کی کوئی ٹہنی جب سوکھ جائے تو کاٹ سکتے ہیں۔ اور تر گھاس اور تر درخت کو کاٹنے میں جزاء واجب ہوگی۔ اور حرم کی گھاس اور درخت اگر جانور خود چریں تو کوئی مضائقہ نہیں، مگر گھاس کاٹ کر یا پتے توڑ کر جانور کو کھلانا جائز نہیں، جزاء واجب ہوگی۔

ملحوظہ: عمرو بن سعید کے دو لقب تھے، ایک: اشدق (منہ پھٹ) دوسرا: لطیم الشیطان (شیطان کا تھپڑ مارا ہوا) ان لقبوں سے اس کی حیثیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بعد میں اسی حکومت نے جس کا وہ آلۂ کار تھا اس کو قتل کردیا۔

[۳۷-] بابٌ: لِيُبَلِّغِ الْعِلْمَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ

قَالَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم.

[۱۰٤-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ سَعِيْدٌ، هُوَ ابْنُ أَبِيْ سَعِيْدٍ، عَنْ أَبِيْ شُرَيْحٍ، أَنَّهُ قَالَ لِعَمْرِو بْنِ سَعِيْدٍ، وَهُوَ يَبْعَثُ الْبُعُوْثَ إِلٰى مَكَّةَ: ائْذَنْ لِيْ أَيُّهَا الْأَمِيْرُ أُحَدِّثْكَ قَوْلاً قَامَ بِهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم الْغَدَ مِنْ يَوْمِ الْفَتْحِ، سَمِعَتْهُ أُذُنَايَ، وَوَعَاهُ قَلْبِيْ، وَأَبْصَرَتْهُ عَيْنَايَ، حِيْنَ تَكَلَّمَ بِهِ، حَمِدَ اللّٰهَ وَأَثْنٰى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: " إِنَّ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللّٰهُ، وَلَمْ يُحَرِّمْهَا النَّاسُ، فَلَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَسْفِكَ بِهَا دَمًا، وَلَا يَعْضِدَ بِهَا شَجَرَةً، فَإِنْ أَحَدٌ تَرَخَّصَ لِقِتَالِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فِيْهَا، فَقُوْلُوْا: إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَذِنَ لِرَسُوْلِهِ وَلَمْ يَأْذَنْ لَكُمْ، وَإِنَّمَا أَذِنَ لِيْ فِيْهَا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ، ثُمَّ عَادَتْ حُرْمَتُهَا الْيَوْمَ كَحُرْمَتِهَا بِالْأَمْسِ، وَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ" فَقِيْلَ لِأَبِيْ شُرَيْحٍ: مَاقَالَ عَمْرٌو؟ قَالَ: أَنَا أَعْلَمُ مِنْكَ يَا أَبَا شُرَيْحٍ، إِنَّ مَكَّةَ لَا تُعِيْذُ عَاصِيًا، وَلَا فَارًّا بِدَمٍ، وَلَا فَارًّا بِخَرْبَةٍ. [انظر: ۱۸۳۲، ٤۲۹٥]

[۱۰٥-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَبْدِ الْوَهَّابِ، ثَنَا حَمَّادٌ، عَنْ أَيُّوْبَ، عَنْ مُحَمَّدٍ، عَنِ ابْنِ أَبِيْ بَكْرَةَ، عَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ: ذَكَرَ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم، قَالَ: " فَإِنَّ دِمَاءَ كُمْ وَأَمْوَالَكُمْ – قَالَ مُحَمَّدٌ: وَأَحْسَبُهُ قَالَ: وَأَعْرَاضَكُمْ – عَلَيْكُمْ حَرَامٌ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِيْ شَهْرِكُمْ هٰذَا، أَلَا لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ" – وَكَانَ مُحَمَّدٌ يَقُوْلُ: صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم كَانَ ذٰلِكَ– " أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟" مَرَّتَيْنِ. [راجع: ٦۸]

لغات: البَعْث: فوج، ہروہ جماعت جوکہیں بھیجی جائے جمع بُعوث .... سَفَكَ (ض) سَفْكًا الدمَ أو الماءَ: خون یاپانی بہانا......... أُحدِّثك: جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے......... إئذن کے ہمزہ کو ی سے بدل کر إیْذن بھی پڑھ سکتے ہیں .... عَضَدَ (ض) عَضْدًا الشجرةَ: درخت کو ہنسیا سے کاٹنا......... تَرَخَّصَ فی الأَمْرِ: کسی معاملہ میں رخصت پرعمل کرنا......... لِقتال میں لام اجلیہ ہے أی لأجل قتال......... خَرْبَة: عیب، لغزش، جنایت اور ایک روایت میں خِزْیة ہے یعنی رسوائی کا کام......... ہندوستانی نسخے میں لاتُعیذ سے پہلے إنَّ مكة چھوٹ گیا ہے، مصری نسخہ میں ہے، اس کے بغیر بات پوری نہیں ہوتی۔ اسی طرح حوض والے نسخہ میں عن أبی بكرة نہیں ہے، گیلری میں ہے وہی نسخہ صحیح ہے۔

قوله: ذكر النبیّ: یہ وہی جملہ ہے جو پہلے بھی آیا ہے۔ حضرت ابوبکرہؓ نے حدیثیں کسی کاپی میں لکھ رکھی تھیں۔ یہ ان حدیثوں میں سے ایک ہے، یہ روایت پہلے (حدیث نمبر ۶۷) تفصیل سے آئی ہے۔ وہاں الفاظ تھے: فإن دماء كم وأموالكم وأعراضكم: یہاں وأعراضكم سے پہلے محمد بن سیرین نے وَأَحْسَبُه قال کہا ہے، یعنی محمد بن سیرین کہتے ہیں: میرا خیال ہے کہ حدیث میں وأعراضكم بھی ہے۔

قوله: صدق رسول الله: اس جملہ کا مفہوم یہ ہے: محمد بن سیرینؒ کہتے ہیں: آنحضور ﷺ نے جو فرمایا تھا کہ حاضرین غائبین تک بات پہنچائیں، یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگیا، صحابہ نے آپؐ کے ارشادات غائبین تک پہنچادیئے۔

قوله: ألا هل بَلَّغْتُ؟: حدیث سے جڑا ہوا ہے، اور وكان محمدٌ جملہ معترضہ ہے۔

ملحوظہ: حَسِب قرآنِ کریم میں باب سمع سے آیا ہے، سورۂ نور میں ہے: ﴿يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً﴾ البتہ بعض قراء يَحْسِبُه (عین کلمہ مکسور) پڑھتے ہیں، اسی لئے منشعب میں اس کو مستقل باب شمار کیا ہے۔

بابُ إِثْمِ مَنْ كَذَبَ عَلَى النبیِّ صلى الله عليه وسلم

نبی ﷺ کی جانب جھوٹی بات منسوب کرنے کا گناہ

اس باب کا ماقبل سے ربط یہ ہے کہ دین پہنچانے میں غلط بیانی کا احتمال ہے اس لئے یہ باب لائے، اور نصیحت فرمائی کہ نقل دین میں احتیاط سے کام لو، دانستہ یانادانستہ غلط بیانی سے بچو، نادانستہ غلطی تو ہوسکتی ہے، جہل ونسیان انسان کی فطرت ہے مگر جب غلطی کا احساس ہوجائے تو فوراً رجوع کرلینا چاہئے، غلطی پر اصرار نہیں کرنا چاہئے۔

حدیث (۱): رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر جھوٹ مت بولو، کیونکہ جو مجھ پر جھوٹ بولے گا وہ جہنم میں جائے گا۔

تشریح:

۱- نبی ﷺ کی حیات مبارکہ میں جس طرح صحابہ قرآنِ کریم کی تبلیغ کرتے تھے یعنی نیا نازل شدہ قرآن سب

مسلمانوں تک پہنچاتے تھے کیونکہ اس کا حکم تھا: بَلِّغُوا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً: میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک آیت ہو، اسی طرح حیات نبوی میں صحابہ حدیثیں بھی روایت کرتے تھے، کیونکہ سب صحابہ ہمہ وقت خدمت نبوی میں حاضر نہیں رہتے تھے۔ پس جو موجود ہوتے اور کوئی حدیث سنتے وہ اس کو دوسرے صحابہ تک پہنچاتے، اس لئے باب کی احادیث میں ہدایت ہے کہ کوئی شخص نبی ﷺ کی طرف سے غلط غلط بات منسوب نہ کرے، صحیح بات اور بے کم و کاست پہنچائے۔

۲- اور یہ حکم حیاتِ نبوی کے ساتھ خاص نہیں، قیامت تک کے لئے ہے، پس احادیث شریفہ پوری احتیاط کے ساتھ بیان کرنی چاہئیں، صحیح روایات ہی بیان کریں اور بالقصد کوئی جھوٹی بات حضور ﷺ کی طرف منسوب نہ کریں۔

۳- کچھ لوگوں نے لفظ علیَّ سے یہ بات نکالی ہے کہ دین کو نقصان پہنچانے والی حدیثیں تو گڑھنا جائز نہیں مگر دین کو فائدہ پہنچانے والی حدیثیں گڑھ سکتے ہیں، کیونکہ یہ لَهُ ہے عَلَیَّ نہیں ہے، چنانچہ خلیل نحوی کے غلام نے ہر سورت کے فضائل میں حدیثیں گھڑی ہیں، لوگوں نے اس سے کہا: یہ کیا کرتا ہے؟ اس نے کہا: لوگوں کو قرآن سے قریب کرتا ہوں! وہ قرآن زیادہ پڑھیں گے، حاشیہ میں اس کی تردید ہے۔ علی اور لام میں فرق ضرور ہے، علی ضرر کے لئے آتا ہے اور لام فائدے کے لئے، مگر جب علی صلہ میں آتا ہے تو یہ فرق ملحوظ نہیں رہتا، اور یہاں علی صلہ میں آیا ہے۔

[۳۸-] بابُ إِثْمِ مَنْ كَذَبَ عَلَى النبيِّ صلى الله عليه وسلم

[۱۰۶-] حدثنا عَلِيُّ بْنُ الْجَعْدِ، قَالَ: أَنَا شُعْبَةُ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ مَنْصُوْرٌ، قَالَ: سَمِعْتُ رِبْعِيَّ بْنَ حِرَاشٍ، يَقُوْلُ: سَمِعْتُ عَلِيًّا، يَقُوْلُ: قَالَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم: "لاَ تَكْذِبُوْا عَلَيَّ، فَإِنَّهُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَلِجِ النَّارَ"

حدیث (۲): حضرت عبداللہ الزبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے اپنے ابا حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے کہا: کیا بات ہے میں آپ کو اس طرح حدیثیں بیان کرتے نہیں دیکھتا جس طرح فلاں اور فلاں صاحبان بیان کرتے ہیں، حضرت زبیرؓ نے فرمایا: سنو! میں نبی اکرم ﷺ سے جدا نہیں ہوا، لیکن میں نے آپ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص مجھ پر جھوٹ بولے اس کو چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

تشریح: حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، آنحضور ﷺ کے پھوپی زاد بھائی اور ہم زلف ہیں، اور حواری رسول کے لقب سے معروف ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بڑی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا آپ کے نکاح میں تھیں، عبداللہ بن الزبیرؓ انہی کے بطن سے ہیں، یہ وہی عبداللہ ہیں جن سے جنگ کے لئے عمرو بن سعید مکہ مکرمہ لشکر بھیج رہا تھا اور ابوشریح عدوی نے اس کو حدیث سنائی تھی، انھوں نے اپنے والد سے عرض کیا: آپ بہ کثرت حدیثیں کیوں بیان نہیں کرتے، جس طرح فلاں اور فلاں صحابہ بیان کرتے ہیں؟ کیا آپ کو صحبتِ نبوی کا زیادہ موقع نہیں ملا؟ یا آپ کو حدیثیں محفوظ نہیں، آپؓ نے فرمایا: یہ دونوں باتیں نہیں، بلکہ میں نے حضور اقدس

ﷺ سے ایک حدیث سنی ہے، وہ حدیث مجھے بہ کثرت حدیثیں بیان کرنے سے روکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جس شخص نے میرے نام سے جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے، اور بہ کثرت حدیثیں بیان کرنے میں بلاارادہ بھی غلط بیانی ہوسکتی ہے اس لئے میں ڈرتا ہوں اور کثرتِ حدیث سے بچتا ہوں .... پس آج جو لوگ اناپ شناپ حدیثیں بیان کرتے ہیں ان کو محتاط رہنا چاہئے، حدیث کی مذکور وعید کا مصداق نہیں بننا چاہئے۔

[۱۰۷-] حدثنا أَبُوْ الْوَلِيْدِ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ جَامِعِ بْنِ شَدَّادٍ، عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ أَبِيْهِ، قَالَ: قُلْتُ لِلزُّبَيْرِ: إِنِّي لَا أَسْمَعُكَ تُحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم كَمَا يُحَدِّثُ فُلَانٌ وَفُلَانٌ، قَالَ: أَمَا إِنِّي لَمْ أُفَارِقْهُ، وَلٰكِنْ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ: "مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"

حدیث (۳): حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: بیشک مجھے روکتی ہے بکثرت حدیثیں بیان کرنے سے یہ بات کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: ''جس نے مجھ پر بالقصد کذب بیانی کی اس کو چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے!''

حدیث (۴): حضرت سلمۃ بن الاکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے میری طرف منسوب کرکے وہ بات کہی جو میں نے نہیں کہی تو اس کو اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالینا چاہئے!''

تشریح: اس مضمون کی روایتیں ستر صحابہ سے مروی ہیں، اور حضرت انسؓ مکثرین صحابہ میں سے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مجھے تکثیر حدیث سے مذکورہ حدیث روکتی ہے۔ اگر میں نے حضور اقدس ﷺ سے یہ حدیث نہ سنی ہوتی تو میں اور بھی حدیثیں بیان کرتا۔

[۱۰۸-] حدثنا أَبُوْ مَعْمَرٍ، ثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ، عَنْ عَبْدِ الْعَزِيْزِ، قَالَ أَنَسٌ: إِنَّهُ لَيَمْنَعُنِيْ أَنْ أُحَدِّثَكُمْ حَدِيْثًا كَثِيْرًا أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: "مَنْ تَعَمَّدَ عَلَيَّ كَذِبًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"

[۱۰۹-] حدثنا الْمَكِّيُّ بْنُ إِبْرَاهِيْمَ، قَالَ: حَدَّثَنَا يَزِيْدُ بْنُ أَبِيْ عُبَيْدٍ، عَنْ سَلَمَةَ، هُوَ ابْنُ الْأَكْوَعِ، قَالَ: سَمِعْتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: "مَنْ يَقُلْ عَلَيَّ مَالَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"

قولہ: أن أحدثكم: أن مصدریہ ہے اور اس سے پہلے مِن پوشیدہ ہے أي مِن أن أحدثكم اور أنَّ النبيَّ فاعل ہے۔

حدیث (۵): حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: نبی ﷺ نے فرمایا: ''میرے نام پر نام رکھو اور میری کنیت نہ رکھو، اور جس نے خواب میں مجھے دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا اس لئے کہ شیطان میرا پیکر نہیں بنا سکتا، اور جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا اس کو اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنانا چاہئے!''

تشریح: اس حدیث میں تین مضمون ہیں:

پہلا مضمون: محمد نام رکھنا جائز ہے اور ابو القاسم کنیت رکھنا جائز نہیں۔ ایک مرتبہ نبی ﷺ کہیں تشریف لے جارہے تھے، اس جانب ایک اور شخص بھی جارہا تھا اس کی کنیت ابو القاسم تھی، کسی نے پیچھے سے پکارا یا أبا القاسم نبی پاک ﷺ متوجہ ہوئے، اس نے کہا: میں فلاں شخص کو بلا رہا ہوں، اس وقت آپؐ نے فرمایا: ''میرے نام پر نام رکھو مگر میری کنیت مت رکھو (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۵۰)

اور آپ کا نام رکھنے کی اجازت اس لئے تھی کہ عرب بڑے آدمی کو نام سے نہیں پکارتے تھے، کنیت سے پکارتے تھے۔ صحابہ آپؐ کو یارسول اللہ کہہ کر پکارتے تھے اور غیر مسلم ابو القاسم کہہ کر، اس لئے نبی ﷺ نے اپنا نام رکھنے کی اجازت دی اور کنیت رکھنے سے منع کیا۔

پس ابو القاسم کنیت رکھنے کی ممانعت لغیرہ ہے اور جہاں لغیرہ ممانعت ہوتی ہے فی نفسہ جواز ہوتا ہے، اس لئے اب ابو القاسم کنیت رکھنا جائز ہے، جیسے ایک حدیث میں ابو عیسیٰ کنیت رکھنے کی ممانعت آئی ہے (مصنف ابن ابی شیبہ) یہ ممانعت بھی لغیرہ ہے، اس ایہام سے بچنے کے لئے ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی باپ تھا، فی نفسہ ممانعت نہیں۔ چنانچہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی کنیت ابو عیسیٰ رکھی تھی، اور نبی ﷺ کو اس کا علم تھا۔ آپؐ نے منع نہیں فرمایا۔

(ابوداؤد ۲: ۳۲۲)

دوسرا مضمون: جس نے آپؐ کو خواب میں دیکھا اس نے آپؐ ہی کو دیکھا۔ متقدمین میں سے بعض کی رائے یہ تھی کہ جس نے نبی ﷺ کو آخری زندگی والے حلیے میں دیکھا اس نے بالیقین آپؐ کو دیکھا، چنانچہ وہ حضرات خواب دیکھنے والے سے حلیہ دریافت کرتے تھے۔

اور متقدمین کی دوسری رائے یہ تھی کہ آپؐ کو آخری زندگی والے حلیہ میں دیکھنا ضروری نہیں، کسی بھی زمانہ کے حلیہ میں دیکھے تو اس نے آپ ہی کو دیکھا، اور اگر ایسے حلیہ میں دیکھے جو کبھی بھی آپؐ کا حلیہ نہیں رہا تو اس نے آپ کو نہیں دیکھا۔

اور متأخرین کی رائے یہ ہے کہ خواب دیکھنے والے نے آپؐ کو جس حلیہ میں بھی دیکھا ہو، اگرچہ نامناسب حلیہ میں دیکھا ہو، مگر قرائن سے جان لیا ہو کہ یہ نبی ﷺ ہیں تو وہ آپؐ ہی ہیں، خواہ روایات میں منقول حلیہ میں دیکھا ہو یا کسی اور حلیہ میں۔

حضرت گنگوہی قدس سرہ فرماتے ہیں: یہی رائے صحیح ہے، کیونکہ خواب دیکھنے والے کو جس شخص سے مناسبت ہوتی ہے اس کی شکل میں آپؐ نظر آتے ہیں، نیز خواب دیکھنے والے کی ایمانی حالت اور امور باطنہ کے اختلاف سے بھی آپؐ کی زیارت مختلف صورتوں میں ہوتی ہے۔

تیسرا مضمون: وہی ہے جس کے لئے باب قائم کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر بالقصد کذب بیانی حرام ہے، اس کی سزا دوزخ کی آگ ہے، چونکہ نادانستہ غلطی ممکن ہے اس لئے معتمداً کی قید لگائی کہ یہ وعید دانستہ کذب بیانی کی صورت میں ہے۔

[۱۱۰-] حدثنا مُوسَى، قَالَ: ثَنَا أَبُو عَوَانَةَ، عَنْ أَبِي حَصِينٍ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قَالَ:" تَسَمَّوْا بِاسْمِي، وَلاَ تَكْتَنُوا بِكُنْيَتِي، وَمَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لاَ يَتَمَثَّلُ فِي صُورَتِي، وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"

[انظر: ۳۵۳۹، ۶۱۸۸، ۶۱۹۷، ۶۹۹۳]

بابُ كِتَابَةِ الْعِلْمِ

علم کو لکھنے کا بیان

غائبین تک علم پہنچانے کی ایک صورت کتابتِ علم ہے اس کے ذریعہ دین پھیلتا ہے اور فیض باقی رہتا ہے، شروع میں حدیثیں لکھنے کی ممانعت تھی، مگر اسی زمانہ میں حدیثیں لکھی بھی گئیں، چنانچہ جب مانع ختم ہوگیا تو حدیثوں کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اب اس کے جواز پر اجماع ہے۔

حدیث: ابو جُحیفہ کہتے ہیں: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا خاندانِ نبوت کے پاس کوئی خاص کتاب ہے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: نہیں! البتہ قرآنِ کریم ہے یا وہ سمجھ ہے جو کسی مسلمان کو دی جاتی ہے یا وہ چیز ہے جو اس صحیفہ میں ہے (یہی ٹکڑا باب سے متعلق ہے) راوی کہتا ہے: میں نے پوچھا: صحیفہ میں کیا ہے؟ آپؓ نے فرمایا: دیت کے اور قیدیوں کو چھڑانے کے احکام ہیں اور یہ بات ہے کہ کسی مسلمان کو کسی کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے۔

تشریح:

شیعوں نے پروپیگنڈہ کیا تھا کہ حضور اقدس ﷺ نے خاندانِ نبوت (بنو ہاشم) کو خاص علوم دیئے ہیں جو دوسروں کو نہیں دیئے، اور دلیل یہ دیتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی تقریروں میں، وعظوں میں، اور اسباق میں وہ باتیں بیان کرتے ہیں جو دوسرے صحابہ بیان نہیں کرتے، معلوم ہوا کہ خاندانِ نبوت کے پاس کوئی خاص کتاب ہے جس میں سے وہ باتیں بیان کرتے ہیں۔

اس لئے حضرت ابو جُحیفہؓ نے سوال کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہمارے پاس کوئی مخصوص تحریر نہیں ہے، بس یہی قرآن ہے جو ساری امت کے پاس ہے، اور شیعوں کا یہ کہنا کہ حضرت علیؓ جو علمی باتیں بیان کرتے ہیں وہ دوسرے صحابہ بیان نہیں کرتے: یہ خداداد فہم ہے، اللہ تعالیٰ ہر آدمی کو الگ فہم دیتے ہیں مجھے اللہ تعالیٰ نے خاص فہم عنایت فرمایا ہے اس لئے میں قرآن سے وہ باتیں سمجھتا ہوں جو دوسرے صحابہ نہیں سمجھتے۔

پھر حضرت علیؓ نے طلبہ کا ذہن دوسری طرف پھیر دیا، فرمایا: ہاں میرے پاس ایک خاص تحریر ہے جو کسی اور کے پاس

نہیں، وہ تحریر میری تلوار کی مٹھ میں ہے، طلبہ نے اجازت لے کر وہ تحریر نکالی، اس میں زکوٰۃ کے مسائل تھے، دیت کے احکام تھے، مسلمان قیدیوں کو چھڑانے کا حکم تھا اور ایک بات یہ بھی تھی کہ کسی مسلمان کو کسی کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے، نصاب زکوٰۃ کی تفصیلات اور صحابہ کے پاس بھی تھیں، باقی تین باتیں اس تحریر میں زائد تھیں، اس لئے راوی نے انہی کا ذکر کیا۔ اور نصابِ زکوٰۃ کا تذکرہ چھوڑ دیا۔

قوله: لا يُقْتَلُ مسلمٌ بِكافرٍ: غیر مسلم چار قسم کے ہیں: (۱) ذمی: یعنی وہ غیر مسلم جس کو اسلامی ملک کی شہریت حاصل ہے (۲) مستأمن: امن طلب کرنے والا، یعنی وہ غیر مسلم جو ویزا لے کر اسلامی ملک میں آیا ہے (۳) معاہد: عہد و پیمان کرنے والا: یعنی دارالحرب کا وہ غیر مسلم جس کے ساتھ اسلامی ملک نے ناجنگ معاہدہ کر رکھا ہے (۴) حربی: دارالحرب کا باشندہ، جس کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں۔

تمام ائمہ متفق ہیں کہ اگر کوئی مسلمان مستأمن، معاہد یا حربی کو قتل کردے تو قصاص میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اور ذمی میں اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک اس کے بدلے میں مسلمان کو قتل کیا جائے گا، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک قتل نہیں کیا جائے گا۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یہ حدیث عام ہے۔ چاروں قسموں کو شامل ہے۔ اور احناف کے نزدیک ذمی کو یہ حدیث شامل نہیں، کیونکہ عمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم نے ذمی کے بدلے میں مسلمان کو قتل کیا ہے یا اس کا حکم دیا ہے۔ یہ بات متعدد روایات میں آئی ہے، وہ روایات اعلاء السنن (۱۸: ۹۴-۱۰۵) میں ہیں، وہ روایات اگرچہ ضعیف ہیں مگر سب مل کر قوی قابل استدلال ہو جاتی ہیں۔

اور مذکورہ حدیث احناف کے نزدیک دمائے جاہلیت کے بارے میں ہے، یعنی اگر کوئی کافر کسی دوسرے کافر کو قتل کردے پھر قاتل اور مقتول کے ورثاء مسلمان ہو جائیں اور وہ قصاص کا مطالبہ کریں تو اس قتل کے بدلے میں جو زمانہ جاہلیت میں ہوا تھا اس مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا (مزید تفصیل آگے آئے گی)

[۳۹-] بابُ كِتَابَةِ الْعِلْمِ

[۱۱۱-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ، قَالَ: أَنَا وَكِيْعٌ، عَنْ سُفْيَانَ، عَنْ مُطَرِّفٍ، عَنِ الشَّعْبِيِّ، عَنْ أَبِي جُحَيْفَةَ، قَالَ: قُلْتُ لِعَلِيٍّ رضى الله عنه : هَلْ عِنْدَكُمْ كِتَابٌ؟ قَالَ: لَا، إِلَّا كِتَابُ اللّٰهِ، أَوْ فَهْمٌ أُعْطِيَهُ رَجُلٌ مُسْلِمٌ، أَوْ مَا فِي هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ، قَالَ: قُلْتُ: وَمَا فِي هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ؟ قَالَ: الْعَقْلُ، وَفَكَاكُ الْأَسِيْرِ، وَلَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ. [انظر: ۱۸۷۰، ۳۰۴۷، ۳۱۷۲، ۳۱۷۹، ۶۷۵۵، ۶۹۰۳، ۶۹۱۵، ۷۳۰۰]

وضاحت: یہاں روایت میں جو سفیان ہیں وہ کونسے سفیان ہیں: ثوری یا ابن عیینہ؟ جواب: معلوم نہیں۔ اس لئے کہ دونوں سفیان اساتذہ اور تلامذہ میں شریک ہیں، اس لئے جب تک صراحت نہ ملے تعیین مشکل ہے، مگر اس جہالت

سے حدیث کی صحت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لئے کہ دونوں سفیان ثقہ اور قابل اعتماد ہیں۔

قاعدہ: اگر دو راویوں کے درمیان امتیاز مشکل ہو اور دونوں ثقہ ہوں تو حدیث صحیح ہے، اور دونوں ضعیف ہوں تو حدیث ضعیف ہے اور ایک ثقہ اور ایک ضعیف ہے تو توقف کیا جاتا ہے یعنی اس سے استدلال نہیں کیا جاتا۔

حدیث (۲): حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فتح مکہ کے سال قبیلۂ خزاعہ نے قبیلۂ بنولیث کے ایک آدمی کو قتل کیا اپنے اس مقتول کے بدلے میں جس کو پہلے قبیلۂ بنولیث نے قتل کیا تھا، نبی ﷺ کو یہ بات بتلائی گئی تو آپؐ اونٹنی پر سوار ہوئے اور تقریر فرمائی۔ آپؐ نے فرمایا: بیشک اللہ نے مکہ والوں سے قتل کو یا فرمایا: ہاتھی کو روک دیا ـــــ امام بخاریؒ فرماتے ہیں: اس کو شک پر محمول کرو، ابونعیم نے اسی طرح کہا تھا: القتل، أو: الفیل، اور ابونعیم کے علاوہ دیگر رواۃ تعیین کے ساتھ الفیل کہتے ہیں ـــــ اور مکہ والوں پر رسول اللہ ﷺ کو اور مسلمانوں کو قابو دیا۔ سنو! مکہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں ہوا اور نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال ہوگا، سنو! میرے لئے بھی دن کے ایک مخصوص حصہ میں حلال کیا گیا تھا۔ سنو! مکہ اس وقت بھی حرام ہے اس کا کانٹا یعنی کانٹے دار درخت نہ تراشا جائے اور اس کا درخت نہ کاٹا جائے، اور اس کا لقطہ نہ اٹھایا جائے مگر وہ شخص جو مالک تک پہنچانے کی نیت سے اٹھائے۔ پس اب جو قتل کیا جائے گا اس کے ورثاء کو دو مفید باتوں میں اختیار ہوگا، یا تو دیت لیں یا قاتل کو قصاصاً قتل کریں۔

تقریر کے بعد یمن کا ایک شخص آپؐ کے پاس آیا اور اس نے کہا: یارسول اللہ! یہ تقریر میرے لئے لکھوا دیجئے، آپؐ نے صحابہ سے فرمایا: یہ تقریر ابوشاہ کو لکھ کر دیدو (یہی ٹکڑا ترجمۃ الباب سے متعلق ہے) پھر قریش کے ایک شخص: حضرت عباسؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اذخر کا استثناء فرما دیجئے، اس لئے کہ ہم اس کو چھتوں پر بچھاتے ہیں اور قبروں میں ڈالتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''مگر اذخر مستثنیٰ ہے''

تشریح: زمانۂ جاہلیت میں قبائل میں خون ریزی ہوتی تھی، جس کا داؤ چلتا دشمن قبیلہ کے آدمی کو اڑا دیتا پھر جب موقع ملتا تو مقتول کا قبیلہ قاتل کے قبیلہ کے کسی بھی آدمی کو قتل کر دیتا، اس طرح قتل اور جواب قتل کا سلسلہ چلتا رہتا۔ فتح مکہ کے سال خزاعہ نے بنولیث کے کسی آدمی کو قتل کیا تھا، بنولیث پہلے خزاعہ کا آدمی مار چکے تھے، جب آنحضور ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے تقریر فرمائی کہ اس قتل کی دیت تو میں دیتا ہوں مگر آئندہ قتل ہوگا تو قاتل مقتول کے ورثاء کو سونپ دیا جائے گا، پھر ان کو دیت اور قصاص کے درمیان اختیار ہوگا اور یہ دونوں ہی باتیں ان کے لئے مفید ہیں، کبھی قصاص لینے سے دل کی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور آگے قتل کا سلسلہ رک جاتا ہے، اور کبھی دیت لینا مقتول کے ورثاء کے لئے مفید ہوتا ہے۔

اُس تقریر میں آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ہاتھی والے بھی مکہ پر چڑھائی کی کوشش کر چکے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے قتل کو یا فرمایا: ہاتھی کو مکہ سے روک دیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابونعیم (شیخ بخاریؒ) کو شک تھا کہ نبی ﷺ نے کیا لفظ استعمال

فرمایا تھا: القتل یا الفیل، مگر دیگر روات یقین کے ساتھ الفیل کہتے ہیں، اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ہاتھی والوں کے آنے کی خبر سن کر مکہ والے پہاڑوں میں چلے گئے تھے، مکہ خالی کر دیا تھا، اس لئے ہاتھی والے کس کا خون بہاتے؟

اور یہ بھی فرمایا کہ آج تک حرم میں قتال نہ کسی کے لئے جائز تھا اور نہ آئندہ جائز ہوگا، صرف مجھے قتال کی اجازت دی گئی، اور وہ بھی مخصوص وقت کے لئے اب اس کی حرمت پہلے کی طرح لوٹ آئی ہے۔ اب میرے لئے بھی یہاں قتال جائز نہیں۔

اور یہ بھی فرمایا کہ مکہ کا کوئی بھی درخت کانٹے دار یا بغیر کانٹے کا نہ کاٹا جائے، اور نہ پڑی چیز اٹھائی جائے مگر یہ کہ مالک تک پہنچانے کی نیت سے اٹھائے تو کوئی حرج نہیں (حرم کے کونسے درخت کاٹ سکتے ہیں اور کونسے نہیں؟ نیز لقطہ کے احکام کے سلسلہ میں پوری تفصیل پہلے باب ۳۷ میں گذر چکی ہے)

تقریر کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اذخر گھاس کا استثناء فرما دیجئے، اس لئے کہ یہ گھاس ہم چھتوں پر ڈالتے ہیں اور قبروں میں بچھاتے ہیں۔ آپؐ نے اس کا استثناء فرما دیا۔

تقریر کے بعد ایک شخص نے جو یمن کا رہنے والا تھا اور جس کا نام ابوشاہ تھا: عرض کیا کہ یہ تقریر مجھے لکھ کر دی جائے تاکہ میں اس کو یمن لے جاؤں اور لوگوں کو سناؤں، آپؐ نے حکم دیا اور صحابہ نے وہ تقریر ابوشاہ کو لکھ کر دی، اسی مناسبت سے یہ حدیث یہاں لائے ہیں کہ علم (حدیث) کو لکھنا جائز ہے، کیونکہ اس کی اصل یہ حدیث ہے۔

قولہ: بخیر النَّظَرین: النَّظَر کے معنی ہیں: شفقت، مہربانی، مفید، یعنی مقتول کے ورثاء کو دو مفید باتوں کے درمیان اختیار ہوگا، وہ دو باتیں: دیت اور قصاص ہیں، قتل عمد کی دیت بہت بھاری ہے، آج کل کے حساب سے تقریباً بیس لاکھ روپے بنتی ہے۔ یہ دیت مفید اس طرح ہے کہ اس سے ورثاء کو کاروبار کھڑا کرنے کا موقع ملے گا، اور قصاص میں بھی فائدہ ہے اس صورت میں غصہ ٹھنڈا ہوگا، اگر دیت ملے نہ قصاص تو اندر اندر لاوا ابلتا رہے گا اور مقتول کے ورثاء کو جب بھی موقع ملے گا قاتل کو یا اس سے تعلق رکھنے والے کسی بھی شخص کو قتل کر دیں گے، اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

اور مقتول کے ورثاء کو جو دیت لینے کا اختیار ہے وہ اختیار تام ہے یا ناقص؟ احناف کے نزدیک اختیار ناقص ہے یعنی قاتل کی رضامندی سے دیت لے سکتے ہیں، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اختیار کامل ہے، دیت لینے کے لئے قاتل کی رضامندی ضروری نہیں۔

[۱۱۲-] حدثنا أَبُوْ نُعَيْمٍ الْفَضْلُ بْنُ دُكَيْنٍ، قَالَ: ثنا شَيْبَانُ، عَنْ يَحْيىَ، عَنْ أَبِيْ سَلَمَةَ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ: أَنَّ خُزَاعَةَ قَتَلُوْا رَجُلاً مِنْ بَنِيْ لَيْثٍ، عَامَ فَتْحِ مَكَّةَ، بِقَتِيْلٍ مِنْهُمْ قَتَلُوْهُ، فَأُخْبِرَ بِذٰلِكَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم، فَرَكِبَ رَاحِلَتَهُ، فَخَطَبَ فَقَالَ: " إِنَّ اللهَ حَبَسَ عَنْ مَكَّةَ الْقَتْلَ أَوْ: الْفِيْلَ - قَالَ مُحَمَّدٌ: وَافْعَلُوْهُ

عَلَى الشَّكِّ، كَذَا قَالَ أَبُو نُعَيْمٍ: الْقَتْلَ أَوِ الْفِيلَ، وَغَيْرُهُ يَقُوْلُ: الْفِيلَ- وَسُلِّطَ عَلَيْهِمْ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم وَالْمُؤْمِنُوْنَ، أَلَا، وَإِنَّهَا لَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِيْ، وَلَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ بَعْدِيْ، أَلَا، وَإِنَّهَا حَلَّتْ لِيْ سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ، أَلَا، وَإِنَّهَا سَاعَتِيْ هٰذِهِ حَرَامٌ، لَا يُخْتَلٰى شَوْكُهَا، وَلَا يُعْضَدُ شَجَرُهَا، وَلَا تُلْتَقَطُ سَاقِطَتُهَا إِلَّا لِمُنْشِدٍ، فَمَنْ قُتِلَ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ: إِمَّا أَنْ يُعْقَلَ وَإِمَّا أَنْ يُقَادَ أَهْلُ الْقَتِيْلِ"

فَجَاءَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْيَمَنِ، فَقَالَ: اكْتُبْ لِيْ يَارسولَ اللَّهِ! فَقَالَ: " اكْتُبُوْا لِأَبِيْ فُلَانٍ"

فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ قُرَيْشٍ: إِلَّا الْإِذْخِرَ يَارسولَ اللَّهِ! فَإِنَّا نَجْعَلُهُ فِيْ بُيُوْتِنَا وَقُبُوْرِنَا، فَقَالَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم: " إِلَّا الْإِذْخِرَ، إِلَّا الْإِذْخِرَ" [انظر: ٢٤٣٤، ٦٨٨٠]

حدیث (۳): حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی پاک ﷺ کے اصحاب میں سے کسی کے پاس مجھ سے زیادہ حدیثیں نہیں ہیں، سوائے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے، یعنی ان کے پاس مجھ سے زیادہ حدیثیں ہیں، کیونکہ وہ حدیثیں لکھتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔

تشریح: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کی اجازت سے سنی ہوئی حدیثیں ایک کاپی میں لکھی تھیں جس کا نام انھوں نے صحیفۂ صادقہ رکھا تھا۔ اس لئے ان کے پاس حدیثیں زیادہ تھیں۔ مگر آج حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات زیادہ ہیں، حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات پانچ ہزار تین سو ہیں، اور حضرت عبداللہ کی سات سو سے نو سو تک۔ اور اس کی علماء نے متعدد وجوہ بیان کی ہیں، مثلاً: حضرت ابو ہریرہؓ پوری زندگی مدینہ منورہ میں رہے، اور انھوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ تعلیم وتعلّم میں مصروف رکھا جبکہ حضرت عبداللہؓ وفات نبوی کے بعد مصر چلے گئے تھے، اور ان کا زیادہ رجحان عبادات کی طرف تھا، اس لئے مرکزی جگہ میں ہونے کی وجہ سے حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس واردین وصادرین کی تعداد زیادہ تھی، اس وجہ سے ان کی روایات کی تعداد بڑھ گئی۔ کہتے ہیں: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے آٹھ سو تابعین نے حدیثیں روایت کی ہیں۔ حضرت عبداللہ نے حدیثیں لکھی تھیں اسی مناسبت سے یہ روایت یہاں لائے ہیں۔

[١١٣-] حدثنا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ، قَالَ: ثَنَا سُفْيَانُ، قَالَ: ثَنَا عَمْرٌو، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ وَهْبُ بْنُ مُنَبِّهٍ، عَنْ أَخِيْهِ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُوْلُ: مَا مِنْ أَصْحَابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم أَحَدٌ أَكْثَرَ حَدِيْثًا عَنْهُ مِنِّيْ، إِلَّا مَا كَانَ مِنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، فَإِنَّهُ كَانَ يَكْتُبُ وَلَا أَكْتُبُ. تَابَعَهُ مَعْمَرٌ، عَنْ هَمَّامٍ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ.

وضاحت: وہب اور ہمام دونوں بھائی ہیں، ہمام بہت مضبوط راوی ہیں، انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے سنی ہوئی حدیثیں ایک کاپی میں لکھی تھیں، جس کا نام صحیفۂ ہمام بن منبہ ہے، جو ڈاکٹر حمید اللہ رحمہ اللہ کی تحقیق سے چھپ چکا ہے، اس میں تقریباً سو حدیثیں ہیں۔ ان کے بھائی وہب ہلکے راوی ہیں اس لئے ان کے متابع معمر کو لائے، معمر بھی ہمام سے

یہ حدیث روایت کرتے ہیں۔

حدیث (۴): حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جب مرض وفات میں حضور اقدس ﷺ کی تکلیف بڑھی تو آپؐ نے فرمایا: میرے پاس کاغذ قلم لاؤ، میں تمہیں وہ بات لکھوادوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہوؤ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اس وقت آپؐ پر مرض کا غلبہ ہے اور ہمارے پاس قرآنِ کریم موجود ہے۔ قرآن ہمارے لئے کافی ہے، پس موجود لوگوں میں اختلاف ہوا، بعض کی رائے تھی کہ تحریر لکھوالینی چاہئے تاکہ امت گمراہ نہ ہو، اور بعض حضرت عمرؓ کی موافقت میں تھے۔ چنانچہ شور زیادہ ہوا، پس آپؐ نے فرمایا: سب میرے پاس سے چلے جاؤ، میرے پاس جھگڑا مناسب نہیں، حضرت ابن عباسؓ یہ حدیث بیان کر کے جب گھر سے نکلے تو طالبین سے فرمایا: مصیبت بالائے مصیبت یہ ہوئی کہ حضور ﷺ جو کچھ لکھوانا چاہتے تھے: لوگ اس کے درمیان اور آپؐ کے درمیان حائل ہو گئے!

تشریح:

۱- حضور اقدس ﷺ کیا لکھوانا چاہتے تھے؟ اس سلسلہ میں قیاس آرائیوں سے کوئی فائدہ نہیں جب آپؐ نے نہ لکھوایا نہ بتلایا تو اب کوئی یہ بات کیسے جان سکتا ہے؟ ایک ظاہری احتمال یہ ہے کہ آپؐ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کی صراحت کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپؐ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی فرمایا تھا۔ آگے بخاری (کتاب الاحکام، باب الاستخلاف حدیث نمبر ۷۲۱۷) میں یہ حدیث آرہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیماری کی حالت میں حضرت عائشہؓ سے فرمایا: ''میرا ارادہ ہوتا ہے کہ ابوبکر اور ان کے فرزند عبدالرحمٰن کو بلاؤں اور ان کو وصیت کروں، اور ان کو ولی عہد بناؤں، تاکہ کہنے والا کچھ نہ کہے۔ اور تمنا کرنے والا تمنا نہ کرے، پھر میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ ابوبکر کے علاوہ کسی اور کی خلافت پر راضی نہ ہونگے، اور مسلمان بھی سوائے ابوبکر کے کسی اور کی خلافت قبول نہ کریں گے: لقد هَمَمْتُ أن أُرسل إلى أبي بكر وابنه فَأَعْهَدَ، أن يقولَ القائلون أو يتمنى المتمنون، ثم قلت: يأبى الله ويدفع المؤمنون: یہ متفق علیہ حدیث ہے، اس حدیث سے ظاہری احتمال یہ نکلتا ہے کہ آپؐ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں لکھوانا چاہتے تھے، یا اپنے بعد ہونے والے خلفاء کو ترتیب وار لکھوانا چاہتے تھے۔

بہر حال آپؐ نے کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کیا البتہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز کی امامت سونپ کر ان کی خلافت کی طرف واضح اشارہ فرمایا۔ چنانچہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں جب خلافت کے مسئلہ میں اختلاف ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امامت صغریٰ سے امامت کبریٰ پر استدلال کیا، جس کو تمام صحابہ نے تسلیم کیا اور آپؓ بالاتفاق خلیفہ قرار پائے۔ اگرچہ چند اصحاب نے شروع میں ناگواری کا اظہار کیا، مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت نہیں کی، مگر ان کی ناراضگی کے اسباب دوسرے تھے، پھر جب صورتِ حال ان کے سامنے آئی تو ان کی ناراضگی ختم ہوگئی اور انھوں نے بھی بیعت کرلی۔

۲- اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے طلبہ کو حدیث سنا کر گھر سے نکلتے وقت جو تأسف کا اظہار کیا ہے کہ کاش لوگ مانع نہ بنتے اور تحریر لکھوا لیتے تو امت گمراہ نہ ہوتی۔ یہ تأسف اس بنا پر تھا کہ شیعہ جو پروپیگنڈہ کرتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بلا فصل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ یہی لکھوانا چاہتے تھے جس کو عمرؓ نے لکھوانے نہیں دیا: یہ پروپیگنڈہ ختم ہو جاتا، اب تو قیامت تک ان کا منہ کون پکڑ سکتا ہے!

۳- شیعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر یہ طعن کرتے ہیں کہ آخر وقت میں پیغمبر خدا ﷺ کو وصیت کرنے سے روکا، تحریر لکھنے نہ دی، پس آپؓ کی نافرمانی اور حکم عدولی کی وجہ سے وہ کافر ہو گئے۔

اس کا جواب: یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم عدولی نہیں کی تھی بلکہ خیر خواہی کی تھی۔ حضرت عمرؓ یہ چاہتے تھے کہ ایسی تکلیف اور بیماری کی شدت میں حضور کو تکلیف دینا مناسب نہیں۔ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ نے صلح حدیبیہ میں صلح نامہ میں سے لفظ ''رسول اللہ'' کو مٹانے کا حکم دیا تھا، مگر حضرت علیؓ نے نہیں مٹایا، یہ حکم عدولی نہیں تھی، بلکہ یہ انکار کمالِ محبت اور کمالِ عظمت کی دلیل تھی۔

علاوہ ازیں: آنحضور ﷺ جو کچھ لکھوانا چاہتے تھے وہ بات اگر اتنی ہی ضروری تھی تو اس واقعہ کے بعد آپؐ پانچ روز حیات رہے ہیں آپؐ بعد میں بھی وہ تحریر لکھوا سکتے تھے، مگر نہ تو آپؐ نے دوبارہ کاغذ قلم منگوایا نہ گھر والوں سے اس بارے میں کچھ فرمایا۔ معلوم ہوا کہ وہ کوئی ایسا ضروری حکم نہیں تھا جس پر دین و شریعت کا مدار ہو، بلکہ بر بنائے شفقت آپؐ کچھ لکھوانا چاہتے تھے اور صحابہ قرائن سے اس کو جانتے تھے اس لئے نہ لکھوانے سے کچھ ضرر نہیں ہوا۔

مناسبت: حدیث کا باب سے ربط واضح ہے۔ آپؐ نے آخر حیات میں کچھ لکھوانا چاہا، یہی کتابتِ علم ہے، مگر باہمی اختلاف مانع بنا۔ اس لئے تحریر وجود میں نہیں آئی، مگر ارادہ کرنا استدلال کے لئے کافی ہے۔

[۱۱٤-] حدثنا يَحْيَى بْنُ سُلَيْمَانَ، قَالَ: حَدَّثَنِي ابْنُ وَهْبٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِي يُونُسُ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: لَمَّا اشْتَدَّ بِالنَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم وَجَعُهُ، قَالَ: " ائْتُونِي بِكِتَابٍ أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَا تَضِلُّوا بَعْدَهُ " قَالَ عُمَرُ: إِنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم غَلَبَهُ الْوَجَعُ، وَعِنْدَنَا كِتَابُ اللَّهِ حَسْبُنَا، فَاخْتَلَفُوا وَكَثُرَ اللَّغَطُ، قَالَ: " قُومُوا عَنِّي، وَلَا يَنْبَغِي عِنْدِيَ التَّنَازُعُ " فَخَرَجَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَقُولُ: إِنَّ الرَّزِيَّةَ كُلَّ الرَّزِيَّةِ مَا حَالَ بَيْنَ رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم وَبَيْنَ كِتَابِهِ.

[انظر: ۳۰۵۳، ۳۱٦۸، ٤٤۳۱، ٤٤۳۲، ٥٦٦۹، ۷۳٦٦]

ملحوظہ: اس حدیث سے شیعوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر چار اعتراض کئے ہیں، جن کے جوابات تحفہ اثنا عشریہ میں حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ نے دیئے ہیں اور وہاں سے ایضاح البخاری کے حاشیہ میں نقل کئے ہیں۔

بابُ الْعِلْمِ وَالْعِظَةِ بِاللَّيْلِ

رات میں علمی باتیں اور نصیحت کرنا

گذشتہ باب کا حاصل یہ تھا کہ علم کو لکھ کر محفوظ کرلو۔ حدیث میں ہے: قَیِّدُوْا الْعِلْمَ بِالْکِتَابَةِ: لکھ کر علم کے پیر باندھ دو (قرطبی ۱۰:۲۰۶) یعنی علم کو محفوظ کرلو تاکہ بھول نہ ہو جاؤ، مگر یہ روایت امام بخاری کے معیار کی نہیں اس لئے اس کو نہیں لائے۔ اب یہ باب باندھا ہے کہ دن تو پڑھنے کے لئے ہے ہی، رات میں بھی پڑھو، پھر چاہے رات کے شروع میں سوجاؤ پھر اٹھ کر پڑھو، صبح کے وقت ذہن تازہ ہوتا ہے، اس وقت کا مطالعہ بہت مفید ہوتا ہے اور اگر چاہو تو رات کے شروع میں پڑھو پھر سوجاؤ، اکثر لوگوں کے لئے یہی آسان ہوتا ہے۔ اس لئے اگلا باب لائیں گے: بابُ السَّمَرَ بالعلم: سَمَر کے معنی ہیں: رات میں سونے سے پہلے باتیں کرنا، پس سونے سے پہلے پڑھنا پڑھانا بھی سمر ہے۔

مگر جو کچھ پڑھو، اسے یاد بھی کرو، ورنہ پڑھنا بیکار ہے، جو طالب علم خواندہ یاد نہیں کرتا اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو ہاتھوں میں سوراخ کرکے پانی پیتا ہے، پانی کبھی اس کے منہ تک نہیں پہنچے گا، جو کچھ استاذ ہاتھ میں ڈالے گا نیچے بہہ جائے گا، اس لئے اگلا باب لائیں گے: بابُ حفظ العلم۔

اُس کے بعد یہ باب آرہا ہے کہ جب پڑھنے کے لئے استاذ کے سامنے بیٹھو تو خاموش رہ کر استاذ کی بات غور سے سنو، اگر آپس میں باتیں کروگے تو استاذ کی بات غور سے نہیں سن سکوگے اور کچھ بھی پلے نہیں پڑے گا۔ اس لئے اگلا باب ہے: بابُ الإنصات للعلماء: علماء کے سامنے خاموش رہنا اور توجہ سے سننا۔ یہ مسلسل چار ابواب ہیں جن کا باب کتابة العلم کے ساتھ جوڑ ہے۔

حدیث: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ایک رات نبی ﷺ بیدار ہوئے، اور آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ پاک ہیں! آج رات کتنے فتنے اتارے گئے، اور کتنے خزانوں کے دوازے کھولے گئے۔ کمرے والیوں کو (ازواج مطہرات کو) بیدار کرو، بہت سی عورتیں دنیا میں کپڑے پہننے والی آخرت میں ننگی ہونگی۔

تشریح:

۱- آپ ﷺ نے رات میں خواب دیکھا جس سے گھبرا کر اٹھ گئے۔ اور اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کی، خواب کیا دیکھا تھا؟ معلوم نہیں، ہوسکتا ہے آپؐ نے یہی خواب بعینہ دیکھا ہو کہ امت کے لئے خزانوں کے دروازے کھول دیئے گئے اور فتنوں کے دوازے بھی۔ اس لئے کہ مال اور فتنے میں چولی دامن کا ساتھ ہے، جب بھی مال آتا ہے فتنے ساتھ لاتا ہے یعنی جب کسی قوم میں خوش حالی آتی ہے تو عام طور پر اللہ کا ڈر اٹھ جاتا ہے لوگوں کے احوال دگرگوں ہوجاتے ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپؐ نے خواب میں کچھ اور دیکھا ہو جس کی تعبیر آپؐ نے یہ بیان کی ہو۔

۲- ازواج مطہرات کے کمرے الگ الگ تھے، اور اس رات آنحضرت ﷺ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں تھے۔ اس لئے آپؐ نے فرمایا: یہاں کوئی ہے جو جاکر سب ازواج مطہرات کو بیدار کرے تاکہ وہ عبادت میں مشغول ہوں، اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ فتنوں سے حفاظت کا سامان اللہ تعالیٰ سے لو لگانا اور عبادت میں مشغول ہونا ہے۔

پھر اس سے گہرا اشارہ یہ ہے کہ جب لوگوں کے پاس مال آتا ہے تو سب سے پہلے عورتیں فتنے میں مبتلا ہوتی ہیں، ان میں فیشن چل پڑتا ہے۔ پس عورتوں کو فتنے سے بچنے کا سامان زیادہ کرنا ہے۔ یعنی ان کو عبادت میں مصروف زیادہ ہونا ہے۔

۳- اور مال کی وجہ سے عورتوں میں سب سے بڑا فتنہ لباس کے تعلق سے آتا ہے، پہلے لوگ اس حدیث کی شرح یہ کرتے تھے کہ عورتیں اتنا باریک کپڑا پہنیں گی کہ بدن جھلکے گا، بظاہر لباس پہن رکھا ہوگا مگر بدن جھلک رہا ہوگا، پس گویا وہ ننگی ہونگی اس لئے آخرت میں ان کو یہ سزا ملے گی کہ وہ حقیقتاً ننگی ہونگی، مگر اب مغربیت کا سیلاب امنڈ آیا ہے مرد بھی ایسے کپڑے پہنتے ہیں کہ ننگے معلوم ہوتے ہیں اور عورتیں بھی ایسے کپڑے پہنتی ہیں کہ ننگی معلوم ہوتی ہیں۔ پتلون ایسا ہی عریاں لباس ہے اس کو مرد تو پہنتے ہی ہیں عورتیں بھی پہننے لگی ہیں، بلکہ فیشن پرست عورتیں تو حقیقتاً ننگی ہوتی ہیں، ذرا سا کپڑا بدن پر ڈال لیتی ہیں، باقی سارا بدن کھلا رہتا ہے۔

اور یہ بگاڑ ٹی وی کے راستے سے دنیا میں آیا ہے، ٹی وی سانپوں کی پٹاری ہے اس کے ذریعہ تبلیغ کے بغیر مغربی کلچر ساری دنیا میں پھیل رہا ہے، پس ٹی وی درحقیقت ٹی بی ہے جو انسانیت کی روح کو کھوکھلا کردیتی ہے۔

اور ٹی وی کے بعد دوسرا نمبر کیمرے کا ہے، آپ کوئی بھی اخبار اٹھا کر دیکھیں خاص طور پر انگریزی اخبار، آپ کو ہر صفحے پر عورتوں کی ننگی تصویریں نظر آئیں گی اور بہت سے لوگ تو ان تصویروں کی وجہ سے اخبار خریدتے ہیں۔ ان دو شیطانی چرخوں نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور ہر جگہ یورپ وامریکہ کا کلچر عام ہو رہا ہے، جس کی وجہ سے عورتیں کپڑے پہننے کے باوجود ننگی ہوتی ہیں۔ اور مرد بھی ننگے ہوتے ہیں، ان کو آخرت میں یہ سزا ملے گی کہ وہ حقیقتاً ننگے ہونگے۔

مناسبت: یہ ارشاد حضور اقدس ﷺ نے رات کے پچھلے حصہ میں بیدار ہونے کے بعد فرمایا ہے۔ پس رات میں سوکر اٹھنے کے بعد پڑھنے پڑھانے کا ثبوت نکل آیا اور یہی باب کا مدعی ہے۔

[۴۰-] بابُ الْعِلْمِ وَالْعِظَةِ بِاللَّيْلِ

[۱۱۵-] حدثنا صَدَقَةُ، قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ، عَنْ مَعْمَرٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ هِنْدٍ، عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، ح: وَعَمْرٌو، وَيَحْيَى بْنُ سَعِيْدٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنِ امْرَءَ ةٍ، عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، قَالَتْ: اسْتَيْقَظَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم ذَاتَ لَيْلَةٍ، فَقَالَ: "سُبْحَانَ اللهِ! مَاذَا أُنْزِلَ اللَّيْلَةَ مِنَ الْفِتَنِ، وَمَاذَا فُتِحَ مِنَ الْخَزَائِنِ، أَيْقِظُوْا صَوَاحِبَ الْحُجَرِ، فَرُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٍ فِي الآخِرَةِ" [انظر: ۱۱۲۶، ۳۵۹۹، ۵۸۴۴، ۶۲۱۸، ۷۰۶۹]

بابُ السَّمَرِ فِی الْعِلْمِ

سونے سے پہلے علمی باتیں کرنا

رات میں سونے سے پہلے بھی پڑھنا پڑھانا جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، سَمَر کے معنی ہیں: رات میں سونے سے پہلے قصہ گوئی کرنا تاکہ نیند آجائے۔

حدیث (۱): ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ہمیں نبی ﷺ نے اپنی آخری زندگی میں ایک رات عشا کی نماز پڑھائی، پھر جب سلام پھیرا تو آپ کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''تم اپنی اس رات کو دیکھو یعنی یاد رکھو، پس بیشک اس رات سے سو سال کے ختم پر ان لوگوں میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا جو آج زمین کی پیٹھ پر ہیں''

تشریح:

۱- اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سو سال ہوتے ہوتے یہ قرن ختم ہوجائے گا۔ بعض لوگوں کو اس حدیث سے غلط فہمی ہوئی، انھوں نے حدیث کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ صدی کے ختم پر قیامت آجائے گی، حالانکہ آپ کی مراد یہ تھی کہ سو سال ہوتے ہوتے یہ قرن ختم ہوجائے گا، یہ مطلب خود راوی حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا ہے۔

(ترمذی حدیث ۲۲۳۹، ابواب الفتن)

۲- لوگوں نے اس حدیث کے ذیل میں حیاتِ خضر، حیاتِ عیسیٰ اور حیاتِ جنّات کے مسائل چھیڑے ہیں، انھوں نے خیال کیا کہ یہ منطق کا کلیہ ہے، اس سے کوئی جزئیہ خارج نہیں رہنا چاہئے، حالانکہ یہ خطابی ارشاد ہے جو اکثری احوال کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اگر بعض جزئیات اس سے خارج ہوجائیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ غرض مذکورہ مسائل کا اس حدیث سے کچھ تعلق نہیں۔ ان کو اگر طے کرنا ہے تو ان کے دلائل سے طے کرنا چاہئے، اس حدیث سے ان کا کچھ تعلق نہیں۔

مناسبت: آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد عشاء کے بعد فرمایا ہے، پس ثابت ہوا کہ رات میں سونے سے پہلے بھی پڑھنے پڑھانے کی گنجائش ہے۔

[۴۱-] بابُ السَّمَرِ فِی الْعِلْمِ

[۱۱۶-] حدثنا سَعِیْدُ بْنُ عُفَیْرٍ، قَالَ: حَدَّثَنِیْ اللَّیْثُ، قَالَ: حَدَّثَنِیْ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ خَالِدِ بْنِ مُسَافِرٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ سَالِمٍ، وَأَبِیْ بَکْرِ بْنِ سُلَیْمَانَ بْنِ أَبِیْ حَثْمَةَ: أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ قَالَ: صَلّٰی لَنَا النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم الْعِشَاءَ فِیْ آخِرِ حَیَاتِهِ، فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ، فَقَالَ: " أَرَأَیْتَکُمْ لَیْلَتَکُمْ هٰذِهِ، فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لاَ یَبْقٰی مِمَّنْ هُوَ عَلٰی ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ" [انظر: ۵۶۴، ۶۰۱]

حدیث (۲): حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے ایک رات اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر گذاری، اس دن نبی ﷺ کی حضرت میمونہ کے یہاں باری تھی، نبی ﷺ نے عشا کی نماز پڑھائی، پھر گھر تشریف لائے، پھر چار رکعتیں پڑھیں، پھر سو گئے، پھر کھڑے ہوئے اور پوچھا: بچونگڑا سو گیا؟ یا اس کے مانند کوئی جملہ فرمایا، پھر آپ نماز کے لئے کھڑے ہوئے، پس میں آپؐ کی بائیں طرف کھڑا ہوا، آپؐ نے مجھے اپنی دائیں طرف لے لیا۔ آپؐ نے پانچ رکعتیں پڑھیں، پھر دو رکعتیں پڑھیں، پھر سو گئے یہاں تک کہ میں نے آپؐ کے خراٹوں کی آواز سنی، پھر آپؐ نماز (فجر) کے لئے تشریف لے گئے۔

تشریح: یہ حدیث بخاری شریف میں کئی جگہ آئی ہے۔ اور راویوں میں ترتیب واقعہ اور تعداد رکعات میں اختلاف ہے، اور سندیں سب کی صحیح ہیں، بخاری میں آئی ہیں۔ یہاں جو ترتیب ہے اس کے اعتبار سے حدیث باب سے بے جوڑ ہے۔ حقیقت میں واقعہ کی صحیح نوعیت وہ ہے جو آئندہ بخاری میں آ رہی ہے اور وہ یہ ہے: ایک رات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنی خالہ ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر رک گئے تاکہ آنحضور ﷺ کی رات کی عبادت دیکھیں، وہ حضرت میمونہؓ کی باری کا دن تھا۔ اور اُن دنوں وہ نماز نہیں پڑھتی تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ تکیہ کی چوڑائی میں سر رکھ کر لیٹ گئے، ابھی پوری طرح سوئے نہیں تھے کہ حضور اقدس ﷺ عشا پڑھا کر تشریف لائے اور آپؐ نے چار رکعتیں پڑھیں، یہ عشاء کے بعد کی دو سنت مؤکدہ اور دو سنت غیر مؤکدہ تھیں۔ پھر آپؐ نے پوچھا: بچونگڑا سو گیا؟ (یہ آپؐ نے سونے سے پہلے پوچھا تھا) حضرت میمونہؓ نے کہا: جی ہاں سو گیا۔ پھر آپؐ اور حضرت میمونہؓ تکیہ کی لمبائی میں سر رکھ کر لیٹ گئے اور باتیں کرتے ہوئے سو گئے (یہ سمر ہے) پھر رات میں آنحضور ﷺ خاموشی سے اٹھے تاکہ کسی کی نیند خراب نہ ہو، اور استنجے وغیرہ سے فارغ ہو کر گھر میں ایک مشکیزہ لٹک رہا تھا اس کے پاس آئے اور ہلکا وضو کیا پھر تہجد شروع فرمایا، ابن عباسؓ سارا منظر دیکھ رہے تھے کیونکہ وہ سوئے نہیں تھے، چنانچہ انھوں نے بھی اسی طرح وضو کیا، اور آنحضور ﷺ کی اقتداء کرلی، مگر آپؐ کی بائیں طرف کھڑے ہوئے آپؐ نے اشارہ سے ان کو دائیں طرف لے لیا۔

یہ جو آنحضور ﷺ نے سونے سے پہلے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے باتیں کی ہیں یہی سمر ہے، پس ثابت ہوا کہ رات میں سونے سے پہلے پڑھنا پڑھانا جائز ہے۔ اسی مقصد سے یہ حدیث لائے ہیں (سونے سے پہلے باتیں کرنے والا مضمون کتاب التفسیر (حدیث نمبر ۴۵۶۹) میں ہے)

فائدہ: امام بخاری رحمہ اللہ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کبھی وہ باب میں جو روایت لاتے ہیں اس کو پیش نظر رکھ کر ترجمہ قائم نہیں کرتے بلکہ نفس الامر میں جو واقعہ ہوتا ہے جو کسی دوسری روایت میں آیا ہوتا ہے اس کو پیش نظر رکھ کر ترجمہ قائم کرتے ہیں، یہاں ایسا ہی کیا ہے۔

[۱۱۷-] حدثنا آدَمُ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، قَالَ: ثَنَا الْحَكَمُ، قَالَ: سَمِعْتُ سَعِيْدَ بْنَ جُبَيْرٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: بِتُّ فِيْ بَيْتِ خَالَتِيْ مَيْمُوْنَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ زَوْجِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، وَكَانَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم عِنْدَهَا فِيْ لَيْلَتِهَا، فَصَلَّى النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم الْعِشَاءَ، ثُمَّ جَاءَ إِلَى مَنْزِلِهِ فَصَلَّى أَرْبَعَ رَكْعَاتٍ، ثُمَّ نَامَ، ثُمَّ قَامَ، ثُمَّ قَالَ:" نَامَ الْغُلَيِّمُ؟" أَوْ: كَلِمَةً تُشْبِهُهَا، ثُمَّ قَامَ فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهِ، فَجَعَلَنِيْ عَنْ يَمِيْنِهِ، فَصَلَّى خَمْسَ رَكْعَاتٍ، ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ نَامَ حَتّٰى سَمِعْتُ غَطِيْطَهُ، أَوْ: خَطِيْطَهُ، ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ.[انظر:۱۳۸، ۱۸۳، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۲۶، ۷۲۸، ۸۵۹، ۱۱۹۸، ۴۵۶۹، ۴۵۷۰، ۴۵۷۱ ۵۹۱۹، ۶۲۱۵، ۶۳۱۶، ۷۴۵۲]

وضاحت: خراٹوں کا آغاز خطیط کہلاتا ہے۔اور بعد والی کیفیت غطیط، راوی کو شک ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے کونسا لفظ بولا تھا۔

بابُ حِفْظِ الْعِلْمِ

علم کی حفاظت کرنا

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ خواندہ یاد کرنا چاہئے، پڑھنا اور خواندہ یاد نہ کرنا غیر مفید ہے، پڑھنا اسی وقت مفید ہے جب خواندہ یاد کیا جائے۔

حدیث (۱): حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لوگ کہتے ہیں: ابو ہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے، اگر قرآن مجید کی دوآیتیں نہ ہوتیں تو میں کبھی بھی حدیث بیان نہ کرتا، پھر سورۂ بقرہ کی دوآیتیں (۱۵۹و۱۶۰) تلاوت فرمائیں: ''جولوگ چھپاتے ہیں ان واضح دلیلوں کو اور ہدایت کی باتوں کو جو ہم نے اتاریں، اس کے بعد کہ ہم نے وہ باتیں لوگوں کے واسطے کھول دیں کتاب (توریت) میں ان پر اللہ تعالیٰ لعنت بھیجتے ہیں، اور لعنت کرنے والے بھی یعنی جن وانس، ملائکہ وحیوانات سب لعنت بھیجتے ہیں۔مگر جنھوں نے توبہ کی اور اپنے کام درست کر لئے اور حق بات بیان کر دی پس میں ان کو معاف کر دونگا۔اور میں بڑا معاف کرنے والا نہایت مہربان ہوں''

بیشک ہمارے مہاجر بھائی بازاروں میں مشغول رہتے تھے اور ہمارے انصاری بھائی باغوں میں مشغول رہتے تھے، اور ابو ہریرہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ لگا رہتا تھا، اس کو صرف کھانے کی فکر تھی، اور وہ اس وقت حاضر رہتا تھا جب مہاجرین وانصار حاضر نہیں رہتے تھے، اور ان حدیثوں کو یاد کرتا تھا جن کو مہاجرین وانصار یاد نہیں کرتے تھے۔

تشریح: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر بہ کثرت حدیثیں بیان کرنے کی وجہ سے ان کی زندگی ہی میں اعتراض ہوا

تھا۔ اس روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ پہلی بات تو یہ فرمائی کہ اگر میرے سامنے سورۂ بقرہ کی مذکورہ دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کبھی بھی حدیث بیان نہ کرتا۔ اُن آیتوں کی وجہ سے مجبوراً میں حدیثیں بیان کرتا ہوں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن آیات میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ رشد و ہدایت اور علم دین کو چھپاتے ہیں ان پر اللہ کی اور کل کائنات کی لعنت ہے۔ اس وعید سے بچنے کے لئے میں حدیثیں بیان کرتا ہوں۔

پھر اعتراض کا جواب دیا کہ مہاجرین کاروبار میں مشغول رہا کرتے تھے اور انصار کھیتی باڑی میں، وہ حضرات جب وقت ملتا مجلس نبوی میں حاضر ہوتے، باقی وقت کاروبار میں اور بیوی بچوں میں مشغول رہتے۔ اور ابو ہریرہؓ کو کیا چاہئے تھا؟ دو روٹی اور دو بوٹی جو آنحضور ﷺ کے دسترخوان پر مل جاتی تھیں، اس لئے میں ہر وقت آنحضور ﷺ کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ آپ کے ارشادات سنتا اور ان کو یاد کرتا، اس کے علاوہ میرا کوئی کام نہیں تھا۔ اس لئے میرے پاس حدیثیں زیادہ ہیں۔

مناسبت: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو دعائے نبوی کی برکت سے بھی جس کی تفصیل اگلی حدیث میں آرہی ہے ساری حدیثیں یاد رہتی تھیں، وہ کوئی حدیث بھولتے نہیں تھے۔ اور دیگر صحابہ بھول بھی جاتے تھے، یہی ٹکڑا یعنی **یحفظ مالا یحفظون** باب سے متعلق ہے۔

سوال: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو دعائے نبوی کی برکت سے حدیثیں خود بخود یاد ہو جاتی تھیں، ان کو یاد نہیں کرنا پڑتی تھیں، پس حدیث باب کے ساتھ منطبق نہیں، باب ہے: جو پڑھا ہے اس کو یاد کرو، اور حضرت ابو ہریرہؓ کو یاد نہیں کرنا پڑتا تھا۔

جواب: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو دعا کی برکت حاصل تھی مگر وہ حدیثیں یاد بھی کرتے تھے اور آپؐ کی وفات کے بعد حدیثیں یاد کر کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سناتے بھی تھے۔

[٤٢-] بابُ حِفْظِ الْعِلْمِ

[١١٨-] حدثنا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنِ الْأَعْرَجِ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، قَالَ: إِنَّ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ: أَكْثَرَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ! وَلَوْلَا آيَتَانِ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مَا حَدَّثْتُ حَدِيْثًا، ثُمَّ يَتْلُوْ: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى﴾ إِلٰى قَوْلِهِ: ﴿الرَّحِيْمُ﴾ [البقرة: ١٥٩] إِنَّ إِخْوَانَنَا مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفَقُ بِالْأَسْوَاقِ، وَإِنَّ إِخْوَانَنَا مِنَ الْأَنْصَارِ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الْعَمَلُ فِيْ أَمْوَالِهِمْ، وَإِنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ يَلْزَمُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم لِشِبَعِ بَطْنِهِ، وَيَحْضُرُ مَالَا يَحْضُرُوْنَ، وَيَحْفَظُ مَالَا يَحْفَظُوْنَ. [انظر: ١١٩، ٢٠٤٧، ٢٣٥٠، ٣٦٤٨، ٧٣٥٤]

قولہ: لِشِبَعِ بطنه: میں لام تعلیلیہ ہے أی لأجل یعنی ابو ہریرہ کو کیا چاہئے تھا؟ پیٹ بھر کھانا!

حدیث (۲): حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں آپؐ سے بہت سی باتیں سنتا ہوں مگر بھول جاتا ہوں، آپؐ نے فرمایا: اپنی چادر پھیلاؤ، میں نے چادر پھیلا دی، آپؐ نے اس میں لپ بھر کر ڈالا یعنی ڈالنے کا اشارہ کیا، پھر فرمایا: چادر کو سینہ سے لگالو، میں نے چادر سینہ سے ملالی اس کے بعد میں کبھی کوئی حدیث نہیں بھولا، جو حدیث سنتا خود بخود یاد ہو جاتی۔

تشریح: یہ واقعہ بیان کر کے حضرت ابو ہریرہؓ نے لوگوں کے اعتراض کا جواب دیا ہے کہ لوگ حدیث کی کثرت کی وجہ سے مجھ پر طعن کرتے ہیں۔ جواب یہ دیا ہے کہ میں ایک طرف ہر وقت نبی ﷺ کے ساتھ لگا رہتا تھا، دوسری طرف حضور اقدس ﷺ کی ایک خصوصی دعا بھی مجھے حاصل تھی۔ جب میں نے حافظہ کی کمزوری کی شکایت کی تو آپؐ نے میری چادر میں کچھ ڈالا، ہاتھ بظاہر خالی تھے، مگر ان میں علم کے خزانے تھے، چنانچہ میں اس کے بعد آپؐ کی کوئی بات نہیں بھولا، یہ وجہ ہے میرے پاس حدیثیں زیادہ ہونے کی۔

[۱۱۹-] حدثنا أَبُوْ مُصْعَبٍ أَحْمَدُ بْنُ أَبِيْ بَكْرٍ، قَالَ: ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ إِبْرَاهِيْمَ بْنِ دِيْنَارٍ، عَنِ ابْنِ أَبِيْ ذِئْبٍ، عَنْ سَعِيْدِ الْمَقْبُرِيِّ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، قَالَ: قُلْتُ: يَارسولَ اللهِ! إِنِّيْ أَسْمَعُ مِنْكَ حَدِيْثًا كَثِيْرًا أَنْسَاهُ، قَالَ: "ابْسُطْ رِدَاءَ كَ" فَبَسَطْتُهُ، قَالَ: فَغَرَفَ بِيَدَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: "ضُمَّ"، فَضَمَمْتُهُ، فَمَا نَسِيْتُ شَيْئًا بَعْدُ.

[راجع: ۱۱۷]

حدثنا إِبْرَاهِيْمُ بْنُ الْمُنْذِرِ، قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِيْ فُدَيْكٍ بِهٰذَا، قَالَ: فَغَرَفَ بِيَدِهِ فِيْهِ.

وضاحت: یہ حدیث ابراہیم بن المنذر: ابن ابی فُدیک سے، اور وہ ابن ذئب سے بھی روایت کرتے ہیں۔ اور دونوں حدیثوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی حدیث میں بیدیہ تثنیہ ہے اور دوسری حدیث میں بیدہ مفرد ہے اور بس۔

حدیث (۳): حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو برتن محفوظ کئے ہیں۔ ان میں سے ایک برتن میں نے پھیلایا ہے۔ یعنی اس کی حدیثیں بیان کی ہیں اور رہا دوسرا برتن تو اگر میں اس کو پھیلاؤں تو یہ گردن کاٹ دی جائے۔

تشریح:

۱- وہ حدیثیں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان نہیں کیں وہ فتنوں کی حدیثیں تھیں۔ آنحضور ﷺ نے کچھ نام بہ نام بیان کئے تھے، جیسے مدینہ منورہ میں جو منافقین تھے آپؐ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو ان کے نام بتادیئے تھے، مگر حضرت حذیفہؓ کو بیان کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی وجہ سے وہ "رسول اللہ کے بھیدی" کہلاتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے دورِ خلافت میں جب کسی کے ایمان کے بارے میں شک ہوتا، اور اس کا انتقال ہوتا، اور جنازہ آتا تو آپؓ پوچھتے: حذیفہؓ جنازہ پڑھنے آئے ہیں؟ اگر آئے ہوتے تو آپؓ جنازہ پڑھاتے، ورنہ نہیں پڑھاتے، اسی طرح چند امراء کے نام حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بتائے تھے مگر ان کو بیان کرنے کی اجازت نہیں تھی، اسی تھیلے کی حدیثوں کا حضرت ابو ہریرہؓ نے تذکرہ کیا ہے۔

۲- جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو منافقین اور فتنہ پرور امراء کے نام بتائے تھے تو پھر ان کو بیان کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی تھی؟ جواب: اس کی وجہ ہمیں معلوم نہیں، جب کسی حدیث میں اس کا کوئی اشارہ نہیں آیا تو ہم کیسے بتلائیں؟ رہے عقلی احتمالات تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

۳- دونوں تھیلوں کا برابر ہونا ضروری نہیں، ممکن ہے ایک تھیلا اتنا بڑا ہو کہ اس میں پانچ ہزار حدیثیں آئیں، اور دوسرے تھیلے میں صرف پانچ۔ بہر حال ایک تھیلا حضرت ابو ہریرہؓ نے کھول دیا اس کی حدیثیں امت تک پہنچا دیں، اور دوسرا تھیلا محفوظ رکھا اسے کھولنے میں فتنہ کا اندیشہ تھا۔

۴- اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ جن باتوں کے بیان کرنے میں فتنے کا اندیشہ ہو وہ باتیں لوگوں کے سامنے بیان نہیں کرنی چاہئیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غالباً اسی وجہ سے بیان کرنے سے منع کیا ہوگا۔

۵- گردن میں دو رگیں ہیں: ایک سے سانس آتا جاتا ہے وہ حُلقوم ہے، اور دوسری سے کھانا پانی آتا جاتا ہے وہ بُلعوم ہے مگر یہاں مراد گردن ہے۔

[۱۲۰-] حدثنا إِسْمَاعِيْلُ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ أَخِيْ، عَنِ ابْنِ أَبِيْ ذِئْبٍ، عَنْ سَعِيْدٍ الْمَقْبُرِيِّ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، قَالَ: حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم وِعَاءَ يْنِ، فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ، وَأَمَّا الآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ، قَالَ أَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ: الْبُلْعُوْمُ: مَجْرَى الطَّعَامِ.

بَابُ الإِنْصَاتِ لِلْعُلَمَاءِ

علماء کے سامنے خاموش رہنا

تعلّم کے وقت علماء کے سامنے خاموش رہنا چاہئے، خاموش ہو کر بات سننی چاہئے، اگر بات سُن بھی رہا ہے اور باتیں بھی کر رہا ہے تو بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿إِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهُ وَأَنْصِتُوْا﴾: جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو، خاموش رہنے کا حکم اسی وجہ سے ہے کہ قرآن غور سے سنا جائے۔

حدیث: حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی پاک ﷺ نے ان سے حجۃ الوداع کے موقعہ پر فرمایا: لوگوں کو خاموش کرو۔ حضرت جریرؓ نے لوگوں کو خاموش کیا، جب سب لوگ خاموش ہوگئے تو آپؐ نے فرمایا: ''میرے بعد کافر مت ہوجانا کہ بعض بعض کی گردنیں مارنے لگیں!''

تشریح:

یہاں حقیقی کفر مراد نہیں، بلکہ دین کا عملی انکار مراد ہے، جس کی ایک صورت مسلمانوں کا باہم قتل وقتال بھی ہے، اس لئے کہ باہمی نزاعات مونڈنے والے ہیں، اور سر نہیں مونڈتے، دین مونڈ دیتے ہیں، فتنے جب سر ابھارتے ہیں تو قتل وقتال کی نوبت آتی ہے جو عملی طور پر دین کا انکار ہے۔

اور جو مشہور ہے کہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ وفات نبوی سے پچاس دن پہلے مسلمان ہوئے ہیں، یہ بات شاید صحیح نہ ہو۔ حضرت جریرؓ حجۃ الوداع میں شریک تھے، پس اغلب یہ ہے کہ آپؓ ۹ ہجری میں مسلمان ہوئے ہیں، ذوالخلصہ کا مندر نبی ﷺ نے آپؓ کے ذریعہ منہدم کرایا ہے، بڑے حسین وجمیل تھے، حضرت عمرؓ آپؓ کو اس امت کا یوسف کہتے تھے، جنگ قادسیہ میں قبیلۂ بجیلہ کا علم آپؓ کے ہاتھ میں تھا، حضرت علیؓ نے آپ کو سفیر بنا کر حضرت معاویہؓ کے پاس بھیجا تھا، مگر بعد میں آپؓ فتنوں سے الگ ہوگئے اور ۵۱ ہجری میں وفات پائی۔ آنحضور ﷺ جب بھی آپ کو دیکھتے مسکراتے، یہ مسکرانا اکرام یا انبساط کے لئے تھا۔ جب وہ پہلی مرتبہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں تو آپؐ نے ان کے لئے اپنی چادر بچھائی ہے۔

اور اس حدیث میں دو جملے ہیں اور دونوں کے درمیان واوِ عاطفہ نہیں ہے، پس دونوں جملوں میں کمال اتصال ہے، اس لئے دونوں جملوں کا مفہوم ایک ہے۔

[٤٣-] بَابُ الإِنْصَاتِ لِلْعُلَمَاءِ

[١٢١-] حدثنا حَجَّاجٌ، قَالَ: ثنا شُعْبَةُ، قَالَ: أَخْبَرَنِي عَلِيُّ بْنُ مُدْرِكٍ، عَنْ أَبِي زُرْعَةَ، عَنْ جَرِيْرٍ، أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ لَهُ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ: اسْتَنْصِتِ النَّاسَ، فَقَالَ: "لاَ تَرْجِعُوْا بَعْدِيْ كُفَّارًا، يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ" [انظر: ٤٤٠٥، ٦٨٦٩، ٧٠٨٠]

بابُ مَا يُسْتَحَبُّ لِلْعَالِمِ إِذَا سُئِلَ: أَيُّ النَّاسِ أَعْلَمُ؟ فَيَكِلُ الْعِلْمَ إِلَى اللهِ تَعَالىٰ

جب عالم سے پوچھا جائے کہ سب سے بڑا عالم کون ہے؟ تو کہے: اللہ بہتر جانتے ہیں

عالم کے لئے تواضع اور خاکساری ضروری ہے، حدیث میں ہے: مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ: جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی

کے لئے خاکساری اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اونچا اٹھاتے ہیں، جس عالم میں غرور ہوتا ہے اس کا فیض عام نہیں ہوتا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا فیض عام ہو تو اپنے علم پر کبھی غرور نہ کرو، اپنے آپ کو چھوٹا سمجھو، خاکساری اختیار کرو، تمہارا فیض عام ہوگا۔ یہ باب اسی مقصد سے لائے ہیں، مثلاً: ایک گاؤں ہے، جہاں تنہا آپ ہی عالم ہیں، آپ کے علاوہ دوسرا کوئی عالم نہیں۔ اب اگر آپ سے پوچھا جائے کہ گاؤں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ اور آپ جواب دیں کہ میں ہوں تو یہ جواب صحیح ہے مگر مبنی بر تکبر ہے، ''میں'' اللہ کو پسند نہیں۔ ایسے موقعہ پر علم کو اللہ کی طرف پھیر دینا چاہئے، یعنی یہ جواب دینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

تواضع کی مثال: آپ بیٹھے ہیں، کوئی کھڑے کھڑے آپ سے مسئلہ پوچھتا ہے آپ اس کی بے تمیزی کا خیال نہ کریں اس کو مسئلہ بتادیں، یہ بات باب تواضع سے ہے، اس لئے اگلا باب لائے: **بابُ مَنْ سَأَلَ وَهُوَ قَائِمٌ عالمًا جالِسًا:** یعنی اگر کوئی کھڑے کھڑے مسئلہ پوچھے تو اسی حالت میں مسئلہ بتلادے بلکہ اگر مفتی صاحب کسی کام میں مشغول ہوں اور کوئی مسئلہ پوچھے تو بھی بتادینا چاہئے، سائل کی بے تمیزی کا خیال نہیں کرنا چاہے، چنانچہ اگلا باب لائے: **بابُ السُّؤَالِ وَالْفُتْيَا عند رَمْيِ الْجِمَارِ،** آخر بندہ کس چیز پر اکڑے؟ کس بر تے پر اپنے لوسبا کھینچے؟ اس کے پاس کیا ہے؟ ساری کائنات کا علم مل کر بھی اللہ کے علم کے پاسنگ کو نہیں پہنچتا، انسان کے پاس معمولی علم ہے، اس کو اس پر غرور زیب نہیں دیتا اس لئے اگلا باب لائے: **بابُ قول الله تعالیٰ ﴿ وَمَا أُوْتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلاَّ قَلِيْلاً ﴾** یہ مسلسل چار ابواب کے درمیان ربط اور ان کے مقاصد کا بیان ہے۔

یہاں حدیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک تعلیمی سفر کا تذکرہ ہے جو مختصر طور پر پہلے (باب ۱۶ میں) گذر چکا ہے۔ یہ واقعہ بنی اسرائیل کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے، مگر یہود نے اس واقعہ کو اپنے پیغمبر کی کسر شان سمجھا، اس لئے انھوں نے اس واقعہ کو ایک فرضی موسیٰ کے ساتھ جوڑ دیا، نوف بن فضالہ بکالی ایک تابعی ہیں، وہ کعب احبار کی بیوی کے لڑکے تھے، اور انھوں نے کعب احبار کے گھر میں تربیت پائی تھی۔ اور کعب احبار کتب یہود کے بڑے عالم تھے، ان سے نوف نے یہ بات حاصل کی کہ قرآن مجید میں جس موسیٰ کا واقعہ ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ وہ ایک دوسرے موسیٰ ہیں جن کے باپ کا نام میشان تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام عمران تھا، حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے نوف بکالی کی یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کی تو آپؓ نے نوف کی بات کی پرزور تردید کی، اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی حدیث سنائی جو درج ذیل ہے۔

حدیث: سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: نوف بکالی کہتا ہے کہ جو موسیٰ حضرت خضر سے ملنے گئے تھے وہ بنی اسرائیل والے موسیٰ نہیں تھے جو صاحبِ شریعت تھے اور جن کے باپ کا نام عمران تھا، بلکہ وہ ایک دوسرے موسیٰ تھے (جن کے باپ کا نام میشان تھا) ابن عباسؓ نے فرمایا: اللہ کا دشمن جھوٹ کہتا ہے،

مجھ سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کرتے ہوئے حدیث بیان کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو نبی تھے (اس لفظ میں نوف بکالی کی تردید ہے) بنی اسرائیل میں تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے، آپؑ سے پوچھا گیا: لوگوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: میں سب سے بڑا عالم ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب فرمایا، کیونکہ انھوں نے علم کو اللہ کی طرف نہیں پھیرا، اللہ نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ میرے بندوں میں ایک بندہ دو دریاؤں کے سنگم پر ہے، وہ آپ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: خدایا! میں اس تک کیسے پہنچ سکتا ہوں؟ یعنی مجھے اس کا پتہ نشان بتادیا جائے، تاکہ میں اس کے پاس پہنچوں۔ موسیٰ سے کہا گیا: کسی تھیلے میں ایک مچھلی رکھ لو، جہاں اس کو گم کرو وہیں وہ بندہ ملے گا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چلے، ان کے ساتھ ان کا خادم یوشع بن نون بھی تھا، دونوں نے ایک تھیلے میں مچھلی رکھ لی، یہاں تک کہ جب دونوں ایک چٹان کے پاس آئے تو دونوں وہاں اپنا سر رکھ کر سو گئے، پس (موسیٰ کے روانہ ہونے کے بعد) مچھلی تھیلے سے نکل کر سمندر میں چلی گئی۔ مچھلی کا سمندر میں جانا سرنگ نُما تھا اور موسیٰ اور خادم کے لئے حیرت زا تھا (پہلی تعبیر نفس الامر کے اعتبار سے ہے اور دوسری ناظر کے اعتبار سے) پس دونوں باقی رات اور پورے دن چلتے رہے، جب (اگلے دن کی) صبح ہوئی تو موسیٰ نے خادم سے فرمایا: ناشتہ لاؤ، آج کے سفر سے تو ہم تھک گئے! اور موسیٰ علیہ السلام نے ذرا بھی تھکن محسوس نہیں کی یہاں تک کہ اس جگہ سے آگے بڑھ گئے جس جگہ کا حکم دیئے گئے تھے —— یعنی منزل مقصود سے آگے بڑھنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تھکن محسوس ہوئی، با مقصد محنت سے آدمی نہیں تھکتا، بے مقصد محنت تھکا دیتی ہے [1] —— موسیٰ علیہ السلام سے خادم نے کہا: ارے! جب ہم چٹان پر ٹھہرے تھے تو میں اس مچھلی کو بھول گیا، حضرت موسیٰ نے کہا: اسی جگہ کی ہمیں تلاش تھی، چنانچہ دونوں اپنے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے واپس لوٹے، جب دونوں چٹان کے پاس پہنچے تو دیکھا ایک شخص چادر اوڑھ کر لیٹا ہوا ہے (راوی کو شک ہے کہ حدیث میں مُسَجًّی بثوبٍ ہے یا تَسَجَّی

(۱) سوال: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو پتا ہی نہیں تھا کہ ہم منزل مقصود سے آگے بڑھ رہے ہیں، پھر ان کو تکان کیوں محسوس ہوا؟ جواب: نفس الامری بات کا قلبِ نبوت پر اثر پڑا جس سے طبیعت متأثر ہوئی، قلوب صافیہ پر نفس الامری بات کا اثر پڑتا ہے۔ حضرت الاستاذ علامہ بلیاوی قدس سرہ نے ایک مرتبہ یہ واقعہ سنایا کہ میں روزانہ عشا کے بعد شیخ الہند قدس سرہ کے سر میں تیل رکھنے کے لئے جایا کرتا تھا، کبھی تو حضرت دیر تک تیل لگواتے اور کبھی جلدی سر چھڑا لیتے، میں نے غور کیا تو وجہ یہ سمجھ میں آئی کہ جب میں باوضو تیل لگانے کے لئے جاتا ہوں تو حضرت دیر تک تیل لگواتے ہیں، اور جس دن بے وضو جاتا ہوں جلدی سر چھڑا لیتے ہیں، چنانچہ میں باوضو تیل لگانے کے لئے جانے لگا۔ معلوم ہوا کہ قلب مصفی پر نفس الامری بات کا اثر پڑتا ہے، یا جیسے نبی ﷺ ایک مرتبہ جہری نماز پڑھا رہے تھے، پیچھے کسی نے سراً پڑھا جس سے آپ پر قراءت دشوار ہوگئی، چونکہ امام کے پیچھے پڑھنا ایک امر منکر ہے اس لئے اس کا قلب نبوت پر اثر پڑا اور آپؐ پر قراءت دشوار ہوگئی (باب ۱۶ دیکھئے)

بثوبہ ہے مفہوم دونوں کا ایک ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بندہ کو سلام کیا۔ حضرت خضر نے کہا: آپ کے علاقہ میں سلام کہاں سے آیا؟ موسیٰ نے فرمایا: میں موسیٰ ہوں، حضرت خضر نے پوچھا: بنی اسرائیل والے موسیٰ؟ انھوں نے کہا: ہاں (یہاں سے معلوم ہوا کہ نوف بکالی کی بات غلط تھی) حضرت موسیٰ نے کہا: کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں اس غرض سے کہ آپ مجھے اس رشد وہدایت کی تعلیم دیں جس کی آپ کو تعلیم دی گئی ہے، حضرت خضر نے کہا: آپ میرے ساتھ صبر نہیں کرسکیں گے (میرے بعض اعمال ظاہر شریعت کے خلاف ہونگے آپ ان پر ضرور نکیر کریں گے) اے موسیٰ! میں اللہ کے علوم میں سے ایسا علم سکھلایا گیا ہوں جس کو آپ نہیں جانتے، اور آپ اللہ کے علوم میں سے ایک ایسا علم سکھلائے گئے ہیں جس کو میں نہیں جانتا۔ حضرت موسیٰ نے کہا: آپ مجھے اگر اللہ نے چاہا تو صبر کرنے والا پائیں گے، اور میں آپ کی حکم عدولی نہیں کروں گا الی اخرہ۔

یہاں تک حدیث کی شرح (باب ۱۶) میں گذر چکی ہے۔ وہاں دیکھ لی جائے۔ اور حضرت خضر علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ جو علم آپ کو دیا گیا ہے اسے میں نہیں جانتا اور جو علم مجھے دیا گیا ہے اسے آپ نہیں جانتے: یہاں سے میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ حضرت خضر انسان نہیں تھے، رجال الغیب میں سے تھے، رجال الغیب زمینی فرشتوں کو کہتے ہیں جو عام طور پر نظر نہیں آتے، اور کبھی نظر بھی آتے ہیں، ان کو تکوینیات کا علم دیا جاتا ہے، تفصیل باب ۱۶ میں گذری ہے، بعض لوگ ان کو انسان کہتے ہیں، پھر بعض ولی مانتے ہیں اور بعض نبی۔ ان کے دلائل حاشیہ میں ہیں وہاں دیکھ لیں۔

[٤٤-] بابُ مَا يُسْتَحَبُّ لِلْعَالِمِ إِذَا سُئِلَ: أَيُّ النَّاسِ أَعْلَمُ؟ فَيَكِلُ الْعِلْمَ إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى

[١٢٢-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْمُسْنِدِيُّ، قَالَ: ثَنَا سُفْيَانُ، قَالَ: ثَنَا عَمْرٌو، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ سَعِيْدُ بْنُ جُبَيْرٍ، قَالَ: قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ: إِنَّ نَوْفًا الْبِكَالِيَّ يَزْعُمُ أَنَّ مُوْسَى لَيْسَ مُوْسَى بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ، إِنَّمَا هُوَ مُوْسَى آخَرُ، فَقَالَ: كَذَبَ عَدُوُّ اللّٰهِ! حَدَّثَنَا أُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: " قَامَ مُوْسَى النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم خَطِيْبًا فِيْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ، فَسُئِلَ: أَيُّ النَّاسِ أَعْلَمُ؟ فَقَالَ: أَنَا أَعْلَمُ، فَعَتَبَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ عَلَيْهِ، إِذْ لَمْ يَرُدَّ الْعِلْمَ إِلَيْهِ، فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَيْهِ أَنَّ عَبْدًا مِنْ عِبَادِيْ بِمَجْمَعِ الْبَحْرَيْنِ هُوَ أَعْلَمُ مِنْكَ، قَالَ: رَبِّ! وَكَيْفَ بِهِ؟ فَقِيْلَ لَهُ: احْمِلْ حُوْتًا فِيْ مِكْتَلٍ، فَإِذَا فَقَدْتَهُ فَهُوَ ثَمَّ، فَانْطَلَقَ وَانْطَلَقَ مَعَهُ بِفَتَاهُ يُوْشَعَ بْنِ نُوْنٍ، وَحَمَلاَ حُوْتًا فِيْ مِكْتَلٍ، حَتّٰى كَانَا عِنْدَ الصَّخْرَةِ وَضَعَا رُؤُسَهُمَا فَنَامَا، فَانْسَلَّ الْحُوْتُ مِنَ الْمِكْتَلِ، فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا، وَكَانَ لِمُوْسَى وَفَتَاهُ عَجَبًا، فَانْطَلَقَا بِقِيَّةَ لَيْلَتِهِمَا وَيَوْمَهُمَا، فَلَمَّا أَصْبَحَ، قَالَ مُوْسَى لِفَتَاهُ: ﴿ آتِنَا غَدَاءَ نَا لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴾ وَلَمْ يَجِدْ مُوْسَى مَسًّا مِنَ النَّصَبِ حَتَّى جَاوَزَ الْمَكَانَ الَّذِيْ أُمِرَ بِهِ، فَقَالَ لَهُ فَتَاهُ: ﴿ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ﴾ قَالَ مُوْسٰى:

﴿ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰى آثَارِهِمَا قَصَصًا﴾ فَلَمَّا انْتَهَيَا إِلَى الصَّخْرَةِ إِذَا رَجُلٌ مُسَجًّى بِثَوْبٍ، أَوْ قَالَ: تَسَجَّى بِثَوْبِهِ، فَسَلَّمَ مُوْسَى، فَقَالَ الْخَضِرُ: وَأَنَّى بِأَرْضِكَ السَّلَامُ؟ فَقَالَ: أَنَا مُوْسَى، فَقَالَ: مُوْسَى بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: ﴿هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلٰى أَنْ تُعَلِّمَنِيْ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا؟ قَالَ: إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا﴾ يَا مُوْسَى إِنِّيْ عَلٰى عِلْمٍ مِنْ عِلْمِ اللهِ عَلَّمَنِيْهِ لَا تَعْلَمُهُ أَنْتَ، وَأَنْتَ عَلٰى عِلْمٍ عَلَّمَكَهُ اللهُ لَا أَعْلَمُهُ، ﴿قَالَ: سَتَجِدُنِيْ إِنْ شَاءَ اللهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِيْ لَكَ أَمْرًا﴾

(آگے کا ترجمہ) پھر دونوں چلے، یعنی باہم قول وقرار کر کے دونوں دریا کے کنارے کنارے چلے —— اب خادم کا تذکرہ نہیں آئے گا، ممکن ہے موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے بعد خادم کو واپس بھیج دیا ہو، اور اس کا بھی امکان ہے کہ مجمع البحرین پر ٹھہرا دیا ہو، تا کہ واپسی میں ساتھ لے لیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ساتھ ہو مگر تابع ہونے کی وجہ سے اس کا ذکر نہ کیا ہو۔ مفسرینِ کرام عام طور پر تیسرا احتمال لکھتے ہیں، پھر آگے کوئی ایسا مقام آیا جس سے آگے جانے کے لئے کشتی درکار تھی مگر ان کے پاس کشتی نہ تھی، پس ان کے پاس سے ایک کشتی گذری، انھوں نے کشتی والوں سے درخواست کی کہ وہ ان کو سوار کر لیں —— کیلری میں تثنیہ کا صیغہ لکھا ہے فکلّماهم، وہی نسخہ صحیح ہے، اس لئے کہ اب خادم غائب ہے —— حضرت خضر علیہ السلام پہچان لئے گئے، چنانچہ انھوں نے دونوں کو بغیر اجرت کے کشتی میں بٹھالیا —— یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت خضر زمینی فرشتے ہیں تو ان کو دریا پار کرنے کے لئے کشتی کی کیا ضرورت ہے؟ جواب: ساتھی کی رعایت ملحوظ تھی، اور کشتی سے متعلق بھی ایک امر خداوندی کی تعمیل کرنی تھی —— پس ایک چڑیا آئی اور وہ کشتی کے کنارے پر بیٹھی، اور اس نے سمندر میں ایک چونچ یا دو چونچ ماری —— دونوں یہ منظر دیکھ رہے تھے —— حضرت خضر نے کہا: نہیں گھٹایا میرے علم نے اور آپ کے علم نے اللہ کے علم میں سے مگر جتنا گھٹایا اس چڑیا نے سمندر میں سے —— یعنی مخلوق کے علم میں اور اللہ کے علم میں اتنی بھی نسبت نہیں جتنی چڑیا کی چونچ کے پانی میں اور سمندر کے پانی میں نسبت ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام کو بتلا دیا گیا ہوگا کہ موسیٰ علیہ السلام نے أنا أعلم کا دعوی کیا ہے۔ اس لئے انھوں نے یہ بات فرمائی کہ غور کرو، چڑیا نے سمندر میں سے جو پانی پیا ہے اس پانی کے درمیان اور سمندر کے پانی کے درمیان کیا نسبت ہے؟ میرے اور تمہارے علم کی بلکہ پوری کائنات کے علم کی اللہ کے علم کے ساتھ یہ نسبت بھی نہیں پھر أنا أعلم کا دعوی کیسے درست ہو سکتا ہے؟ —— پھر حضرت خضر نے کشتی کے تختوں میں سے ایک تخت کا قصد کیا اور اس کو اکھاڑ دیا —— ظاہر ہے کشتی کا تختہ ہاتھ سے نہیں اکھڑتا کلہاڑی وغیرہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مگر حضرت خضر نے ہاتھ سے اکھاڑ دیا، اس سے معلوم ہوا کہ وہ انسان نہیں فرشتے تھے —— پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ان لوگوں نے ہمیں بغیر اجرت کے کشتی میں سوار کیا اور آپ نے ان کی کشتی کا قصد کیا، اور اس کو پھاڑ ڈالا تا کہ کشتی والوں کو ڈبو دیں —— اس سے معلوم ہوا کہ حضرت خضر

نے کشتی اترتے وقت پھاڑی تھی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے کشتی والوں کے ڈوب جانے کا اندیشہ ظاہر کیا، اپنا کوئی تذکرہ نہیں کیا، یعنی جب کشتی آگے روانہ ہوگی، اور دریا میں موجیں اٹھیں گی تو پانی کشتی میں داخل ہوجائے گا۔ غرض یہ عمل نہ شرعاً درست ہے نہ اخلاقاً، پس آپ نے یہ بہت ہی معیوب کام کیا —— حضرت خضر نے کہا: کیا میں نے کہا نہ تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کرسکیں گے —— سو دیکھئے وہی بات سامنے آگئی —— حضرت موسیٰ نے کہا: بھول پر آپ میری گرفت نہ فرمائیں، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھول تھی —— یہاں سے یہ بات ثابت ہوئی کہ انبیاء کرام سے بھول ہوتی ہے، سورۂ طٰہٰ (آیت ۱۵۵) میں حضرت آدم علیہ السلام کے بھولنے کی صراحت ہے، اور حدیث شریف میں ہے کہ ایک بار حضور ﷺ نے ظہر کی یا عصر کی پانچ رکعتیں پڑھادیں، اور آخر میں سجدۂ سہو کیا۔ اور نماز کے بعد ارشاد فرمایا: میں ایک انسان ہوں جس طرح آپ لوگوں کو یاد رہتا ہے مجھے بھی یاد رہتا ہے، اور جس طرح آپ لوگوں کو بھول لگتی ہے مجھے بھی بھول لگتی ہے (مسند احمد ۱: ۴۲۰) پس بھولنا نہ کمالِ نبوت کے منافی ہے نہ کارِ نبوت کے۔ حضرت خضرؑ نے موسیٰ علیہ السلام کا عذر قبول کرلیا۔

تشریح: حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی اس لئے پھاڑی تھی کہ وہ کشتی جدھر جارہی تھی اس طرف ایک ظالم بادشاہ کی علم داری تھی جو ہر اچھی کشتی کو غصب کرلیتا تھا، اگر حضرت خضرؑ اس کشتی کو پھاڑ کر عیب دار نہ کردیتے تو وہ بادشاہ اسے چھین لیتا اور ان غریبوں کا ذریعہ معاش چلا جاتا۔ اب وہ لوگ مرمت کرالیں گے اور نقصان سے بچ جائیں گے۔

فَانْطَلَقَا يَمْشِيَانِ عَلٰى سَاحِلِ الْبَحْرِ، لَيْسَ لَهُمَا سَفِيْنَةٌ، فَمَرَّتْ بِهِمَا سَفِيْنَةٌ، فَكَلَّمُوْهُمْ أَنْ يَحْمِلُوْهُمَا، فَعُرِفَ الْخَضِرُ فَحَمَلُوْهُمَا بِغَيْرِ نَوْلٍ، فَجَاءَ عُصْفُوْرٌ فَوَقَعَ عَلٰى حَرْفِ السَّفِيْنَةِ فَنَقَرَ نَقْرَةً أَوْ نَقْرَتَيْنِ فِي الْبَحْرِ، فَقَالَ الْخَضِرُ: يَا مُوْسَى مَا نَقَصَ عِلْمِيْ وَعِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللهِ تَعَالٰى إِلَّا كَنَقْرَةِ هٰذَا الْعُصْفُوْرِ فِي الْبَحْرِ، فَعَمَدَ الْخَضِرُ إِلٰى لَوْحٍ مِنْ أَلْوَاحِ السَّفِيْنَةِ فَنَزَعَهُ، فَقَالَ مُوْسَى: قَوْمٌ حَمَلُوْنَا بِغَيْرِ نَوْلٍ عَمَدْتَ إِلٰى سَفِيْنَتِهِمْ فَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا﴾ قَالَ:أَلَمْ أَقُلْ: إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا؟ قَالَ: لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ﴾ فَكَانَتِ الْأُوْلٰى مِنْ مُوْسَى نِسْيَانًا.

(آگے کا ترجمہ) پھر دونوں چلے —— یعنی کشتی سے اتر کر خشکی کی راہ لی —— پس اچانک ایک لڑکا جو بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا، خضرؑ نے اس کے سر کو اوپر سے پکڑا اور ہاتھ سے اس کا سر اکھاڑ دیا —— یعنی ایک گاؤں کے قریب چند لڑکے کھیل رہے تھے ان میں سے ایک کو جو زیادہ خوبصورت اور سیانا تھا پکڑ کر مار ڈالا۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ بچوں نے شور کیوں نہیں مچایا؟ اور ان کا پیچھا کیوں نہیں کیا؟ معلوم ہوا کہ حضرت خضرؑ کا یہ عمل کسی نے نہیں دیکھا، موسیٰ علیہ السلام کو دکھانا مقصود تھا۔ انھوں نے دیکھا، باقی کسی نے نہیں دیکھا۔ بظاہر ایسا نظر آیا کہ کوئی حادثہ پیش آیا، جس سے

بچہ کا سر کٹ گیا، معلوم ہوا کہ حضرت خضرؑ انسان نہیں تھے —— حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیا آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی، جس نے کسی کا خون نہیں کیا؟ حضرت خضر نے کہا: کیا میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ ابن عیینہؒ فرماتے ہیں: اس میں (لك کے اضافہ میں) زیادہ تاکید ہے —— یعنی اس مرتبہ خفگی بڑھ گئی، اس لئے لك بڑھایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس بار بھول کر نہیں ٹوکا تھا بلکہ عمداً نکیر کی تھی، کیونکہ احکام شریعت کی خلاف ورزی پر تحمل جب عام صالحین سے نہیں ہوسکتا تو موسیٰ علیہ السلام تو پیغمبر تھے۔ ان کا کام ہی ہر قسم کی بدی کو روکنا اور نیکی کو پھیلانا تھا، وہ بھلا اس امر منکر پر خاموش کیسے رہ سکتے تھے؟

تشریح: اس لڑکے کی سرشت میں کفر و سرکشی تھی، والدین اس کے نیک اور صالح تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام کو وحی سے یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر والدین کے لئے فتنہ بنے گا، والدین اپنی طبعی محبت کی وجہ سے بے دینی میں اس کا ساتھ دیں گے، اس لئے حضرت خضر علیہ السلام نے اس لڑکے کا کام تمام کر دیا۔ اور لڑکے کا مارا جانا والدین کے حق میں رحمت اور ان کے دین کی حفاظت کا ذریعہ بن گیا۔ اور جو صدمہ ان کو پہنچا تھا حق تعالیٰ نے اس کی تلافی ایسی اولاد سے کر دی جو پاکیزگی میں مقتول لڑکے سے بہتر تھی۔ اور ماں باپ پر شفقت و مہربانی میں بڑھی ہوئی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک نیک لڑکی دی جو ایک نبی سے منسوب ہوئی اور ایک نبی اس سے پیدا ہوئے، جس سے ایک امت چلی —— یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

ایک: یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ وہ لڑکا بڑا ہو کر کافر ہوگا اور ماں باپ کو گمراہ کرے گا تو پھر علم الٰہی کے مطابق ہونا ضروری تھا، کیونکہ علم الٰہی کے خلاف کوئی بات نہیں ہوسکتی، پھر وہ مارا کیسے گیا؟ اور اللہ تعالیٰ کا علم غلط کیسے ہو گیا؟

دوم: یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ اس کے ماں باپ ایمان پر قائم رہیں اور اس کی وجہ سے حکمت مقتضی ہوئی کہ پیش آنے والی رکاوٹ دور کر دی جائے، چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام کو بھیج کر اسے قتل کرا دیا تو اس سے بہتر تو یہ تھا کہ اس لڑکے کو پیدا ہی نہ کرتے، یا کرتے تو اس کو اس قدر شریر نہ ہونے دیتے، یا جہاں لاکھوں کافر دنیا میں موجود ہیں اس کے والدین کو بھی کافر ہو جانے دیتے؟!

پہلے سوال کا جواب: سمجھنے کے لئے پہلے تین باتیں سمجھیں:

۱- علم معلوم کے تابع ہوتا ہے، اس کا برعکس نہیں ہوتا، مثلاً کوئی شخص تاج محل دیکھے اور ویسا ہی جانے جیسا وہ ہے تو یہ جاننا مطابق واقعہ اور صحیح ہے۔ اس صورت میں تاج محل کا علم: معلوم یعنی خود تاج محل کے تابع ہوگا، اور اگر کوئی شخص ذہن میں خیالی تاج محل بنائے تو آگرہ والے تاج محل کا اس کے مطابق ہونا ضروری نہیں، کیونکہ معلوم علم کے تابع نہیں ہوتا۔

۲- اللہ کے علم میں اور مخلوقات کے علم میں یہ فرق ہے کہ اللہ کا علم حضوری ہے یعنی وہ وجود معلوم کا محتاج نہیں۔ ازل سے اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتے ہیں، اور مخلوق کا علم کسبی ہے، وہ وجود معلومات کا محتاج ہے، جب شئ موجود ہوتی ہے تبھی اس

کا علم ہوتا ہے، پس تا ابد جو کچھ ہونے والا ہے: اللہ تعالیٰ کو ازل سے اس کا علم ہے، مگر اللہ کے جاننے سے لازم نہیں آتا کہ ایسا ہی ہو، یہ بات اس وقت ضروری ہوگی جب معلوم علم کے تابع ہو، جیسے ہمارے کسی بات کو جاننے سے ـــ مثلاً استاذ ایک طالبِ علم کے بارے میں جانتا ہے کہ وہ اول آئے گا یا فیل ہوگا ـــ ویسا ہی ہونا ضروری نہیں، بس فرق اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہیں اور ہماری معلومات سرسری ہیں۔

۳- تقدیر کا حاصل یہ ہے کہ بندے پیدا ہو کر جو اچھے برے کام کریں گے: اللہ تعالیٰ ان کو ازل سے جانتے ہیں اور جانتے ہی نہیں، سب کچھ لوح محفوظ میں لکھ بھی رکھا ہے۔ مگر اس جاننے اور لکھنے سے انسان مجبور نہیں ہو جاتا، کیونکہ معلوم علم کے تابع نہیں ہوتا، بلکہ جو کچھ پیش آنے والا ہے، اور بندے اپنی مرضی سے جو اچھے اور برے کام کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ازل سے جانتے ہیں اور ان کو لکھ بھی لیا ہے، کیونکہ ان کا علم حضوری ہے، وجودِ معلوم کا محتاج نہیں، اور اللہ تعالیٰ کا یہ جاننا مطابق واقعہ ہے، کیونکہ جو علم معلوم سے ماخوذ ہو وہی صحیح علم ہوتا ہے، پس اللہ تعالیٰ کے علم کے خلاف اس لئے نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ وہی جانتے ہیں جو ہونے والا ہے۔

یہ مضمون یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ تقدیر کے معنی پلاننگ کے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ازل میں کائنات کے لئے جو اندازہ مقرر کیا ہے اس میں یہ بھی طے ہے کہ انسان جزوی اختیار رکھنے والی مخلوق ہوگی، پھر وہ اپنی مرضی اور اپنے جزوی اختیار سے جو کچھ کرے گی اس کو اللہ تعالیٰ ازل سے جانتے ہیں اور اس کو لکھ بھی لیا ہے۔

اب جواب آسانی سے سمجھ میں آجائے گا: اللہ تعالیٰ ازل میں صرف یہی نہیں جانتے کہ وہ لڑکا بڑا ہو کر ضرور کافر ہوگا، اور اس کے والدین اس کے فتنہ میں مبتلا ہونگے، بلکہ علم الٰہی میں پوری تفصیل ہے کہ اگر وہ لڑکا بڑا ہوتا تو کافر ہوتا، اور اس کے والدین کے لئے فتنہ بنتا، مگر وہ بلوغ سے پہلے بچپن ہی میں مر جائے گا یا مار دیا جائے گا۔ اس لئے وہ نہ کافر ہوگا نہ اپنے والدین کے لئے فتنہ بنے گا۔ غرض تقدیر صرف اجمالی نہیں، بلکہ پوری تفصیل کے ساتھ ہے۔

دوسرے سوال کا جواب: یہ ہے کہ تکوینیات کے بارے میں انسان کا علم محدود ہے، حضرت خضر علیہ السلام نے اس سے تو پردہ اٹھایا کہ اس لڑکے کو مار ڈالنے میں یہ حکمت تھی مگر یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ اس کو پیدا کرنے میں کیا حکمت تھی، مثلاً انسان کے بدن میں کئی جگہ بال اگتے ہیں، ناخن بڑھتے ہیں۔ شریعت کا حکم یہ ہے کہ ان کو صاف کیا جائے، یہ نظافت کا تقاضہ ہے، یہاں بھی یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ان کا کاٹنا ضروری ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا ہی کیوں کیا؟ جواب میں بس یہی کہا جائے گا کہ اس کی حکمت اللہ ہی جانتے ہیں، ہم صرف اجمالاً یہ بات جانتے ہیں کہ ان بالوں کو پیدا کرنے میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔ اسی طرح اس لڑکے کو پیدا کرنے میں بھی کوئی حکمت تھی جو ہم نہیں جانتے، اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ حضرت خضرؑ نے بھی اس سے پردہ نہیں اٹھایا، اس لئے عقل انسانی کے لئے بجز اعترافِ عجز وقصور کے کوئی راہ نہیں، ہمیں تو بس یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دنیا میں جو چیزیں: خراب اور بری سمجھی جاتی ہیں ان میں

بھی مجموعۂ عالم کے اعتبار سے خیر اور فائدے ہیں۔

فَانْطَلَقَا فَإِذَا غُلَامٌ يَلْعَبُ مَعَ الْغِلْمَانِ، فَأَخَذَ الْخَضِرُ بِرَأْسِهِ مِنْ أَعْلَاهُ، فَاقْتَلَعَ رَأْسَهُ بِيَدِهِ، فَقَالَ مُوسَى: ﴿أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ؟ قَالَ: أَلَمْ أَقُلْ لَكَ: إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا؟﴾ قَالَ ابْنُ عُيَيْنَةَ: وَهٰذَا أَوْ كَدُ.

(آگے کا ترجمہ) پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب وہ ایک بستی والوں کے پاس پہنچے تو دونوں نے گاؤں والوں سے کھانا مانگا، پس گاؤں کے لوگوں نے دونوں کی ضیافت کرنے سے انکار کر دیا ــــ یعنی ایک بستی میں پہنچ کر وہاں کے لوگوں سے ملے اور چاہا کہ بستی والے مہمان بنا کر کھانا کھلائیں، قدیم زمانہ میں جبکہ سرایوں کا رواج نہیں تھا نہ ہوٹلوں اور کھانے پینے کی دوکانوں کا سلسلہ تھا تو مسافر اپنا حق سمجھتے تھے کہ بستی والوں سے کھانا پانی طلب کریں۔ اور بستی والے بھی ان کی مہمانداری اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ اور بڑی خوش دلی سے یہ فریضہ انجام دیتے تھے، مگر اس گاؤں کے لوگوں کی قسمت میں یہ سعادت نہیں تھی انھوں نے موسیٰ وخضر علیہما السلام جیسے مقربین کی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا ــــ یہاں پھر ایک بار سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت خضر فرشتے تھے تو ان کو کھانے کی کیا ضرورت تھی؟ جواب یہ ہے کہ ساتھی کی موافقت منظور تھی، پھر جب کھانا مل جائے گا تو کھانے والا کھالے گا اور دوسرا کوئی عذر کر دے گا۔ غرض آیت پاک سے حضرت خضر علیہ السلام کا کھانا مانگنا ثابت ہوتا ہے اور اتنی بات ان کے فرشتہ ہونے کی منافی نہیں۔ کھانا کھانا ثابت نہیں ہوتا جو فرشتہ ہونے کے منافی ہو۔

پھر انھوں نے گاؤں میں ایک دیوار دیکھی جو گرنا چاہتی تھی، حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس دیوار کو سیدھا کر دیا ــــ یعنی گاؤں والوں کا برتاؤ دیکھ کر چاہئے تو یہ تھا کہ ایسے تنگ دل اور بے مروت لوگوں پر غصہ آتا مگر حضرت خضر علیہ السلام نے غصہ کے بجائے ان پر احسان کیا۔ بستی میں ایک بڑی بھاری دیوار جھکی جارہی تھی اور قریب تھا کہ زمین بوس ہو جائے، لوگ اس کے نیچے سے گذرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ہاتھ لگا کر اس کو سیدھا کر دیا ــــ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت لیتے! ــــ یعنی بستی والوں نے مسافر کا حق نہ سمجھا پھر ان کی دیوار مفت میں ٹھیک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟! اگر کچھ معاوضہ لے کر دیوار سیدھی کرتے تو ہمارا بھی کام بن جاتا اور ان تنگ دل بخیلوں کو بھی تنبیہ ہوتی ــــ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: بس میرا آپ کا ساتھ ختم ہوا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ موسیٰ پر رحم فرمائیں! ہماری خواہش تھی کہ وہ صبر کرتے تاکہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی باتیں سناتے۔

تشریح: وہ دیوار دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس گاؤں میں رہتے تھے، اور اس کے نیچے خزانہ مدفون تھا، اور ان کا باپ نیک آدمی تھا۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس دیوار کے نیچے سونے چاندی کا ذخیرہ تھا (رواہ الترمذی

والحاکم) جوان کے باپ سے ان کو میراث میں پہنچا تھا، اگر دیوار گر پڑتی تو یتیم بچوں کا جو مال وہاں گڑا تھا ظاہر ہو جاتا اور بدنیت لوگ اٹھا لیتے، بچوں کا باپ چونکہ نیک آدمی تھا اس لئے اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس کے مال کو اس کی اولاد کے لئے محفوظ رکھا، اور حضرت خضرؑ کو بھیج کر دیوار درست کرا دی، اور مال کی یہ حفاظت اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے تھی، حضرت خضر کا دیوار کو سیدھا کرنا بامر خداوندی تھا۔ اور جو کام خدا کے حکم سے کرنا ضروری ہو اس پر مزدوری لینا جائز نہیں، یہیں سے یہ ضابطہ بنا ہے کہ طاعات مقصودہ پر اجارہ باطل ہے۔

فائدہ: حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعہ میں ہمارے لئے جو سب سے بڑا سبق ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ٹھیک حکمتِ خداوندی کے مطابق ہو رہا ہے، کائنات میں کوئی بات بایں معنی شر نہیں کہ سبب کا مقتضی پورا نہ ہو، یا اس کی ضد صادر ہو، ہر چیز خدا نے جس مقصد کے لئے پیدا کی ہے وہ اس مقصد کی تکمیل کرتی ہے۔ البتہ ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی کام انسان کی مصلحتؔ سے ہم آہنگ نہ ہو یا اس کے حق میں زیادہ بہتر نہ ہو، مگر مجموعۂ عالم کے اعتبار سے وہ بھی خیر ہی ہوتا ہے، پس ظاہر بین نگاہیں دنیا میں بظاہر جو کچھ ہوتا دیکھتی ہیں اس سے کبھی غلط نتیجہ اخذ کر لیتی ہیں، اس وجہ سے کہ ان کے سامنے اللہ کی مصلحتیں نہیں ہوتیں۔ مثلاً ظالموں کا پھلنا پھولنا، اور بے گناہوں کا تکلیفوں میں مبتلا ہونا۔ نافرمانوں پر انعامات کی بارش ہونا اور فرمانبرداروں پر مصائب کا ہجوم ہونا، بدکاروں کا عیش اڑانا اور نیکوکاروں کا خستہ حالی میں زندگی بسر کرنا: یہ سب وہ مناظر ہیں جو آئے دن انسانوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، اور جو لوگ حقیقتِ حال سے واقف نہیں ہوتے وہ غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں، ایسے ہی معاملات میں غور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے ذریعہ کارخانۂ قدرت سے پردہ اٹھا کر ہم کو ایک جھلک دکھائی ہے، تا کہ ہم جان لیں کہ یہاں شب و روز جو کچھ ہو رہا ہے وہ عین حکمت و مصلحت کے مطابق ہو رہا ہے، اگر چہ ہماری کوتاہ نظریں اس کی حقیقت تک نہ پہنچ سکتیں، مگر ہمیں یقین کرنا چاہئے کہ باغبان باغ کی مصلحت دیکھ کر ہی کام کرتا ہے۔

فَانْطَلَقَا حَتّٰى أَتَيَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَنْ يُضَيِّفُوْهُمَا، فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُرِيْدُ أَنْ يَنْقَضَّ، قَالَ الْخَضِرُ بِيَدِهِ، فَأَقَامَهُ، فَقَالَ لَهُ مُوْسَى: لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا؟ قَالَ: هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ قَالَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم: "يَرْحَمُ اللّٰهُ مُوْسَى، لَوَدِدْنَا لَوْ صَبَرَ حَتّٰى يُقَصَّ عَلَيْنَا مِنْ أَمْرِهِمَا" [راجع: ۷۴]
قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ: ثَنَا بِهِ علي بن خَشْرَمٍ، قَالَ: ثَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ بِطُوْلِهِ.

وضاحت: حدیث کے آخر میں فربریؒ نے اپنی سند بڑھائی ہے جو اوپر جا کر حضرت سفیانؒ سے مل جاتی ہے، اور درمیان میں امام بخاریؒ کا واسطہ نہیں آتا۔ اسی کا نام استخراج ہے۔

بابُ مَنْ سَأَلَ وَهُوَ قَائِمٌ عَالِمًا جَالِسًا

کھڑے ہوئے شخص کا بیٹھے ہوئے عالم سے مسئلہ پوچھنا

اگر مفتی صاحب بیٹھے ہوں اور کوئی شخص کھڑے ہو کر مسئلہ پوچھے تو مفتی صاحب کو اس کی بے تمیزی کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے، اسے مسئلہ بتا دینا چاہئے، اور یہ بات بابِ تواضع سے ہے۔

حدیث: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک شخص نبی پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ کی راہ میں جہاد کرنا کیا ہے؟ ہم میں سے کوئی بربنائے غضب قتال کرتا ہے اور کوئی بربنائے عصبیت قتال کرتا ہے، یعنی قوم ووطن کی پاسداری میں لڑتا ہے، یا دشمن قوم پر غصہ آتا ہے اس لئے لڑتا ہے پس کیا یہ قتال فی سبیل اللہ ہے؟ آپؐ نے اس کی طرف سر اٹھایا۔ راوی کہتا ہے: آپؐ نے سر اس لئے اٹھایا کہ وہ کھڑا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: ''جس نے اس لئے قتال کیا کہ اللہ کا نام سر بلند ہو وہی اللہ کی راہ میں قتال کرنے والا ہے''

تشریح: قتال مختلف مقاصد سے ہوتا ہے، ان میں سے صرف ایک جہاد فی سبیل اللہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے لڑے، اس کے علاوہ قتال کی جو شکلیں ہیں وہ شرعی جہاد نہیں، جیسے ہجرت کئی مقاصد سے ہوتی ہے، مگر ہجرت کا ثواب صرف ایک شخص کے لئے ہے باقی کے لئے ہجرت کا ثواب نہیں۔

[٤٥-] بابُ مَنْ سَأَلَ وَهُوَ قَائِمٌ عَالِمًا جَالِسًا

[١٢٣-] حدثنا عُثْمَانُ، قَالَ: ثَنَا جَرِيْرٌ، عَنْ مَنْصُوْرٍ، عَنْ أَبِيْ وَائِلٍ، عَنْ أَبِيْ مُوْسَى، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النبيِّ صلى الله عليه وسلم، فَقَالَ: يَارسولَ اللهِ! مَا الْقِتَالُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ؟ فَإِنَّ أَحَدَنَا يُقَاتِلُ غَضَبًا، وَيُقَاتِلُ حَمِيَّةً، فَرَفَعَ إِلَيْهِ رَأْسَهُ، قَالَ: وَمَا رَفَعَ إِلَيْهِ رَأْسَهُ إِلَّا أَنَّهُ كَانَ قَائِمًا، فَقَالَ: " مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ " [انظر: ٢٨١٠، ٣١٢٦، ٧٤٥٨]

بابُ السُّؤَالِ وَالْفُتْيَا عِنْدَ رَمْيِ الْجِمَارِ

رمی جمار کے وقت مسئلہ پوچھنا اور جواب دینا

حدیث: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے نبی ﷺ کو جمرات کے پاس دیکھا درانحالیکہ آپؐ پوچھے جا رہے تھے۔ یعنی آپؐ رمی جمرات کے لئے تشریف لے گئے وہیں لوگوں نے آپؐ سے مسائل پوچھنے شروع کئے۔ ایک شخص نے پوچھا: یارسول اللہ! میں نے رمی سے پہلے قربانی کرلی؟ آپؐ نے فرمایا: اب رمی

کرلے کوئی حرج نہیں۔ دوسرے شخص نے پوچھا: یارسول اللہ! میں نے قربانی سے پہلے سر منڈا لیا؟ آپؐ نے فرمایا: اب قربانی کرلے کوئی حرج نہیں (حضرت عبداللہؓ کہتے ہیں) اس دن نہیں پوچھے گئے آپ کسی چیز کے بارے میں جس کو اس نے آگے پیچھے کردیا تھا مگر آپؐ نے فرمایا: اب کرلے کوئی حرج نہیں۔

تشریح: یہ حدیث پہلے بھی گذری ہے، وہاں بتایا تھا کہ حاجی کو ۱۰ ذی الحجہ میں چار کام کرنے ہوتے ہیں: (۱) جمرۂ عقبیٰ کی رمی (۲) قربانی (۳) حلق یا قصر (۴) اور طواف زیارت۔ اول تین کاموں کے درمیان متمتع اور قارن کے لئے ترتیب امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک واجب ہے۔ اور جمہور کے نزدیک سنت ہے۔ اور یہ روایت امام اعظم رحمہ اللہ کے خلاف نہیں، اس لئے کہ وہ دونوں سائل اگر مفرد تھے تو ان پر قربانی واجب نہیں تھی، پس تقدیم وتاخیر میں کچھ حرج نہیں۔

یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ رمی جمرات کا وقت مشغولیت کا وقت ہے، مگر آنحضور ﷺ نے اسی حال میں مسائل بتائے، لہٰذا اگر مفتی کسی کام میں مشغول ہو اور کوئی اس سے مسئلہ پوچھے تو مسئلہ بتادے، یہ بات بابِ تواضع سے ہے اور یہی باب کا مدعیٰ ہے۔

[٤٦-] بابُ السُّؤَالِ وَالْفُتْيَا عِنْدَ رَمْيِ الْجِمَارِ

[١٢٤-] حدثنا أَبُوْ نُعَيْمٍ، قَالَ: ثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ أَبِيْ سَلَمَةَ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ عِيْسَى بْنِ طَلْحَةَ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: رَأَيْتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم عِنْدَ الْجَمْرَةِ وَهُوَ يُسْأَلُ، فَقَالَ رَجُلٌ: يَارسولَ اللّٰهِ! نَحَرْتُ قَبْلَ أَنْ أَرْمِيَ؟ قَالَ:" ارْمِ وَلاَ حَرَجَ" قَالَ آخَرُ: يَارسولَ اللّٰهِ! حَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَنْحَرَ؟ قَالَ: "انْحَرْ وَلاَ حَرَجَ" فَمَا سُئِلَ عَنْ شَيْئٍ قُدِّمَ وَلاَ أُخِّرَ إِلَّا قَالَ:" افْعَلْ وَلاَ حَرَجَ" [راجع:٨٣]

بابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى ﴿وَمَا أُوْتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلاَّ قَلِيْلاً﴾

انسان بس برائے نام علم دیا گیا ہے!

یہ گذشتہ سلسلہ کا آخری باب ہے، اور اس باب کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کس برتے پر اپنے کو لمبا کھینچتا ہے؟ انسان کے پاس علم ہی کتنا ہے؟ اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''اور نہیں دیئے گئے تم علم میں سے مگر تھوڑا'' پس انسان کو غرور وتکبر زیب نہیں دیتا، اس کا کمال تواضع وخاکساری کو زیور بنانا ہے، اور غرور وتکبر سے دامن چھڑانا ہے۔

حدیث: ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: دریں اثناء کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ منورہ کے ویران علاقے میں چل رہا تھا، اور آپ کھجور کی ٹہنی پر جو آپؐ کے ہاتھ میں تھی ٹیک لگا کر چل رہے تھے کہ آپؐ یہود کی ایک جماعت کے پاس سے گذرے، ان میں سے بعض نے کہا: ان سے روح کے بارے میں پوچھو، دوسروں نے کہا: مت

پوچھو، کہیں وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دیں جو تمہیں ناگوار ہو۔ بعض کہنے لگے: ہم ضرور ان سے پوچھیں گے، چنانچہ ان میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے کہا: اے ابوالقاسم! روح کیا چیز ہے؟ آپؐ خاموش رہے، میں نے دل میں سوچا: آپ پر وحی آرہی ہے، پس میں (آپؐ کے پیچھے) کھڑا ہو گیا، پس جب آپؐ سے وہ کیفیت دور ہوئی تو آپؐ نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت (۸۵) تلاوت فرمائی: ''لوگ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیں روح میرے پروردگار کے حکم سے ایک چیز ہے اور نہیں دیئے گئے وہ (یہود) علم میں سے مگر تھوڑا سا!'' اعمشؒ کہتے ہیں: ہماری قراءت اسی طرح ہے۔

تشریح:

۱- قرآنِ کریم میں ﴿وَمَا أُوتِيتُمْ﴾ جمع حاضر کا صیغہ ہے۔ اور اعمش کی قراءت میں ﴿وَمَا أُوتُوا﴾ جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے، مگر یہ قراءت نہ تو قراءت متواترہ میں سے ہے اور نہ قراءت مشہورہ میں سے، بلکہ شاذ قراءت ہے۔

۲- حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک مستقل باب قائم کر کے روح کی حقیقت بیان کی ہے، اور سب سے پہلے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ جب قرآن کریم نے روح کی حقیقت نہیں سمجھائی اور اس کی وجہ قلت علم بتائی تو کوئی اس کی حقیقت کیسے سمجھ سکتا ہے؟

شاہ صاحب نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ امام اعمش رحمہ اللہ کی قراءت میں ﴿وَمَا أُوتُوا﴾ جمع غائب کا صیغہ ہے۔ پس یہ آیت یہود کے ساتھ خاص ہے اور ﴿وَمَا أُوتِيتُمْ﴾ سے بھی یہود ہی مراد ہیں، یعنی یہود کے پاس اتنا علم نہیں کہ وہ روح کی حقیقت سمجھ سکیں۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ غیر یہود بھی روح کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے۔

مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ﴿وَمَا أُوتُوا﴾ کو بھی ﴿وَمَا أُوتِيتُمْ﴾ کی طرف لوٹا سکتے ہیں۔ پس آیت کا مصداق سبھی انسان ہونگے اور یہود بھی کلی کا ایک فرد ہونگے، اب آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی بھی انسان کو اس درجہ کا علم نہیں دیا گیا ہے کہ وہ روح کی حقیقت سمجھ سکے۔ اور یہ قاعدہ کہ بعض قراءتیں دوسری قراءتوں کی تفسیر کرتی ہیں صحیح ہے، مگر وہ قاعدہ صرف قراءت متواترہ اور مشہورہ کی حد تک ہے۔ قراءت شاذہ کو شامل نہیں اور امام اعمشؒ کی قراءت شاذ ہے۔

سوال: یہ آیت مکی دور میں نازل ہو چکی ہے، جب یہود کے بتانے پر اہل مکہ نے آنحضور ﷺ سے تین سوال کئے تھے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی، اور یہاں حدیث میں یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ پس یہ تعارض ہے؟

جواب: یہ آیت ہجرت سے پہلے مکہ میں بھی نازل ہوئی ہے اور ہجرت کے بعد مدینہ میں بھی، اور اس کو اصولِ تفسیر میں تکرارِ نزول کہتے ہیں، اور تکرارِ نزول دو مقصد سے ہوتا ہے، کبھی کسی آیت یا سورت کی اہمیت ظاہر کرنی ہوتی ہے تو بار بار نازل کی جاتی ہے، اور کبھی ذہن کو ملتفت کرنا مقصود ہوتا ہے یعنی آپ اس سوال کا جواب فلاں آیت سے دیں یہاں

یہی صورت ہوئی تھی۔

[٤٧-] بابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى ﴿وَمَا أُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيْلًا﴾

[١٢٥-] حدثنا قَيْسُ بْنُ حَفْصٍ، قَالَ: ثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ، قَالَ: ثَنَا الْأَعْمَشُ سُلَيْمَانُ بْنُ مِهْرَانَ، عَنْ إِبْرَاهِيْمَ، عَنْ عَلْقَمَةَ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ: بَيْنَا أَنَا أَمْشِيْ مَعَ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم فِيْ خَرِبِ الْمَدِيْنَةِ، وَهُوَ يَتَوَكَّأُ عَلٰى عَسِيْبٍ مَعَهُ، فَمَرَّ بِنَفَرٍ مِنَ الْيَهُوْدِ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ: سَلُوْهُ عَنِ الرُّوْحِ: قَالَ بَعْضُهُمْ: لَا تَسْأَلُوْهُ لَا يَجِيْءُ فِيْهِ بِشَيْءٍ تَكْرَهُوْنَهُ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ: لَنَسْأَلَنَّهُ، فَقَامَ رَجُلٌ مِنْهُمْ، فَقَالَ: يَا أَبَا الْقَاسِمِ، مَا الرُّوْحُ؟ فَسَكَتَ، فَقُلْتُ: إِنَّهُ يُوْحَى إِلَيْهِ، فَقُمْتُ، فَلَمَّا انْجَلٰى عَنْهُ، قَالَ: ﴿ وَيَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ؟ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّيْ، وَمَا أُوْتُوْا مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيْلًا﴾ [الإسراء: ٨٥] قَالَ الْأَعْمَشُ: هِيَ كَذَا فِيْ قِرَاءَتِنَا: وَمَا أُوْتُوْا. [انظر: ٤٧٢١، ٧٢٩٧، ٧٤٥٦، ٧٤٦٢]

بابُ مَنْ تَرَكَ بَعْضَ الْأَخْبَارِ مَخَافَةَ أَنْ يَقْصُرَ فَهْمُ بَعْضِ النَّاسِ فَيَقَعُوْا فِيْ أَشَدَّ مِنْهُ

ایسی باتیں جو عوام کی سمجھ سے باہر ہوں، بیان نہیں کرنی چاہئیں

اب آدابِ عالم شروع کررہے ہیں، آداب: ادب کی جمع ہے، اور ادب کے معنی ہیں: ما يُحْمَدُ فِعْلُه ولا يُذَمُّ تَرْكُه: وہ باتیں جن کا کرنا تعریف کیا جاتا ہے، اور نہ کرنے کی برائی نہیں کی جاتی، یعنی کرو تو واہ واہ! اور نہ کرو تو کوئی بات نہیں، جیسے اونچی جگہ بیٹھ کر وضو کرنا ایک ادب ہے۔ اگر کوئی اس کی رعایت کرے تو سبحان اللہ! اور اگر نہ کرے مگر چھینٹوں سے بچے تو کوئی گناہ نہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ باب میں الأخبار بھی ہے اور الاختیار بھی۔ الاخْتِیار: کے معنی ہیں: مستحب امر، اور بعض الاختیار کا ترجمہ ہے: کچھ مستحب باتیں، اور گیلری میں الأخبار ہے، اس کے معنی ہیں: بعض باتیں۔ دونوں لفظوں کو پیش نظر رکھ کر میں کلام کرونگا۔

بعض الاختیار کا مطلب ہے: جو عالم مقتدی اور پیشوا ہو وہ بربنائے مصلحت بعض مستحبات کو ترک کرسکتا ہے، جیسے نبی ﷺ نے فتح مکہ کے موقعہ پر ایک وضو سے پانچ نمازیں ادا فرمائیں، آپؐ نے فجر سے پہلے مجمع کے سامنے وضو فرمایا اور اعضاء مغسولہ کو ایک ایک مرتبہ دھویا، اور سر اور خفین پر مسح کیا، پھر اس وضو سے فجر سے عشا تک پانچ نمازیں پڑھائیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آج آپ نے وہ کام کیا جو کبھی نہیں کیا یعنی آپ کا معمول یہ نہیں تھا، آپؐ اعضائے مغسولہ کو تین تین بار دھوتے تھے، ہر فرض نماز کے لئے نیا وضو کرتے تھے۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

اے عمر! میں نے بالقصد ایسا کیا ہے (رواہ الترمذی) کیونکہ مکہ نیا فتح ہوا تھا، اور مکہ کے سب لوگ مسلمان ہوگئے تھے، پس انہیں نمازیں بھی پڑھنی ہونگی اور عرب میں پانی بہت کم تھا، اور پانچ نمازیں پڑھنے کے لئے کم از کم پانچ لوٹے پانی چاہئے، اور گھر میں دس آدمی ہوں تو پچاس لوٹے صرف نماز کے لئے چاہئیں، اتنا پانی کہاں سے لائیں گے؟ اس کا ذہنوں پر بوجھ پڑسکتا تھا، اس لئے آپؐ نے مجمع کے سامنے وضو کرکے دکھایا کہ وضو میں بہت زیادہ پانی کی ضرورت نہیں، سوگرام پانی سے بھی وضو ہوسکتا ہے، پھر ہر نماز کے لئے نیا وضو بھی ضروری نہیں۔ ایک وضو سے جب تک وہ باقی رہے متعدد نمازیں پڑھ سکتے ہیں۔ غرض اس موقعہ پر آنحضور ﷺ نے بعض مستحبات کو بربنائے مصلحت ترک کردیا۔

یا جیسے شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ نبی ﷺ نے مزدلفہ کی رات میں بالقصد تہجد نہیں پڑھا تھا، کیونکہ ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان جمع تھے۔ اور پورے جزیرۃ العرب سے لوگ آئے ہوئے تھے، پس اگر آپؐ تہجد پڑھتے تو بعض لوگ یہ سمجھتے کہ یہ نماز بھی ضروری ہے، اس لئے حضور ﷺ نے بالقصد اس رات تہجد نہیں پڑھا، تہجد پڑھنا مستحب ہے، لیکن حضور ﷺ نے بربناء مصلحت مزدلفہ کی رات میں تہجد ترک کردیا۔

باب کا یہ مطلب اس صورت میں ہے جب لفظ الاختیار ہو اور اگر لفظ الأخبار ہو تو بعض الأخبار کا مطلب ہوگا: عالم کو ہر بات عوام کے سامنے بیان نہیں کرنی چاہئے، جو بات عام آدمی سمجھ سکتا ہے وہی بات بیان کرنی چاہئے، کیونکہ اگر ایسی باتیں بیان کریں گے جس کو لوگ نہیں سمجھ سکتے تو وہ بیان کرنے والے کی تکذیب نہیں کریں گے، بلکہ اللہ ورسول کی بات میں شک کریں گے۔ اور اپنی عاقبت خراب کرلیں گے۔

البتہ مخصوص حضرات کے سامنے وہ باتیں بیان کرسکتے ہیں، اس لئے اگلا باب لائے: بابُ مَنْ خَصَّ بالعلم: اس باب کا مقصد یہ ہے کہ مخصوص حضرات کے سامنے وہ باتیں بیان کرسکتے ہیں، عام لوگوں کے سامنے وہ باتیں بیان نہیں کرنی چاہئیں، مثلاً میں سبق میں کبھی کوئی مسئلہ بیان کرتا ہوں اور ہدایت کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ کسی کو بتانا نہیں، عام لوگ اس کو نہیں بوجھ سکیں گے جیسے کوئی جماعت کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو، اور اس کو ایمرجنسی ہو، ٹرین آگئی ہو تو جب امام قعدۂ اخیرہ میں تشہد پڑھ لے یا بقدر تشہد بیٹھ چکے تو مقتدی سلام پھیر کر جاسکتا ہے، ظاہر ہے یہ مسئلہ عوام کو بتانے کا نہیں، ورنہ جب امام سلام پھیرے گا تو پیچھے کوئی نہیں ہوگا۔

قولہ: مخافةَ أن يقصُرَ: دلیل ہے کہ باب میں صحیح لفظ الأخبار ہے۔ چنانچہ میں نے متن میں یہی لفظ رکھا ہے اور اس صورت میں مطلب ہوگا کہ بعض باتیں اس لئے چھوڑ دی جائیں کہ بعض لوگ ان کو نہیں سمجھ سکیں گے، وہ غلطی میں پڑجائیں گے اور اللہ ورسول کی تکذیب کرنے لگیں گے۔

حدیث: اسود بن یزیدؒ کہتے ہیں: حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما نے اپنے دورِ خلافت میں مجھ سے پوچھا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کچھ باتیں تم سے چپکے چپکے بیان کرتی تھیں تو کیا انھوں نے کعبہ شریف کے بارے میں بھی کوئی

بات بیان کی ہے؟ میں نے کہا: حضرت عائشہؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! اگر تیری قوم (کے کفر) کا زمانہ قریب نہ ہوتا (بکفر: ابن الزبیر کا اضافہ ہے) تو میں کعبہ کو ڈھادیتا اور بنائے ابراہیمی پر تعمیر کرتا، اور میں اس کے دو دروازے رکھتا۔ ایک دروازے سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے دروازے سے نکلتے، پھر ابن الزبیرؓ نے کعبہ شریف کی تعمیر کی، اور منشأ نبوی کے مطابق اس کے دو دروازے رکھے، مگر حجاج نے پھر اس کو حسب سابق کر دیا۔

تشریح:

۱- کعبہ کی اصل شکل دائیں قدم کی طرح تھی، انگوٹھے کی جگہ حجر اسود لگا ہوا ہے، اور چھوٹی انگلی کی جگہ رکن یمانی ہے، اور حطیم کی طرف ایڑی کی طرح کعبہ گول تھا، اور اس کے دو دروازے تھے ایک سے لوگ داخل ہوتے تھے اور دوسرے سے نکلتے تھے، اس زمانہ میں لوگ نماز کعبہ کے اندر پڑھتے تھے، وہی مسجد تھی۔ نبوت سے پہلے جب آپؐ کی عمر ۳۵ سال تھی قریش نے کعبہ دوبارہ تعمیر کیا تھا، اور حطیم کی طرف کا کچھ حصہ کعبہ سے باہر نکال دیا تھا، کعبہ چھوٹا تعمیر کیا تھا، اور ایک دروازہ بند کر دیا تھا، اور دوسرے دروازہ کو قدم آدم اونچا کر دیا تھا تاکہ قریش اپنی اجارہ داری قائم رکھ سکیں، جسے چاہیں اندر جانے دیں اور جسے چاہیں روک دیں۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقعہ پر نبی ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ کعبہ کو از سر نو بنائے ابراہیمی پر تعمیر کریں، مگر اس کی تکمیل نہیں کی، عبداللہ بن الزبیرؓ نے اس کی تکمیل کی، پھر جب حجاج نے ان کو شکست دی تو ان کا نام باقی نہ رہے اس لئے کعبہ کو بحالہ کر دیا۔

۲- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ حدیث سب کے سامنے بیان نہیں کرتی تھیں، مخصوص حضرات کے سامنے ہی بیان کرتی تھیں، پس ثابت ہوا کہ ہر بات عوام کے سامنے بیان نہیں کرنی چاہئے، اور یہی باب کا مدعی ہے، اور یہ بات عالم کے آداب میں سے ہے۔

۳- اس حدیث سے یہ ضابطہ نکلتا ہے کہ جو کام استحباب کے درجہ کا ہو اگر وہ فتنہ کا باعث بن سکتا ہو تو وہ کام نہیں کرنا چاہئے، پہلے ماحول ساز گار بنانا چاہئے پھر وہ کام کرنا چاہئے، کعبہ شریف کو بنائے ابراہیمی پر تعمیر کرنا استحباب کے درجہ کا کام تھا۔ اس لئے کہ کعبہ بہر حال کعبہ ہے، چاہے وہاں سرے سے کوئی عمارت نہ ہو، اور اسے منہدم کر کے بنائے ابراہیمی پر تعمیر کرنے میں جو لوگ نئے مسلمان ہوئے تھے ان کے بدکنے کا اندیشہ تھا، اس لئے آنحضور ﷺ نے یہ کام نہیں کیا، مگر صدیقہؓ کے سامنے خواہش کا اظہار کیا، تاکہ جب یہ اندیشہ باقی نہ رہے تو یہ کام کیا جائے، ابن الزبیرؓ کے زمانہ میں وہ اندیشہ باقی نہیں رہا، اس لئے انھوں نے منشأ نبوی کے مطابق کعبہ شریف تعمیر کر دیا، مگر برا ہو حجاج کا اس نے پھر حسب سابق کر دیا۔ مگر حجاج نے صرف حطیم کی طرف کی دیوار نئی بنائی ہے اور ایک دروازہ بند کر دیا ہے اور ایک اونچا کر دیا ہے، باقی تعمیر ابن الزبیر کی ہے۔ پھر ہارون رشید نے منشأ نبوی کے مطابق تعمیر کرنے کا ارادہ کیا مگر امام مالک رحمہ اللہ نے روک دیا تاکہ کعبہ شریف بادشاہوں کا کھلونا نہ بن جائے۔

[٤٨-] بابُ مَنْ ترکَ بَعْضَ الأَخْبَارِ مَخَافَةَ أَنْ يَقْصُرفَهْمُ بَعْضِ النَّاسِ فَيَقَعُوْا فِى أَشَدَّ مِنْهُ

[١٢٦-] حدثنا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ مُوْسَى، عَنْ إِسْرَائِيْلَ، عَنْ أَبِى إِسْحَاقَ، عَنِ الْأَسْوَدِ، قَالَ: قَالَ لِى ابْنُ الزُّبَيْرِ: كَانَتْ عَائِشَةُ تُسِرُّ إِلَيْكَ كَثِيْرًا، فَمَا حَدَّثَتْكَ فِى الْكَعْبَةِ؟ فَقُلْتُ: قَالَتْ لِى: قَالَ النبىُّ صلى الله عليه وسلم :" يا عَائِشَةُ! لَوْلاَ قَوْمُكِ حَدِيْثٌ عَهْدُهُمْ - قَالَ ابْنُ الزُّبَيْرِ: بِكُفْرٍ - لَنَقَضْتُ الْكَعْبَةَ، فَجَعَلْتُ لَهَا بَابَيْنِ: بَابًا يَدْخُلُ النَّاسُ، وَبَابًا يَخْرُجُوْنَ مِنْهُ" فَفَعَلَهُ ابْنُ الزُّبَيْرِ. [انظر: ١٥٨٣، ١٥٨٤، ١٥٨٥، ١٥٨٦، ٣٣٦٨، ٤٤٨٤، ٧٢٤٣]

بابٌ: مَنْ خَصَّ بِالْعِلْمِ قَوْمًا دُوْنَ قَوْمٍ كِرَاهِيَةَ أَنْ لَا يَفْهَمُوْا

خاص باتیں خاص لوگوں ہی کے سامنے بیان کی جائیں

خاص باتیں مخصوص حضرات ہی سے بیان کرنی چاہئیں، عوام سے بیان نہیں کرنی چاہئیں، ہوسکتا ہے وہ بات سمجھ نہ سکیں، اور اپنی عاقبت خراب کرلیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوگوں کے سامنے وہی باتیں بیان کرو جو وہ جانتے ہیں، یعنی سمجھ سکتے ہیں اگر ان سے ایسی باتیں بیان کروگے جو ان کی سمجھ سے بالاتر ہیں تو ہوسکتا ہے وہ اللہ ورسول کی باتوں میں شک کریں اور ان باتوں کی تکذیب کردیں، کیا تم اس کو پسند کروگے؟ ظاہر ہے کوئی شخص اس کو پسند نہیں کرسکتا، آج کل واعظین اپنے بیانوں میں انوکھی باتیں بیان کرنے کو پسند کرتے ہیں، پھر لوگ تحقیق کرتے پھرتے ہیں کہ یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ترجمۃ الباب کے دو جزء ہیں: ایک: ہر بات ہر آدمی سے بیان نہیں کرنی چاہئے اور اس کی دلیل باب کی حدیث ہے۔ دوم: ہر بات عوام کے سامنے بیان کی جائے گی تو وہ سمجھ نہ سکیں گے پس لوگ اس بات میں شک کریں گے اور اس کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے، اور حضرت علیؓ کا قول پہلے لائے ہیں اور سند بعد میں، محدثین ایسا کرتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ بھی ایسا کرتے ہیں۔

حدیث (۱): حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گدھے پر سوار ہوکر کہیں تشریف لے جارہے تھے اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ آپؐ کے پیچھے بیٹھے تھے، آپؐ نے آواز دی: اے معاذ بن جبل! انھوں نے جواب دیا: یارسول اللہ! حاضر ہوں! آپؐ خاموش ہوگئے، کچھ دیر کے بعد پھر آواز دی: انھوں نے پھر جواب دیا کہ حاضر ہوں یارسول اللہ! آپؐ پھر خاموش ہوگئے، کچھ دیر کے بعد تیسری مرتبہ آواز دی انھوں نے جواب دیا: یارسول اللہ! حاضر ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: جو بھی شخص سچے دل سے اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کی آگ حرام کردیتے ہیں'' حضرت معاذؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا میں لوگوں کو یہ بشارت سنادوں تاکہ وہ خوش ہوجائیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''رہنے دو، وہ بھروسہ کرکے بیٹھ جائیں گے'' چنانچہ حضرت معاذؓ نے زندگی بھر یہ حدیث بیان نہیں کی، موت کے وقت بیان کی تاکہ گنہ گار نہ ہوں۔

تشریح:

۱- آج اسّی فیصد مسلمان توحید ورسالت کی گواہی پر تکیہ کرکے بیٹھ گئے ہیں۔ عمل سے قطعی غافل ہوگئے ہیں اور واعظین کا حال یہ ہے کہ جہاں وعید کی حدیث آئی فوراً تاویل کردی، مثلاً من ترك الصلاة متعمداً فقد كفر: جو دانستہ نماز چھوڑے وہ یقیناً کافر ہوگیا۔ واعظین فوراً تاویل کریں گے کہ کفر حقیقی مراد نہیں، مجازی معنی ہیں اور حدیث کا مطلب یہ ہے وہ ہے، پس وعید کا جو مقصد تھا وہ فوت ہوگیا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے آپؐ نے یہی فرمایا ہے کہ اگر تم لوگوں کو یہ خوشخبری سنادوگے تو وہ عمل سے غافل ہوجائیں گے۔

یہاں ہمارے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے یہ بات صرف حضرت معاذؓ سے بیان کی جو خواص میں سے تھے، پس باب کا پہلا جزء ثابت ہوگیا، اور آگے بیان کرنے سے منع کردیا، کیونکہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہوجائیں گے، پس باب کا دوسرا جزء بھی ثابت ہوگیا۔

۲- مؤمن پر جہنم کی آگ حرام ہے: اس کا یہ مطلب نہیں کہ خواہ کیسے ہی گناہ کرے جہنم میں نہیں جائے گا، کبائر کی وجہ سے جہنم میں جانا پڑسکتا ہے، البتہ ہمیشہ وہاں رہنا نہیں ہوگا، گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا۔

۳- حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے وفات سے پہلے یہ حدیث اس لئے بیان کی کہ علم چھپانے کے سلسلہ میں جو وعید ہے اس کا مصداق نہ بن جائیں۔

۴- اور حضور ﷺ نے بار بار اس لئے پکارا تھا کہ وہ پوری طرح متوجہ ہوجائیں۔ اور غور سے بات سنیں اور محفوظ کریں۔

حدیث (۲): حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھ سے یہ بات بیان کی گئی کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''جو اللہ سے ملا اس حال میں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا تھا تو وہ جنت میں جائے گا'' حضرت معاذؓ نے پوچھا: کیا میں لوگوں کو یہ خوشخبری سنادوں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اس پر بھروسہ کرکے بیٹھ جائیں گے۔

تشریح: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا انتقال بہت پہلے ہوگیا ہے، اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے براہ راست ان سے یہ حدیث نہیں سنی، بلکہ ان کے کسی تلمیذ سے سنی ہے، اور یہ اوپر والی روایت ہی ہے مگر روایت بالمعنی ہے، صحابہ وتابعین روایت بالمعنی کرتے تھے۔

[۴۹-] بابٌ: مَنْ خَصَّ بِالْعِلْمِ قَوْمًا دُوْنَ قَوْمٍ، كِرَاهِيَةَ أَنْ لَا يَفْهَمُوْا

[۱۲۷-] وَقَالَ عَلِيٌّ: حَدِّثُوْا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُوْنَ، أَتُحِبُّوْنَ أَنْ يُكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ؟ حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ مُوْسَى، عَنْ مَعْرُوْفِ [بْنِ خَرَّبُوْذَ] عَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ، عَنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ.

[۱۲۸-] حدثنا إِسْحَاقُ بْنُ إِبْرَاهِيْمَ، قَالَ: أَنَا مُعَاذُ بْنُ هِشَامٍ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ أَبِيْ، عَنْ قَتَادَةَ، قَالَ: ثَنَا أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ أَنَّ النبيَّ صلی اللہ علیہ وسلم - وَمُعَاذٌ رَدِيْفُهُ عَلَى الرَّحْلِ - قَالَ: "يَا مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ" قَالَ: لَبَّيْكَ يَارسولَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ، قَالَ: "يا مُعَاذُ" قَالَ: لَبَّيْكَ يَارسولَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ، قَالَ يَا مُعَاذُ! قَالَ: لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ، ثَلاثًا - قَالَ: "مَا مِنْ أَحَدٍ يَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسولُ اللّٰهِ، صِدْقًا مِنْ قَلْبِهِ، إِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ" قَالَ: يَارسولَ اللّٰهِ! أَفَلَا أُخْبِرُ بِهِ النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوْا؟ قَالَ: "إِذًا يَتَّكِلُوْا" وَأَخْبَرَ بِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهِ تَأَثُّمًا. [انظر: ۱۲۹]

[۱۲۹-] حدثنا مُسَدَّدٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُعْتَمِرٌ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبِيْ، قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا، قَالَ: ذُكِرَ لِيْ أَنَّ النبيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ لِمُعَاذٍ: "مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ" قَالَ: أَلَا أُبَشِّرُ بِهِ النَّاسَ؟ قَالَ: "لَا، أَخَافُ أَنْ يَتَّكِلُوْا" [راجع: ۱۲۸]

بابُ الْحَيَاءِ فِي الْعِلْمِ

طلب علم میں شرم نہیں کرنی چاہئے

اب آدابِ متعلّم شروع کررہے ہیں، علم کے معاملہ میں شرم کرنا ٹھیک نہیں، دلیل حضرت مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے جو کتاب میں ہے، حیاء صفتِ محمودہ ہے اور ایمان کی اہم ترین شاخ ہے، مگر یہ طلب علم کی راہ کا روڑا ہے، پس طالب علم کے لئے حیا کرنا ٹھیک نہیں، اب تو کتابوں کا دور آگیا ہے، دور اول میں جب کتابیں نہیں تھیں پڑھنے کا طریقہ سوال وجواب تھا۔ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہ سے پوچھا: بتاؤ! وہ کونسا درخت ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے اور وہ مسلمان کی مثال ہے؟ حضرت ابن عمرؓ جواب سمجھ گئے، مگر شرما گئے اور بولے نہیں تو حضرت عمرؓ نے اس کو پسند نہیں کیا، اور فرمایا: تمہیں جواب دینا چاہئے تھا، اگر تم جواب دیتے تو مجھے بے حد خوشی ہوتی۔

غرض علم کے معاملہ میں شرمانا نہیں چاہئے، جو بات معلوم نہ ہو بے جھجک پوچھنی چاہئے، اور کسی وجہ سے خود نہ پوچھ سکے تو دوسرے کے ذریعہ پوچھوائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک معاملہ درپیش تھا، ان کو حضور ﷺ سے پوچھتے ہوئے شرم آتی تھی کیونکہ وہ حضور ﷺ کے داماد تھے اس لئے انھوں نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے پوچھوایا، پس اس کی تو گنجائش ہے مگر چپ سادھ لینا کہ نہ خود پوچھے نہ دوسرے سے پوچھوائے: ٹھیک نہیں۔

۱- مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دو شخصوں کو علم نہیں آتا: شرم کرنے والے کو اور گھمنڈی کو، شرم کرنے والا بھی نہیں پوچھے گا اور گھمنڈی بھی نہیں پوچھے گا، پس ان کو علم کیسے حاصل ہوگا؟

۲- حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: انصار کی عورتیں بھلی عورتیں ہیں، حیاء نے دین کی سمجھ حاصل کرنے سے ان کو نہیں روکا، یعنی انصار کی عورتوں میں حیا تھی، مگر دین کے معاملہ میں وہ شرم نہیں کرتی تھیں، بے تکلف حضور ﷺ سے پوچھتی تھیں۔

واقعہ: ایک انصاری خاتون تھیں، ان کے شوہر جنگ احد میں شہید ہوگئے تھے، ان کے باپ نے ان کا نکاح کسی جگہ کردیا۔ اور ان سے نہیں پوچھا، وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ! میرے ابا نے ایک شخص سے میرا نکاح کردیا اور مجھ سے نہیں پوچھا میں اس نکاح کو پسند نہیں کرتی، آنحضور ﷺ نے وہ نکاح رد کردیا، جب آپؐ نے یہ فیصلہ سنادیا تو اس نے کہا: یارسول اللہ! مجھے وہ نکاح منظور ہے، اور میں اس پر راضی ہوں، دوسری عورتوں نے اس سے کہا: اللہ کی بندی! جب تجھے باپ کا نکاح برقرار رکھنا تھا تو پھر تو نے حضور ﷺ سے شکایت کیوں کی؟ اس خاتون نے جواب دیا: میں حضور ﷺ کے پاس اس لئے گئی تھی کہ انصار کی سب عورتوں کو معلوم ہوجائے کہ باپ کو بیٹی پر زبردستی کرنے کا کوئی حق نہیں، اب مسئلہ واضح ہوگیا اور میرے باپ نے میرا جو نکاح کیا ہے اسے میں منظور کرتی ہوں۔ یہ ایک انصاری عورت کا واقعہ ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ دین سیکھنے کے معاملہ میں کتنی جری تھیں اور حدیث میں جو واقعہ آرہا ہے وہ بھی ایک انصاری خاتون ہی کا ہے۔

حدیث: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ام سُلیم (حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ) حضور اقدس ﷺ کے پاس آئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ حق بات بیان کرنے میں شرماتے نہیں (پس حق بات پوچھنے میں کیا شرمانا، یہ تمہید قائم کر کے سوال کیا) کیا عورت پر بھی غسل ہے جب وہ پانی دیکھے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں اس پر بھی غسل واجب ہے جب وہ پانی دیکھے، یعنی کپڑے پر منی کا اثر دیکھے۔ ام سلمہؓ نے شرم سے اپنا چہرہ چھپالیا، اور کسی دوسرے وقت عرض کیا: یارسول اللہ! کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، تیرا دایاں ہاتھ خاک آلود ہو، بچہ عورت کے مشابہ کیسے ہوتا ہے؟

تشریح:

۱- اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام سُلیم رضی اللہ عنہا نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہوکر تنہائی میں مسئلہ پوچھا ہے مگر یہ بات صحیح نہیں، واقعہ کی صحیح نوعیت یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کی مجلس ہورہی تھی، اس میں عورتیں بھی پیچھے بیٹھی تھیں، اسی مجلس میں ام سُلیم نے یہ مسئلہ پوچھا ہے اور مردوں کے سامنے پوچھا ہے، اور چونکہ شرم کا مسئلہ تھا اس لئے پہلے تمہید قائم کی کہ یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ حق بات بیان کرنے میں شرم نہیں کرتے، مکھی مچھر کی مثال بھی بیان کرتے ہیں، پس بندوں کو بھی حق بات دریافت کرنے میں شرم نہیں کرنی چاہئے، پھر مسئلہ پوچھا۔ اسی وجہ سے حضرت ام سلمہ

رضی اللہ عنہا نے شرم سے چہرہ چھپالیا، اور کسی وقت ام سُلیم سے کہا: ام سُلیم! تو نے تو چوراہے پر عورتوں کا بھانڈا پھوڑ دیا، یعنی بھری مجلس میں عورتوں کی پوشیدہ بات ظاہر کردی، پھر کسی دوسرے موقع پر خود حضرت ام سلمہؓ نے بھی آپؐ سے یہ مسئلہ پوچھا اور آپؐ نے ان کو بھی یہی جواب دیا کہ اگر عورت بیدار ہو اور کپڑے پر منی کی تری دیکھے تو اس پر غسل واجب ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک بات ام سلمہؓ پوچھیں تو عورتوں کی فضیحت نہ ہو اور وہی بات اُم سلیم پوچھیں تو عورتیں رسوا ہو جائیں یہ کیا بات ہوئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ام سلمہؓ نے شوہر سے یعنی رسول اللہ ﷺ سے تنہائی میں پوچھا ہے، اور ام سلیم نے مردوں کی مجلس میں دریافت کیا ہے، اس لئے دونوں کے پوچھنے میں فرق ہے۔

۲- عورتوں کو احتلام کی نوبت کم آتی ہے کیونکہ ان کا مزاج مرطوب ہے۔ اور ان کا نظام تولید اندر ہے اس لئے تحریک کم ہوتی ہے، اور مرد کا نظام باہر ہے اور مزاج گرم خشک ہے اور عضو سے کپڑا وغیرہ لگتا ہے اس لئے احتلام کی نوبت زیادہ آتی ہے۔ اور اکثر عورتوں کو تو احتلام کا تجربہ ہی نہیں ہوتا، ام سلیم کے سوال سے مردوں کو معلوم ہو گیا کہ عورتوں کو بھی یہ صورت پیش آتی ہے، چوراہے پر بھانڈا پھوڑنے کا یہی مطلب ہے۔

۳- بیشتر احکام میں مرد وزن میں اشتراک ہے اس لئے کہ دونوں ایک نوع کی دو صنفیں ہیں، البتہ کچھ احکام میں فرق ہے جن کا تعلق صنف سے ہے، بدخوابی کا تعلق صنف سے نہیں، بلکہ نوع سے ہے اس لئے دونوں کا حکم یکساں ہے۔

۴- اگر کوئی شخص خواب دیکھے کہ وہ صحبت کر رہا ہے اور انزال ہو گیا مگر بیدار ہونے کے بعد کپڑے پر منی کے اثرات نہ پائے تو اس پر غسل واجب نہیں، اور اس کی برعکس صورت میں غسل واجب ہے، یعنی خواب یاد نہ ہو، یا خواب میں انزال ہونا یاد نہ ہو مگر بیدار ہونے کے بعد کپڑے پر تری دیکھے تو اس پر غسل واجب ہے، پہلی صورت میں یہ کہا جائے گا کہ بلی کے خواب میں چھیچھڑے! کیونکہ اگر انزال ہوا تھا تو تری کہاں گئی؟ اور دوسری صورت میں کہا جائے گا کہ گہری نیند کی وجہ سے خواب یاد نہیں رہا۔ جب کپڑے پر منی ہے تو بدخوابی ضرور ہوئی ہے اس لئے غسل واجب ہے۔

۵- حضرت ام سلمہؓ نے یہ بھی پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ! کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ یعنی عورت کی بھی منی ہوتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اگر عورت کا پانی نہیں ہوتا تو پھر بچے میں ننھیال کی مشابہت کہاں سے آتی ہے؟ بچہ کبھی ننھیال کے مشابہ ہوتا ہے اور کبھی ددھیال کے۔ معلوم ہوا کہ مرد کی طرح عورت کا بھی پانی ہوتا ہے۔

۶- تَرِبَتْ یَمِیْنُكِ: تیرا دایاں ہاتھ خاک آلود ہو، یہ لفظی ترجمہ ہے، مگر یہ محاورہ ہے اور محاورہ کا لفظی ترجمہ نہیں کیا جاتا نہ وہ مراد ہوتا ہے، بلکہ محاورہ کا محل استعمال ملحوظ رکھا جاتا ہے، جیسے پیار وشفقت کے لئے اردو میں کہتے ہیں: باؤلے! کیا بات پوچھی! یہ بات پوچھنے کی ہے؟ تو یہاں باؤلے کا لفظی ترجمہ مراد نہیں، بلکہ یہ ایک محاورہ ہے، جو پیار وشفقت کے موقعہ پر بولا جاتا ہے اسی طرح یہ عربی محاورہ ہے اور پیار وشفقت کے موقعہ پر بولا جاتا ہے۔

مناسبت: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث لاکر بس اتنا استدلال کرنا ہے کہ دینی معاملہ میں شرم محمود نہیں۔ حضرت ام سُلیمؓ کو ایک مسئلہ معلوم کرنا تھا، اور وہ شرم کا مسئلہ تھا مگر انھوں نے شرم نہیں کی بلکہ مسئلہ دریافت کرلیا پس دینی بات پوچھنے میں شرم نہیں کرنی چاہئے کیونکہ شرم علم کی راہ کا روڑا ہے۔

حدیث (۲): ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے پوچھا: ایک درخت ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے، اور وہ درخت مسلمان کی مثال ہے، بتاؤ وہ کونسا درخت ہے؟ پس لوگ جنگل کے درختوں میں کھوگئے، ابن عمرؓ کہتے ہیں: میرے دل میں جواب آگیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔ لیکن میں شرمایا، اور بولا نہیں۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپؐ ہی بتائیں کہ وہ کونسا درخت ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وہ کھجور کا درخت ہے۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں: میں نے بعد میں اپنے ابا حضرت عمرؓ سے کہا: میں جواب سمجھ گیا تھا، مگر مجلس میں اکابر صحابہ موجود تھے اس لئے مجھے شرم آئی اور میں خاموش رہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم جواب دیتے تو مجھے اس سے زیادہ خوشی ہوتی کہ میرے لئے اتنا اور اتنا مال ہو، یعنی دنیا بھر کی دولت پاکر بھی مجھے اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی تمہارے جواب سے ہوتی۔

مناسبت: یہ حدیث پہلے کئی مرتبہ گذری ہے، یہاں یہ استدلال کرنا ہے کہ دینی معاملہ میں ابن عمرؓ نے شرم کی تو حضرت عمرؓ نے اس کو پسند نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ دینی معاملہ میں شرم محمود نہیں۔

[۵۰-] بابُ الْحَیَاءِ فِی الْعِلْمِ

[۱-] وَقَالَ مُجَاهِدٌ: لَا یَتَعَلَّمُ الْعِلْمَ مُسْتَحْیٍ وَلَا مُسْتَكْبِرٌ.

[۲-] وَقَالَتْ عَائِشَةُ: نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْأَنْصَارِ لَمْ یَمْنَعْهُنَّ الْحَیَاءُ أَنْ یَتَفَقَّهْنَ فِی الدِّیْنِ.

[۱۳۰-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ، قَالَ: أنا أَبُوْ مُعَاوِیَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامٌ، عَنْ أَبِیْهِ، عَنْ زَیْنَبَ بِنْتِ أُمِّ سَلَمَةَ، عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، قَالَتْ جَاءَ تْ أُمُّ سُلَیْمٍ إِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَتْ: یَارسولَ اللّٰهِ! إِنَّ اللّٰهَ لَایَسْتَحْیِیْ مِنَ الْحَقِّ، فَهَلْ عَلَی الْمَرْأَةِ مِنْ غُسْلٍ إِذَا احْتَلَمَتْ؟ فَقَالَ النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم: "إِذَا رَأَتِ الْمَاءَ" فَغَطَّتْ أُمُّ سَلَمَةَ - تَعْنِیْ وَجْهَهَا - وَقَالَتْ: یَارسولَ اللّٰهِ! أَوَ تَحْتَلِمُ الْمَرْأَةُ؟ قَالَ: "نَعَمْ، تَرِبَتْ یَمِیْنُكِ، فَبِمَ یُشْبِهُهَا وَلَدُهَا؟" [انظر: ۲۸۲، ۳۳۲۸، ۶۰۹۱، ۶۱۲۱]

[۱۳۱-] حدثنا إِسْمَاعِیْلُ، قَالَ: حَدَّثَنِیْ مَالِكٌ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِیْنَارٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: "إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا یَسْقُطُ وَرَقُهَا، وَهِیَ مَثَلُ الْمُسْلِمِ، حَدِّثُوْنِیْ مَا هِیَ؟" فَوَقَعَ النَّاسُ فِیْ شَجَرِ الْبَادِیَةِ، وَوَقَعَ فِیْ نَفْسِیْ أَنَّهَا النَّخْلَةُ، قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: فَاسْتَحْیَیْتُ، قَالُوْا: یَارسولَ اللّٰهِ! أَخْبِرْنَا بِهَا، فَقَالَ رسولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: "هِیَ النَّخْلَةُ" قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: فَحَدَّثْتُ أَبِیْ بِمَا وَقَعَ فِیْ نَفْسِیْ، فَقَالَ: لَأَنْ تَكُوْنَ قُلْتَهَا أَحَبُّ إِلَیَّ مِنْ أَنْ یَكُوْنَ لِیْ كَذَا وَكَذَا. [راجع: ۳۱]

بَابُ مَنِ اسْتَحْىٰ فَأَمَرَ غَيْرَهُ بِالسُّؤَالِ

مسئلہ پوچھنے میں شرم آئے تو دوسرے سے پوچھوائے

اگر خود مسئلہ پوچھنے میں کسی وجہ سے شرم آتی ہو تو اتنی گنجائش ہے کہ دوسرے سے پوچھوائے، نہ خود پوچھنا نہ دوسرے سے پوچھوانا ٹھیک نہیں۔

حدیث: حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں ایسا آدمی تھا جس کو مذی بہت نکلتی تھی، پس میں نے مقداد رضی اللہ عنہ سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے اس کا حکم دریافت کریں، چنانچہ انھوں نے پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا: اس میں وضو ہے۔

تشریح: حضرت علیؓ جب بھی بیوی سے مذاق کرتے مذی نکل آتی، اور غسل کرتے، ان کے خیال میں منی اور مذی کا حکم ایک تھا پھر جب بار بار نہانے سے مشقت لاحق ہوئی تو خیال آیا کہ دین میں تنگی نہیں، شاید میں مسئلہ صحیح نہیں سمجھ رہا۔ اس لئے انھوں نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے مسئلہ پوچھنے کے لئے کہا، اور خود اس لئے نہیں پوچھا کہ آپ داماد تھے، جب حضرت مقدادؓ نے مسئلہ پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: غسل منی نکلنے سے واجب ہوتا ہے۔ مذی میں وضو کر لینا کافی ہے۔

اور حدیث کی باب سے مناسبت یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے خود مسئلہ نہیں پوچھا۔ حضرت مقدادؓ سے پوچھوایا، معلوم ہوا کہ اگر کوئی مانع ہو تو دوسرے کے ذریعہ بھی مسئلہ پوچھوا سکتے ہیں۔

فائدہ: کسی روایت میں ہے کہ یہ مسئلہ حضرت مقدادؓ نے پوچھا تھا، اور کسی میں ہے کہ حضرت عمارؓ نے پوچھا تھا، اور کسی میں ہے کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا تھا، ان میں تطبیق یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے پہلے حضرت مقدادؓ سے مسئلہ پوچھنے کے لئے کہا، مگر جب ان کی طرف سے تاخیر ہوئی تو حضرت عمارؓ سے کہا، پھر جب پریشانی بڑھی تو خود ہی پوچھ لیا۔ پھر ان دونوں حضرات نے بھی پوچھا، پس روایات میں کوئی تعارض نہیں۔

[۵۱-] بَابُ مَنِ اسْتَحْىٰ فَأَمَرَ غَيْرَهُ بِالسُّؤَالِ

[۱۳۲-] حدثنا مُسَدَّدٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ دَاوُدَ، عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ مُنْذِرٍ الثَّوْرِيِّ، عَنْ مُحَمَّدِ ابْنِ الْحَنَفِيَّةِ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رضی الله عنه، قَالَ: كُنْتُ رَجُلًا مَذَّاءً، فَأَمَرْتُ الْمِقْدَادَ أَنْ يَسْأَلَ النبيَّ صلی الله علیه وسلم، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: "فِيهِ الْوُضُوْءُ" [انظر: ۱۷۸، ۲۶۹]

بَابُ ذِكْرِ الْعِلْمِ وَالْفُتْيَا فِي الْمَسْجِدِ

مسجد میں تعلیم و تعلّم اور فتوی دینا

اب آداب عامہ شروع کرتے ہیں، تعلیم و تعلّم کے سلسلہ کے دو ادب بیان کئے ہیں: ایک: مسجد میں تعلیم و تعلّم اور

فتوی دینے کی گنجائش ہے، دورِ اول میں تعلیم وتعلّم اور مسائل کی مجلسیں مسجدوں میں ہوتی تھیں۔ باقاعدہ درسگاہیں نہیں تھیں، بلکہ آج بھی بعض جگہ مسجدوں ہی میں اسباق ہوتے ہیں، پس اس کی گنجائش ہے، اس سلسلہ میں یہ پہلا باب ہے، اور دوسرا باب یہ ہے کہ مفتی سائل کے سوال سے زیادہ جواب دے سکتا ہے، یعنی جواب دے کر کوئی اور ضروری بات بتانا چاہے تو بتا سکتا ہے۔ یہ دوسرا ادب ہے اور اس کے لئے اگلا باب آرہا ہے۔

حدیث: ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ایک شخص مسجد میں کھڑا ہوا اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپؐ ہمیں کہاں سے احرام باندھنے کا حکم دیتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: مدینہ منورہ والے ذوالحلیفہ سے احرام باندھیں، اور شام والے جحفہ سے، اور نجد والے قرن سے، ابن عمرؓ کہتے ہیں: اور لوگ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یمن والے یلملم سے احرام باندھیں۔ یعنی شروع کے تین مواقیت تو حضرت ابن عمرؓ نے آنحضور ﷺ سے براہِ راست سنے ہیں اور چوتھا صحابہ کے واسطہ سے سنا ہے، اور ابن عمرؓ کہا کرتے تھے کہ میں نے یہ رسول اللہ ﷺ سے نہیں سمجھا، یعنی حضور ﷺ نے یہ چوتھا میقات بھی بیان کیا تھا مگر ابن عمرؓ نہیں سمجھے اس لئے صحابہ سے دریافت کیا۔

مناسبت: سائل نے یہ سوال مسجد میں کیا تھا، اور آنحضور ﷺ نے مسجد ہی میں جواب دیا تھا، پس معلوم ہوا کہ مسجد میں پڑھنے پڑھانے کی اور مسئلہ بتانے کی گنجائش ہے۔

[۵۲-] بابُ ذِكْرِ الْعِلْمِ والْفُتْيَا فِي الْمَسْجِدِ

[۱۳۳-] حدثنا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيْدٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ بْنُ سَعْدٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا نَافِعٌ مَوْلَى عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ: أَنَّ رَجُلاً قَامَ فِي الْمَسْجِدِ فَقَالَ: يارسولَ اللّٰهِ! مِنْ أَيْنَ تَأْمُرُنَا أَنْ نُهِلَّ؟ فَقَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: " يُهِلُّ أَهْلُ الْمَدِيْنَةِ مِنْ ذِي الْحُلَيْفَةِ، وَيُهِلُّ أَهْلُ الشَّامِ مِنَ الْجُحْفَةِ، وَيُهِلُّ أَهْلُ نَجْدٍ مِنْ قَرْنٍ" وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: وَيَزْعُمُوْنَ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ: "وَيُهِلُّ أَهْلُ الْيَمَنِ مِنْ يَلَمْلَمَ " وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَقُوْلُ: لَمْ أَفْقَهْ هٰذِهِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم.

[انظر: ۱۵۲۲، ۱۵۲۵، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸]

بابُ مَنْ أَجَابَ السَّائِلَ بِأَكْثَرَ مِمَّا سَأَلَهُ

سوال سے زیادہ جواب دینا

یہ آداب عامہ کے سلسلہ کا دوسرا باب، اور کتاب العلم کا آخری باب ہے، اس باب کا مقصد یہ ہے کہ مفتی سائل کے سوال سے زیادہ افادہ کرسکتا ہے، یعنی سوال کا جواب دے کر کوئی اور ضروری بات بتانا چاہے تو بتا سکتا ہے، چند ابواب پہلے

یہ باب گذرا ہے کہ اگر عالم کچھ خاص باتیں عوام کے سامنے بیان نہ کرے تو اس کی گنجائش ہے، یہ اس کا مقابل باب ہے کہ اگر عالم ازخود کوئی بات بیان کرنا چاہے تو اس کی گنجائش ہے۔

مگر امام بخاریؒ جو حدیث لائے ہیں وہ صریح نہیں۔ صریح روایت یہ ہے کہ ایک بدّو نے پوچھا: یارسول اللہ! ہم جنگل میں اونٹ چرانے جاتے ہیں، اور چھاگل میں پینے کے لئے پانی لے جاتے ہیں، پس اگر ذرا سی ہوا نکل جائے تو کیا وضو کئے بغیر نماز پڑھ سکتے ہیں کیونکہ پانی میں قلت ہے؟ آپؐ نے فرمایا: إِذَا فَسَا أَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ، وَلَا تَأْتُوا النِّسَاءَ فِي أَدْبَارِهِنَّ: جب تم میں سے کوئی گوز مارے تو چاہئے کہ وضو کرے، اور تم عورتوں سے پچھلی راہ میں صحبت مت کرو، یہ آخری بات ان صاحب نے نہیں پوچھی تھی۔ یہ بات نبی ﷺ نے ازخود بتائی۔ یہ اس باب کی صریح مثال ہے۔ مگر یہ روایت حضرتؒ کے معیار کی نہیں اس لئے اسے نہیں لائے، اور جو روایت لائے ہیں اس میں سے یہ بات نکالنا ذرا مشکل ہے۔

حدیث: ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے پوچھا: محرم کیا کیا کپڑے پہن سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: محرم کرتا نہ پہنے، پگڑی نہ باندھے، پائجامہ نہ پہنے، ٹوپی نہ اوڑھے (حاشیہ میں لکھا ہے کہ بُرنس لمبی ٹوپی کو کہتے ہیں، اسی طرح جو ٹوپی جبہ کے ساتھ سلی ہوئی ہو اس کو بھی بُرنس کہتے ہیں) اور نہ کوئی ایسا کپڑا پہنے جس کو ورس یا زعفران نے چھویا ہے یعنی ان میں رنگا گیا ہے اور محرم اگر چپل نہ پائے تو چاہئے کہ خفین پہنے اور چاہئے کہ ان کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لے۔

تشریح:

۱- سائل نے مثبت پہلو سے سوال کیا تھا مگر آپؐ نے منفی پہلو سے جواب دیا۔ اس لئے کہ محرم جو کپڑے پہن سکتا ہے وہ غیر محدود ہیں، اور جو نہیں پہن سکتا وہ محدود ہیں، اس لئے آپؐ نے منفی پہلو سے جواب دیا کہ ان کپڑوں کے علاوہ ہر کپڑا پہن سکتا ہے۔

غرض حدیث میں صرف سوال کا جواب ہے اگرچہ بالواسطہ ہے کوئی افادۂ مزید نہیں، اس لئے میں نے کہا تھا کہ حدیث کو باب سے منطبق کرنا ذرا مشکل ہوگا۔

۲- محرم کرتا اور پائجامہ نہیں پہن سکتا: اس سے علماء نے یہ ضابطہ بنایا ہے کہ جو کپڑا بدن کی ساخت پر سیا گیا ہو یا بُنا گیا ہو وہ محرم نہیں پہن سکتا، جیسے کرتا، جبہ، پائجامہ، چڈی، نیکر اور بنیان وغیرہ، اور جو کپڑا بدن کی ساخت پر نہیں سیا گیا جیسے لنگی بدن کے ساخت پر نہیں سی جاتی بلکہ اس کے دونوں کنارے ملا کر سی دیتے ہیں اس لئے محرم سلی ہوئی لنگی پہن سکتا ہے۔

اور ٹوپی اور پگڑی نہیں باندھ سکتا: اس سے یہ ضابطہ بنایا ہے کہ احرام میں مرد کے لئے سر ڈھانپنا منع ہے اور چہرہ ڈھانپنا بھی منع ہے، اور چھتری سے سایہ کرنا سر ڈھانپنا نہیں، کیونکہ اس کے اور سر کے درمیان فاصلہ رہتا ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے چھت کے نیچے رہنا بالاتفاق جائز ہے۔

اور ورس اور زعفران میں رنگا ہوا کپڑا نہیں پہن سکتا: اس سے یہ ضابطہ بنایا ہے کہ ہر وہ کپڑا جو خوشبودار رنگ میں رنگا

گیا ہو یا خوشبو میں بسایا گیا ہو: محرم نہیں پہن سکتا، نہ مرد پہن سکتا ہے نہ عورت، اور ممانعت کی وجہ خوشبو ہے رنگ نہیں۔

اور احرام میں خفین پہننا بھی جائز نہیں، اور اگر کسی کے پاس چپل نہ ہوں تو وہ خفین کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لے اور جوتی نما بنا کر پہن سکتا ہے۔ جاننا چاہئے کہ ٹخنے دو ہیں: ایک: وہ جہاں تک وضو میں پاؤں دھونا ضروری ہے یعنی پیر کی دونوں جانبوں میں ابھری ہوئی ہڈی، دوسرے: پاؤں کا اوپری حصہ جہاں بال اگتے ہیں، وہ بھی ٹخنے ہیں، احرام میں دونوں ٹخنے کھلے رکھنے ضروری ہیں۔ مزید تفصیل کتاب الحج میں آئے گی۔

مناسبت: حدیث کے باب کے ساتھ انطباق میں تین احتمال ہیں:

ایک: آپؐ نے سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ صرف ایک زائد بات بتائی کہ محرم یہ یہ کپڑے نہیں پہن سکتا، پس افادۂ مزید ہو گیا مگر یہ احتمال ٹھیک نہیں۔ اس لئے کہ افادۂ مزید کا تحقق اس وقت ہوگا جب پہلے سوال کا جواب دیا جائے، پھر کوئی زائد بات بتائی جائے۔

دوم: آپؐ نے جو ان ڈائرکٹ جواب دیا اس میں سائل کے سوال کا جواب بھی ہے اور فائدہ مزید بھی، اس لئے کہ جواب نبوی سے ضمناً یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ محرم مذکورہ ممنوع کپڑوں کے علاوہ کپڑے پہن سکتا ہے، یہ جواب ہوا۔ اور یہ یہ کپڑے نہیں پہن سکتا، یہ افادۂ مزید ہوا۔

سوم: چپل نہ ہوں تو خفین ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ کر پہنے، یہ جزء افادۂ مزید ہے۔ مگر یہ احتمال صحیح نہیں، اس لئے کہ چپل پہنے جاتے ہیں، اور سائل نے یہ پوچھا ہے کہ محرم کیا کیا چیزیں نہیں پہن سکتا، اس لئے صحیح احتمال دوسرا ہے۔

[۵۳-] بَابُ مَنْ أَجَابَ السَّائِلَ بِأَكْثَرَ مِمَّا سَأَلَهُ

[۱۳۴-] حدثنا آدمُ، قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي ذِئْبٍ، عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، ح: وَعَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ سَالِمٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: أَنَّ رَجُلًا سَأَلَهُ: مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ؟ فَقَالَ: "لَايَلْبَسُ الْقَمِيصَ، وَلَا الْعِمَامَةَ، وَلَا السَّرَاوِيْلَ، وَلَا الْبُرْنُسَ، وَلَا ثَوْبًا مَسَّهُ الْوَرْسُ أَوِ الزَّعْفَرَانُ، فَإِنْ لَمْ يَجِدِ النَّعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسِ الْخُفَّيْنِ، وَلْيَقْطَعْهُمَا حَتَّى يَكُوْنَا تَحْتَ الْكَعْبَيْنِ"

[انظر: ۳۶۶، ۱۵۴۲، ۱۸۳۸، ۱۸۴۲، ۵۷۹۴، ۵۸۰۳، ۵۸۰۵، ۵۸۰۶، ۵۸۴۷، ۵۸۵۲]

وضاحت: ابن ابی ذئب نے نافع، عن ابن عمر کے طریق سے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور زھری، عن سالم، عن ابن عمر کے طریق سے بھی۔

﴿الحمد للہ! کتاب العلم کی تقریر کی ترتیب پوری ہوئی﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

كتابُ الْوُضُوْءِ

بابُ مَاجَاءَ فِی الْوُضُوْءِ

وضوء کا بیان

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں جو آیت لکھی ہے وہ سورۂ مائدہ کی آیت ٦ ہے۔ یہ آیت پوری کتاب الوضوء کی پیشانی ہے، اور آیت سے پہلے جو باب ہے وہ باب نہیں ہونا چاہئے۔ اس پر نون لکھا ہے، یعنی یہ باب ایک نسخہ میں ہے، تمام نسخوں میں نہیں ہے، اور یہی نسخے صحیح ہیں، اس لئے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کتاب کے شروع میں آیت لکھتے ہیں پھر احادیث لاتے ہیں، اور پوری کتاب اس آیت کی تفسیر ہوتی ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی کیا ہے کتاب الوضوء کے بعد آیت لکھی ہے، پھر تراجم قائم کرکے احادیث لکھی ہیں، وہ تمام حدیثیں اسی آیت کی تفسیر ہیں، اگر یہاں باب ہوگا تو آیت کا صرف اسی باب سے تعلق ہوگا، حالانکہ یہ آیت پوری کتاب الوضوء کی تمہید ہے، اس لئے میں یہاں آیتِ کریمہ کی تفسیر نہیں کرتا، قبل از وقت تفسیر کی ضرورت نہیں، پوری کتاب الوضوء آیت کی تفسیر ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اعضاء مغسولہ کو ایک ایک بار دھونا فرض کا ادنیٰ درجہ ہے، اور دو مرتبہ دھونا پہلا تکمیلی درجہ ہے اور تین تین مرتبہ دھونا آخری تکمیلی درجہ ہے، اور یہ بات نبی ﷺ سے مختلف احادیث میں مروی ہے جو آئندہ آرہی ہیں، اور تین مرتبہ پر رک جانا ضروری ہے، تین مرتبہ سے زیادہ دھونا اسراف فی المرّات ہے، اور وضو میں زائد از ضرورت پانی صرف کرنا اسراف فی الماء ہے، اور علماء نے دونوں کو مکروہ لکھا ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ وضو کررہے تھے، اور پانی میں اسراف کررہے تھے، نبی ﷺ کا وہاں سے گذر ہوا، آپؐ نے فرمایا: اے سعد! یہ اسراف کیسا؟ انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا پانی میں بھی اسراف ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، اگرچہ تم جاری نہر پر وضو کرو (مشکوٰۃ حدیث ۴۲۷) اور ہمارے علاقہ میں اللہ کے فضل سے پانی بہت ہے، اس لئے ہمیں پانی کی قدر معلوم نہیں، نل سے وضو کرتے ہیں، ہر آدمی ایک بالٹی پانی ضائع کرتا ہے، جبکہ ایک لوٹے سے کامل وضو ہوسکتا ہے، ایسا کرنا ٹھیک نہیں، یہ اسراف ہے اس سے بچنا چاہئے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اعضاء کو تین مرتبہ سے زیادہ دھونا اس وقت مکروہ ہے جب غسل کی تکمیل کی نیت سے دھوئے، تبرید یا تنظیف کے مقصد سے تین سے زیادہ مرتبہ دھونے میں مضائقہ نہیں، اور ایک مرتبہ دھونے کا اطلاق اس

وقت ہوگا جبکہ پورا عضو دھل جائے، اگر بعض عضو دھلا ہے تو اس کو پورا عضو دھونا نہیں کہیں گے۔

٤- كِتَابُ الْوُضُوْءِ

بسم الله الرحمن الرحيم

[١-] بابُ مَاجَاءَ فِي الْوُضُوْءِ

[١-] وَقَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى: ﴿ إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلاَةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾[المائدة: ٦]

[٢-] قَالَ أَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ: وَبَيَّنَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم أَنَّ فَرْضَ الْوُضُوْءِ مَرَّةً مَرَّةً، وَتَوَضَّأَ أَيْضًا مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ، وَثَلاَثًا ثَلاَثًا، وَلَمْ يَزِدْ عَلٰى ثَلاَثٍ، وَكَرِهَ أَهْلُ الْعِلْمِ الإِسْرَافَ فِيْهِ، وَأَنْ يُجَاوِزُوْا فِعْلَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

وضاحت: أن يُجاوزوا کا عطف الإسراف پر ہے اور أن مصدریہ ہے یعنی علماء پانی میں اسراف کو ناپسند کرتے ہیں اور نبی ﷺ کے فعل سے تجاوز کو بھی یعنی تین مرتبہ سے زیادہ دھونے کو بھی ناپسند کرتے ہیں۔

بابٌ: لاَ تُقْبَلُ صَلاَةٌ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ

پاکی کے بغیر نماز صحیح نہیں

نماز کی صحت کے لئے طہارت یعنی وضو اور غسل ضروری ہیں، اگر دونوں میں سے ایک بھی نہ ہو تو نماز صحیح نہیں ہوگی۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس شخص کی نماز قبول نہیں جو نئی بات پیدا کرے یہاں تک کہ وضو کرے، ایک شخص نے جو حضر موت کا تھا پوچھا: حضرت! نئی بات پیدا کرنا کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: پادنا یا گوز مارنا، ریح زیادہ مقدار میں خارج ہو تو فُساء ہے، اردو میں اس کو 'پاد' کہتے ہیں، اور تھوڑی ریح ضُراط کہلاتی ہے، اردو میں اس کو 'گوز' کہتے ہیں۔ مراد حدث اصغر ہے۔

تشریح:

۱- یہ حدیث آگے (حدیث ۱۷۶) بھی آرہی ہے، وہاں مضمون یہ ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو شخص مسجد میں نماز کا انتظار کرتا ہے وہ نماز میں شمار ہوتا ہے، جب تک نئی بات پیدا نہ کرے، ایک عجمی طالب علم نے پوچھا: حضرت! نئی بات پیدا کرنا کیا ہے؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: گوز مارنا نئی بات پیدا کرنا ہے ——— عام طور پر شارحین کا

خیال یہ ہے کہ مذکورہ سوال وجواب وہاں ہوئے ہیں، اس حدیث میں یہ سوال وجواب نہیں ہیں مگر دونوں جگہ سوال وجواب مان لیں تو حرج کچھ نہیں!

۲- قبول کے دو معنی ہیں: قبول بمعنی صحت اور قبول بمعنی رضا (پسندیدگی) مثلاً مسلم شریف میں حدیث ہے: مَن أَتَى عَرَّافًا فَسَأَلَه عن شيئٍ لَمْ تُقْبَلْ له صلوةُ أربعين ليلة: جو شخص کاہن کے پاس جائے اور اس سے غیب کی باتیں پوچھے اس کی نماز چالیس دن تک قبول نہیں کی جاتی (مشکوۃ حدیث ۴۵۹۵) اس میں قبول بمعنی رضا (پسندیدگی) ہے، اور یہاں حدیث میں قبول بمعنی صحت ہے۔

۳- اسحاق بن ابراہیم الحنظلی: یہ اسحاق بن راہویہ ہیں، جو بڑے مجتہد ہیں، ان کے والد کا نام ابراہیم ہے اور لقب راہویہ۔ یہ فارسی لفظ ہے، راہ کے معنی ہیں: راستہ، اور ویہ کے معنی ہیں: والا، راہویہ: یعنی راستہ والا، کہتے ہیں حضرت اسحاق کی دادی سفر حج پر جارہی تھیں کہ راستہ میں یہ بچہ پیدا ہوا اس لئے راہویہ (راستے والا) کے لقب سے معروف ہوا، عرب اس کو رَاهُوْيَه پڑھتے ہیں، کیونکہ واؤ سے پہلے ضمہ ہوتا ہے۔

جاننا چاہئے کہ عربی کے علاوہ ہر زبان کے ہر لفظ کا آخری حرف ساکن ہوتا ہے، فارسی میں صرف دو اعراب ہیں، ایک مضاف پر اور ایک موصوف پر باقی فارسی کے بھی تمام الفاظ آخر سے ساکن ہیں، راہ: الگ لفظ ہے اور وَیہ: الگ، مگر عرب اس کو نہیں سمجھتے وہ ملا کر پڑھتے ہیں اور واؤ سے پہلے ضمہ پڑھتے ہیں اور ہم لوگ رَاهْوَيْهْ پڑھتے ہیں، دونوں لفظوں کو ساکن کرتے ہیں اور حضرموت (بسکون الضاد) یمن کا ایک مشہور شہر ہے۔

[۲-] بابٌ: لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ

[۱۳۵-] حدثنا إِسْحَاقُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ الْحَنْظَلِيُّ، قَالَ: أَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ، قَالَ: أَنَا مَعْمَرٌ، عَنْ هَمَّامِ بْنِ مُنَبِّهٍ، أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُوْلُ: قَالَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: " لَا تُقْبَلُ صَلَاةُ مَنْ أَحْدَثَ حَتّٰى يَتَوَضَّأَ" قَالَ رَجُلٌ مِنْ حَضْرَ مَوْتَ: مَا الْحَدَثُ يا أَبَا هُرَيْرَةَ؟ قَالَ: فُسَاءٌ أَوْ ضُرَاطٌ. [انظر : ٦٩٥٤]

بابٌ: فَضلِ الوَضوءِ، وَالغُرُّ الْمُحَجَّلُوْنَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوْءِ

وضو کی فضیلت اور وضو کی برکت سے چہرے اور اعضاء کی چمک

وضو کی فضیلت میں ایک حدیث عبداللہ صنابحی رضی اللہ عنہ کی ہے جو تفصیل سے نسائی، ابن ماجہ اور موطا مالک میں ہے کہ جب مسلمان بندہ وضو کرتا ہے اور مضمضہ کرتا ہے تو گناہ اس کے منہ سے نکل جاتے ہیں۔ اور جب ناک صاف کرتا ہے تو گناہ ناک سے نکل جاتے ہیں، اور جب چہرہ دھوتا ہے تو چہرے سے یہاں تک کہ پلکوں کے نیچے سے گناہ

نکلتے ہیں اور جب ہاتھ دھوتا ہے تو ہاتھوں سے یہاں تک کہ ناخنوں سے گناہ نکلتے ہیں اور جب سر پر مسح کرتا ہے تو سر سے یہاں تک کہ کانوں سے گناہ نکلتے ہیں اور جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں سے یہاں تک کہ ناخنوں سے گناہ نکلتے ہیں۔ پھر اس کا مسجد جانا اور نماز پڑھنا مزید ثواب کا باعث ہوتا ہے۔

اور وضو کی دوسری فضیلت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے قیامت کے دن اعضاءِ وضو چمکیں گے ـــــ غُرَّۃ کے معنی ہیں: پیشانی کی سفیدی، اور غُرٌّ اور أَغَرٌّ کے معنی ہیں: روشن پیشانی، اسی لئے مہینہ کی پہلی تاریخ کو غُرَّۃُ الشَّھْرِ کہتے ہیں، نیا چاند مہینہ کی پیشانی کو روشن کرتا ہے، پہلے راتیں تاریک تھیں اب تھوڑی روشنی ہوئی ـــــ اور مُحَجَّلُوْن: تَحْجِیل سے اسم مفعول ہے، اس کے معنی ہیں: وہ گھوڑا جس کا رنگ سفید نہ ہو اور اس کے چاروں پیر سفید ہوں۔

حدیث: نُعیم مجمر کہتے ہیں: میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد کی چھت پر گیا، وہاں آپؓ نے وضو کیا، اور فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت قیامت کے دن بلائی جائے گی اس حال میں کہ وضو کی وجہ سے ان کے چہرے اور ہاتھ پاؤں چمک رہے ہونگے، لہٰذا تم میں سے جو اپنے اعضاء کی چمک کو لمبا کر سکے تو چاہئے کہ وہ ایسا کرے۔

تشریح:

۱- ترمذی میں یہ حدیث اس طرح ہے: میری امت قیامت کے دن سجدوں کی وجہ سے روشن چہرہ، وضو کی وجہ سے روشن اعضاء ہوگی، یعنی قیامت کے دن اس امت کی امتیازی نشانی یہ ہوگی کہ اس کے وہ اعضاء جو وضو میں دھوئے جاتے ہیں اور وہ اعضاء جو سجدے میں استعمال ہوتے ہیں: نماز اور وضو کی وجہ سے خاص طور پر روشن اور چمکدار ہونگے، اور ہر شخص پہچان لے گا کہ یہ آخری نبی کا امتی ہے۔

اور سابقہ امتوں میں بھی نماز اور وضو تھے پس ان کو بھی ان دونوں عملوں کا فائدہ پہنچے گا مگر وہ فائدہ کسی اور شکل میں ہوگا، اس حدیث میں جو فائدہ بیان کیا گیا ہے وہ اس امت کی خصوصیت ہے۔

۲- کبھی قرآن وحدیث میں فہم سامع پر اعتماد کر کے آدھا مضمون چھوڑ دیتے ہیں، جیسے ﴿بِیَدِكَ الْخَیْرُ﴾ (آل عمران آیت ۲۶) آپ کے ہاتھ میں خیر ہے، شر بھی اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، مگر فہم سامع پر اعتماد کر کے اس کو چھوڑ دیا، اس لئے کہ اس سے پہلے متقابلات آئے ہیں پس سامع خود یہ آدھا مضمون سمجھ لے گا۔ ترمذی شریف کی حدیث میں بھی دونوں مضمونوں میں سے آدھا بیان کیا ہے، اور باقی آدھا فہم سامع پر اعتماد کر کے چھوڑ دیا ہے، فرمایا: میری امت قیامت کے دن سجدوں کی وجہ سے روشن پیشانی ہوگی، اور صرف پیشانی ہی نہیں بلکہ دوسرے اعضاء بھی جو سجدے میں استعمال ہوتے ہیں روشن ہونگے، یہ آدھا مضمون چھوڑ دیا ہے، کیونکہ وہ اگلے مضمون کے ساتھ مقابلہ کرنے سے سمجھ میں آجائے گا اور دوسرا مضمون یہ ارشاد فرمایا کہ میری امت وضو کی وجہ سے روشن اعضاء ہوگی، یعنی ان کے ہاتھ پاؤں چمکتے ہونگے اور

صرف اعضاء ہی نہیں چہرہ اور سر بھی روشن ہونگے ، یہ آدھا مضمون چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ وہ پہلے مضمون کے ساتھ مقابلہ کرنے سے سمجھ میں آجائے گا، اور جو اعضاء سجدے میں بھی استعمال ہوتے ہیں اور وضو میں بھی دھوئے جاتے ہیں یعنی چہرہ، کفین اور قدمین ان میں دونوں عبادتوں کی برکتیں جمع ہونگی اس لئے ان کی چمک دوبالا ہوجائے گی۔

۳- اسی طرح مُعادلین میں سے ایک جگہ جو مضمون بیان کرتے ہیں اسے دوسری جگہ لے جاتے ہیں اور دوسری جگہ جو مضمون بیان کرتے ہیں اسے پہلی جگہ لاتے ہیں، جیسے سورۂ ہود (آیات ۱۰۶ و ۱۰۷) میں ہے: جو لوگ بدبخت ہوئے وہ دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم ہیں، ہاں اگر خدا ہی کو (نکالنا) منظور ہو تو دوسری بات ہے ﴿ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيْدُ ﴾ بیشک تیرا رب جو چاہتا ہے کر ڈالتا ہے، پھر جنتیوں کا تذکرہ ہے کہ نیک لوگوں کو ان کے اعمال کے صلہ میں جنت ملے گی، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم ہیں مگر جو چاہے تیرا رب کرسکتا ہے ﴿عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ﴾ مگر جنت کبھی ختم نہ ہونے والا صلہ ہے، یہ جملہ اوپر بھی جائے گا یعنی جہنم بھی کبھی ختم نہ ہونے والی سزا ہے، اور اوپر والا مضمون یہاں آئے گا یعنی جنتی جو جنت میں ہمیشہ رہیں گے وہ اللہ کی مرضی سے رہیں گے، اللہ تعالیٰ بے بس نہیں ہوجائیں گے، اسی طرح جہنمی جہنم میں جو ہمیشہ رہیں گے وہ بھی اللہ کی مرضی سے رہیں گے، اللہ تعالیٰ بے بس نہیں ہوجائیں گے۔ غرض: وہاں کا جملہ یہاں لانا ہے اور یہاں کا جملہ وہاں لے جانا ہے، تب بات مکمل ہوگی، جو لوگ یہ قاعدہ نہیں جانتے اور ﴿عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ﴾ والا مضمون اوپر نہیں لے جاتے انھوں نے یہ غلط رائے قائم کی کہ جہنم کسی دن ختم ہوجائے گی، اور جنت ہمیشہ رہے گی، ان کو یہ غلط فہمی یہ قاعدہ نہ جاننے کی وجہ سے ہوئی۔ اس قاعدہ کی رو سے بھی ترمذی شریف کی حدیث میں دونوں مضمونوں میں تبادلہ ہوگا، پس چہرہ اور اعضاء وضو کی وجہ سے بھی روشن ہونگے اور سجدوں کی وجہ سے بھی۔

۴- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ہاتھ مونڈھوں تک اور پاؤں گھٹنوں تک دھوئے، اس پر نُعیم مجمر کو حیرت ہوئی اور سوال کیا تو حضرت نے فرمایا: میں ہاتھ پاؤں مونڈھوں اور گھٹنوں تک اس لئے دھو رہا ہوں کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: قیامت کے دن وضو کی وجہ سے اعضاء چمکیں گے، میں چاہتا ہوں کہ میرے اعضاء زیادہ سے زیادہ چمکیں، اس لئے میں یہاں تک ہاتھ پاؤں دھو رہا ہوں، اسی کا نام ہے: إطالةُ الغُرَّة: چمک کو لمبا کرنا ——— ''پس جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے اعضاء زیادہ چمکیں تو وہ اس طرح کرے'' یہ ارشاد حضور ﷺ کا ہے یا حضرت ابو ہریرہؓ کا؟ ظاہر یہ ہے کہ یہ ابو ہریرہؓ کا قول ہے، کیونکہ یہ حضور ﷺ کا ارشاد ہوتا تو امت کا اس پر عمل ہوتا، میں نے بڑوں کو دیکھا ہے کوئی اس پر عمل نہیں کرتا تھا، یہ دلیل ہے کہ یہ حضرت ابو ہریرہؓ کا ارشاد ہے مرفوع حدیث نہیں۔

سوال: جب امام بخاری رحمہ اللہ الغُرُّ المحجَّلُون والی روایت باب میں لائے ہیں تو پھر باب میں ان دونوں لفظوں کا تذکرہ کیوں کیا؟

جواب: وضو کی فضیلت میں متعدد روایات ہیں مگر وہ امام بخاریؒ کے معیار کی نہیں، اس لئے حضرتؒ نے باب میں اضافہ کیا ہے، پھر اضافہ کو پیش نظر رکھ کر حدیث لائے ہیں، پس جب یہ جزء ثابت ہوگیا تو پہلا جزء بھی ثابت ہوگیا یعنی وضو کی اہمیت سمجھ میں آ گئی۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ الغر المحجلون إلخ ایک نسخہ میں ہے اس پر ن بنا ہوا ہے، ہر نسخہ میں یہ عبارت نہیں ہے، پس ان نسخوں کے لحاظ سے کوئی اعتراض نہیں۔

[۳-] بابٌ: فَضْلُ الْوُضُوْءِ، وَالْغُرُّ الْمُحَجَّلُوْنَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوْءِ

[۱۳۶-] حدثنا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ، قَالَ: ثَنَا اللَّيْثُ، عَنْ خَالِدٍ، عَنْ سَعِيْدِ بْنِ أَبِيْ هِلَالٍ، عَنْ نُعَيْمِ الْمُجْمِرِ قَالَ: رَقِيْتُ مَعَ أَبِيْ هُرَيْرَةَ عَلَى ظَهْرِ الْمَسْجِدِ فَتَوَضَّأَ، فَقَالَ: إِنِّيْ سَمِعْتُ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: "إِنَّ أُمَّتِيْ يُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرًّا مُحَجَّلِيْنَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوْءِ" فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يُطِيْلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ.

بابٌ لَايَتَوَضَّأُ مِنَ الشَّكِّ حَتّٰى يَسْتَيْقِنَ

شک سے وضو نہیں ٹوٹتا

اس باب میں یہ مسئلہ ہے کہ شک سے وضو نہیں ٹوٹتا، جب کسی ناقض کے پائے جانے کا یقین ہوجائے تب وضو ٹوٹے گا۔ بعض مرتبہ پیٹ میں قراقر ہوتا ہے، ہوا مبرز کے قریب آکر واپس لوٹ جاتی ہے، اس وقت شکی مزاج خیال کرتا ہے کہ شاید ہوا نکل گئی ہو، ایسے شک سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

حدیث: عباد بن تمیم اپنے چچا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس شخص کی شکایت کی جسے وہم ہوتا ہے کہ اس نے نماز میں کوئی چیز پائی یعنی جسے نماز پڑھتے ہوئے ہوا نکلنے کا شک ہوتا ہے، آپؐ نے فرمایا: وہ نماز سے نہ لوٹے تا آنکہ آواز سنے یا بدبو محسوس کرے، یعنی جب تک ہوا نکلنے کا یقین نہ ہو نماز نہ چھوڑے۔

تشریح:

۱- یہ حدیث قطع وساوس کے باب سے ہے، اس میں نقض وضو کی تمام صورتوں کا بیان نہیں، جب پیٹ میں قراقر ہوتا ہے اور ہوا مبرز کے قریب آکر لوٹ جاتی ہے تو شکی مزاج لوگوں کو خروج ریح کا گمان ہوتا ہے، یہ ارشاد ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے ان کو جب تک خروج ریح کا یقین نہ ہوجائے وضو نہیں ٹوٹتا، اور یقین کے بہت سے طریقے ہیں، ایک آواز

سننا ہے، دوسرا بدبو محسوس کرنا ہے، پس اگر کسی اور طریقہ سے خروج ریح کا یقین ہو جائے تو بھی وضو ٹوٹ جائے گا۔

۲- اس حدیث کو زہریؒ حضرت سعید سے بھی روایت کرتے ہیں اور عباد بن تمیم سے بھی۔ اور وہ دونوں عباد کے چچا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں —— عبداللہ بن زیدؓ نام کے دو صحابی ہیں، ایک کے دادا کا نام عاصم ہے یہ وضو والے عبداللہ ہیں، اور دوسرے کے دادا کا نام عبدربہ ہے وہ اذان والے عبداللہ ہیں۔

قولہ: شُکِیَ: کو مجہول بھی پڑھ سکتے ہیں اس صورت میں الرجلُ مرفوع ہوگا، اور معروف بھی پڑھ سکتے ہیں پس وہ منصوب ہوگا اور فاعل عبداللہ ہونگے —— اور خَیَّل تخییلا کے معنی ہیں: شک کرنا، وہم کرنا۔ خُیِّلَ: فعل مجہول ہے یعنی وہم ہوتا ہے۔

[٤-] بابٌ لَایَتَوَضَّأُ مِنَ الشَّكِّ حَتّٰی یَسْتَیْقِنَ

[١٣٧-] حدثنا عَلِیٌّ، قَالَ: ثَنَا سُفْیَانُ، قَالَ: ثَنَا الزُّهْرِیُّ، عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیِّبِ، وَعَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِیْمٍ، عَنْ عَمِّهِ، أَنَّهُ شَكٰی إِلٰی رسولِ اللهِ صلی الله علیه وسلم الرَّجُلَ الَّذِیْ یُخَیَّلُ إِلَیْهِ أَنَّهُ یَجِدُ الشَّیْئَ فِی الصَّلَاةِ؟ فَقَالَ: "لَا یَنْفَتِلُ - أَوْ: لَا یَنْصَرِفُ - حَتّٰی یَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ یَجِدَ رِیْحًا" [انظر: ١٧٧، ٢٠٥٦]

بابُ التَّخْفِیْفِ فِی الْوُضُوْءِ

وضو ہلکا کرنا

اس باب میں تخفیف فی المرات کا بیان ہے، یعنی اعضاء وضو کو ایک ایک مرتبہ یا دو دو مرتبہ دھونا، ہلکا وضو اس وقت کرنا چاہئے جب اس سے نماز نہ پڑھنی ہو، صرف باوضو رہنے کے لئے وضو کیا ہو، یا پانی میں قلت ہو، یا وضو پر وضو کرے تو ہلکا وضو کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حضور اقدس ﷺ سے یہ ثابت ہے۔

حدیث: پہلے گذری ہے اور آئندہ بھی آئے گی، یہ سفیان بن عیینہ کی حدیث ہے جس کو وہ عمرو بن دینار سے، وہ کریب سے اور وہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں: نبی ﷺ سوئے یہاں تک کہ خراٹے لینے لگے، پھر نماز پڑھی اور کبھی کہا: نبی ﷺ کروٹ پر لیٹے یہاں تک کہ خراٹے لینے لگے، پھر کھڑے ہوئے اور نماز پڑھی (تحویل) علی بن المدینی کہتے ہیں: پھر ابن عیینہ نے ہم سے بار بار یہ حدیث مذکورہ سند سے اس طرح بیان کی: ابن عباسؓ کہتے ہیں: میں نے ایک رات اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر گذاری جب رات کا کچھ حصہ گذر گیا تو نبی ﷺ کھڑے ہوئے، اور آپؐ نے ایک مشکیزہ سے جو لٹک رہا تھا ہلکا وضو فرمایا (سفیان کہتے ہیں) عمرو بن دینار اس کو ہلکا کرتے تھے اور کم کرتے تھے یعنی عمرو بن دینار نے ہلکا وضو کر کے تلامذہ کو دکھایا۔ شارحین نے لکھا ہے کہ یہ تخفیف

فی المرات تھی یعنی اعضاء کوایک ایک مرتبہ یا دو دو مرتبہ دھویا پھر آپؐ نے کھڑے ہوکر نماز شروع فرمائی (ابن عباسؓ کہتے ہیں) میں نے بھی آپؐ کی طرح وضو کیا، پھر آپ کی بائیں طرف کھڑا ہوگیا، سفیان کبھی یسارہ کے بجائے شمالہ کہتے تھے (مطلب دونوں کا ایک ہے) پس آپؐ نے مجھے گھمایا اور اپنی دائیں جانب لے لیا، پھر آپؐ نے نماز پڑھی جتنا اللہ نے چاہا، پھر کروٹ پر لیٹ گئے، اور سو گئے یہاں تک کہ خراٹے لینے لگے۔ پھر مؤذن نے آکر نماز کی اطلاع دی تو آپؐ اس کے ساتھ نماز کے لئے تشریف لے گئے اور نماز پڑھائی اور نیا وضو نہیں کیا۔

نوم انبیاء ناقض وضو نہیں:

طلبہ نے عمرو بن دینار سے کہا: لوگ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کی آنکھیں سوتی ہیں، دل نہیں سوتا، یعنی لوگوں میں جو مشہور ہے کہ انبیاء کی نیند ناقضِ وضو نہیں، اس کی دلیل یہ حدیث ہے۔ عمرو بن دینار نے کہا جی ہاں! اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے، پھر فرمایا: میں نے عبید بن عُمیر سے سنا ہے کہ انبیاء کا خواب وحی ہوتا ہے، پس انبیاء کی نیند ناقض وضو کیسے ہوسکتی ہے؟ کیونکہ اگر انبیاء غافل سوئیں گے تو وحی کیسے اخذ کریں گے، چوکنا سوئیں گے جبھی وحی اخذ کریں گے۔ اور چوکنا سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، امت چوکنا سوئے تو اس کا بھی وضو نہیں ٹوٹتا، اور امت کے چوکنا سونے کی صورت یہ ہے کہ کھڑے کھڑے یا رکوع، سجدہ اور قعدہ کی حالت میں سوئے یا مقعد زمین پر جما کر سوئے، یہ چوکنا سونا ہے، اس طرح سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اور ٹیک لگا کر سونا، یا چت لیٹ کر یا کروٹ پر سونا غفلت والا سونا ہے پس وہ ناقض وضو ہے۔

پھر عبید بن عُمیر نے سورۂ صافات کی آیت (۱۰۲) تلاوت فرمائی: ''اے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں'' پھر آپؐ نے حکم کی تعمیل کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ خواب تین مرتبہ دیکھا تھا۔

فائدہ: یہ حدیث مختلف طرح سے آئی ہے، یہاں یہ ہے کہ آپؐ نے رات میں بیدار ہونے کے بعد ہلکا وضو کیا اور آگے حدیث (نمبر ۱۸۳) میں ہے کہ کامل وضو کیا، میرا رجحان یہ ہے کہ جب آپؐ تہجد کے لئے بیدار ہوئے ہیں تو کامل وضو کیا ہے پھر دورانِ تہجد جب آپؐ سوئے ہیں تو اٹھ کر ہلکا وضو کیا ہے، کیونکہ یہ وضو پر وضو تھا۔ پھر فجر کی سنتیں پڑھ کر سو گئے، اور جب اطلاع دی گئی تو نماز پڑھانے کے لئے تشریف لے گئے اور وضو نہیں فرمایا، اس لئے کہ انبیاء کی نیند ناقض وضو نہیں۔

[۵-] بابُ التَّخْفِيْفِ فِي الْوُضُوْءِ

[۱۳۸-] حدثنا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: ثَنَا سُفْيَانُ، عَنْ عَمْرٍو، قَالَ: أَخْبَرَنِي كُرَيْبٌ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم نَامَ حَتّٰى نَفَخَ، ثُمَّ صَلّٰى، وَرُبَّمَا قَالَ: اضْطَجَعَ حَتّٰى نَفَخَ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى ح: ثُمَّ حَدَّثَنَا بِهِ سُفْيَانُ مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ عَنْ عَمْرٍو، عَنْ كُرَيْبٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: بِتُّ عِنْدَ خَالَتِي مَيْمُوْنَةَ لَيْلَةً

فَقَامَ النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم مِنَ اللَّیْلِ، فَلَمَّا کَانَ فِیْ بَعْضِ اللَّیْلِ قَامَ رسولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فَتَوَضَّأ. ثُمَّ جِئْتُ فَقُمْتُ عَنْ یَسَارِہِ – وَرُبَّمَا قَالَ سُفْیَانُ: عَنْ شِمَالِہِ.– فَحَوَّلَنِیْ فَجَعَلَنِیْ عَنْ یَمِیْنِہِ، ثُمَّ صَلّٰی مَاشَاءَ اللّٰہُ، ثُمَّ اضْطَجَعَ فَنَامَ حَتّٰی نَفَخَ ثُمَّ أَتَاہُ الْمُنَادِیْ فَآذَنَہُ بِالصَّلاَۃِ، فَقَامَ مَعَہُ إِلَی الصَّلاَۃِ، فَصَلّٰی وَلَمْ یَتَوَضَّأْ.

قُلْنَا لِعَمْرٍو: إِنَّ نَاسًا یَقُوْلُوْنَ إِنَّ رسولَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم تَنَامُ عَیْنُہُ وَلاَ یَنَامُ قَلْبُہُ قَالَ عَمْرٌو: سَمِعْتُ عُبَیْدَ بْنَ عُمَیْرٍ یَقُوْلُ: رُؤْیَا الأَنْبِیَاءِ وَحْیٌ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿إِنِّیْ أَرٰی فِی الْمَنَامِ أَنِّیْ أَذْبَحُکَ﴾ [الصافات: ۱۰۲] [راجع: ۱۱۷]

بَابُ إِسْبَاغِ الْوُضُوْءِ

کامل وضو کرنے کا بیان

اِسباغ (افعال) مصدر ہے، اس کے معنی ہیں: کامل کرنا، اگر وضو پر وضو کرے یا صرف باوضو رہنے کے لئے وضو کرے یا پانی میں قلت ہو تو ہلکا وضو کرنے کی گنجائش ہے، ورنہ عام حالات میں کامل وضو کرنا چاہئے۔

حدیث: حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ عرفہ سے روانہ ہوئے، یہاں تک کہ جب آپؐ گھاٹی میں پہنچے تو سواری سے اترے، اور پیشاب فرمایا، پھر وضو کیا مگر کامل وضو نہیں کیا، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! نماز کا ارادہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نماز تیرے آگے ہے، یعنی مزدلفہ میں جا کر نماز پڑھیں گے، پھر آپؐ سوار ہو کر چلے جب مزدلفہ میں آئے تو آپؐ نے وضو کیا اور کامل وضو کیا، پھر نماز کے لئے اقامت کہی گئی آپؐ نے مغرب پڑھائی، پھر ہر آدمی نے اپنے اونٹوں کو ان کی جگہوں میں بٹھایا، پھر عشاء کے لئے تکبیر کہی گئی پس آپؐ نے عشاء کی نماز پڑھائی، اور مغرب اور عشاء کے درمیان نوافل نہیں پڑھے۔

تشریح: آپؐ نے عرفہ سے واپسی میں کسی گھاٹی میں پیشاب کیا پھر ہلکا وضو کیا، یعنی اعضاء ایک ایک مرتبہ دھوئے، پھر مزدلفہ پہنچ کر کامل وضو فرمایا، پھر نماز پڑھائی، اور مغرب اور عشاء کے درمیان اتنا فاصلہ رکھا کہ لوگ جانوروں پر سے سامان اتار سکیں اور جانوروں کا گھاس چارہ کر سکیں، اور آپؐ نے مغرب اور عشاء کے درمیان نفل نہیں پڑھے۔

اور حدیث کا باب سے انطباق یہ ہے کہ آپؐ نے راستہ میں جو وضو فرمایا تھا وہ باوضو رہنے کے لئے تھا، اس لئے آپؐ نے ہلکا وضو کیا تھا، پھر مزدلفہ میں کامل وضو کیا۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسباغ کے معنی انقاء (صفائی) کے کئے ہیں، یہ تفسیر باللازم ہے، ورنہ اسباغ کا اصل مفہوم اعضاء مغسولہ کو تین تین مرتبہ دھونا ہے، ظاہر ہے جب اعضاء تین تین بار دھوئے جائیں گے تو صاف

ہوجائیں گے۔ پس یہ تفسیر باللازم ہے اور اگر تین مرتبہ دھونے کے بعد بھی اعضاء صاف نہ ہوں تو زائد بھی دھوسکتا ہے خود ابن عمرؓ سے ابن المنذر رنے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ وہ پیروں کو سات مرتبہ دھوتے تھے۔

فائدہ: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں مغرب وعشاء کے درمیان بالقصد نفل نہیں پڑھے تھے، تاکہ کوئی ان کو ضروری نہ سمجھ لے۔

[٦-] بابُ إِسْبَاغِ الْوُضُوْءِ

وَقَدْ قَالَ ابْنُ عُمَرَ: إِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ الإِنْقَاءُ.

[١٣٩-] حدثنا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ، عَنْ مَالِكٍ، عَنْ مُوْسَى بْنِ عُقْبَةَ، عَنْ كُرَيْبٍ مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ، أَنَّهُ سَمِعَهُ يَقُوْلُ: دَفَعَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم مِنْ عَرَفَةَ حَتّٰى إِذَا كَانَ بِالشِّعْبِ نَزَلَ فَبَالَ ثُمَّ تَوَضَّأَ وَلَمْ يُسْبِغِ الْوُضُوْءَ فَقُلْتُ: الصَّلَاةَ يَارسولَ اللّٰهِ! فَقَالَ: "الصَّلَاةُ أَمَامَكَ" فَرَكِبَ فَلَمَّا جَاءَ الْمُزْدَلِفَةَ نَزَلَ فَتَوَضَّأَ فَأَسْبَغَ الْوُضُوْءَ، ثُمَّ أُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَصَلَّى الْمَغْرِبَ ثُمَّ أَنَاخَ كُلُّ إِنْسَانٍ بَعِيْرَهُ فِيْ مَنْزِلِهِ، ثُمَّ أُقِيْمَتِ الْعِشَاءُ فَصَلّٰى وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا. [انظر: ١٨١، ١٦٦٧، ١٦٦٩، ١٦٧٢]

بابُ غَسْلِ الْوَجْهِ بِالْيَدَيْنِ مِنْ غُرْفَةٍ وَاحِدَةٍ

ایک چلو پانی لے کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ دھونا

اس باب میں تخفیف فی الماء کا بیان ہے۔ وضو میں اسراف جائز نہیں، ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے لوگوں کو وضو کر کے دکھایا، چہرہ دھونے کے لئے ایک چلو میں پانی لیا پھر اس کے ساتھ دوسرا ہاتھ ملایا اور چہرہ دھویا، ہم چہرہ دھونے کے لئے لب بھر کر پانی لیتے ہیں۔ ایک لب میں چار چلو پانی آتا ہے، مگر ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا کہ ہم پانی زیادہ استعمال کر رہے ہیں، کیونکہ ہم ایسے علاقہ میں رہتے ہیں جہاں پانی بکثرت ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وضو کر رہے تھے اور اسراف کر رہے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گذر ہوا، آپؐ نے فرمایا: اے سعد! یہ اسراف کیسا؟ انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا وضو میں بھی اسراف ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں اگرچہ تم جاری نہر پر وضو کرو (مشکوۃ حدیث ۴۲۷)

حدیث: عطاء بن یسار کہتے ہیں: ابن عباسؓ نے وضو کیا، پس اپنا چہرہ دھویا، ایک چلو پانی لیا اور اس سے مضمضہ اور استنشاق کیا یعنی وصل کیا، پھر ایک چلو پانی لیا اور اس طرح اس کے ساتھ اپنا دوسرا ہاتھ ملایا، اور اس سے چہرہ دھویا، پھر ایک چلو پانی لیا، اور اس سے اپنا دایاں ہاتھ دھویا، پھر ایک چلو پانی لیا اور اس سے اپنا بایاں ہاتھ دھویا، پھر سر پر مسح کیا، پھر

ایک چلو پانی لیا اوراس کو دائیں پاؤں پر ڈالا، اوراس کو دھویا (یہاں رَشَّ بمعنی غَسَلَ ہے) پھر دوسرا چلو لیا۔ اوراس سے اپنا بایاں پاؤں دھویا، پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس طرح وضو کرتے دیکھا ہے، یعنی لوگوں کو عمل کر کے دکھایا، کیونکہ تعلیم فعلی اوقع فی النفس ہوتی ہے۔

[۷-] بابُ غَسْلِ الْوَجْهِ بِالْيَدَيْنِ مِنْ غُرْفَةٍ وَاحِدَةٍ

[۱٤٠-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحِيْمِ قَالَ: أَنَا أَبُوْ سَلَمَةَ الْخُزَاعِيُّ مَنْصُوْرُ بْنُ سَلَمَةَ، قَالَ: أَنَا ابْنُ بِلَالٍ يَعْنِيْ سُلَيْمَانَ، عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّهُ تَوَضَّأَ فَغَسَلَ وَجْهَهُ، أَخَذَ غَرْفَةً مِنْ مَاءٍ فَمَضْمَضَ بِهَا وَاسْتَنْشَقَ، ثُمَّ أَخَذَ غَرْفَةً مِنْ مَاءٍ فَجَعَلَ بِهَا هٰكَذَا أَضَافَهَا إِلٰى يَدِهِ الْأُخْرٰى، فَغَسَلَ بِهَا وَجْهَهُ ثُمَّ أَخَذَ غَرْفَةً مِنْ مَاءٍ فَغَسَلَ بِهَا يَدَهُ الْيُمْنٰى، ثُمَّ أَخَذَ غَرْفَةً مِنْ مَاءٍ فَغَسَلَ بِهَا يَدَهُ الْيُسْرٰى، ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ ثُمَّ أَخَذَ غَرْفَةً مِنْ مَاءٍ فَرَشَّ عَلٰى رِجْلِهِ الْيُمْنٰى حَتّٰى غَسَلَهَا، ثُمَّ أَخَذَ غَرْفَةً أُخْرَى فَغَسَلَ بِهَا رِجْلَهُ يَعْنِيْ الْيُسْرٰى، ثُمَّ قَالَ: هٰكَذَا رَأَيْتُ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَتَوَضَّأُ.

بابُ التَّسْمِيَةِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ، وَعِنْدَ الْوِقَاعِ

ہر حال میں بسم اللہ پڑھنا اور بیوی کے ساتھ مقاربت کے وقت بھی

وضو سے پہلے بسم اللہ پڑھنی چاہئے، تسمیہ کو خواہ سنت کہو یا مستحب یا ادب، بہر حال بسم اللہ پڑھنی چاہئے۔ تسمیہ علی الوضو کے سلسلہ میں روایتیں ہیں۔ خاص حدیث بھی ہے اور عام حدیث بھی، مشہور حدیث ہے: كل أمرٍ ذی بالٍ لم يُبدَأ ببسم الله فهو أقطع: کوئی بھی اہم کام اگر اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے تو وہ ناقص ہے، اور وضو بھی اہم کام ہے اس لئے اس کو بھی بسم اللہ سے شروع کرنا چاہئے، یہ عمومی حدیث ہے، اور خصوصی حدیث ترمذی شریف میں تسمیہ فی الوضو کے باب میں ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: لا وضو لمن لم يذكر اسم الله عليه: اس شخص کی وضو نہیں جو اس پر اللہ کا نام نہ لے، اس کے علاوہ اور بھی حدیثیں ہیں مگر کوئی حدیث بخاری شریف میں لانے کے قابل نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ ترجمۃ الباب میں ضعیف حدیث لاتے ہیں مگر ہلکی ضعیف لاتے ہیں، بہت زیادہ ضعیف تعلیقاً بھی نہیں لاتے اور ترمذی میں امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ میں تسمیہ علی الوضو کے سلسلہ میں کوئی حدیث نہیں جانتا جس کی سند اچھی ہو۔ اور خصوصی حدیث محکم الدلالہ بھی نہیں، یعنی تسمیہ علی الوضو کے سلسلہ میں صریح بھی نہیں، کیونکہ ربیعۃ الرائے اور شاہ ولی اللہ صاحبان رحمہما اللہ نے اس سے نیت مراد لی ہے۔

غرض: کوئی روایت بخاری شریف میں لانے کے قابل نہیں، ایسی جگہ امام بخاری رحمہ اللہ باب میں اضافہ کرتے

ہیں پھر اضافہ کو دلیل سے ثابت کرتے ہیں اس طرح اصل مدعیٰ خود بخود ثابت ہوجاتا ہے، یہاں بھی ایسا ہی کیا ہے، پہلے ایک کلیہ بنایا پھر اس کلیہ کی ایک جزئی لائے اور اس جزئی کو دلیل سے ثابت کیا، پس وہی حکم کلی کے ہر فرد کے لئے ثابت ہوگا، اور اس کلیہ کے افراد میں تسمیہ علی الوضو بھی ہے اس لئے اس کے لیے بھی یہ حکم ثابت ہوگا۔ پہلے یہ کلیہ ذکر کیا کہ ہر حال میں تسمیہ چاہئے پھر اس کا ایک فرد لائے کہ بیوی سے مقاربت کے وقت بھی تسمیہ چاہئے، پھر اس جزئی کو حدیث سے ثابت کیا تو کلی کے ہر فرد کے لئے حکم ثابت ہوگیا۔

دوسری تقریر: حدیث سے عند الجماع تسمیہ ثابت ہے، جب کہ بوقت جماع خاموش رہنے کا حکم ہے، اور جماع کوئی عبادت بھی نہیں، اس کے باوجود حدیث سے تسمیہ ثابت ہے اور وضو تو عبادت ہے اور اس وقت خاموش رہنے کا حکم بھی نہیں، پس وضو سے پہلے تسمیہ بدرجۂ اولیٰ ثابت ہوگا۔ یہ استدلال بدلالۃ النص ہے۔

فائدہ: ہر اہم کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنی چاہئے، اور صرف ''بسم اللہ'' کہنا بھی کافی ہے اور پوری بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، مگر معمول نبوی یہ تھا کہ بسم اللہ کے ساتھ موقع کی مناسبت سے واوِ عطف کے ساتھ یا اس کے بغیر دوسرا جملہ ملاتے تھے، جیسے جانور ذبح کرنے کا تسمیہ ہے بسم الله والله أكبر: (مشکوٰۃ حدیث ۱۴۶۱) اور کھانے کا تسمیہ ہے: بسم الله وعلى بركة الله (مستدرک حاکم ۴:۱۰۷ کنز العمال ۱۵:۲۵۶ حدیث ۴۰۸۴۵) اور وضو کا تسمیہ طبرانی کی معجم صغیر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں: بسم الله والحمد لله آیا ہے۔ اور حدیث کی سند اچھی ہے (معارف السنن ۱:۱۵۷)

اور ذبح کے تسمیہ میں اللہ اکبر ملانے کی حکمت یہ ہے کہ ذابح اس زعم میں مبتلا نہ ہوجائے کہ میں زبردست ہوں، زبردست اللہ تعالیٰ ہیں اور وضو کے تسمیہ میں الحمد للہ ملانے کی حکمت یہ ہے کہ اللہ نے وضو کی توفیق دی اس پر اللہ کا شکر بجالانا چاہئے۔ اور کھاتے وقت برکت کی دعا کی حکمت واضح ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس گیا اور اس نے یہ دعا پڑھی: اے اللہ: ہمیں شیطان سے بچا اور شیطان کو ہم سے بچا، اور اس اولاد سے بچا جو (اس صحبت سے) آپ ہمیں عنایت فرمائیں، پس اگر ان کے لئے اولاد کا فیصلہ کیا گیا تو اس بچے کو شیطان ضرر نہیں پہنچا سکے گا۔

تشریح: میاں بیوی با اختیار، عاقل و بالغ ہیں وہ اپنے کسب و اختیار سے شیطان سے بچ سکتے ہیں اس لئے یہ دعا کی: ''اے اللہ! ہمیں شیطان سے بچا'' یعنی خود میاں بیوی کی ذمہ داری ہے کہ وہ شیطان سے بچیں، صحبت کرتے وقت کوئی نامناسب کام (شیطانی کام) نہ کریں، اور اولاد چونکہ بے اختیار ہے اس کے پاس عقل و خرد نہیں اس لئے تعبیر بدلی: ''اور بچا شیطان کو اس اولاد سے جو آپ ہمیں عنایت فرمائیں'' یعنی شیطان اس کو ضرر نہ پہنچائے۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو شیطان اس کو چونکا مارتا ہے، غیر محسوس طریقہ پر اس کو نقصان پہنچاتا ہے، جیسے بعض بچے پیدا

ہونے کے بعد سوکھنے لگتے ہیں اردو میں اس کو ہوا لگنا کہتے ہیں، اور عاملوں کی اصطلاح میں ام الصبیان کہتے ہیں یہ شیطان کے مَس (چھونے) کا اثر ہے۔ اگر صحبت سے پہلے میاں بیوی یہ دعا پڑھ لیں تو اولاد شیطان کے ضرر سے محفوظ رہے گی۔

[۸-] بابُ التَّسْمِيَةِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ، وَعِنْدَ الْوِقَاعِ

[۱۴۱-] حدثنا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: ثَنَا جَرِيْرٌ، عَنْ مَنْصُوْرٍ، عَنْ سَالِمِ بْنِ أَبِي الْجَعْدِ، عَنْ كُرَيْبٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: يَبْلُغُ بِهِ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: " لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا أَتَى أَهْلَهُ قَالَ: بِسْمِ اللهِ اللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ، وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَارَزَقْتَنَا، فَقُضِيَ بَيْنَهُمَا وَلَدٌ لَمْ يَضُرَّهُ". [انظر: ۳۲۷۱، ۳۲۸۳، ۵۱۶۵، ۶۳۸۸، ۷۳۹۶]

قوله: يبلُغ به النبيَّ: ابن عباسؓ پہنچتے ہیں اس حدیث کے ساتھ نبی ﷺ تک یعنی حدیث مرفوع ہے، مگر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ حدیث نبی ﷺ سے براہ راست سنی ہے یا کسی صحابی کے واسطہ سے؟ اس پر اس جملہ کی کوئی دلالت نہیں۔

بابُ مَايَقُوْلُ عِنْدَ الْخَلاءِ

بیت الخلاء جانے کی دعا

جب ہر حال میں تسمیہ مطلوب ہے تو بیت الخلاء جاتے وقت بھی تسمیہ چاہئے، اور اس خاص موقعہ کا تسمیہ الگ ہے۔ لوگ عام طور پر وضو سے پہلے استنجا کرتے ہیں اس لئے یہاں یہ ابواب لائے ہیں۔

بیت الخلاء جانے کی دعا: اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ: الخبث کی ب پر ضمہ اور جزم دونوں جائز ہیں، ضمہ کی صورت میں خبیث کی جمع ہے اور مراد مذکر شیاطین ہیں، اور خبائث سے مراد مؤنث شیاطین ہیں اور دعا کا ترجمہ یہ ہے: اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں مذکر و مؤنث شریر جنات سے! اور الخُبْث (بالسکون) مصدر ہے، اس کے معنی ہیں: گندگی، ناپاکی، اب دعا کا ترجمہ ہے: اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں گندگی سے اور شریر مذکر و مؤنث جنات سے، اس صورت میں مذکر شیاطین مؤنث شیاطین کے تابع ہونگے۔

مؤنث کو مذکر کے تابع کرنا تو عام بات ہے مگر کبھی مذکر کو بھی مؤنث کے تابع کرتے ہیں، جیسے زنا کے باب میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ﴾ اس ارشاد میں عورت کو مقدم کیا ہے اور مرد کو تابع، اور چوری کے باب میں ارشاد ہے: ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ﴾ اس میں مرد کو مقدم کیا ہے اور عوت کو تابع۔ اس لئے کہ زنا کے وجود میں عورت کا دخل زیادہ ہوتا ہے، اگر عورت راضی نہ ہو تو زنا مشکل ہے، زبردستی کی بات اور ہے، اور چوری مرد زیادہ کرتے ہیں اس لئے مرد

کومقدم کیا، معلوم ہوا کہ کبھی مذکر کو بھی مؤنث کے تابع کرتے ہیں، اسی طرح یہاں بھی مذکر: مؤنث کے تابع ہوجائیں گے، اور خبائث سے دونوں کو مراد لیا جائے گا۔

دعا کی حکمت: جنات ہم کو دیکھتے ہیں اگرچہ ہم ان کو نہیں دیکھتے اور جب بھی شرارت کا موقع آتا ہے تو اس کو شیاطین ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اس لئے ان کی شرارت سے بچنے کے لئے یہ دعا تلقین فرمائی، ترمذی کتاب الصلوٰۃ کے آخر میں یہ حدیث ہے کہ جب انسان بسم اللہ کہہ کر بیت الخلاء جاتا ہے تو شیاطین کو انسان کی شرم گاہ نظر نہیں آتی، پردہ پڑجاتا ہے، اور وہ کھلواڑ نہیں کرسکتے ہیں۔

سوال: اس دعا میں تسمیہ کا ذکر نہیں جبکہ مسئلہ یہ بیان کرنا ہے کہ بیت الخلاء جاتے وقت بسم اللہ پڑھنی چاہئے؟

جواب: تسمیہ کا ذکر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے جو ترمذی میں کتاب الصلوٰۃ کے آخر میں ہے، وہ حدیث یہاں بھی لانی چاہئے تھی، یعنی بیت الخلاء جاتے وقت بسم اللہ کہہ کر یہ دعا پڑھے، اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اللّٰہم: تسمیہ کے قائم مقام ہے۔

مسائل: بیت الخلاء جاتے وقت اور نکلتے وقت حدیثوں میں جو دعائیں آئی ہیں وہ باہر پڑھ کر بیت الخلاء میں جانا چاہئے، اور بعد کی دعا باہر نکل کر پڑھنی چاہئے۔ اور جنگل میں قضائے حاجت کے لئے جائے تو ستر کھولنے سے پہلے اور ستر باندھنے کے بعد پڑھے —— اور اگر کوئی شخص باہر دعا پڑھنا بھول جائے اور اندر جانے کے بعد یاد آئے تو اگر بیت الخلاء صاف ستھرا ہے جیسے فلش، اس میں بالفعل گندگی نہیں ہوتی پس وہ جنگل کے حکم میں ہے، ستر کھولنے سے پہلے دعا پڑھ سکتا ہے۔ اور بعد کی دعا باہر نکل کر پڑھنی چاہئے، کیونکہ استنجے کے بعد بیت الخلاء میں بدبو ہوتی ہے —— اور اگر بیت الخلاء میں بالفعل گندگی ہے یا صفائی نہ ہونے کی وجہ سے بدبو ہے تو دعا دل میں پڑھے زبان سے نہ پڑھے، کیونکہ گندگی کے قریب اللہ کا ذکر مکروہ ہے۔

ملحوظہ: الخَلاء: کے معنی ہیں: خالی جگہ اس میں لفظ 'بیت' اردو والوں نے بڑھایا ہے تاکہ جو شخص لفظ خلاء کو نہیں سمجھتا وہ سمجھ لے، جیسے زم زم پر لفظ آب بڑھایا حالانکہ آب اور زم زم ایک ہیں، پھر آب بھی فارسی لفظ ہے جس کو عام طور پر لوگ نہیں سمجھتے اس لئے انھوں نے لفظ 'پانی' بڑھایا، وہ کہتے ہیں: آبِ زم زم کا پانی —— اسی طرح عربی میں لفظ الخلاء کے ساتھ بیت بڑھانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ الخلاء کے معنی بیت الخلاء ہیں۔

[۹-] بابُ مَایَقُوْلُ عِنْدَ الْخَلاَءِ

[۱۴۲-] حدثنا آدمُ قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ عَبْدِ الْعَزِیْزِ بْنِ صُهَیْبٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَنَساً یَقُوْلُ: کَانَ النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم إِذَا دَخَلَ الْخَلاَءَ قَالَ: "اللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ"

تَابَعَهُ ابْنُ عَرْعَرَةَ، عَنْ شُعْبَةَ، وَقَالَ غُنْدَرٌ، عَنْ شُعْبَةَ: "إِذَا أَتَى الْخَلَاءَ" وَقَالَ مُوْسَى، عَنْ حَمَّادٍ: "إِذَا دَخَلَ" وَقَالَ سَعِيْدُ بْنُ زَيْدٍ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ: "إِذَا أَرَادَ أَنْ يَدْخُلَ" [انظر: ۶۳۲۲]

وضاحت: یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہے، ان سے عبدالعزیز بن صہیب روایت کرتے ہیں، پھر عبد العزیز سے تین حضرات روایت کرتے ہیں: شعبہؒ، حماد بن زیدؒ اور سعید بن زیدؒ، ان تینوں حضرات کے الفاظ میں معمولی فرق ہے۔

پھر شعبہ رحمہ اللہ سے تین تلامذہ روایت کرتے ہیں: آدم، ابن عرعرۃ اور غندر، آدم کے الفاظ ہیں: إذا دَخَلَ الخلاء: اور ابن عرعرۃ ان کے متابع ہیں یعنی ان کے الفاظ بھی یہی ہیں، اور غندر کے الفاظ ہیں: إذا دخل الخلاء، مگر اس اختلاف سے معنی پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

اور عبدالعزیز کے دوسرے شاگرد حماد بن زید کے الفاظ بھی یہی ہیں: إذا دخل الخلاء ——— اور تیسرے شاگرد سعید بن زید کے الفاظ ہیں: إذا أراد أن يَدْخُلَ۔

ملحوظہ: حماد بن زید بڑے محدث اور مضبوط راوی ہیں، اور سعید بن زید ان کے بھائی ہیں اور ذرا ضعیف ہیں، متکلم فیہ راوی ہیں۔ بخاری شریف میں صرف اسی ایک جگہ تعلیقاً ان کی روایت آئی ہے، اور وہ بھی اس وجہ سے لائے ہیں کہ وہ حدیث کے الفاظ کے ساتھ متفرد نہیں، عبدالوارث نے بھی عبدالعزیز سے انہی الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے، ان کی روایت: بیہقی میں ہے اور علی شرط الشیخین ہے ——— اور سعید بن زید کی حدیث کے جو الفاظ ہیں اس سے مسئلہ طے ہو گیا کہ بیت الخلاء میں داخل ہونے سے پہلے یہ دعا پڑھنی چاہئے، البتہ اگر باہر دعا پڑھنا بھول جائے اور فلش صاف ستھرا ہو نہ وہاں بالفعل گندگی ہو نہ بدبو ہو تو کپڑا کھولنے سے پہلے وہاں بھی دعا پڑھ سکتا ہے، آج کل کے فلش جنگل کے حکم میں ہیں۔

ملحوظہ: حماد بن زید (متوفی ۱۶۷ھ) کے بارے میں حاشیہ میں لکھا ہے کہ وہ ابدال میں سے تھے، اور انھوں نے اولاد کی طلب میں ستر نکاح کئے تھے مگر کوئی اولاد نہ ہوئی، کیونکہ ابدال کے یہاں اولاد نہیں ہوتی، ورنہ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا دعویدار ہوگا کہ میں بدل بنوں، جب کہ بیٹے میں ابدال کے اوصاف ہونے ضروری نہیں۔

بَابُ وَضْعِ الْمَاءِ عِنْدَ الْخَلَاءِ

بیت الخلاء میں پانی رکھنا

کوئی بیت الخلاء گیا، اس کے خادم نے وضو کے لئے پانی رکھا تو یہ جائز ہے، حدیث سے اس کا ثبوت ہے، اور بیت الخلاء میں استنجے کے لئے پانی رکھنا بھی جائز ہے۔ حدیث سے اس کا بھی ثبوت ہے۔

حدیث: پہلے گذری ہے، آنحضور ﷺ استنجے کے لئے تشریف لے گئے، حضرت ابن عباسؓ نے سوچا: آپؐ بیت الخلاء سے نکل کر وضو فرمائیں گے، اس لئے انھوں نے وضو کا پانی رکھ دیا، جب آپؐ بیت الخلاء سے باہر آئے، اور وضو کا پانی رکھا ہوا دیکھا تو پوچھا: کس نے پانی رکھا ہے؟ بتایا گیا کہ ابن عباسؓ نے رکھا ہے۔ آپؐ خوش ہوئے اور دعا دی: ''اے اللہ! اس کو دین کی سمجھ عطا فرما'' چنانچہ وہ دعائے نبوی کی برکت سے حبر الامۃ (بڑے عالم) بنے۔ حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما جیسی شخصیات نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے ـــــ اور وضو کے لئے پانی رکھنا وضو میں استعانت نہیں، متعلقاتِ وضو میں استعانت ہے جس میں کوئی حرج نہیں۔

[۱۰-] بابُ وَضْعِ الْمَاءِ عِنْدَ الْخَلاَءِ

[۱۴۳-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ، قَالَ: ثَنَا هَاشِمُ بْنُ الْقَاسِمِ، قَالَ: ثَنَا وَرْقَاءُ، عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِىْ يَزِيْدَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم دَخَلَ الْخَلاَءَ، فَوَضَعْتُ لَهُ وَضُوْءً ا، قَالَ: " مَنْ وَضَعَ هٰذَا؟" فَأُخْبِرَ، فَقَالَ: " اللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِى الدِّيْنِ". [راجع: ۷۵]

بابٌ لاَ تُسْتَقْبَلُ الْقِبْلَةُ بِغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ إِلاَّ عِنْدَ الْبِنَاءِ: جِدَارٍ أَوْ نَحْوِهِ

چھوٹے بڑے استنجا میں صحراء میں استقبال ممنوع ہے، بنیان میں جائز ہے

یہ معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، اور اس مسئلہ میں اختلاف نص فہمی کا نہیں بلکہ دلائل کا ہے، ایسے معرکۃ الآراء مسائل میں تین مرحلوں میں بیان کرتا ہوں۔ سب سے پہلے اقوال فقہاء بیان کرتا ہوں، پھر مسئلہ سے تعلق رکھنے والی روایت بیان کرتا ہوں، پھر آخر میں یہ بتاتا ہوں کہ ائمہ مجتہدین نے ان روایات سے کس طرح استدلال کیا ہے؟ ہر ایک نے جو مذہب اختیار کیا ہے اس کی وجہ بیان کرتا ہوں۔

مذاہبِ فقہاء:

استقبال واستدبار کے سلسلہ میں بنیادی اقوال یہ ہیں:

۱- امام اعظم رحمہ اللہ سے چار قول منقول ہیں: (۱) دونوں مطلقاً مکروہ تنزیہی ہیں ـــــ مطلقاً کا مطلب ہے: بنیان (عمارت) اور صحراء (کھلی جگہ) دونوں میں استقبال واستدبار ممنوع ہیں ـــــ (۲) دونوں مطلقاً مکروہ تحریمی ہیں اور یہی مفتی بہ قول ہے۔ (۳) استدبار مطلقاً جائز ہے اور استقبال مطلقاً مکروہ تحریمی ہے (۴) استدبار صرف بنیان میں جائز ہے اور استقبال دونوں جگہ ناجائز ہے ـــــ یہ قول درحقیقت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا ہے مگر حکماً یہ قول بھی امام اعظم کا شمار کیا جاتا ہے۔

۲-امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک دونوں باتیں بنیان میں جائز ہیں اور صحراء میں ناجائز۔
۳-امام احمد رحمہ اللہ سے تین قول مروی ہیں: (۱) امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے قول کے موافق یعنی بنیان میں دونوں جائز اور صحراء میں ناجائز (۲) احناف کے مفتی بہ قول کے موافق، یعنی دونوں مطلقاً مکروہ تحریمی (۳) استقبال مطلقاً ناجائز اور استدبار مطلقاً جائز۔
۴-داود ظاہری، ربیعۃ الرائے اور اصحاب ظواہر کے نزدیک استقبال واستدبار دونوں مطلقاً جائز ہیں۔
۵-امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک استدبار مطلقاً جائز ہے، اور استقبال صرف بنیان میں جائز ہے صحراء میں جائز نہیں ــــ اور بنیان سے مراد یہ ہے کہ سامنے کوئی آڑ ہو، خواہ دیوار ہو، پہاڑ ہو، درخت ہو یا کوئی اور چیز ہو۔
۶-ابراہیم نخعی اور حسن بصری رحمہما اللہ کے نزدیک بیت اللہ کی طرف بھی دونوں مطلقاً مکروہ ہیں اور بیت المقدس کی طرف بھی۔

روایات:

اس مسئلہ میں چار حدیثیں ہیں:

پہلی حدیث: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی ہے۔ یہ حدیث یہاں مختصر ہے، تفصیلی روایت آگے (حدیث ۳۹۴) آرہی ہے، حضرت ابوایوبؓ یہ ارشاد نبوی نقل کرتے ہیں: ''جب تم میں سے کوئی نشیبی زمین میں آئے'' ــــ غائط کے اصل ہیں: نشیبی زمین اور کھجوروں کا جھنڈ۔ دورِ اول میں لوگ قضائے حاجت کے لئے ایسی ہی جگہوں میں جاتے تھے، اور مراد بیت الخلاء ہے ــــ ''تو قبلہ کی طرف نہ منہ کرے اور نہ پیٹھ، بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ یا پیٹھ کرے''

حضرت ابوایوبؓ کہتے ہیں: ہم لوگ ملک شام گئے۔ وہاں ہم نے بیت الخلاء قبلہ رخ بنے ہوئے پائے، ہم ان میں بہ تکلف گھوم کر بیٹھتے تھے، یعنی حتی الامکان استقبال واستدبار سے بچتے تھے، اور اللہ سے استغفار کرتے تھے۔

دوسری حدیث: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں ایک مرتبہ اپنی بہن حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی چھت پر چڑھا ــــ اس وقت حضور اکرم ﷺ بیت الخلاء میں تھے۔ اور حضرت ابن عمرؓ اس سے واقف نہیں تھے، اور بیت الخلاء کی چھت نہیں تھی ــــ پس اچانک میری نظر پڑی، میں نے حضور ﷺ کو اس طرح قضائے حاجت کرتے ہوئے دیکھا کہ آپؐ کا منہ شام کی طرف تھا اور پیٹھ کعبہ کی طرف (یہ حدیث اعلی درجہ کی ہے اور ابھی آرہی ہے)

تیسری حدیث: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے ہم کو پیشاب کرتے وقت قبلہ کی جانب منہ کرنے سے منع کیا تھا۔ پھر میں نے نبی ﷺ کو انتقال سے ایک سال پہلے قبلہ کی جانب منہ کرکے پیشاب کرتے ہوئے دیکھا (یہ روایت ترمذی میں ہے اور حسن ہے)

چوتھی حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ کی مجلس میں اس کا تذکرہ آیا کہ لوگ قبلہ کی طرف پیٹھ کرنے کو ناپسند کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا: استقبلوا بمقعدتی القبلة: میری نشست گاہ قبلہ کی طرف کردو، یعنی اس طرح کردو کہ پیٹھ قبلہ کی طرف ہو (ابن ماجہ ص: ۲۷)

یہ روایت قابل استدلال نہیں کیونکہ اس کی سند میں خالد بن ابی الصلت ہے جو ضعیف راوی ہے۔ علامہ ذہبیؒ نے اس کو منکر الحدیث کہا ہے، اور ابن حزم نے اس کو مجہول کہا ہے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ خالد کا استاذ عراک بن مالک حضرت عائشہؓ سے اس حدیث کو بلا واسطہ روایت کرتا ہے یا بالواسطہ؟ اس میں اختلاف ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو مضطرب قرار دیا ہے۔

علاوہ ازیں: یہ روایت محکم الدلالۃ بھی نہیں، کیونکہ نبی ﷺ کے ارشاد استقبلوا بمقعدتی القلبة کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بیت الخلاء میں بیٹھنے کا رخ بدل دو، اس طرح کہ قضاء حاجت کے وقت آپؐ کی پیٹھ قبلہ کی طرف ہو، اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ مسجد وغیرہ میں آپؐ کی نشست گاہ اس طرح رکھی جائے کہ پیٹھ قبلہ کی طرف ہو، تاکہ لوگ جان لیں کہ استقبال واستدبار کی ممانعت صرف مخصوص حالت میں ہے، ہر وقت نہیں۔ غرض یہ حدیث محکم الدلالہ بھی نہیں، اس لئے بحث سے خارج ہے۔

مجتہدین کے استدلالات:

ربیعۃ الرائے اور اصحاب ظواہر وغیرہ نے ان روایات کو ناسخ ومنسوخ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک ممانعت کی روایات منسوخ ہیں اور جواز کی روایات ناسخ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بنیان میں استدبار کا جواز ثابت ہوا پس وہی حکم استقبال کا بھی ہوگا۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے صحراء میں پیشاب کرتے وقت استقبال ثابت ہوا، پس وہی حکم استدبار کا بھی ہوگا، جب دونوں کا مطلقاً جواز ثابت ہوگیا تو ممانعت کی روایات منسوخ ہوگئیں۔

دیگر ائمہ ان روایات میں نسخ نہیں مانتے وہ دو باتیں کہتے ہیں:

۱- حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت عہد فاروقی کی ہے، جب شام فتح ہوا اور اسلامی لشکر بستی میں داخل ہوا تو اس نے سرکاری عمارتوں میں قیام کیا۔ وہاں جو بیت الخلاء بنے ہوئے تھے وہ قبلہ رخ تھے، صحابہ نے مجبوراً ان کو استعمال کیا اور استقبال یا استدبار سے بچنے کے لئے بہ تکلف گھوم کر بیٹھتے تھے پھر استغفار کرتے تھے۔ اگر ممانعت کی روایات منسوخ ہوتیں تو اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟

۲- اور اگر ممانعت منسوخ ہوگئی تھی تو ضروری تھا کہ نبی ﷺ امت کو اس کی اطلاع دیتے، محض چھپ کر عمل نہ کرتے، جبکہ ایک بھی روایت ایسی اطلاع دہی کی نہیں ہے۔

اور امام اعظم رحمہ اللہ نے حضرت ابو ایوبؓ کی روایت پر حکم کا مدار رکھا ہے اس لئے کہ حنفیہ کے یہاں دو اصول ہیں:

۱- جب قولی اور فعلی روایات میں تعارض ہوتا ہے تو احناف قولی روایت کو لیتے ہیں اور فعلی روایت کی تاویل کرتے ہیں: لِأَنَّ أحاديثَ الأفعال يَتطرَّقُ إليها الاحتمال: یعنی فعلی روایت میں احتمال نکل سکتے ہیں، مثلاً: یہ احتمال کہ اچانک دیکھنے کی صورت میں ابن عمرؓ سے چوک ہوگئی ہو، اور وہ بالکل صحیح سمت کا اندازہ نہ کرسکے ہوں۔ یا یہ احتمال کہ یہ نبی ﷺ کی خصوصیت ہو، اور ممانعت صرف امت کے لئے ہو، اس لئے کہ آپؐ کعبہ سے افضل ہیں۔ اور اعلی کے ذمہ ادنی کی تعظیم نہیں، یا یہ احتمال کہ آپؐ گھوم کر بیٹھے ہوں جیسے صحابہ ملک شام میں اسی طرح بیٹھتے تھے، اور اچانک دیکھنے والا اس کا اندازہ نہیں کرسکتا —— اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت اولاً تو اعلی درجہ کی نہیں، نیز وہ بھی فعلی روایت ہے، اس میں بھی احتمال نکل سکتے ہیں، مثلاً: یہ احتمال کہ بے پردگی سے بچنے کے لئے مجبوراً آپؐ نے ایسا کیا ہو، یا یہ احتمال کہ یہ آپؐ کی خصوصیت ہو۔

۲- احناف جب محرم اور مبیح روایات میں تعارض ہوتا ہے تو محرم روایات کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ اس میں احتیاط ہے، اور حضرت ابوایوبؓ کی روایت محرم یعنی ممانعت کرنے والی ہے، اور دوسری دو روایتیں مبیح یعنی جواز ثابت کرتی ہیں، پس احتیاط اولی ہے اور وہ محرم روایات کو لینے میں ہے۔

اور ائمہ ثلاثہ کا اصول اس کے برعکس ہے، وہ بوقت تعارض فعلی روایت کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک فعلی روایت قولی روایت سے اقوی ہے، قولی روایت میں نسخ کا احتمال ہے اور فعلی روایت میں یہ احتمال نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ ابن عمرؓ کی روایت سے حضرت ابوایوبؓ کی روایت میں تخصیص کرتے ہیں، اور بنیان میں استقبال و استدبار کا یا مطلقاً استدبار کا جواز ثابت کرتے ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابن عمر کی روایت سے بنیان میں استدبار کا جواز ثابت ہوتا ہے، امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ استقبال کو اس پر قیاس کرتے ہیں، اور بنیان میں دونوں کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ اور امام احمد رحمہ اللہ صحراء میں استدبار کو اس پر قیاس کرتے ہیں اور استدبار کا مطلقاً جواز اور استقبال کا مطلقاً عدم جواز ثابت کرتے ہیں، اور وجہ فرق یہ ہے کہ بڑے استنجے میں ناپاکی نیچے کی طرف جاتی ہے، اس لئے اس میں کعبہ شریف کی توہین نہیں، اور چھوٹے استنجے میں ناپاکی کعبہ کی طرف جاتی ہے اس لئے اس میں کعبہ کی اہانت ہے، چنانچہ وہ مطلقاً ممنوع ہے —— حنفیہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔

اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے صرف بنیان میں استدبار کا جواز ثابت کرتے ہیں اس پر نہ استقبال کو قیاس کرتے ہیں اور نہ صحراء میں استدبار کو، چنانچہ ان کے نزدیک صرف بنیان میں استدبار جائز ہے۔ اور استقبال مطلقاً ناجائز ہے اور صحراء میں استدبار بھی ممنوع ہے[1]

(۱) نوٹ: تحفۃ الالمعی (۱:۲۰۹ نمبر۴) میں ہے کہ ابو یوسفؒ فرماتے ہیں: ابن عمرؓ کی روایت سے صرف استدبار کا جواز ثابت ہوتا ہے، پس بنیان اور صحراء دونوں میں استدبار کی اجازت ہے، یہ غلط چھپا ہے، صحیح بات وہ ہے جو یہاں ہے۔

اورامام بخاریؒ کے نزدیک حضرت ابوایوبؓ کی حدیث صحراء کے ساتھ خاص ہے۔ بنیان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اور حضرت ابوایوبؓ نے جو حدیث کو بنیان پر محمول کیا ہے وہ ان کی رائے ہے مجتہد کے لئے اس کا لینا ضروری نہیں۔

اور حدیث صحراء کے ساتھ خاص ہے اس کے چار قرائن ہیں:

(۱) لفظ الغائط: اس کے اصل معنی ہیں: نشیبی جگہ، پرانے زمانہ میں استنجے کے لئے لوگ جنگل جاتے تھے اور نشیبی جگہ تلاش کرتے تھے، تاکہ پردہ ہوجائے، قرآن (المائدہ آیت ۶) میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔

(۲) حدیث میں جہات اربعہ کا تذکرہ ہے۔ اور چاروں جہتوں کی آزادی جنگل میں ہوتی ہے، بنیان میں یہ آزادی نہیں ہوتی، بنیان میں جس طرح بیت الخلاء بنا ہوا ہے اسی طرح بیٹھنا ہے۔

(۳) عربوں کا طریقہ بڑے استنجے کے لئے جنگل جانے کا تھا، ظاہر ہے جس ماحول میں ارشاد فرمایا گیا ہے اسی ماحول میں حدیث سمجھی جائے گی۔

(۴) نبی ﷺ سے بنیان میں قضاء حاجت کے وقت کعبہ کی طرف پیٹھ کرنا ثابت ہے جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے، اور حضرت ابوایوبؓ کی حدیث میں اس کی ممانعت ہے، پس تعارض ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک کو بنیان کے لئے اور دوسری کو صحراء کے لئے تجویز کیا جائے —— یہ چار قرائن ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ابوایوبؓ کی حدیث صحراء کے ساتھ خاص ہے۔

غرض: امام بخاری رحمہ اللہ نے صحراء میں استدبار کو بنیان میں استدبار پر قیاس کیا اور اس کو علی الاطلاق جائز کہا، یعنی ابن عمرؓ کی حدیث سے حضرت ابوایوبؓ کی حدیث میں سے استدبار فی الصحراء کو خاص کیا، اور بنیان میں استقبال کو بھی جائز کہا، اس لئے کہ بنیان میں استقبال کی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں۔ حضرت ابوایوبؓ کی روایت بنیان کے لئے نہیں ہے —— اور بنیان سے مراد یہ ہے کہ استنجا کرنے والے کے سامنے آڑ ہو، خواہ دیوار ہو پہاڑ ہو، درخت ہو یا کوئی اور چیز ہو تو قبلہ کی طرف منہ کرنا بھی جائز ہے۔

اور حضرت ابراہیم نخعی اور حسن بصری رحمہما اللہ نے حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ والی حدیث کو نہ صرف عام رکھا بلکہ وہی حکم بیت المقدس کے لئے بھی ثابت کیا، اس لئے کہ وہ بھی ایک زمانہ میں مسلمانوں کا قبلہ رہ چکا ہے، اور اب بھی اس کی عظمت برقرار ہے۔ اور نبی ﷺ کو نماز میں کعبہ شریف کی طرف اس لئے پھیرا گیا کہ وہ ملت ابراہیمی اسماعیلی کا قبلہ ہے اور آپ کی بعثت اسی ملت پر ہوئی ہے۔ پس یہ بہتر کی طرف تحویل ہے، اس لئے بیت المقدس کا احترام تحویل قبلہ کے بعد بھی باقی ہے، اس لئے استنجا کرتے وقت اس کی طرف بھی منہ یا پیٹھ کرنا ممنوع ہے۔

فائدہ (۱): شَرِّقُوا أَوْ غَرِّبُوْا کا حکم مدینہ والوں کے لئے اور ان لوگوں کے لئے ہے جو کعبہ سے شمال یا جنوب میں رہتے ہیں اور جو لوگ کعبہ سے مشرق یا مغرب کی جانب رہتے ہیں جیسے ہم مشرق میں ہیں تو ان کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ

جنوب یا شمال کی طرف منہ یا پیٹھ کریں۔

فائدہ (۲): امام بخاری رحمہ اللہ باب میں لفظ استدبار نہیں لائے، کیونکہ ان کے نزدیک استدبار مطلقاً جائز ہے، اور استقبال کی دو قسمیں ہیں: (۱) استقبال فی البنیان (۲) اور استقبال فی الصحراء۔ پھر اول کا استثناء کیا یعنی جائز کہا تو ثانی کا عدم جواز ثابت ہوا۔

[۱۱-] بابٌ لاَ تُسْتَقْبَلُ الْقِبْلَةُ بِغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ، إِلاَّ عِنْدَ الْبِنَاءِ: جِدَارٍ أَوْ نَحْوِهِ

[۱۴۴-] حدثنا آدَمُ، قَالَ: ثَنَا ابْنُ أَبِي ذِئْبٍ قَالَ: ثَنَا الزُّهْرِيُّ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَزِيْدَ اللَّيْثِيِّ، عَنْ أَبِي أَيُّوْبَ الْأَنْصَارِيِّ، قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: " إِذَا أَتَى أَحَدُكُمُ الْغَائِطَ فَلاَ يَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ، وَلاَ يُوَلِّهَا ظَهْرَهُ، شَرِّقُوْا أَوْ غَرِّبُوْا ". [انظر: ۳۹۴]

وضاحت: یستقبل: میں ھو ضمیر أحدکم کی طرف راجع ہے .... ولا یُوَلِّها ظَهْرَه: اور نہ پھیرے کعبہ کی طرف اپنی پیٹھ، یعنی استدبار نہ کرے .... شَرِّقُوْا أو غَرِّبُوْا: مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف منہ یا پیٹھ کرے۔

بابُ مَنْ تبرَّزَ عَلَى لَبِنَتَيْنِ

قدمچوں پر استنجا کرنا

لَبِنَۃ کے معنی ہیں: کچی اینٹ، اینٹ کو پکالیا جائے تو وہ آجُرَّۃ ہے، جس کی جمع آجُر ہے، اور دو کچی اینٹوں پر یعنی قدمچوں پر استنجا کرنا: یہ بہتر ہے، اس لئے کہ اس صورت میں ناپاکی میں تلویث کا اندیشہ نہیں رہتا۔ ابھی اوپر والے مسئلہ سے متعلق ہی ابواب چل رہے ہیں۔ پہلے بتایا ہے کہ حضرت رحمہ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ اگر ایک ہی مسئلہ سے متعلق متعدد روایات لانی ہوں تو حضرت رحمہ اللہ ہر حدیث پر نیا باب قائم کرتے ہیں تاکہ افادۂ مزید ہوجائے، اس باب میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے، اس میں ایک بات یہ ہے کہ نبی ﷺ دو کچی اینٹوں پر یعنی قدمچوں پر استنجا فرمارہے تھے۔ اسی افادۂ مزید کے لئے نیا باب قائم کیا ہے۔

حدیث: مختصر ہے، پورا واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مسجد نبوی میں تشریف فرماتھے اور آپ کی پیٹھ کعبہ کی طرف تھی اور واسع بن حبان نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہوکر وہ حضرت ابن عمرؓ کی طرف مڑے، مگر سامنے نہیں بیٹھے دائیں یا بائیں مڑکر بیٹھے تاکہ بیت المقدس کی طرف پیٹھ نہ ہو۔ ابن عمرؓ سمجھ گئے کہ وہ سامنے کیوں نہیں بیٹھے۔ چنانچہ آپؓ نے مسئلہ چھیڑا اور فرمایا: کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جب آپ چھوٹے بڑے استنجے کے لئے بیٹھیں تو نہ قبلہ کی طرف منہ کریں اور نہ بیت المقدس کی طرف (اور پیٹھ بھی نہ کریں، ابراہیم نخعی اور حسن بصری کی یہی رائے ہے۔ اور یہ رائے

پہلے سے چلی آرہی ہے، ابن عمرؓ نے اس خیال کی تردید کی) فرمایا: میں ایک دن اپنے گھر (حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر) کی چھت پر چڑھا، میں نے نبی ﷺ کو قدمچوں پر استنجا کرتے ہوئے دیکھا درانحالیکہ آپؐ کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا (جب بوقت قضاء حاجت بیت المقدس کی طرف منہ کر سکتے ہیں تو عام حالات میں اس کی طرف پیٹھ کیوں نہیں کر سکتے؟ پھر دوسری عقلی دلیل دی) فرمایا: شاید تو ان لوگوں میں سے ہے جو اپنی سرینوں کو زمین سے لگا کر نماز پڑھتے ہیں، یعنی نماز میں بھی تو بیت المقدس کی طرف پیٹھ ہوتی ہے، یا تو عورتوں کی طرح سرین زمین پر بچھا کر سجدہ کرتا ہے، عورت سرین زمین سے لگا کر سجدہ کرتی ہے، اور مرد اٹھا کر، اس وقت بھی تو بیت المقدس کی طرف پیٹھ ہوتی ہے، پھر عام حالات میں بیت المقدس کی طرف پیٹھ کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟ واسع نے کہا: بخدا! میں یہ مسئلہ نہیں جانتا تھا۔ حضرت ابن عمرؓ کے اس ارشاد کے بعد مسئلہ کی پوری حقیقت میری سمجھ میں آگئی ——— امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت ابن عمرؓ کے ارشاد: لعلك من الذين إلخ سے مراد وہ لوگ ہیں جو نماز پڑھتے ہوئے سجدہ میں زمین سے سرین نہیں اٹھاتے بلکہ سرین زمین سے لگا کر سجدہ کرتے ہیں، یعنی عورتیں مراد ہیں (یہ تفصیلی روایت مسلم شریف میں ہے)

تشریح: استنجا کرتے وقت بیت اللہ کی طرف پیٹھ کرنا اور عام حالات میں پیٹھ کرنا: الگ الگ دو حالتیں ہیں، ان میں فرق کرنا ضروری ہے مگر بعض لوگوں نے فرق نہیں کیا۔ انھوں نے یہ خیال کیا کہ عام حالات میں بھی بیت اللہ کی طرف پیٹھ کرنا جائز نہیں۔ جب نبی ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپؐ نے اپنی نشست گاہ اس طرح کرادی کہ بیٹھتے وقت قبلہ کی طرف پیٹھ ہو تا کہ لوگ جان لیں کہ استقبال واستدبار کی ممانعت مخصوص حالت میں ہے ہر وقت نہیں (ابن ماجہ) اور بعض لوگوں نے اور غلو کیا، انھوں نے کہا کہ عام حالات میں بھی بیت المقدس کی طرف پیٹھ کرنا جائز نہیں۔ حضرت ابن عمرؓ نے اس خیال کی تردید کی کہ نبی ﷺ سے قضاء حاجت کے وقت بیت المقدس کی طرف منہ کرنا ثابت ہے۔ پس مخصوص حالت میں بھی اور عام حالت میں بھی پیٹھ کرنا بدرجۂ اولی جائز ہے، کیونکہ آدمی جب نماز پڑھتا ہے تو سرین اٹھا کر سجدہ کرتا ہے۔ اس وقت بھی تو بیت المقدس کی طرف پیٹھ ہوتی ہے، پس نماز کے علاوہ حالتوں میں بیت المقدس کی طرف پیٹھ کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟

فائدہ: کعبہ شریف کا ایک ادب لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ بیت اللہ کی طرف پاؤں نہیں پھیلانے چاہئیں، یہ ادب کسی روایت میں نہیں آیا، شاید یہ ادب آیت پاک: ﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبُ﴾ سے ماخوذ ہو، بیت اللہ شعائر میں سے ہے۔ پس اس کی تعظیم ضروری ہے، مگر یہ تقوی کی بات ہے۔

[۱۲-] بابُ مَنْ تبرَّزَ عَلَى لَبِنَتَيْنِ

[۱۴۵-] حدثنا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى بْنِ

حَبَّانَ، عَنْ عَمِّهِ وَاسِعِ بْنِ حَبَّانَ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ، أَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ: إِنَّ نَاسًا يَقُوْلُوْنَ: إِذَا قَعَدْتَ عَلٰى حَاجَتِكَ فَلاَ تَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَلاَ بَيْتَ الْمَقْدِسِ، فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ: لَقَدِ ارْتَقَيْتُ يَوْمًا عَلٰى ظَهْرِ بَيْتٍ لَنَا، فَرَأَيْتُ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم عَلٰى لَبِنَتَيْنِ، مُسْتَقْبِلاً بَيْتَ الْمَقْدِسِ لِحَاجَتِهِ، وَقَالَ: لَعَلَّكَ مِنَ الَّذِيْنَ يُصَلُّوْنَ عَلٰى أَوْرَاكِهِمْ، فَقُلْتُ: لاَ أَدْرِيْ وَاللّٰهِ! قَالَ مَالِكٌ: يَعْنِي الَّذِيْ يُصَلِّيْ وَلاَ يَرْتَفِعُ عَنِ الأَرْضِ، يَسْجُدُ وَهُوَ لاَصِقٌ بِالأَرْضِ. [انظر: ۱۴۸، ۱۴۹، ۳۱۰۲]

وضاحت: حبَّان: ح کے زبر اور زیر کے ساتھ دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں، اور اس میں الف نون زائدتان ہیں، حَبٌّ کے معنی ہیں: دانہ، اور حِبٌّ کے معنی ہیں: حبیب، جو محبوب کے معنی میں ہے۔

بابُ خُرُوْجِ النِّسَاءِ إلى البَرَازِ

عورتوں کا استنجے کے لئے جنگل جانا

اگر گھر میں بیت الخلاء نہ ہو تو استنجے کے لئے جنگل جا سکتے ہیں۔ مرد بھی اور عورتیں بھی، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

حدیث: صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ازواج مطہرات رات میں جب استنجے کی ضرورت محسوس کرتیں مناصع کی طرف نکلتیں، اور یہ (بقیع قبرستان کے قریب) ایک لمبا چوڑا میدان تھا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے کہا کرتے تھے کہ آپ ازواج مطہرات کو گھروں میں روک لیں (ضرورت کے وقت بھی گھر سے نہ نکلنے دیں) مگر نبی ﷺ ایسا نہیں کرتے تھے۔ ایک رات عشاء کے قریب حضرت سودہ رضی اللہ عنہا قضائے حاجت کے لئے نکلیں۔ اور وہ قدر آور تھیں، حضرت عمرؓ نے ان کو پہچان لیا اور پکار کر کہا: سودہ! ہم نے آپ کو پہچان لیا، اس حرص میں کہ پردہ کا حکم نازل ہو، پس اللہ نے حجاب کے احکام نازل فرمائے۔

تشریح: مذکورہ واقعہ نزول حجاب کے بعد کا ہے۔ آیت حجاب نازل ہونے کے بعد بھی ازواج مطہرات بڑے استنجے کے لئے گھر سے نکلتی تھیں اور رات میں جاتی تھیں، اس لئے کہ گھروں میں بیت الخلاء نہیں تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خواہش تھی کہ ازواج مطہرات کا پردہ دوسری عورتوں سے سخت ہو، وہ بول و براز کے لئے بھی گھر سے نہ نکلیں، تاکہ ہر کس وناکس کی ان پر نظر نہ پڑے۔ مگر آنحضور ﷺ ایسا نہیں کرتے تھے، اس لئے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو ضرورت کے وقت گھر سے نکلنے کی اجازت دی ہے، ارشاد پاک ہے: ﴿ يٰأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلاَبِيْبِهِنَّ ﴾ (الاحزاب آیت ۵۹) اے نبی!! آپ اپنی بیویوں سے، بیٹیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی چادریں ذرا نیچے لٹکا لیا کریں۔ اس آیت کے اشارے سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت عورتیں باپردہ گھر سے نکل سکتی ہیں۔ اور یہ رخصت ازواج مطہرات کے لئے بھی تھی، چنانچہ ایک رات

عشاء کے قریب حضرت سودہ رضی اللہ عنہا باپردہ قضائے حاجت کے لئے جنگل جارہی تھیں، راستہ میں حضرت عمرؓ مل گئے۔ حضرت سودہؓ بھرے بدن کی اور لمبے قد کی تھیں، چال سے پہچانی جاسکتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے ان کو پہچان لیا، اور دور سے پکار کر کہا: اے سودہؓ! میں نے آپ کو پہچان لیا، آپؓ نے ایسا اس لئے کیا کہ ازواج مطہرات کے سلسلہ میں پردے کے خصوصی احکام نازل ہوں۔ حضرت سودہؓ فوراً واپس لوٹ گئیں اور حضور اقدس ﷺ کے پاس گئیں، اس وقت آپؐ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے، اور کھانا تناول فرمارہے تھے۔ آپؐ کے دست مبارک میں ہڈی تھی جسے آپؐ نوش فرمارہے تھے۔ حضرت سودہؓ نے آکر واقعہ بیان کیا تو اسی حال میں وحی کے آثار شروع ہوئے۔ جب وحی پوری ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: قد أُذِنَ أَنْ تَخْرُجْنَ فِيْ حَاجَتِكُنَّ: تمہیں ضرورت کے لئے گھر سے نکلنے کی اجازت دی گئی، پس تم ضرورت کے لئے جنگل جاسکتی ہو۔ یعنی حضرت عمرؓ کی خواہش کے مطابق وحی نازل نہیں ہوئی، بہت سے احکام میں حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق وحی نازل ہوئی ہے۔ مگر ازواج مطہرات کے سلسلہ میں جس خصوصی حکم کے وہ خواہش مند تھے اس کے مطابق وحی نازل نہیں ہوئی، کیونکہ اس میں مشقت تھی، گھروں میں بیت الخلاء بنے ہوئے نہیں تھے (واقعہ کی یہ تفصیل آئندہ (حدیث ۴۷۹۵) آرہی ہے)

فائدہ: بخاری شریف کی تمام سندیں صحیح ہیں، اگرچہ بعض سندوں پر دارقطنی نے اعتراض کئے ہیں مگر حافظ رحمہ اللہ نے ان کے جواب دیئے ہیں، البتہ سند کی صحت کے لئے متن کے ہر ہر جزء کی صحت لازم نہیں، راوی کا وہم ہوسکتا ہے، بڑوں سے بھی وہم ہوجاتا ہے۔ اسی طرح سند کے ضعف سے متن کے ہر ہر جزء کا خلاف واقعہ ہونا ضروری نہیں، کبھی سند ضعیف ہوتی ہے مگر بات صحیح ہوتی ہے، اس کی مثال ابھی گذری ہے: حماد بن زید وغیرہ کے الفاظ تھے: إذا دخل الخلاء: اور سعید بن زید جو متکلم فیہ راوی ہیں ان کے الفاظ تھے: إذا أراد أن يدخل، اور یہی الفاظ صحیح ہیں، باقی روایتیں اسی پر محمول ہیں، باب کی روایت میں بھی وہم ہے، آگے حدیث (نمبر ۴۷۹۵) میں ہے: خرجت سودةُ بعد ما ضُرِبَ الحجابُ لحاجتها: یعنی یہ واقعہ نزول حجاب کے بعد کا ہے۔ پس اس روایت میں فأنزل الله الحجاب: راوی کا وہم ہے۔

[۱۳-] بابُ خُرُوْجِ النِّسَاءِ إِلَى الْبَرَازِ

[۱۴۶-] حدثنا يَحْيىَ بْنُ بُكَيْرٍ، قَالَ: ثَنَا اللَّيْثُ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ عُقَيْلٌ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُرْوَةَ، عَنْ عَائِشَةَ: أَنَّ أَزْوَاجَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم كُنَّ يَخْرُجْنَ بِاللَّيْلِ إِذَا تبَرَّزْنَ إِلَى الْمَنَاصِعِ، وَهُوَ صَعِيْدٌ أَفْيَحُ، وَكَانَ عُمَرُ يَقُوْلُ لِلنَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم: احْجُبْ نِسَاءَ كَ، فَلَمْ يَكُنْ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم يَفْعَلُ، فَخَرَجَتْ سَوْدَةُ بِنْتُ زَمْعَةَ زَوْجُ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم لَيْلَةً مِنَ اللَّيَالِيْ عِشَاءً، وَكَانَتِ امْرَأَةً طَوِيْلَةً، فَنَادَاهَا عُمَرُ: أَلاَ قَدْ عَرَفْنَاكِ يَا سَوْدَةُ، حِرْصًا عَلَى أَنْ يُنْزَلَ الْحِجَابُ، فَأَنْزَلَ اللهُ الْحِجَابَ.

[انظر: ۱۴۷، ۴۷۹۵، ۵۲۳۷، ۶۲۴۰]

[١٤٧-] حدثنا زَكَرِيَّا، قَالَ: ثَنَا أَبُوْ أُسَامَةَ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ عَائِشَةَ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قَالَ: "قَدْ أُذِنَ أَنْ تَخْرُجْنَ فِيْ حَاجَتِكُنَّ" قَالَ هِشَامٌ: يَعْنِيْ الْبَرَازَ. [راجع: ١٤٦]

وضاحت: پہلی حدیث حضرت عروہؒ سے امام زہریؒ روایت کرتے ہیں اور دوسری ان کے صاحبزادے ہشامؒ...... جب حضرت سودہؓ واپس آئیں اور حضرت عمرؓ کی بات بتائی تو فوراً وحی کے آثار شروع ہوئے۔ جب وحی نازل ہوچکی تو آپؐ نے فرمایا: تمہیں ضرورت کے لئے گھر سے نکلنے کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ لہٰذا حاجت کے لئے جنگل جاسکتی ہو......... صَعِيدٌ أفيح: بڑا میدان، فَيْحٌ کے معنی ہیں: بڑا، پھیلا ہوا۔ حدیث میں ہے: إنَّ شدة الحر من فَيْحِ جهنم: گرمی کی زیادتی جہنم کے پھیلاؤ سے ہے۔ بڑے ہال کو قاعةٌ فَيْحَاءُ، بڑے کمرے کو غُرفة فَيْحاء کہتے ہیں، صعيدٌ مذکر ہے اس لئے أفيح مذکر آیا ہے......... مناصِع: مَنْصَع (بروزن مَقْعَد) کی جمع ہے، بقیع قبرستان کے قریب یہ ایک میدان تھا......... كانت امرأةٌ طويلةٌ بھی پڑھ سکتے ہیں، اس صورت میں کان تامہ ہوگا اور خبر کی ضرورت نہ ہوگی۔

بابُ التَّبَرُّزِ فِيْ الْبُيُوْتِ

گھروں میں استنجا کرنا

پہلے گھروں میں بیت الخلاء نہیں تھے، لوگ قضاء حاجت کے لئے جنگل جاتے تھے، مرد بھی اور عورتیں بھی۔ پھر گھروں میں بیت الخلاء بن گئے تو جنگل میں جانے کی ضرورت نہ رہی۔ آنحضور ﷺ بھی بیت الخلاء میں قضاء حاجت فرماتے تھے۔

حدیث (۱): ابن عمرؓ کہتے ہیں: میں کسی ضرورت سے حضرت حفصہؓ کے گھر کی چھت پر چڑھا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپؐ قضائے حاجت فرمارہے ہیں، درانحالیکہ قبلہ کی طرف آپؐ کی پیٹھ اور شام (بیت المقدس) کی طرف آپ کا منہ ہے۔

حدیث (۲): ابن عمرؓ کہتے ہیں: ایک دن میں اپنے گھر (یہ مجاز ہے) کی چھت پر چڑھا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپؐ دو کچی اینٹوں (قدمچوں) پر بیٹھے ہوئے ہیں اور بیت المقدس کی طرف آپؐ کا رخ ہے۔

تشریح: ان حدیثوں کا یہاں مقصد یہ ہے کہ گھروں میں قضاء حاجت جائز ہے۔ نبی ﷺ سے یہ ثابت ہے۔

[١٤-] بابُ التَّبَرُّزِ فِيْ الْبُيُوْتِ

[١٤٨-] حَدَّثَنِيْ إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْمُنْذِرِ، قَالَ: ثَنَا أَنَسُ بْنُ عِيَاضٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى بْنِ حَبَّانَ، عَنْ وَاسِعِ بْنِ حَبَّانَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ، قَالَ: ارْتَقَيْتُ عَلَى ظَهْرِ بَيْتِ حَفْصَةَ لِبَعْضِ

حَاجَتِیْ، فَرَأَیْتُ رسولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم یَقْضِیْ حَاجَتَهُ مُسْتَدْبِرَ الْقِبْلَةِ مُسْتَقْبِلَ الشَّامِ.[راجع: ١٤٥]

[١٤٩-] حدثنا یَعْقُوْبُ بْنُ إِبْرَاهِیْمَ، قَالَ: ثَنَا یَزِیْدُ بْنُ هَارُوْنَ، قَالَ: أَنَا یَحْیَی، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ یَحْیَی بْنِ حَبَّانَ: أَنَّ عَمَّهُ وَاسِعَ بْنَ حَبَّانَ أَخْبَرَهُ: أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ أَخْبَرَهُ، قَالَ: لَقَدْ ظَهَرْتُ ذَاتَ یَوْمٍ عَلٰی ظَهْرِ بَیْتِنَا، فَرَأَیْتُ رسولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم قَاعِدًا عَلٰی لَبِنَتَیْنِ، مُسْتَقْبِلَ بَیْتِ الْمَقْدِسِ.[راجع: ١٤٥]

وضاحت:مستقبل:عربی میں ب کے زبر کے ساتھ اور اردو میں ب کے زیر کے ساتھ ہے۔

بابُ الِاسْتِنْجَاءِ بِالْمَاءِ

پانی سے استنجا کرنا

پانی سے استنجا کرنے کے سلسلہ میں پہلے اختلاف تھا۔حضرت سعید بن المسیبؒ عدم جواز کے قائل تھے۔اور ان کی دلیل یہ تھی کہ پانی محترم ہے، جیسے روٹی محترم ہے، وہ کھائی جاتی ہے اس لئے اس سے استنجا جائز نہیں، اسی طرح پانی بھی محترم ہے، وہ پیا جاتا ہے پس اس سے بھی استنجا کرنا جائز نہیں۔مگر جب امت کے سامنے آنحضور ﷺ کا عمل آیا کہ آپؐ نے پانی سے استنجا فرمایا ہے تو اختلاف ختم ہوگیا۔کیونکہ نص کے مقابلہ میں قیاس نہیں چلتا۔

جاننا چاہئے کہ دورِ اول میں عام طور پر لوگ چھوٹا بڑا استنجا ڈھیلوں سے کرتے تھے مگر آنحضور ﷺ ڈھیلوں کے ساتھ پانی استعمال فرماتے تھے یا صرف پانی استعمال فرماتے تھے؟ اس کی تفصیل روایات میں نہیں آئی مگر آپؐ سے استنجے میں پانی کا استعمال ثابت ہے۔

حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ جب قضاء حاجت کے لئے تشریف لے جاتے تو میں اور ایک دوسرا لڑکا اپنے ساتھ پانی لے کر جاتے (ابوالولید کہتے ہیں) اس پانی سے آپؐ استنجا فرماتے تھے۔

تشریح: حضرت انس رضی اللہ عنہ آپؐ کے خادم تھے، جب آپؐ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو ان کی والدہ ان کو لے کر حاضر خدمت ہوئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ! اس لڑکے کو خدمت کے لئے قبول فرمالیں، اس وقت ان کی عمر دس سال تھی، پھر وہ وفات تک آپؐ کی خدمت میں رہے۔ایک دوسرا انصاری لڑکا بھی آپؐ کا خادم تھا، ان دونوں کے ذمہ دو خدمتیں تھیں: ایک: استنجے کا پانی ساتھ لے جانا، دوسری: کھلی جگہ میں نماز پڑھنی ہو تو سترہ بنانے کے لئے نیزہ ساتھ لے جانا۔یہاں حدیث سے بس یہ استدلال کرنا ہے کہ نبی ﷺ پانی سے استنجا کرتے تھے۔

[١٥-] بابُ الِاسْتِنْجَاءِ بِالْمَاءِ

[١٥٠-] حدثنا أَبُوْ الْوَلِیْدِ هِشَامُ بْنُ عَبْدِ الْمَلِكِ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ أَبِیْ مُعَاذٍ - وَاسْمُهُ عَطَاءُ بْنُ أَبِیْ

مَيْمُوْنَةَ — قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ، يَقُوْلُ: كَانَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم إِذَا خَرَجَ لِحَاجَتِهِ أَجِيْءُ أَنَا وَغُلَامٌ، مَعَنَا إِدَاوَةٌ مِنْ مَاءٍ، يَعْنِيْ يَسْتَنْجِيْ بِهِ. [انظر: ١٥١]

لفظی ترجمہ: آتا تھا میں اور ایک لڑکا، ہمارے ساتھ پانی کا برتن ہوتا تھا، مراد لے رہے ہیں حضرت انسؓ: آپؐ اس سے استنجا کرتے تھے۔

بَابُ مَنْ حُمِلَ مَعَهُ الْمَاءُ لِطُهُوْرِهِ

استنجے کے لئے خادم کا پانی لے جانا تا کہ مخدوم استنجا کرے

ایک شخص استنجے کے لئے گیا، اس کے ساتھ اس کا خادم پانی لے کر گیا تا کہ مخدوم اس پانی سے استنجا کرے: یہ جائز ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ایک دوسرا لڑکا آنحضور ﷺ کے ساتھ پانی لے کر جاتے تھے۔ یہ حدیث اوپر آچکی ہے، مگر حضرت کو کوئی تقریب نکال کر حدیث کی سب سندیں بخاری میں لانی ہیں اس لئے الفاظ بدل کر نیا باب قائم کیا اور دوسری سند سے حدیث لے آئے۔

حدیث: حضرت علقمہ وغیرہ کچھ طلبہ دمشق آئے تا کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے حدیثیں حاصل کریں۔ حضرت نے پوچھا: کہاں سے آئے ہو؟ انھوں نے بتایا: کوفہ سے آئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا: کیا وہاں چپلوں والے، وضو کے پانی والے اور تکیہ والے صحابی نہیں ہیں؟ ان کی مراد حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے ذمہ تین خدمتیں تھیں: وہ بیٹھنے کا گدا ساتھ لئے رہتے تھے اور دونوں چپل رکھ لیتے تھے جب آپؐ اٹھتے تو چپل پہناتے، اسی طرح وضو کا پانی اور مسواک وغیرہ رکھنے کی خدمت بھی آپؐ کے سپرد تھی، اس وجہ سے آپؓ صاحب النعلین والطھور والوسادة کہلاتے تھے۔ ابوالدرداءؓ نے فرمایا: جب کوفہ میں ابن مسعودؓ موجود ہیں تو کسی اور کے پاس جانے کی ضرورت کیا ہے؟ جاؤ ان سے علم حاصل کرو۔

حضرت ابوالدرداءؓ کے اس قول سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس ﷺ کے لئے وضو کا پانی رکھنے کی خدمت حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی، لہٰذا کوئی خادم استنجے کے لئے پانی ساتھ لے کر جائے تو اس میں بھی کچھ حرج نہیں۔

فائدہ: عربوں کے یہاں دو طرح کے تکیے ہوتے تھے۔ ایک: بچھا کر بیٹھنے کا جس کو اردو میں گدا کہتے ہیں، عربی میں اس کو وِسادۃ کہتے ہیں، اور دوسرا سر کے نیچے رکھنے کا، اس کو مِخَدَّة کہتے ہیں، اور وسادہ کبھی سر کے نیچے بھی رکھتے ہیں۔

[١٦-] بَابُ مَنْ حُمِلَ مَعَهُ الْمَاءُ لِطُهُوْرِهِ

وَقَالَ أَبُو الدَّرْدَاءِ: أَلَيْسَ فِيْكُمْ صَاحِبُ النَّعْلَيْنِ وَالطُّهُوْرِ وَالْوِسَادِ؟

[۱۵۱-] حدثنا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ أَبِي مَيْمُوْنَةَ، قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا يَقُوْلُ: كَانَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم إِذَا خَرَجَ لِحَاجَتِهِ تَبِعْتُهُ أَنَا وَغُلَامٌ مِنَّا، مَعَنَا إِدَاوَةٌ مِنْ مَاءٍ. [راجع: ۱۵۰]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ جب قضاء حاجت کے لئے تشریف لے جاتے تو میں اور ہم میں سے ایک لڑکا (انصار میں سے) اپنے ساتھ ایک برتن میں پانی لے کر جاتے تھے۔

بَابُ حَمْلِ الْعَنَزَةِ مَعَ الْمَاءِ فِي الإِسْتِنْجَاءِ

استنجا کے پانی کے ساتھ ڈنڈا لے جانا

عَنَزَۃ: اس ڈنڈے کو کہتے ہیں جس کے نیچے پھل لگا ہوا ہوتا ہے، جمع عَنَز وعَنَزات آتی ہے۔ ابھی اوپر والے مسئلہ سے متعلق ہی ابواب چل رہے ہیں۔ نبی ﷺ جب قضاء حاجت کے لئے تشریف لے جاتے تو حضرت انس اور انصاری لڑکا پانی اور ڈنڈا ساتھ لے کر جاتے تھے، ڈنڈا کیوں لے جاتے تھے؟ علماء نے درجۂ احتمال میں چند باتیں لکھی ہیں، جو حاشیہ میں ہیں، میرے نزدیک اقرب یہ ہے کہ ان دونوں لڑکوں کے ذمہ دو خدمتیں تھیں، ایک: جب آپ استنجے کے لئے جائیں تو پانی ساتھ لے جانا۔ دوم: کھلی جگہ نماز پڑھنی ہو تو ڈنڈا ساتھ لے جانا تا کہ اس کا سترہ بنایا جائے، یہ دو الگ الگ خدمتیں تھیں جن کو راوی نے ایک ساتھ کر دیا ہے، اس لئے بات الجھ گئی ہے۔ مگر امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان اس طرف ہے کہ بوقت استنجا پانی اور ڈنڈا دونوں ساتھ لے جائے جاتے تھے، اسی بات کو پیش نظر رکھ کر باب قائم کیا ہے۔ اور حاشیہ میں دونوں کو ساتھ لے جانے کی متعدد وجہیں بیان کی ہیں۔

[۱۷-] بابُ حَمْلِ الْعَنَزَةِ مَعَ الْمَاءِ فِي الإِسْتِنْجَاءِ

[۱۵۲-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ، قَالَ: ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ أَبِي مَيْمُوْنَةَ، سَمِعَ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُوْلُ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَدْخُلُ الْخَلَاءَ فَأَحْمِلُ أَنَا وَغُلَامٌ إِدَاوَةً مِنْ مَاءٍ وَعَنَزَةً يَسْتَنْجِيْ بِالْمَاءِ، تَابَعَهُ النَّضْرُ وَشَاذَانُ عَنْ شُعْبَةَ، الْعَنَزَةُ: عَصًا عَلَيْهِ زُجٌّ. [راجع: ۱۵۰]

ترجمہ: جب نبی ﷺ جنگل (الخلاء سے جنگل مراد ہے) تشریف لے جاتے تو میں اور ایک لڑکا پانی کا برتن اور ڈنڈا اٹھاتے، اس پانی سے آپؐ استنجا کرتے (اور ڈنڈا کیوں لے جاتے تھے؟ حضرت انسؓ نے اس کی وجہ بیان نہیں کی)......... نضر اور شاذان: محمد بن جعفر کے متابع ہیں یعنی یہ دونوں حضرات بھی شعبہ رحمہ اللہ سے اس حدیث کو روایت کرتے ہیں......... عَنَزَۃ: اس ڈنڈے کو کہتے ہیں جس کے نیچے لوہے کا پھل لگا ہوا ہوتا ہے۔

بابُ النَّهْيِ عَنْ الاِسْتِنْجَاءِ بِالْيَمِيْنِ

دائیں ہاتھ سے استنجا کرنے کی ممانعت

شریعت مطہرہ نے جن محاسن اخلاق کی تعلیم دی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ تمام اچھے کام دائیں ہاتھ سے کئے جائیں اور برے کام بائیں ہاتھ سے، اچھے کام: جیسے کھانا، پینا، قرآن یا کتاب پکڑنا: سب کے لئے دایاں ہاتھ استعمال کیا جائے، اور برے کام: جیسے بغل میں یا زیر ناف کھجانا، ناک یا کان میں انگلی ڈالنا، ناک صاف کرنا اور چھوٹا یا بڑا استنجا کرنا: ایسے کاموں کے لئے بایاں ہاتھ استعمال کیا جائے۔

یہ شریعتِ مطہرہ کی ایک خوبی ہے کہ اس نے ایسی اچھی باتوں کی تعلیم دی جن تک عقل انسانی کی رسائی نہیں ہوتی۔ آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو شریعت کی روشنی سے محروم ہیں، وہ سب کام دائیں ہاتھ سے کرتے ہیں، اسی سے استنجا کرتے ہیں اسی سے کھاتے ہیں۔ یورپ کے لوگ جو خود کو مہذب کہتے ہیں ان کی سمجھ میں یہ بات تو آگئی کہ ہم جس ہاتھ سے استنجا کرتے ہیں اس سے کھانا نہیں چاہئے، چنانچہ وہ چھری کانٹوں سے کھاتے ہیں مگر آج تک ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ہاتھوں کو اچھے برے کاموں کے لئے تقسیم کرنا چاہئے، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان ہے کہ آپؐ نے امت کو چھری کانٹوں سے نجات دی اور ہاتھوں کی تقسیم کر کے مسئلہ حل کر دیا۔

حدیث: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی پیئے تو برتن میں سانس نہ لے۔ اور جب بیت الخلاء جائے تو اپنی شرم گاہ کو دائیں ہاتھ سے نہ چھوئے اور نہ دائیں ہاتھ سے استنجا کرے۔

تشریح: اس حدیث میں ایک ادب تو یہ سکھایا ہے کہ پانی وغیرہ پیتے وقت برتن میں سانس نہیں لینا چاہئے، اگر سانس لینا ہو تو برتن منہ سے ہٹالے، برتن میں سانس لینا تہذیب کے خلاف ہے۔ اور کبھی ایک برتن سے لوگ یکے بعد دیگرے پیتے ہیں ایسی صورت میں جس کا نمبر بعد میں ہوگا اس کو کراہیت ہوگی، اور دوسرا ادب یہ سکھایا ہے کہ دائیں ہاتھ سے شرم گاہ کو چھونا نہیں چاہئے، نہ دائیں ہاتھ سے استنجا کرنا چاہئے، بلکہ تمام ناپسندیدہ کام بائیں ہاتھ سے کرنے چاہئیں۔

[۱۸-] بابُ النَّهْيِ عَنِ الاِسْتِنْجَاءِ بِالْيَمِيْنِ

[۱۵۳-] حدثنا مُعَاذُ بْنُ فَضَالَةَ، قَالَ: ثَنَا هِشَامٌ — هُوَ الدَّسْتَوَائِيُّ — عَنْ يَحْيَى بْنِ أَبِيْ كَثِيْرٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِيْ قَتَادَةَ، عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: "إِذَا شَرِبَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَتَنَفَّسْ فِيْ الإِنَاءِ، وَإِذَا أَتَى الْخَلَاءَ فَلَا يَمَسَّ ذَكَرَهُ بِيَمِيْنِهِ، وَلَا يَتَمَسَّحْ بِيَمِيْنِهِ" [انظر: ۱۵۴، ۵۶۳۰]

بابٌ: لَايُمْسِكُ ذَكَرَهُ بِيَمِيْنِهِ إِذَا بَالَ

پیشاب کرتے وقت شرم گاہ کو دائیں ہاتھ سے نہ پکڑے

یہ ذیلی باب ہے، اوپر پیشاب کرنے کا ذکر نہیں آیا تھا، اس لئے اس کی تخصیص کر رہے ہیں کہ پیشاب کرتے وقت بھی شرم گاہ دائیں ہاتھ سے نہیں پکڑنی چاہئے۔

حدیث: نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی پیشاب کرے تو ہرگز اپنا عضو دائیں ہاتھ سے نہ پکڑے، اور نہ دائیں ہاتھ سے استنجا کرے، اور نہ برتن میں سانس لے۔

[۱۹-] بابٌ: لَايُمْسِكُ ذَكَرَهُ بِيَمِيْنِهِ إِذَا بَالَ

[۱۵۴-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: ثَنَا الْأَوْزَاعِيُّ، عَنْ يَحْيَى بْنِ أَبِيْ كَثِيْرٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِيْ قَتَادَةَ، عَنْ أَبِيْهِ عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: " إِذَا بَالَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَأْخُذَنَّ ذَكَرَهُ بِيَمِيْنِهِ، وَلَا يَسْتَنْجِ بِيَمِيْنِهِ، وَلَا يَتَنَفَّسْ فِي الْإِنَاءِ" [راجع: ۱۵۳]

بابُ الْإِسْتِنْجَاءِ بِالْحِجَارَةِ

پتھر سے استنجا کرنے کا بیان

الاستنجا میں دونوں الف وصلی ہیں، پس جب اس کو ملائیں گے تو دونوں الف گر جائیں گے، اور ل پر کسرہ پڑھیں گے اس لئے کہ ساکن کو جب حرکت دیتے ہیں تو کسرہ کی حرکت دیتے ہیں، جیسے: ﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ﴾ (الحجرات آیت ۱۱) یہاں بھی دونوں الف وصلی ہیں ان کو گرا کر ل پر کسرہ پڑھیں گے۔

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ چھوٹے بڑے استنجا میں پانی استعمال کرنا ضروری نہیں، ڈھیلے پتھر پر اکتفا کرنا بھی جائز ہے، بشرطیکہ انقاء (صفائی) ہو جائے۔ البتہ پانی استعمال کرنا بہتر ہے۔ اور ڈھیلے پتھر پر اکتفا کرنے کی اجازت اس صورت میں ہے جب نجاست مخرج سے متجاوز نہ ہوئی ہو۔ اگر نجاست مخرج سے متجاوز ہوگئی ہو تو پھر ڈھیلے پر اکتفا کرنا جائز نہیں، بلکہ پانی کا استعمال ضروری ہے۔

اور مخرج سے متجاوز ہونے والی ناپا کی کتنی معاف ہے؟ اس میں اختلاف ہے، امام شافعی رحمہ اللہ معمولی نجاست کو بھی معاف نہیں رکھتے، ناپا کی تھوڑی بھی متجاوز ہو جائے تو اس کا دھونا ضروری ہے، ڈھیلے پر اکتفا جائز نہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے باب ماجاء فی غسل دم الحیض من الثوب میں امام شافعیؒ کا یہ قول بیان کیا ہے کہ ان کے نزدیک اگر

مصلی کے کپڑوں پر یا بدن پر معمولی ناپاکی بھی ہوتو اس کی نماز نہیں ہوگی، پھر امام ترمذیؒ نے اس قول پر تبصرہ کیا ہے کہ **شَدَّد في ذلك**: امام شافعیؒ نے مسئلہ میں سختی کردی، قلیل ناپاکی سے بچنا ممکن نہیں۔

اور امام احمد رحمہ اللہ نے رائے مبتلی بہ پر یہ بات چھوڑ دی ہے۔ اگر ناظر کثیر سمجھے تو دھونا ضروری ہے ورنہ ڈھیلے پر اکتفا کرنا جائز ہے، یعنی نماز ہو جائے گی۔

اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک درہم سے کم ناپاکی معاف ہے، ڈھیلے پر اکتفا کرنا جائز ہے اس کی نماز بلا کراہیت درست ہوگی اور اگر نجاست بقدر درہم ہوتو اس کو دھونا ضروری ہے، ورنہ نماز مکروہ تحریمی ہوگی، اور درہم سے زائد ہوتو دھونا فرض ہے، بغیر دھوئے نماز نہیں ہوگی۔

فائدہ(۱): **حجارة** (پتھر) سے مراد ہے: **كُلُّ طاهرٍ غيرِ محترمٍ قالعٍ للنجاسة**: یعنی ہر وہ پاک چیز جو قابل احترام نہ ہو اور نجاست کو صاف کرنے والی ہو جیسے: مٹی کا ڈھیلا، پرانا کپڑا اور استنجے کا کاغذ وغیرہ، نئے اور کارآمد کپڑے سے استنجا کرنا مکروہ ہے، اسی طرح لکھنے کے کاغذ سے بھی استنجا مکروہ ہے کیونکہ یہ قابل احترام چیزیں ہیں۔

فائدہ(۲): بعض مسجدوں میں اینٹ یا مٹی کے ڈھیلے رکھے رہتے ہیں جن کو لوگ بار بار استعمال کرتے ہیں، اگر ان کے بعد پانی استعمال کیا جائے تو کوئی حرج نہیں، ناپاک ڈھیلے سے پیشاب خشک کر سکتے ہیں، اور اگر صرف ان ناپاک ڈھیلوں سے استنجا کیا جائے تو درست نہیں، نماز کی صحت کے لئے پاک ڈھیلوں سے استنجا کرنا ضروری ہے۔

حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نبی ﷺ کے پیچھے چلا درانحالیکہ آپؐ قضائے حاجت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔ آپؐ چلتے وقت دائیں بائیں نہیں دیکھتے تھے اس لئے میں آپؐ سے قریب ہوا (تاکہ آپؐ کو میرے ساتھ ہونے کا احساس ہو) آپؐ نے فرمایا: میرے لئے پتھر تلاش کرکے لاؤ تاکہ میں ان کے ذریعہ جھاڑوں (یہ لفظی ترجمہ ہے اور مراد ہے: استنجا کروں) ابو ہریرہؓ کہتے ہیں: یا اس کے مانند کوئی جملہ فرمایا۔ اور یہ ہدایت فرمائی کہ ہڈی اور لید نہ لانا، پس میں اپنی چادر کے پلے میں باندھ کر چند پتھر لایا، اور ان کو آپؐ کے پاس رکھ دیا، اور آپؐ کے پاس سے ہٹ گیا، جب آپ قضائے حاجت سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے ان پتھروں کے ذریعہ ناپاکی کا پیچھا کیا یعنی استنجا کیا۔

تشریح:

عرب میں اگرچہ ہر جگہ پتھر ہی پتھر ہوتے ہیں مگر استنجے کے لئے موزون پتھر ہر جگہ دستیاب نہیں ہوتے، اس لئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دور سے موزون پتھر تلاش کرکے لائے۔ اور ہڈی چکنی ہوتی ہے اس سے مخرج صاف نہیں ہوتا، اور لید ناپاک ہے، پس ایک ناپاکی دوسری ناپاکی کو کس طرح پاک کرے گی؟ اس لئے آپؐ نے ہڈی اور لید سے منع کیا۔ علاوہ ازیں ہڈی جنات کی خوراک ہے۔ ترمذی میں حدیث (نمبر ۲۱) ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: لید اور ہڈی سے استنجامت کرو اس لئے کہ یہ چیزیں تمہارے بھائی جنات کی خوراک ہیں۔ غرض لید اور ہڈی سے استنجا کرنے کی ممانعت

لغیرہ ہے، اور غیر ہڈی کا چکنا ہونا اور لید کا ناپاک ہونا ہے یا یہ دونوں چیزیں جنات کی خوراک ہیں۔ اور جہاں نہی لغیرہ ہوتی ہے وہاں فی نفسہ جواز ہوتا ہے اس لئے اگر کوئی شخص ہڈی یا لید سے استنجا کرے اور صفائی ہوجائے تو استنجا درست ہوگا اور نماز صحیح ہوگی۔

[۲۰-] بابُ الإِسْتِنْجَاءِ بِالْحِجَارَةِ

[۱۵۵-] حدثنا أَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدٍ الْمَكِّيُّ، قَالَ: ثَنَا عَمْرُو بْنُ يَحْيىَ بْنِ سَعِيْدِ بْنِ عَمْرٍو الْمَكِّيُّ، عَنْ جَدِّهِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: اتَّبَعْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم، وَخَرَجَ لِحَاجَتِهِ، فَكَانَ لاَ يَلْتَفِتُ، فَدَنَوْتُ مِنْهُ، فَقَالَ:" ابْغِنِي أَحْجَارًا أَسْتَنْفِضْ بِهَا - أَوْ: نَحْوَهُ - وَلاَ تَأْتِنِي بِعَظْمٍ وَلاَ رَوْثٍ" فَأَتَيْتُهُ بِأَحْجَارٍ بِطَرَفِ ثِيَابِي، فَوَضَعْتُهَا إِلَى جَنْبِهِ، وَأَعْرَضْتُ عَنْهُ، فَلَمَّا قَضَى أَتْبَعَهُ بِهِنَّ. [انظر: ۳۸۶۰]

بابٌ لاَ يُسْتَنْجَى بِرَوْثٍ

لید سے استنجا جائز نہیں

حدیث: ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ استنجے کے لئے تشریف لے گئے۔ آپؐ نے مجھے تین پتھر لانے کا حکم دیا، مجھے دو پتھر ملے، میں نے تیسرا تلاش کیا مگر نہیں ملا، میں نے ایک لید لی، دو پتھر اور ایک لید لے کر آپؐ کے پاس آیا۔ آپؐ نے پتھر لے لئے اور لید پھینک دی، اور فرمایا: یہ ناپاک ہے!

تشریح: اس باب کا مقصد بس اتنا ہے کہ لید سے استنجا نہیں کرنا چاہئے، نبی ﷺ نے لید سے استنجا نہیں کیا، اور اس حدیث کے تحت یہ مسئلہ چھیڑا جاتا ہے ـــــ اگرچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے نہیں چھیڑا ـــــ کہ جو شخص صرف ڈھیلوں سے استنجا کرے تو کتنے ڈھیلوں سے استنجا کرنا ضروری ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ اور دو باتیں اجماعی ہیں:

ایک: استنجے میں انقاء (صفائی) ضروری ہے، چاہے تین ڈھیلوں سے ہو یا زیادہ سے، اگر انقاء کے بغیر استنجا کرنے والا نماز پڑھے گا تو نماز نہیں ہوگی۔

دوم: اگر تین ڈھیلوں سے انقاء نہ ہو اور چوتھا ڈھیلا استعمال کرنا پڑے تو پھر طاق ڈھیلے استعمال کرنا مستحب ہے۔

لیکن اگر ایک یا دو ڈھیلوں سے صفائی ہوجائے تو پھر تین ڈھیلے استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور اختلاف نص فہمی کا ہے، دلائل کا اختلاف نہیں۔

مذاہبِ فقہاء: امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک اگر ایک یا دو ڈھیلوں سے انقاء ہوجائے تو تین کا عدد سنت ہے۔ پس اگر استنجاء کرنے والا ایک یا دو پتھروں پر اکتفا کرے تو اس کا استنجا درست ہوگا اور نماز درست ہوگی۔

اورامام شافعی اورامام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک تثلیث اورانقاء دونوں ضروری ہیں، پس ایک یا دو ڈھیلوں سے انقاء ہوجائے تب بھی تیسرا ڈھیلا استعمال کرنا ضروری ہے، ورنہ نماز نہیں ہوگی۔

دلائل: احادیث دوطرح کی ہیں، بعض وہ ہیں جن میں تین پتھروں سے استنجا کرنے کا حکم ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: أَمَرَ بِثَلاَثَةِ أَحْجَارٍ (ابن ماجہ، دارمی) اور بعض وہ ہیں جن میں تین سے کم پر اکتفا کرنے سے منع کیا ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: نهانا أن نَسْتَنْجِيَ بأَقَلَّ من ثلاثةِ أحْجَارٍ. (مسلم)

ان روایات کا ملحظ (پیش نظر) کیا ہے؟ تثلیث (تین کا عدد) یا انقاء؟ امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک ان روایات کا ملحظ انقاء (صفائی) ہے، عدد نہیں، نبی ﷺ نے ایک ایسا عدد اختیار کیا ہے جس سے عام طور پر صفائی ہوجاتی ہے۔ جیسے فقہ میں ناپاک کپڑے کو پاک کرنے کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ تین مرتبہ دھوؤ اور ہر مرتبہ نچوڑو، لیکن اگر کوئی شخص ناپاک کپڑے کو دومرتبہ دھوئے اور ظن غالب ہوجائے کہ ناپاکی نکل گئی تو کپڑا پاک ہوجائے گا، اور اگر تین مرتبہ دھونے کے باوجود ناپاکی کپڑے میں نظر آئے تو چوتھی اور پانچویں مرتبہ دھونا ضروری ہے، اسی طرح یہاں بھی فرض صرف انقاء ہے۔ اور احادیث میں تین پتھروں کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ اس سے عام طور پر انقاء ہوجاتا ہے۔ پس جس شخص نے ایک یا دو ڈھیلوں سے انقاء کرلیا تو اس کا استنجا ہوگیا، اور اگر نہیں ہوا تو تیسرا بلکہ چوتھا اور پانچواں ڈھیلا بھی استعمال کرنا ضروری ہے، اور دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: إذا ذَهَبَ أَحَدُكم إلى الغائطِ فَلْيَذْهَبْ مَعَهُ بثلاثَةِ أَحْجَارٍ، فَلْيَسْتَطِبْ بِهَا، فإنَّهَا تُجْزِئُ عَنْهُ: جب تم میں سے کوئی شخص استنجے کے لئے جائے تو اس کو چاہئے کہ اپنے ساتھ تین پتھر لے جائے، پس ان کے ذریعہ صفائی حاصل کرے، اس لئے کہ تین ڈھیلے اس کے لئے کافی ہوجائیں گے (نسائی شریف ۱:۸)

یہ حدیث صریح ہے کہ جن روایات میں تثلیث کا حکم ہے یا تین سے کم کی ممانعت ہے ان کا ملحظ انقاء ہے، عدد نہیں۔ اور چونکہ نبی ﷺ کی عادت تین ڈھیلوں سے استنجا کرنے کی تھی اور صحابہ وتابعین کا بھی یہی معمول تھا اس لئے تثلیث سنت ہے۔ اور حضرت امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک احادیث تثلیث کا ملحظ تثلیث وانقاء دونوں ہیں، پس ان کے نزدیک دونوں چیزیں ضروری ہیں، دو سے انقاء ہوجائے تب بھی تیسرا ڈھیلا استعمال کرنا ضروری ہے۔

احناف کے نزدیک یہ حقیقت ومجاز کو جمع کرنا ہے اس لئے کہ تثلیث کے حقیقی معنی ہیں: تین ڈھیلے استعمال کرنا، اور مجازی معنی ہیں: انقاء۔ اور انقاء کی فرضیت تمام علماء نے انہی احادیث سے ثابت کی ہے، انقاء کی فرضیت کے لئے اور کوئی دلیل نہیں۔ پس جب مجازی معنی لے لئے تو اب حقیقی معنی مراد لینا درست نہیں۔

فائدہ (۱): امام طحاویؒ اور علامہ کاسانی وغیرہ نے اس حدیث سے تثلیث کی عدم فرضیت پر استدلال کیا ہے اس طرح کہ نبی ﷺ نے جہاں استنجاء کرنے کا ارادہ فرمایا تھا وہاں موزون پتھر نہیں تھے، ورنہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو تلاش

کرنے کے لئے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر ابن مسعود کو بھی صرف دو ہی پتھر ملے، معلوم ہوا کہ آس پاس بھی پتھر نہیں تھے، اور آپؐ نے صرف دو پتھر قبول کئے اور لید پھینک دی، معلوم ہوا کہ اس دن آپؐ نے صرف دو پتھروں سے استنجا کیا۔ اور جب زندگی میں ایک مرتبہ دو ڈھیلوں سے استنجا کرنا ثابت ہوا تو تثلیث کا وجوب ختم ہو گیا۔ مگر اس حدیث سے یہ استدلال کمزور ہے کیونکہ یہ روایت مسند احمد میں بھی ہے، اس میں ہے: ائتنی بحجرٍ: کوئی پتھر لاؤ (مسند احمد ۱: ۴۵۰) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث کے تمام روات ثقہ ہیں (فتح ۱: ۲۷۵) پس مذکورہ استدلال کمزور ہے۔ صحیح بات وہ ہے جو میں نے بتائی کہ اس باب میں اختلاف دلائل کا نہیں، نص فہمی کا ہے۔

فائدہ (۲): مَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْيُوْتِرْ، مَنْ فَعَلَ فَقَدْ أَحْسَنَ وَمَنْ لاَ فَلاَ حَرَجَ: جو استنجے کے لئے پتھر تلاش کرے وہ تین پتھر تلاش کرے، جس نے ایسا کیا اس نے اچھا کیا اور جس نے ایسا نہیں کیا تو کوئی حرج نہیں (مشکوۃ حدیث ۳۵۲) اس جیسی حدیثوں میں جو ایتار کا حکم ہے اس سے تثلیث کے وجوب کے قائل تین کے بعد کا ایتار مراد لیتے ہیں اور تین کے بعد کی وتریت کے استحباب پر اجماع ہے، اور جو دو امام تثلیث کو واجب نہیں کہتے ان کے نزدیک تین کا عدد بھی مراد ہے، جبکہ دو سے انقاء ہو جائے، اور تیسرا پتھر لینا مستحب نہیں بلکہ سنت ہے، کیونکہ عمل نبوی سے اس کا ثبوت ہے اور بعد کا وتر عدد مستحب ہے۔

[۲۱-] بابُ لاَ يُسْتَنْجَى بِرَوْثٍ

[۱۵۶-] حدثنا أَبُوْ نُعَيْمٍ، قَالَ: ثَنَا زُهَيْرٌ، عَنْ أَبِيْ إِسْحَاقَ، قَالَ: لَيْسَ أَبُوْ عُبَيْدَةَ ذَكَرَهُ، وَلٰكِنْ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ الْأَسْوَدِ، عَنْ أَبِيْهِ: أَنَّهُ سَمِعَ عَبْدَ اللّٰهِ، يَقُوْلُ: أَتَى النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم الْغَائِطَ فَأَمَرَنِيْ أَنْ آتِيَهُ بِثَلاَثَةِ أَحْجَارٍ، فَوَجَدْتُ حَجَرَيْنِ، وَالْتَمَسْتُ الثَّالِثَ، فَلَمْ أَجِدْ، فَأَخَذْتُ رَوْثَةً فَأَتَيْتُهُ بِهَا فَأَخَذَ الْحَجَرَيْنِ وَأَلْقَى الرَّوْثَةَ، وَقَالَ: هٰذَا رِكْسٌ. وَقَالَ إِبْرَاهِيْمُ بْنُ يُوْسُفَ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ أَبِيْ إِسْحَاقَ: حَدَّثَنِيْ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ.

قال: ليس أبو عبيدة ذكره: اس حدیث کو حضرت ابن مسعودؓ سے ان کے صاحبزادے ابوعبیدۃ بھی روایت کرتے ہیں، جو اعلی درجہ کے ثقہ راوی ہیں۔ کتبِ ستہ میں ان کی روایتیں ہیں، مگر ابھی سات سال کے تھے کہ ابن مسعودؓ کی وفات ہوگئی، اس لئے انھوں نے اپنے والد سے نہیں پڑھا بلکہ ان کے شاگردوں سے پڑھا ہے۔ اور اس زمانہ میں چونکہ اسناد کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا اس لئے انھوں نے یاد نہیں رکھا کہ کونسی حدیث کس سے لی ہے۔ چنانچہ جب اسناد کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ عن ابن مسعود کہہ کر حدیثیں بیان کرتے تھے، اس لئے ان کی روایتیں مرسل ہیں۔ مگر ان کے مراسیل (منقطع روایتیں) بالاجماع حجت ہیں، بہرحال ابوعبیدۃ والی سند میں انقطاع ہے اس لئے ابو اسحاق نے صراحت کی کہ میں یہ

روایت ابوعبیدۃ سے نقل نہیں کرتا بلکہ عبدالرحمٰن بن الاسود سے بیان کرتا ہوں، اس سند میں کوئی انقطاع نہیں۔

قوله: وقال إبراهيم بن يوسف إلخ: اوپر والی سند زہیر کی ہے مگر زہیر نے ابواسحاق سے ان کی آخری عمر میں پڑھا ہے جبکہ ان کا حافظہ بگڑ گیا تھا اس لئے ان کا متابع لائے کہ یہ حدیث اس سند سے ابواسحاق سے ان کے صاحبزادے یوسف بھی روایت کرتے ہیں پھر ان سے ان کے صاحبزادے ابراہیم روایت کرتے ہیں اور اس سند میں تحدیث کی صراحت بھی ہے۔

بابُ الوُضُوْءِ مَرَّةً مَرَّةٍ

ایک ایک مرتبہ دودومرتبہ اور تین تین مرتبہ اعضائے وضودھونا

یہ مسئلہ پہلے گذر چکا ہے کہ وضو میں اعضاء مغسولہ کو ایک ایک مرتبہ دھونا فرض ہے، اور دودومرتبہ دھونا پہلا تکمیلی درجہ ہے، اور تین تین مرتبہ دھونا آخری تکمیلی درجہ ہے۔ اور تین سے زیادہ دھونا مالیخولیائی آدمی کا کام ہے۔ جاننا چاہئے کہ بعض روایات میں یہ ہے کہ نبی ﷺ نے اعضاء وضو کو ایک ایک مرتبہ دھویا اور بعض میں ہے کہ دودومرتبہ دھویا اور بعض میں ہے کہ تین تین مرتبہ دھویا، ان میں تعارض نہیں، کیونکہ یہ الگ الگ واقعات ہیں۔

[٢٢-] بابُ الوُضُوْءِ مَرَّةً مَرَّةً

[١٥٧-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: ثَنَا سُفْيَانُ، عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: تَوَضَّأَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم مَرَّةً مَرَّةً.

[٢٣-] بابُ الوُضُوْءِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ

[١٥٨-] حدثنا الْحُسَيْنُ بْنُ عِيْسَى، قَالَ: ثَنَا يُوْنُسُ بْنُ مُحَمَّدٍ، قَالَ: أَنَا فُلَيْحُ بْنُ سُلَيْمَانَ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِيْ بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ، عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيْمٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم تَوَضَّأَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ.

[٢٤-] بابُ الوُضُوْءِ ثَلاَثًا ثَلاَثًا

[١٥٩-] حدثنا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ الْأُوَيْسِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ إِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، أَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَزِيْدَ أَخْبَرَهُ، أَنَّ حُمْرَانَ مَوْلَى عُثْمَانَ، أَخْبَرَهُ، أَنَّهُ رَأَى عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ دَعَا بِإِنَاءٍ، فَأَفْرَغَ عَلَى كَفَّيْهِ ثَلاَثَ مِرَارٍ فَغَسَلَهُمَا، ثُمَّ أَدْخَلَ يَمِيْنَهُ فِي الْإِنَاءِ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلاَثًا وَيَدَيْهِ إِلَى

الْمِرْفَقَيْنِ ثَلاَثَ مِرَارٍ، ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ ثَلاَثَ مِرَارٍ إِلَى الْكَعْبَيْنِ، ثُمَّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: " مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِيْ هٰذَا، ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ، لاَ يُحَدِّثُ فِيْهِمَا نَفْسَهُ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ". [انظر: ١٦٠، ١٦٤، ١٩٣٤، ٦٤٣٣]

[١٦٠-] وَعَنْ إِبْرَاهِيْمَ، قَالَ: صَالِحُ بْنُ كَيْسَانَ: قَالَ ابْنُ شِهَابٍ: وَلٰكِنْ عُرْوَةُ يُحَدِّثُ عَنْ حُمْرَانَ: فَلَمَّا تَوَضَّأَ عُثْمَانُ قَالَ: لَأُحَدِّثَنَّكُمْ حَدِيْثًا لَوْلاَ آيَةٌ مَا حَدَّثْتُكُمُوْهُ، سَمِعْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: " لاَ يَتَوَضَّأُ رَجُلٌ يُحْسِنُ وُضُوْءَ هُ، وَيُصَلِّيْ الصَّلاَةَ إِلاَّ غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الصَّلاَةِ حَتّٰى يُصَلِّيَهَا" قَالَ عُرْوَةُ: الآيَةُ ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا أَنْزَلْنَا﴾ [البقرة: ١٥٩] [راجع: ١٥٩]

ترجمہ: حُمران جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ ہیں کہتے ہیں: انھوں نے حضرت عثمانؓ کو دیکھا کہ ایک برتن میں پانی منگوایا، پھر برتن کو جھکا کر اپنی ہتھیلی میں پانی لیا اور دونوں ہاتھوں کو تین مرتبہ دھویا۔ پھر دایاں ہاتھ برتن میں ڈال کر پانی لیا اور کلی کی اور ناک جھاڑی، پھر چہرہ تین مرتبہ دھویا، پھر دونوں ہاتھ کہنیوں تک تین مرتبہ دھوئے، پھر سر کا مسح کیا، پھر دونوں پاؤں ٹخنوں تک تین مرتبہ دھوئے، پھر فرمایا: نبی ﷺ نے فرمایا ہے: "جس نے میرے وضو کی طرح وضو کیا پھر دو رکعتیں (تحیۃ الوضو) پڑھیں۔ ان دونوں رکعتوں میں دل میں کوئی خیال نہیں لایا یعنی اللہ کی طرف متوجہ رہا تو اس کے سابقہ گناہ بخش دیئے جائیں گے"

تشریح:

۱- رسول اللہ ﷺ کی عادت مستمرہ اعضاء مغسولہ کو تین تین مرتبہ دھونے کی تھی، مگر آپؐ نے بیان جواز کے لئے گاہ بہ گاہ اعضاء مغسولہ کو ایک ایک مرتبہ یا دو دو مرتبہ بھی دھویا ہے۔ نیز ایک ہی وضو میں بعض اعضاء کو ایک مرتبہ، بعض کو دو مرتبہ اور بعض کو تین مرتبہ بھی دھویا ہے۔ اس لئے یہ سب صورتیں جائز ہیں، اور مسئلہ یہ ہے کہ اعضاء مغسولہ کو ایک ایک مرتبہ دھونا فرض ہے اور دو دو مرتبہ دھونا افضل ہے اور یہ افضلیت کا ادنی درجہ ہے۔ اور تین تین مرتبہ دھونا فضیلت کا اعلی درجہ ہے۔ اس سے اوپر کوئی درجہ نہیں، البتہ اگر تین مرتبہ دھونے کے بعد بھی عضو کے خشک رہ جانے کا یقین یا ظن غالب ہو تو پھر چوتھی اور پانچویں مرتبہ دھونا ضروری ہے۔

۲- مَضْمَضَ الماء فی فیه: کے معنی ہیں: پانی کو منہ میں پھرایا، یعنی کلی کی اور الاستنشاق کے معنی ہیں: پانی سونگھنا، ناک میں پانی چڑھانا، پھر سانس کی قوت سے پانی باہر جھاڑنا الاستنثار ہے۔

۳- سر کا مسح ایک مرتبہ سنت ہے یا تین مرتبہ؟ یہ مسئلہ امام بخاری رحمہ اللہ نے بیان نہیں کیا، امام ترمذی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک سر کا مسح تین مرتبہ نئے پانیوں سے سنت ہے۔ باقی تمام فقہاء ایک مرتبہ مسح کو سنت کہتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے مسح کو غسل پر قیاس کیا ہے جبکہ صحیح حدیثوں سے نبی ﷺ کا ایک مرتبہ مسح کرنا

ثابت ہے۔ امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے (ابو داؤد ا: ۱۵) فرمایا ہے: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ساری صحیح حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ سر کا مسح ایک مرتبہ ہے، کیونکہ راویوں نے اعضاء مغسولہ کو تین تین بار دھونے کا ذکر کیا ہے اور انھوں نے ان سب روایات میں مَسَحَ رَأْسَه کہا ہے۔ اور کوئی عدد ذکر نہیں کیا۔ جس طرح سر کے علاوہ میں انھوں نے عدد ذکر کیا ہے، اور قرینِ قیاس بھی یہی بات ہے کیونکہ سر پر مسح کا حکم تخفیف کے لئے ہے، اگر تین نئے پانیوں سے تین بار مسح کریں گے تو غسل ہو جائے گا۔

۴- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو وضو کر کے دکھایا جیسا کہ حضور ﷺ نے وضو کر کے دکھایا تھا، پھر آپؐ نے فرمایا: جس نے میری طرح وضو کیا پھر دو نفلیں پڑھیں، ان میں اپنے دل میں کوئی خیال نہیں لایا تو اس کے گذشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے (یہ بڑی سخت شرط ہے، دورانِ نماز دل میں کوئی خیال نہ آئے بہت مشکل ہے، اگر کوشش کرے گا تو یہی خیال مسلط ہو جائے گا کہ دل میں خیال نہیں لانا چاہئے)

۵- اس حدیث کو حمران سے حضرت عروہؒ بھی روایت کرتے ہیں، ان کی روایت کا متن عطاء بن یزید کی روایت سے مختلف ہے۔ حمران کہتے ہیں: حضرت عثمانؓ نے وضو کیا اور فرمایا: میں تم سے ایک حدیث بیان کرتا ہوں، اگر قرآنِ کریم میں ایک آیت نہ ہوتی تو میں کبھی تم سے یہ حدیث بیان نہ کرتا۔ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جب بھی کوئی شخص اچھی طرح وضو کرتا ہے اور نماز (تحیۃ الوضوء) پڑھتا ہے تو اس کے وہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں جو اس وضو اور اگلی نماز (فرض نماز) کے درمیان ہونگے یہاں تک کہ وہ اگلی نماز پڑھ لے —— یہ مضمون کہ وضو اور اگلی نماز کے درمیان جو گناہ ہونگے وہ معاف ہو جائیں گے عروۃ کی روایت میں زیادہ ہے، اور ظاہر ہے حضرت عثمانؓ نے بار بار لوگوں کو وضو کر کے دکھایا ہے اور یہ حدیث بار بار بیان کی ہے، پس عطاء بن یزید اور عروہ کی حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔ اور وہ آیت جس کی وجہ سے حضرت عثمانؓ نے یہ حدیث بیان کی ہے وہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۵۹ ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے علم چھپانے پر وعید بیان کی ہے، اس وعید سے بچنے کے لئے حضرت عثمانؓ نے یہ حدیث بیان کی۔

ملحوظہ: فضائل کی روایتوں سے لوگ کبھی غلط فائدہ اٹھاتے ہیں، وہ گناہوں پر بے باک ہو جاتے ہیں، اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہ حدیث بیان نہیں کرتے تھے، مگر علم چھپانا جائز بھی نہیں، اس لئے بیان کر دی۔

بَابُ الاِسْتِنْثَارِ فِي الْوُضُوْءِ

وضو میں ناک جھاڑنے کا بیان

ناک میں پانی چڑھانے کو استنشاق کہتے ہیں پھر سانس کی قوت سے جھاڑنے کو استنثار کہتے ہیں۔ استنثار کے لئے استنشاق لازم ہے، پانی چڑھائے گا تبھی جھاڑے گا۔ حضرت عثمان، عبداللہ بن زید اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی حدیثوں

میں استنثار کا ذکر ہے۔ یہ روایتیں بخاری میں مختلف جگہ آئی ہیں۔

وضو میں متعدد افعال ہیں ان میں سے خاص استنثار کو اس کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے ذکر کیا ہے، عام طور پر لوگ وضو کرتے وقت ناک میں پانی چڑھاتے ہیں مگر جھاڑتے نہیں، ناک میں پہلے سے آلائش ہوتی ہے جب وہ بھیگتی ہے تو ناک میں بدبو پیدا ہوجاتی ہے، اس لئے خاص طور پر اس جزء کو بیان کیا۔

حدیث: نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی وضو کرے تو چاہئے کہ ناک جھاڑے اور جب استنجے کے لئے پتھر تلاش کرے تو چاہئے کہ طاق عدد اختیار کرے'' —— استجمر میں س ت طلب کے لئے ہیں، مادہ جَمْرٌ ہے جس کے معنی ہیں: پتھر، اور یہاں طاق سے مراد بالا جماع ایک کے بعد کا طاق ہے، پھر امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک تین کے بعد کا ایتار مراد ہے اور امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک تین کا عدد بھی مراد ہے جبکہ دو سے انقاء ہوجائے۔

تشریح: امام احمد رحمہ اللہ نے دونوں امروں کو وجوب پر محمول کیا ہے اس لئے ان کے نزدیک مضمضہ اور استنشاق وضو اور غسل دونوں میں واجب ہیں اور استنجے میں تثلیث بھی واجب ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے پہلے امر کو استحباب پر اور دوسرے کو وجوب پر محمول کیا ہے اس لئے ان کے نزدیک مضمضہ اور استنشاق دونوں میں سنت ہیں اور تثلیث واجب ہے۔ اور امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ نے دونوں امروں کو استحباب پر محمول کیا ہے اس لئے ان کے نزدیک وضو میں مضمضہ اور استنشاق سنت ہیں اور استنجے میں تثلیث بھی سنت ہے جبکہ دو ڈھیلوں سے انقاء ہوجائے۔

[۲۵-] بابُ الِاسْتِنْثَارِ فِي الْوُضُوْءِ

ذَكَرَهُ عُثْمَانُ، وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ زَيْدٍ، وَابْنُ عَبَّاسٍ عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

[۱۶۱-] حدثنا عَبْدَانُ: أَنَا عَبْدُ اللّٰهِ، قَالَ: أَنَا يُوْنُسُ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ أَبُوْ إِدْرِيْسَ، أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: أَنَّهُ قَالَ: " مَنْ تَوَضَّأَ فَلْيَسْتَنْثِرْ وَمَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْيُوْتِرْ" [انظر: ۱۶۲]

بابُ الِاسْتِجْمَارِ وِتْرًا

طاق ڈھیلے استعمال کرنا

پہلے استنجے کے سلسلہ میں ابواب آئے ہیں، وہاں یہ باب قائم نہیں کیا تھا، اور اوپر حدیث میں ایتار کا ذکر آیا اس لئے ضمناً یہ باب قائم کردیا، اس کو باب در باب کہتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا باب قائم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے —— استنجے کے ڈھیلوں میں تین کا عدد سنت ہے یا واجب؟ اس میں اختلاف ہے، مگر تین کے بعد ایتار بالا جماع مستحب ہے، تفصیل گذر چکی۔

حدیث: نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی وضو کرے تو ناک میں پانی ڈالے پھر اس کو جھاڑے، اور جو استنجے کے لئے ڈھیلے تلاش کرے تو طاق عدد لے، اور جب تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو تو وضو کے برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے انہیں دھولے اس لئے کہ تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گذاری ہے۔

تشریح:

۱- عرب کے لوگ عام طور پر چھوٹے بڑے استنجے میں پتھر استعمال کرتے تھے، اور صرف پتھر استعمال کرنے والا خواہ کتنا ہی مبالغہ کرے نجاست کے کچھ نہ کچھ اجزاء باقی رہ جاتے ہیں، اور وہ لوگ لنگی پہنتے تھے اور علاقہ گرم تھا، پس اگر نیند میں ہاتھ محلِ نجاست پر پہنچ گیا تو ہاتھ ناپاک ہو جائے گا، کیونکہ نجاست اپنے محل میں تو معاف ہے مگر دوسری جگہ معاف نہیں، پس اگر وہ شخص بیدار ہونے کے بعد ہاتھ دھوئے بغیر پانی میں ڈالے گا تو پانی ناپاک ہو جائے گا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ پہلے ہاتھ دھوؤ پھر برتن میں ڈالو۔

۲- امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک حدیث میں مذکور حکم باب نظافت سے ہے، طہارت ونجاست سے اس کا کچھ تعلق نہیں، دیگر ائمہ کے نزدیک طہارت ونظافت دونوں سے تعلق ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ناپاکی گرنے سے پانی ناپاک ہوتا ہے یا نہیں؟ اور ہوتا ہے تو کب ہوتا ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ اصحاب ظواہر یعنی غیر مقلدین کہتے ہیں: پانی کی ذات پاک ہے اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی، خواہ پانی تھوڑا ہو یا زیادہ، اور خواہ ناپاکی گرنے سے اوصاف میں تغیر آئے یا نہ آئے بہر حال پانی پاک ہے۔

اور دیگر فقہاء ومحدثین کے نزدیک قلیل پانی میں ناپاکی گرنے سے پانی ناپاک ہو جاتا ہے، اور کثیر پانی جب تک اس کا کوئی وصف نہ بدلے ناپاک نہیں ہوتا ـــــ پھر قلیل کی تعیین میں اختلاف ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک: ظُهور الأثر وعَدَمُه: پر مدار ہے، یعنی تھوڑا یا زیادہ ہونا امر اضافی ہے، اگر پانی میں ناپاکی کا اثر ظاہر ہو جائے تو پانی ناپاکی کی بہ نسبت قلیل ہے اس لئے ناپاک ہو جائے گا، اور اگر ناپاکی کا اثر ظاہر نہ ہو تو پانی ناپاکی کی بہ نسبت کثیر ہے، اس لئے ناپاک نہ ہوگا۔

اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک قلیل وکثیر کا مدار قلتین پر ہے، اگر پانی دو مٹکے یا زیادہ ہے تو کثیر ہے اور دو مٹکوں سے کم ہے تو قلیل ہے۔

اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک قلیل وکثیر کا مدار پانی کے پھیلاؤ پر ہے، اگر پانی کا پھیلاؤ اتنا ہے کہ ایک طرف کی حرکت کا اثر دوسری طرف نہیں پہنچتا تو وہ کثیر ہے اور اگر حرکت دوسری طرف پہنچتی ہے تو وہ قلیل ہے۔ امام اعظمؒ کے مسلک کے لئے تعبیر ہے: خُلوصُ الأثر وعدمه: ایک طرف کے اثر کا دوسری طرف پہنچنا اور نہ پہنچنا، مگر چونکہ اس کا اندازہ کرنا عوام کے لئے مشکل تھا اس لئے بعد کے مفتیوں نے دہ در دہ کو فتوی کے لئے متعین کر دیا۔

غرض تین ائمہ کے نزدیک مذکورہ حدیث کا تعلق نظافت وطہارت دونوں سے ہے لہٰذا اگر ہاتھوں پر بالیقین ناپاکی ہے اور دھوئے بغیر ہاتھ برتن میں ڈال دیئے تو پانی ناپاک ہوجائے گا۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک پانی ناپاک نہیں ہوگا جبکہ اس ناپاکی سے پانی کا کوئی وصف نہ بدلے، ان کے نزدیک یہ حدیث باب نظافت سے ہے۔

جاننا چاہئے کہ پانی کی طہارت وعدم طہارت کا مسئلہ امام بخاریؒ نے یہاں بیان نہیں کیا اور آئندہ بھی بیان نہیں کریں گے، اس لئے کہ اس کا مدار بیر بُضاعہ اور قلتین والی حدیثوں پر ہے اور وہ حدیثیں بخاری میں لانے کے قابل نہیں۔

۳- علت پر حکم کا مدار ہوتا ہے وہ پائی جائے تو حکم پایا جاتا ہے اور وہ نہ رہے تو حکم بھی نہیں رہتا، جیسے شراب کا حرام ہونا: نشہ آور ہونے کی وجہ سے ہے، پس اگر وہ سرکہ بن جائے اور اس میں نشہ نہ رہے تو حرمت مرتفع ہوجائے گی، اور حکمت پر حکم کا مدار نہیں ہوتا۔ وہ رہے یا نہ رہے حکم باقی رہتا ہے، اور علت ہمیشہ ایک ہوتی ہے، اور حکمتیں متعدد ہوسکتی ہیں۔ جیسے بڑے برتن میں مجلس میں پانی لایا گیا پس حکم یہ ہے کہ ایک سانس میں مت پیؤ، اور برتن میں سانس مت لو، اور اس کی دو حکمتیں ہیں: ایک: بعد میں جس کا نمبر آئے گا اس کو ناگوار نہ ہو۔ دوسری: پانی جسم میں رچے پچے۔ اب گلاسوں میں اور چھوٹے برتنوں میں پانی پیا جاتا ہے پس پہلی حکمت ختم ہوگئی۔ مگر دوسری حکمت اب بھی باقی ہے، اسی طرح ہاتھ دھوئے بغیر برتن میں ڈالنے کی ممانعت کی بھی دو حکمتیں ہیں: ایک: احتمال نجاست۔ دوسری: پانی کی نظافت۔ پہلی حکمت اب باقی نہیں رہی کیونکہ اب لوگ پانی سے استنجاء کرتے ہیں مگر دوسری حکمت اب بھی باقی ہے، سوتے ہوئے آدمی زیر ناف ہاتھ لے جاتا ہے، بغل میں کھجاتا ہے، ناک کان میں انگلی ڈالتا ہے اور ان جگہوں میں اگرچہ ناپاکی نہیں ہوتی مگر میل کچیل ہوتا ہے، پس نظافت کا تقاضہ اب بھی یہ ہے کہ ہاتھ دھوئے بغیر برتن میں نہ ڈالے۔

مسئلہ: اگر ہاتھ کے ناپاک ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو تو پانی میں ڈالنے سے پہلے ہاتھوں کا دھونا فرض ہے۔ دھوئے بغیر پانی میں ہاتھ ڈالے گا تو پانی ناپاک ہوجائے گا۔ اور اگر ناپاکی کا صرف احتمال ہے تو ہاتھوں کا دھونا سنت مؤکدہ ہے اگر دھوئے بغیر پانی میں ہاتھ ڈالے گا تو پانی ناپاک نہ ہوگا۔ فقہی ضابطہ ہے: اليقين لا يزول بالشك: جو بات یقینی ہے وہ شک سے ختم نہیں ہوتی۔ اور اگر ہاتھ بالیقین پاک ہیں تب بھی دھوکر ڈالنا مستحب ہے، اب یہ حکم صرف باب نظافت سے ہوگا۔

[۲۶-] بَابُ الِاسْتِجْمَارِ وِتْرًا

[۱۶۲-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: أَنَا مَالِكٌ، عَنْ أَبِي الزِّنَادِ، عَنِ الْأَعْرَجِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ: " إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ فَلْيَجْعَلْ فِي أَنْفِهِ مَاءً، ثُمَّ لِيَنْتَثِرْ، وَمَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْيُوْتِرْ، وَإِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ نَوْمِهِ فَلْيَغْسِلْ يَدَهُ قَبْلَ أَنْ يُدْخِلَهَا فِي وَضُوْئِهِ، فَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَا يَدْرِي أَيْنَ بَاتَتْ يَدُهُ "[راجع: ۱۶۱]

بابُ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ، وَلَا يَمْسَحُ عَلَى الْقَدَمَيْنِ

پاؤں کا دھونا ضروری ہے مسح جائز نہیں

یہ باب فرقہ امامیہ کی تردید میں ہے ان کے نزدیک چہرہ اور ہاتھ مغسول اعضاء ہیں اور سر اور پیر ممسوح، وہ ﴿أَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ (المائدۃ آیت ۶) میں کسرہ والی قراءت سے استدلال کرتے ہیں اور اس کو ﴿وَامْسَحُوْا﴾ کے تحت لیتے ہیں، اور اہل السنہ والجماعہ کے نزدیک ننگے پاؤں کا وظیفہ (خاص حکم) دھونا ہے، ان کے نزدیک ننگے پاؤں پر مسح جائز نہیں۔

جمہور کے دلائل:

۱- باب کی روایت ہے جو پہلے بھی گذری ہے۔ ایک مرتبہ لوگ مکہ سے مدینہ کی طرف سفر کر رہے تھے، راستہ میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا، لوگ ایک پانی پر پہنچے اور چونکہ نماز میں دیر ہو رہی تھی اس لئے صحابہ نے جلدی جلدی وضو کیا، چنانچہ بعض کی ایڑیاں خشک رہ گئیں۔ نبی ﷺ نے پکار کر دو یا تین مرتبہ فرمایا: ویلٌ للأعقابِ من النار: وضو میں خشک رہ جانے والی ایڑیوں کے لئے جہنم کی وعید ہے۔ معلوم ہوا کہ پیروں کا وظیفہ غسل ہے مسح نہیں، کیونکہ مسح پیروں کے اوپر کیا جاتا ہے ایڑیوں اور تلووں پر نہیں کیا جاتا، پس ان کے خشک رہ جانے پر وعید سنانے کے کوئی معنی نہیں۔

۲- فضل طہور کی روایات میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے: جب آدمی اپنے دونوں پیر دھوتا ہے تو ان سے ہر غلطی نکل جاتی ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ پاؤں کا وظیفہ غسل ہے، اگر ان پر مسح فرض ہوتا تو پاؤں دھونے سے گناہ نہ نکلتے یہ دلیل امام طحاوی رحمہ اللہ نے پیش کی ہے مگر یہ دلیل غور طلب ہے، اس لئے کہ غسل مسح سے ابلغ ہے اور کامل کے ضمن میں ناقص پایا جاتا ہے جیسے وضو میں اگر کوئی سر پر مسح کرنے کے بجائے سر دھوڈالے تب بھی وضو ہو جاتا ہے اس لئے گناہ بھی نکلیں گے۔

۳- أرجلَكم: میں نصب والی قراءت جمہور کی دلیل ہے، کیونکہ اس صورت میں أرجل کا عطف وجوہ اور أیدی پر ہوگا اور آیت کے معنی ہونگے: اپنے پیروں کو دونوں ٹخنوں تک دھوؤ، اور شیعوں کا قراءت جر سے پیروں پر مسح کے لئے استدلال درست نہیں، کیونکہ اس صورت میں إلی الکعبین کی قید بے معنی ہو جائے گی، کیونکہ مسح تین انگلیوں کے بقدر ہوتا ہے، انگلیوں کو کھینچ کر ٹخنوں تک لے جانا ضروری نہیں۔

قراءتِ جر کی توجیہ:

جر جر جوار ہے، یعنی پڑوس کے اثر سے آیا ہے، مگر اس توجیہ کو علامہ ابن الہمام نے رد کیا ہے وہ کہتے ہیں: پڑوس

کے اثر سے غیر منصرف پر تنوین پڑھنے کی نظیر تو قرآن میں ہے مگر پڑوس کے اثر سے بجائے رفع ونصب کے کسرہ پڑھنے کی کوئی نظیر نہ قرآن میں ہے اور نہ کلام عرب میں۔

④ جر کی قراءت مسح علی الخفین پر محمول ہے مگر یہ توجیہ بھی محل نظر ہے کیونکہ اس صورت میں إلی الکعبین کی قید بے معنی ہو جاتی ہے، مسح علی الخفین میں ٹخنوں تک انگلیوں کو کھینچ کر لے جانا ضروری نہیں۔

③ مسح بمعنی غسل خفیف ہے، اور آیت میں صنعت استخدام ہے، صنعت استخدام یہ ہے کہ لفظ کے ایک معنی لئے جائیں پھر جب اس کی طرف ضمیر لوٹائی جائے تو دوسرے معنی لئے جائیں جیسے شاعر کہتا ہے:

إذا نزل السَّمَاءُ بأرض قومٍ ❁ رَعَيْنَاه وإن كانوا غَضْبَانًا

ترجمہ: جب کسی قوم کے علاقہ میں بارش ہوتی ہے تو ہم گھاس چرا آتے ہیں چاہے وہ غضبناک ہوں۔

اس شعر میں السماء سے مراد بارش ہے، پھر جب اس کی طرف رعیناہ کی ضمیر لوٹائی تو گھاس مراد لی جو بارش سے اگتی ہے، یہی صنعت استخدام ہے، اسی طرح دو ضمیریں کسی ایک مرجع کی طرف لوٹائی جائیں اور مرجع کے الگ الگ معنی لئے جائیں تو یہ بھی صنعت استخدام ہے۔ اسی طرح دو معمولوں کو ایک فعل سے جوڑا جائے اور ہر معمول کے ساتھ تعلق کے وقت الگ معنی مراد لئے جائیں تو یہ بھی صنعت استخدام ہے۔ آیتِ کریمہ میں رؤس اور أرجل دونوں کو امسحوا کے ساتھ جوڑا گیا ہے مگر رؤس کے ساتھ تعلق کی صورت میں مسح کے معنی ہیں: کسی چیز پر بھیگا ہوا ہاتھ پھیرنا (إمرارُ الید المبتلّة علی الشيئ) اور أرجل کے ساتھ تعلق کی صورت میں مسح کے معنی ہیں: ہلکا دھونا۔ لفظ مسح اس معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں حدیث میں نمسح علی أرجلنا میں مسح: غسل خفیف کے معنی میں ہے۔

اور اس کی دلیل کہ جب أرجل کا تعلق امسحوا کے ساتھ کیا جائے تو معنی غسل خفیف کے ہونگے، نصب والی قراءت ہے۔ نصب کی قراءت میں ارجل کا تعلق اغسلوا کے ساتھ ہے اور غسل بالغ مراد ہے۔ پس جر کی قراءت میں بھی یہی معنی لینے ہونگے، فرق صرف بالغ اور خفیف کا ہوگا، اور ایسا نہیں کریں گے تو دو قراءتوں میں تعارض ہو جائے گا، حالانکہ جس طرح دو آیتوں میں تعارض نہیں ہو سکتا دو قراءتوں میں بھی تعارض نہیں ہو سکتا۔

دوسری دلیل: پیروں کے دھونے کا تعامل وتواتر ہے، کسی حدیث سے نبی ﷺ کا یا کسی صحابی کا وضو میں ننگے پیروں پر مسح کرنا ثابت نہیں، پس ثابت ہوا کہ جر کی قراءت میں بھی غسل ہی مراد ہے۔

فائدہ: قراءتِ جر سے لوگوں کے ذہنوں سے ایک بوجھ ہٹانا مقصود ہے، جزیرۃ العرب میں پانی بہت کم تھا، اور دورِ نبوی میں لوگ عام طور پر ننگے پاؤں چلتے تھے جس سے پیر گندے ہو جاتے تھے، پھر جب اسلام نے نماز اور وضو کا حکم دیا اور وضو بھی روزانہ پانچ مرتبہ تو ہر مرتبہ ایک لوٹا پانی چاہئے تاکہ میلے پیر صاف ہوں، اور ایک گھر میں دس نفر ہوں تو سوچئے کتنا پانی درکار ہوگا، اتنا پانی وہ لوگ کہاں سے لائیں گے، ذہنوں سے اس بوجھ کو ہٹانے کے لئے أرجل کا تعلق بجائے

غسل کے مسح کے ساتھ جوڑا، اور مسح سے غسل خفیف مرادلیا، یعنی وضو میں پیروں کو دھو کر صاف کرنا ضروری نہیں بلکہ پیروں کا بھیگ جانا اور دو چار قطرے ٹپک جانا وضو کے لئے کافی ہے، برخلاف چہرہ اور ہاتھ کے وہ عام طور پر گندے نہیں ہوتے اس لئے تھوڑے پانی سے بھی ان میں غسل بالغ ہوجاتا ہے، جیسے فتح مکہ کے موقع پر جب سارا مکہ مسلمان ہوا تھا، نبی ﷺ نے ایک مرتبہ فجر میں لوگوں کے سامنے وضو کیا، چہرے اور ہاتھوں کو ایک ایک مرتبہ دھویا، سر اور خفین پر مسح کیا پھر اس وضو سے فجر سے عشا تک پانچ نمازیں پڑھائیں، جب کہ یہ معمولِ نبوی نہیں تھا اور ایسا آپؐ نے اس لئے کیا تھا تاکہ لوگ جان لیں کہ وضو میں کچھ زیادہ پانی درکار نہیں، اسی طرح جہر کی قراءت کے ذریعہ لوگوں کے ذہنوں سے بوجھ ہٹانا مقصود ہے۔

[۲۷-] بابُ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ، وَلاَ يَمْسَحُ عَلَى الْقَدَمَيْنِ

[۱۶۳-] حَدَّثَنِيْ مُوْسَى، قَالَ: ثَنَا أَبُوْ عَوَانَةَ، عَنْ أَبِيْ بِشْرٍ، عَنْ يُوْسُفَ بْنِ مَاهَكَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: تَخَلَّفَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم عَنَّا فِيْ سَفْرَةٍ، فَأَدْرَكَنَا وَقَدْ أَرْهَقْنَا الْعَصْرَ، فَجَعَلْنَا نَتَوَضَّأُ وَنَمْسَحُ عَلَى أَرْجُلِنَا، فَنَادَى بِأَعْلَى صَوْتِهِ: "وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ" مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلاَثًا. [راجع: ٦٠]

وضاحت: ويلٌ للأعقاب من النار: میں مجاز بالحذف ہے تقدیر عبارت ہے: ويلٌ للمقصّرين في غَسْلِ الأعقاب من النار، یعنی جو لوگ ایڑیاں دھونے میں کوتاہی کرتے ہیں ان کے لئے دوزخ کی وعید ہے۔

بابُ الْمَضْمَضَةِ فِي الْوُضُوْءِ

وضو میں کلی کرنا

پہلے استنشاق اور استنثار کا باب آیا تھا، یہ مضمضہ کا باب ہے۔ حضرت ابن عباس اور عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما کی حدیثوں میں مضمضہ کا بھی ذکر ہے۔ اور پہلے بتایا تھا کہ مضمضہ اور استنشاق امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک وضو اور غسل دونوں میں واجب ہیں۔ امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک دونوں میں سنت ہیں اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک وضو میں سنت اور غسل میں واجب ہیں۔

[۲۸-] بابُ الْمَضْمَضَةِ فِي الْوُضُوْءِ

قَالَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ، وَعَبْدُ اللهِ بْنُ زَيْدٍ عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

[۱۶۴-] حدثنا أَبُوْ الْيَمَانِ، قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ عَطَاءُ بْنُ يَزِيْدَ، عَنْ حُمْرَانَ

مُوْلٰی عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ، أَنَّهُ رَأَى عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ دَعَا بِوَضُوْءٍ، فَأَفْرَغَ عَلٰى يَدَيْهِ مِنْ إِنَائِهِ، فَغَسَلَهُمَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ أَدْخَلَ يَمِيْنَهُ فِي الْوَضُوْءِ، ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ، ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا، وَيَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ ثَلَاثًا، ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ، ثُمَّ غَسَلَ كُلَّ رِجْلٍ ثَلَاثًا، ثُمَّ قَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم يَتَوَضَّأُ نَحْوَ وُضُوْئِيْ هٰذَا، وَقَالَ:" مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِيْ هٰذَا، وَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيْهِمَا نَفْسَهُ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ" [راجع: ۱۵۹]

بابُ غَسْلِ الأَعْقَابِ

وضومیں ایڑیاں دھونا

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ وضومیں اعضاء مغسولہ کا استیعاب ضروری ہے، اور اعقاب کا ذکر اتفاق واقعہ کے طور پر ہے، باب کی حدیث میں اعقاب کا ذکر آیا ہے۔ ان کے خشک رہ جانے کی وجہ سے نبی ﷺ نے وعید سنائی ہے، اس لئے حضرت رحمہ اللہ نے بھی باب میں اعقاب کو خاص کیا، محمد بن سیرین رحمہ اللہ وضومیں انگوٹھی نکال کر یا ہلا کر اس کے نیچے پانی پہنچاتے تھے، معلوم ہوا کہ اعضاء مغسولہ کو بالاستیعاب دھونا ضروری ہے۔

حدیث: محمد بن زیاد کہتے ہیں: میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا، جب وہ ہمارے قبیلہ کی مسجد کے پاس سے گذرے اور لوگ لوٹوں سے وضو کررہے تھے، آپؓ نے لوگوں کو وضو کرتے ہوئے دیکھ کر فرمایا: اچھی طرح وضو کرو، اس لئے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: وضومیں خشک رہ جانے والی ایڑیوں کے لئے جہنم کی وعید ہے۔

تشریح: کبھی وضومیں خاص طور پر سردیوں میں ایڑیاں اور کہنیاں خشک رہ جاتی ہیں، اس لئے وضومیں ان کے دھونے کا خاص اہتمام کرنا چاہئے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہی نصیحت فرمائی ہے۔........ المِطْهَرة: لوٹا۔ نبی ﷺ کے زمانہ میں عام طور پر لوگ برتن میں ہاتھ ڈال کر پانی لے کر وضو کرتے تھے پھر لوٹے عام ہوگئے تو لوگ لوٹوں سے وضو کرنے لگے، اب نل سے وضو کرتے ہیں اس میں اسراف ہے۔ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی رحمہ اللہ کے مدرسہ میں نل لگے ہوئے ہیں مگر درمیانی سائز کے لوٹے بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اور حکم ہے کہ لوٹے میں پانی بھرو اور وضو کرو، یہی صحیح طریقہ ہے۔ اس میں پانی کی بچت ہے۔

[۲۹-] بابُ غَسْلِ الأَعْقَابِ

وَكَانَ ابْنُ سِيْرِيْنَ يَغْسِلُ مَوْضِعَ الْخَاتَمِ إِذَا تَوَضَّأَ.

[۱۶۵-] حدثنا آدَمُ بْنُ أَبِيْ إِيَاسٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ زِيَادٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا

هُرَيْرَةَ، وَكَانَ يَمُرُّ بِنَا، وَالنَّاسُ يَتَوَضَّؤُنَ مِنَ الْمِطْهَرَةِ، قَالَ: أَسْبِغُوا الْوُضُوْءَ، فَإِنَّ أَبَا الْقَاسِمِ صلى الله عليه وسلم قَالَ: "وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ"

بَابُ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ فِي النَّعْلَيْنِ، وَلَا يَمْسَحُ عَلَى النَّعْلَيْنِ

چپل پہنے ہوئے پاؤں دھونا اور چپلوں پر مسح نہ کرنا

اگر پیروں میں خفین نہ ہوں تو ان کا وظیفہ غسل ہے، اگرچہ چپل پہن رکھے ہوں۔ البتہ چپل پہنے ہوئے پاؤں دھونا جائز ہے، غرض: چپل بمنزلہ خف نہیں، اس لئے ان پر مسح جائز نہیں، مسح اسی صورت میں جائز ہے جب خفین پہن رکھے ہوں، پس یہ باب بھی گذشتہ سے پیوستہ ہے، اس میں بھی شیعوں کی تردید ہے۔

حدیث: عبید بن جریج نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: اے ابوعبدالرحمٰن! میں آپ کو ایسے چار کام کرتے ہوئے دیکھتا ہوں کہ آپ کے اصحاب میں سے کسی کو یہ کام کرتے ہوئے نہیں دیکھتا۔ ابن عمرؓ نے پوچھا: وہ چار کام کیا ہیں اے ابن جریج؟ انھوں نے کہا:

(۱) میں دیکھتا ہوں کہ آپ کعبہ شریف کے صرف دو یمنی گوشوں کا استلام کرتے ہیں یعنی آپ صرف اس کنارے کا جس میں حجر اسود لگا ہوا ہے اور اس کے مقابل کنارے (رکن یمانی) کا استلام کرتے ہیں۔ کعبہ شریف کے باقی دو کونوں کا جن کو رکن شامی کہتے ہیں، استلام نہیں کرتے جبکہ دیگر لوگ ان کا بھی استلام کرتے ہیں۔

(۲) اور میں دیکھتا ہوں کہ آپ ایسے چمڑے کے چپل پہنتے ہیں جن پر سے بال اڑا دیئے گئے ہیں۔ ایسا چمڑا اعلی شمار ہوتا ہے، اور جس چمڑے پر سے بال اڑائے نہیں گئے وہ معمولی سمجھے جاتے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ اعلی درجہ کے چپل پہنتے تھے جبکہ عام طور پر لوگ بالوں والے چپل یعنی معمولی چپل پہنتے تھے۔

(۳) اور میں دیکھتا ہوں کہ آپ زرد رنگ میں رنگا ہوا کپڑا پہنتے ہیں۔

(۴) اور میں دیکھتا ہوں کہ جب آپ مکہ میں ہوتے ہیں تو لوگ ذی الحجہ کا چاند دیکھتے ہی احرام باندھ لیتے ہیں اور آپ احرام نہیں باندھتے یہاں تک کہ یوم الترویہ آتا ہے، یعنی آپ آٹھ ذی الحجہ کو احرام باندھتے ہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے چاروں باتوں کی وجہ بیان کی کہ نبی ﷺ صرف دو یمنی کونوں کا استلام کرتے تھے، اس لئے میں بھی صرف ان دو کونوں کا استلام کرتا ہوں۔ اور شامی کونوں کا استلام نہیں کرتا، کیونکہ نبی ﷺ سے ان کا استلام نہیں کیا، اور رہے بال اڑائے ہوئے چمڑے کے چپل تو میں نے نبی ﷺ کو ایسے چپل پہنے ہوئے دیکھا ہے جن پر بال نہیں ہوتے تھے اور آپؐ ان میں وضو فرماتے تھے (یہی ٹکڑا باب سے متعلق ہے) اس لئے میں ان کو پہننا پسند کرتا ہوں۔ یعنی میں اعلی درجہ کے چپل اتباع سنت میں پہنتا ہوں۔ اور رہا زرد رنگ کا کپڑا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو زرد رنگ

میں رنگا ہوا کپڑا پہنتے ہوئے دیکھا ہے، یعنی میرا زرد کپڑا پہننا بھی اتباع سنت میں ہے، اور رہا احرام باندھنا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپؐ نے احرام باندھا جب آپؐ کو آپؐ کی اونٹنی لے کر روانہ ہوئی۔

تشریح:

۱- چاروں ائمہ متفق ہیں کہ طواف میں صرف یمن کی طرف کے دو کونوں کا استلام سنت ہے، شامی کونوں کا استلام سنت نہیں۔ اس لئے کہ وہ اپنی اصل جگہ پر (بناء ابراہیمی پر) نہیں ہیں، مگر دورِ اول میں بعض صحابہ وتابعین ان کونوں کا بھی استلام کرتے تھے، یہ اختلاف رفتہ رفتہ ختم ہو گیا اب رکن شامی کا کوئی استلام نہیں کرتا۔

۲- زرد رنگ کا کپڑا مردوں کے لئے ناپسندیدہ ہے، اس قسم کے کپڑے سادھو سنت اور پادری پہنتے ہیں، اس لئے ان سے مشابہت کی وجہ سے شریعت نے مردوں کے لئے اس رنگ کو پسند نہیں کیا، ترمذی میں حدیث (نمبر ۱۷۱۵) ہے، نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو زرد رنگ کا کپڑا پہننے سے منع فرمایا، اور آنحضور ﷺ نے پھر آپؐ کی اتباع میں حضرت ابن عمرؓ نے جو زرد کپڑا پہنا ہے وہ ہلکا زرد ہوگا۔ جیسے حدیث میں سرخ کپڑے کی ممانعت آئی ہے، اور آنحضور ﷺ سے سرخ کپڑا زیب تن فرمانا ثابت ہے۔ علماء نے فرمایا کہ تیز سرخ رنگ ناپسندیدہ ہے اور ہلکا سرخ رنگ اور سیاہی مائل سرخ رنگ یعنی براؤن رنگ جائز ہے۔

۳- نبی ﷺ بال بغیر کے چپل پہنتے تھے اور ان میں وضو فرماتے تھے۔ علماء نے اس جملہ کے دو مطلب بیان کئے ہیں: (۱) آپ چپل پہنے ہوئے پیر دھوتے تھے، پیر دھونے کے لئے چپل نکالتے نہیں تھے (۲) پیر دھو کر گیلے پیروں میں چپل پہن لیتے تھے، پیر خشک ہونے کا انتظار نہیں کرتے تھے، اس لئے کہ جب چمڑا رنگ دیا گیا تو وہ پاک ہو گیا خواہ مردار کا ہو، پس گیلے پیروں میں چپل پہننے جائز ہیں، میرے نزدیک یہ دوسرا مطلب راجح ہے اس لئے کہ چمڑے کے چپل پہن کر اگر پاؤں دھوئے جائیں گے تو چمڑا خراب ہو جائے گا، اور چپل چند دنوں میں استعمال کے قابل نہیں رہیں گے۔

۴- حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب مکہ میں قیام پذیر ہوتے تھے تو آٹھ ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھتے تھے۔ اس لئے کہ نبی ﷺ نے بھی ذوالحلیفہ سے اس وقت احرام شروع کیا تھا جب آپؐ کی اونٹنی آپؐ کو لے کر روانہ ہوئی تھی، حضرت ابن عمرؓ کا اس سے استدلال یہ ہے کہ آپؐ نے سفر سے متصل احرام باندھا ہے، پہلے سے احرام نہیں باندھا، معلوم ہوا کہ مکہ والے جب سفر حج شروع کریں تب احرام باندھیں، ذی الحجہ کا چاند دیکھ کر احرام باندھنا ضروری نہیں۔ اور حج کا سفر آٹھ ذی الحجہ سے شروع ہوتا ہے، اس دن حجاج منیٰ میں جاتے ہیں پس اس دن سے احرام شروع کرنا کافی ہے۔

فائدہ: آنحضور ﷺ ۲۵ ذی قعدہ میں ظہر کی نماز پڑھ کر مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے اور ذوالحلیفہ میں قیام فرمایا۔ پھر اگلے دن طلوع شمس کے بعد ذوالحلیفہ میں ایک درخت کے قریب دوگانہ ادا فرمایا اور تلبیہ پڑھ کر احرام شروع کیا، مگر اس کا علم صرف ان لوگوں کو ہوا جو وہاں موجود تھے۔ پھر جب اونٹنی آپؐ کو لے کر کھڑی ہوئی تو آپؐ نے تلبیہ پڑھا، پس

کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے خیال کیا کہ آپ نے اب احرام شروع کیا، چنانچہ انھوں نے یہی بات روایت کی (ابن عمرؓ یہی روایت کرتے تھے) پھر جب اونٹنی بیداء نامی ٹیلے پر چڑھی تو آپؐ نے پھر تلبیہ پڑھا، پس جن لوگوں نے یہی تلبیہ سنا انھوں نے اسی کو پہلا تلبیہ سمجھا اور یہ بیان کیا کہ آپؐ نے بیداء سے احرام باندھا، مگر صحیح بات یہ ہے کہ آپؐ نے درخت کے قریب مسجد کے پاس احرام شروع کیا ہے (ابوداؤد حدیث ۱۷۷۰)

[۳۰-] بابُ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ فِي النَّعْلَيْنِ، وَلاَ يَمْسَحُ عَلَى النَّعْلَيْنِ

[۱۶۶-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوسُفَ، قَالَ: أَنَا مَالِكٌ، عَنْ سَعِيْدِ الْمَقْبُرِيِّ، عَنْ عُبَيْدِ بْنِ جُرَيْجٍ، أَنَّهُ قَالَ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ: يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ! رَأَيْتُكَ تَصْنَعُ أَرْبَعًا لَمْ أَرَ أَحَدًا مِنْ أَصْحَابِكَ يَصْنَعُهَا، قَالَ: وَمَا هِيَ يَا ابْنَ جُرَيْجٍ؟ قَالَ: رَأَيْتُكَ لاَ تَمَسُّ مِنَ الأَرْكَانِ إِلاَّ الْيَمَانِيَّيْنِ، وَرَأَيْتُكَ تَلْبَسُ النِّعَالَ السِّبْتِيَّةَ، وَرَأَيْتُكَ تَصْبُغُ بِالصُّفْرَةِ، وَرَأَيْتُكَ إِذَا كُنْتَ بِمَكَّةَ أَهَلَّ النَّاسُ إِذَا رَأَوُا الْهِلاَلَ وَلَمْ تُهِلَّ أَنْتَ حَتّٰى كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ.

قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: أَمَّا الأَرْكَانُ فَإِنِّي لَمْ أَرَ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَمَسُّ إِلاَّ الْيَمَانِيَّيْنِ، وَأَمَّا النِّعَالُ السِّبْتِيَّةُ فَإِنِّي رَأَيْتُ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَلْبَسُ النِّعَالَ الَّتِي لَيْسَ فِيْهَا شَعْرٌ، وَيَتَوَضَّأُ فِيْهَا، فَأَنَا أُحِبُّ أَنْ أَلْبَسَهَا، وَأَمَّا الصُّفْرَةُ فَإِنِّي رَأَيْتُ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَصْبُغُ بِهَا، فَإِنِّي أُحِبُّ أَنْ أَصْبُغَ بِهَا، وَأَمَّا الإِهْلاَلُ فَإِنِّي لَمْ أَرَ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يُهِلُّ حَتّٰى تَنْبَعِثَ بِهِ رَاحِلَتُهُ.

[انظر: ۱۵۱٤، ۱۵۵۲، ۱٦۰۹، ۲۸٦٥، ۵۷۵۱]

بابُ التَّيَمُّنِ فِي الْوُضُوْءِ وَالْغُسْلِ

وضو اور غسل میں دائیں سے شروع کرنا

وضو میں بھی اور غسل میں بھی دائیں کو مقدم کرنا چاہئے۔ وضو میں دائیں کی تقدیم کی کوئی حدیث نہیں، اور غسل میں ہے، اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے باب میں غسل کا اضافہ کیا۔ جب یہ جزء ثابت ہو جائے گا تو دوسرا اجزء یعنی وضو میں دائیں کی تقدیم خود بخود ثابت ہو جائے گی۔

حدیث (۱): جب نبی ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو آپؐ نے ان عورتوں سے جو صاحبزادی کو غسل دینے کے لئے جمع ہوئی تھیں فرمایا: میت کی دائیں جانب سے اور اس کے اعضاء وضو سے شروع کرو، یعنی پہلے میت کو وضو کراؤ پھر نہلاؤ، اور وضو اور غسل دونوں میں دائیں کو مقدم کرو۔

تشریح: اس حدیث میں غسل کے ضمن میں وضو کا ذکر ہے۔ مستقل وضو کا ذکر نہیں، اس لئے حضرت رحمہ اللہ نے

باب میں الغسل کا اضافہ فرمایا......... مَیَامِن: مَیْمَنَه کی جمع ہے اوراس کے معنی ہیں: دایاں۔

حدیث (۲): حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: نبی ﷺ دائیں طرف سے شروع کرنے کو پسند فرماتے تھے، چپل پہننے میں، تیل کنگھا کرنے میں اور پاکی حاصل کرنے میں (ان تین چیزوں کا بیان بطور مثال ہے) اور سارے ہی احوال میں آپ کو دائیں طرف سے شروع کرنا پسند تھا۔

تشریح: طُهور لفظ عام ہے، وضو اور غسل دونوں کو شامل ہے اس لئے میں نے کہا تھا کہ وضو کے لئے کوئی خاص حدیث نہیں.......... اور جوتا چپل پہننے میں ادب یہ ہے کہ پہلے دایاں چپل پہنا جائے پھر بایاں۔ اور نکالنے کا معاملہ برعکس ہے، پہلے بایاں نکالے پھر دایاں......... اور تَرَجُّل کے اصل معنی ہیں: تیل کنگھا کرنا، یعنی پہلے سر کو اچھی طرح دھونا پھر بالوں کو تیل پلانا، پھر کنگھا کرنا۔ نبی ﷺ سر مبارک دھونے میں بھی اور کنگھی کرنے میں بھی دائیں کو مقدم کرتے تھے.......... اور حدیث میں مذکور تین کام بطور مثال ہیں آپؐ ہر اچھا کام دائیں ہاتھ سے کرتے تھے اور دائیں طرف سے شروع فرماتے تھے۔

[۳۱-] بابُ التَّيَمُّنِ فِي الْوُضُوْءِ وَالْغُسْلِ

[۱۶۷-] حدثنا مُسَدَّدٌ، قَالَ: ثَنَا إِسْمَاعِيْلُ، قَالَ: ثَنَا خَالِدٌ، عَنْ حَفْصَةَ بِنْتِ سِيْرِيْنَ، عَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ: قَالَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم لَهُنَّ فِيْ غَسْلِ ابْنَتِهِ: "ابْدَأْنَ بِمَيَا مِنِهَا وَمَوَاضِعِ الْوُضُوْءِ مِنْهَا"

[انظر: ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳]

[۱۶۸-] حدثنا حَفْصُ بْنُ عُمَرَ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ أَشْعَثُ بْنُ سُلَيْمٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبِيْ، عَنْ مَسْرُوْقٍ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: كَانَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم يُعْجِبُهُ التَّيَمُّنُ فِيْ تَنَعُّلِهِ، وَتَرَجُّلِهِ، وَطُهُوْرِهِ وَفِيْ شَأْنِهِ كُلِّه. [اطر: ۴۲۶، ۵۳۸۰، ۵۸۵۴، ۵۹۲۶]

بابُ الْتِمَاسِ الْوَضُوْءِ إِذَا حَانَتِ الصَّلَاةُ

جب نماز کا وقت ہو جائے پانی تلاش کیا جائے

اس باب میں مسئلہ یہ ہے کہ نماز کا وقت داخل ہونے سے پہلے پانی تلاش کرنا ضروری نہیں۔ جب قبل از وقت وضو ضروری نہیں تو پانی کی تلاش کیوں کر ضروری ہو سکتی ہے؟ تیمّم والے واقعہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب صبح ہوئی تو پانی تلاش کیا گیا مگر پانی نہیں ملا۔ چنانچہ صحابہ نے مضطربانہ خدمتِ اقدس میں عرض کیا: یارسول اللہ! نماز فجر کا وقت ہو گیا ہے اور کسی کے پاس پانی نہیں ہے، نماز کس طرح پڑھیں؟ آپؐ ناراض نہیں ہوئے کہ پہلے سے اس کا

خیال کیوں نہیں رکھا؟ معلوم ہوا کہ قبل از وقت پانی تلاش کرنا ضروری نہیں۔

حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے نبی ﷺ کو دیکھا درانحالیکہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا، لوگوں نے وضو کے لئے پانی تلاش کیا مگر نہیں ملا۔ پس نبی ﷺ کے پاس کسی برتن میں تھوڑا سا پانی لایا گیا، آپؐ نے اس میں اپنا دست مبارک رکھا اور لوگوں کو حکم دیا کہ اس سے وضو کریں۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ آپؐ کی انگلیوں کے درمیان سے چشمہ کی طرح پانی پھوٹ رہا تھا، یہاں تک کہ آخری فرد نے بھی وضو کرلیا۔

تشریح:

۱- یہ واقعہ سفر کا ہے یا حضر کا؟ اور اس واقعہ کا پس منظر کیا ہے؟ یہ باتیں مجھے معلوم نہیں۔ پورا واقعہ اس طرح ہے کہ آنحضور ﷺ کی مجلس ہو رہی تھی، عصر کی نماز کا وقت آ گیا، جن کے گھر قریب تھے وہ وضو کرنے کے لئے گھر چلے گئے، کیونکہ عرب کی مساجد میں وضو کا انتظام نہیں ہوتا، اور جن کے گھر دور تھے وہ نہیں گئے، انھوں نے پانی تلاش کیا مگر تھوڑا سا پانی ملا، ایک برتن میں وہ پانی آپؐ کی خدمت میں لایا گیا، اور عرض کیا: یارسول اللہ! بس اتنا پانی ہے، برکت کی دعا فرمادیں۔ نبی ﷺ نے اپنا دست مبارک اس برتن میں رکھا، بس کیا تھا آپؐ کی انگلیوں سے پانی کے چشمے پھوٹ پڑے، تمام صحابہ نے اس سے وضو کیا اور وہ اسّی حضرات تھے......... پس بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضر کا واقعہ ہے۔ اس لئے کہ بعض حضرات وضو کرنے کے لئے گھر چلے گئے تھے اور جن کے گھر دور تھے وہ رک گئے تھے۔

۲- اس واقعہ میں بھی حضور ﷺ خفا نہیں ہوئے کہ پہلے سے پانی تلاش کر کے کیوں نہیں رکھا؟ معلوم ہوا کہ قبل از وقت پانی تلاش کرنا ضروری نہیں، اور دونوں واقعوں میں وقت ہونے کے بعد پانی تلاش کیا گیا، معلوم ہوا کہ وقت ہونے کے بعد پانی تلاش کرنا ضروری ہے، چاہے پانی نہ ملنے کا یقین ہو، پھر بھی تلاش کرنا ضروری ہے، کیونکہ بعض مرتبہ ایسی جگہ سے پانی مل جاتا ہے جدھر خیال بھی نہیں جاتا، البتہ پہلے سے پانی کا انتظام رکھنا امر محمود ہے۔

[۳۲-] بابُ الْتِمَاسِ الوَضُوْءِ إِذَا حَانَتِ الصَّلَاةُ

وَقَالَتْ عَائِشَةُ: حَضَرَتِ الصُّبْحُ فَالْتُمِسَ الْمَاءُ فَلَمْ يُوْجَدْ فَنَزَلَ التيَمُّمُ.

[۱۶۹-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: أَنَا مَالِكٌ، عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِيْ طَلْحَةَ، عَنْ أَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ أَنَّهُ قَالَ: رَأَيْتُ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، وَحَانَتْ صَلَاةُ الْعَصْرِ، فَالْتَمَسَ النَّاسُ الْوَضُوْءَ فَلَمْ يَجِدُوْا، فَأُتِيَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بِوَضُوْءٍ، فَوَضَعَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فِيْ ذٰلِكَ الإِنَاءِ يَدَهُ، وَأَمَرَ النَّاسَ أَنْ يَتَوَضَّؤُوْا مِنْهُ، قَالَ: فَرَأَيْتُ الْمَاءَ يَنْبُعُ مِنْ تَحْتِ أَصَابِعِهِ، حَتّٰى تَوَضَّؤُوْا مِنْ عِنْدِ آخِرِهِمْ. [انظر: ۱۹۵، ۲۰۰، ۳۵۷۲، ۳۵۷۳ ۳۵۷۴، ۳۵۷۵]

بابُ الْمَاءِ الَّذِیْ یُغْسَلُ بِهِ شَعْرُ الإِنْسَانِ وَسُؤْرِ الْکِلَابِ وَمَمَرِّهَا فِی الْمَسْجِدِ

جس پانی سے انسان کے بال دھوئے جائیں وہ پانی پاک ہے، کتوں کا جھوٹا اوران کا مسجد میں گذرنا

یہ دوہراباب ہے، اس باب میں امام بخاری رحمہ اللہ کی دوعادتیں سامنے آئی ہیں:

پہلی عادت: کبھی حضرتؒ ایک باب میں دومختلف مسئلے اکٹھا کردیتے ہیں، یہاں بھی ایسا ہی کیا ہے، ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ جس پانی سے انسان کے بال دھوئے جائیں وہ پانی پاک ہے۔ اور دوسرا مسئلہ: یہ ہے کہ کتے کا جھوٹا پاک ہے۔ یہ دوالگ الگ مسئلے ہیں جن کو حضرت نے ایک باب میں جمع کردیا ہے۔

پہلا مسئلہ بیان کرکے اس سے تعلق رکھنے والا حضرت عطاءؒ کا اثر لائے ہیں، پھر دوسرا مسئلہ ذکر کیا ہے اور اس سے متعلق حضرت زہریؒ کا اثر لائے ہیں، پھر پہلے مسئلہ سے متعلق دو حدیثیں لائے ہیں، پھر دوسرے مسئلہ سے متعلق چار حدیثیں لائے ہیں۔ مگر بابٌ کہہ کر دوسرے مسئلہ سے متعلق حدیثوں کو جدا کردیا ہے، بلکہ ایک نسخہ میں تو تفصیلی باب ہے، بہر حال ایک عادت تو یہی سامنے آئی ہے کہ ایک ہی باب میں دومختلف مسئلے اکٹھا کردیئے ہیں۔

دوسری عادت: یہ سامنے آئی ہے کہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہوجاتا ہے اور فریقین کے دلائل مضبوط ہوتے ہیں تو حضرت رحمہ اللہ دونوں فریق کے دلائل پیش کرکے آگے بڑھ جاتے ہیں، کوئی فیصلہ نہیں کرتے، دوسرے مسئلہ میں حضرت نے ایسا ہی کیا ہے۔ سور کلب کی طہارت وعدم طہارت کے سلسلہ میں دونوں فریق کے دلائل قوی تھے اس لئے حضرت رحمہ اللہ نے اپنی رائے محفوظ رکھی، اور کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

پہلا مسئلہ: ایک شخص نے کسی برتن میں اپنی ڈاڑھی یا سر کے بال دھوئے اور بالوں پر کوئی حسی ناپاکی نہیں تھی تو وہ پانی پاک ہے یا ناپاک؟ یہ مسئلہ نہ کسی حدیث کی کتاب میں ہے نہ فقہ میں۔ البتہ فقہ میں یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر وہ عضو جس میں حیات حلول نہیں کرتی وہ پاک ہے، زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی۔ البتہ اس سے خنزیر مستثنیٰ ہے اور شوافعؒ کے نزدیک کتا بھی مستثنیٰ ہے، ان کے نزدیک کتا بھی نجس العین ہے، اور بالوں میں حیات حلول نہیں کرتی پس جس پانی میں بال دھوئے جائیں وہ پانی پاک ہے، اسی طرح جانوروں کے بال بھی اگر اس پر حسی ناپاکی نہ ہو تو پاک ہیں، پس بلی گود میں بیٹھ جائے یا کتا بستر پر چڑھ جائے اور ان کے بدن پر حسی ناپاکی نہ ہو تو کپڑا ناپاک نہیں ہوگا۔

البتہ فقہ میں یہ مسئلہ ہے کہ بال اکھاڑنے کے بعد اس کی جڑ میں جو سفید رطوبت ہوتی ہے وہ ناپاک ہے، بعض لوگ بال اکھاڑ کر منہ میں لیتے ہیں، یہ جائز نہیں، اگر اس رطوبت کے ساتھ بال پانی میں گر جائے تو پانی ناپاک ہوجائے گا، کیونکہ تھوڑا پانی قلیل ناپاکی سے بھی ناپاک ہوجاتا ہے۔

غرض: مذکورہ مسئلہ کسی کتاب میں نہیں، نہ کتبِ حدیث میں اور نہ فقہ میں، حالانکہ باب کی حدیث کے ضمن میں یہ

مسئلہ چھیڑا جاسکتا ہے مگر کسی محدث نے نہیں چھیڑا، صرف امام بخاری رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ اور جس پانی میں بال دھوئے گئے ہیں وہ پانی پاک ہے یا ناپاک؟ اس کا مدار اس پر ہے کہ بال کٹنے کے بعد پاک ہیں یا ناپاک؟ اگر پاک ہیں تو کٹنے سے پہلے بھی پاک ہیں، پس پانی پاک ہے اور اگر ناپاک ہیں تو کٹنے سے پہلے بھی ناپاک ہیں، پس پانی ناپاک ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس سلسلہ میں ایک اثر اور ایک حدیث لائے ہیں۔

اثر: عطاء بن ابی رباح جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے خاص شاگرد اور امام اعظم رحمہ اللہ کے استاذ ہیں: ان سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ حج سے فارغ ہو کر لوگ جو بال کٹواتے ہیں کیا ان بالوں کی رسی بٹ سکتے ہیں؟ حضرت عطاءؒ نے فرمایا: کوئی مضائقہ نہیں، ان بالوں سے دھاگے بھی بُن سکتے ہیں اور رسّی بھی، معلوم ہوا کہ بال کٹنے کے بعد پاک ہیں، پس کٹنے سے پہلے بھی پاک ہیں۔

فائدہ: حضرت عطاء رحمہ اللہ کی اس رائے سے احناف متفق نہیں، ان کے نزدیک انسان کا کوئی بھی جز استعمال کرنا جائز نہیں، یہ احترام انسانیت کے خلاف ہے، اعضاء کی پیوندکاری کا بھی اصلی حکم یہی ہے، اگرچہ اعضاء کی پیوندکاری میں امتہان (پامالی، ناقدری) نہیں ہے مگر جس باڈی میں سے آنکھ اور گردے وغیرہ نکالے جاتے ہیں اس باڈی کی توہین ہوتی ہے، مگر مفتیانِ کرام اضطرار کی حالت میں اجازت دیتے ہیں، البتہ جسم کے وہ اجزاء جن کا متبادل جسم میں پیدا ہوتا ہے ان کا بوقت ضرورت استعمال جائز ہے لیکن اس کی خرید وفروخت جائز نہیں، جیسے عورت کا دودھ بچہ دو سال تک پی سکتا ہے، یہ ایک ضرورت ہے مگر اس دودھ کو بیچنا جائز نہیں، عورت دوسرے کے بچہ کو دودھ پلا سکتی ہے، ہدیہ دے سکتی ہے مگر بیچ نہیں سکتی۔ اسی طرح خون بھی دے سکتے ہیں مگر اس کا بیچنا جائز نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ بدن میں بعض اعضاء ضرورت سے زائد ہیں جیسے ایک گردہ زائد ہے پس اس کو بیچ سکتے ہیں، یہ خیال غلط ہے، کوئی گردہ زائد نہیں، دونوں گردے ایک ساتھ کام کرتے ہیں، جیسے دونوں آنکھیں ایک ساتھ کام کرتی ہیں۔

سوال: اعضاء کی پیوندکاری ایک انسانی ضرورت ہے، ایک شخص مر گیا، اس کی آنکھیں یا گردہ نکال کر کسی دوسرے کو لگا دیا جائے اور اس کی حیات لمبی کر دی جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ بیشک خرید وفروخت منع ہے، مگر پیوندکاری تو جائز ہونی چاہئے۔

جواب: اضطرار یعنی سخت مجبوری کی حالت میں جائز ہے، مطلقاً منع نہیں، مگر جب سے اعضاء کی پیوندکاری کا سلسلہ شروع ہوا ہے میڈیکل سائنس کی ترقی رک گئی ہے، اگر اعضاء کی پیوندکاری کا سلسلہ بند ہو جائے تو میڈیکل سائنس ترقی کرے گی اور مصنوعی آنکھیں اور گردے وغیرہ تیار ہونگے، کیونکہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، جب ضرورت پیش آتی ہے تو سائنس والے غور وفکر کرتے ہیں اور نئی نئی چیزیں ایجاد کرتے ہیں، چونکہ مرنے والوں کے اعضاء سے کام چل رہا ہے اس لئے سائنس دان آگے نہیں بڑھتے، اس طرح میڈیکل سائنس کی ترقی رک گئی ہے۔

مسائل:

۱-خون وغیرہ وہ اجزاء جن کا متبادل پیدا ہو جاتا ہے ان کو کسی حال میں بیچنا جائز نہیں مگر مجبوری میں خریدنا جائز ہے، جیسے مجبوری کی حالت میں رشوت دینے کی گنجائش ہے جبکہ رشوت دیئے بغیر اپنا حق نہ مل سکتا ہو، مگر رشوت لینے کی کسی حال میں گنجائش نہیں۔

۲-اسی طرح اعضاء کی وصیت کرنا بھی جائز نہیں، بعض لوگ زندگی میں یہ وصیت کرتے ہیں کہ ان کی وفات کے بعد ان کے اعضاء نکال لئے جائیں اور ضرورت مند کو لگا دیئے جائیں ایسی وصیت کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ انسان اپنے اعضاء کا مالک نہیں، جیسے زندگی میں کوئی عضو بیچنا جائز نہیں اسی طرح وصیت کرنا بھی جائز نہیں۔

قولہ: وسؤر الكلاب ومَمَرِّها في المسجد: سے دوسرا مسئلہ بیان کیا ہے، کتے کا جھوٹا پاک ہے یا ناپاک؟ امام مالک رحمہ اللہ پاک کہتے ہیں اور دیگر ائمہ ناپاک۔ اور امام بخاری رحمہ اللہ نے محتاط لفظ استعمال کیا ہے: وسؤر الكلاب: اور کتے کا جھوٹا، وہ پاک ہے یا ناپاک اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہا، کیونکہ سؤرِ کلب کی طہارت یا عدم طہارت پر کوئی صریح دلیل نہیں۔ حدیثوں میں ولوغ کلب سے برتن دھونے کا حکم ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یہ حکم طہارت کے لئے ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک یہ حکم تعبدی ہے، یعنی شریعت نے دھونے کا حکم دیا ہے اس لئے دھوتے ہیں، اس کی وجہ معلوم نہیں، مگر سؤرِ کلب پاک ہے۔ اور مسلم شریف (۱: ۱۳۷) میں جو حدیث ہے: طُهور إناء أحدكم إذا ولغ الكلب فيه أن يغسله سبع مرات: اس کو امام مالکؒ روایت بالمعنی قرار دیتے ہیں۔

غرض: امام بخاری رحمہ اللہ نے تنگی محسوس کی اس لئے باب میں اضافہ کیا: ومَمَرِّها في المسجد: اور کتوں کا مسجد میں گذرنا، اس جزء کی دلیل تھی اس لئے باب میں اس کا اضافہ فرمایا۔

جب مسجدِ نبوی تعمیر ہوئی تو دروازوں پر کواڑ نہیں تھے، رات میں کتے گھس آتے تھے، اور کتا ہانپتا ہے پس اس کا تھوک مسجد میں گرتا ہے، معلوم ہوا کہ کتے کا تھوک پاک ہے، ورنہ صحابہ مسجد کو دھوتے، اور جب کتے کا لعاب پاک ہے تو اس کا جھوٹا بھی پاک ہے۔

غرض: حضرت رحمہ اللہ نے کوئی فیصلہ تو نہیں کیا مگر اس جزء کی وجہ سے پھر باب میں جو احادیث لائے ہیں ان کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ بھی امام مالک رحمہ اللہ کی طرح سؤرِ کلب کی طہارت کے قائل ہیں۔

ابن شہاب زہریؒ کا قول:

امام زہریؒ فرماتے ہیں: اگر کسی برتن میں پانی ہے اور اس میں کتے نے منہ ڈال دیا اور وضو کے لئے کوئی دوسرا پانی نہیں تو اسی پانی سے وضو کرے (زہریؒ کا قول پورا ہوا) سفیان ثوری رحمہ اللہ نے اس کی تائید کی، فرمایا: مسئلہ واقعی یہی

ہے یعنی امام زہریؒ نے بالکل صحیح مسئلہ بتایا اس لئے کہ تیمّم کی اجازت اس وقت ہے جب پانی نہ ہو، اور یہاں پانی موجود ہے، پس تیمّم نہیں کرے گا بلکہ اس پانی سے وضو کرے گا۔

پھر فرمایا: مگر میرے دل میں اس سلسلہ میں کچھ دغدغہ ہے، یعنی مجھے امام زہریؒ کی بات پر پورا اطمینان نہیں، بلکہ میری رائے یہ ہے کہ اس پانی سے وضو بھی کرے اور تیمّم بھی کرے (یہ عجیب بات ہوئی، ابھی تو استاذ کی تائید کررہے تھے اور ابھی دوسری رائے دیدی)

فائدہ: تابعین کے اقوال وآثار اگر حنفیہ کے خلاف ہوں تو جواب دینے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ وہ بھی مجتہد تھے، اور امام اعظم رحمہ اللہ بھی مجتہد ہیں اور ایک مجتہد کی رائے دوسرے مجتہد پر حجت نہیں، ہاں اگر کوئی حدیث بظاہر احناف کے خلاف ہو تو اس کی تاویل ضروری ہے، اسی طرح کسی صحابی کا کوئی قول وفعل احناف کے خلاف نظر آئے تو بھی تاویل ضروری ہے اس لئے کہ احناف کے نزدیک صحابہ کے اقوال وافعال بھی حجت ہیں۔

[۳۳-] بابُ الْمَاءِ الَّذِيْ يُغْسَلُ بِهِ شَعْرُ الإِنْسَانِ

وَكَانَ عَطَاءٌ لاَيَرَى بِهِ بَأْسًا: أَنْ يُتَّخَذَ مِنْهَا الْخُيُوْطُ وَالْحِبَالُ.

وَسُؤْرِ الْكِلاَبِ وَمَمَرِّهَا فِي الْمَسْجِدِ.

وَقَالَ الزُّهْرِيُّ: إِذَا وَلَغَ فِيْ إِنَاءٍ لَيْسَ لَهُ وَضُوْءٌ غَيْرُهُ يَتَوَضَّأُ بِهِ، وَقَالَ سُفْيَانُ: هٰذَا الْفِقْهُ بِعَيْنِهِ، لِقَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ: ﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَيَمَّمُوْا﴾ [النساء: ۴۳] وَهٰذَا مَاءٌ، وَفِي النَّفْسِ مِنْهُ شَيْءٌ، يَتَوَضَّأُ بِهِ وَيَتَيَمَّمُ.

حدیث (۱): محمد بن سیرین نے عَبیدہ بن قیس سلمانی (جو نبی ﷺ کی حیات میں مسلمان ہوگئے تھے مگر آپؐ سے ملاقات نہیں ہوئی) سے کہا: ہمارے پاس نبی ﷺ کے موئے مبارک ہیں جو ہمیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یا کہا: حضرت انسؓ کے خاندان کے لوگوں سے حاصل ہوئے ہیں۔ عبیدہ نے کہا: اگر میرے پاس آپؐ کا کوئی موئے مبارک ہوتا تو مجھے دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے زیادہ محبوب ہوتا۔

حدیث (۲): حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب (حجۃ الوداع میں) نبی ﷺ نے سر مبارک حلق کرایا تو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ پہلے وہ شخص تھے جنھوں نے موئے مبارک لئے۔

تشریح: ترمذی میں حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے حجۃ الوداع میں جمرۂ عقبہ کی رمی کرنے کے بعد قربانی کی، پھر حالق کو سر مبارک کی دائیں جانب دی اس نے اس کو مونڈا، آپؐ نے وہ بال حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ (حضرت انسؓ کے سوتیلے والد) کو دیئے، پھر حالق کو اپنے سر کی بائیں جانب دی اس نے وہ بال کاٹے، آپؐ نے وہ بال بھی ابوطلحہ کو دیئے اور فرمایا: ان کو لوگوں میں تقسیم کردو، اور مسلم (۴۲۱:۱) میں ہے کہ دائیں جانب کے بال آپؐ نے خود لوگوں میں تقسیم

فرمائے اور بائیں طرف کے بال ابوطلحہ کو دیئے، اور مسلم ہی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ ام سُلیم کو دیئے۔ علامہ عینی رحمہ اللہ نے اس تعارض کو اس طرح حل کیا ہے کہ دراصل دونوں جانبوں کے بال نبی ﷺ نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو دیئے تھے۔ پھر دائیں جانب کے بال حضرت ابوطلحہ نے نبی ﷺ کے حکم سے لوگوں میں تقسیم کر دیئے، اور بائیں جانب کے بال آپؐ کے حکم سے اپنی اہلیہ حضرت ام سُلیم رضی اللہ عنہا کو دیدیئے (عمدۃ ۳:۳۸)

اور یہ حدیث تبرکات کی اصل ہے اور ظاہر ہے تبرک کوئی پاک چیز ہی بن سکتی ہے، اور نبی ﷺ نے ایسی کوئی صراحت نہیں کی کہ میرے بال تو پاک ہیں، اور دوسروں کے پاک نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ بال پاک ہیں .... یہ دونوں حدیثیں پہلے مسئلہ سے متعلق ہیں۔

[۱۷۰-] حدثنا مَالِكُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ، قَالَ: ثَنَا إِسْرَائِيلُ، عَنْ عَاصِمٍ، عَنِ ابنِ سِيرِيْنَ، قَالَ: قُلْتُ لِعَبِيْدَةَ: عِنْدَنَا مِنْ شَعْرِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، أَصَبْنَاهُ مِنْ قِبَلِ أَنَسٍ، أَوْ: مِنْ قِبَلِ أَهْلِ أَنسٍ، فَقَالَ: لَأَنْ تَكُوْنَ عِنْدِيْ شَعْرَةٌ مِنْهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا. [انظر: ۱۷۱]

[۱۷۱-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحِيْمِ، قَالَ: نَا سَعِيْدُ بْنُ سُلَيْمَانَ، قَالَ: ثَنَا عَبَّادٌ، عَنِ ابْنِ عَوْنٍ، عَنِ ابنِ سِيرِيْنَ، عَنْ أَنَسٍ: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم لَمَّا حَلَقَ رَأْسَهُ كَانَ أَبُوْ طَلْحَةَ أَوَّلَ مَنْ أَخَذَ مِنْ شَعْرِهِ. [راجع: ۱۷۰]

بابٌ: إِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِي الإِنَاءِ

یہ تفصیلی باب ایک نسخہ میں ہے، اور ایک نسخہ میں صرف بابٌ ہے، اس صورت میں یہ کالفصل من الباب السابق ہوگا .... کتے کے جھوٹے کے سلسلہ میں تین مسئلے ہیں: (۱) کتے کا جھوٹا پاک ہے یا ناپاک؟ (۲) کتا برتن میں منہ ڈال دے تو سات مرتبہ دھونا ضروری ہے یا تین مرتبہ دھونے سے برتن پاک ہوجائے گا؟ (۳) مٹی سے مانجھنے کا کیا حکم ہے؟

پہلا مسئلہ: امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک کتے کا جھوٹا پاک ہے اور دیگر ائمہ کے نزدیک ناپاک ہے۔ جاننا چاہئے کہ امام مالکؒ اپنی اصل پر ہیں، اس لئے کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تمام درندوں کا جھوٹا پاک ہے۔ انھوں نے سور ہرّہ پر تمام درندوں کے سور کو قیاس کیا ہے، اور کتا بھی ایک درندہ ہے پس اس کا جھوٹا بھی پاک ہونا چاہئے، چنانچہ امام مالکؒ اسی کے قائل ہیں مگر چھوٹے دو امام اس مسئلہ میں ان سے الگ ہوگئے، انھوں نے کتے کے جھوٹے کو ناپاک قرار دیا۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک تو تمام درندوں کا جھوٹا ناپاک ہے، پس کتے کا جھوٹا بھی ناپاک ہے، اور امام اعظمؒ نے سور

ہرہ کے حکم کو سواکن البیوت کی طرف متعدی کیا ہے۔

دوسرا مسئلہ: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ولوغ کلب کی صورت میں برتن کو سات مرتبہ دھونا ضروری ہے اور احناف کے نزدیک تین مرتبہ دھونے سے برتن پاک ہوجاتا ہے۔ البتہ سات مرتبہ دھونا مستحب ہے۔

ائمہ ثلاثہ کی دلیل باب کی پہلی حدیث ہے، اس میں نبی ﷺ نے سات مرتبہ دھونے کا حکم دیا ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ کا یہ ارشاد استحباب پر محمول ہے کیونکہ حدیث کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا فتوی یہ ہے کہ تین مرتبہ دھونے سے برتن پاک ہوجاتا ہے (حضرت ابوہریرہؓ کا یہ فتوی طحاوی باب سؤر الکلب میں ہے)

پھر ائمہ ثلاثہ کے درمیان اس میں اختلاف ہوا ہے کہ برتن دھونے کا حکم کیوں ہے؟ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک یہ حکم طہارت کے لئے ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک یہ حکم تعبدی ہے، کیونکہ کتے کا جھوٹا ان کے نزدیک پاک ہے، اور تعبد کا مطلب یہ ہے کہ شریعت نے دھونے کا حکم دیا ہے اس لئے دھوتے ہیں، اس کی وجہ ہم نہیں جانتے، اور جمہور کی دلیل مسلم شریف کی روایت ہے: طُهور إناء أحدكم إذا وَلَغَ الكلبُ فيه أن يَغْسِلَه سبعَ مرات: تمہارے برتن کی پاکی جب اس میں کتا منہ ڈال دے یہ ہے کہ اس کو سات مرتبہ دھوؤ (مسلم ۱: ۱۳۷) جمہور لفظ طُهور سے استدلال کرتے ہیں اور امام مالکؒ اس کو بالمعنی روایت قرار دیتے ہیں، یعنی راوی نے جیسا سمجھا ایسا لفظ بدل دیا۔

تیسرا مسئلہ: برتن کو مٹی سے مانجھنا امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک واجب ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص سات مرتبہ دھوئے مگر مٹی سے نہ مانجھے تو برتن پاک نہیں ہوگا۔ پھر امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک دو مرتبہ مٹی سے مانجھنا ضروری ہے، ایک مرتبہ سات کے اندر، دوسرے: آٹھویں مرتبہ۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی حدیث میں والثامنة بالتُراب آیا ہے، اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک سات کے اندر مانجھنا کافی ہے، اور آٹھویں مرتبہ مانجھنا مستحب ہے۔ اور امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک مانجھنا ضروری نہیں صرف مستحب ہے۔

فائدہ: ائمہ ثلاثہ تتریب وتسبیع کو شرعی حکم قرار دیتے ہیں، یعنی برتن کی پاکی کے لئے سات مرتبہ دھونا اور مٹی سے مانجھنا ضروری ہے۔ البتہ امام مالکؒ تعبدی حکم قرار دیتے ہیں اور مٹی سے مانجھنے کو ضروری نہیں کہتے، اور احناف اس حکم کو ارشادی قرار دیتے ہیں، یعنی لوگوں کو ان کی بھلائی کی بات بتائی گئی ہے۔ لوگوں کو چاہئے کہ کتے کے جھوٹے برتن کو سات مرتبہ دھوئیں اور ایک مرتبہ مٹی سے مانجھیں، اور علامہ ابن رشد مالکی رحمہ اللہ نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ممکن ہے کتا ہڑکایا (باؤلا) ہو، اور ہڑک کے جراثیم چپکو ہوتے ہیں، جب تک مریں گے نہیں برتن سے نکلیں گے نہیں، اور ان کا علاج نوشادر ہے جو مٹی میں ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ پس جب برتن مٹی سے مانجھا جائے گا تو جراثیم مرجائیں گے اور بار بار دھونے سے نکل جائیں گے۔ اور ان کی مضرت سے آدمی بچ جائے گا۔

یا تتریب وتسبیع کا مقصد تنفیر ہے، یعنی لوگوں کے دلوں میں کتوں کی نفرت بٹھانا ہے، پس تتریب وتسبیع کا حکم وجوبی

نہیں استحبابی ہوگا۔ اور حدیث کے راوی کا فتوی عدم وجوب کی دلیل ہے، اور بعض حضرات اس حدیث کو منسوخ قرار دیتے ہیں، مگر یہ توجیہ ٹھیک نہیں، کیونکہ تسبیع وتتریب کے استحباب کا قول احناف کے یہاں بھی موجود ہے، اگر یہ حکم ختم ہوگیا تھا تو استحباب کیسے باقی رہتا؟ اس لئے صحیح پہلی دو توجیہیں ہیں۔

بابٌ: إِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِي الإِنَاءِ

[۱۷۲-] حدثنا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: أَنَا مَالِكٌ، عَنْ أَبِي الزِّنَادِ، عَنِ الأَعْرَجِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: أَنَّ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ: " إِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِيْ إِنَاءِ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعًا "

ترجمہ: نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا پیئے تو چاہئے کہ وہ اس کو سات مرتبہ دھوئے۔

تشریح: یہ حدیث سورِ کلب کی طہارت وعدم طہارت میں صریح نہیں، اور مسلم شریف کی حدیث جس میں لفظ طهور ہے امام بخاریؒ نے اس کی تخریج نہیں کی۔ اس وجہ سے بعض حضرات نے یہ اندازہ کیا ہے کہ امام بخاریؒ اس مسئلہ میں امام مالکؒ کے ساتھ ہیں۔

[۱۷۳-] حدثنا إِسْحَاقُ، قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ الصَّمَدِ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ دِيْنَارٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبِيْ، عَنْ أَبِيْ صَالِحٍ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم " أَنَّ رُجُلاً رَأَى كَلْبًا يَأْكُلُ الثَّرَى مِنَ الْعَطَشِ، فَأَخَذَ الرَّجُلُ خُفَّهُ فَجَعَلَ يَغْرِفُ لَهُ بِهِ، حَتّٰى أَرْوَاهُ، فَشَكَرَ اللّٰهُ لَهُ فَأَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ "

[انظر: ۲۳۶۳، ۲٤٦٦، ٦٠٠٩]

ترجمہ: گذشتہ امتوں میں سے کسی شخص کا واقعہ ہے کہ وہ پانی پینے کے لئے کنویں میں اترا، جب پانی پی کر باہر نکلا تو اس نے ایک کتے کو دیکھا جو پیاس کی وجہ سے گیلی مٹی چاٹ رہا تھا، اس نے سوچا: جتنی شدید پیاس مجھے لگی تھی کتا بھی اتنا شدید پیاسا ہے، اس کو پانی پلانا چاہئے، چنانچہ وہ دوبارہ کنویں میں اترا اور اپنے خف میں پانی بھر کر لایا اور کتے کے سامنے چلو بھر بھر کر پانی ڈالنے لگا یہاں تک کہ اس کو سیراب کردیا، پس اللہ تعالیٰ نے اس بندے کا شکریہ ادا کیا، اور اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا یہ ہے کہ اس کی بخشش فرمادی اور اس کو جنت میں داخل فرمایا۔

تشریح: اس حدیث سے استدلال اس طرح ہے کہ اس بندے نے خف میں پانی پلایا تھا، اور کتے نے خف میں منہ ڈال کر پانی پیا تھا، اگر کتے کا جھوٹا ناپاک ہوتا تو موزہ ناپاک ہوجاتا اور وہ بندہ اس موزے کو دھوتا حالانکہ حدیث میں اس کا تذکرہ نہیں۔

اس استدلال کے حاشیہ میں متعدد جواب لکھے ہیں، مثلاً: یہ گذشتہ شریعت کا واقعہ ہے جو ہماری شریعت میں حجت

نہیں، ہماری شریعت میں کتے کے جھوٹے کے بارے میں مستقل احکام ہیں۔ دوسرا جواب: اس بندے نے خف میں پانی پلایا تھا اس کی کوئی دلیل نہیں، ہوسکتا ہے کسی گڈھے وغیرہ میں پانی ڈالا ہو جہاں سے کتے نے پیا ہو، پس جب احتمال نکل آیا تو استدلال باطل ہوگیا۔

[۱۷٤-] وَقَالَ أَحْمَدُ بْنُ شَبِيْبٍ: ثَنَا أَبِيْ، عَنْ يُوْنُسَ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ حَمْزَةُ بْنُ عَبْدِ اللهِ، عَنْ أَبِيْهِ، قَالَ: كَانَتِ الْكِلَابُ تُقْبِلُ وَتُدْبِرُ فِي الْمَسْجِدِ فِيْ زَمَانِ رسولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم، فَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرُشُّوْنَ شَيْئًا مِنْ ذٰلِكَ.

ترجمہ: ابن عمرؓ کہتے ہیں: نبی ﷺ کے زمانہ میں کتے مسجدِ نبوی میں آتے جاتے تھے اور صحابہ اس کی وجہ سے مسجد کو دھوتے نہیں تھے۔

تشریح:

جب مسجدِ نبوی نئی تعمیر ہوئی تو اس کے کواڑ نہیں تھے، رات میں کتے گھس آتے تھے، اور کتا زبان نکالے رہتا ہے، اس کی رال ٹپکتی رہتی ہے، مسجدِ نبوی میں بھی ان کا لعاب ٹپکتا ہوگا مگر صحابہ مسجد کو دھوتے نہیں تھے، معلوم ہوا کہ کتے کا لعاب پاک ہے، پس اس کا سور بھی پاک ہے۔

مگر یہ استدلال محلِ نظر ہے، کیونکہ ابن عمرؓ کی اسی حدیث میں ابوداؤد میں یہ بھی ہے کہ کتے مسجدِ نبوی میں پیشاب کرتے تھے اور مسجد دھوئی نہیں جاتی تھی (ابوداؤد ۱:۵۵ باب في طهور الأرض إذا يبست) ظاہر ہے کتے کا پیشاب پاک نہیں، اور مسجدِ نبوی نہ دھونے کی وجہ یہ تھی کہ زمین جس طرح دھونے سے پاک ہوتی ہے خشک ہوجانے سے بھی پاک ہوجاتی ہے جبکہ زمین پر ناپاکی کا اثر: رنگ، بو مزہ باقی نہ رہے۔ حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے مروی حدیث ہے: زَكَاةُ الْأَرْضِ يُبْسُهَا: زمین کی پاکی اس کا سوکھ جانا ہے۔ یہ حدیث حسن لغیرہ ہے، متعدد صحابہ اس کو روایت کرتے ہیں (نصب الرایہ ۱:۲۱۱) پس جس طرح پیشاب دھوئے بغیر خشک ہوجانے کی وجہ سے زمین پاک ہوجاتی ہے اسی طرح لعاب بھی خشک ہوگیا تو زمین پاک ہوگئی، پس اس حدیث سے لعاب کا پاک ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

[۱۷۵-] حدثنا حَفْصُ بْنُ عُمَرَ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، عَنِ ابْنِ أَبِي السَّفَرِ، عَنِ الشَّعْبِيِّ، عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ، قَالَ: سَأَلْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: " إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ الْمُعَلَّمَ فَقَتَلَ فَكُلْ، وَإِذَا أَكَلَ فَلَا تَأْكُلْ فَإِنَّمَا أَمْسَكَ عَلٰى نَفْسِهِ " قُلْتُ: أُرْسِلُ كَلْبِيْ فَأَجِدُ مَعَهُ كَلْبًا آخَرَ؟ قَالَ: "فَلَا تَأْكُلْ، فَإِنَّمَا سَمَّيْتَ عَلٰى كَلْبِكَ وَلَمْ تُسَمِّ عَلٰى كَلْبٍ آخَرَ"

[انظر: ۲۰۵٤، ۵٤۷۵، ۵٤۷٦، ۵٤۷۷، ۵٤۸۳، ۵٤۸٤، ۵٤۸۵، ۵٤۸٦، ۵٤۸۷، ۷۳۹۷]

ترجمہ: عدی بن حاتم (جو مشہور سخی حاتم طائی کے بیٹے ہیں پہلے نصرانی تھے پھر مسلمان ہوئے) کہتے ہیں: میں نے نبی ﷺ سے پوچھا (کہ ہم کتے کو شکار پر چھوڑتے ہیں پس کیا وہ جو شکار مارے وہ ہمارے لئے حلال ہے؟) آپؐ نے فرمایا: جب تم نے شکار کا طریقہ سکھلائے ہوئے کتّے کو شکار پر چھوڑا پس اس نے شکار کو مار ڈالا یعنی ذبح اختیاری کا موقع نہیں ملا تو وہ حلال ہے اسے کھاؤ، اور اگر اس نے خود شکار میں سے کھایا تو نہ کھاؤ، اس لئے کہ اب اس نے شکار اپنے لئے مارا ہے، میں نے پوچھا: میں اپنا کتا شکار پر چھوڑتا ہوں، پس میں اس کے ساتھ دوسرے کتے کو پاتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: اس صورت میں شکار حرام ہے اس کو کھانا جائز نہیں، اس لئے کہ تم نے اپنے کتے پر بسم اللہ پڑھی ہے، دوسرے کتے پر بسم اللہ نہیں پڑھی۔

تشریح:

۱- اس کتّے کا شکار حلال ہے جو معلّم (سکھلایا ہوا) ہو، اور کتے میں تعلیم کی علامت یہ ہے کہ وہ شکار میں سے نہ کھائے، ایسا کتا بسم اللہ پڑھ کر چھوڑا جائے تو اس کا کیا ہوا شکار حلال ہے خواہ وہ مر چکا ہو، اور اگر کتے نے شکار میں سے کھالیا تو یہ دلیل ہے کہ وہ معلّم نہیں، پس وہ شکار حرام ہے۔

۲- اگر شکار زندہ ملے تو ذبح اختیاری ضروری ہے، اور مرا ہوا ملے تو حلال ہے بشرطیکہ کتے نے شکار کو کسی جگہ سے پھاڑا ہو، یہ پھاڑنا ذبح اضطراری کے قائم مقام ہو جائے گا اور شکار حلال ہوگا، تفصیل اپنی جگہ آئے گی۔

۳- اگر شکار پر چھوڑے ہوئے کتے کے ساتھ غیر معلّم کتا مل جائے، اور دونوں مل کر شکار کریں یا دوسرا کتا بھی معلّم ہو مگر وہ چھوڑا نہ گیا ہو یا بغیر تسمیہ کے چھوڑا گیا ہو، یا غیر مسلم کا کتا ہو تو ان سب صورتوں میں شکار حلال نہیں۔ اور اگر دونوں کتے معلّم ہوں اور مسلمانوں کے یا کتابی کے ہوں اور دونوں تسمیہ کے ساتھ چھوڑے گئے ہوں تو شکار حلال ہے۔

۴- اس حدیث سے یہ ضابطہ بنایا گیا ہے کہ اگر کسی شکار میں دو سبب موت جمع ہو جائیں ایک حلال اور دوسرا حرام تو حرام والے سبب کو ترجیح ہوگی اور شکار حرام ہوگا، اسی میں احتیاط ہے، جیسے شکار تیر کھا کر پانی میں گرا اور نکالتے نکالتے مر گیا تو وہ حلال نہیں، کیونکہ یہاں دو سبب موت جمع ہوئے، ایک تیر لگنا، دوسرا پانی میں گرنا۔ پس دوسرے سبب کو ترجیح ہوگی، اور یہ سمجھا جائے گا کہ وہ بغیر ذبح مرا ہے اس لئے حرام ہوگا۔

۵- اس حدیث سے استدلال اس طرح ہے کہ جب کتا شکار کو پکڑے گا تو لامحالہ اس کے دانت گوشت میں گھسیں گے، اور گوشت پر لعاب لگے گا، اور نبی ﷺ نے گوشت دھونے کا حکم نہیں دیا، اس سے معلوم ہوا کہ کتے کا لعاب پاک ہے، پس اس کا سور بھی پاک ہے۔

جواب: یہ بات مفروغ عنہ ہے، ہر مسلمان جانتا ہے کہ کتے کا جھوٹا ناپاک ہے، اس لئے اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں، سائل نے جو بات پوچھی تھی اس کا جواب دیا۔

بابُ مَنْ لَمْ يَرَ الْوُضُوْءَ إِلاَّ مِنَ الْمَخْرَجَيْنِ: الْقُبُلِ وَالدُّبُرِ

سبیلین سے نکلنے والی چیز ہی سے وضو ٹوٹتا ہے

یہ باب اہم ہے، اور اس کے دو جزء ہیں: ایک: ایجابی، دوسرا: سلبی۔ ایجابی جزء یہ ہے: سبیلین سے جو بھی چیز نکلے وہ ناقض وضو ہے، خواہ وہ نکلنے والی چیز معتاد ہو یا غیر معتاد (یعنی ایسی چیز نکلے جو عادۃً نکلتی ہے یا ایسی چیز نکلے جو عام طور پر نہیں نکلتی، جیسے کیڑا وغیرہ) اور وہ نکلنے والی چیز خواہ قلیل ہو یا کثیر، اور سلبی جزء ہے: سبیلین کے علاوہ بدن سے نکلنے والی چیز خواہ پاک ہو جیسے آنسو پسینہ وغیرہ یا ناپاک ہو جیسے خون پیپ وغیرہ ان سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ باب میں متعدد آثار ہیں ان میں سے بعض جزء اول سے متعلق ہیں اور بعض ثانی سے، اور میں نے باب کی تحلیل کر کے دو جزء اس لئے بنائے ہیں کہ تمام آثار باب پر منطبق ہو جائیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ آیت کریمہ: ﴿أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ (المائدہ:٦) کے دونوں ٹکڑوں میں صرف نواقض وضو کا بیان ہے یا ناقض وضو اور ناقض غسل کا؟ ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں: دونوں میں نواقض وضو کا بیان ہے، ان کے نزدیک غائط سے مراد سبیلین سے نکلنے والی ناپاکی ہے اور لامستم: لَمَسْتُم کے معنی میں ہے، یعنی وضو دو چیزوں سے ٹوٹتا ہے ایک: ماخَرَجَ من السبیلین سے، دوم: عورت کو چھونے سے۔ دونوں ٹکڑوں میں ان کے نزدیک نواقض وضو کا بیان ہے۔ اور صحابہ میں سے حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی بھی یہی رائے تھی، ائمہ ثلاثہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

اور حنفیہ کے نزدیک آیت کے پہلے ٹکڑے میں ناقض وضو کا بیان ہے اور دوسرے ٹکڑے میں ناقض غسل کا، اور اس کی دو دلیلیں ہیں:

۱- اس سے پہلے وضو اور غسل دونوں کا بیان آیا ہے، پس عقل کا تقاضا ہے کہ جب نواقض کا بیان آئے تو دونوں کا آئے۔

۲- اللہ تعالیٰ نے لامستم النساء فرمایا ہے، جو باب مفاعلہ سے جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے اور اس باب کا خاصہ اشتراک ہے، یعنی دو شخصوں کا کسی کام میں شریک ہونا، پس لامستم کے معنی ہیں: مرد عورتوں کو اور عورتیں مردوں کو پکڑیں، اور یہ کیفیت انزال کے وقت ہوتی ہے لہٰذا یہ کنایہ ہے جماع سے، اور اس میں ناقض غسل کا بیان ہے۔ حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے علاوہ صحابہ کی یہی رائے تھی، اسی کو حنفیہ نے لیا ہے۔.........اب آثار واحادیث پڑھئے۔

[٣٤-] بابُ مَنْ لَمْ يَرَ الْوُضُوْءَ إِلاَّ مِنَ الْمَخْرَجَيْنِ: الْقُبُلِ وَالدُّبُرِ

[١-] لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ﴾ [المائدة:٦]

[۲-] وَقَالَ عَطَاءٌ فِيمَنْ يَخْرُجُ مِنْ دُبُرِهِ الدُّوْدُ، أَوْ مِنْ ذَكَرِهِ نَحْوُ الْقَمْلَةِ: يُعِيْدُ الْوُضُوْءَ.
[۳-] وَقَالَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ: إِذَا ضَحِكَ فِي الصَّلاَةِ أَعَادَ الصَّلاَةَ وَلَمْ يُعِدِ الْوُضُوْءَ.
[٤-] وَقَالَ الْحَسَنُ: إِنْ أَخَذَ مِنْ شَعْرِهِ أَوْ أَظْفَارِهِ أَوْ خَلَعَ خُفَّيْهِ فَلاَ وُضُوْءَ عَلَيْهِ.
[۵-] وَقَالَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ: لاَ وُضُوْءَ إِلاَّ مِنْ حَدَثٍ.

۱-﴿أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ﴾: اس آیت کی تنقیح میں اختلاف ہوا ہے۔ ائمہ ثلاثہ اور امام بخاری رحمہم اللہ کے نزدیک اس سے ما خَرَجَ من السبیلین: مراد ہے، کیونکہ بیت الخلاء میں سبیلین ہی سے ناپا کی نکلتی ہے، اور اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ سبیلین کے علاوہ سے نکلنے والی ناپا کی ناقض وضو نہیں۔ یہ باب کا سلبی جزء ہوا اور احناف سبیلین کی تخصیص نہیں کرتے، وہ ہر اس ناپا کی کو جو انسان کے بدن سے نکلے آیت کا مصداق قرار دیتے ہیں، لہٰذا سبیلین سے ناپا کی نکلے یا بدن سے خون یا پیپ نکلے یا منہ بھر کر قے ہو سب صورتوں میں وضو ٹوٹ جائے گا۔
۲-حضرت عطاءؒ کہتے ہیں: اگر پچھلی راہ سے کیڑا نکلے یا اگلی شرم گاہ سے جوں جیسی کوئی چیز نکلے تو وضو ٹوٹ جائے گا، حضرت عطاء تابعی ہیں اور تابعی کا قول مجتہدین پر حجت نہیں، اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کی رائے بھی یہی ہے کہ سبیلین سے کوئی بھی چیز نکلے خواہ معتاد چیز نکلے یا غیر معتاد وضو ٹوٹ جائے گا۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک سبیلین سے معتاد چیز نکلے تو وضو ٹوٹے گا، اور کیڑا نکلے تو وضو نہیں ٹوٹے گا، اس لئے کہ اس کا نکلنا معتاد نہیں۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک اگر نکلنے والے کیڑے پر ناپا کی ہے تو وضو ٹوٹے گا اور ناپا کی نہیں ہے تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اس لئے کہ کیڑا فی نفسہ پاک ہے اور ناقض ناپا کی کا نکلنا ہے —— حضرت عطاء کا یہ قول باب کے ایجابی جزء سے متعلق ہے، ایجابی جزء تھا: سبیلین سے نکلنے والی ہر چیز ناقض وضو ہے خواہ وہ معتاد ہو یا غیر معتاد، تھوڑی نکلے یا زیادہ۔ اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت عطاء کا یہی فتوی ہے۔
۳-حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب کوئی شخص نماز میں ہنسا تو نماز ٹوٹ گئی، مگر وضو باقی ہے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں —— یہ قول سلبی جزء سے متعلق ہے یعنی سبیلین کے علاوہ سے کوئی بھی چیز نکلے مثلاً منہ سے ہنسی نکلے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا یہی فتوی ہے۔
وضاحت: ہنسی کے تین درجے ہیں: پہلا درجہ تبسم ہے، اس کو اردو میں مسکرانا کہتے ہیں، یعنی چہرہ پر ہنسی کے آثار ظاہر ہوں، ہونٹ کھلیں، دانت نظر آئیں، مگر آواز نہ پیدا ہو۔ اس سے نماز نہیں ٹوٹتی، اور نہ وضو ٹوٹتا ہے —— پھر اس سے اوپر ضحک (ہنسنا) ہے، یعنی آواز پیدا ہو، مگر آواز خود سنے، دوسرا نہ سنے، اس سے صرف نماز ٹوٹتی ہے وضو نہیں ٹوٹتا —— پھر آخری درجہ ہے قهقهة: اردو میں اس کو کھلکھلا کر ہنسنا کہتے ہیں، یعنی ہنسی کی آواز دوسرے سنیں اس سے نماز اور وضو دونوں ٹوٹ جاتے ہیں۔ پس حضرت جابرؓ کا فتوی حنفیہ کے خلاف نہیں، احناف بھی ضحک کی صورت میں نماز

کے ٹوٹ جانے کے اور وضو کے نہ ٹوٹنے کے قائل ہیں۔

اور قہقہہ سے وضوٹوٹ جاتا ہے اس سلسلہ میں گیارہ حدیثیں ہیں: چار مرسل اور سات مسند، علامہ عینی رحمہ اللہ نے عمدۃ القاری میں اسی باب میں ان سب کو جمع کیا ہے، انہیں دیکھنا چاہئے۔

۴-حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر کسی باوضو شخص نے سر کے بال منڈائے، یا ناخن کاٹے یا پیروں میں سے خفین نکالے تو اس پر وضو ضروری نہیں، یعنی بالوں پر جو مسح کیا تھا وہ کافی ہے، دوبارہ مسح کی ضرورت نہیں، اسی طرح دوبارہ ناخن دھونے کی ضرورت نہیں اسی طرح خفین نکالنے کے بعد صرف پیر دھونے کافی ہیں ازسرنو وضو کی ضرورت نہیں ـــــ امام بخاریؒ نے اس قول سے غیر ما خرج من السبیلین کے ناقض وضو نہ ہونے پر استدلال کیا ہے۔

۵-حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''وضو واجب نہیں مگر حدث سے'' یہ حدیث آئندہ صفحہ پر آرہی ہے، اس سے ایجابی جزء بھی ثابت ہوتا ہے کہ سبیلین سے نکلنے والی چیز ناقض وضوء ہے اور مفہوم مخالف سے سلبی جزء بھی ثابت ہوتا ہے کہ سبیلین کے علاوہ سے نکلنے والی چیز ناقض نہیں۔

جواب (۱): حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد اس حدیث کا خلاصہ ہے جو آئندہ صفحہ پر آرہی ہے، کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے، دورانِ نماز اس کے پیٹ میں قراقر ہوا اور ہوا مبرز کے قریب آکر واپس لوٹ گئی، تو کیا حکم ہے؟ حضرت نے فرمایا: وضو نہیں ہے مگر حدث سے یعنی جب تک حدث کا یقین نہ ہو جائے نماز پڑھتا رہے، شک سے وضو نہیں ٹوٹتا، یعنی حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ ارشاد نواقض وضو کے بارے میں نہیں ہے بلکہ اس میں قطع وساوس کا بیان ہے کہ شک سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

جواب (۲): اس ارشاد میں حصر اضافی ہے، حقیقی نہیں، اگر حصر میں کوئی بھی فرد خارج نہ ہو، تمام افراد آجائیں تو وہ حصر حقیقی ہے، جیسے لا إلہ إلا اللہ میں حصر حقیقی ہے۔ اور مخصوص افراد کے اعتبار سے حصر ہو تو وہ حصر اضافی ہے، جیسے کہیں کہ بہادر زید ہی ہے، ایسا مخصوص افراد کے اعتبار سے کہا جاتا ہے، دنیا کے تمام بہادروں کا احاطہ مقصود نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہاں حدیث میں بھی حصر اضافی ہے، لہٰذا اس حدیث سے ایجابی جزء تو ثابت ہوسکتا ہے کہ ما خَرَجَ من السبیلین: ناقض وضو ہے مگر سلبی جزء ثابت نہیں ہوسکتا، کیونکہ مفہوم مخالف معتبر نہیں۔

[٦-] وَيُذْكَرُ عَنْ جَابِرٍ: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كَانَ فِيْ غَزْوَةِ ذَاتِ الرِّقَاعِ فَرُمِيَ رَجُلٌ بِسَهْمٍ فَنَزَفَهُ الدَّمُ، فَرَكَعَ وَسَجَدَ، وَمَضَى فِيْ صَلاَتِهِ.

[٧-] وَقَالَ الْحَسَنُ: مَا زَالَ الْمُسْلِمُوْنَ يُصَلُّوْنَ فِيْ جِرَاحَاتِهِمْ.

[٨-] وَقَالَ طَاوُسٌ، وَمُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ، وَعَطَاءٌ، وَأَهْلُ الْحِجَازِ: لَيْسَ فِيْ الدَّمِ وُضُوْءٌ.

۶-حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع میں ایک صحابی کو نماز کے دوران دشمن نے تیر مارا، وہ نماز میں مشغول رہے کیونکہ وہ سورۂ کہف پڑھ رہے تھے، اور ان کو بہت مزہ آرہا تھا، جب دشمن نے یکے بعد دیگرے تین تیر مارے تو انھوں نے نماز ختم کی اور اپنے ساتھ کو جگایا، جب کافر نے محسوس کیا کہ یہاں اور بھی چوکیدار ہے تو وہ بھاگ گیا (یہ ایک لمبا واقعہ ہے جو تفصیل سے ابوداؤد حدیث ۱۹۸ میں ہے) اس حدیث سے اس طرح استدلال کیا ہے کہ اگر خون ناقض وضو ہوتا تو وہ صحابی پہلے ہی تیر پر نماز ختم کر دیتے۔ ان کا نماز کو جاری رکھنا دلیل ہے کہ خون ناقض وضو نہیں۔

جواب: اس واقعہ سے استدلال صحیح نہیں، اس لئے کہ وہ صحابی خون میں لت پت تھے۔ ابوداؤد میں ہے: جب مہاجری نے انصاری صحابی کو خون میں لت پت دیکھا تو کہا: سبحان اللہ! آپؓ نے مجھے پہلے ہی تیر پر کیوں نہ جگادیا؟ انھوں نے فرمایا: میں ایک ایسی سورت پڑھ رہا تھا جس کو میں درمیان میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، **فلما رأى المهاجری مابالأنصاری من الدِّماء، قال سبحان الله: ألا أَنْبَهْتَنِی أَوَّلَ ما رَمَی، قال: كنتُ فی سورة أقرأُ ها فلم أُحِبَّ أن أَقْطَعَها**۔ اور خون بالاجماع ناپاک ہے، پس جب یہ صحابی خون میں لت پت ہو گئے تھے تو ان کی نماز کیسے باقی رہی؟ اصل بات یہ ہے کہ اس واقعہ کا تعلق عشق سے ہے، جس کے احکام جدا ہیں۔

۷-حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مسلمان فوجی برابر جنگوں میں زخموں کے ساتھ نماز پڑھتے رہے ہیں، یعنی زخموں سے خون نکلتا رہتا تھا اور وہ نماز پڑھتے رہتے تھے۔ معلوم ہوا کہ سبیلین کے علاوہ سے خون وغیرہ کا نکلنا ناقض وضو نہیں۔

جواب: یہ استدلال بھی تام نہیں، اس لئے کہ وہ معذور تھے اور معذور کے احکام جدا ہیں، معذور کا عذر سے وضو نہیں ٹوٹتا، پس حضرت حسن رحمہ اللہ کا ارشاد بجا ہے مگر اس کا نواقض وضو سے کوئی تعلق نہیں، اس کا تعلق معذور سے ہے۔

۸-حضرت طاؤسؒ، محمد بن علیؒ (امام باقر) عطاء بن ابی رباحؒ اور حجازی علماء کہتے ہیں کہ خروج دم سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

حضرت طاؤس مکہ کے رہنے والے تھے، ان کا لقب طاؤس العلماء تھا، پرندوں میں جو مقام مور کو حاصل ہے علماء میں حضرت طاؤس کو وہی مقام حاصل تھا۔ اور محمد بن علی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے اور حضرت علی زین العابدین کے صاحبزادے اور حضرت جابرؓ کے خاص شاگرد ہیں اور باقر کے لقب سے معروف ہیں۔ باقِر: اسم فاعل کے معنی ہیں: پھاڑنے والا، مراد وسیع العلم ہے۔ اور عطاء بن ابی رباح کا تعارف پہلے آچکا ہے کہ وہ حضرت ابن عباسؓ کے خاص شاگرد اور امام اعظم رحمہ اللہ کے استاذ ہیں۔ اور حجازی علماء سے مراد ائمہ ثلاثہ وغیرہ ہیں۔ ان سب حضرات کی رائے ہے: **لیس فی الدم وضوءٌ**: خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، مگر تابعین کے اقوال مجتہدین پر حجت نہیں، پھر دم کی دو قسمیں ہیں: سائل اور غیر سائل۔ یہاں کونسا دم مراد ہے؟ یہ بات معلوم نہیں، دم غیر سائل بھی مراد ہو سکتا ہے اس سے حنفیہ کے نزدیک بھی وضو نہیں ٹوٹتا۔

[۹-] وَعَصَرَ ابْنُ عُمَرَ بَثْرَةً فَخَرَجَ مِنْهَا دَمٌ فَلَمْ يَتَوَضَّأْ.
[۱۰-] وَبَزَقَ ابْنُ أَبِي أَوْفَى دَمًا فَمَضَى فِي صَلَاتِهِ.
[۱۱-] وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ، وَالْحَسَنُ فِيمَنْ يَحْتَجِمُ: لَيْسَ عَلَيْهِ إِلَّا غَسْلُ مَحَاجِمِهِ.

۹- حضرت ابن عمرؓ نے ایک مرتبہ پھنسی دبائی، اس میں سے کچھ مواد نکلا، انھوں نے اس کو انگلیوں سے مسل دیا اور وضو کئے بغیر نماز پڑھی۔

جواب: امام بخاری رحمہ اللہ نے جن الفاظ میں یہ اثر پیش کیا ہے وہ پورے الفاظ نہیں، یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں اس طرح ہے: عَصَرَ بَثْرَةً في وجهه فَخَرَجَ منها شيئٌ مِنْ دَمٍ فَحَكَّه بين أُصْبُعَيْهِ ثم صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ: حضرت ابن عمرؓ کے چہرے میں پھنسی تھی، اس کو دبایا تو اس میں سے کچھ خون نکلا، حضرت نے اس خون کو انگلیوں میں مسل دیا، پھر نماز پڑھی اور نیا وضو نہیں کیا، اس میں صراحت ہے کہ پھنسی میں سے ذرا سا خون نکلا تھا یعنی وہ دم غیر سائل تھا اور دم غیر سائل حنفیہ کے نزدیک بھی ناقض وضو نہیں۔

۱۰- حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ نے خون تھوکا یعنی تھوک میں خون آیا اور وہ نماز پڑھتے رہے، خون کی وجہ سے نماز نہیں توڑی، معلوم ہوا کہ خون کا نکلنا ناقض وضوء نہیں۔

وضاحت: حنفیہ کے نزدیک اس مسئلہ میں تفصیل ہے، اگر منہ میں خون پیٹ سے آیا ہے تو قئی کے احکام جاری ہونگے، منہ بھر کر خون ہو تو وضو ٹوٹے گا ورنہ نہیں، اور دانتوں میں سے خون نکلا ہے تو غلبہ کا اعتبار ہوگا، اگر تھوک غالب ہے تو وضو نہیں ٹوٹے گا اور خون غالب ہے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ نے تھوک میں جو خون دیکھا تھا وہ پیٹ کا خون تھا یا دانتوں کا؟ اور غالب تھا یا مغلوب؟ جب تک یہ بات طے نہ ہو استدلال درست نہیں۔

فائدہ: حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ آخری صحابی ہیں جن کا کوفہ میں انتقال ہوا ہے۔ سن ۸۷ھ میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ نے ان کو بالیقین دیکھا ہے اور ان سے روایت بھی کی ہے، امام اعظم کی پیدائش میں دو قول ہیں: ۷۰ھ اور ۸۰ھ۔ دوسرے قول کے اعتبار سے ابن ابی اوفی کی وفات کے وقت آپ کی عمر آٹھ سال ہوگی، یہ عمر تحمل حدیث کے لئے کافی ہے۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیکھنا بھی نہایت قوی دلائل سے ثابت ہے اور تقریباً بیس اکابر علماء نے اس کو تسلیم کیا ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں: قواعد فی علوم الحدیث ص: ۳۰۶، تحقیق شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ)

۱۱- حضرت ابن عمرؓ اور حسن بصریؒ نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو پچھنے لگوائے کہ اس پر لازم نہیں مگر پچھنے لگوانے کی جگہ کا دھونا۔

وضاحت: اس اثر سے امام بخاریؒ کا استدلال اس پر موقوف ہے کہ یہ حصر حقیقی ہو، یعنی پچھنے لگوانے والے پر صرف

پچھنے کی جگہ کو دھونا ہے، اس کے علاوہ کچھ واجب نہیں، نہ غسل واجب ہے نہ وضو، مگر حنفیہ کے نزدیک یہ حصر اضافی ہے اور غسل کے اعتبار سے حصر ہے کہ صرف محاجم کو دھونا ضروری ہے، پورے بدن کو دھونا ضروری نہیں، رہا مسئلہ وضو کا تو وہ مسکوت عنہ ہے۔

[۱۷٦-] حدثنا آدَمُ بْنُ أَبِیْ إِیَاسٍ، قَال: ثَنَا ابْنُ أَبِیْ ذِئْبٍ، قَالَ: ثَنَا سَعِیْدُ الْمَقْبُرِیُّ، عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ، قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم: "لَا یَزَالُ الْعَبْدُ فِیْ صَلَاةٍ مَا کَانَ فِی الْمَسْجِدِ یَنْتَظِرُ الصَّلَاةَ مَا لَمْ یُحْدِثْ"، فَقَالَ رَجُلٌ أَعْجَمِیٌّ: مَا الْحَدَثُ یَا أَبَا هُرَیْرَةَ؟ قَالَ: الصَّوْتُ، یَعْنِی الضَّرْطَةَ.
[انظر: ٤٤٥، ٤٧٧، ٦٤٧، ٦٤٨، ٦٥٩، ٢١١٩، ٣٢٢٩، ٤٧١٧]

[۱۷۷-] حدثنا أَبُو الْوَلِیْدِ، قَالَ: ثَنَا ابْنُ عُیَیْنَةَ، عَنِ الزُّهْرِیِّ، عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِیْمٍ، عَنْ عَمِّهِ، عَنِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم قَالَ: "لَا یَنْصَرِفُ حَتّٰی یَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ یَجِدَ رِیْحًا" [راجع: ١٣٧]

حدیث (۱): حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا: آدمی برابر نماز میں رہتا ہے جب تک وہ مسجد میں نماز کا انتظار کرتا ہے، جب تک وہ نئی بات پیدا نہ کرے، ایک عجمی طالب علم نے پوچھا: حضرت! نئی بات پیدا کرنا کیا ہے؟ آپؓ نے فرمایا: آواز کرنا یعنی پادنا نئی بات پیدا کرنا ہے۔

تشریح:

۱- اس حدیث سے یہ ضابطہ بنا ہے کہ منتظر صلوٰۃ بحکم صلوٰۃ ہے۔ ایک طالب علم کہتا ہے: جب انتظارِ صلوٰۃ سے نوافل کا ثواب ملتا ہے تو پھر نفلیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ روٹی ملے یوں تو کھیتی کرے کیوں؟ جواب: بیشک منتظر صلوٰۃ کو نفلوں کا ثواب ملتا ہے، مگر صرف اصلی ثواب ملتا ہے فضلی نہیں ملتا، اور جو بالفعل نماز پڑھ رہا ہے اس کو اصلی اور فضلی (انعامی) دونوں ثواب ملتے ہیں، جیسے ایک مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھنے سے تہائی قرآن کا ثواب ملتا ہے، یہ تہائی قرآن کا اصلی ثواب ہے اور جو تہائی قرآن پڑھے گا اس کو اصلی اور فضلی دونوں ثواب ملیں گے، جو یقیناً ایک ثواب سے بڑھ کر ہیں۔

۲- امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال اس طرح ہے کہ حدث کے اصل معنی ہیں: ہگنا، اور ہگنا دو ہیں: ایک بڑا ہگنا، یعنی پاخانہ کرنا اور دوسرا چھوٹا ہگنا یعنی ریح خارج کرنا۔ نبی ﷺ نے اسی کو ناقض وضو کہا ہے، معلوم ہوا کہ ماخَرَجَ من السبیلین ناقض ہے اور اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ ما خرج من غیر السبیلین ناقض وضو نہیں، پس ثابت ہوا کہ سبیلین سے کوئی چیز نکلے گی تو وضو ٹوٹے گا، اور غیر سبیلین سے نکلنے کی صورت میں وضو نہیں ٹوٹے گا۔

جواب: یہ ہے کہ اس حدیث میں ناقض وضو کا بیان نہیں، بلکہ یہ حدیث قطع وساوس کے باب سے ہے کہ اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہے یا نماز کا انتظار کر رہا ہے اور پیٹ میں قراقر ہوا اور ہوا مبرز کے قریب آکر لوٹ جائے تو شکی مزاج آدمی کو وضو

ٹوٹنے کا وہم ہوتا ہے، اس سے کہا جا رہا ہے کہ اس وہم پر دھیان نہ دے، جب تک حدث کا یقین نہ ہو نماز پڑھتا رہے۔

حدیث (۲): نبی ﷺ نے فرمایا (نماز سے) واپس نہ پھرے یہاں تک کہ آواز سنے یا بدبو محسوس کرے، یہ حدیث بھی قطع وساوس کے باب سے ہے، یعنی جب تک حدث کا یقین نہ ہو جائے خواہ ریح کی آواز سن کر یقین ہو، یا بدبو سے یقین ہو یا کسی اور طرح سے یقین ہو، اس وقت تک وضو نہیں ٹوٹتا............اسی حدیث سے یہ فقہی ضابطہ بنا ہے: الیقین لایزول بالشکّ۔

[۱۷۸-] حدثنا قُتَیْبَةُ، قَالَ: ثَنَا جَرِیْرٌ، عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ مُنْذِرٍ أَبِیْ یَعْلَى الثَّوْرِیِّ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَنَفِیَّةِ، قَالَ: قَالَ عَلِیٌّ: کُنْتُ رَجُلًا مَذَّاءً فَاسْتَحْیَیْتُ أَنْ أَسْأَلَ رسولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیه و لم فَأَمَرْتُ الْمِقْدَادَ ابْنَ الْأَسْوَدِ فَسَأَلَهُ فَقَالَ: "فِیْهِ الْوُضُوْءُ" وَرَوَاهُ شُعْبَةُ عَنِ الْأَعْمَشِ. [راجع: ۱۳۲]

اس حدیث سے استدلال اس طرح ہے کہ مذی ذکر سے نکلتی ہے اور اس میں وضو ہے، پس اس کا مفہوم مخالف نکلا کہ ما خرج من غیر السبیلین ناقض وضو نہیں۔

اور جواب یہ ہے کہ مفہوم مخالف حنفیہ کے نزدیک حجت نہیں، علاوہ ازیں: حضرت علیؓ جب بھی مذی نکلتی تھی تو غسل کرتے تھے، اس اعتبار سے حصر ہے کہ مذی میں صرف وضو ہے، غسل ضروری نہیں۔

ملحوظہ: شعبہ رحمہ اللہ جریر کے متابع ہیں یعنی وہ بھی اعمشؒ سے اس حدیث کو روایت کرتے ہیں۔

[۱۷۹-] حدثنا سَعْدُ بْنُ حَفْصٍ، قَالَ: ثَنَا شَیْبَانُ، عَنْ یَحْیَى، عَنْ أَبِیْ سَلَمَةَ، أَنَّ عَطَاءَ بْنَ یَسَارٍ أَخْبَرَهُ، أَنَّ زَیْدَ بْنَ خَالِدٍ أَخْبَرَهُ، أَنَّهُ سَأَلَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ، قُلْتُ: أَرَأَیْتَ إِذَا جَامَعَ وَلَمْ یُمْنِ؟ قَالَ عُثْمَانُ: یَتَوَضَّأُ کَمَا یَتَوَضَّأُ لِلصَّلَاةِ، وَیَغْسِلُ ذَکَرَهُ، قَالَ عُثْمَانُ: سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم، فَسَأَلْتُ عَنْ ذٰلِكَ عَلِیًّا، وَالزُّبَیْرَ، وَطَلْحَةَ، وَأُبَیَّ بْنَ کَعْبٍ رضی اللہ عنهم فَأَمَرُوْهُ بِذٰلِكَ. [انظر: ۲۹۲]

[۱۸۰-] حدثنا إِسْحَاقُ بْنُ مَنْصُوْرٍ، قَالَ: أَخْبَرَنَا النَّضْرُ، قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ، عَنِ الْحَکَمِ، عَنْ ذَکْوَانَ أَبِیْ صَالِحٍ، عَنْ أَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم أَرْسَلَ إِلٰى رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ فَجَاءَ وَرَأْسُهُ یَقْطُرُ، فَقَالَ النبیُّ صلی اللہ علیه وسلم: "لَعَلَّنَا أَعْجَلْنَاكَ" فَقَالَ: نَعَمْ، فَقَالَ رسولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم: "إِذَا أُعْجِلْتَ أَوْ: قُحِطْتَ فَعَلَیْكَ الْوُضُوْءُ" تَابَعَهُ وَهْبٌ قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، وَلَمْ یَقُلْ غُنْدَرٌ وَیَحْیَى عَنْ شُعْبَةَ: الْوُضُوْءُ.

حدیث (۱): زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ کی کیا رائے

ہے جب کوئی شخص بیوی سے صحبت کرے اور انزال نہ ہو تو کیا حکم ہے؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا: وہ نماز والی وضو کرے اور شرم گاہ کو دھوڈالے۔ یعنی اکسال کی صورت میں صرف وضو ہے غسل واجب نہیں۔ پھر حضرت عثمانؓ نے فرمایا: میں نے یہ بات نبی ﷺ سے سنی ہے، حضرت زیدؓ کہتے ہیں: پھر میں نے یہی مسئلہ حضرات علی، زبیر، طلحہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم سے پوچھا تو انھوں نے بھی اسی کا حکم دیا، یعنی یہی مسئلہ بتایا کہ صرف وضو واجب ہے غسل واجب نہیں۔

حدیث (۲): ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو ایک انصاری کے پاس بھیجا وہ اس حال میں آئے کہ ان کے سر سے غسل کا پانی ٹپک رہا تھا۔ نبی ﷺ نے ان سے فرمایا: شاید ہم نے تم کو جلدی کرادی؟ انھوں نے کہا: ہاں یارسول اللہ! آپؐ نے فرمایا: جب تم جلدی کرادیئے جاؤ یا فرمایا کہ پانی کا قحط ہو جائے یعنی انزال نہ ہو تو تم پر وضو ہے۔

تشریح:

۱-اکسال: باب افعال کا مصدر ہے اس کے معنی ہیں: سست کرنا۔ یعنی جماع شروع کرنے کے بعد کسی وجہ سے عضو میں فتور آجائے اور آدمی انزال کے بغیر جماع چھوڑ دے تو اس صورت میں غسل واجب ہوگا یا نہیں؟ یہ مسئلہ دور صحابہ میں اختلافی تھا، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اختلاف ختم ہوگیا، اب پوری امت متفق ہے کہ اکسال کی صورت میں غسل واجب ہے۔ یہ مسئلہ تفصیل سے کتاب الغسل کے آخر میں آئے گا۔

۲-امام بخاری رحمہ اللہ نے ان حدیثوں سے باب کے دونوں جزوں پر استدلال کیا ہے کہ اکسال میں مذی تو نکلتی ہے اس لئے نبی ﷺ نے وضو کو واجب کیا، معلوم ہوا کہ سبیلین سے نکلنے والی چیز ناقض وضو ہے۔ اور اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ سبیلین کے علاوہ سے نکلنے والی چیز ناقض نہیں، پس پہلا جزء بھی ثابت ہوگیا —— اور جواب اوپر آچکا کہ احناف کے نزدیک مفہوم مخالف معتبر نہیں۔

۳-حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے ان صحابی کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا تھا، اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ خود ان کے گھر تشریف لے گئے تھے۔ آپؐ کسی مہم پر جارہے تھے، بعض صحابہ ساتھ تھے، ان انصاری صحابی کو بھی ساتھ لینا تھا، آپؐ نے آواز دی، اتفاق سے اس وقت وہ بیوی کے ساتھ مشغول تھے۔ نبی ﷺ کی آواز سن کر وہ فوراً بیوی سے علاحدہ ہوگئے اور جلدی سے نہا کر باہر آئے اس حال میں کہ ان کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا —— یہ واقعہ کے متعلقات ہیں، اور متعلقات میں کبھی ایسا اختلاف ہوجاتا ہے، پس اس کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔

۴-دوسری حدیث کو حضرت شعبہؒ سے نضر بن شمیل، وہب، غندر اور یحییٰ: چار حضرات روایت کرتے ہیں، ان کی روایتوں میں یہ فرق ہے کہ نضر بن شمیل أخبرنا کہتے ہیں اور وہب حدثنا، اور یحییٰ اور غندر کی روایت میں وضو کا ذکر نہیں،

ان کی روایت مسند احمد میں ہے، اس کے الفاظ ہیں: لیس علیك الغسل، وضو کا تذکرہ نہیں۔

بابُ الرَّجُلِ يُوَضِّئُ صَاحِبَهُ

استاذ کو وضو کرانا

متعلقاتِ وضو میں استعانت جائز ہے، البتہ بے ضرورت اعضاء دھونا مکروہ ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے مسئلہ کی تین صورتیں کی ہیں: (۱) کسی کے لئے پانی اور مسواک وغیرہ رکھنا (۲) بے ضرورت وضو کرانا یعنی پانی ڈالنا (۳) بے ضرورت دوسرے کا اعضاء دھونا۔ اول جائز ہے، ثانی مکروہ تنزیہی (خلاف اولیٰ) ہے اور ثالث مکروہ تحریمی ہے۔

علامہ عینی رحمہ اللہ نے امام نوویؒ کی اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ احادیث سے صحابہ کا آنحضور ﷺ کو وضو کرانا یعنی پانی ڈالنا ثابت ہے، پس اس کو مکروہ اور خلافِ اولیٰ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ جس طرح متعلقاتِ وضو میں بے ضرورت استعانت جائز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ کے لئے وضو کا پانی رکھا تھا، آپؐ نے خوش ہو کر ان کو دعا دی تھی، اسی طرح صحابہ کرام نے نبی ﷺ کو وضو کرایا ہے، پس یہ بھی بلا کراہت جائز ہے، البتہ بے ضرورت دوسرے کا اعضاء دھونا مکروہ ہے، کیونکہ اس کا ثبوت نہیں۔

مگر علامہ عینی رحمہ اللہ کا اعتراض صحیح نہیں، اس لئے کہ جن روایات میں صحابہ کا نبی ﷺ کو وضو کرانا یعنی پانی ڈالنا مروی ہے وہ تمام سفر کے واقعات ہیں، اور سفر میں پانی چھاگل میں ہوتا ہے جیسے آج کل بوتل میں ہوتا ہے، پس کوئی پانی ڈالے گا تبھی وضو کیا جائے گا۔ غرض: سفر میں صحابہ کا پانی ڈالنا اور آپؐ کو وضو کرانا ضرورت کی وجہ سے تھا، اس لئے بات وہی صحیح معلوم ہوتی ہے جو امام نوویؒ نے فرمائی ہے۔

حدیث (۱): حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ جب عرفہ سے لوٹے تو ایک گھاٹی میں تشریف لے گئے اور قضاء حاجت فرمائی۔ حضرت اُسامہؓ کہتے ہیں: پس میں نے پانی ڈالا اور آپؐ نے وضو فرمایا، میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نماز پڑھیں گے؟ آپؐ نے فرمایا: نماز آگے ہے یعنی مزدلفہ میں جا کر نماز پڑھیں گے۔

تشریح: أفاض کے معنی ہیں: لوٹنا۔ مگر یہ لفظ عرفہ سے لوٹنے کے لئے خاص ہے، جیسے تلاوت کے معنی ہیں: پڑھنا۔ مگر یہ لفظ آسمانی کتابوں کے لئے خاص ہے، کسی اور کتاب کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں کیا جاتا۔ حجۃ الوداع میں عرفہ سے لوٹتے وقت نبی ﷺ نے راستہ میں کسی گھاٹی میں پیشاب فرمایا ہے پھر ہلکا وضو کیا ہے۔ اس میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے پانی ڈالا ہے اور یہ پانی ڈالنا ضرورت کی وجہ سے تھا۔

حدیث (۲): حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: وہ ایک سفر میں نبی ﷺ کے ساتھ تھے، آپؐ قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے، پھر حضرت مغیرہؓ نے پانی ڈالا اور آپؐ نے وضو فرمایا، پس آپؐ نے اپنا چہرہ اور ہاتھ

دھوئے، اور سر پر اور خفین پر مسح کیا۔

تشریح: یہ غزوۂ تبوک کا واقعہ ہے، اس میں بھی حضرت مغیرہؓ نے پانی ڈالا ہے اور یہ پانی ڈالنا بھی ضرورت سے تھا۔

[٣٥-] بابُ الرَّجُلِ يُوَضِّئُ صَاحِبَهُ

[١٨١-] حدثنا ابْنُ سَلَامٍ، قَالَ: أَنَا يَزِيْدُ بْنُ هَارُوْنَ، عَنْ يَحْيىَ، عَنْ مُوْسَى بْنِ عُقْبَةَ، عَنْ كُرَيْبٍ مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ: أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم لَمَّا أَفَاضَ مِنْ عَرَفَةَ عَدَلَ إِلَى الشِّعْبِ، فَقَضَى حَاجَتَهُ، قَالَ أُسَامَةُ: فَجَعَلْتُ أَصُبُّ عَلَيْهِ وَيَتَوَضَّأُ، فَقُلْتُ: يَارسولَ اللّٰهِ، أَتُصَلِّيْ؟ فَقَالَ: "الْمُصَلّٰى أَمَامَكَ" [راجع: ١٣٩]

[١٨٢-] حدثنا عَمْرُو بْنُ عَلِيٍّ، قَالَ: ثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ، قَالَ: سَمِعْتُ يَحْيىَ بْنَ سَعِيْدٍ يَقُوْلُ: أَخْبَرَنِيْ سَعْدُ بْنُ إِبْرَاهِيْمَ، أَنَّ نَافِعَ بْنَ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ أَخْبَرَهُ، أَنَّهُ سَمِعَ عُرْوَةَ بْنَ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ، يُحَدِّثُ عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ، أَنَّهُ كَانَ مَعَ رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فِيْ سَفَرٍ، وَأَنَّهُ ذَهَبَ لِحَاجَةٍ لَهُ، وَأَنَّ الْمُغِيْرَةَ جَعَلَ يَصُبُّ الْمَاءَ عَلَيْهِ، وَهُوَ يَتَوَضَّأُ، فَغَسَلَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ، وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ، وَمَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ.

[انظر: ٢٠٣، ٢٠٦، ٣٦٣، ٣٨٨، ٢٩١٨، ٤٤٢١، ٥٧٩٨، ٥٧٩٩]

لغت: المصلّٰی: نماز پڑھنے کی جگہ۔ أمامك: تیرے آگے۔

بابُ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ بَعْدَ الْحَدَثِ وَغَيْرِهِ

بے وضوء تلاوت اور ادعیہ واذکار جائز ہیں

حدث سے حدث اصغر (بے وضو ہونا) مراد ہے اور حدث اکبر کے لئے لفظ جنابت استعمال کرتے ہیں، اس باب میں مسئلہ یہ ہے کہ بے وضو قرآن مجید کی تلاوت جائز ہے، بے وضو قرآن کو چھونا الگ مسئلہ ہے، اور اس میں اختلاف ہے، مگر بے وضو قرآن مجید کی تلاوت جائز ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور غیرہ کا عطف قراءۃ القرآن پر ہے، اور غیر سے مراد اذکار وادعیہ ہیں، یعنی بے وضو تلاوت قرآن بھی جائز ہے اور اذکار وادعیہ بھی۔ اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔

اور بعض لوگوں نے الحدث پر عطف کیا ہے، یعنی حدثِ اصغر اور حدث اکبر دونوں صورتوں میں قرآن کی تلاوت جائز ہے، غیر مقلدین اسی کے قائل ہیں۔ اور امام بخاریؒ کی بھی یہی رائے ہے، مگر حضرت نے یہ مسئلہ کتاب الحیض (باب تقضی الحائض المناسك کلّها) میں بیان کیا ہے، یہاں یہ مسئلہ نہیں چھیڑا، اس لئے صحیح یہ ہے کہ وغیرہ کا عطف قراءۃ القرآن پر ہے اور غیر سے مراد اذکار وادعیہ ہیں۔

امام بخاریؒ نے حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے دوقول پیش کیے ہیں: ایک منصور کی سند سے ہے اور دوسرا: حماد کی سند سے، ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں: حمام میں تلاوتِ قرآن کی گنجائش ہے، لابأس به کے معنی ہیں: گنجائش ہے اس میں خلاف اولیٰ کا مفہوم ہے، یعنی جائز تو ہے مگر مناسب نہیں۔

حمام: نہانے دھونے کے ہوٹل کو کہتے ہیں، جن ملکوں میں پانی کم ہے وہاں جگہ جگہ ہوٹل بنے ہوئے ہوتے ہیں جہاں نہانے دھونے کا پورا انتظام ہوتا ہے، لوگ وہاں جاکر نہاتے دھوتے ہیں، جو حمام میں نہانے کے لئے جائے گا، عام طور پر وہ بے وضو ہوگا، اور حضرت ابراہیمؒ نے وہاں تلاوت قرآن کو جائز کہا ہے، معلوم ہوا کہ بے وضو قرآن کریم کی تلاوت کرسکتا ہے۔

اور بے وضو خط لکھنے کی بھی گنجائش ہے: خط میں بھی کبھی آدمی قرآن کی کوئی آیت لکھتا ہے، یا کم از کم بسم اللہ ضرور لکھتا ہے، وہ بھی قرآن کی ایک آیت ہے، جب بے وضو قرآن مجید کی آیت لکھ سکتا ہے تو بے وضو قرآن کریم کی تلاوت بھی کرسکتا ہے، کَتْب مصدر ہے اور اس کا عطف القراء ۃ پر ہے، کبھی حرف جر کو لوٹا کر عطف کرتے ہیں۔

دوسرا اثر: جو شخص غسل خانہ میں ہو اس کو سلام کرسکتے ہیں؟ حضرت نخعیؒ نے فرمایا: اگر اس نے لنگی پہن رکھی ہے تو سلام کرسکتے ہیں اور ننگا ہو تو سلام کرنا جائز نہیں، ظاہر ہے جو غسل خانہ میں نہانے کے لئے گیا ہے وہ بے وضو ہوگا، اور وہ سلام کا جواب دے سکتا ہے، اور سلام ذکر ہے پس معلوم ہوا کہ بے وضو اللہ کا ذکر کرسکتے ہیں، یہ غیرہ کی مثال ہے۔

حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: انھوں نے ایک رات حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر گذاری، وہ ان کی خالہ ہیں۔ پس میں تکیہ کی چوڑائی میں سر رکھ کر سوگیا، اور نبی ﷺ اور زوجۂ مطہرہ تکیہ کی لمبائی میں سر رکھ کر سوئے، رسول اللہ ﷺ آدھی رات تک یا کچھ پہلے تک یا کچھ بعد تک سوئے (وہ گھڑیوں کا دور نہیں تھا، اس لئے اندازہ کیا کہ نصف رات تک یا کچھ کم یا زیادہ سوئے) پھر آپؐ بیدار ہوئے اور بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے چہرے سے نیند کو پونچھا، یعنی آنکھیں مل کر نیند اڑائی۔ پھر آپ ﷺ نے سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی دس آیتیں پڑھیں، پھر آپؐ ایک پرانے مشکیزہ کے پاس تشریف لائے جو گھر میں لٹکا ہوا تھا، اور اس سے وضو فرمایا، اور کامل وضو فرمایا، یعنی اعضاء مغسولہ کو تین تین بار دھویا، پھر نماز شروع فرمائی۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں: پس میں بھی کھڑا ہوا اور اسی طرح کیا جس طرح نبی ﷺ نے کیا تھا، یعنی میں نے بھی آنکھیں ملیں، اور نبی ﷺ جیسا وضو کیا، پھر میں گیا اور آپؐ کے پہلو میں (بائیں طرف) کھڑا ہوگیا، آپؐ نے اپنا دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھا اور میرے دائیں کان کو پکڑا آپؐ اس کو موڑ رہے تھے یعنی اشارہ کرکے دائیں طرف لے لیا، پس آپؐ نے دو دو کرکے تہجد کی بارہ رکعتیں پڑھیں، پھر وتر پڑھا، پھر آپؐ کروٹ پر لیٹ گئے، یہاں تک کہ مؤذن نے آکر نماز کی اطلاع دی، پس آپ کھڑے ہوئے اور دو ہلکی رکعتیں پڑھیں (یہ فجر کی سنتیں تھیں) پھر گھر سے باہر تشریف لائے اور فجر کی نماز پڑھائی۔

تشریح:

۱- حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت بار بار آئی ہے، اس میں ایک مضمون یہ ہے کہ آپؐ نے بیدار ہونے کے بعد سورۂ آل عمران کا آخری رکوع تلاوت فرمایا جس میں دس آیتیں ہیں۔ اس رکوع میں درحقیقت گیارہ آیتیں ہیں مگر عرب کسر چھوڑ دیتے ہیں اس لئے دس کہا، اور اس وقت بہ ظاہر آپؐ بے وضو ہونگے، اسی حال میں آپؐ نے قرآن پڑھا، معلوم ہوا کہ بے وضو تلاوت جائز ہے۔ پس ذکر و اذکار اور ادعیہ وغیرہ بدرجۂ اولیٰ جائز ہیں۔

۲- بخاری شریف کے شروع میں شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ کے جو تراجم ابواب ہیں وہاں حضرت نے فرمایا ہے کہ طویل سونے کے بعد حدث کا احتمال ہے اور نوم انبیاء ناقض وضو نہیں، اُس مسئلے کا اِس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں، یعنی یہ بات کہ نوم انبیاء ناقض وضو نہیں بالکل صحیح ہے مگر وہ مسئلہ الگ ہے اور یہ مسئلہ الگ ہے۔

۳- پہلے بتایا تھا کہ عربوں کے یہاں دو تکیے ہوتے ہیں ایک: بیٹھنے کے لئے جس کو اردو میں گدا کہتے ہیں اور عربی میں اس کو وِسادۃ کہتے ہیں، اور دوسرا: سر کے نیچے رکھنے کے لئے، اس کو مِخَدَّۃ کہتے ہیں، جس تکیہ پر حضرت ابن عباسؓ سر رکھ کر سوئے تھے وہ گدا تھا جس کو موڑ کر تکیہ بنالیا گیا تھا، اس کی چوڑائی پر ابن عباسؓ سوئے اور لمبائی پر نبی ﷺ اور زوجۂ مطہرہ سوئیں۔

۴- یہاں حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے بیدار ہونے کے بعد کامل وضو فرمایا، یعنی اعضاء مغسولہ کو تین تین بار دھویا، اور پہلے ایک باب گذرا ہے باب التخفیف فی الوضوء، وہاں ابن عباسؓ کی اسی حدیث میں یہ تھا کہ آپؐ نے ہلکا وضو فرمایا۔ وہ وضو دورانِ تہجد جب آپؐ سوئے ہیں اس وقت فرمایا ہے، اور تہجد شروع کرنے سے پہلے کامل وضو فرمایا ہے۔

۵- یہ روایت بخاری شریف میں متعدد بار آئی ہے، اور تعداد رکعات میں سخت اضطراب ہے۔ یہاں بارہ رکعتوں کا تذکرہ ہے، اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ایسے اختلاف کی صورت میں کسی ایک روایت کو سامنے رکھ کر کوئی بات طے کرنا جائز نہیں، اور وتر کی ایک رکعت پڑھی تھی یا تین؟ اس سلسلہ میں بھی یہ روایت صریح نہیں، پس یہ روایت نہ کسی کے موافق ہے اور نہ مخالف۔

[۳۶-] بابُ قِراءَةِ الْقُرْآنِ بَعْدَ الْحَدَثِ وَغَيْرِهِ

[۱-] وَقَالَ مَنْصُوْرٌ، عَنْ إِبْرَاهِيْمَ: لاَ بَأْسَ بِالْقِرَاءَةِ فِي الْحَمَّامِ، وَبِكَتْبِ الرِّسَالَةِ عَلَى غَيْرِ وُضُوْءٍ.

[۲-] وَقَالَ حَمَّادٌ، عَنْ إِبْرَاهِيْمَ: إِنْ كَانَ عَلَيْهِمْ إِزَارٌ فَسَلِّمْ، وَإِلَّا فَلاَ تُسَلِّمْ.

[۱۸۳-] حدثنا إِسْمَاعِيْلُ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ، عَنْ مَخْرَمَةَ بْنِ سُلَيْمَانَ، عَنْ كُرَيْبٍ مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ: أَنَّهُ بَاتَ لَيْلَةً عِنْدَ مَيْمُوْنَةَ زَوْجِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: وَهِيَ خَالَتُهُ،

فَاضْطَجَعْتُ فِيْ عَرْضِ الْوِسَادَةِ، وَاضْطَجَعَ رَسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم وَأَهْلُهُ فِيْ طُوْلِهَا، فَنَامَ رَسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم حَتّٰى انْتَصَفَ اللَّيْلُ، أَوْ قَبْلَهُ بِقَلِيْلٍ أَوْ بَعْدَهُ بِقَلِيْلٍ، اسْتَيْقَظَ رَسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فَجَلَسَ يَمْسَحُ النَّوْمَ عَنْ وَجْهِهِ بِيَدِهِ، ثُمَّ قَرَأَ الْعَشْرَ الآيَاتِ الْخَوَاتِيْمَ مِنْ سُوْرَةِ آلِ عِمْرَانَ، ثُمَّ قَامَ إِلٰى شَنٍّ مُعَلَّقَةٍ فَتَوَضَّأَ مِنْهَا فَأَحْسَنَ وُضُوْءَ هُ، ثُمَّ قَامَ يُصَلِّيْ.

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: فَقُمْتُ فَصَنَعْتُ مِثْلَ مَا صَنَعَ، ثُمَّ ذَهَبْتُ فَقُمْتُ إِلٰى جَنْبِهِ، فَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى رَأْسِيْ، وَأَخَذَ بِأُذُنِيْ الْيُمْنٰى يَفْتِلُهَا، فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ أَوْتَرَ، ثُمَّ اضْطَجَعَ حَتّٰى أَتَاهُ الْمُؤَذِّنُ، فَقَامَ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ، ثُمَّ خَرَجَ فَصَلَّى الصُّبْحَ.

[راجع: ١١٧]

بابُ مَنْ لَمْ يَتَوَضَّأْ إِلَّا مِنَ الْغَشْيِ الْمُثْقِلِ

ہلکی بیہوشی ناقض وضونہیں، کامل بیہوشی ناقض ہے

غَشْیٌ کے معنی ہیں: بے ہوش ہوجانا، یعنی ہلکی بیہوشی۔ اس صورت میں حواس باقی رہتے ہیں۔ اور وہ بیہوشی جس میں حواس باقی نہ رہیں اس کے لئے لفظ إغماء ہے اور دوسرا لفظ ہے: الغَشْيُ الْمُثْقِل: (بھاری بیہوشی) ہلکی بیہوشی سے وضونہیں ٹوٹتا، اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ اور وہ بیہوشی جس میں ہوش نہ رہے اس سے وضوٹوٹ جاتا ہے، چاہے ایک لحہ کے لئے بیہوشی طاری ہو جیسے لیٹ کر سوگیا اس کا وضوٹوٹ گیا، چاہے ایک لحہ کے لئے سویا ہو، کیونکہ خروج ریح کا مظنہ پیدا ہوگیا۔ اسی طرح بیہوشی سے چاہے ایک لحہ کے لئے ہو وضوٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ خروج ریح کا مظنہ پیدا ہوجاتا ہے، لیکن بیہوشی کا ابتدائی مرحلہ جس کو عربی میں غشی کہتے ہیں اور اردو میں اس کے لئے کوئی خاص لفظ نہیں اس سے بالا جماع وضو نہیں ٹوٹتا، کیونکہ اس میں ہوش باقی رہتا ہے۔

حدیث: پہلے گذری ہے: نبی ﷺ کے زمانہ میں ایک مرتبہ سورج گہن ہوا، آپؐ نے مدینہ منورہ میں منادی کرائی: الصلوۃ جامعة: جامع مسجد چلو نماز ہورہی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بھی آئیں، اس وقت صدیقہ نماز پڑھ رہی تھیں، اور مسجد میں جماعت ہورہی تھی اور صدیقہؓ حجرہ سے اقتدا کررہی تھیں۔ حضرت اسماءؓ نے پوچھا: یہ بے وقت کی نماز کیسی؟ صدیقہؓ نے سبحان اللہ کہا یعنی دیکھ نہیں رہی میری نیت بندھی ہوئی ہے اور انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا، انھوں نے پوچھا: کیا کوئی نشانی ظاہر ہوئی ہے؟ صدیقہؓ نے سر کے اشارہ سے ہاں کہا۔ چنانچہ وہ بھی جماعت میں شریک ہوگئیں، وہ کہتی ہیں کہ گرمی شدید تھی اس وجہ سے مجھ پر بیہوشی چھانے لگی، قریب میں ایک برتن میں پانی رکھا تھا، اس میں سے پانی لے کر میں سر پر ڈالتی تھی، تاکہ گرمی سے کچھ راحت ملے۔

حضرت اسماءؓ پر جو بیہوشی طاری ہوئی تھی وہ ہلکی بیہوشی تھی، ان کو ہوش تھا اسی وجہ سے وہ سر پر پانی ڈال رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ ہلکی بیہوشی ناقض وضو نہیں (باقی حدیث کا ترجمہ اور شرح کتاب الوضوء باب ۲۴ (حدیث ۸۶) میں پڑھیں)

[۳۷-] بابُ مَنْ لَمْ يَتَوَضَّأْ إِلَّا مِنَ الْغَشْيِ الْمُثْقِلِ

[۱۸۴-] حدثنا إِسْمَاعِيلُ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنِ امْرَأَتِهِ فَاطِمَةَ، عَنْ جَدَّتِهَا أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِيْ بَكْرٍ، أَنَّهَا قَالَتْ: أَتَيْتُ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم حِيْنَ خَسَفَتِ الشَّمْسُ، فَإِذَا النَّاسُ قِيَامٌ يُصَلُّوْنَ فَإِذَا هِيَ قَائِمَةٌ تُصَلِّيْ، فَقُلْتُ: مَا لِلنَّاسِ؟ فَأَشَارَتْ بِيَدِهَا نَحْوَ السَّمَاءِ، وَقَالَتْ: سُبْحَانَ اللّٰهِ! فَقُلْتُ: آيَةٌ؟ فَأَشَارَتْ: أَنْ نَعَمْ، فَقُمْتُ حَتّٰى تَجَلَّانِيَ الْغَشْيُ، وَجَعَلْتُ أَصُبُّ فَوْقَ رَأْسِيْ مَاءً، فَلَمَّا انْصَرَفَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم حَمِدَ اللّٰهَ وَأَثْنٰى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: "مَا مِنْ شَيْءٍ كُنْتُ لَمْ أَرَهُ إِلَّا قَدْ رَأَيْتُهُ فِيْ مَقَامِيْ هٰذَا حَتّٰى الْجَنَّةَ وَالنَّارَ، وَلَقَدْ أُوْحِيَ إِلَيَّ أَنَّكُمْ تُفْتَنُوْنَ فِي الْقُبُوْرِ مِثْلَ أَوْ: قَرِيْبًا مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ" - لَا أَدْرِيْ أَيَّ ذٰلِكَ قَالَتْ أَسْمَاءُ - يُؤْتٰى أَحَدُكُمْ فَيُقَالُ لَهُ: مَا عِلْمُكَ بِهٰذَا الرَّجُلِ؟ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ أَوِ: الْمُوْقِنُ - لَا أَدْرِيْ أَيَّ ذٰلِكَ قَالَتْ أَسْمَاءُ - فَيَقُوْلُ: هُوَ مُحَمَّدٌ رسولُ اللّٰهِ، جَاءَ نَا بِالْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى، فَأَجَبْنَا وَآمَنَّا وَاتَّبَعْنَا، فَيُقَالُ: نَمْ صَالِحًا، فَقَدْ عَلِمْنَا إِنْ كُنْتَ لَمُؤْمِنًا. وَأَمَّا الْمُنَافِقُ أَوِ: الْمُرْتَابُ - لَا أَدْرِيْ أَيَّ ذٰلِكَ قَالَتْ أَسْمَاءُ - فَيَقُوْلُ: لَا أَدْرِيْ، سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ شَيْئًا فَقُلْتُهُ [راجع: ۸٦]

بابُ مَسْحِ الرَّأْسِ كُلِّهِ

پورے سر کا مسح کرنا

وضو میں پورے سر کا مسح فرض ہے یا بعض سر کا؟ امام مالک اور امام بخاری رحمہما اللہ کے نزدیک پورے سر کا مسح فرض ہے، ایک بال بھی مسح سے رہ گیا تو وضو نہیں ہوگا اور نماز صحیح نہیں ہوگی، دیگر ائمہ کے نزدیک بعض سر کا مسح فرض ہے۔ پھر حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک چوتھائی سر کا مسح فرض ہے، اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک کم از کم اتنی مقدار جس پر مسح کا اطلاق ہو سکے کافی ہے۔ چنانچہ ان کے کئی قول ہیں: (۱) کم از کم تین بالوں کا مسح فرض ہے (۲) ایک بال پر بھی مسح کافی ہے (۳) بال کے بعض حصہ پر بھی مسح کافی ہے۔ جاننا چاہئے کہ احناف کا ایک قول یہ ہے کہ تین انگلیوں کے بقدر مسح فرض ہے مگر اس پر فتوی نہیں، مفتی بہ قول ربع رأس کا ہے۔

امام بخاریؒ کے دلائل:

پہلی دلیل: اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُ وْسِكُمْ﴾ رأس پورے سر کو کہتے ہیں، پس پورے سر پر مسح

فرض ہے، اور باء زائدہ ہے جیسے آیتِ تیمم ﴿فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ﴾ میں باء زائدہ ہے، اسی لئے تیمم میں پورے چہرے پر مسح فرض ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے اسی طرح آیت وضو میں بھی باء زائدہ ہے۔

دوسری دلیل: حضرت سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں: عورت مرد کی طرح ہے، وہ بھی اپنے سر پر مسح کرے گی، حضرت سعیدؒ نے لفظ بعض استعمال نہیں کیا، بلکہ رأس استعمال کیا ہے جبکہ بیان کا موقعہ ہے اور محل بیان میں بات پوری بیان کی جاتی ہے۔ پس اگر بعض سر کا مسح فرض ہوتا تو حضرت سعیدؒ اس کی وضاحت کرتے۔

تیسری دلیل: عقلی ہے جو حضرت سعیدؒ کے قول سے نکلتی ہے کہ عورت کا سر ستر ہے، اگر مسح میں کچھ تخفیف ہوتی تو عورت کے لئے ہوتی مگر اس کے لئے بھی کوئی تخفیف نہیں، اس کو بھی سر کھول کر پورے سر کا مسح کرنا ہے پس مرد کو بدرجۂ اولی پورے سر کا مسح کرنا ہوگا۔

جمہور کے دلائل:

جمہور کے نزدیک آیت وضو میں باء تبعیضیہ ہے، اور دلیل حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے وضو کیا اور ناصیہ پر اور پگڑی پر مسح کیا، یہ حدیث اعلی درجہ کی صحیح ہے، اور مسلم شریف میں ہے (مشکوٰۃ حدیث ۳۹۹) اور دوسری دلیل حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے وہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے پگڑی میں ہاتھ داخل کیا اور سر کے اگلے حصہ پر مسح کیا اور پگڑی توڑی نہیں (ابوداؤد حدیث ۱۴۷) ظاہر ہے پگڑی کے اندر ہاتھ ڈال کر بعض سر کا ہی مسح کیا جا سکتا ہے۔

غرض حنفیہ اور حنابلہ نے حضرت مغیرہؓ کی حدیث سامنے رکھ کر دو باتیں کہیں:

ایک: آیتِ وضو میں باء تبعیضیہ ہے اور پورے سر کا نہیں بلکہ بعض سر کا مسح فرض ہے، ورنہ ماننا پڑے گا کہ اس دن نبی ﷺ کا وضو نہیں ہوا، ایسی بات بھلا کون کہہ سکتا ہے؟

دوم: مقدار ناصیہ پر یعنی ربع رأس پر مسح فرض ہے۔ اگر اس سے کم پر مسح جائز ہوتا تو نبی ﷺ زندگی میں ایک مرتبہ عمل کر کے ضرور دکھاتے۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی باء تبعیضیہ ہے اور اتنی بات اس حدیث سے ثابت ہے مگر مقدار اپنے اجتہاد سے طے فرمائی ہے، ان کے نزدیک تین بال پر، یا ایک بال پر یا بال کے بعض حصہ پر مسح کافی ہے۔

اور جمہور کہتے ہیں جب آیتِ وضو کی تفسیر حدیث میں موجود ہے تو آیتِ تیمم پر قیاس کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آیت کی تفسیر حدیث سے کی جائے گی، جیسے تیمم میں ہاتھوں پر مسح مرفقین تک ہے یا رُسغین تک؟ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک رسغین تک ہے۔ انھوں نے آیتِ تیمم کو آیتِ سرقہ پر قیاس کیا ہے۔ آیتِ سرقہ میں صرف ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے، غایت مذکور نہیں۔ اور چور کا ہاتھ گٹے سے کاٹا جاتا ہے، اور آیتِ تیمم میں بھی غایت مذکور نہیں، پس ان پر بھی مسح

گٹوں تک کیا جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس رائے کو امام احمد رحمہ اللہ کے علاوہ کسی نے نہیں لیا، کیونکہ جب حدیث میں صراحت ہے کہ تیمّم کہنیوں تک کیا جائے گا تو اب قیاس کی کیا ضرورت ہے، اسی طرح یہاں بھی حدیث سے بعض سر پر مسح ثابت ہے پس اس کی روشنی میں آیت کی تفسیر کی جائے گی۔ آیتِ تیمّم پر قیاس کرنا درست نہیں۔

علاوہ ازیں: چہرہ پر تیمّم: چہرہ دھونے کے قائم مقام ہے اور اصل میں یعنی چہرہ دھونے میں استیعاب فرض ہے پس اس کے نائب تیمّم میں بھی استیعاب فرض ہوگا، اور تیمّم کی آیت میں باء کے تبعضیہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں برخلاف مسح رأس کے: وہ خود اصل ہے کسی کا قائم مقام نہیں، پس اس کو آیتِ تیمّم پر قیاس کرنا درست نہیں، اور برؤسکم میں باء تبعیضیہ ہے اس کی دلیل موجود ہے۔

اور حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ کا قول مجتہدین پر حجت نہیں، وہ تابعی ہیں۔ علاوہ ازیں: عورت کو بعض سر پر مسح کرنا ہے یا کل پر؟ حضرت سعیدؒ نے یہ مسئلہ بیان نہیں کیا، بلکہ ان کے قول کا مطلب یہ ہے کہ مردوں کی طرح عورت کو بھی سر کھول کر مسح کرنا ہے۔ وہ اوڑھنی وغیرہ پر مسح نہیں کرسکتی، کوئی اجنبی موجود ہو تب بھی سر کھول کر مسح کرے یہ شرعی ضرورت ہے، اس لئے حضرت سعیدؒ نے لفظ کل یا بعض استعمال نہیں کیا ان کو یہ مسئلہ بیان کرنا مقصود ہی نہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ جمہور کے دلائل پر مالکیہ نے اعتراض کیا ہے کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے ناصیہ پر اور پگڑی پر مسح کیا، اس طرح پورے سر کا مسح ہوگیا، بعض پر اصالۃً ہوا اور بعض پر ضمناً۔ چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ محنک پگڑی پر مسح کے جواز کے قائل ہیں، ان کے نزدیک پگڑی توڑے بغیر سر پر مسح کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے امام مالکؒ اور امام بخاریؒ نے ناصیہ والی حدیث کو نہیں لیا، مگر یہ اعتراض درست نہیں، یہ اعتراض حنابلہ کی طرف سے تو ہوسکتا ہے مالکیہ نہیں کرسکتے کیونکہ مالکیہ کے نزدیک پگڑی پر مسح درست نہیں۔

ہمیشہ پورے سر کا مسح کرنا چاہئے

جو مسائل معرکۃ الآراء ہوتے ہیں ان میں چونکہ لمبی بحثیں ہوتی ہیں اس لئے بعض مرتبہ ذہن غلط بن جاتا ہے، چنانچہ عام طور پر احناف آدھے سر کا مسح کرتے ہیں اور شوافع سر کے ذرا سے حصے کا۔ یہ بات ٹھیک نہیں، نبی ﷺ کی سنت مستمرہ پورے سر کا مسح کرنے کی ہے، صرف ایک مرتبہ مسئلہ کی وضاحت کے لئے سر کے اگلے حصہ کا مسح کیا ہے۔ اس لئے پورے سر کا مسح فرض نہ سہی سنت تو ہے، اس لئے ہمیشہ پورے سر کا مسح کرنا چاہئے۔

[۳۸-] بابُ مَسْحِ الرَّأْسِ كُلِّهِ

[۱-] لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿وَامْسَحُوا بِرُؤُسِكُمْ﴾ [المائدة:٦]

[۲-] وَقَالَ ابْنُ الْمُسَيَّبِ: الْمَرْأَةُ بِمَنْزِلَةِ الرَّجُلِ، تَمْسَحُ عَلٰى رَأْسِهَا.

[۳-] وَسُئِلَ مَالِكٌ: أَيُجْزِئُ أَنْ يَمْسَحَ بَعْضَ رَأْسِهِ؟ فَاحْتَجَّ بِحَدِيْثِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ.

[۱۸۵-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: أَنَا مَالِكٌ، عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى الْمَازِنِيِّ، عَنْ أَبِيْهِ: أَنَّ رَجُلاً قَالَ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ - وَهُوَ جَدُّ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى - أَتَسْتَطِيْعُ أَنْ تُرِيَنِيْ كَيْفَ كَانَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَتَوَضَّأُ؟ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ زَيْدٍ: نَعَمْ، فَدَعَا بِمَاءٍ فَأَفْرَغَ عَلٰى يَدِهِ فَغَسَلَ يَدَهُ مَرَّتَيْنِ، ثُمَّ مَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلاَثًا، ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلاَثًا، ثُمَّ غَسَلَ يَدَيْهِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ، ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَهُ بِيَدَيْهِ فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَأَدْبَرَ، بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ حَتّٰى ذَهَبَ بِهِمَا إِلٰى قَفَاهُ؛ ثُمَّ رَدَّهُمَا إِلَى الْمَكَانِ الَّذِيْ بَدَأَ مِنْهُ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ.[انظر: ۱۸۶، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۷، ۱۹۹]

ترجمہ: یحییٰ بن عمارہ کہتے ہیں: ایک شخص نے (عمرو بن عمارہ نے جو یحییٰ کے بھائی ہیں) حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے کہا: —— اور وہ یعنی سائل عمرو بن یحییٰ کے دادا ہیں (بلکہ وہ عمرو بن یحییٰ کے چچا ہیں) —— کیا آپ مجھے نبی ﷺ کا وضو دکھا سکتے ہیں کہ آپؐ کس طرح وضو فرماتے تھے؟ حضرت عبداللہؓ نے کہا: ہاں، چنانچہ انھوں نے پانی منگوایا، پھر پانی اپنے ہاتھ پر ڈالا، اور ہاتھ دومرتبہ دھوئے، پھر تین مرتبہ کلی کی اور ناک جھاڑی یعنی وصل کیا، پھر چہرہ تین مرتبہ دھویا، پھر دونوں ہاتھ دو دومرتبہ کہنیوں تک دھوئے، پھر دونوں ہاتھ سے سر پر مسح کیا، پس ان دونوں میں اقبال وادبار کیا، سر کے اگلے حصہ سے مسح شروع کیا، یہاں تک کہ دونوں ہاتھوں کو گدی تک لے گئے، پھر ان کو اس جگہ واپس لائے جہاں سے مسح شروع کیا تھا، پھر دونوں پاؤں دھوئے۔

تشریح:

۱- اس حدیث کے راویوں میں تھوڑا الجھاؤ ہے، حاشیہ میں بھی الجھاؤ ہے اس لئے اس کو اچھی طرح سمجھ لیں، ایک شخص ہیں ابوحسن یہ بدری عقبی صحابی ہیں، ان کے لڑکے ہیں: عمارہ، پھر عمارہ کے دولڑکے ہیں عمرو اور یحییٰ، پھر یحییٰ کے لڑکے عمرو ہیں، یہ جو یحییٰ کے لڑکے عمرو ہیں وہ اپنے ابا یحییٰ سے اس حدیث کو روایت کرتے ہیں اور سائل ہیں عمرو بن عمارہ جو یحییٰ کے بھائی اور عمرو بن یحییٰ کے چچا ہیں، وہ ہمیشہ باوضو رہتے تھے، ان کی وضو کے ساتھ خاص دلچسپی تھی اس لئے انھوں نے حضرت عبداللہؓ سے یہ سوال کیا ہے۔ اور وھو جد عمرو بن یحییٰ میں ھو کا مرجع سائل عمرو بن عمارہ ہیں جو عمرو بن یحییٰ کے دادا نہیں بلکہ چچا ہیں۔

۲- إقبال کے معنی ہیں: سامنے آنا، جیسے باب الظاہر سے کوئی شخص میری طرف آئے تو یہ اقبال ہے، اور إدبار کے معنی ہیں: پیٹھ پھیر کر جانا جیسے میری طرف سے باب الظاہر کی طرف جانا ادبار ہے۔ اجمال میں اقبال پہلے ہے اور إدبار بعد

میں، اور تفسیر میں إدبار کی تفسیر پہلے کی ہے، کیونکہ عرف میں اقبال پہلے اور ادبار بعد میں استعمال کیا جاتا ہے جبکہ مسح کا مسنون طریقہ یہ نہیں، اس لئے أدبر کی تفسیر پہلے کی۔

امام مالک رحمہ اللہ نے اس حدیث سے مسح رأس میں استیعاب کی فرضیت پر استدلال کیا ہے، اس لئے کہ نبی ﷺ نے دونوں ہاتھوں سے پورے سر کا مسح کیا ہے۔ مگر یہ فعلی حدیث ہے اور فعلی حدیث سے فرضیت ثابت نہیں ہوتی، ہاں فعلی روایت سے عدم فرضیت ثابت ہوسکتی ہے۔ حضرت مغیرہؓ کی حدیث فعلی ہے اس سے سر کے مسح میں استیعاب کی عدم فرضیت ثابت ہوسکتی ہے۔

۳- اس حدیث میں مضمضہ اور استنثار کے بعد ایک مرتبہ ثلاثاً آیا ہے، اور جہاں ایک مرتبہ ثلاثاً آئے وہاں وصل مراد ہوتا ہے، اور جہاں دو مرتبہ ثلاثاً آئے وہاں فصل مراد ہوتا ہے۔ وصل کے معنی ہیں: دونوں کو ملانا، یعنی ایک چلو پانی لے کر تھوڑے پانی سے کلی کرنا اور باقی پانی سے ناک صاف کرنا، اور فصل کہتے ہیں: دونوں کو علاحدہ علاحدہ نئے پانی سے کرنا، مضمضہ اور استنشاق میں فصل اولیٰ ہے یا وصل؟ اس میں اختلاف ہے، اور یہ اختلاف جواز وعدم جواز کا نہیں بلکہ اولیٰ غیر اولیٰ کا ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک وصل اولیٰ ہے، اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک فصل اولی ہے، اور امام مالک رحمہ اللہ سے دو روایتیں ہیں: ایک امام شافعیؒ کے موافق اور دوسری امام اعظمؒ کے موافق۔

۴- منیۃ المصلی میں جو فقہ کی کتاب ہے اور جس کی شرح کبیری ہے، محیط سے مسح کا طریقہ یہ لکھا ہے کہ دونوں ہاتھ بھگا کر خنصر، بنصر اور وسطی تین انگلیوں کو سر کے اگلے حصہ پر رکھے اور انگوٹھا اور ہتھیلی الگ رکھے، پھر انگلیوں کو کھینچ کر گدی تک لے جائے، پھر ہتھیلی سے سر کی دونوں جانبوں کا مسح کرتا ہوا ہاتھوں کو آگے لائے، پھر شہادت کی انگلیوں سے کانوں کے اندر کا اور انگوٹھوں سے کانوں کے باہر کا مسح کرے۔ علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ یہ طریقہ کسی حدیث سے ثابت نہیں۔ مسح کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ سر کے اگلے حصہ پر رکھے اور سر کو گھیرتا ہوا پیچھے لے جائے، پھر پیچھے سے آگے لائے، اور شہادت کی انگلیوں سے کانوں کے اندر کا اور انگوٹھوں سے کانوں کے باہر کا مسح کرے، اور یہ خیال کہ اس طرح مسح کرنے سے ہاتھ، انگلیاں اور انگوٹھے مستعمل ہوجائیں گے کبیری اور فتح القدیر میں اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہاتھ جب تک ایک عضو پر چلتا رہتا ہے مستعمل نہیں ہوتا، جیسے ہاتھ دھوتے ہیں تو پانی ہتھیلی سے کہنی تک چلتا ہے پھر گرتا ہے، یہ پانی ہاتھ سے علاحدہ ہونے کے بعد مستعمل ہوگا، جب تک عضو پر چلتا رہے گا مستعمل نہیں ہوگا۔ یہی حکم مسح میں بھی ہے اور کان چونکہ سر کا جزء ہیں اور ہاتھ کو علاحدہ کئے بغیر ان کا مسح ممکن نہیں اس لئے انکے حق میں بھی انگلیاں اور انگوٹھے مستعمل نہیں ہونگے۔ ہاں خفین پر مسح کرنے کے لئے دوسرا پانی لینا ہوگا کیونکہ وہ دوسرا عضو ہیں۔

۵- گردن پر مسح کا کیا حکم ہے؟ اس سلسلہ میں تین رائیں ہیں: (۱) امام نووی رحمہ اللہ اس کو بدعت کہتے ہیں (۲) اکثر احناف اور اصحاب متون مستحب کہتے ہیں اور یہی صحیح قول ہے (۳) اور بعض لوگ سنت کہتے ہیں۔ اس سلسلہ کی تمام

روایات کو مولانا ابوالحسنات عبدالحئی لکھنوی رحمہ اللہ نے تحفة الطلبة فی مسح الرقبة نامی رسالہ میں جمع کیا ہے اور سعایہ شرح شرح وقایہ (۱:۱۷۸) میں بھی تفصیل ہے۔

بابُ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ

پیر ٹخنوں سمیت دھونا

وضو میں ہاتھ اور پاؤں کہنیوں اور ٹخنوں سمیت دھونے ضروری ہیں اور یہ مسئلہ اجماعی ہے۔ اگرچہ امام زفر رحمہ اللہ کا اختلاف ہے، ان کے نزدیک کہنیاں اور ٹخنے غسل میں شامل نہیں، مگر جب چار ائمہ کی تقلید پر امت کا اجماع ہوگیا تو اب جو مسئلہ ان کے درمیان متفق علیہ ہے وہ اجماعی ہے، اور جو مسئلہ ان کے درمیان اختلافی ہے وہ اختلافی ہے، اس لئے میں نے کہا کہ یہ مسئلہ اجماعی ہے۔

حدیث: عمرو بن یحییٰ اپنے والد یحییٰ سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: میری موجودگی میں عمرو بن ابی حسن نے عبداللہ بن زیدؓ سے نبی ﷺ کے وضو کے بارے میں پوچھا: پس انھوں نے ایک تسلے میں پانی منگوایا، اور لوگوں کو دکھانے کے لئے نبی ﷺ جیسا وضو کیا۔ پہلے تسلے کو جھکا کر اپنے ہاتھ پر پانی ڈالا اور دونوں ہاتھ تین مرتبہ دھوئے، پھر اپنا ہاتھ تسلے میں ڈالا اور تین چلو سے مضمضہ استنشاق اور استنثار کیا یعنی وصل کیا۔ پھر برتن میں ہاتھ ڈال کر پانی لیا اور چہرہ تین مرتبہ دھویا، پھر ہاتھ ڈال کر پانی لے کر دونوں ہاتھ دو مرتبہ کہنیوں سمیت دھوئے، پھر ہاتھ ڈال کر پانی لیا اور سر پر ایک مرتبہ مسح کیا اور ان دونوں کے ساتھ اقبال وادبار کیا، یعنی پہلے دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر پیچھے لے گئے پھر دونوں کو آگے لائے، پھر دونوں پاؤں ٹخنوں سمیت دھوئے۔

تشریح: صحیح عمرو بن عمارۃ بن ابی حسن ہے۔ کبھی دادا کی طرف نسبت کردیتے ہیں، جیسے غزوۂ حنین کے موقع پر نبی ﷺ نے یہ رجز پڑھا ہے:

أنا النبيُّ لاكَذِبْ ۞ أنا ابْنُ عبد المطلب

عبدالمطلب آپؐ کے دادا تھے، والد حضرت عبداللہ تھے، پس یہ مجاز ہے .... نبی ﷺ ہاتھوں کو سر پر رکھ کر پہلے پیچھے لے گئے پھر آگے لائے۔ راوی نے اس کو ایک مرتبہ مسح کہا ہے، کیونکہ دوسرا اور تیسرا مسح اس وقت کہا جائے گا جب نیا پانی لے کر مسح کرے۔

[۳۹-] بابُ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ

[۱۸۶-] حدثنا مُوْسَى، قَالَ: نَا وُهَيْبٌ، عَنْ عَمْرٍو، عَنْ أَبِيْهِ: شَهِدْتُ عَمْرَو بْنَ أَبِيْ حَسَنٍ سَأَلَ عَبْدَ

اللّٰهِ بْنَ زَيْدٍ عَنْ وُضُوْءِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم فَدَعَا بِتَوْرٍ مِنْ مَاءٍ، فَتَوَضَّأَ لَهُمْ وَضُوْءَ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم، فَأَكْفَأَ عَلٰى يَدِهِ مِنَ التَّوْرِ، فَغَسَلَ يَدَيْهِ ثَلاَ ثًا، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فِي التَّوْرِ، فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلاَثَ غَرَفَاتٍ، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَغَسَلَ وَجْهَهُ ثَلاثًا ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَغَسَلَ يَدَيْهِ مَرَّتَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَمَسَحَ رَأْسَهُ فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَأَدْبَرَ مَرَّةً وَاحِدَةً، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ. [راجع: ١٨٥]

بابُ اسْتِعْمَالِ فَضْلِ وَضُوْءِ النَّاسِ

وضو سے بچا ہوا پانی پاک ہے

فضل کے معنی ہیں: بچا ہوا۔ خواہ کھانے پینے سے بچا ہو یا وضو اور غسل سے۔ یہاں وضو سے بچا ہوا پانی مراد ہے۔ دورِ اول میں عام طور پر بڑے برتن میں پانی ہوتا تھا، اس میں ہاتھ ڈال کر پانی لیتے تھے اور وضو اور غسل کرتے تھے، جیسے آج کل لوگ حوض سے وضو کرتے ہیں۔ پھر برتن میں جو پانی بچ گیا وہ فضل الوضوء ہے، یہ ماء مستعمل نہیں، پس دوسروں کے لئے اس سے وضو اور غسل کرنا جائز ہے۔

فائدہ: سور کے معنی ہیں: باقی ماندہ۔ یہ لفظ بھی فضل کی طرح عام ہے، اردو میں اس کا ترجمہ ''جھوٹا'' کرتے ہیں، یہ ترجمہ جھوٹا ہے، اسلام میں جھوٹے کا تصور نہیں، یہ ہندوانہ تصور ہے۔ اسلام میں سب سچا ہے یعنی پاک ہے، لہٰذا ہر انسان کا خواہ وہ کوئی ہو اس کا بچا ہوا کھانا اور پانی پاک ہے، اس کے ساتھ بھی کھا سکتے ہیں اور اس کا بچا ہوا بعد میں بھی کھا سکتے ہیں۔ اور لوگوں میں ایک حدیث مشہور ہے: سؤر المؤمن شفاء: مسلمان کا بچا ہوا شفا ہے، یہ بے اصل روایت ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے الموضوعات الکبری میں اس کی صراحت کی ہے، درحقیقت کسی نے جھوٹے کے ہندوانہ تصور کو توڑنے کے لئے یہ بات چلائی ہے۔ اگر یہ حدیث ہوتی تو مسلمانوں کا اس پر عمل ہوتا، گھر میں کوئی بیمار پڑتا تو پانی یا کھانا گھر والوں کو یا محلّہ والوں کو تھوڑا تھوڑا کھلا کر بچا ہوا بیمار کو کھلاتے مگر مسلمانوں میں اس کا رواج نہیں۔

ہاں مسلمانوں میں تبرک کا رواج ہے، یعنی کسی نیک آدمی کا بچا ہوا لوگ شوق سے کھاتے ہیں، تبرک کا ثبوت حدیث سے ہے: ایک مرتبہ نبی ﷺ نے دودھ نوش فرمایا، دائیں طرف ام ہانی تھیں، آپؐ نے بچا ہوا ان کو عنایت فرمایا، انھوں نے روزہ ہونے کے باوجود اس کو پی لیا، کیونکہ روزے کی قضا کی جاسکتی ہے، اور تبرک ہاتھ سے چلا جائے گا تو اگلی بے جائے گی۔

غرض: تبرک کا ثبوت ہے اور مسلمانوں میں اس کا رواج بھی ہے، مگر مؤمن کے بچے ہوئے کا شفا ہونا بے اصل بات ہے۔ اور اس کا رواج بھی نہیں۔ بڑے لوگ بھی یہ غلطی کرتے ہیں اور اس جملہ کو حدیث کے طور پر پیش کرتے ہیں، اس لئے اس بات سے واقف رہنا ضروری ہے۔

ماءِ مستعمل کا حکم:

ماءِ مستعمل امامِ اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک طاہر (پاک) ہے، مگر مطہر (پاک کرنے والا) نہیں، پس ماءِ مستعمل کپڑے پر گر جائے تو کپڑا پاک ہے، مگر اس سے وضو اور غسل کرنا جائز نہیں، کیونکہ وہ مطہر نہیں۔ یہ امام محمد رحمہ اللہ کی امام اعظمؒ سے ایک روایت ہے اور یہی مفتی بہ ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول جدید بھی یہی ہے [1] اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک ماءِ مستعمل نجاست خفیفہ ہے، یہ بھی امامِ اعظمؒ کی ایک روایت ہے، مگر اس پر فتوی نہیں، اور امام اعظمؒ سے بواسطہ حسن بن زیاد ایک روایت یہ بھی ہے کہ ماءِ مستعمل نجاست غلیظہ ہے، مگر اس پر بھی فتوی نہیں، اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک ماءِ مستعمل پاک بھی ہے اور پاک کرنے والا بھی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی طرف بھی یہی قول منسوب کیا گیا ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ باب میں ماءِ مستعمل کا بیان نہیں ہے، بلکہ فضل سے مراد وہ پانی ہے جو وضو کرنے کے بعد برتن میں بچ جاتا ہے۔ حافظ رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اس کی صراحت کی ہے، ماءِ مستعمل تو اس پانی کو کہتے ہیں جو رفع حدث یا ثواب حاصل کرنے کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے، اور جو پانی برتن میں ہے اور جس میں ہاتھ ڈال کر پانی لے کر وضو کیا ہے اس پر یہ تعریف صادق نہیں آتی، پس اس کو ماءِ مستعمل کہنا اور یہ کہنا کہ امام بخاریؒ کے نزدیک بھی ماءِ مستعمل پاک ہے: صحیح نہیں، اس طرف باب میں ادنی اشارہ بھی نہیں۔

اثر: حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ پانی میں بھگو کر مسواک کرتے تھے، اور ایسا کئی بار کرتے تھے، ان کی بیوی اس پانی سے وضو کرنا چاہتی تو حضرت جریرؓ فرماتے: اس پانی سے وضو کر یعنی یہ ماءِ مستعمل نہیں، فضل الوضوء ہے، بلکہ فضل السِّواك ہے، اس پر ماءِ مستعمل کا اطلاق درست نہیں۔

حدیث (۱): حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہمارے پاس نبی ﷺ ٹھیک دوپہر میں تشریف لائے، پس وضو کا پانی لایا گیا، تو آپؐ نے وضو فرمایا۔ پس لوگ آپؐ کے وضو کے بچے ہوئے پانی کو لینے لگے، اور اس کو اپنے بدن پر ملنے لگے، پھر نبی ﷺ نے ظہر کی دو رکعتیں اور عصر کی دو رکعتیں پڑھائیں، اور آپؐ کے سامنے پھل لگا ہوا ڈنڈا تھا جس کو سترہ بنایا گیا تھا۔

تشریح: فضل وضوء سے مراد وہ پانی ہے جو اس برتن میں بچ گیا تھا جس میں سے آپؐ نے وضو فرمایا تھا۔ لوگوں نے برکت کے لئے وہ پانی اپنے چہروں پر اور بدن پر مل لیا ــــــ اور یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے۔ ابطح مقام میں آپؐ نے یہ وضو فرمایا تھا۔ اور وہاں ظہر اور عصر پڑھائی تھی اور دو دو رکعتیں پڑھائی تھیں، کیونکہ آپؐ مسافر تھے۔

حدیث (۲): حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے ایک برتن میں پانی منگوایا، اور اس

---

(۱) امام شافعی رحمہ اللہ پہلے بغداد میں رہتے تھے، اس زمانہ کے آپ کے اجتہادات قولِ قدیم کہلاتے ہیں، پھر آخر کے دو سال مصر میں گذارے ہیں وہاں آپ کی بہت سی رائیں بدل گئی ہیں، یہ آپ کے جدید اقوال ہیں۔

میں اپنے ہاتھ اور چہرہ دھویا، پھر اس میں کلی کی، پھر ان دونوں سے فرمایا: دونوں اس میں سے کچھ پیو، اور باقی اپنے چہروں پر اور سینوں پر ڈالو۔

تشریح: یہ روایت یہاں بہت مختصر ہے، تفصیلی روایت بابُ غزوۃ الطائف (حدیث ۴۳۲۸) میں آئے گی۔ نبی ﷺ جعرانہ میں ٹھہرے ہوئے تھے، وہیں حنین وطائف کی غنیمتیں آپؐ نے تقسیم فرمائی تھیں۔ جب مال تقسیم ہو گیا اور کچھ باقی نہ رہا تو ایک بدو آیا اور اس نے کہا: مالِ غنیمت میں میرا جو حصہ ہے وہ مجھے دیجئے، آپؐ نے فرمایا: ''خوشخبری سن لو'' یعنی دینے کے لئے مادی نعمت نہیں رہی، روحانی نعمت قبول کرلے، مگر وہ نہیں سمجھا، اس نے کہا: آپؐ خوشخبریاں بہت سناتے ہیں، کچھ مال بھی تو دیں، اس جواب سے آپؐ کو ناگواری ہوئی، اتفاق سے اسی وقت حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما آگئے، وہ خاص وقت تھا آپؐ نے ان دونوں سے فرمایا: یہ بندہ تو خوشخبری قبول نہیں کرتا تم دونوں قبول کرلو، دونوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم قبول کرتے ہیں، پھر آپؐ نے پانی منگوایا، اور اس میں ہاتھ اور چہرہ دھویا، پھر اس میں کلی کی اور ان دونوں سے فرمایا: اس میں سے کچھ پی لو اور باقی سر اور سینوں پر ڈال لو، چنانچہ دونوں نے اس میں سے کچھ پیا اور باقی سروں پر اور چہروں پر ڈالنے لگے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا پردہ کے پیچھے سے سارا منظر دیکھ رہی تھیں، انھوں نے پکار کر کہا: سارا نہ پی جانا اپنی امی کے لئے بھی کچھ بچانا، چنانچہ انھوں نے کچھ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے لئے بھی بچایا۔

یہ جو نبی ﷺ نے چہرہ اور ہاتھ دھوئے تھے اور اس میں کلی ڈالی تھی وہ ماء مستعمل نہیں تھا، اس لئے کہ آپؐ نے وضو نہیں کیا تھا، اور وہ دھونا نہ رفع حدث کے لئے تھا اور نہ قربت کے لئے، اس لئے اس کو ماء مستعمل کہنا صحیح نہیں۔

حدیث (۳): محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: یہ محمود وہ ہیں جن کے چہرے پر نبی ﷺ نے کلی ڈالی تھی، درانحالیکہ وہ اس وقت بچے تھے وہ کلی آپؐ نے اس کنویں کے پانی سے بھر کر ڈالی تھی جو ان کے گھر میں تھا۔ اور عروہ: مسور بن مخرمہ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان دونوں میں سے ایک اپنے ساتھی کی تصدیق کرتا ہے کہ جب نبی ﷺ وضو فرماتے تھے تو قریب تھا کہ لوگ آپؐ کے وضو کے بچے ہوئے پانی کو حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے لڑ پڑیں۔ کاد: محلِ اثبات میں ہے اس لئے فعل کی نفی کرے گا یعنی لڑے نہیں تھے۔

تشریح: یہ حدیث پہلے بھی گذری ہے کہ نبی ﷺ ایک مرتبہ محمود بن الربیعؓ کے گھر تشریف لے گئے، اس وقت وہ پانچ سال کے تھے، آپؐ نے وضو کے لئے پانی منگوایا، گھر میں کنواں تھا، اس میں سے کھینچ کر ایک ڈول پانی پیش کیا گیا۔ آپؐ نے اس میں سے وضو فرمایا، پھر منہ میں پانی لے کر حضرت محمودؓ کے منہ پر کلی ڈالی۔ آپؐ نے ان کے منہ پر کلی کیوں ڈالی تھی؟ اس کی وجہ معلوم نہیں، اس حدیث میں اور کسی دوسری حدیث میں اس کی کوئی وجہ مروی نہیں، بعض کہتے ہیں: آپؐ نے بچے کا مذاق کیا تھا۔ اور بعض کہتے ہیں: تبرکاً ڈالی تھی، اور بعض کہتے ہیں علاجاً ڈالی تھی۔ حضرت محمودؓ بیمار ہونگے۔

عروہ: یہ عروۃ بن الزبیر ہیں جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے ہیں، اور مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ میں سے ہیں، اور غیرہ سے مراد مروان بن الحکم ہے جو مدینہ منورہ کا گورنر تھا بعد میں امیر المومنین بنا، حضرت عروہ رحمہ اللہ مسور اور مروان دونوں سے روایت کرتے ہیں۔ دونوں نے حضرت عروہ سے الگ الگ موقعوں پر یہ حدیث بیان کی ہے، دونوں کی حدیثوں کا مفہوم تقریباً ایک ہے، یُصدق کلُّ واحد منهما صاحِبَه کا یہی مطلب ہے، اور یہ صلح حدیبیہ کے واقعہ کا ایک حصہ ہے، وہاں جب نبی ﷺ وضو فرماتے تو صحابہ آپؐ کے وضو کا بچا ہوا پانی لینے کے لئے دوڑتے یعنی ہر شخص وہ تبرک حاصل کرنے کی کوشش کرتا، یہ وہ پانی ہے جو برتن میں بچ گیا ہے جس میں سے آپؐ نے وضو فرمایا ہے، یہ ماء مستعمل نہیں ہے، برتن میں وضو کا باقی ماندہ پانی ہے، پس اس حدیث کا بھی ماء مستعمل سے کچھ تعلق نہیں۔

[۴۰/۱-] بابُ اسْتِعْمَالِ فَضْلِ وَضُوْءِ النَّاسِ

وَأَمَرَ جَرِيْرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ أَهْلَهُ أَنْ يَتَوَضَّؤُا بِفَضْلِ سِوَاكِهِ.

[۱۸۷-] حدثنا آدَمُ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، قَالَ: ثَنَا الْحَكَمُ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا جُحَيْفَةَ يَقُوْلُ: خَرَجَ عَلَيْنَا النبيُّ صلى الله عليه وسلم بِالْهَاجِرَةِ فَأُتِيَ بِوَضُوْءٍ، فَتَوَضَّأَ، فَجَعَلَ النَّاسُ يَأْخُذُوْنَ مِنْ فَضْلِ وَضُوْئِهِ، فَيَتَمَسَّحُوْنَ بِهِ، فَصَلَّى النبيُّ صلى الله عليه وسلم الظُّهْرَ رَكْعَتَيْنِ، وَالْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ، وَبَيْنَ يَدَيْهِ عَنَزَةٌ.

[انظر: ۳۷۶، ۴۹۵، ۴۹۹، ۵۰۱، ۶۳۳، ۶۳۴، ۳۵۵۳، ۳۵۶، ۵۷۸۶، ۵۸۵۹]

[۱۸۸-] وَقَالَ أَبُوْ مُوْسَى: دَعَا النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم بِقَدَحٍ فِيْهِ مَاءٌ فَغَسَلَ يَدَيْهِ وَوَجْهَهُ فِيْهِ، وَمَجَّ فِيْهِ، ثُمَّ قَالَ لَهُمَا: "اشْرَبَا مِنْهُ وَأَفْرِغَا عَلَى وُجُوْهِكُمَا وَنُحُوْرِكُمَا" [انظر: ۱۹۶، ۴۳۲۸]

[۱۸۹-] حدثنا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ: ثَنَا يَعْقُوْبُ بْنُ إِبْرَاهِيْمَ بْنِ سَعْدٍ، قَالَ: ثَنَا أَبِيْ، عَنْ صَالِحٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ مَحْمُوْدُ بْنُ الرَّبِيْعِ.

قَالَ: وَهُوَ الَّذِيْ مَجَّ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فِيْ وَجْهِهِ وَهُوَ غُلَامٌ مِنْ بِئْرِهِمْ.

وَقَالَ عُرْوَةُ عَنِ الْمِسْوَرِ وَغَيْرِهِ يُصَدِّقُ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا صَاحِبَهُ: وَإِذَا تَوَضَّأَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم كَادُوْا يَقْتَتِلُوْنَ عَلَى وَضُوْئِهِ. [راجع: ۷۷]

وضاحت: یہ دو الگ الگ روایتیں ہیں اور پہلی روایت میں قال کا فاعل امام زہری رحمہ اللہ ہیں، انھوں نے حضرت محمود کا تعارف کرایا ہے، اور اس حدیث سے بھی استدلال کرنا ہے، آپؐ نے وضو کا بچا ہوا پانی منہ میں لے کر حضرت محمودؓ پر ڈالا تھا، معلوم ہوا کہ فضل الوضوء پاک ہے ـــــ اور دوسری حدیث صلح حدیبیہ کے موقعہ کی ہے، اس کو

امام زہری نے حضرت عروہ سے روایت کیا ہے اور اس سے استدلال کرنا ہے کہ فضل الوضوء پاک ہے۔

بابٌ

یہ باب کالفصل من الباب السابق ہے، اور یہ حدیث بھی گذشتہ مسئلہ سے متعلق ہے۔

حدیث: سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: مجھے میری خالہ نبی ﷺ کے پاس لے گئیں، اور عرض کیا: یارسول اللہ! یہ میرا بھانجا ہے اور بیمار ہے (اس حدیث میں وَقِعٌ ہے اور ایک نسخہ میں وَجِعٌ ہے۔ دونوں صفت کے صیغے ہیں اور دونوں کے معنی ایک ہیں) آپؐ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے لئے برکت کی دعا کی، پھر وضو فرمایا، پس میں نے آپؐ کا وضو کا بچا ہوا پانی پیا، پھر میں آپؐ کی پیٹھ کے پیچھے کھڑا ہوا، تو میں نے مہر نبوت دیکھی جو چھپر کھٹ کی گھنڈی جیسی تھی (دوسرا ترجمہ:) جو چکور کے انڈے جیسی تھی۔

تشریح:

۱- حضرت سائبؓ کو دو بیماریاں تھیں، سر میں درد رہتا تھا اور پیٹ میں تکلیف تھی، نبی ﷺ نے سر پر ہاتھ پھیرا اور شفا کی دعا فرمائی تو ایک بیماری دور ہوگئی، اور وضو کا بچا ہوا پانی پیا تو پیٹ کی تکلیف دور ہوگئی، اور یہ وہ پانی تھا جو برتن میں بچ گیا تھا، ماء مستعمل نہیں تھا۔

۲- مہر نبوت علاماتِ نبوت میں سے تھی، اور ولادت کے وقت ہی سے تھی، اور وفات کے وقت غائب ہوگئی تھی، اور اس پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ اور جن روایتوں میں کچھ لکھا ہوا ہونا منقول ہے وہ روایات درجۂ ثبوت کو نہیں پہنچی، اور مہر نبوت کی مقدار اور رنگ میں روایتیں مختلف ہیں کیونکہ یہ تشبیہات ہیں اور ہر شخص کی تشبیہ اس کے ذہن کے موافق ہوتی ہے۔ اس لئے اختلاف ناگزیر ہے۔

۳- چونکہ حضرت سائبؓ کے سر پر نبی ﷺ نے ہاتھ پھیرا تھا اور وضو کا پانی پلایا تھا: اس لئے میں نے یہ سمجھا ہے کہ درد: سر اور پیٹ میں ہوگا۔ واللہ اعلم

۴- الزِّر: بٹن، گھنڈی .... الحَجَلَة: گنبد نما کپڑوں سے آراستہ کیا ہوا دولہن کا کمرہ۔ گھر کے اندر دولہن کے لئے لگایا ہوا پردہ .... اس کا ترجمہ چکور بھی کیا گیا ہے، یہ کبوتر جیسا ایک پرندہ ہے جس کے پیر اور چونچ سرخ ہوتی ہے اور اس کا گوشت عمدہ ہوتا ہے، اس صورت میں زِر کا ترجمہ انڈا کیا جائے گا۔

[۴۰/۲-] بابٌ

[۱۹۰-] حدثنا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ يُوْنُسَ، قَالَ: حَدَّثَنَا حَاتِمُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ، عَنِ الْجَعْدِ، قَالَ: سَمِعْتُ السَّائِبَ بْنَ يَزِيْدَ يَقُوْلُ: ذَهَبَتْ بِيْ خَالَتِيْ إِلَى النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم، فَقَالَتْ: يَارسولَ اللّٰهِ، إِنَّ ابْنَ

أُخْتِيْ وَقِعٌ، فَمَسَحَ رَأْسِيْ وَدَعَا لِيْ بِالْبَرَكَةِ، ثُمَّ تَوَضَّأَ فَشَرِبْتُ مِنْ وَضُوْئِهِ، ثُمَّ قُمْتُ خَلْفَ ظَهْرِهِ فَنَظَرْتُ إِلَى خَاتَمِ النُّبُوَّةِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ مِثْلَ زِرِّ الْحَجَلَةِ. [انظر: ۳۵۴۰، ۳۵۴۱، ۵۶۷۰، ۶۳۵۲]

بَابُ مَنْ مَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ غُرْفَةٍ وَاحِدَةٍ

ایک چلو سے مضمضہ اور استنشاق کرنا

مضمضہ اور استنشاق میں فصل اولیٰ ہے یا وصل؟ فصل کہتے ہیں: دونوں کو علاحدہ علاحدہ پانیوں سے کرنا، اور وصل نام ہے دونوں کو ملانے کا یعنی ایک چلو پانی لے کر تھوڑے سے کلی کرنا اور باقی سے ناک صاف کرنا۔

امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک وصل اولیٰ ہے، اور فصل جائز ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک فصل اولیٰ ہے اور وصل جائز ہے، پس اختلاف جواز وعدم جواز کا نہیں بلکہ اولیٰ غیر اولیٰ کا ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ سے دونوں فریق کے موافق روایتیں ہیں۔

حدیث: یحییٰ بن عمارہ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کا وضو روایت کرتے ہیں: انھوں نے برتن جھکا کر ہاتھوں پر ڈالا اور ان کو دھویا، پھر ایک چلو سے منہ دھویا یا کہا: منہ میں پانی گھمایا اور پانی سونگھا (ایک چلو سے منہ دھویا یا مضمضہ اور استنشاق کیا صحیح کونسی تعبیر ہے اس میں راوی کو شک ہے) اور ایسا تین بار کیا، یعنی وصل کیا، پھر ہاتھوں کو کہنیوں کے ساتھ دو دو مرتبہ دھویا، پھر سر پر مسح کیا اس میں اقبال وادبار کیا، پھر دونوں پاؤں ٹخنوں سمیت دھوئے، پھر فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو ایسا تھا۔

تشریح: یہ وہی سند ہے جو اوپر آئی تھی، جس میں الجھن تھی، صحیح بات یہاں ہے کہ راوی یحییٰ ہیں جن سے ان کے فرزند عمرو روایت کرتے ہیں اور سائل کا نام بھی عمرو ہے وہ یحییٰ کے بھائی اور عمرو بن یحییٰ کے چچا ہیں۔ اس حدیث میں مضمضہ اور استنشاق کے بعد ثلاثاً ایک مرتبہ آیا ہے۔ اور میں نے بتایا تھا کہ اگر ثلاثاً ایک مرتبہ آئے تو وصل مراد ہوتا ہے۔ پس یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مستدل ہے۔

اور حنفیہ کی دلیل طلحہ بن مُصرف کی حدیث ہے جو ابوداؤد میں ہے: فَرَأَيْتُهُ يَفْصِلُ بَيْنَ الْمَضْمَضَةِ وَالاستنشاق: (ابوداؤد ۱: ۹) یعنی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مضمضہ اور استنشاق میں فصل کرتے ہوئے دیکھا۔ اسی طرح صحیح ابن السکن میں شقیق بن سلمہ کی حدیث ہے کہ میں نے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو وضو کرتے دیکھا: تَوَضَّاءَ ا ثلاثاً ثلاثاً، وأَفْرَدَا الْمَضْمَضَةَ من الاستنشاق: دونوں نے اعضاء وضو کو تین تین مرتبہ دھویا۔ اور دونوں نے مضمضہ استنشاق سے جدا کیا، پھر دونوں حضرات نے فرمایا: هكذا رأينا رسولَ الله صلى الله عليه وسلم تَوَضَّأَ: ہم نے اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے دیکھا ہے (رواه ابن السكن في صحيحه: بحوالہ التعليق الصبيح ۱: ۲۰۵) ان کے

علاوہ اور بھی بہت سی روایات ہیں جن میں ثلاثاً ثلاثاً آیا ہے اس لئے احناف نے فصل کو افضل کہا ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ احادیث میں مضمضہ اور استنشاق کے مختلف طریقے آئے ہیں، بعض میں ایک چلو بعض میں دو چلو، بعض میں تین چلو، اور بعض میں چھ چلو کا ذکر ہے (کشف النقاب ۱:۴۰۱-۴۰۳) پس وضو کرنے والے کو جس طریقہ پر سہولت ہو مضمضہ اور استنشاق کرے، کوئی پابندی نہیں۔

دنیا کے حالات یکساں نہیں، ہمارے یہاں اللہ کے فضل سے پانی بہت ہے، لیکن دنیا میں ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں پانی بہت کم ہے، وہاں ایک لوٹے میں پورا گھر وضو کرتا ہے۔ اس طرح کے مسائل کی اہمیت وہاں زیادہ ہے جہاں پانی کم ہے، لیکن اگر آدمی درجۂ کمال حاصل کرنا چاہتا ہے تو مضمضہ اور استنشاق تین تین مرتبہ کرے، منہ اور ناک کی پوری صفائی اسی صورت میں ہوگی۔ جیسے نبی ﷺ سے پوچھا گیا کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھ سکتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: أَوَ لِكُلِّكُمْ ثَوْبَان؟ کیا تم میں سے ہر شخص کے پاس دو کپڑے ہیں؟ (ابوداؤد ۱:۹۲) ظاہر ہے: نہیں ہیں، ہر شخص کو اُس زمانہ میں دو کپڑے میسر نہیں تھے۔ پھر ان کو ضروری کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: الصَّلاةُ فی الثوب الواحد سنة: ایک کپڑے میں نماز پڑھنا سنت ہے، ہم لوگ نبی ﷺ کے عہد مبارک میں ایسا کرتے تھے، اور ہمارا یہ عمل برا نہیں سمجھا جاتا تھا، مگر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یہ حکم اس وقت تھا جب کپڑے کم تھے، اب اللہ نے کشادگی فرمائی ہے پس دو کپڑوں میں نماز پڑھنا افضل ہے (مشکوٰۃ ۱:۷۳ باب الستر) یہاں بھی یہی مسئلہ ہے، جن علاقوں میں پانی قلیل ہے وہاں کے لوگ کسی بھی روایت پر عمل کریں، البتہ جن علاقوں میں پانی وافر ہے وہاں افضل پر عمل کرنا چاہئے۔

[۴۱-] بابُ مَنْ مَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ غُرْفَةٍ وَاحِدَةٍ

[۱۹۱-] حدثنا مُسَدَّدٌ، قَالَ: ثَنَا خَالِدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: ثَنَا عَمْرُو بْنُ يَحْيىَ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ: أَنَّهُ أَفْرَغَ مِنَ الإِنَاءِ عَلٰى يَدَيْهِ فَغَسَلَهُمَا، ثُمَّ غَسَلَ أَوْ: مَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفَّةٍ وَاحِدَةٍ، فَفَعَلَ ذٰلِكَ ثَلَاثًا، فَغَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا، ثُمَّ غَسَلَ يَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ، وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ مَا أَقْبَلَ وَمَا أَدْبَرَ، وَغَسَلَ رِجْلَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ، ثُمَّ قَالَ: هٰكَذَا وُضُوْءُ رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم. [راجع: ۱۸۵]

بابُ مَسْحِ الرَّأْسِ مَرَّةً

سر کا مسح ایک مرتبہ مسنون ہے

سر کا مسح ایک بار سنت ہے یا تین بار؟ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سر کا مسح تین بار نئے پانیوں سے سنت ہے، ان

کے علاوہ سب فقہاء ایک بار مسح کو سنت کہتے ہیں۔ اور امام شافعیؒ کی نقلی دلیل چند ضعیف روایات ہیں اور انھوں نے مسح کو غسل پر قیاس کیا ہے، جبکہ بہت سی صحیح نصوص سے نبی ﷺ کا ایک مرتبہ مسح کرنا ثابت ہے۔ باب کی حدیث میں بھی ایک ہی مرتبہ مسح کا ذکر ہے، اور امام ابوداودؒ نے فرمایا ہے: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ساری حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ سر کا مسح ایک مرتبہ ہے، کیونکہ روایوں نے اعضاء مغسولہ کو تین تین بار دھونے کا ذکر کیا ہے۔ مگر انھوں نے ان سب روایات میں مسح رأسه کہا ہے، اور کوئی عدد ذکر نہیں کیا، جس طرح سر کے علاوہ میں انھوں نے عدد ذکر کیا ہے (۱۵:۱)

اور مسح کو غسل پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ مسح کا حکم تخفیف کے لئے ہے، اگر سنت کے مطابق مسح کیا جائے اور تین مرتبہ نئے پانیوں سے کیا جائے تو وہ غسل (دھونا) ہو کر رہ جائے گا، پھر امام شافعیؒ کے نزدیک کانوں کا مسح بھی تین مرتبہ تین نئے پانیوں سے مسنون ہے، ان کا تو غسل بالغ ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں یہ نص کے مقابلہ میں قیاس ہے اس لئے صحیح نہیں، اور اختلافِ روایات کی صورت میں اصح مافی الباب کو لیا جاتا ہے، اس اصول کے بھی خلاف ہے۔

جاننا چاہئے کہ بعض روایات میں دو مرتبہ مسح کا ذکر آیا ہے اور بعض میں تین مرتبہ، جیسے ابن عقیل کی روایت میں دو مرتبہ مسح کا ذکر ہے (ترمذی حدیث ۳۶) اور حُمران مولیٰ عثمان کی روایت میں تین مرتبہ مسح کا ذکر ہے (ابوداود حدیث ۱۰۷) یہ دونوں روایتیں قابلِ تمسک نہیں، ابن عقیل صدوق سئ الحفظ ہیں اور ابوداود والی روایت میں عبدالرحمٰن بن وردان ہیں، ان کی دارقطنی وغیرہ نے تضعیف کی ہے، پھر وہ روایت شاذ ہے، ثقہ روات کے خلاف ہے۔ اُس حدیث میں ثقہ روات ثلاثا کا ذکر نہیں کرتے (بذل ۱:۵۱۵) علاوہ ازیں: نبی ﷺ نے مسح میں جو اقبال و ادبار کیا ہے، یعنی پہلے ہاتھوں کو سر پر رکھ کر گدی تک لے گئے ہیں پھر آگے لائے ہیں اس کو دو مرتبہ مسح کرنا کہا ہے، پھر بالوں کو ٹھیک کرنے کے لئے سر پر ہاتھ پھیرا تو بعض نے اس کو تین مرتبہ مسح کرنا کہا، حالانکہ یہ ایک ہی مرتبہ مسح ہے۔ اور امام شافعی بھی ان حدیثوں سے استدلال نہیں کرتے، اس لئے کہ ان کے نزدیک تین نئے پانیوں سے تین مرتبہ مسح کرنا مسنون ہے، اور یہاں نبی ﷺ نے نیا پانی نہیں لیا۔

[۴۲-] بابُ مَسْحِ الرَّأْسِ مَرَّةً

[۱۹۲-] حدثنا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ، قَالَ: ثَنَا وُهَيْبٌ، قَالَ: ثَنَا عَمْرُو بْنُ يَحْيَى، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: شَهِدْتُ عَمْرَو بْنَ أَبِي حَسَنٍ سَأَلَ عَبْدَ اللهِ بْنَ زَيْدٍ عَنْ وُضُوْءِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم، فَدَعَا بِتَوْرٍ مِنْ مَاءٍ فَتَوَضَّأَ لَهُمْ، فَكَفَأَهُ عَلَى يَدَيْهِ فَغَسَلَهُمَا ثَلاَثًا، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فِي الإِنَاءِ، فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلاَثًا بِثَلاَثِ غُرْفَاتٍ مِنْ مَاءٍ، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فِي الإِنَاءِ فَغَسَلَ وَجْهَهُ ثَلاَثًا، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فِي الإِنَاءِ فَغَسَلَ يَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فِي الإِنَاءِ، فَمَسَحَ بِرَأْسِهِ، فَأَقْبَلَ بِيَدِهِ وَأَدْبَرَ بِهَا، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فِي الإِنَاءِ فَغَسَلَ رِجْلَيْهِ، حَدَّثَنَا مُوْسَى قَالَ: حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ قَالَ: مَسَحَ بِرَأْسِهِ مَرَّةً. [راجع: ۱۸۵]

وضاحت: یہی حدیث گذشتہ باب میں آئی ہے، اُس کو عمرو بن یحییٰ سے خالد بن عبداللہ نے روایت کیا تھا اور اِس کو وُہیب روایت کرتے ہیں، پھر وُہیب سے سُلیمان بن حرب بھی روایت کرتے ہیں اور موسیٰ بن اسماعیل بھی۔ موسیٰ کی حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ نبی ﷺ نے سر پر ایک مرتبہ مسح کیا، موسیٰ کی روایت چند ابواب پہلے (باب ۳۹) گذری ہے۔ اور عمرو بن ابی حسن میں دادا کی طرف نسبت ہے، باپ کا نام عمارہ ہے۔

بابُ وُضُوْءِ الرَّجُلِ مَعَ امْرَأَتِهِ، وَفَضْلِ وُضُوْءِ الْمَرْأَةِ

میاں بیوی کا ایک ساتھ وضو کرنا اور عورت کے وضو کا بچا ہوا پانی پاک ہے

اس باب میں دو مسئلے ہیں: (۱) میاں بیوی دونوں ایک ساتھ برتن میں ہاتھ ڈال کر پانی لیں اور وضو یا غسل کریں تو جائز ہے یا نہیں؟ (۲) مرد اور عورت آگے پیچھے پانی استعمال کریں، یعنی مرد نے پہلے وضو یا غسل کیا اور برتن میں پانی بچ گیا تو کیا دوسرا کوئی مرد یا عورت اس باقی ماندہ پانی کو استعمال کرسکتے ہیں؟ یا عورت نے استعمال کیا تو اس کا بچا ہوا پانی دوسری عورت یا مرد استعمال کرسکتا ہے۔

پہلا مسئلہ اجماعی ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک ساتھ پانی استعمال کریں تو جائز ہے۔ اسی طرح مرد کا بچا ہوا دوسرا مرد بھی استعمال کرسکتا ہے اور عورت بھی، اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں، البتہ عورت کا غسل جنابت سے بچا ہوا پانی مرد استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ عدم جواز کے قائل ہیں اور جمہور جائز کہتے ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ کی دلیل: حضرت حکم بن عمرو غفاری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے عورت کی طہارت سے بچے ہوئے پانی سے منع کیا، انہی کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی ﷺ نے اس بات سے منع کیا کہ مرد عورت کی طہارت کے بچے ہوئے پانی سے وضو کرے (ترمذی حدیث ۶۷ و ۶۸)

اور جمہور کی دلیل: حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے: انھوں نے ایک بڑے برتن سے غسل جنابت کیا، اس میں پانی بچ گیا، نبی ﷺ نے اس سے وضو کرنا چاہا تو بیوی صاحبہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں جنبی تھی، نبی ﷺ نے فرمایا: ''پانی جنبی نہیں ہوتا'' (ترمذی حدیث ۶۶) جمہور نے اس حدیث کو لیا ہے، کیونکہ یہ باب کی سب سے زیادہ صحیح روایت ہے۔ اور حضرت حکم کی روایات کی تاویل کی ہے کہ ان میں ممانعت بربناء مصلحت تھی، قطع وساوس مقصود تھا، اور اس کی احادیث میں بہت نظیریں ہیں۔

پہلے یہ حدیث گذری ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''نمازی اس وقت تک نماز سے نہ پلٹے جب تک آواز نہ سنے یا بدبو محسوس نہ کرے'' اسی طرح آپؐ نے غسل خانہ میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا، یہ بھی اسی حکمت سے تھا۔ اسی طرح

یہ حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: بیشک وضو کے لئے ایک شیطان ہے جس کو وَلہان (سرگشتگی) کہا جاتا ہے۔ پس پانی کے وسوسوں سے بچو (رواہ ابن ماجہ ومسند احمد، مشکوۃ حدیث ۴۱۹) پانی کے وسوسے یہ ہیں کہ اعضاء دھوتا ہی رہے اور اس کو دھلنے کا یقین نہ ہو، مؤمن کو چاہئے کہ وہ شریعت کی مقرر کی ہوئی حد پر رکے۔ حضرت حکمؓ کی روایت بھی اسی قبیل سے ہے، کبھی عورت بے سلیقہ ہوتی ہے، پاکی ناپاکی کے مسائل سے واقف نہیں ہوتی، یا محتاط نہیں ہوتی، ایسی صورت میں اس کا بچا ہوا پانی مرد استعمال کرے گا تو اس کی طبیعت میں وسوسے پیدا ہونگے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا: کیا عورت مرد کے ساتھ نہا سکتی ہے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں! اگر وہ سمجھ دار ہے (یہ حدیث نسائی شریف میں ہے) اس جواب سے ممانعت کی علت سمجھ میں آ گئی، اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ نبی ﷺ نے پہلے عورت کے فضل سے منع فرمایا ہے، ورنہ اطلاع کرنے کی ضرورت نہیں تھی، اور نبی ﷺ نے: **إن الماء لایُجنب**: فرمایا کر اشارہ کیا کہ وہ ممانعت بر بناء مصلحت تھی، یعنی قطع وساوس کے لئے تھی، ورنہ فی نفسہ عورت کے استعمال کرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوجاتا۔

[۴۳-] بابُ وُضُوْءِ الرَّجُلِ مَعَ امْرَأَتِهِ، وَفَضْلِ وُضُوْءِ الْمَرْأَةِ

وَتَوَضَّأَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ بِالْحَمِيْمِ مِنْ بَيْتِ نَصْرَانِيَّةٍ

[۱۹۳-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: ثَنَا مَالِكٌ، عَنْ نَافِعٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ، أَنَّهُ قَالَ: كَانَ الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ يَتَوَضَّؤُنَ فِيْ زِمَانِ رسولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم جَمِيْعًا.

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لے گئے، وہ ٹھنڈا علاقہ ہے۔ آپؓ نے وہاں کسی نصرانی عورت کے گھر کے گرم پانی سے وضو کیا، ہندوستانی نسخہ میں من بیت سے پہلے واؤ ٹھیک نہیں۔ اور حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مرد اور عورتیں ایک ساتھ وضو کیا کرتے تھے۔

تشریح: حدیث شریف سے باب کا پہلا جزء: مرد اور عورت ایک ساتھ پانی استعمال کر سکتے ہیں: صراحتاً ثابت ہوتا ہے اور دوسرا جزء: ضمناً ثابت ہوتا ہے، جب مرد اور عورت ایک ساتھ وضو کریں گے تو ان کے ہاتھ برتن میں آگے پیچھے پڑیں گے، دونوں ایک ساتھ ہاتھ ڈالیں اور پانی لیں ایسا نہیں ہوتا، پس جب عورت نے ہاتھ ڈال کر پانی لیا تو باقی ماندہ اس کا فضل ہوا۔ اور صحابہ اس کو بے تکلف استعمال کرتے تھے، اور نبی ﷺ یہ بات جانتے تھے، پس معلوم ہوا کہ عورت کا فضل مرد استعمال کر سکتا ہے، اور ہوسکتا ہے باب کا دوسرا جزء حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر سے ثابت کیا ہو، اس طرح کہ اس گرم پانی میں جو نصرانی عورت نے حضرت عمرؓ کو پیش کیا تھا اس نے اس میں ہاتھ ڈالا ہوگا۔ اور حضرت عمرؓ نے اس کو استعمال کیا، معلوم ہوا کہ عورت کا فضل مرد استعمال کر سکتا ہے۔

بابُ صَبِّ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم وَضُوْءَ ہ عَلَی الْمُغْمٰی عَلَیْہِ

نبی ﷺ کا بیہوش پر وضو کا پانی ڈالنا

چند ابواب پہلے ایک باب گذرا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک ماء مستعمل طاہر بھی ہے اور مطہر بھی، یہ اسی سلسلہ کا دوسرا باب ہے۔

حدیث: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سخت بیمار پڑے، نبی ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کے لئے گئے، وہ بیہوش تھے، آپؐ نے پانی منگوا کر وضو فرمایا، اور برتن میں بچا ہوا پانی ان کے اوپر چھڑکا، جس سے ان کو ہوش آ گیا، انھوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! میں کلالہ ہوں، یعنی نہ میرے اصول ہیں نہ فروع، پس میری میراث کس کو ملے گی؟ اس وقت سورۂ نساء کی آخری آیت جس میں کلالہ کے احکام ہیں نازل ہوئی۔

تشریح: نبی ﷺ نے حضرت جابرؓ پر جو پانی چھڑکا تھا وہ کون سا پانی تھا؟ ماء مستعمل تھا یا وضو کے بعد برتن میں بچا ہوا پانی تھا؟ دونوں احتمال ہیں، پس یہ حدیث ماء مستعمل کی طہارت وعدم طہارت کے بارے میں نص نہیں، علاوہ ازیں: اس حدیث سے زیادہ سے زیادہ ماء مستعمل کی طہارت ثابت ہوگی، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف اس میں ہے کہ ماء مستعمل مطہر ہے یا نہیں؟ اور اس مسئلہ سے اس حدیث کا کوئی تعلق نہیں۔

[۴۴-] بابُ صَبِّ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم وَضُوْءَ ہ عَلَی الْمُغْمٰی عَلَیْہِ

[۱۹۴-] حدثنا أَبُو الْوَلِیْدِ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَۃُ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْکَدِرِ، قَالَ: سَمِعْتُ جَابِرًا یَقُوْلُ: جَاءَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَعُوْدُنِیْ وَأَنَا مَرِیْضٌ لاَ أَعْقِلُ، فَتَوَضَّأَ وَصَبَّ عَلَیَّ مِنْ وَضُوْئِہِ، فَعَقَلْتُ، فَقُلْتُ: یَارسولَ اللّٰہِ! لِمَنِ الْمِیرَاثُ؟ إِنَّمَا یَرِثُنِیْ کَلاَلَۃٌ، فنزلَتْ آیَۃُ الْفَرَائِضِ.

[انظر: ۴۵۷۷، ۵۶۵۱، ۵۶۶۴، ۵۶۷۴، ۶۷۲۳، ۶۷۴۳، ۷۳۰۹]

بابُ الْغُسْلِ وَالْوُضُوْءِ فِی الْمِخْضَبِ وَالْقَدَحِ وَالْخَشَبِ وَالْحِجَارَۃِ

لگن، پیالے، لکڑی اور پتھر کے برتن میں وضوء و غسل کرنا

یہ باب علماء کے اعتبار سے اگرچہ قلیل النفع ہے، مگر عام مسلمانوں کے اعتبار سے اہمیت وافادیت رکھتا ہے۔
المِخْضَب کے معنی ہیں: لگن، یعنی وہ بڑا برتن جس میں کپڑے دھوتے ہیں اور خانساماں اس میں چاول بھگاتے ہیں .... اور القَدَح کے معنی ہیں: پینے کا برتن، چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی جمع: أقداح ہے .... اور الخشب کے معنی ہیں:

لکڑی، اور الحجارۃ کے معنی ہیں: پتھر، ان دونوں کا تذکرہ بطور مثال ہے یعنی برتن میں خواہ وہ لکڑی کا ہو، پتھر کا ہو، یا کسی اور دھات کا ہو وضو اور غسل کرنا جائز ہے۔

[۴۵-] بابُ الْغُسْلِ وَالْوُضُوْءِ فِيْ الْمِخْضَبِ وَالْقَدَحِ وَالْخَشَبِ والْحِجَارَةِ

[۱۹۵-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُنِيْرٍ، سَمِعَ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ بَكْرٍ، قَالَ: ثَنَا حُمَيْدٌ، عَنْ أَنَسٍ قَالَ: حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَقَامَ مَنْ كَانَ قَرِيْبَ الدَّارِ إِلَى أَهْلِهِ، وَبَقِيَ قَوْمٌ فَأُتِيَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بِمِخْضَبٍ مِنْ حِجَارَةٍ فِيْهِ مَاءٌ، فَصَغُرَ الْمِخْضَبُ أَنْ يَبْسُطَ فِيْهِ كَفَّهُ، فَتَوَضَّأَ الْقَوْمُ كُلُّهُمْ قُلْنَا: كَمْ كُنْتُمْ؟ قَالَ: ثَمَانِيْنَ وَزِيَادَةٌ. [راجع: ۱۶۸]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ کہتے ہیں: نماز کا وقت آ گیا، پس جن کے گھر قریب تھے وہ (وضو کرنے کے لئے) اپنے گھر چلے گئے، اور کچھ لوگ باقی رہ گئے (ان کے گھر دور تھے) پس نبی ﷺ کے پاس پتھر کا ایک لگن لایا گیا جس میں پانی تھا، وہ برتن چھوٹا تھا اس میں ہتھیلی پھیلانا مشکل تھا، یعنی اوپر سے منہ چوڑا تھا مگر اندر سے تنگ تھا، پس سب لوگوں نے اس پانی سے وضو کیا، طلبہ نے پوچھا: آپ حضرات کتنے تھے؟ حضرت انسؓ نے فرمایا: اسّی سے کچھ زیادہ آدمی تھے۔

تشریح: یہ حدیث ابھی گذری ہے، اس میں صراحت ہے کہ نماز کا وقت ہونے کے بعد کچھ حضرات جن کے گھر قریب تھے، وضو کرنے کے لئے گھر چلے گئے تھے، معلوم ہوا کہ یہ مدینہ منورہ کا واقعہ ہے۔ اس برتن میں تھوڑا سا پانی تھا۔ آپؐ نے اس میں دست مبارک رکھا تو انگلیوں کے درمیان سے چشمے پھوٹ نکلے۔ سب صحابہ نے اس پانی سے وضو کیا، وہ اسّی سے کچھ زیادہ تھے۔ یہ پانی پتھر کے ایک برتن میں لایا گیا تھا، جس کا منہ چوڑا تھا اور اندر سے تنگ تھا۔ اس برتن سے پانی لے کر سب حضرات نے وضو کیا، معلوم ہوا کہ پتھر کے برتن میں وضو غسل کرنا جائز ہے۔

[۱۹۶-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ، قَالَ: ثَنَا أَبُوْ أُسَامَةَ، عَنْ بُرَيْدٍ، عَنْ أَبِيْ بُرْدَةَ، عَنْ أَبِيْ مُوْسَى: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم دَعَا بَقَدَحٍ فِيْهِ مَاءٌ فَغَسَلَ يَدَيْهِ وَوَجْهَهُ فِيْهِ، وَمَجَّ فِيْهِ. [راجع: ۱۸۸]

ترجمہ: ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک پیالہ منگوایا جس میں پانی تھا، آپؐ نے اس میں دونوں ہاتھ اور چہرہ دھویا اور اس میں کلی فرمائی۔

تشریح: یہ حدیث ابھی چند ابواب پہلے گذری ہے، اور یہ حدیث مختصر ہے پورا واقعہ غزوۃ الطائف میں آیا ہے اور حدیث کی باب کے ساتھ مناسبت واضح ہے۔

[۱۹۷-] حدثنا أَحْمَدُ بْنُ يُوْنُسَ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ أَبِيْ سَلَمَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ يَحْيَى، عَنْ

أَبِيهِ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ، قَالَ: أَتَى رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، فَأَخْرَجْنَا لَهُ مَاءً فِي تَوْرٍ مِنْ صُفْرٍ، فَتَوَضَّأَ فَغَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا، وَيَدَيْهِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ، وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ، فَأَقْبَلَ بِهِ وَأَدْبَرَ، وَغَسَلَ رِجْلَيْهِ. [راجع: ١٨٥]

ترجمہ: عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ (ہمارے گھر) تشریف لائے، ہم آپؐ کے لئے تانبے کی ایک تھال میں پانی لائے، آپؐ نے وضوفرمایا، پس چہرہ تین مرتبہ دھویا، ہاتھوں کو دو دو مرتبہ دھویا، اور سر پر مسح کیا اور مسح میں اقبال وادبار کیا، اور دونوں پیر دھوئے۔

تشریح: یہ حدیث بار بار آرہی ہے، یہاں یہ ہے کہ تانبے کی ایک تھال سے آپؐ نے وضو کیا، پس مخضب اور قدح کے علاوہ دیگر دھاتوں کے برتن سے بھی وضو کرنا جائز ہے۔

[١٩٨-] حدثنا أَبُو الْيَمَانِ، قَالَ: أَنَا شُعَيْبٌ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، قَالَ: أَخْبَرَنِي عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ، أَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ: لَمَا ثَقُلَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم، وَاشْتَدَّ بِهِ وَجَعُهُ، اسْتَأْذَنَ أَزْوَاجَهُ فِي أَنْ يُمَرَّضَ فِي بَيْتِي، فَأَذِنَّ لَهُ، فَخَرَجَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم بَيْنَ رَجُلَيْنِ تَخُطُّ رِجْلَاهُ فِي الْأَرْضِ، بَيْنَ عَبَّاسٍ وَرَجُلٍ آخَرَ، قَالَ عُبَيْدُ اللّٰهِ: فَأَخْبَرْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ فَقَالَ: أَتَدْرِي مَنِ الرَّجُلُ الْآخَرُ؟ قُلْتُ: لَا، قَالَ: هُوَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ، وَكَانَتْ عَائِشَةُ تُحَدِّثُ أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ بَعْدَ مَادَخَلَ بَيْتَهُ وَاشْتَدَّ وَجَعُهُ: "هَرِيقُوا عَلَيَّ مِنْ سَبْعِ قِرَبٍ لَمْ تُحْلَلْ أَوْكِيَتُهُنَّ، لَعَلِّي أَعْهَدُ إِلَى النَّاسِ" وَأُجْلِسَ فِي مِخْضَبٍ لِحَفْصَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم ثُمَّ طَفِقْنَا نَصُبُّ عَلَيْهِ تِلْكَ، حَتّٰى طَفِقَ يُشِيرُ إِلَيْنَا أَنْ قَدْ فَعَلْتُنَّ، ثُمَّ خَرَجَ إِلَى النَّاسِ.

[انظر: ٦٦٤، ٦٦٥، ٦٧٩، ٦٨٣، ٦٨٧، ٧١٢، ٧١٣، ٧١٦، ٢٥٨٨، ٣٠٩٩، ٣٣٨٤، ٤٤٤٢، ٤٤٤٥، ٥٧١٤، ٧٣٠٣]

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب نبی ﷺ بیمار ہوئے اور آپ کی بیماری بڑھ گئی تو آپؐ نے اپنی ازواج سے میرے گھر میں بیماری کے ایام گذارنے کی اجازت مانگی، تمام ازواج نے آپؐ کو اجازت دیدی، پس نبی ﷺ دو آدمیوں کے سہارے نکلے اس حال میں کہ آپ کے قدم مبارک زمین پر نشان بنارہے تھے، یعنی آپؐ بیماری کی شدت کی وجہ سے پاؤں اٹھا کر نہیں چل پارہے تھے۔ حضرت عباسؓ اور ایک دوسرے شخص کے سہارے چل رہے تھے۔ راوی عبیداللہ کہتے ہیں: میں نے حضرت ابن عباسؓ کو یہ حدیث سنائی کہ حضرت عائشہؓ نے آپؐ کے مرض وفات کا یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا، حضرت ابن عباسؓ نے تصدیق کی اور پوچھا: کیا تم جانتے ہو وہ دوسرا شخص کون تھا جس کے سہارے نبی ﷺ چل رہے تھے اور جس کا نام حضرت عائشہؓ نے نہیں لیا؟ میں نے کہا: نہیں، انھوں نے فرمایا: وہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ بھی بیان فرماتی تھیں کہ میرے گھر آنے کے بعد اور تکلیف بڑھنے کے بعد (ایک دن) آپؐ نے فرمایا: مجھ پر ایسی سات مشکیزوں کا پانی ڈالو جن کے تسمے کھولے نہ گئے ہوں، شاید میں لوگوں سے کوئی عہد و پیمان باندھوں، چنانچہ آپؐ ایک لگن میں بٹھائے گئے جو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا تھا (یہی جزء باب سے متعلق ہے) پھر ہم آپؐ پر ان مشکیزوں کا پانی ڈالنے لگے، یہاں تک کہ آپؐ نے ہماری طرف اشارہ کرنا شروع کیا یعنی اشارہ سے کہا کہ اب رک جاؤ، تم اپنا کام کر چکیں، پھر آپؐ لوگوں کی طرف نکلے۔

تشریح:

۱- حضور اقدس ﷺ کا مرض وفات تیرہ یوم رہا ہے۔ بدھ کے دن سے مرض شروع ہوا، وہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی باری کا دن تھا، اور پیر کے دن وصال ہوا۔ مرض کی ابتدا دردِ سر سے ہوئی، آپؐ اپنے غلام ابو مویہبہ کے ساتھ شب میں بقیع قبرستان تشریف لے گئے، اور اموات کے لئے دعا مغفرت فرمائی۔ وہاں سے تشریف لائے تو دفعۃً مزاج ناساز گار ہو گیا، سر میں درد شروع ہوا جو دن بدن بڑھتا رہا، آپؐ حسب معمول ازواج مطہرات کے یہاں تشریف لے جاتے، مگر ازواج سے پوچھتے کہ کل میں کہاں ہونگا؟ جب آپؐ نے متعدد بار یہ پوچھا تو ازواج مطہرات منشأ نبوی سمجھ گئیں، اور انھوں نے باہم مشورہ کیا کہ نبی ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری کا انتظار ہے، چنانچہ سب نے جمع ہو کر برضا و رغبت آپؐ کو حضرت عائشہؓ کے گھر بیماری کے ایام گذارنے کی اجازت دیدی، پس آپؐ حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے سہارے حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف لے آئے۔ مرض کا یہ حال تھا کہ آپ قدم مبارک نہیں اٹھا پا رہے تھے، وہ زمین پر گھسٹ رہے تھے، اسی حال میں صدیقہؓ کے گھر تشریف لائے، اور وہیں آپ کا صدیقہ کی باری کے دن وصال ہوا اور اسی حجرہ میں قبر اطہر بنی۔

۲- عرب کا علاقہ گرم خشک ہے۔ ایسی جگہوں میں ٹھنڈا پانی بخار کا علاج ہے، اور سات کی قید کیوں تھی؟ اور تسمے نہ کھولے گئے ہوں یہ قید کیوں تھی؟ طبی تدابیر اور عملیات میں ایسی باتوں کا ایک اثر ہوتا ہے، عملیات میں ایسی قیدیں اور شرطیں ہیں کہ ایسے سات کنوں کا پانی لاؤ، ایسی سات ندیوں کا اور نہروں کا پانی لاؤ، عامل ایسی شرطیں لگاتے ہیں، ان کی کوئی تاثیر ہے جبھی شرطیں لگاتے ہیں، یا جیسے سات مرتبہ دعا پڑھ کر مریض پر دم کرتے ہیں۔ غرض بالاجمال سبھی جانتے ہیں کہ اس طرح کی قیدوں کی تاثیر ہے، اور بالتفصیل حکماء اور عامل میں بھی نہیں جانتے۔

بَابُ الْوُضُوْءِ مِنَ التَّوْرِ

پانی پینے کے برتن سے وضو کرنے کا بیان

حدیث (۱): عمرو بن یحیٰی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: میرے چچا بہت زیادہ وضو کیا کرتے تھے

یعنی ہر وقت باوضو رہتے تھے (قال کا فاعل اگر عمرو بن یحیٰ کو بنائیں تو تعبیر صحیح ہے، اور اگر یحیٰ فاعل ہوں تو یہاں بھی صحیح تعبیر نہیں، وہ یحیٰ کے نہیں عمرو کے چچا تھے اور ان کا نام بھی عمرو تھا اور ان کے والد کا نام عمارہ تھا) انھوں نے عبد اللہ بن زیدؓ سے کہا: کیا آپؓ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپؐ نے نبی ﷺ کو کس طرح وضو کرتے دیکھا ہے؟ چنانچہ حضرت عبد اللہ نے ایک پانی پینے کے برتن میں پانی منگوایا (یہی ٹکڑا باب سے متعلق ہے) اور اس کو جھکا کر ہاتھوں پر پانی ڈالا، اور ان کو تین مرتبہ دھویا، پھر برتن میں ہاتھ ڈال کر پانی لیا اور ایک چلو سے مضمضہ اور استنثار کیا اور ایسا تین مرتبہ کیا، پھر برتن میں ہاتھ ڈالا، اور چلو میں پانی لیا اور اس کے ساتھ دوسرا ہاتھ ملا کر چہرہ دھویا، ایسا تین مرتبہ کیا، پھر دونوں ہاتھ کہنیوں کے ساتھ دو مرتبہ دھوئے، پھر ہاتھ میں پانی لیا اور سر پر مسح کیا اور اس میں اقبال و ادبار کیا، پھر دونوں پاؤں دھوئے، پھر فرمایا: میں نے نبی ﷺ کو اس طرح وضو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

حدیث (۲): حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ نے کسی برتن میں پانی منگوایا، پس ایک بڑا برتن لایا گیا جس میں تھوڑا سا پانی تھا، آپؐ نے اس برتن میں اپنی انگلیاں رکھ دیں، حضرت انسؓ کہتے ہیں: پس میں پانی کو دیکھ رہا تھا، جو آپؐ کی انگلیوں کے درمیان سے پھوٹ رہا تھا، حضرت انسؓ کہتے ہیں: میں نے ان لوگوں کا اندازہ لگایا جنھوں نے اس پانی سے وضو کیا، وہ ستر اور اسّی کے درمیان تھے......... تور کی طرح قدح بھی ایک برتن ہے۔ اس مناسبت سے یہ حدیث یہاں لائے۔

ایک اہم بات:

یہ حدیث پہلے بھی آئی ہے اس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان تھا کہ وضو کرنے والے اسّی سے زیادہ تھے، اور یہاں ہے کہ ستر اور اسّی کے درمیان تھے۔ نیز پہلے یہ آیا ہے کہ مخضب میں پانی لایا گیا تھا جو اوپر سے کشادہ اور اندر سے تنگ تھا اور یہاں ہے کہ قدح میں پانی لایا گیا تھا پس جاننا چاہئے کہ یہ واقعہ کے متعلقات ہیں۔ ان میں اختلاف سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ دورِ اول میں حدیثیں روایت بالمعنی کی جاتی تھیں، اور صحابہ حدیثیں بار بار بیان کرتے تھے، ایسی صورت میں واقعہ کے متعلقات میں اختلاف ناگزیر تھا۔ حافظ رحمہ اللہ روایات میں جو اس قسم کے اختلافات آئے ہیں ان میں تطبیق کی کوشش کرتے ہیں، اور جب کوئی راہ نظر نہیں آتی تو تعدد واقعہ کہہ کر گذر جاتے ہیں، جیسے نبی ﷺ کی ایک مرتبہ سفر میں فجر کی نماز قضاء ہوئی، وہ نماز قضاء کہاں ہوئی تھی؟ ایک روایت میں ہے کہ خیبر کے راستہ میں قضاء ہوئی تھی، دوسری میں ہے کہ تبوک کے راستہ میں قضاء ہوئی تھی، کسی نے دونوں میں اس طرح تطبیق دی کہ جب آپؐ خیبر تشریف لے گئے تو پہلے تبوک والے راستہ پر چلے تھے، پھر خیبر والے راستہ پر پڑ گئے۔ مگر میں نے قاعدہ بنایا ہے کہ اصل واقعہ پر توجہ مرکوز رکھنی چاہئے، واقعہ کے متعلقات میں اختلاف سے پریشان نہیں ہونا چاہئے۔

[۴۶-] بابُ الْوُضُوْءِ مِنَ التَّوْرِ

[۱۹۹-] حدثنا خَالِدُ بْنُ مَخْلَدٍ، قَالَ: ثَنَا سُلَيْمَانُ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ عَمْرُو بْنُ يَحْيىٰ، عَنْ أَبِيْهِ، قَالَ: كَانَ عَمِّيْ يُكْثِرُ مِنَ الْوُضُوْءِ، فَقَالَ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ: أَخْبِرْنِيْ كَيْفَ رَأَيْتَ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم يَتَوَضَّأُ؟ فَدَعَا بِتَوْرٍ مِنْ مَاءٍ، فَكَفَأَ عَلىٰ يَدَيْهِ، فَغَسَلَهُمَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فِي التَّوْرِ، فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِنْ غُرْفَةٍ وَاحِدَةٍ، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَاغْتَرَفَ بِهَا فَغَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ غَسَلَ يَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ مَرَّتَيْنِ، ثُمَّ أَخَذَ بِيَدِهِ مَاءً فَمَسَحَ بِهِ رَأْسَهُ، فَأَدْبَرَ بِهِ وَأَقْبَلَ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ، فَقَالَ: هٰكَذَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم يَتَوَضَّأُ. [راجع: ۱۸۵]

[۲۰۰-] حدثنا مُسَدَّدٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادٌ، عَنْ ثَابِتٍ، عَنْ أَنَسٍ: أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم دَعَا بِإِنَاءٍ مِنْ مَاءٍ، فَأُتِيَ بِقَدَحٍ رَحْرَاحٍ، فِيْهِ شَيْءٌ مِنْ مَاءٍ، فَوَضَعَ أَصَابِعَهُ فِيْهِ، قَالَ أَنَسٌ: فَجَعَلْتُ أَنْظُرُ إِلَى الْمَاءِ يَنْبُعُ مِنْ بَيْنِ أَصَابِعِهِ، قَالَ أَنَسٌ: فَحَزَرْتُ مَنْ تَوَضَّأَ مِنْهُ مَا بَيْنَ السَّبْعِيْنَ إِلَى الثَّمَانِيْنَ. [راجع: ۱۶۹]

لغت: الرَّحْراح: فراخ کشادہ، إناء رَحْراح: چھوٹی دیوار والا کشادہ برتن۔

بابُ الْوُضُوْءِ بِالْمُدِّ

ایک مُد پانی سے وضو کرنا

حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ ایک صاع سے لے کر پانچ مد تک پانی سے غسل فرماتے تھے، اور ایک مُد سے وضو فرماتے تھے۔

تشریح: ایک مُد دو رطل کا ہوتا ہے، یعنی سات سو نوے گرام کا اور صاع چار مد کا، یعنی تین کلو ایک سو پچاس گرام کا۔

یہ حدیث اگر ایسی جگہ بیان کی جائے جہاں پانی بہت ہے تو حدیث کا سبق یہ ہے کہ وضو اور غسل میں اسراف نہیں کرنا چاہئے، نبی ﷺ اتنے ہی پانی سے وضو اور غسل فرمایا کرتے تھے۔ اور اگر یہ حدیث ایسی جگہ بیان کی جائے جہاں پانی کی قلت ہے تو حدیث کا سبق یہ ہے کہ وضو اور غسل میں بخیلی نہیں کرنی چاہئے۔ بہت تھوڑے پانی سے وضو اور غسل کرنے میں بدن خشک رہ جانے کا احتمال ہے۔ نبی ﷺ پانی کی قلت کے باوجود آٹھ سو گرام پانی سے وضو اور سوا تین لیٹر سے غسل فرمایا کرتے تھے، پس لوگوں کو بھی چاہئے کہ پانی استعمال کرنے میں کنجوسی نہ کریں۔

[۴۷-] بابُ الْوُضُوْءِ بِالْمُدِّ

[۲۰۱-] حدثنا أَبُوْ نُعَيْمٍ، قَالَ: ثَنَا مِسْعَرٌ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ ابْنُ جَبْرٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا يَقُوْلُ: كَانَ النبيُّ

صلی اللہ علیہ وسلم یَغْسِلُ أَوْ: كَانَ يَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ إِلَى خَمْسَةِ أَمْدَادٍ، وَيَتَوَضَّأُ بِالْمُدِّ.

بابُ الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ

چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا

خفین پر مسح جائز ہے، اور یہ اجماعی مسئلہ ہے، اس میں صرف شیعوں کا اختلاف ہے، ان کے نزدیک پیر ممسوح عضو ہیں، ننگے پیروں پر مسح ضروری ہے اور خفین پر مسح جائز نہیں۔ اور غیر مقلدین کے نزدیک خفین پر ہی نہیں بلکہ عام سوتی اور اونی موزوں پر بھی مسح جائز ہے۔

جاننا چاہئے کہ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ خفین پر مسح کے قائل نہیں تھے، یہ غلط انتساب ہے ان کے نزدیک بھی مسح علی الخفین جائز ہے، البتہ توقیت وتحدید میں ان کا اختلاف ہے جو آپ طحاوی میں پڑھیں گے۔

فائدہ: چمڑے کے موزوں کو عربی میں خُفّ کہتے ہیں، اور جو موزے چمڑے کے علاوہ کسی اور مادے کے ہوں ان کو جورب کہتے ہیں، یہ فارسی لفظ ہے اس کی اصل گورپا (پاؤں کی قبر) ہے۔ اور جورب کی بنیادی قسمیں دو ہیں: ثخین (دبیز موٹا) اور رقیق (پتلا، باریک)

ثخین: وہ موزہ ہے جس میں تین شرطیں پائی جائیں: (۱) وہ اتنا موٹا ہو کہ پانی چھن کر اندر نہ جائے (۲) وہ اپنی ضخامت کی وجہ سے پنڈلی پر کھڑا رہے، اس کو باندھنا نہ پڑے۔ اور آج کل جو سوتی، اونی اور نائلون کے موزے استعمال ہوتے ہیں ان کے اندر ربڑ ہوتا ہے جو پنڈلی کو تھامے رہتا ہے، پس یہ خود سے رکنا نہیں (۳) ان کو پہن کر ایک فرسخ یعنی تین میل یعنی تقریباً پانچ کلومیٹر چلا جا سکے......... اگر یہ تینوں شرطیں جمع ہوں تو جورب ثخین ہے ورنہ رقیق۔

پھر ہر ایک کی تین تین قسمیں ہیں: مجلد، منعّل اور سادہ۔

مجلّد: وہ موزہ ہے جس کے اوپر نیچے پورے پیر پر چمڑا چڑھا دیا گیا ہو۔ اور منعّل: وہ موزے ہے جن کی صرف تلی پر یا تلی اور پیر کے کناروں پر چمڑا چڑھایا گیا ہو، اور جس پر بالکل چمڑا نہ چڑھایا گیا ہو وہ سادہ موزہ ہے۔

احکام:

(۱و۲) جو جورب مجلد ہوں خواہ ثخین ہوں یا رقیق ان پر بالاجماع مسح جائز ہے، کیونکہ جب اس پر چمڑا چڑھا دیا گیا تو وہ خف ہو گیا۔

(۳) ثخین منعل پر بھی بالاجماع مسح جائز ہے۔

(۴) اور ثخین سادہ میں پہلے اختلاف تھا، صاحبین اور ائمہ ثلاثہ مسح جائز کہتے تھے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ ناجائز، مگر

وفات سے تین دن پہلے یا نو دن پہلے امام اعظم رحمہ اللہ نے اپنے قول سے رجوع کرلیا ہے، اس لئے اب اس پر بھی بالاجماع مسح جائز ہے۔

(۵) رقیق سادہ موزوں پر بالاجماع مسح جائز نہیں۔ غیر مقلدین اس پر بھی مسح جائز کہتے ہیں، یہ لوگ کہتے ہیں کہ حدیث میں لفظ جورب آیا ہے اور فقہاء نے جو ثخین کی قید بڑھائی ہے وہ حدیث سے ثابت نہیں، اس لئے ہر جورب پر مسح جائز ہے۔ مگر یہ تو ''کالے کالے جامن'' والی بات ہوگئی، محض نام پر احکام کیسے دائر کئے جاسکتے ہیں؟ اور قیود فقہاء نے اس لئے بڑھائی ہیں کہ دورِ نبوی میں جورب کی یہی حالت تھی، بعد میں مشینری دور آیا تو موزے باریک سے باریک بننے لگے، ان کے لئے وہ سابقہ حکم کیسے ہوسکتا ہے؟

(۶) رقیق منعل پر مسح جائز ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ متقدمین کی کتابوں میں نہیں ہے، جن بعض کتابوں میں ہے اس میں ناجائز لکھا ہے، البتہ متاخرین کی کتابوں میں یہ مسئلہ ہے، بعض حضرات ان پر مسح جائز کہتے ہیں، اور عام طور پر علماء کی رائے یہ ہے کہ ان پر مسح جائز نہیں۔

[٤٨-] بابُ الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ

[٢٠٢-] حدثنا أَصْبَغُ بْنُ الْفَرَجِ، عَنِ ابْنِ وَهْبٍ، قَالَ: حَدَّثَنِیْ عَمْرٌو، قَالَ: حَدَّثَنِیْ أَبُو النَّضْرِ، عَنْ أَبِیْ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ، عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِیْ وَقَّاصٍ، عَنِ النبیِّ صلی اللہ علیه وسلم أَنَّهُ مَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ، وَأَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ سَأَلَ عُمَرَ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ: نَعَمْ، إِذَا حَدَّثَكَ شَيْئًا سَعْدٌ عَنِ النبیِّ صلی اللہ علیه وسلم فَلَا تَسْأَلْ عَنْهُ غَيْرَهُ، وَقَالَ مُوْسَى بْنُ عُقْبَةَ: أَخْبَرَنِیْ أَبُو النَّضْرِ، أَنَّ أَبَا سَلَمَةَ أَخْبَرَهُ، أَنَّ سَعْدًا حَدَّثَهُ، فَقَالَ عُمَرُ لِعَبْدِ اللّٰهِ نَحْوَهُ.

ترجمہ: ابن عمرؓ سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے خفین پر مسح کیا۔ ابن عمرؓ نے اپنے ابا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اس سلسلہ میں دریافت کیا یعنی حضرت سعدؓ کی تصدیق چاہی تو آپؓ نے فرمایا: سعدؓ نے صحیح کہا، پھر ابن عمرؓ کو نصیحت فرمائی کہ جب تم سے حضرت سعدؓ نبی ﷺ کی کوئی حدیث بیان کریں تو پھر وہ حدیث کسی اور سے مت پوچھو یعنی تصدیق کرنے کی ضرورت نہیں۔

وضاحت: یہ ابوالنضر کی حدیث ہے، اس کو ان سے عمرو بھی روایت کرتے ہیں اور موسیٰ بن عتبہ بھی۔ عمرو کی روایت میں ابوسلمہ اور حضرت سعدؓ کے درمیان ابن عمر کا واسطہ ہے، اور موسیٰ کی روایت میں یہ واسطہ نہیں۔

[٢٠٣-] حدثنا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ الْحَرَّانِیُّ، قَالَ: ثَنَا اللَّيْثُ، عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ، عَنْ سَعْدِ بْنِ إِبْرَاهِيْمَ، عَنْ نَافِعِ بْنِ جُبَيْرٍ، عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الْمُغِيْرَةِ، عَنْ أَبِيْهِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ، عَنْ رسولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم،

أَنَّـهُ خَرَجَ لِحَاجَتِهِ، فَاتَّبَعَهُ الْمُغِيرَةُ بِإِدَاوَةٍ فِيهَا مَاءٌ، فَصَبَّ عَلَيْهِ حِينَ فَرَغَ مِنْ حَاجَتِهِ، فَتَوَضَّأَ وَمَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ [راجع: ۱۸۲]

حدیث: پہلے گذری ہے، یہ سفر تبوک کا واقعہ ہے، حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے، حضرت مغیرہؓ پانی کا برتن لے کر آپؐ کے پیچھے گئے، جب آپ قضاء حاجت سے فارغ ہوئے تو انھوں نے پانی ڈالا اور آپؐ نے وضو کیا، اور خفین پر مسح کیا۔

تشریح: مسح علی الخفین کی روایات حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں، مگر شیعہ ان کو منسوخ مانتے ہیں، اور ناسخ آیتِ وضو کو بتاتے ہیں۔ حضرت جریر رضی اللہ عنہ کی روایت ان کے اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے وضو کیا اور خفین پر مسح کیا، طلبہ نے سوال کیا: آپ خفین پر مسح کرتے ہیں؟ آپؓ نے فرمایا: کیوں نہ کروں، جب کہ میں نے نبی ﷺ کو خفین پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ طلبہ نے پوچھا: آیتِ وضو کے نزول سے پہلے دیکھا ہے یا بعد میں؟ حضرت جریرؓ نے فرمایا: میں تو مسلمان ہی آیتِ وضو نازل ہونے کے بعد ہوا ہوں، یعنی میں نے بعد میں دیکھا ہے۔ یہ حدیث مفسر ہے کہ مسح علی الخفین کی روایات معمول بہ ہیں، اور شیعوں کا ان کو منسوخ کہنا صحیح نہیں۔

[۲۰۴-] حدثنا أَبُونُعَيْمٍ، قَالَ: ثَنَا شَيْبَانُ، عَنْ يَحْيَى، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ جَعْفَرِ بْنِ عَمْرِو بْنِ أُمَيَّةَ الضَّمْرِيِّ، أَنَّ أَبَاهُ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ رَأَى رسولَ اللّهِ صلى الله عليه وسلم يَمْسَحُ عَلَى الْخُفَّيْنِ، وَتَابَعَهُ حَرْبٌ وَأَبَانُ عَنْ يَحْيَى. [انظر: ۲۰۵]

[۲۰۵-] حدثنا عَبْدَانُ، قَالَ: أَنَا عَبْدُ اللّهِ، قَالَ: أَخْبَرَنَا الْأَوْزَاعِيُّ، عَنْ يَحْيَى، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ جَعْفَرِ ابْنِ عَمْرِو بْنِ أُمَيَّةَ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم يَمْسَحُ عَلَى عِمَامَتِهِ وَخُفَّيْهِ. وَتَابَعَهُ مَعْمَرٌ، عَنْ يَحْيَى، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ عَمْرٍو، رَأَيْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم. [راجع: ۲۰۴]

ترجمہ: حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ کہتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو خفین پر مسح کرتے دیکھا ہے۔......... اور دوسری حدیث میں ہے کہ خفین پر اور پگڑی پر مسح کرتے دیکھا ہے۔

تشریح: اس حدیث کو عمرو بن امیہؓ سے ان کے لڑکے جعفر روایت کرتے ہیں، پھر ان سے ابو سلمہ روایت کرتے ہیں، یہ مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ میں سے ہیں، پھر ان سے یحیٰ روایت کرتے ہیں، اور ان سے روایت کرنے والے بہت ہیں۔ ایک امام اوزاعی بھی ہیں، ان کی حدیث میں پگڑی پر مسح کا بھی ذکر ہے، دیگر روات پگڑی کا تذکرہ نہیں کرتے، حاشیہ میں ہے کہ یہ امام اوزاعی کا وہم ہے، اور معمر بھی اس حدیث کو یحیٰ سے روایت کرتے ہیں، اور ان کی حدیث میں بھی پگڑی کا ذکر ہے مگر ان کی روایت منقطع ہے اس لئے کہ وہ ابو سلمہ اور حضرت عمرو بن امیہ کے درمیان واسطہ ذکر نہیں کرتے۔

پگڑی پر مسح کا حکم:

امام احمد رحمہ اللہ محنک پگڑی پر مسح جائز کہتے ہیں، اور یہ پگڑی باندھنے کا ایک خاص طریقہ ہے، حَنَک کے معنی ہیں: ٹھوڑی، پگڑی کا پیچ ٹھوڑی کے نیچے سے لیا جاتا ہے، جنگ میں خاص طور پر اس طرح پگڑی باندھ کر اس پر خود پہنا جاتا ہے تا کہ وہ ہلے نہ اور سر زخمی نہ ہو، ایسی پگڑی پر امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک مسح جائز ہے، دیگر فقہاء پگڑی پر مسح کرنا جائز نہیں کہتے، ان کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِكُمْ﴾ اس میں سر پر مسح کا حکم ہے، لہٰذا سر ہی پر مسح کرنا ضروری ہے۔ دوسری دلیل: حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے پوتے ابو عبیدہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے خفین پر مسح کے بارے میں پوچھا: انھوں نے فرمایا: سنت ہے، پھر انھوں نے پوچھا: پگڑی پر مسح کا کیا حکم ہے؟ حضرت جابرؓ نے فرمایا: بالوں کو ہاتھ لگاؤ، یعنی پگڑی پر مسح جائز نہیں (ترمذی شریف ۱۰۴)

اور امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے وہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے خفین پر اور پگڑی پر مسح کیا، اور دوسری دلیل حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے خفین پر اور خمار (پگڑی) پر مسح کیا، اور تیسری دلیل حضرت عمرو بن امیہ کی حدیث ہے۔

جمہور کہتے ہیں کہ حضرت عمرو کی حدیث میں علت خفیہ ہے، وہ استشہاد میں پیش کئے جانے کے قابل نہیں، اور حضرت مغیرہؓ کی حدیث میں مسلم شریف میں یہ ہے کہ ناصیہ پر اور پگڑی پر مسح کیا، پس یہ درحقیقت ناصیہ پر مسح ہے، پھر جب پگڑی صحیح کی تو اس پر بھی مسح ہو گیا، مگر یہ مسح ضمناً اور صورۃً تھا، اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث کے بعض طرق میں بھی ناصیہ کا ذکر ہے (کشف النقاب ۲: ۴۳۹) علاوہ ازیں یہ اخبار آحاد ہیں ان سے قرآن پر زیادتی جائز نہیں، اس کے لئے خبر متواتر یا کم از کم خبر مشہور چاہئے، جیسے قرآن میں پاؤں دھونے کا حکم ہے، اور مسح علی الخفین کی روایات سے اس پر زیادتی کی گئی ہے، اور خفین پر مسح کو جائز کہا گیا ہے، اس لئے کہ وہ روایات متواتر ہیں، اسی طرح قرآن میں سر پر مسح کا حکم ہے۔ اس پر زیادتی کے لئے خبر متواتر چاہئے، اخبار آحاد کافی نہیں۔

بابٌ إِذَا أَدْخَلَ رِجْلَيْهِ وَهُمَا طَاهِرَتَانِ

جوازِ مسح کے لئے پاکی پر خفین پہننا شرط ہے

اس باب میں مسئلہ یہ ہے کہ خفین پر مسح اس وقت جائز ہے جب ان کو پاکی پر پہنا ہو، اس میں ائمہ اربعہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، البتہ داؤد ظاہری اختلاف کرتے ہیں، ان کے نزدیک اگر پیروں پر حسّی ناپاکی نہ ہو اور خفین پہنے ہوں تو مسح جائز ہے۔ جوازِ مسح کے لئے طہارت شرط نہیں، اور دوسرا اختلاف ائمہ اربعہ کے درمیان ہے، امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خفین پر مسح اسی وقت جائز ہے جب ان کو طہارت کاملہ پر پہنا ہو، دیگر ائمہ کے نزدیک جب پہلی بار

حدث لاحق ہو اس وقت طہارت کاملہ ہونا ضروری ہے، خفین پہننے کے وقت طہارت کاملہ ضروری نہیں، مثلاً ایک شخص نے پاؤں دھوکر خفین پہن لئے پھر چہرہ اور ہاتھ دھوئے اور سر پر مسح کیا پھر حدث پیش آیا تو اب خفین پر مسح جائز ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک جائز نہیں، کیونکہ جس وقت خفین پہنے ہیں اس وقت طہارت کامل نہیں، اور پاؤں دھوکر خفین پہن لئے اور ابھی چہرہ اور ہاتھ نہیں دھوئے تھے کہ حدث پیش آ گیا تو کسی کے نزدیک مسح جائز نہیں۔

اور یہ اختلاف درحقیقت ایک دوسرے مسئلہ پر متفرع ہے، وضو میں ترتیب واجب ہے یا سنت؟ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ترتیب واجب ہے، جس ترتیب سے قرآن میں وضو کا ذکر ہے اسی ترتیب سے وضو کرنا ضروری ہے۔ اور جمہور کے نزدیک سنت ہے، وہ کہتے ہیں کہ واوٗ مطلق جمع کے لئے ہے، ترتیب کے لئے نہیں ہے، پس جس نے صرف پیر دھوکر خفین پہنے پھر وضو کامل کیا تو امام شافعی کے نزدیک اس کا وضو نہیں ہوا، پس اس کے لئے خفین پر مسح کرنا جائز نہیں، اور جمہور کے نزدیک اس کا وضو صحیح ہے اس لئے مسح جائز ہے۔

اس مسئلہ میں امام مالکؒ کا بھی اختلاف ہونا چاہئے تھا، ان کے نزدیک وضو میں موالات شرط ہے، لہٰذا اگر خفین پہن کر فوراً وضو مکمل کیا تب تو مسح جائز ہے، اور کچھ دیر بعد وضو مکمل کیا تو مسح جائز نہیں، مگر کتابوں میں یہ اختلاف نہیں لکھا۔

[۴۹-] بابٌ إِذَا أَدْخَلَ رِجْلَيْهِ وَهُمَا طَاهِرَتَانِ

[۲۰۶-] حدثنا أَبُو نُعَيْمٍ، قَالَ: ثَنَا زَكَرِيَّا، عَنْ عَامِرٍ، عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الْمُغِيْرَةِ، عَنْ أَبِيْهِ، قَالَ: كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم فِيْ سَفَرٍ، فَأَهْوَيْتُ لِأَنْزِعَ خُفَّيْهِ، فَقَالَ: " دَعْهُمَا، فَإِنِّيْ أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ" فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا. [راجع: ۱۸۲]

ترجمہ: حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں ایک سفر میں (غزوۂ تبوک میں) نبی ﷺ کے ساتھ تھا (انھوں نے آپؐ کو وضو کرایا) پس میں جھکا تاکہ آپؐ کے موزے نکالوں، آپؐ نے فرمایا: ان کو رہنے دو، میں نے ان کو پاکی کی حالت میں پہنا ہے، پھر آپؐ نے ان پر مسح فرمایا۔

بابُ مَنْ لَمْ يَتَوَضَّأْ مِنْ لَحْمِ الشَّاةِ وَالسَّوِيْقِ

بکری کا گوشت اور ستو کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا

اس باب میں مسئلہ یہ ہے کہ بکری کا گوشت اور ستّو کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اور یہ مسئلہ اجماعی ہے، اور شاۃ کی قید اس لئے لگائی ہے کہ اونٹ کے گوشت میں امام احمد رحمہ اللہ کا اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، خواہ گوشت کچا کھائے یا پکا کر کھائے، اور گائے بھینس وغیرہ شاۃ کے حکم میں ہیں۔ ان کے گوشت سے

وضونہیں ٹوٹتا، اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ دورِاول میں اس مسئلہ میں اختلاف تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ ما مسَّت النار کی مزاولت سے وضوٹوٹ جاتا ہے یعنی ہر وہ چیز جس کو آگ پر پکایا گیا ہے اس کے استعمال سے خواہ خارجی استعمال ہو یا داخلی: وضوٹوٹ جاتا ہے، پھر یہ اختلاف مضمحل ہوگیا، اب پوری امت متفق ہے کہ ماست النار سے وضونہیں ٹوٹتا۔ امام احمد رحمہ اللہ کا صرف اونٹ کے گوشت میں اختلاف ہے —— جاننا چاہئے کہ ماست النار سے وضوٹوٹنے کی روایات اعلی درجہ کی صحیح ہیں، مگر وہ منسوخ ہیں۔ امام بخاریؒ ان میں سے کوئی روایت نہیں لائے، صرف ناسخ روایتیں لائے ہیں۔

حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے دورِ خلافت میں بکری کا گوشت کھایا، پھر نیا وضو کئے بغیر نماز پڑھائی۔ معلوم ہوا کہ بکری کا گوشت کھانے سے وضونہیں ٹوٹتا۔ طالب علم کہتا ہے کہ لحمًا عام ہے، بکری وغیرہ ہر گوشت کو شامل ہے پس حضرات خلفاء ثلاثہ کا یہ عمل باب سے کس طرح منطبق ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ عرف وعادت بکری کا گوشت کھانے ہی کی تھی، اس اعتبار سے یہ اثر باب سے منطبق ہے۔

حدیث (۱): رسول اللہ ﷺ نے بکری کے شانہ کا گوشت نوش فرمایا، پھر نماز پڑھائی اور وضونہیں کیا۔

حدیث (۲): عمرو بن امیہؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کو دیکھا درانحالیکہ آپؐ بکری کے شانہ کا گوشت چھری سے کاٹ کر نوش فرمارہے تھے، آپؐ کو نماز کی اطلاع دی گئی تو آپؐ نے چھری رکھ دی اور نماز پڑھائی اور وضونہیں کیا۔

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت چھری سے گوشت، ڈبل روٹی اور پھل وغیرہ کاٹنا جائز ہے، البتہ بے ضرورت چھری کا استعمال ٹھیک نہیں، یہ عجمیوں کا طریقہ ہے، وہ چھری کانٹے سے کھاتے ہیں۔ اور ضعیف روایات میں جو گوشت اور روٹی کاٹنے کی ممانعت آئی ہے اس کا یہی محمل ہے[1]

[۵۰-] بابُ مَنْ لَمْ يَتَوَضَّأْ مِنْ لَحْمِ الشَّاةِ وَالسَّوِيْقِ

وَأَكَلَ أَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ رضى الله عنهم لَحْمًا، فَلَمْ يَتَوَضَّؤُا.

(۱) ابوداؤد (حدیث ۳۷۷۸) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع روایت ہے کہ چھری سے گوشت مت کاٹو۔ اس لئے کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے، بلکہ اس کو دانتوں سے نوچ کر کھاؤ، وہ زیادہ خوش گوار اور زود ہضم ہے (اس کا ایک راوی ابومعشر نجیح بن عبد الرحمن سندی مدنی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو منکر الحدیث کہا ہے)

اور طبرانی میں حضرت ابن عباس اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہم کی روایت ہے کہ چھری سے روٹی مت کاٹو، جس طرح عجمی لوگ کاٹتے ہیں اور جب تم میں سے کوئی گوشت کھانے کا ارادہ کرے تو اس کو چھری سے نہ کاٹے بلکہ اس کو اپنے ہاتھ میں لے اور چاہئے کہ اس کو دانتوں سے نوچ کر کھائے، پس وہ زیادہ خوش گوار اور زود ہضم ہے (یہ حدیث عباد بن کثیر ثقفی کی وجہ سے ضعیف ہے)

[۲۰۷-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ یُوْسُفَ، قَالَ أَنَا مَالِكٌ، عَنْ زَیْدِ بْنِ أَسْلَمَ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم أَکَلَ کَتِفَ شَاةٍ، ثُمَّ صَلّٰی وَلَمْ یَتَوَضَّأْ.

[انظر: ٥٤٠٤، ٥٤٠٥]

[۲۰۸-] حدثنا یَحْیَی بْنُ بُکَیْرٍ، قَالَ: ثَنَا اللَّیْثُ، عَنْ عُقَیْلٍ، عَنْ ابن شِهَابٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِیْ جَعْفَرُ بْنُ عَمْرِو بْنِ أُمَیَّةَ، أَنَّ أَبَاهُ أَخْبَرَهُ، أَنَّهُ رَأَی النَّبِیَّ صلی الله علیه وسلم یَحْتَزُّ مِنْ کَتِفِ شَاةٍ، فَدُعِیَ إِلَی الصَّلاَةِ، فَأَلْقَی السِّکِّیْنَ فَصَلّٰی وَلَمْ یَتَوَضَّأْ. [انظر: ٦٧٥، ٢٩٢٣، ٥٤٠٨، ٥٤٢٢، ٥٤٦٢]

لغت: اِحتزَّہ: کاٹنا.........حزَّہ (ن) حزًّا: کاٹنا مگر الگ نہ کرنا۔

بَابُ مَنْ مَضْمَضَ مِنَ السَّوِیْقِ وَلَمْ یَتَوَضَّأْ

ستّو کھا کر کلی کرنا اور وضو نہ کرنا

یہ باب افادہ کے لئے قائم کیا ہے، اوپر والا باب عام تھا، اسی باب کی حدیثیں ابھی چل رہی ہیں۔

حدیث: حضرت سُوید بن النعمانؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ خیبر کے سال نکلے، جب آپ صہباء مقام میں پہنچے جو خیبر کے قریب ہے تو آپؐ نے عصر کی نماز پڑھی۔ پھر توشہ منگوایا، آپؐ کے پاس صرف ستو لایا گیا، آپؐ نے اس کو تیار کرنے کا حکم دیا چنانچہ اس کو بھگایا گیا، یعنی پانی ڈال کر اور کھجور سے میٹھا کر کے ربڑی بنائی گئی۔ پس رسول اللہ ﷺ نے بھی کھایا اور ہم نے بھی کھایا، پھر جب نماز مغرب کا وقت ہوا تو آپؐ کھڑے ہوئے اور کلی کی اور ہم نے بھی کلی کی۔ پھر آپؐ نے نماز پڑھائی اور وضو نہیں کیا۔

تشریح: ستّو کو آگ پر بھونتے ہیں۔ پہلے گیہوں کو ہلکا سا بھونتے ہیں پھر اس کو موٹا موٹا پیستے ہیں پھر گھی وغیرہ میں اس کو بھون کر تیار کر لیتے ہیں۔ نبی ﷺ نے اس کو کھا کر وضو نہیں کیا، صرف منہ صاف کرنے کے لئے کلی کی، معلوم ہوا کہ ماست النار سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اور حدیث کی باب سے مناسبت واضح ہے۔

حدیث (۲): حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان کے گھر میں بکری کے شانہ کا گوشت تناول فرمایا، پھر نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔

تشریح: اس حدیث کا ذیلی باب سے کوئی جوڑ نہیں۔ شارحین پریشان ہوئے ہیں اور حاشیہ میں بحث ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث اوپر والے باب کی ہے، جاہل کاتبوں نے اس باب میں لکھ دی ہے، یہ عجیب وغریب توجیہ ہے۔ اس سے تو پوری کتاب ناقابل اعتبار ہو کر رہ جائے گی، اور یہ بحث ہی فضول ہوگی کہ حدیث باب سے منطبق ہے یا

نہیں؟ اور نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے؟ اور میرے پاس بھی اس کی کوئی توجیہ نہیں، سوائے اس کے کہ یوں کہیں کہ ذیلی باب کی حدیث کا ذیلی باب سے منطبق ہونا ضروری نہیں، جنرل باب سے منطبق ہو جائے تو بھی کافی ہے، یہ زبردستی کی توجیہ ہے مگر کاتبوں کے سر ٹھیکرا پھوڑنے سے بہتر ہے۔

[۵۱-] بابُ مَنْ مَضْمَضَ مِنَ السَّوِيْقِ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ

[۲۰۹-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: أَنَا مَالِكٌ، عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ، عَنْ بُشَيْرِ بْنِ يَسَارٍ مَوْلٰى بَنِي حَارِثَةَ، أَنَّ سُوَيْدَ بْنَ النُّعْمَانِ أَخْبَرَهُ، أَنَّهُ خَرَجَ مَعَ رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم عَامَ خَيْبَرَ، حَتّٰى إِذَا كَانُوْا بِالصَّهْبَاءِ - وَهِيَ أَدْنٰى خَيْبَرَ - فَصَلَّى الْعَصْرَ، ثُمَّ دَعَا بِالْأَزْوَادِ، فَلَمْ يُؤْتَ إِلَّا بِالسَّوِيْقِ، فَأَمَرَ بِهِ فَثُرِّيَ، فَأَكَلَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم وَأَكَلْنَا، ثُمَّ قَامَ إِلَى الْمَغْرِبِ فَمَضْمَضَ وَمَضْمَضْنَا، ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. [انظر: ۲۱۵، ۲۹۸۱، ۴۱۷۵، ۴۱۹۵، ۵۳۸۴، ۵۳۹۰، ۵۴۵۴، ۵۴۵۵]

[۲۱۰-] حَدَّثَنَا أَصْبَغُ، قَالَ: نَا ابْنُ وَهْبٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ عَمْرٌو، عَنْ بُكَيْرٍ، عَنْ كُرَيْبٍ، عَنْ مَيْمُوْنَةَ: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم أَكَلَ عِنْدَهَا كَتِفًا، ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ.

بابٌ هَلْ يُمَضْمَضُ مِنَ اللَّبَنِ؟

کیا دودھ پی کر کلی کرنی چاہئے؟

دودھ پیا، چائے پی، حلوا کھایا یا کوئی اور چیز کھائی یا پی اور فوراً نماز پڑھنی ہے تو منہ صاف کر کے یا کم از کم کلی کر کے نماز پڑھنی چاہئے۔

حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے دودھ نوش فرمایا پھر کلی کی اور فرمایا: دودھ میں چکناہٹ ہے۔

تشریح: یہ حدیث درحقیقت آدابِ طعام کی ہے، سب سے پہلے امام مالک رحمہ اللہ نے اس کو کتاب الطہارۃ میں لیا اور چونکہ امام مالکؒ تمام محدثین کے سرخیل ہیں۔ اس لئے بعد کے محدثین نے بھی اس کو کتاب الطہارۃ میں لیا .... دَسَم کے معنی ہیں: چکناہٹ، نبی ﷺ نے اپنے فعل کی وجہ بیان کی ہے، اس لئے حکم ہر اس چیز کو عام ہوگا جس میں چکناہٹ ہو، مثلاً: اونٹ کا گوشت، اور گھی کا کوئی بھی آئٹم، ان کو کھا کر کلی کر لینی چاہئے۔

مسئلہ: کوئی چیز کھانے کے بعد منہ میں اس کا مزہ باقی ہو اس حالت میں نماز پڑھنا جائز ہے، مثلاً چائے پی، ابھی اس کا مزہ منہ میں باقی ہے اس حالت میں کلی کئے بغیر کوئی نماز پڑھے تو درست ہے مگر کلی کر کے پڑھنا بہتر ہے۔

[۵۲-] بابٌ هَلْ يُمَضْمِضُ مِنَ اللَّبَنِ؟

[۲۱۱-] حدثنا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ، وَقُتَيْبَةُ، قَالَا: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ، عَنْ عُقَيْلٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم شَرِبَ لَبَنًا فَمَضْمَضَ، وَقَالَ: "إِنَّ لَهُ دَسَمًا" تَابَعَهُ يُونُسُ وَصَالِحُ بْنُ كَيْسَانَ عَنِ الزُّهْرِيِّ. [انظر: ۵۶۰۹]

وضاحت: یونس اور صالح: عقیل کے متابع ہیں، یعنی وہ دونوں بھی ابن شہاب زہریؒ سے اس حدیث کو روایت کرتے ہیں۔

بابُ الْوُضُوْءِ مِنَ النَّوْمِ، وَمَنْ لَمْ يَرَ مِنَ النَّعْسَةِ وَالنَّعْسَتَيْنِ أَوِ الْخَفْقَةِ وُضُوْءًا

نیند ناقض وضو ہے مگر ہلکی نیند ناقض نہیں

نیند ناقض وضو ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ تفصیل حاشیہ میں ہے، ہمیں صرف احناف کا مسلک سمجھنا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک نیند بعض حالتوں میں ناقض ہے اور بعض میں نہیں۔ اگر اس طرح سویا کہ خروج ریح کا مظنہ (احتمال) پیدا ہو گیا تو وضو ٹوٹ جائے گا۔ اور اگر ایسی ہیئت پر سویا کہ خروج ریح کا مظنہ پیدا نہیں ہوا تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر نماز کی ہیئاتِ اربعہ یعنی قیام، رکوع، سجدہ اور قعدہ کی حالت میں سویا، خواہ نماز کے اندر سویا یا نماز کے باہر سویا، یا مقعد زمین پر جما کر سویا تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ جاننا چاہئے کہ سجدہ سے مردوں کا سجدہ مراد ہے، عورت سجدہ میں سو جائے یا کوئی مرد عورت کی طرح سجدہ کرے اور سو جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا، اسی طرح چت لیٹ کر یا کروٹ پر سویا یا ٹیک لگا کر سویا کہ اگر وہ ٹیک ہٹالی جائے تو گر جائے تو بھی وضو ٹوٹ جائے گا۔

اور اگر ٹیک خود نہیں لگائی بلکہ ٹیک خود لگی جیسے کرسی وغیرہ پر ٹیک خود لگتی ہے تو دو صورتیں ہیں: اگر صرف ٹیک لگی ہوئی ہے تو وضو نہیں ٹوٹے گا، اور ٹیک لگا بھی رکھی ہے تو وضو ٹوٹ جائے گا، اور فیصلہ رائے مبتلی پر چھوڑ دیا جائے گا۔

غرض: احناف کے نزدیک نیند فی حالٍ ناقض وضو ہے دون حالٍ، مذکورہ پانچ صورتوں میں ناقض نہیں۔ ان ہیئتوں میں خروج ریح کا مظنہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور مذکورہ تین صورتوں میں ناقض وضو ہے، اس لئے کہ خروج ریح کا مظنہ پیدا ہو جاتا ہے۔

باب میں حدیث ہے کہ جب تہجد میں کوئی سوتا تو نبی ﷺ اس سے فرماتے: پہلے سو جاؤ، جب نیند پوری ہو جائے تب نماز پڑھنا، ہو سکتا ہے تم دعا کرو اور بے خبری میں بددعا کرنے لگو، اس لئے پہلے نیند پوری کر لو، پھر نشاط کے ساتھ نماز پڑھو، معلوم ہوا کہ نیند مطلقاً ناقض وضو نہیں، صرف بعض احوال میں ناقض ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نیند سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، البتہ ایک مرتبہ جھومنا یا دومرتبہ جھومنا یا ایک مرتبہ جھوکا مارنا، اس سے وضو نہیں ٹوٹتا......... نُعاس: نیند کا ابتدائی درجہ ہے اس میں آنکھیں بند ہوجاتی ہیں مگر کسی قدر شعور باقی رہتا ہے۔ اردو میں اس کو اونگھنا کہتے ہیں، ہم نے ترجمہ کیا ہے: 'جھومنا' پھر اس کے بعد کا درجہ ہے 'جھوکا' جب اونگھ گہری ہوجاتی ہے تو جھوکا آتا ہے۔ وہ خَفقَۃ کہلاتا ہے، یعنی امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک بھی بعض احوال میں نیند ناقض ہے اور بعض میں نہیں۔

اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کثیر نیند ناقض ہے قلیل نہیں، امام احمد رحمہ اللہ کی بھی ایک روایت یہی ہے۔ اور شاید امام بخاریؒ کی بھی یہی رائے ہے، اور امام شافعی رحمہ اللہ کی امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہ رائے بیان کی ہے کہ ان کے نزدیک اگر نیند گہری ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا جیسے سوتے ہوئے خواب نظر آیا، یا جسم کا پچھلا حصہ زمین سے اٹھ گیا تو گہری نیند ہے اور ناقض ہے۔ اور امام شافعیؒ کا ایک قول احناف کے قول کے موافق ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ نماز میں سونا مطلقاً ناقض نہیں، اور نماز سے باہر سونا مطلقاً ناقض ہے۔ اور اسحاق بن راہویہؒ نے فرمایا: جب نیند عقل پر غالب آجائے یعنی انسان بے خبر ہوجائے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے، خواہ کسی حالت میں سوئے۔

حدیث (۱): نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اونگھنے لگے درانحالیکہ وہ نماز پڑھ رہا ہے تو چاہئے کہ وہ سوجائے، یہاں تک کہ نیند پوری ہوجائے، اس لئے کہ تم میں سے کوئی جب اونگھتے ہوئے نماز پڑھتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ شاید وہ استغفار کرے اور اپنے لئے بددعا کرنے لگے۔

تشریح:

اس حدیث میں نماز سے تہجد کی نماز مراد ہے، وہی دیر تک پڑھی جاتی ہے اور اسی میں اونگھ آتی ہے۔ فرائض تو تھوڑی دیر میں نمٹ جاتے ہیں، کبھی آدمی تہجد میں اٹھتا ہے اور نیند پوری نہیں ہوتی تو نماز میں اونگھ آتی ہے، اس حال میں تہجد نہیں پڑھنا چاہئے، بلکہ نماز جلدی سے پوری کر کے سوجائے، جب نیند پوری ہوجائے تب نماز پڑھے۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ دعا مانگنا چاہے مگر بے شعوری میں اپنے لئے بددعا کرنے لگے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اونگھ ناقض وضو نہیں، آپؐ نے نماز پوری کر کے سونے کے لئے فرمایا ہے، فلیرقد کا یہی مفہوم ہے جو نماز پڑھ رہا ہے اس کو جلدی سے پوری کر کے سوجائے۔

حدیث (۲): رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب نماز (تہجد) میں اونگھ آنے لگے تو چاہئے کہ جا کر سوجائے، یہاں تک کہ وہ جانے جو کچھ پڑھ رہا ہے یعنی نیند پوری ہوجائے، اور نشاط آجائے، تاکہ سمجھ کر تلاوت کرے اور اللہ سے دعا مانگے۔

[۵۳-] بَابُ الْوُضُوْءِ مِنَ النَّوْمِ، وَمَنْ لَمْ يَرَ مِنَ النَّعْسَةِ وَالنَّعْسَتَيْنِ أَوِ الْخَفْقَةِ وُضُوْءًا

[۲۱۲-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: أَنَا مَالِكٌ، عَنْ هِشَامٍ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ

صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: "إِذَا نَعَسَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ يُصَلِّيْ فَلْيَرْقُدْ، حَتَّى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ، فَإِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا صَلَّى وَهُوَ نَاعِسٌ لاَ يَدْرِيْ لَعَلَّهُ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبُّ نَفْسَهُ"

[۲۱۳-] حدثنا أَبُوْ مَعْمَرٍ، قَالَ: ثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ، قَالَ: ثَنَا أَيُّوْبُ، عَنْ أَبِيْ قِلاَبَةَ، عَنْ أَنَسٍ، عَنِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ:" إِذَا نَعَسَ فِيْ الصَّلاَةِ فَلْيَنَمْ حَتَّى يَعْلَمَ مَا يَقْرَأُ "

بَابُ الْوُضُوْءِ مِنْ غَيْرِ حَدَثٍ

باوضو کا وضو کرنا

وضو پر وضو کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ باعثِ اجر ہے۔ نبی ﷺ سے ثابت ہے، یہ اسراف نہیں، اس باب کا یہی مقصد ہے۔

حدیث: عمرو بن عامر کہتے ہیں: حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی ﷺ ہر نماز کے لئے نیا وضو کرتے تھے، میں نے پوچھا: صحابہ کا عمل کیا تھا؟ انھوں نے کہا: ہمارے لئے ایک وضو کافی تھا جب تک حدث پیش نہ آئے۔

تشریح:

۱- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر نماز کے لئے نیا وضو ضروری نہیں، ایک وضو جب تک رہے فرض اور نفل نمازیں پڑھ سکتے ہیں اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ رہی یہ بات کہ نبی ﷺ کے لئے کیا حکم تھا، اب اس کو طے کرنے کی ضرورت نہیں۔ طحاوی شریف میں ایک روایت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ پر پہلے ہر فرض نماز کے لئے نیا وضو کرنا ضروری تھا، پھر جب آپؐ کے لئے اس میں دشواری ہوئی تو یہ حکم اٹھالیا گیا اور اس کی جگہ مسواک کرنے کا حکم دیا گیا۔

۲- اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی ﷺ ہر نماز کے لئے نیا وضو کرتے تھے خواہ پہلا وضو باقی ہو یا ٹوٹ گیا ہو، معلوم ہوا کہ وضو پر وضو کرنا فعل عبث اور اسراف نہیں، بلکہ مسنون ہے۔

حدیث (۲): سوید بن النعمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خیبر والے سال نکلے، جب ہم صہباء مقام میں پہنچے تو ہمیں رسول اللہ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی، جب نماز سے فارغ ہو گئے تو آپؐ نے کھانا منگوایا، پس آپؐ کے پاس صرف ستو لایا گیا، پس ہم نے کھایا اور پیا۔ پھر آپ مغرب کے لئے کھڑے ہوئے، پس آپؐ نے کلی کی اور مغرب پڑھائی اور وضو نہیں کیا ——— معلوم ہوا کہ آپؐ پر بھی ہر فرض نماز کے لئے نیا وضو کرنا ضروری نہیں تھا، مگر آپؐ پھر بھی نیا وضو فرماتے تھے کیونکہ یہ باعث اجر ہے۔

[۵۴-] بَابُ الْوُضُوْءِ مِنْ غَيْرِ حَدَثٍ

[۲۱۴-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: ثَنَا سُفْيَانُ، عَنْ عَمْرِو بْنِ عَامِرٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا ح:

قَالَ: وَحَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ، قَالَ: ثَنَا يَحْيىَ، عَنْ سُفْيَانَ، قَالَ: حَدَّثَنِي عَمْرُو بْنُ عَامِرٍ، عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: كَانَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم يَتَوَضَّأُ عِنْدَ كُلِّ صَلاَةٍ، قُلْتُ: كَيْفَ كُنْتُمْ تَصْنَعُوْنَ؟ قَالَ: يُجْزِئُ أَحَدَنَا الْوُضُوْءُ مَالَمْ يُحْدِثْ.

[۲۱۵-] حدثنا خَالِدُ بْنُ مَخْلَدٍ، قَالَ: ثَنَا سُلَيْمَانُ، قَالَ: حَدَّثَنِي يَحْيىَ بْنُ سَعِيْدٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِي بُشَيْرُ بْنُ يَسَارٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِي سُوَيْدُ بْنُ النُّعْمَانِ، قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم عَامَ خَيْبَرَ، حَتّٰى إِذَا كُنَّا بِالصَّهْبَاءِ صَلَّى لَنَا رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم الْعَصْرَ، فَلَمَّا صَلَّى دَعَا بِالْأَطْعِمَةِ فَلَمْ يُؤْتَ إِلاَّ بِالسَّوِيقِ، فَأَكَلْنَا وَشَرِبْنَا، ثُمَّ قَامَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم إِلَى الْمَغْرِبِ فَمَضْمَضَ ثُمَّ صَلَّى لَنَا الْمَغْرِبَ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. [راجع: ۲۰۹]

بابٌ مِنَ الْكَبَائِرِ أَنْ لاَ يَسْتَتِرَ مِنْ بَوْلِهِ

اپنے پیشاب سے احتراز نہ کرنا کبیرہ گناہ ہے

بول سے آدمی کا پیشاب مراد ہے، وہ نجاست غلیظہ ہے، ایسی ناپاکی درہم سے کم معاف ہے، درہم کے بقدر یا اس سے زیادہ معاف نہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تو ذرا سی بھی معاف نہیں۔ اس لئے پیشاب سے بچنے کا خاص اہتمام کرنا چاہئے، پیشاب سے نہ بچنا گناہ کبیرہ ہے، ایسے شخص کی کوئی نماز صحیح نہیں ہوتی۔ پس جس طرح نماز نہ پڑھنا گناہ کبیرہ ہے، پیشاب سے نہ بچنا بھی گناہ کبیرہ ہے۔ جو لوگ پیشاب کے بعد استبراء سے پہلے پانی سے دھوکر اٹھ جاتے ہیں وہ ٹھیک نہیں کرتے، پیشاب کے عضو کی نالی میں پیشاب رکا رہتا ہے جو چلنے سے نکلتا ہے، اس لئے پیشاب کے بعد ڈھیلا یا استنجے کا کاغذ استعمال کرنا چاہئے، یا خوب استبراء کر کے پانی استعمال کرنا چاہئے یا پیشاب استنجے کا کپڑا الگ رکھے، کیونکہ عام حالات میں ناپاک لنگی پہننا جائز ہے، اس میں سونا بھی جائز ہے۔

حدیث: ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: نبی ﷺ مکہ یا مدینہ کے باغوں میں سے ایک باغ سے گذرے، آپؐ نے دو انسانوں کی آواز سنی جو اپنی قبروں میں عذاب دیئے جارہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: یہ دونوں قبر والے عذاب دیئے جارہے ہیں، اور کسی اہم معاملے میں عذاب نہیں دیئے جارہے بلکہ معمولی بات میں عذاب دیئے جارہے ہیں، پھر فرمایا: کیوں نہیں! (اہم معاملہ میں عذاب دیئے جارہے ہیں) ان میں سے ایک اپنے پیشاب سے نہیں بچتا تھا، اور دوسرا چغلیاں کھاتا تھا۔ پھر آپؐ نے کھجور کی ایک شاخ منگوائی، اور چیر کر اس کے دو ٹکڑے کئے، اور ہر قبر پر ایک ٹہنی گاڑی، آپؐ سے عرض کیا گیا: یارسول اللہ! آپؐ نے ایسا کیوں کیا؟ یعنی قبر پر ٹہنیاں گاڑنے کا کیا مقصد ہے؟ آپؐ نے فرمایا: شاید ان کے عذاب میں تخفیف کی جائے جب تک ٹہنیاں خشک نہ ہوں۔

تشریح:

۱- راوی کو شک ہے کہ یہ مکہ مکرمہ کا واقعہ ہے یا مدینہ منورہ کا، اور راجح یہ ہے کہ مدینہ منورہ کا واقعہ ہے، اس لئے کہ مکہ میں باغات نہیں ہیں۔

۲- حائط کے معنی ہیں: دیوار، اس کی جمع حیطان ہے اور مراد کھجوروں کے باغ ہیں۔ اس زمانہ میں باغ کے چاروں طرف دیوار بنانے کا دستور تھا، اس لئے یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ اب باغ کو حائط کہیں گے، اگر چہ اس کے اطراف میں دیوار نہ ہو، یہ جس خاندان کا باغ تھا انھوں نے اپنے اموات کی تدفین باغ میں کی ہوگی، آج بھی لوگ اپنے باغوں میں اپنے اموات کی تدفین کرتے ہیں۔

۳- آپؐ نے فرمایا: ان دونوں کو کسی اہم معاملہ میں عذاب نہیں ہو رہا، پھر فرمایا: کیوں نہیں! یعنی اہم معاملہ میں عذاب ہو رہا ہے۔ یہ دو مختلف باتیں اس طرح جمع ہیں کہ عمل کے اعتبار سے یہ دونوں باتیں معمولی ہیں، پیشاب سے بچنا کیا مشکل ہے؟ اور چغل خوری کا کیا فائدہ ہے؟ مگر نتائج کے اعتبار سے یہ دونوں باتیں سنگین ہیں۔ اگر پیشاب سے نہیں بچے گا تو ساری نمازیں برباد ہونگی، اور لگائی بجھائی کرنا مونڈنے والی خصلت ہے۔ اور سر نہیں مونڈتی، دین مونڈ دیتی ہے یعنی یہ فساد ذات البین کا سبب ہے، اس سے دین کا جنازہ نکل جاتا ہے۔

۴- آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قبروں پر ٹہنیاں گاڑی تھیں اس کی وجہ خود بیان فرمائی ہے کہ شاید ان کے خشک ہونے تک ان کے عذاب میں تخفیف کردی جائے، اور مسلم شریف کے آخر میں جابرؓ کی روایت ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: **أَحْبَبْتُ بِشَفَاعَتِیْ أَنْ یُرَفَّهَ ذاك عنهما ما دام الغُصْنَانِ رَطْبَیْنِ** (۴۱۸:۲): پسند کیا میں نے اپنی سفارش کی وجہ سے کہ کلفت دور کرے یہ عمل ان دونوں سے جب تک دونوں ٹہنیاں تر رہیں یعنی میں نے ان کے لئے سفارش کی، میری سفارش مطلقاً قبول نہیں ہوئی، مقید قبول ہوئی۔ جب تک یہ ٹہنیاں تر رہیں گی میری سفارش کی وجہ سے ان کے عذاب میں تخفیف ہوگی۔

پس بدعتیوں کا اس روایت سے قبروں پر پھول چڑھانے کے جواز پر استدلال کرنا صحیح نہیں، اور ان کا یہ کہنا بھی بے دلیل ہے کہ پھول تسبیح پڑھیں گے، اس سے میت کو فائدہ پہنچے گا، کیونکہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے عمل کی وجہ بیان کی ہے تو اب دوسرے کو فعل نبوی کی وجہ بیان کرنے کا حق نہیں۔

۵- قبر پر پھول چڑھانا حرام ہے، چڑھانا بندگی ہے، اور غیر اللہ کی کسی بھی درجہ میں بندگی شرک ہے، ہاں قبر پر پھول پتے اور گھاس وغیرہ رکھنا اور ڈالنا جائز ہے، اور دونوں کا فرق اس طرح معلوم کیا جا سکتا ہے کہ جو شخص پھول لے کر کسی قبر پر جا رہا ہے اس کو نیم کے پتوں کا ایک گٹھر دو اور کہو: پھولوں کی یہ چند پنکھڑیاں مجھے دیدے، اور یہ ڈھیر سارے پتے لے جا کر قبر پر رکھ دے، یہ ان سے زیادہ تسبیح پڑھیں گے، اگر وہ اس کے لئے بے تکلف تیار ہو جائے تو سمجھ لو کہ وہ پھول رکھنے جا رہا

ہے اور اگر وہ ناک منہ چڑھائے اور اس کو صاحب قبر کی توہین سمجھے تو سمجھ لو کہ وہ پھول چڑھانے جارہا ہے جو شرک ہے۔

علاوہ ازیں: یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ نبی ﷺ نے ایسی قبروں پر ٹہنیاں گاڑی تھیں جن کو عذاب ہورہا تھا، اور بدعتی بزرگوں کی قبر پر پھول چڑھاتے ہیں، تو کیا ان کے خیال میں ان بزرگوں کو قبر میں عذاب ہورہا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ کچھ بھی کہیں وہ قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں، رکھتے نہیں، اور چڑھانا بحکم نذر ہے جو طاعت ہے اور غیر اللہ کی عبادت شرک ہے۔

فائدہ: ایک حدیث مشہور ہے کہ نبی ﷺ ایک صالح مؤمن کی تدفین سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے پایا کہ اس پر عذاب ہورہا ہے، آپؐ نے اس کی بیوی سے پوچھا کہ اس کا کیا عمل تھا؟ اس پر قبر میں عذاب ہورہا ہے؟ بیوی نے بتایا وہ بکریاں چراتے تھے اور ان کے پیشاب سے بچتے نہیں تھے۔ آپؐ نے فرمایا: اسی وجہ سے عذاب ہورہا ہے۔ اور فرمایا: پیشاب سے بچو، اس لئے کہ قبر میں عام طور پر عذاب پیشاب سے نہ بچنے کی وجہ سے ہوگا۔ علامہ کشمیری قدس سرہ نے فرمایا: یہ حدیث ثابت نہیں، اگر یہ واقعہ صحیح سند سے ثابت ہوجائے تو بول ما یؤکل لحمہ کی طہارت وعدم طہارت کا مسئلہ طے ہوجائے (معارف السنن ۱:۲۷۶) یہاں ماکول اللحم جانوروں کے پیشاب کا مسئلہ چند ابواب کے بعد آرہا ہے۔

[۵۵-] بابٌ مِنَ الْكَبَائِرِ أَنْ لَا يَسْتَتِرَ مِنْ بَوْلِهِ

[۲۱۶-] حدثنا عُثْمَانُ، قَالَ: ثَنَا جَرِيْرٌ، عَنْ مَنْصُوْرٍ، عَنْ مُجَاهِدٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: مَرَّ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم بِحَائِطٍ مِنْ حِيْطَانِ الْمَدِيْنَةِ أَوْ: مَكَّةَ، فَسَمِعَ صَوْتَ إِنْسَانَيْنِ يُعَذَّبَانِ فِيْ قُبُوْرِهِمَا، فَقَالَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم: "يُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِيْ كَبِيْرٍ" ثُمَّ قَالَ: "بَلَى، كَانَ أَحَدُهُمَا لَا يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ، وَكَانَ الآخَرُ يَمْشِيْ بِالنَّمِيْمَةِ" ثُمَّ دَعَا بِجَرِيْدَةٍ فَكَسَرَهَا كِسْرَتَيْنِ، فَوَضَعَ عَلَى كُلِّ قَبْرٍ مِنْهُمَا كِسْرَةً، فَقِيْلَ لَهُ: يَارسولَ اللّٰهِ! لِمَ فَعَلْتَ هٰذَا؟ قَالَ "لَعَلَّهُ أَنْ يُخَفَّفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا"

[انظر: ۲۱۸، ۱۳۶۱، ۱۳۷۸، ۶۰۵۲، ۶۰۵۵]

بابُ مَاجَاءَ فِيْ غَسْلِ الْبَوْلِ

پیشاب دھونے کا بیان

یہ جنرل باب ہے۔ اور البول میں الف لام عہد ذہنی کا ہے۔ مراد انسان کا پیشاب ہے، وہ نجاست غلیظہ ہے۔ لہٰذا اگر بدن پر یا کپڑے پر لگے تو اس کا دھونا ضروری ہے۔ نبی ﷺ نے ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: "یہ قبر والا اپنے پیشاب سے نہیں بچتا تھا" یعنی پیشاب سے نہ بچنا گناہ کبیرہ ہے اس وجہ سے عذاب میں مبتلا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اور آپؐ نے انسانی پیشاب کے علاوہ کا تذکرہ نہیں کیا: یہ امام بخاریؒ نے ماکول اللحم جانوروں کے پیشاب کی طہارت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر ان کا پیشاب بھی ناپاک ہوتا تو نبی ﷺ اس کی صراحت کرتے، انسانی پیشاب کی تخصیص دلیل ہے کہ وہی ناپاک ہے ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب ناپاک نہیں۔

مگر حضرت رحمہ اللہ کی بات غور طلب ہے، اس لئے کہ یہ تخصیص بر بناء واقعہ ہے، اگر آپؐ نے ازخود مسئلہ بیان کیا ہوتا، پھر تخصیص کرتے تو امام بخاری کی بات صحیح ہوتی، مگر آپؐ نے تو مسئلہ بیان نہیں کیا، بلکہ ایک واقعہ کا اظہار فرمایا ہے، جیسے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا تھا: یارسول اللہ! میری والدہ کا انتقال ہوگیا ہے، اگر میں ان کی طرف سے خیرات کروں تو کیا میری ماں کو اس کا ثواب پہنچے گا؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں پہنچے گا۔ غیر مقلدین کہتے ہیں کہ عبادت بدنیہ کا ایصال ثواب جائز نہیں۔ اگر جائز ہوتا تو آپؐ نے اس کو بیان کیوں نہیں کیا؟ یہ دھوکا ہے۔ نبی ﷺ اگر اقداماً مسئلہ بیان کرتے اور صدقہ کی تخصیص کرتے تو استدلال درست ہوتا، مگر آپؐ نے ازخود مسئلہ بیان نہیں کیا سوال کا جواب دیا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی تخصیص بر بناء واقعہ ہے۔ ماکول اللحم کے ارواث وابوال کی طہارت وعدم طہارت کے مسائل آئندہ آرہے ہیں۔

حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ جب قضاء حاجت کے لئے تشریف لے جاتے تو میں آپؐ کے ساتھ پانی لے کر جاتا، آپ اس سے استنجاء فرماتے ——— استنجے میں سبیلین کو دھویا جاتا ہے، پس بول کا دھونا ثابت ہوا۔

تشریح: یہ حدیث پہلے بھی گذری ہے۔ اور یہاں نیزہ کا ذکر نہیں، معلوم ہوا کہ استنجے کے وقت نیزہ ساتھ نہیں لے جایا جاتا تھا وہ دو الگ الگ موقعوں کی دو الگ الگ خدمتیں تھیں، اور دونوں خدمتیں حضرت انسؓ اور دوسرے انصاری لڑکے کے ذمہ تھیں۔ پہلے حدیث میں دونوں خدمتوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا ہے۔

[۵۶/۱-] بابُ مَاجَاءَ فِي غَسْلِ الْبَوْلِ

وَقَالَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم لِصَاحِبِ الْقَبْرِ: "كَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ" وَلَمْ يَذْكُرْ سِوَى بَوْلِ النَّاسِ.

[۲۱۷-] حدثنا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ، قَالَ: أَخْبَرَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ، قَالَ: حَدَّثَنِي رَوْحُ بْنُ الْقَاسِمِ، قَالَ: حَدَّثَنِي عَطَاءُ بْنُ أَبِي مَيْمُونَةَ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: كَانَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم إِذَا تَبَرَّزَ لِحَاجَتِهِ أَتَيْتُهُ بِمَاءٍ فَيَغْسِلُ بِهِ. [راجع: ۱۵۰]

بابٌ

یہ باب کالفصل من الباب السابق ہے۔ اور ایک نسخہ میں ہے، سب نسخوں میں نہیں ہے، پس یہ حدیث بھی باب

سابق سے متعلق ہے۔

حدیث: ابن عباسؓ کہتے ہیں: نبی ﷺ دو قبروں کے پاس سے گذرے، آپؐ نے فرمایا: ان دونوں کو عذاب ہورہا ہے، اور کسی بڑے معاملہ میں عذاب نہیں ہورہا، رہا ان میں سے ایک تو وہ اپنے پیشاب سے بچتا نہیں تھا، اور رہا دوسرا تو وہ چغلی کے ساتھ چلتا تھا یعنی لگائی بجھائی کرتا تھا، پھر آپؐ نے کھجور کی ایک تر ٹہنی لی، اور اس کو بیچ سے چیرا۔ اور ہر قبر پر ایک ایک ٹہنی گاڑی، صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپؐ نے ایسا کیوں کیا؟ آپؐ نے فرمایا: شاید ان دونوں کے عذاب میں تخفیف کی جائے جب تک وہ خشک نہ ہوں۔

تشریح: اس حدیث میں بھی بول سے انسان کا پیشاب مراد ہے، اس لئے کہ اوپر حدیث میں مِن بولہ آیا ہے۔ اور اس حدیث کو مجاہدؒ سے اعمشؒ روایت کرتے ہیں، اعمش بہت بڑے آدمی ہیں، محدث بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں اور قاری بھی مگر تدلیس کرتے تھے، بعض بڑے لوگ بھی تدلیس کرتے تھے، خود امام بخاریؒ پر بھی تدلیس کا الزام ہے، اس لئے دوسری سند لائے اس میں سماعت کی صراحت ہے۔

فائدہ: اس حدیث کو مجاہد رحمہ اللہ ابن عباسؓ سے براہ راست بھی روایت کرتے ہیں اور اپنے خواجہ طاش طاؤسؒ کے واسطہ سے بھی۔ اوپر والی حدیث حضرت مجاہدؒ نے راست روایت کی ہے، اور اس میں حضرت طاؤس کا واسطہ ہے، اور اس میں مضمون بڑھا ہوا ہے، پس اس کو مزید فی متصل الاسناد کہیں گے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اوپر والی حدیث سے اس حدیث کو اصح قرار دیا ہے، مگر اس تکلف کی ضرورت نہیں، دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔

[۵٦/۲-] بابٌ

[۲۱۸-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى، قَالَ: ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ خَازِمٍ، قَالَ: ثَنَا الأَعْمَشُ، عَنْ مُجَاهِدٍ، عَنْ طَاوُسٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: مَرَّ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم بِقَبْرَيْنِ، فَقَالَ: "إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ، وَمَا يُعَذَّبَانِ فِيْ كَبِيْرٍ، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لاَ يَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ، وَأَمَّا الآخَرُ فَكَانَ يَمْشِيْ بِالنَّمِيْمَةِ" ثُمَّ أَخَذَ جَرِيْدَةً رَطْبَةً، فَشَقَّهَا نِصْفَيْنِ، فَغَرَزَ فِيْ كُلِّ قَبْرٍ وَاحِدَةً، قَالُوْا: يَارسولَ اللهِ! لِمَ فَعَلْتَ هٰذَا؟ قَالَ: "لَعَلَّهُ يُخَفَّفُ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا" قَالَ ابْنُ الْمُثَنَّى: وَحَدَّثَنَا وَكِيْعٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا الأَعْمَشُ، قَالَ: سَمِعْتُ مُجَاهِدًا مِثْلَهُ. [راجع: ۲۱٦]

بابُ تَرْكِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم وَالنَّاسِ الأَعْرَابِيَّ حَتّٰى فَرَغَ مِنْ بَوْلِهِ فِي الْمَسْجِدِ

نبی ﷺ نے اور لوگوں نے بدو کو مسجد میں پورا پیشاب کرنے دیا

حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ نے ایک بدو کو دیکھا، وہ مسجد میں پیشاب کررہا تھا، آپؐ

نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو، یہاں تک کہ وہ فارغ ہوگیا، پس آپؐ نے پانی منگوایا اور اس کے پیشاب پر ڈلوایا۔

تشریح: یہ حدیث بہت مختصر لائے ہیں، پورا واقعہ یہ ہے کہ مسجدِ نبوی میں مجلس ہورہی تھی، ایک بدو آیا اور نماز شروع کردی، اور نماز پڑھ کر یہ دعا کی: اے اللہ! مجھ پر اور محمدؐ پر رحم فرما، اور کسی پر رحم نہ فرما۔ نبی ﷺ نے اس کو ٹوکا اور فرمایا: لقد تَحَجَّرْتَ واسعًا: تو نے کشادہ چیز کو تنگ کردیا۔ پھر وہ اٹھا اور مسجد کے ایک کونے میں پیشاب کرنے لگا، صحابہ نے کہا: رُک رُک کیا کررہا ہے! آپؐ نے صحابہ کو منع کیا، جب وہ پیشاب کرچکا تو آپؐ نے اس کو بلا کر سمجھایا کہ مسجدیں اللہ کا ذکر، تسبیح وتہلیل اور نماز کے لئے ہیں، پیشاب پاخانہ کے لئے نہیں ہیں۔ پھر آپؐ نے صحابہ کو حکم دیا کہ جہاں اس نے پیشاب کیا ہے اس کو کھود کر مٹی باہر ڈال دو، اور ایک ڈول پانی لا کر اس پر ڈال دو، اور صحابہ کو نصیحت فرمائی کہ تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، سختی کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

تشریح:

۱- نبی ﷺ نے صحابہ کو کیوں روکا تھا؟ اس کی ایک وجہ علماء نے یہ بیان کی ہے کہ اگر اس کو پیشاب کرتے ہوئے بھگایا جاتا تو جگہ جگہ پیشاب گرتا، پس مسجد بھی ناپاک ہوتی، اور خود بدو کے کپڑے بھی ناپاک ہوتے، اس لئے آپؐ نے اس کو پیشاب کرنے دیا اور صحابہ کو روک دیا، اور دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے پیشاب میں بند لگنے کا خطرہ تھا، اس لئے آپؐ نے منع فرمایا، یہ وجہ حدیث میں آئی ہے، مسلم شریف، کتاب الطہارۃ (حدیث ۹۸) میں اسی حدیث میں ہے: دَعُوْهُ وَلاَ تُزْرِمُوْهُ: اس کو چھوڑ دو اور اس کو بند نہ لگا دو۔ پس پہلی توجیہ کی ضرورت نہیں۔

۲- حدیث شریف کی باب سے مناسبت واضح ہے۔ اور آپؐ نے جو پیشاب پر پانی ڈلوایا تھا وہی پیشاب کو دھونا ہے، پس جنرل باب سے بھی حدیث منطبق ہوگئی۔

۳- آپؐ نے پیشاب پر پانی کیوں ڈلوایا تھا؟ ائمہ ثلاثہ اور امام بخاری رحمہم اللہ کہتے ہیں: زمین کو پاک کرنے کے لئے ڈلوایا تھا، چنانچہ ان کے نزدیک زمین کو پاک کرنے کا طریقہ صرف دھونا ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پیشاب کی بدبو ختم کرنے کے لئے ڈلوایا تھا، آپؐ نے پہلے مٹی کھدوا کر باہر ڈلوائی تھی پھر پانی ڈلوایا تھا۔ طحاوی کے پہلے ہی باب میں اس حدیث میں اس کی صراحت ہے، جب مٹی کھود کر باہر ڈال دی تو زمین پاک ہوگئی مگر بدبو پیشاب سے آگے جاتی ہے اس لئے آپؐ نے پانی ڈلوایا تاکہ بدبو زمین میں اتر جائے۔ لہٰذا اس حدیث سے ائمہ ثلاثہ اور امام بخاری کا یہ استدلال کرنا کہ زمین کی طہارت کا طریقہ صرف اس کو دھونا ہے: صحیح نہیں۔ زمین دھونے سے بھی پاک ہوتی ہے اور خشک ہوجانے سے بھی اور ناپاکی کا اثر زائل ہوجانے سے بھی پاک ہوجاتی ہے۔ حدیث میں ہے: زکاۃ الأرض یُبْسُها: زمین کی پاکی اس کا سوکھ جانا ہے، یہ حدیث متعدد حضرات سے مروی ہے اور حسن لغیرہ ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: نصب الرایہ ۱: ۲۱۱) اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں جو ابوداؤد میں ہے یہ ہے کہ شروع میں

مسجدِ نبوی کے کواڑ نہیں تھے، اس میں کتے گھس آتے تھے، اور پیشاب کرتے تھے اور صحابہ مسجد کو دھوتے نہیں تھے، یہ حدیث صریح ہے کہ زمین خشک ہوجانے سے پاک ہوجاتی ہے۔

[۵۷-] بابُ تَرْكِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم وَالنَّاسِ الْأَعْرَابِيَّ حَتّٰى فَرَغَ مِنْ بَوْلِهِ فِي الْمَسْجِدِ

[۲۱۹-] حدثنا مُوْسَى بْنُ إِسْمَاعِيْلَ، قَالَ: ثَنَا هَمَّامٌ، قَالَ: ثَنَا إِسْحَاقُ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، أَنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم رَأَى أَعْرَابِيًّا يَبُوْلُ فِي الْمَسْجِدِ فَقَالَ: "دَعُوْهُ" حَتّٰى إِذَا فَرَغَ، دَعَا بِمَاءٍ فَصَبَّهُ عَلَيْهِ.

[انظر: ۲۲۱، ۶۰۲۵]

بابُ صَبِّ الْمَاءِ عَلَى الْبَوْلِ فِي الْمَسْجِدِ

مسجد میں پیشاب پر پانی ڈالنا

حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک دیہاتی کھڑا ہوا اور مسجد میں پیشاب کرنے لگا۔ لوگوں نے اس کو لیا یعنی ڈانٹا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: اس کو چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر پانی کا ڈول بھر کر لا کر ڈال دو (راوی کو شک ہے کہ حدیث میں سجل ہے یا ذنوب) تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، تنگی کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

تشریح: حدیث شریف کا جنرل باب اور ذیلی باب سے انطباق واضح ہے۔ اور اس حدیث میں ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ دعوت وتبلیغ کا کام کرنے والوں کو نرمی سے کام لینا چاہئے، کامیابی کا یہی گر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ: تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، سختی کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے: اس میں یہی تعلیم ہے۔

فائدہ: شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرمایا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کی ایک وجہ آپؐ کی بعثت کا دوہرا ہونا ہے، آپؐ براہ راست صحابہ کی طرف مبعوث تھے، اور صحابہ کے واسطہ سے پوری دنیا کی طرف مبعوث تھے، اس طرح صحابہ بھی آپؐ کی طرف سے مبعوث تھے۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۵۰-۵۵، تحفۃ الالمعی ۱: ۴۳۵)

[۵۸-] بابُ صَبِّ الْمَاءِ عَلَى الْبَوْلِ فِي الْمَسْجِدِ

[۲۲۰-] حدثنا أَبُو الْيَمَانِ، قَالَ: أَنَا شُعَيْبٌ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ ابْنِ مَسْعُوْدٍ: أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ: قَامَ أَعْرَابِيٌّ، فَبَالَ فِي الْمَسْجِدِ، فَتَنَاوَلَهُ النَّاسُ، فَقَالَ لَهُمُ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم: " دَعُوْهُ وَهَرِيْقُوْا عَلٰى بَوْلِهِ سَجْلًا مِنْ مَاءٍ، أَوْ: ذَنُوْبًا مِنْ مَاءٍ، فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا

مُعَسِّرِينَ" [انظر: ٦١٢٨]

[٢٢١-] حدثنا عَبْدَانُ، قَالَ: أَنَا عَبْدُ اللّٰهِ، قَالَ: أَنَا يَحْيىَ بْنُ سَعِيْدٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ، عَنِ النَّبِیِّ صلی الله علیه وسلم: ح: وَحَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ مَخْلَدٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ، عَنْ يَحْيىَ بْنِ سَعِيْدٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ قَالَ: جَاءَ أَعْرَابِیٌّ فَبَالَ فِیْ طَائِفَةِ الْمَسْجِدِ، فَزَجَرَهُ النَّاسُ، فَنَهَاهُمُ النَّبِیُّ صلی الله علیه وسلم، فَلَمَّا قَضٰى بَوْلَهُ أَمَرَ النَّبِیُّ صلی الله علیه وسلم بِذَنُوْبٍ مِنْ مَاءٍ فَأُهْرِيْقَ عَلَيْهِ.

وضاحت: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ان سے یحیٰ انصاریؒ روایت کرتے ہیں اور ان سے عبداللہ بن المبارکؒ اور سلیمانؒ روایت کرتے ہیں، پھر دونوں کی سندیں الگ الگ ہیں، اس لئے سند میں تحویل ہے۔

لغت: خالی ڈول کو دَلْو کہتے ہیں، تھوڑا پانی ہو تو سجل ہے اور بھرا ہوا ہو تو ذَنوب ہے۔

بابُ بَوْلِ الصِّبْيَانِ

بچوں کے پیشاب کا حکم

وہ لڑکا اور لڑکی جو ماں کے دودھ پر اکتفا کرتے ہیں، ابھی انھوں نے باہر کی غذا لینی شروع نہیں کی ان کا پیشاب بھی بالاجماع ناپاک ہے۔ البتہ طریقۂ تطہیر میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک لڑکی کے پیشاب کو دھونا ضروری ہے اور لڑکے کے پیشاب پر چھینٹا دینا کافی ہے۔ اور چھینٹا دینے کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں لڑکے نے پیشاب کیا ہے چلو میں پانی لے کر اس پر اتنا ٹپکایا جائے کہ پانی پیشاب کو ڈھانک لے، مگر نچوڑنا چاہیں تو نہ نچڑے، شوافع کی کتابوں میں اس کے لئے تعبیر ہے: الغَمْرُ بالماء: پانی کے ذریعہ پیشاب کو ڈبو دینا، ہاتھ بھگا کر چھینٹا دینا مراد نہیں۔

اور امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک دونوں کے پیشاب کو دھونا ضروری ہے۔ پھر امام مالکؒ فرماتے ہیں: دونوں میں غَسل بالغ ضروری ہے، اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک لڑکی کے پیشاب کو اچھی طرح دھونا ضروری ہے، اور لڑکے کے پیشاب میں غَسل خفیف (ہلکا دھونا) کافی ہے، اور ہلکا دھونا یہ ہے کہ پیشاب پر پانی ڈالا جائے۔ جب پیشاب کپڑے سے نکل جائے تو نچوڑ دیا جائے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ایسے لڑکے کے پیشاب کے بارے میں حدیثوں میں پانچ لفظ آئے ہیں: (۱) نَضْح (۲) رَشّ (دونوں کے معنی ہیں: چھینٹا دینا، چھڑکنا) (۳) صَبٌّ: ریڑھنا، (۴) اتباع الماء: پانی کو پیشاب کے پیچھے کرنا، یعنی پیشاب پر اتنا پانی ڈالنا کہ وہ دوسری طرف نکل جائے (۵) لم يَغْسِلْهُ غَسْلاً: یعنی اچھی طرح نہیں دھویا، اس میں نفی مفعول مطلق کی ہے، نفس دھونے کی نہیں۔

ان پانچ لفظوں میں سے صبٌّ، اتباع الماء اورلم یغسله غسلا کی دلالت دھونے پر قطعی ہے، باقی دولفظ محتمل ہیں، ان کے معنی چھینٹا دینے کے بھی ہو سکتے ہیں اور دھونے کے بھی، چھینٹا دینے کے معنی تو واضح ہیں اور یہ دونوں لفظ غسل کے معنی میں بھی آتے ہیں، اس کے قرائن یہ ہیں:

-حضرت اسماءرضی اللہ عنہا کی حدیث میں حیض کے خون کی تطہیر کا طریقہ یہ بیان کیا گیا ہے: تَحُتُّه ثم تَقْرُصُه بالماءِ، وَتَنْضَحُهُ، وَتُصَلِّی فیه: حیض کے خون کو کھرچ دو، پھر کپڑے کو پانی سے بھگوکر انگلیوں کے سروں سے رگڑ دو، پھر اس کو دھوڈالو، پھر اس میں نماز پڑھو۔ یہ حدیث چند ابواب کے بعد (حدیث ۲۲۷) آرہی ہے۔ یہاں نضح کے معنی دھونے کے متعین ہیں۔

۲- پہلے ابن عمرؓ کی حدیث (نمبر ۱۷۱) گذری ہے کہ مسجدِ نبوی میں رات میں کتے گھس آتے تھے، فلم یکونوا یَرُشُّوْن شیئًا من ذلك: اس کی وجہ سے صحابہ مسجد کو دھوتے نہیں تھے۔ یہاں بھی رشٌّ کے معنی بالیقین دھونے کے ہیں۔

۳-طحاوی میں روایت ہے: إنی لَأَعْرِفُ مدینةً یَنْضَحُ الْبَحْرُ بجانبها: میں ایک ایسا شہر جانتا ہوں جس کے ساحل سے سمندر ٹکراتا ہے، یہ عمان شہر ہے جو ساحل سمندر پر واقع ہے، جب سمندر میں جوار بھاٹا آتا ہے تو پانی شہر کے کنارے سے ٹکراتا ہے۔ اس حدیث میں بھی نضح کے معنی چھڑکنے کے نہیں ہوسکتے۔

اس لئے بڑے دواماموں نے مسئلے کی بنیاد اس تین لفظوں پر رکھی ہے جو محکم الدلالہ ہیں، اور جو دولفظ محتمل ہیں ان کی تاویل کی ہے کہ ان سے بھی دھونا مراد ہے، اور یہی احتیاط کی بات ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مزاج بھی احتیاط کا ہے، جب عبادات کی روایات میں تعارض ہوتا ہے تو آپ احتیاط والا پہلو لیتے ہیں اور جب معاملات کی روایات میں تعارض ہوتا ہے تو آپ انصاف والا پہلو لیتے ہیں۔

اور باقی دواماموں نے اُن دولفظوں پر مسئلے کا مدار رکھا ہے جن میں چھینٹا دینے کے معنی کا احتمال ہے۔ اور باقی تین لفظوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ روایت بالمعنی ہیں، راوی نے جس طرح سمجھا اسی طرح لفظ بدل دیا، یا یہ کہ کبھی نبی ﷺ نے دھویا بھی ہوگا، جیسے اعضاء وضو تین تین مرتبہ دھوئے جاتے ہیں مگر یہ فرض کا درجہ نہیں، اسی طرح اگر کوئی لڑکے کے پیشاب کو دھوئے تو سبحان اللہ، مگر تطہیر کے لئے دھونا ضروری نہیں۔

وجہ فرق: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دونوں پیشاب ناپاک ہیں اور ان کو دھونا ضروری ہے تو روایات میں دونوں پیشابوں کے لئے الگ الگ لفظ کیوں آئے ہیں؟ وجہ فرق کیا ہے؟ وجہ فرق یہ ہے کہ لڑکی کے مزاج میں برودت ہوتی ہے، اس لئے اس کے پیشاب میں عفونت ہوتی ہے، پس اس کے پیشاب کو مبالغہ کے ساتھ دھونا ضروری ہے، ورنہ کپڑا پاک ہونے کے بعد بھی بدبو رہ جائے گی، اور لڑکے کے مزاج میں حرارت ہوتی ہے، اس لئے اس کے پیشاب میں عفونت کم ہوتی ہے، اس لئے اس میں غسل خفیف بھی کافی ہے۔

علاوہ ازیں: لڑکے کے پیشاب کا مخرج تنگ ہوتا ہے، اس لئے پیشاب ایک جگہ گرتا ہے، اور لڑکی کا مخرج کشادہ ہوتا ہے اس لئے پیشاب کپڑے پر بکھر جاتا ہے۔ پس لڑکے کے پیشاب پر تو پانی ریڑھا جا سکتا ہے، اور لڑکی کے پیشاب میں پورا کپڑا دھونا ضروری ہوتا ہے۔

اور ایک فرق یہ بھی ہے کہ لڑکوں میں ابتلائے عام ہے، مرد اس کو اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں اور لڑکی کی یہ صورت نہیں، اس لئے شریعت نے لڑکے کے پیشاب میں تخفیف کی، اور لڑکی کے پیشاب میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی پاک ﷺ کے پاس ایک بچہ لایا گیا، اس نے آپؐ کے کپڑے پر پیشاب کر دیا، پس پانی لایا گیا پس پیچھے کیا آپؐ نے پانی کو پیشاب کے۔

تشریح: أَتْبَعَهُ إِيَّاهُ: میں دو ضمیریں ہیں، ہ ضمیر متصل اور إِيَّاهُ: ضمیر منفصل، متصل ضمیر پانی کی طرف راجع ہے اور منفصل پیشاب کی طرف، اور اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ جس جگہ بچے نے پیشاب کیا تھا اس پر پانی ریڑھا، پس دوسری طرف پیشاب نکل گیا اور اس کے پیچھے پانی نکلا، اسی کا نام غسل خفیف ہے اور یہ امام اعظم رحمہ اللہ کی صریح دلیل ہے۔

حدیث (۲): ام قیسؓ کہتی ہیں: وہ اپنا چھوٹا بچہ جو ابھی باہر کی غذا نہیں لیتا تھا لے کر نبی پاک ﷺ کے پاس آئیں، آپؐ نے اس کو اپنی گود میں بٹھالیا، اس نے آپؐ کے کپڑے پر پیشاب کر دیا۔ آپؐ نے پانی منگوایا اور اس پر چھڑک دیا، کپڑا دھویا نہیں۔

تشریح: اس حدیث سے چھوٹے دو اماموں نے استدلال کیا ہے، مگر امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ یہاں نضح: بمعنی غسل ہے، نضح کا استعمال غسل کے معنی میں عام ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، اور لم يَغْسِلْهُ: حدیث مرفوع کا جز نہیں، ابن شہابؒ کا قول ہے (عمدہ ۳: ۱۳۳) یا یہ غسل بالغ کی نفی ہے، یعنی آپؐ نے کپڑا اچھی طرح نہیں دھویا، ہلکا دھولیا۔

[۵۹-] بابُ بَوْلِ الصِّبْيَانِ

[۲۲۲-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ، أَنَّهَا قَالَتْ: أُتِيَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بِصَبِيٍّ فَبَالَ عَلٰى ثَوْبِهِ، فَدَعَا بِمَاءٍ فَأَتْبَعَهُ إِيَّاهُ.

[انظر: ۵۴۶۸، ۶۰۰۲، ۶۳۵۵]

[۲۲۳-] حدثنا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: أَنَا مَالِكٌ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ، عَنْ أُمِّ قَيْسٍ بِنْتِ مِحْصَنٍ: أَنَّهَا أَتَتْ بِابْنٍ لَهَا صَغِيْرٍ لَمْ يَأْكُلِ الطَّعَامَ، إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فَأَجْلَسَهُ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فِيْ حِجْرِهِ، فَبَالَ عَلٰى ثَوْبِهِ، فَدَعَا بِمَاءٍ فَنَضَحَهُ، وَلَمْ يَغْسِلْهُ.

[انظر: ۵۶۹۳]

بَابُ الْبَوْلِ قَائِمًا وَقَاعِدًا

کھڑے ہوکر اور بیٹھ کر پیشاب کرنا

اس باب کا حاصل یہ ہے کہ کھڑے ہوکر بھی پیشاب کر سکتے ہیں اور بیٹھ کر بھی۔ مگر باب میں جو روایت ہے اس میں صرف کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کا تذکرہ ہے، بیٹھ کر پیشاب کرنے کا تذکرہ نہیں۔ چونکہ بیٹھ کر پیشاب کرنے کا جواز بدیہی ہے اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ اس کی دلیل نہیں لائے، یا حضرت رحمہ اللہ نے یہ جزء دلالت اولیٰ کے طور پر ثابت کیا ہے، جب کھڑے ہوکر پیشاب کرنا جائز ہے تو بیٹھ کر پیشاب کرنا بدرجہ اولیٰ جائز ہے۔

جاننا چاہئے کہ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ کھڑے ہوکر پیشاب فرمایا ہے مگر یہ سنت نہیں، بلکہ بیان جواز کے لئے آپؐ نے یہ عمل کیا ہے، تاکہ مجبوری میں کھڑے ہوکر پیشاب کرنے میں کوئی تنگی محسوس نہ کرے، لہٰذا یہ صرف حدیث ہے، مسئلہ کی وضاحت کے لئے ہے، سنت نہیں۔ سنت وہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں آیا ہے کہ اگر تم سے کوئی بیان کرے کہ نبی ﷺ کھڑے ہوکر پیشاب کیا کرتے تھے تو اس کی بات نہ ماننا، نبی ﷺ بیٹھ کر ہی پیشاب کیا کرتے تھے (ترمذی حدیث ۱۱)

حدیث: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ ایک قوم کی کوڑی پر تشریف لے گئے اور کھڑے ہوکر پیشاب فرمایا، پھر پانی منگوایا، میں آپؐ کے پاس پانی لے کر آیا، پس آپؐ نے وضوء فرمایا۔

تشریح:

۱- نبی ﷺ نے جو کھڑے ہوکر پیشاب فرمایا ہے بعض نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ وہ جگہ گندی تھی، کپڑے خراب ہونے کا اندیشہ تھا، اس لئے کھڑے ہوکر پیشاب کیا تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آپؐ کے گھٹنے میں تکلیف تھی، بیٹھنا دشوار تھا اس لئے کھڑے ہوکر پیشاب کیا تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ کمر میں تکلیف تھی جس کا علاج عربوں کے نزدیک کھڑے ہوکر پیشاب کرنا تھا، مگر صحیح بات یہ ہے کہ آپؐ نے یہ عمل بیان جواز کے لئے کیا تھا، یعنی مسئلہ کی وضاحت کے لئے کیا تھا۔ اس لئے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ پانی رکھ کر جانے لگے تو آپؐ نے ان کو روک لیا تھا تاکہ آپؐ کا یہ عمل ان کے علم میں آئے اور امت تک وہ اس عمل کو پہنچائیں، اگر کسی مجبوری میں آپؐ نے ایسا کیا ہوتا تو اس سے امت کو واقف کرنا ضروری نہیں تھا۔

۲- نبی ﷺ کبھی بیان جواز کے لئے خلافِ اولیٰ کام کرتے ہیں، اور وہ نبی کے حق میں خلاف اولیٰ نہیں ہوتا، کیونکہ وہ تشریع کے لئے ہوتا ہے، مگر وہ سنت نہیں ہوتا، سنت کی تعریف ہے: الطريقة المسلوكة في الدين: یعنی دینی راہ جس پر امت کو چلنا ہے اور یہ عمل جو بیان جواز کے لئے کیا جاتا ہے وہ دینی راہ نہیں ہوتا، صرف مجبوری کا حکم ہوتا ہے۔

لطیفہ: نیویارک کی ایک مسجد میں ایک غیر مقلد حدیث کی تعلیم کررہا تھا۔ اس نے یہی کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کی روایت پڑھی، اور کہا: کھڑے ہوکر پیشاب کرنا سنت ہے، اس حدیث سے یہ بات صراحتاً ثابت ہوتی ہے۔ مجمع میں سے ایک شخص نے سوال کیا کہ یہ سنت صرف مردوں کے لئے ہے یا عورتوں کے لئے بھی؟ بس اس کی سٹی گم ہوگئی۔

۳- سنت وحدیث میں فرق دوطرح کیا جاسکتا ہے: یا تو حدیث میں صراحت ہو، جیسے آئندہ حدیث (نمبر ۱۱۸۳) آرہی ہے نبی ﷺ نے فرمایا: مغرب سے پہلے نفلیں پڑھو، یہ بات دومرتبہ فرمائی، پھر تیسری مرتبہ لِمَنْ شَاء بڑھایا، یعنی مغرب سے پہلے کوئی نفلیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے۔ راوی حدیث حضرت عبداللہ مزنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: آپؐ نے لمن شاء اس لئے بڑھایا کہ لوگ اس کو سنت نہ بنالیں: کراھیةَ أن یَتَّخِذَھا الناسُ سنةً: اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ لوگ اس نماز کو سنت بنالیں، معلوم ہوا کہ حدیث اور سنت میں کچھ فرق ہے اور ارشاد پاک: صَلُّوْا قبل صلوة المغرب: مسئلہ کی وضاحت کے لئے ہے یعنی عصر کے بعد نفلوں کی جو ممانعت ہے وہ غروب شمس تک ہے، سورج چھپتے ہی کراہیت ختم ہوجاتی ہے، اب کوئی نفلیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے مگر اس وقت میں نفلیں پڑھنا سنت نہیں۔

اور اگر روایت میں کوئی صراحت نہ ہو تو پھر صحابہ کا عمل دیکھا جائے گا۔ اگر صحابہ نے اس پر بالکل عمل نہیں کیا، یا عام طور پر عمل نہیں کیا، صرف مجبوری میں گاہ بہ گاہ عمل کیا ہے تو یہ دلیل ہے کہ وہ سنت نہیں، کسی مسئلہ کی وضاحت کے لئے وہ ارشاد یا عمل تھا، پس کھڑے ہوکر پیشاب کرنا بھی سنت نہیں۔ صحابہ نے اس حدیث پر عمل نہیں کیا۔ دو چار مثالیں ضرور ملیں گی کہ بعض صحابہ نے کسی مجبوری میں کھڑے ہوکر پیشاب کیا ہے، عام طور پر صحابہ کا اس پر عمل نہیں تھا، اگر کھڑے ہوکر پیشاب کرنا سنت ہوتا تو صحابہ ضرور اس پر عمل کرتے، صحابہ سب سے زیادہ سنت کے عاشق تھے۔

[٦٠-] بابُ الْبَوْلِ قَائِمًا وَقَاعِدًا

[٢٢٤-] حدثنا آدمُ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ أَبِیْ وَائِلٍ، عَنْ حُذَیْفَةَ، قَالَ: أَتَی النَّبِیُّ صلی الله علیه وسلم سُبَاطَةَ قَوْمٍ فَبَالَ قَائِمًا، ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ، فَجِئْتُهُ بِمَاءٍ فَتَوَضَّأَ. [انظر: ٢٢٥، ٢٢٦، ٢٤٧١]

بابُ الْبَوْلِ عِنْدَ صَاحِبِهِ، وَالتَّسَتُّرِ بِالْحَائِطِ

ساتھی کی موجودگی میں پیشاب کرنا اور دیوار وغیرہ سے پردہ کرنا

حدیث: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: دیکھا میں نے مجھ کو اور نبی ﷺ کو کہ ہم ساتھ چل رہے تھے۔ پس آپؐ ایک قوم کی کوڑی پر دیوار کے پیچھے آئے اور کھڑے ہوئے جیسا کہ تم لوگ کھڑے ہوتے ہو، پس پیشاب فرمایا، پس میں آپؐ سے دور ہونے لگا، آپؐ نے مجھے اشارہ کیا، میں آپؐ کے پیچھے (دوسری جانب منہ کرکے) کھڑا ہوگیا، یہاں تک کہ آپؐ پیشاب سے فارغ ہوگئے۔

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے قریب میں چھوٹا بڑا استنجاء کرنا جائز ہے، بشرطیکہ پردہ ہو، جیسے اب گھروں میں بیت الخلاء بنتے ہیں، اور لوگ گھر والوں کی موجودگی میں اس میں استنجاء کرتے ہیں، کیونکہ پردہ ہوتا ہے۔ اس ترجمہ کا یہی مقصد ہے۔

فائدہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں صرف خفین پر مسح کرنے کا اور کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کا ذکر ہے۔ ناصیہ پر مسح کرنے کا ذکر اس حدیث میں نہیں، حضرت مغیرہؓ کی حدیث میں ہے، ہدایہ میں دونوں حدیثیں گڈمڈ ہوگئی ہیں، اس لئے طلبہ کے ذہن میں یہ رہ جاتا ہے کہ ناصیہ پر مسح کرنے کا ذکر حضرت حذیفہؓ کی حدیث میں ہے۔

[٦١-] بابُ الْبَوْلِ عِنْدَ صَاحِبِهِ، وَالتَّسَتُّرِ بِالْحَائِطِ

[٢٢٥-] حدثنا عُثْمَانُ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ، قَالَ: ثَنَا جَرِيْرٌ، عَنْ مَنْصُوْرٍ، عَنْ أَبِي وَائِلٍ، عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ: رَأَيْتُنِي أَنَا وَالنَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم نَتَمَاشَى، فَأَتَى سُبَاطَةَ قَوْمٍ خَلْفَ حَائِطٍ، فَقَامَ كَمَا يَقُوْمُ أَحَدُكُمْ فَبَالَ، فَانْتَبَذْتُ مِنْهُ، فَأَشَارَ إِلَيَّ فَجِئْتُهُ فَقُمْتُ عِنْدَ عَقِبِهِ حَتَّى فَرَغَ. [راجع: ٢٢٤]

وضاحت: رَأَيْتُنِي میں دو ضمیریں ہیں، تُ: ضمیر مرفوع متصل ہے اور ی: منصوب متصل، اور أنا ضمیر فصل ہے، اور النبیَّ کا ضمیر منصوب پر عطف ہے، اس لئے أنا ضمیر فصل لائے ہیں۔

بابُ الْبَوْلِ عِنْدَ سُبَاطَةِ قَوْمٍ

کسی قوم کی کوڑی پر پیشاب کرنا

حدیث: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ پیشاب کے معاملہ میں بہت سخت تھے، خود بھی احتیاط برتتے تھے، قارورہ میں پیشاب کرتے تھے، اور دوسروں کو بھی احتیاط کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک آدمی کو دیکھا جو کھڑے ہوکر پیشاب کر رہا تھا، آپؓ نے فرمایا: ویحك! أفلا قاعداً: تیرا ناس ہو، بیٹھ کر پیشاب کیوں نہیں کرتا؟ پھر حضرت نے بنی اسرائیل کا تذکرہ کیا کہ ان کے لئے یہ حکم تھا کہ اگر کپڑے پر پیشاب لگ جائے تو جہاں پیشاب لگا ہے اس جگہ کو کاٹ دینا ضروری تھا، کپڑا پاک کرنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ جب اس واقعہ کی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی تو آپؓ نے فرمایا: کاش وہ رک جاتے! یعنی سختی نہ کرتے، اس لئے کہ نبی ﷺ نے کھڑے ہوکر پیشاب فرمایا ہے اور میں اس کا گواہ ہوں، آپؐ ایک قوم کی کوڑی پر تشریف لے گئے اور کھڑے ہوکر پیشاب فرمایا، معلوم ہوا کہ مجبوری میں کھڑے ہوکر احتیاط کے ساتھ پیشاب کرنا جائز ہے۔

تشریح: مسلم شریف میں اسی روایت میں جلد أحدهم ہے اور جلد سے مراد انسان کا بدن نہیں بلکہ وہ چمڑا مراد

ہے جس کا لباس بنا کر پہنا جاتا تھا، پرانے زمانہ میں چمڑا عام لباس تھا۔ اب بھی لباس میں چمڑا استعمال ہوتا ہے، مگر اب ہائی کلاس لباس میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر اس پر پیشاب لگ جائے تو اس چمڑے کو کاٹنے کا حکم تھا۔ اور ابوداؤد شریف میں جَسَدَ أَحَدِهم ہے، یہ روایت بالمعنی ہے، اس کی تاویل ممکن نہیں، راوی نے جیسا سمجھا روایت کر دیا۔ اس لئے کہ بدن کو کاٹنے کا حکم تکلیف مالایُطاق ہے۔

اس حدیث کی شرح میں حافظ رحمہ اللہ نے فتح الباری میں فرمایا ہے: الأَظْهَرُ أَنَّهُ فَعَل ذلك لِبيَانِ الجواز: دلیل کے اعتبار سے قوی یہ ہے کہ نبی ﷺ نے جو کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا تھا وہ بیان جواز کے لئے تھا۔ لہٰذا علماء نے جو توجیہیں کی ہیں ان کی ضرورت نہیں۔

[٦٢-] بابُ الْبَوْلِ عِنْدَ سُبَاطَةِ قَوْمٍ

[٢٢٦-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ عَرْعَرَةَ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ مَنْصُوْرٍ، عَنْ أَبِيْ وَائِلٍ قَالَ: كَانَ أَبُوْ مُوْسَى الْأَشْعَرِيُّ يُشَدِّدُ فِي الْبَوْلِ، وَيَقُوْلُ: إِنَّ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ كَانَ إِذَا أَصَابَ ثَوْبَ أَحَدِهِمْ قَرَضَهُ، فَقَالَ حُذَيْفَةُ: لَيْتَهُ أَمْسَكَ، أَتَى رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم سُبَاطَةَ قَوْمٍ فَبَالَ قَائِمًا. [راجع: ٢٢٤]

بابُ غَسْلِ الدَّمِ

خون دھونے کا بیان

بہنے والا خون ناپاک ہے اور نجاست غلیظہ ہے۔ اگر بدن پر یا کپڑے پر لگ جائے تو اس کا دھونا ضروری ہے۔ اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ اور ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ﴾: میں دم مسفوح مراد ہے اور الف لام عہد ذہنی کا ہے، دم مسفوح وہ خون ہے جو رگوں میں دوڑتا ہے، یہ تھرڈ کلاس خون ہوتا ہے، اور اعلیٰ خون سے مادّہ اور گوشت بنتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے تفسیر عزیزی میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس سے دم مسفوح مراد ہے جو حرام ہے، اور وہ خون جو گوشت کے ساتھ متصل ہوتا ہے وہ دم غیر مسفوح ہے اور وہ حلال و پاک ہے، مگر اس کو کھانا نہیں چاہئے، گوشت کو دھو کر کھانا چاہئے، اس لئے کہ نبی ﷺ نے جانور کے سات اعضاء کو مکروہ قرار دیا ہے، ان میں سے ایک یہی دم غیر مسفوح ہے، اور اس باب میں دم مسفوح کا ذکر ہے، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، ائمہ متفق ہیں کہ دم مسفوح ناپاک ہے اور نجاست غلیظہ ہے۔

حدیث: حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ایک عورت نبی ﷺ کے پاس آئی (یہ خود حضرت اسماء تھیں، راوی کبھی خود کو غائب کر دیتا ہے) اور اس نے عرض کیا: آپؐ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں جب ہم میں سے کوئی اپنے کپڑے میں حیض دیکھے تو کیا کرے؟ یعنی حیض کا خون کپڑے پر لگ جائے تو کس طرح پاک کرے؟ آپؐ نے فرمایا: پہلے خون کو

کھرچ ڈالو، پھر کپڑے کو پانی میں بھگو کر انگلیوں کے درمیان رگڑو، پھر اس کو دھوڈالو، پھر اس میں نماز پڑھو۔

تشریح: اب اللہ کے فضل سے عورتوں کے پاس کپڑوں کی فراوانی ہے، وہ حیض کے زمانہ کے کپڑے الگ رکھتی ہیں، دورِاول میں یہ فراوانی نہیں تھی۔ عام دنوں میں جو کپڑے عورتیں پہنتی تھیں ایام حیض میں بھی انہی کو پہنتی تھیں اور کچھ زائد کپڑے کرسف وغیرہ بھی استعمال کرتی تھیں۔ مگر کبھی خون زیادہ آجاتا تھا اور کپڑے پر لگ جاتا تھا، اس کو دھونا ضروری ہے۔ اور حیض کا خون خوب رگڑ کر دھونا چاہئے تا کہ اس کا اثر یعنی رنگ اور بو زائل ہوجائے، پھر اس میں نماز پڑھ سکتی ہے خواہ کپڑا خشک نہ ہوا ہو۔

اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ دم مسفوح ناپاک ہے وہ کپڑے پر لگ جائے تو اس کا دھونا ضروری ہے، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، اور اس حدیث میں نضح: غسل کے معنی میں ہے، چھینٹا دینے کے معنی یہاں نہیں ہوسکتے۔

حدیث (۲): حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: فاطمہ بنت ابی حُبیش ؓ نبی ﷺ کے پاس آئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں ایک ایسی عورت ہوں جس کو برابر حیض آتا ہے، میں پاک ہی نہیں ہوتی تو کیا میں نماز چھوڑے رہوں؟ آپ ؐ نے فرمایا: نہیں، یہ رگ کا خون ہے، حیض کا خون نہیں، لہٰذا جب حیض آئے تو نماز چھوڑ دے، اور جب حیض کے ایام گذر جائیں تو خون دھوڈال، (اس میں مجاز بالحذف ہے أي أَثَرَ الدم، خون کا اثر یعنی جنابت دھوڈال یعنی غسل کرلے) پھر نماز شروع کردے۔ ہشام کہتے ہیں کہ میرے ابا نے کہا: پھر تو ہر نماز کے لئے وضو کر یہاں تک کہ وہ وقت (یعنی حیض کا زمانہ) آجائے۔

تشریح:

حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش ؓ کو استحاضہ کی بیماری تھی، وہ اپنے آپ کو حائضہ سمجھتی تھیں اور نماز نہیں پڑھتی تھیں، جب زیادہ دن ہوگئے اور خون نہیں رکا تو وہ پریشان ہوئیں، مؤمن کا قلب ایک کسوٹی ہے، وہ صحیح بات ہی کو قبول کرتا ہے ورنہ اس کا دل بے چین رہتا ہے۔ چنانچہ وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور سارا ماجرا بیان کیا، آپ ؐ نے فرمایا: یہ حیض کا خون نہیں ہے، بلکہ بیماری کا خون ہے، رحم کے منہ پر ایک رگ ہے جس کا نام عاذل ہے کسی وجہ سے وہ کھل جاتی ہے تو خون بہنے لگتا ہے، یہ بیماری ہے اور حیض کا خون قعرِ رحم سے آتا ہے، وہ تندرستی کی علامت ہے اور دونوں کے احکام الگ الگ ہیں، لہٰذا مستحاضہ ایام حیض میں نماز روزے ترک کردے، پھر جب حیض کے ایام گذر جائیں تو نہا کر نماز شروع کردے اور ہر فرض نماز کے وقت کے لئے نیا وضو کرے۔

حضرت فاطمہ ؓ معتادہ تھیں۔ معتادہ وہ مستحاضہ ہے جس کی بیماری لاحق ہونے سے پہلے عادت متعین تھی، وہ عادت کے ایام میں حائضہ ہوگی اور باقی ایام میں پاک ہوگی، مثلاً ایک عورت کو ہر مہینہ کی پانچ تاریخ کو حیض آتا تھا اور سات دن رہتا تھا پھر اس کو استحاضہ کی بیماری لاحق ہوگئی تو وہ ہر مہینہ کی پانچ تا بارہ تاریخ میں نماز چھوڑ دے گی۔ باقی ایام میں وہ پاک

عورت کی طرح ہوگی، مزید تفصیل کتاب الحیض میں آئے گی۔

قوله: تم تَوَضَّئِ لکل صلوۃ: یہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے یا حضرت عروہ کا؟ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرج ہے۔ حضرت عروہ کا قول ہے، مگر صحیح بات یہ ہے کہ یہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے۔ چنانچہ ہشام کے متعدد تلامذہ مثلاً: امام ابوحنیفہ، حماد بن سلمہ، اور ابوعوانہ، ابن سلیم اور ابوحمزہ اس کو حدیث مرفوع کے طور پر روایت کرتے ہیں اور یہ سب ائمہ حدیث ہیں (زبدۃ شرح معانی الآثار ص:۸۲)

چنانچہ ائمہ اربعہ اسی کے قائل ہیں کہ مستحاضہ ہر نماز کے لئے یا ہر نماز کے وقت کے لئے وضو کرے گی۔ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک ہر فرض نماز کے وقت کے لئے وضو کرے گی اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ہر فرض نماز کے لئے وضو کرے گی۔ اور ثمرۂ اختلاف اس طرح ظاہر ہوگا کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اس وضو سے صرف فرض نماز اور اس کے تابع جو سنن ونوافل ہیں وہ پڑھ سکتی ہے، قضاء نماز کے لئے نیا وضو ضروری ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک وقت کے اندر مستحاضہ: فرض قضاء واجب سنن اور نوافل سب پڑھ سکتی ہے اور قرآن کی تلاوت بھی کرسکتی ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا استدلال اسی حدیث سے ہے اور امام اعظمؒ لام وقتیہ مانتے ہیں، اور قرینہ وہ حدیث ہے جس میں عند کل صلوۃ یالوقت کل صلوۃ آیا ہے (فاطمہ بنت ابی حبیش کی حدیث کے ایک طریق میں لوقت کل صلوۃ آیا ہے، دیکھیں: کتاب الآثار ا:۱۹۱باب غسل المستحاضة والحائض)

قوله: فَاغْسِلی عنكِ الدَّمَ: اس جملہ کا بظاہر مفہوم یہ ہے کہ کپڑے پر یا بدن پر جو خون لگا ہے اس کو دھو ڈالے۔ امام بخاریؒ نے اسی مفہوم کے اعتبار سے باب قائم کیا ہے اور حقیقی مفہوم یہ ہے کہ غسل جنابت کرے اور نماز شروع کردے۔

[٦٣-] بابُ غَسْلِ الدَّمِ

[٢٢٧-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰى، قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيىٰ، عَنْ هِشَامٍ، قَالَ: حَدَّثَتْنِىْ فَاطِمَةُ، عَنْ أَسْمَاءَ، قَالَتْ: جَاءَ تِ امْرَأَةٌ إِلَى النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم، فَقَالَتْ: أَرَأَيْتَ إِحْدَانَا تَحِيْضُ فِي الثَّوْبِ: كَيْفَ تَصْنَعُ؟ قَالَ: "تَحُتُّهُ، ثُمَّ تَقْرُصُهُ بِالْمَاءِ، وَتَنْضَحُهُ بِالْمَاءِ، وَتُصَلِّيْ فِيْهِ". [انظر:٣٠٧]

[٢٢٨-] حدثنا مُحَمَّدٌ، قَالَ: أنا أَبُوْ مُعَاوِيَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: جَاءَ تْ فَاطِمَةُ بِنْتُ أَبِيْ حُبَيْشٍ إِلَى النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم، فَقَالَتْ: يَارسولَ اللّٰهِ! إِنِّي امْرَأَةٌ أُسْتَحَاضُ فَلاَ أَطْهُرُ، أَفَأَدَعُ الصَّلاَةَ؟ فَقَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: " لاَ، إِنَّمَا ذٰلِكِ عِرْقٌ، وَلَيْسَ بِحَيْضٍ، فَإِذَا أَقْبَلَتْ حَيْضَتُكِ فَدَعِيْ الصَّلاَةَ، وَإِذَا أَدْبَرَتْ فَاغْسِلِيْ عَنْكِ الدَّمِ، ثُمَّ صَلِّيْ" قَالَ: وَقَالَ أَبِيْ: " ثُمَّ تَوَضَّئِيْ لِكُلِّ صلاَةٍ حَتّٰى يَجِيْءَ ذٰلِكَ الْوَقْتُ"

بابُ غَسْلِ الْمَنِيِّ وَفَرْكِهِ، وَغَسْلِ مَا يُصِيبُ مِنَ الْمَرْأَةِ

منی کو دھونا اور کھرچنا، اور بیوی سے جو رطوبت پہنچے اس کو دھونا

اس باب میں مسئلہ یہ ہے کہ منی ناپاک ہے اور اس کی دلیل غَسل اور فرک والی روایات ہیں۔ اور دوسری عقلی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کے عضو پر جو مہبل کی تری لگتی ہے اس کو دھونے کا حکم دیا ہے، اور وہ تری یا تو مذی کی ہوگی یا منی کی، پس معلوم ہوا کہ منی ناپاک ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک منی ناپاک ہے اور امام اعظم رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ اور دوسرے دو اماموں کے نزدیک منی پاک ہے۔ امام بخاریؒ نے غَسل اور فرک والی روایات سے استدلال کیا ہے، اس طرح کہ کسی بھی روایت میں یہ بات مروی نہیں کہ آپؐ کے کپڑوں پر منی تھی اور آپؐ نے نماز پڑھی۔ اگر منی پاک ہوتی تو بیانِ جواز کے لئے زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ آپؐ منی کے ساتھ نماز پڑھتے تاکہ امت کے سامنے حقیقت کھل کر آجاتی، مگر پوری حیاتِ طیبہ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں، ہمیشہ آپؐ کے کپڑوں پر سے منی یا تو دھوئی جاتی تھی یا کھرچی جاتی تھی، چنانچہ امام اعظم رحمہ اللہ نے دونوں روایتوں کو لیا ان کے نزدیک منی پاک کرنے کا طریقہ غَسل اور فرک دونوں ہیں، یعنی اگر منی تر ہے تو دھونا ضروری ہے اور کپڑے پر خشک ہو جائے تو کھرچنا کافی ہے۔

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ پہلے منی گاڑھی ہوتی تھی، اس لئے کھرچنا کافی تھا۔ اب قُویٰ کمزور ہو گئے ہیں اس لئے اب کھرچنا کافی نہیں، یہ بات صحیح نہیں، مسئلہ اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا خشک منی کھرچ دینے سے کپڑا پاک ہو جاتا ہے۔

اور امام مالک رحمہ اللہ فرک کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک منی کو دھونا ضروری ہے۔ اور امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمہ میں لفظ فوك رکھا ہے مگر اس تعلق سے کوئی روایت نہیں لائے، ہوسکتا ہے امام بخاریؒ بھی امام مالکؒ کی طرح فرک کی روایتوں کو نہ لیتے ہوں۔ مگر ان دونوں لفظوں کے بغیر استدلال تام نہیں ہوتا، اس لئے ترجمہ میں دونوں لفظ رکھے ہیں۔

دوسری عقلی دلیل: منی اگر فی نفسہ پاک بھی ہو تو لغیرہ ناپاک ہوگی، کیونکہ منی سے پہلے مذی نکلتی ہے اور مذی ناپاک ہے، پس جب مذی کے ساتھ منی ملے گی تو وہ پاک کیسے رہے گی؟ اور مذی عضو کی نالی میں پھیلی رہتی ہے تاکہ گاڑھی منی کا تنگ سوراخ سے نکلنا ممکن ہو، جیسے کٹورے میں پیشاب ہے، اس میں بلغم تھوکا تو وہ ناپاک ہو گیا، کیونکہ اس کے ساتھ پیشاب لگ گیا، اسی طرح جب منی کے ساتھ مذی لگ گئی تو وہ پاک کہاں رہی؟

اور مذی ناپاک ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ دورِ اول میں اِکسال کی صورت میں غسل واجب نہیں تھا، مگر اس وقت بھی یہ حکم تھا کہ مرد کے عضو پر عورت کے عضو سے جو تری لگے اس کو دھونا ضروری ہے۔ ظاہر ہے وہ تری مذی کی تھی، منی تو نکلی نہیں، اور اس کو دھونے کا حکم اس لئے تھا کہ مذی ناپاک ہے، وہ ناپاک مذی جب منی کے ساتھ لگ گئی تو منی لغیرہ ناپاک ہو گئی۔

حدیث(۱): حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نبی ﷺ کے کپڑوں پر سے منی کو دھویا کرتی تھی۔ پس آپؐ نماز کے لئے تشریف لے جاتے درانحالیکہ دھونے کا نشان (دھبہ) آپؐ کے کپڑے میں صاف چمکتا تھا۔

تشریح: یہ حدیث دلیل ہے کہ منی ناپاک ہے۔ اگر منی پاک ہوتی تو اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی؟ نظافت کے لئے تو نماز کے بعد بھی دھوئی جا سکتی تھی۔ اور ابوداؤد میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ انھوں نے اپنی بہن ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: نبی ﷺ جن کپڑوں میں مجامعت فرماتے تھے ان میں نماز پڑھتے تھے؟ ام حبیبہؓ نے کہا: نعم، إذا لم یرَ فیه أذًی: ہاں پڑھتے تھے جب ان میں گندگی نہ دیکھتے (ابوداؤد ۱:۵۳) ظاہر ہے أذی سے منی کی گندگی ہی مراد ہے اگرچہ مذی کا بھی احتمال ہے، مگر ظاہر احتمال پہلا ہی ہے، یہ حدیث بھی منی کی نجاست پر صریح دلیل ہے۔

حدیث(۲): سُلیمان کہتے ہیں: میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منی کے بارے میں پوچھا کہ وہ کپڑے پر لگ جائے تو کیا حکم ہے؟ انھوں نے فرمایا: میں نبی ﷺ کے کپڑے پر سے منی کو دھوتی تھی، پس آپؐ نماز کے لئے تشریف لے جاتے اس حال میں کہ دھونے کا دھبہ آپؐ کے کپڑے میں ہوتا تھا۔

[٦٤-] بابُ غَسْلِ الْمَنِيِّ وَفَرْكِهِ، وَغَسْلِ مَا يُصِيبُ مِنَ الْمَرْأَةِ

[۲۲۹-] حدثنا عَبْدَانُ، قَالَ: أَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ الْمُبَارَكِ، قَالَ: أَنَا عَمْرُو بْنُ مَيْمُوْنٍ الْجَزَرِيُّ، عَنْ سُلَيْمَانَ ابْنِ يَسَارٍ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: كُنْتُ أَغْسِلُ الْجَنَابَةَ مِنْ ثَوْبِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم، فَيَخْرُجُ إِلَى الصَّلاَةِ، وَإِنَّ بُقَعَ الْمَاءِ فِيْ ثَوْبِهِ. [انظر: ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲]

[۲۳۰-] حدثنا قُتَيْبَةُ، قَالَ: ثَنَا يَزِيْدُ، قَالَ: ثَنَا عَمْرٌو، عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ، قَالَ: سَمِعْتُ عَائِشَةَ ح: وَثَنَا مُسَدَّدٌ، قَالَ: ثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ، قَالَ: ثَنَا عَمْرُو بْنُ مَيْمُوْنٍ، عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ، قَالَ: سَأَلْتُ عَائِشَةَ عَنِ الْمَنِيِّ يُصِيْبُ الثَّوْبَ؟ فَقَالَتْ: كُنْتُ أَغْسِلُ مِنْ ثَوْبِ رسولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم، فَيَخْرُجُ إِلَى الصَّلاَةِ وَأَثَرُ الْغَسْلِ فِيْ ثَوْبِهِ: بُقَعُ الْمَاءِ. [راجع: ۲۲۹]

بابٌ: إِذَا غَسَلَ الْجَنَابَةَ أَوْ غَيْرَهَا فَلَمْ يَذْهَبْ أَثَرُهُ

منی یا کوئی نجاست دھوئی مگر اس کا اثر زائل نہ ہوا

جب ناپاک کپڑا تین مرتبہ دھو کر نچوڑ لیا اور ناپاکی کپڑے میں سے نکل گئی تو کپڑا پاک ہوگیا، اگرچہ دھبہ کپڑے میں باقی رہ جائے، اب تو صابن وغیرہ کے ذریعہ کیسا بھی دھبہ ہو مٹادیا جاتا ہے، پرانے زمانہ میں یہ چیزیں نہیں تھیں،

بعض مرتبہ کپڑے میں دھبہ باقی رہ جاتا تھا، اس کو نکالنا مشکل ہوتا تھا، پس جب کپڑا اچھی طرح دھولیا تو وہ پاک ہوگیا خواہ دھبہ باقی رہ جائے، یہی باب کا مقصد ہے۔

حدیث (۱): حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نبی ﷺ کے کپڑے پر سے منی کو دھوتی تھی، پھر آپ نماز کے لئے تشریف لے جاتے تھے درانحالیکہ دھونے کا اثر کپڑے میں واضح طور پر معلوم ہوتا تھا، اور وہ اثر پانی کا دھبہ ہوتا تھا۔

تشریح: أثر الغسل: مبتداء ہے اور فيه خبر ہے۔ اور بُقَعُ الماء: الگ جملہ ہے، یہ هو مبتدا محذوف کی خبر ہے، اور مرجع أثر الغسل ہے۔ اس حدیث سے استدلال تام نہیں، اس لئے کہ نبی ﷺ کے کپڑے میں جو دھبہ نظر آتا تھا وہ ناپاکی کا اثر نہیں تھا بلکہ دھونے کا اثر تھا کیونکہ منی دھونے سے آسانی سے نکل جاتی ہے اس کا اثر باقی نہیں رہتا۔ البتہ دھونے کا یعنی بھیگنے کا نشان نظر آتا ہے، مگر باب میں یہ مراد نہیں۔

حدیث (۲): حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ نبی ﷺ کے کپڑے سے منی دھویا کرتی تھیں، پھر وہ اس کو کپڑے میں ایک دھبہ یا متعدد دھبوں کی شکل میں دیکھتی تھیں۔

تشریح: أری: ہمزہ کے زبر کے ساتھ: آنکھوں سے دیکھنا، اور ہمزہ کے پیش کے ساتھ: گمان کرنا۔ یہاں زبر کے ساتھ ہے، اور بُقعة کے معنی ہیں: ایک دھبہ، اور بُقَعًا کے معنی ہیں: متعدد دھبے، ایک جگہ منی لگی ہوتی تو ایک جگہ دھونے کا دھبہ ہوتا اور متعدد جگہ منی لگی ہوتی تو متعدد جگہ دھبے ہوتے۔

[۶۵-] بابٌ: إذا غَسَلَ الْجنابةَ أَوْ غَيْرَهَا فَلَمْ يَذْهَبْ أَثَرُهُ

[۲۳۱-] حدثنا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ، قَالَ: ثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ، قَالَ: ثَنَا عَمْرُو بْنُ مَيْمُوْنٍ، قَالَ: سَمِعْتُ سُلَيْمَانَ بْنَ يَسَارٍ فِيْ الثَّوْبِ تُصِيْبُهُ الْجَنَابَةُ، قَالَ: قَالَتْ عَائِشَةُ: كُنْتُ أَغْسِلُهُ مِنْ ثَوْبِ رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، ثُمَّ يَخْرُجُ إِلَى الصَّلاَةِ، وَأَثَرُ الْغَسْلِ فِيْهِ: بُقَعُ الْمَاءِ. [راجع: ۲۲۹]

[۲۳۲-] حدثنا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ، قَالَ: ثَنَا زُهَيْرٌ، قَالَ: ثَنَا عَمْرُو بْنُ مَيْمُوْنِ بْنِ مِهْرَانَ، عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ، عَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا كَانَتْ تَغْسِلُ الْمَنِيَّ مِنْ ثَوْبِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم ثُمَّ أَرَاهُ فِيْهِ بُقْعَةً أَوْ: بُقَعًا. [راجع: ۲۲۹]

بابُ أَبْوَالِ الإِبِلِ وَالدَّوَابِّ وَالْغَنَمِ وَمَرَابِضِهَا

اونٹوں، چوپایوں اور بکریوں کے پیشاب کا اور ان کے باڑوں کا حکم

تمام وہ جانور جن کا گوشت کھایا جاتا ہے خواہ وہ پالتو ہوں یا جنگلی ان کے فضلات ــــ پیشاب، لید، گوبر اور مینگنی وغیرہ ــــ حضرات مالک، احمد، محمد اور بخاری رحمہم اللہ کے نزدیک پاک ہیں۔ اور حضرات ابوحنیفہ، شافعی اور ابو یوسف

رحمہم اللہ کے نزدیک ناپاک ہیں۔ اور اصحاب ظواہر کے نزدیک انسان، خنزیر اور کتے کے علاوہ تمام جانوروں کے فضلات پاک ہیں خواہ وہ ماکول اللحم ہوں یا غیر ماکول اللحم۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمہ میں اونٹ اور بکری کی صراحت اس لئے کی ہے کہ ان کے بارے میں نص موجود ہے۔ اور دیگر ماکول اللحم جانوروں کو دواب میں لیا ہے۔

فائدہ: ماکول اللحم جانوروں کے فضلات کے بارے میں احناف کے یہاں دو قول ہیں: نجاست غلیظہ کا اور نجاست خفیفہ کا۔ اور دوسرا قول راجح ہے، اس لئے کہ اس کے بارے میں ائمہ میں اختلاف ہے۔ اور جب کسی مسئلہ میں ائمہ میں اختلاف ہوتا ہے تو حکم ہلکا پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح جب کسی حدیث مرفوع سے کسی صحابی کا قول وفعل معارض ہوجاتا ہے تو بھی حکم ہلکا پڑتا ہے، جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں کچھ لوگوں کو آگ میں زندہ جلایا، وہ لوگ آپؓ کی الوہیت کے قائل تھے، آپؓ نے ان کو سمجھایا مگر نہیں مانے تو آپؓ نے ان کو جلانے کی سزا دی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو جب اس کی خبر ہوئی تو فرمایا: اگر میں ہوتا تو قتل کرتا، جلاتا نہیں، اس لئے کہ نبی ﷺ نے جلانے سے منع فرمایا ہے۔ پھر جب حضرت علیؓ کو ابن عباسؓ کی یہ بات پہنچی تو فرمایا: صدق ابنُ عباس: ابن عباس کی بات صحیح ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ اس حکم شرعی سے واقف تھے، پس ممانعت کی حدیث کو خلافِ اولیٰ پر محمول کریں گے، اس کو حرام قرار نہیں دیں گے اس لئے کہ صحابی کا عمل اس کے معارض ہے، اسی طرح ماکول اللحم جانوروں کے فضلات میں ائمہ میں اختلاف ہوا ہے اس لئے حکم ہلکا پڑ جائے گا اور نجاست خفیفہ قرار دیا جائے گا۔

اثر: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جو کوفہ وغیرہ کے گورنر رہے ہیں انھوں نے کوفہ کی ڈاک چوکی میں نماز پڑھی، پرانے زمانہ میں ڈاک چوکی میں گھوڑے تیار رہتے تھے، ڈاک گھوڑوں پر چلتی تھی، ڈاک چوکی سے ڈاک لے کر ایک آدمی گھوڑے پر چلتا تھا، دس پندرہ میل کے بعد دوسری چوکی آتی تھی وہاں دوسرا شخص گھوڑے پر تیار رہتا تھا، وہ ڈاک لے کر چل دیتا تھا۔ اس طرح مہینوں کی مسافت دنوں میں طے ہوجاتی تھی اور جہاں گھوڑے بندھتے ہیں وہاں لید اور پیشاب پڑا رہتا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے وہاں نماز پڑھی، جبکہ ڈاک چوکی سے لگواں پاک صاف میدان موجود تھا، پھر نماز سے فارغ ہوکر فرمایا: یہاں اور وہاں سب برابر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ گھوڑوں کی لید اور پیشاب پاک ہے، اور گھوڑا ماکول اللحم جانور ہے، پس یہی حکم تمام ماکول اللحم جانوروں کا ہے۔

جواب: یہ استدلال اس وقت صحیح ہے جب ثابت ہو کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے کپڑا بچھائے بغیر نماز پڑھی تھی اس احتمال کے ساتھ استدلال تام نہیں۔

[٦٦-] بابُ أَبْوَالِ الإِبِلِ وَالدَّوَابِّ وَالْغَنَمِ وَمَرَابِضِهَا

وَصَلَّى أَبُوْ مُوْسَى فِيْ دَارِ الْبَرِيْدِ وَالسِّرْقِيْنِ وَالْبَرِّيَّةُ إِلَى جَنْبِهِ، فَقَالَ: هَاهُنَا وَثَمَّ سَوَاءٌ.

لغت:مَرَابِض: مَرْبَض کی جمع ہے،اس کے معنی ہیں: بیٹھنا۔اور یہ لفظ بکریوں کے بیٹھنے کے لئے خاص ہے،پس مَربض کے معنی ہیں: بکریوں کا باڑا، وہاں ہرطرف مینگنیاں اور پیشاب پڑا ہوا ہوتا ہے،وہاں نماز پڑھ سکتے ہیں؟ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا اثر دلالت کرتا ہے کہ پڑھ سکتے ہیں، کیونکہ بکریاں بھی ماکول اللحم ہیں، پس ان کے فضلات بھی پاک ہیں ـــــ مگر ابوموسیٰ کے اثر سے استدلال تام نہیں، اس لئے یہ مسئلہ بھی طے نہیں ـــــ دار البرید: ڈاک چوکی........السِّرقین: گوبر، یہ لفظ گائے بھینس کے فضلہ کے لئے استعمال ہوتا ہے، یہاں گھوڑے کی لید مراد ہے، اس کو مرفوع بھی پڑھ سکتے ہیں اور مجرور بھی۔ مجرور پڑھیں گے تو دار البرید پر عطف ہوگا اور مستدل بنے گا، مگر کپڑا بچھا کر نماز پڑھی ہو یہ احتمال باقی رہے گا، اس لئے استدلال تام نہ ہوگا۔ اور اگر مرفوع پڑھیں گے تو مابعد سے تعلق ہوگا، اور مطلب ہوگا: جہاں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے نماز پڑھی تھی اس کے برابر میں لید پڑی تھی، اور صاف میدان بھی موجود تھا، یعنی جہاں نماز پڑھی تھی وہاں لید نہیں تھی، وہ جگہ صاف تھی، البتہ اس کے برابر میں لید تھی، پس استدلال ختم ہوگیا........البَرِّیَّة کے معنی ہیں: صاف میدان۔

[۲۳۳-] حدثنا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ، عَنْ حَمَّادِ بْنِ زَيْدٍ، عَنْ أَيُّوْبَ، عَنْ أَبِيْ قِلَابَةَ، عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: قَدِمَ أُنَاسٌ مِنْ عُكْلٍ أَوْ عُرَيْنَةَ، فَاجْتَوَوُا الْمَدِيْنَةَ، فَأَمَرَهُمُ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم بِلِقَاحٍ، وَأَنْ يَشْرَبُوْا مِنْ أَبْوَالِهَا وَأَلْبَانِهَا، فَانْطَلَقُوْا فَلَمَّا صَحُّوْا قَتَلُوْا رَاعِيَ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم، وَاسْتَاقُوْا النَّعَمَ فَجَاءَ الْخَبَرُ فِيْ أَوَّلِ النَّهَارِ، فَبَعَثَ فِيْ آثَارِ هِمْ، فَلَمَّا ارْتَفَعَ النَّهَارُ جِيْءَ بِهِمْ، فَأَمَرَ فَقُطِعَ أَيْدِيْهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ، وَسُمِّرَتْ أَعْيُنُهُمْ، وَأُلْقُوْا فِي الْحَرَّةِ، يَسْتَسْقُوْنَ فَلَا يُسْقَوْنَ، قَالَ أَبُوْ قِلَابَةَ: فَهٰؤُلَاءِ سَرَقُوْا وَقَتَلُوْا وَكَفَرُوْا بَعْدَ إِيْمَانِهِمْ، وَحَارَبُوْا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ.[انظر: ۱۵۰۱، ۳۰۱۸، ۴۱۹۲، ۴۱۹۳، ۴٦۱۰، ۵٦۸۵، ۵٦۸٦، ۵۷۲۷، ٦۸۰۲، ٦۸۰۳، ٦۸۰۴، ٦۸۰۵، ٦۸۹۹]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: قبیلۂ عُکل یا عُرینہ کے کچھ لوگ مدینہ منورہ آئے، پس ان کو مدینہ میں جوی بیماری لگ گئی، ان کو نبی ﷺ نے دودھ والی اونٹنیوں کا حکم دیا (مدینہ منورہ سے چند میل کے فاصلے پر صدقات کی اونٹنیاں چرتی تھیں اور وہیں رہتی تھیں اور ان میں نبی ﷺ کی ذاتی اونٹنیاں بھی تھیں، وہاں جا کر رہنے کا حکم دیا) اور ان کا پیشاب اور دودھ پینے کا حکم دیا، چنانچہ وہ سب وہاں چلے گئے۔ جب تندرست ہوگئے تو انھوں نے نبی ﷺ کے چرواہے کو قتل کردیا، اور اونٹنیوں کو ہانک لے گئے، صبح سویرے اس کی خبر مدینہ منورہ پہنچی تو آپؐ نے ان کے تعاقب میں گھوڑ سوار روانہ فرمائے، پس جب دن چڑھ گیا تو وہ پکڑ کر لائے گئے، پس آپؐ کے حکم سے ان کے ہاتھ اور پاؤں (جانب مخالف سے) کاٹے گئے۔ اور ان کی آنکھیں پھوڑی گئیں، اور ان کو حرہ نامی میدان میں پھینک دیا گیا، وہ پانی

مانگتے تھے مگر ان کو پانی نہیں دیا گیا (اس لئے کہ وہاں کوئی نہیں تھا) ابو قلابہ کہتے ہیں: ان لوگوں نے چوری کی، اور چرواہے کو قتل کیا، اور ایمان کے بعد کفر کیا، یعنی مرتد ہو گئے اور اللہ اور رسول کے ساتھ جنگ کی۔

تشریح:

ا- یہ آٹھ آدمی تھے، چار قبیلہ عُرینہ کے تھے، تین قبیلہ عکل کے اور ایک کسی اور قبیلہ کا، انھوں نے اسلام قبول کیا، مگر ابھی بشاشت ان کے قلوب میں داخل نہیں ہوئی تھی کہ مدینہ کی آب وہوا ان کو راس نہ آئی، جوئی بیماری لگ گئی، یہ بدہضمی اور یرقان کے علاوہ بیماری ہے۔ معدہ کی خرابی کا نام بدہضمی ہے اور جگر کی خرابی سے یرقان ہوتا ہے، جوئی بیماری ان کے علاوہ ہے مگر آثار مشترک ہیں۔ نبی ﷺ نے ان کو اونٹنیوں کا دودھ اور پیشاب پینے کا حکم دیا۔ قائلین طہارت نے اس سے استدلال کیا کہ اونٹ کا پیشاب پاک ہے، اور مینگنیوں کو پیشاب پر قیاس کیا، پھر دوسرے ماکول اللحم جانوروں تک حکم متعدی کیا۔

جواب: جوئی بیماری میں اونٹ کا دودھ پیا جاتا ہے اور پیشاب سونگھا جاتا ہے۔ نبی ﷺ نے ان کو اسی کا حکم دیا تھا۔ بخاری کی ایک حدیث میں صرف دودھ پینے کا ذکر ہے، پیشاب کا ذکر نہیں (حدیث ۵۶۸۵) اور پیشاب انھوں نے خود پیا تھا اس لئے کہ عربوں کے تصورات میں جوئی بیماری میں پیشاب بھی پیا جاتا تھا۔

اور اگر مان لیا جائے کہ ان کو پیشاب پینے کا حکم دیا گیا تھا تو وہ علاج کے طور پر تھا، پس طہارت ثابت نہ ہوگی، جیسے ایک جنگ میں حضرت زبیر اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کو خارش کی وجہ سے ریشم کا کرتا پہننے کی اجازت دی تھی مگر اس سے مردوں کے لئے ریشم کی حلت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اجازت علاج کی ضرورت سے تھی، یہی معاملہ یہاں بھی ہے۔

قائلین نجاست کے دلائل:

جو تین امام ماکول اللحم جانوروں کے فضلات کو ناپاک کہتے ہیں ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) نبی ﷺ نے جلّالہ جانور کا گوشت کھانے سے اور دودھ پینے سے منع فرمایا (ترمذی حدیث ۱۸۱۸) جِلّة کے معنی ہیں: مینگنی، اور جَلّالة: وہ بکری وغیرہ ہے جو مینگنی کھاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے دودھ اور پسینے میں بدبو پیدا ہوگئی ہے، اگر مینگنی پاک ہوتی تو وہ چنے کے مانند ہوتی، اس کے گوشت اور دودھ سے کیوں روکا جاتا؟ معلوم ہوا کہ مینگنیاں ناپاک ہیں اور اسی سے تمام ماکول اللحم جانوروں کے فضلات کا ناپاک ہونا ثابت ہوگا۔

(۲) مشہور حدیث ہے: اِسْتَنْزِهُوْا مِنَ الْبَولِ فَإِنَّ عَامَّةَ عذابِ القبر منه: پیشاب سے بچو! اس لئے کہ قبر میں زیادہ تر عذاب پیشاب سے نہ بچنے کی وجہ سے ہوگا (دار قطنی ۱۲۸:۱ باب نجاسة البول، حدیث ۷) یہ حدیث عام ہے،

انسان اور غیر انسان، اسی طرح ماکول اللحم اور غیر ماکول اللحم سب کے پیشاب کو شامل ہے۔

(۳) ابوداؤد میں روایت ہے: جب کوئی شخص مسجد میں آئے تو اپنے چپل دیکھ لے، اگر اس میں ناپاکی ہو تو اس کو پونچھ ڈالے، پھر اس میں نماز پڑھے (ابوداؤد ا:۹۵) راستوں میں عام طور پر جانوروں ہی کے فضلات پڑے رہتے ہیں، پس اس روایت سے بھی ان کا ناپاک ہونا ثابت ہوا۔

۲- ابوقلابہ کہتے ہیں: یہ لوگ راہ زن بھی تھے کہ اونٹوں کو ہانک لے گئے، قاتل بھی تھے، چرواہے کو قتل کیا، مرتد بھی ہوگئے، اور اللہ ورسول کے ساتھ جنگ بھی کی، اس لئے ان کو یہ سزا دی گئی، یعنی ان کو قصاصاً قتل نہیں کیا گیا بلکہ ڈاکوؤں والی سزا دی گئی، ارشادِ پاک ہے:﴿ إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَيَسْعَوْنَ فِيْ الْأَرْضِ فَسَادًا، أَنْ يُقَتَّلُوْا أَوْ يُصَلَّبُوْا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيْهِمْ وَأَرْجُلُهِم مِنْ خِلاَفٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ﴾ (المائدہ آیت ۳۳) جو لوگ اللہ ورسول کے ساتھ جنگ کریں، اور زمین میں فساد برپا کریں ان کو قتل کیا جائے یا سولی پر چڑھایا جائے، یا جانب مخالف سے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں۔ یا زمین سے دور کردیئے جائیں یعنی جلاوطن کئے جائیں یا جیل میں بند کئے جائیں۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ قصاص میں مماثلت کے قائل ہیں، انھوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ عرینیین نے نبی ﷺ کے چرواہے کے پہلے ہاتھ پاؤں کاٹے تھے، پھر ببول کے کانٹوں سے اس کی آنکھیں پھوڑی تھیں، پھر مرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا اس لئے نبی ﷺ نے بھی ان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا۔ اور احناف کے نزدیک قصاص تلوار سے ہے خواہ قاتل نے قتل میں کوئی بھی صورت اختیار کی ہو، اس کی صرف گردن ماری جائے گی، زخموں میں مماثلت نہیں ہوگی، اور عرینیین کو یہ سزا سورۂ مائدہ آیت ۳۳ کی رو سے دی گئی تھی۔ وہ اللہ ورسول سے جنگ کرنے والے تھے، ان کو قصاص میں قتل نہیں کیا گیا تھا، ابوقلابہ یہی کہہ رہے ہیں، تفصیل اپنی جگہ پر آئے گی۔

فائدہ: ناپاک یا حرام چیز سے علاج کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے اور راجح قول یہ ہے کہ اگر جان کا خطرہ ہو تو حرام چیز سے علاج کرنا جائز ہے، جبکہ شفا اس میں منحصر ہو، لوگ دوسرا کوئی علاج نہ جانتے ہوں۔

[۲۳۴-] حدثنا آدمُ، قَالَ: ثَنَا شُعْبَةُ، قَالَ: أَنَا أَبُوْ التَّيَّاحِ، عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم يُصَلِّيْ قَبْلَ أَنْ يُبْنَى الْمَسْجِدُ فِيْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ.

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ مسجد نبوی بننے سے پہلے بکریوں کے باڑوں میں نماز پڑھا کرتے تھے۔

تشریح: مسجدِ نبوی کی تعمیر میں تقریباً چھ ماہ لگے ہیں اس وقت تک نماز بکریوں کے باڑوں میں پڑھی جاتی تھی، اور باڑے میں ہر طرف پیشاب اور مینگنیاں بکھری ہوئی ہوتی ہیں وہاں جماعت کرنا دلیل ہے کہ بکریوں کے فضلات پاک

ہیں، مگر تقریب تام نہیں، اس لئے کہ احتمال ہے کہ کپڑا اچھا کر نماز پڑھی ہو، پس اس سے استدلال کیسے صحیح ہوگا؟

بَابُ مَا يَقَعُ مِنَ النَّجَاسَاتِ فِي السَّمْنِ وَالْمَاءِ

گھی اور پانی میں ناپاکی گرجانے کا حکم

اصحاب ظواہر کے نزدیک پانی کسی حال میں ناپاک نہیں ہوتا، خواہ پانی تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اور خواہ ناپاکی تھوڑی ہو یا زیادہ۔ اور ائمہ کے نزدیک قلیل پانی ناپاکی گرنے سے ناپاک ہوجاتا ہے، اور کثیر پانی اس وقت ناپاک ہوتا ہے جبکہ ناپاکی کا اثر: رنگ، بو یا مزہ اس میں ظاہر ہو۔ پھر امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک قلیل وکثیر امر اضافی ہے، یعنی اگر ناپاکی پانی کی بہ نسبت تھوڑی ہے تو پانی کثیر ہے ناپاک نہیں ہوگا، اور ناپاکی پانی کی بہ نسبت زیادہ ہو تو پانی قلیل ہے ناپاک ہوجائے گا، اور قلیل وکثیر کو پہچاننے کا معیار یہ ہے کہ اگر ناپاکی کا اثر پانی میں ظاہر ہوجائے تو پانی قلیل ہے ورنہ کثیر ہے، اور اس کے لئے تعبیر ہے: ظُهور الأثر وعدمه۔ اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک دو مٹکے پانی پر مدار ہے، اگر دو مٹکے یا زیادہ پانی ہے تو کثیر ہے، ناپاکی گرنے سے ناپاک نہیں ہوگا مگر یہ کہ ناپاکی کا اثر اس میں ظاہر ہو۔ اور دو مٹکوں سے کم پانی تھوڑا ہے وہ ناپاک ہوجائے گا خواہ ناپاکی کا اثر ظاہر ہو یا نہ ہو۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر پانی کا پھیلاؤ اتنا ہے کہ ایک طرف کی حرکت دوسری طرف نہیں پہنچتی تو وہ کثیر پانی ہے، اور دوسری طرف حرکت پہنچتی ہے تو وہ قلیل پانی ہے۔ اس کے لئے تعبیر ہے: خُلوصُ الأثر وعدمه۔

امام اعظمؒ کی دلیل غدیر (تالاب) کی روایت ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ یا حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں نبی ﷺ کے ساتھ تھے، ہم ایک ایسے تالاب پر پہنچے جس میں مردار پڑا ہوا تھا۔ پس ہم رک گئے اور لوگ بھی رک گئے، یہاں تک کہ نبی ﷺ تشریف لائے، آپؐ نے پوچھا کیا بات ہے! پانی کیوں نہیں پیتے؟ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ مردار ہے، آپؐ نے فرمایا: استَقُوا فإن الماء لاينجسه شيئ: پانی پیو پس بیشک پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی۔ چنانچہ ہم نے پیا اور سیراب ہوئے، یہ روایت امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح معانی الآثار کے پہلے باب میں ذکر کی ہے، اور ابن ماجہ (حدیث ۵۲۹) میں بھی ہے۔ احناف نے اس سے یہ قاعدہ بنایا ہے کہ اگر پانی کا پھیلاؤ اتنا ہے کہ ایک طرف گری ہوئی ناپاکی کا اثر دوسری طرف نہیں پہنچتا تو وہ پانی کثیر ہے ورنہ قلیل ہے۔ پھر لوگوں کی سہولت کے لئے بعد کے مفتیوں نے دہ دردہ والے قول پر فتوی دیا۔ اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ نے قلتین والی روایت پر مسئلہ کا مدار رکھا۔ مگر احناف اس کو ماء جاری پر محمول کرتے ہیں، تفصیل ترمذی شریف میں ہے۔ دیکھئے تحفۃ الالمعی (۱:۲۹۹-۳۰۷)

اور امام بخاری رحمہ اللہ نے تغیر اوصاف پر مدار رکھا ہے، اگر نجاست کا اثر پانی میں ظاہر ہوگیا تو پانی ناپاک ہے ورنہ

نہیں، یعنی امام مالک رحمہ اللہ کی ہمنوائی کی ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ تغیر کا اثر مثبت اور منفی دونوں طرح ظاہر ہوتا ہے، یعنی تغیر کی وجہ سے ناپاک چیز پاک بھی ہوجاتی ہے اور پاک چیز ناپاک بھی ہوجاتی ہے، جیسے نبی ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب شہید آئے گا تو اس کے زخم تازہ ہونگے اور ان میں سے خون بہہ رہا ہوگا، جو مشک کی طرح مہک رہا ہوگا۔ مشک ہرن کا خون ہے جو قدرتی طور پر اس کے نافہ میں آکر جمع ہوتا ہے، پھر سوکھ کر نافہ گر جاتا ہے، یہ اعلیٰ قسم کی خوشبو ہے اور بالا جماع پاک ہے۔ اس لئے کہ اب وہ خون نہیں رہا، اس میں تغیر آگیا، معلوم ہوا کہ تغیر سے ناپاک چیز پاک ہوجاتی ہے، یہ منفی پہلو سے مثال تھی، اور مثبت پہلو سے مثال یہ ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھی میں ایک چوہا گر کر مرگیا، آپؐ نے فرمایا: چوہا نکال دو اور اس کے اردگرد جو گھی ہے اس کو پھینک دو، باقی گھی استعمال کرو، معلوم ہوا کہ تغیر سے پاک چیز ناپاک ہوجاتی ہے۔ غرض امام بخاریؒ نے امام مالکؒ کی ہمنوائی کی ہے، اور تغیر پر مدار رکھا ہے، اور منفی پہلو سے بھی مثال پیش کی ہے اور مثبت پہلو سے بھی، اس خلاصہ کو ذہن نشین کر کے پہلے آثار پڑھیں، پھر احادیث سمجھیں گے۔

[٦٧-] بابُ مَا يَقَعُ مِنَ النَّجَاسَاتِ فِيْ السَّمْنِ وَالْمَاءِ

[١-] وَقَالَ الزُّهْرِيُّ: لَابَأْسَ بِالْمَاءِ مَا لَمْ يُغَيِّرْهُ طَعْمٌ، أَوْ رِيْحٌ، أَوْ لَوْنٌ.

[٢-] وَقَالَ حَمَّادٌ: لَا بَأْسَ بِرِيْشِ الْمَيْتَةِ.

[٤-] وَقَالَ الزُّهْرِيُّ فِيْ عِظَامِ الْمَوْتَى نَحْوِ الْفِيْلِ وَغَيْرِهِ: أَدْرَكْتُ نَاسًا مِنْ سَلَفِ الْعُلَمَاءِ يَمْتَشِطُوْنَ بِهَا، وَيَدَّهِنُوْنَ فِيْهَا، لَا يَرَوْنَ بِهِ بَأْسًا.

[٤-] وَقَالَ ابْنُ سِيْرِيْنَ وَإِبْرَاهِيْمُ: لَا بَأْسَ بِتِجَارَةِ الْعَاجِ.

وضاحت: جاننا چاہئے کہ ترجمہ کا مقصد پانی اور گھی کی طہارت وعدم طہارت کا مسئلہ ہے۔ مگر حضرت نے ضمناً یہ مسئلہ بھی بیان کیا ہے کہ جن چیزوں میں حیات حلول نہیں کرتی، موت کے بعد وہ پاک رہتی ہیں، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اصل مسئلہ میں اختلاف ہے۔

۱- امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں (ناپاکی گرا ہوا) پانی استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں، جب تک کہ اس کا مزہ، بو اور رنگ نہ بدلے، یعنی جب تک تغیر اوصاف نہ ہو پانی پاک ہے، یہی امام مالک اور امام بخاری رحمہما اللہ کی رائے ہے۔

۲- حماد بن سلیمان (یہ امام اعظمؒ کے استاذ ہیں، آپ نے ان سے فقہ پڑھی ہے) کہتے ہیں: مردار کے پروں میں کوئی حرج نہیں، یعنی مردار کے پر پاک ہیں، ان سے انتفاع جائز ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے، کیونکہ پروں میں حیات حلول نہیں کرتی، امام بخاریؒ نے یہ مسئلہ ضمناً بیان کیا ہے۔

۳-امام زہریؒ نے ہاتھی وغیرہ مردار کی ہڈیوں کے بارے میں فرمایا: میں نے اسلاف کو ہاتھی دانت [1] سے بنی ہوئی کنگھیوں سے کنگھی کرتے دیکھا ہے، اور ہاتھی دانت کے برتنوں میں جو تیل ہوتا ہے اس کو لگاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اسلاف اس میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتے تھے، یعنی بے تکلف اس تیل اور کنگھی کو استعمال کرتے تھے، معلوم ہوا کہ مردار کی ہڈیاں پاک ہیں۔

۴-ابن سیرین اور ابراہیم نخعی رحمہما اللہ فرماتے ہیں: ہاتھی دانت کی تجارت میں کچھ حرج نہیں، معلوم ہوا کہ وہ ناپاک نہیں ورنہ ان کی بیع جائز نہ ہوتی۔

[۲۳۵-] حدثنا إِسْمَاعِيْلُ، قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ مَيْمُوْنَةَ: أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم سُئِلَ عَنْ فَأْرَةٍ سَقَطَتْ فِيْ سَمْنٍ، فَقَالَ: " أَلْقُوْهَا وَمَا حَوْلَهَا، فَاطْرَحُوْهُ، وَكُلُوْا سَمْنَكُمْ" [انظر: ۲۳۶، ۵۵۳۸، ۵۵۳۹، ۵۵۴۰]

[۲۳۶-] حدثنا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ: حَدَّثَنَا مَعْنٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا مَالِكٌ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ مَيْمُوْنَةَ: أَنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم سُئِلَ عَنْ فَأْرَةٍ سَقَطَتْ فِيْ سَمْنٍ؟ فَقَالَ: " خُذُوْهَا وَمَا حَوْلَهَا فَاطْرَحُوْهُ"، قَالَ مَعْنٌ: حَدَّثَنَا مَالِكٌ مَالاَ أُحْصِيْهِ يَقُوْلُ: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ مَيْمُوْنَةَ. [راجع: ۲۳۵]

ترجمہ: حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ سے اس چوہے کے بارے میں پوچھا گیا جو گھی میں گر جائے اور مر جائے، آپؐ نے فرمایا: اس کو اور جو گھی اس کے ارد گرد ہو اس کو پھینک دو، اور باقی گھی کھاؤ۔

تشریح:

۱-امام بخاری رحمہ اللہ کے دو استاذ ہیں: اسماعیل اور علی بن المدینی، اسماعیل امام مالکؒ سے براہ راست روایت کرتے ہیں، اور ابن المدینی معن کے واسطہ سے۔ معن کہتے ہیں: امام مالک رحمہ اللہ نے ہم سے یہ حدیث کئی مرتبہ بیان کی، ہمیشہ حضرت میمونہؓ کا ذکر کرتے تھے، یعنی یہ حدیث حضرت میمونہؓ کے مسانید میں سے ہے، ابن عباس کے مسانید میں سے نہیں، بعض سندوں میں حضرت میمونہ کا ذکر نہیں پس اسے مرسل صحابی کہیں گے۔

۲-جمے ہوئے گھی وغیرہ میں چوہا وغیرہ مر جائے تو اس کو نکال کر پھینک دیا جائے اور جو گھی وغیرہ اس کے ارد گرد ہو وہ بھی نکال کر پھینک دیا جائے، باقی گھی پاک ہے اس کو کھا سکتے ہیں۔

اور اگر گھی پگھلا ہوا ہو تو وہ ناپاک ہو جائے گا، پھر اس میں اختلاف ہے کہ اس کا خارجی استعمال جائز ہے یا نہیں؟

(۱) ہاتھی دانت ایک محاورہ ہے، ہاتھی کی ہڈیوں سے بنے ہوئے برتنوں کو بھی ہاتھ دانت کے برتن کہتے ہیں۔

مثلاً اس سے چراغ جلانا، یا اس کو جوتے وغیرہ پر لگانا۔ امام احمد رحمہ اللہ عدم جواز کے قائل ہیں، وہ اس سے کسی بھی طرح فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دیتے، کیونکہ حدیث میں ہے: وإن كان مائعا فلا تقربوه (مشکوۃ حدیث ۴۱۲۳) اگر گھی سیال ہو تو اس کے نزدیک مت جاؤ۔ اور امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک اس کا خارجی استعمال جائز ہے۔ اس کو چراغ میں استعمال کر سکتے ہیں اور دوسری طرح بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں مگر اس کا کھانا اور بیچنا ممنوع ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک بیچنا بھی جائز ہے، صرف کھانا جائز نہیں کیونکہ وہ نجس لغیرہ ہے، نجس لعینہ نہیں، پس اس کے خارجی استعمال میں اور بیع و شراء میں مضائقہ نہیں۔

۳- جو چیزیں نچوڑی نہیں جاسکتیں جیسے چٹائی، ناپاک پانی پلائی ہوئی چھری اور ناپاک پانی میں اوبالا ہوا گوشت وغیرہ ان کو پاک کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک تین بار دھونے سے اور ہر بار سکھانے سے پاک ہو جائیں گی، اور شہد اور دودھ جیسی چیزوں میں چوہا وغیرہ گر جائیں تو اس میں ہم وزن پانی ملایا جائے پھر پکایا جائے یہاں تک کہ پانی جل جائے، تین مرتبہ اس طرح کرنے سے شہد اور دودھ پاک ہو جائے گا۔ اور فتوی امام ابو یوسفؒ کے قول پر ہے۔ اور امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جو چیزیں نچوڑی نہیں جاسکتیں اگر وہ ناپاک ہو جائیں تو ان کو پاک کرنے کی کوئی شکل نہیں، مگر اس قول پر فتوی نہیں۔ یہ تفصیل عمدۃ القاری (۱: ۹۲۸) میں ہے۔

اور ایک طریقہ بہشتی زیور میں یہ بھی لکھا ہے کہ ناپاک گھی تیل میں اس کے بقدر پانی ڈال کر ہلایا جائے پھر جب وہ گھی تیل پانی کے اوپر آجائے تو کسی طرح اس کو اٹھا لیا جائے اس طرح تین دفعہ پانی ملا کر گھی تیل اٹھا لینے سے پاک ہو جائے گا۔ اور اگر گھی ناپاک ہونے کے بعد جم گیا ہو تو پانی ڈال کر آگ پر رکھ دیا جائے جب پگھل جائے تو اس کو اٹھا لیا جائے (بہشتی زیور حصہ دوم، نجاست کے پاک کرنے کا طریقہ مسئلہ ۲۹)

اور اگر نجاست ایسی چیز میں لگی ہو جس کو نچوڑ نہیں سکتے جیسے تخت، چٹائی، مٹی کا برتن وغیرہ تو اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک دفعہ دھو کر ٹھہر جاوے، جب پانی ٹپکنا بند ہو جائے تو پھر دھوئے، اس طرح تین مرتبہ دھونے سے وہ چیز پاک ہو جائے گی۔

اور اگر بڑا فرش یا قالین ناپاک ہو جائے تو اس پر پانی ڈال کر بھگو دیا جائے، پھر مشین سے اس کا پانی چوسا لیا جائے، اس طرح تین مرتبہ کرنے سے قالین اور فرش پاک ہو جائے گا، یا فرش اور قالین کو جاری نہر میں باندھ دیا جائے، چوبیس گھنٹے کے بعد نکال لیا جائے، پاک ہو جائے گا۔

[۲۳۷-] حدثنا أَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدٍ، قَالَ: أنَا عَبْدُ اللّٰهِ، قَالَ: أنَا مَعْمَرٌ، عَنْ هَمَّامِ بْنِ مُنَبِّهٍ، عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ عَنِ النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم قَالَ: "كُلُّ كَلْمٍ يُكْلَمُهُ الْمُسْلِمُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، يَكُوْنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَهَيْئَتِهَا إِذْ طُعِنَتْ، تَفَجَّرُ دَمًا، اللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ، وَالْعَرْفُ عَرْفُ الْمِسْكِ" [انظر: ۲۸۰۳، ۵۵۳۳]

ترجمہ: نبی ﷺ نے فرمایا: ہر وہ زخم جو راہِ خدا میں مسلمان کو لگایا جائے قیامت کے دن وہ زخم اسی حالت میں ہوگا جس حالت میں اس وقت تھا جب وہ لگایا گیا تھا۔ اس سے خون بہہ رہا ہوگا، اس کا رنگ خون کا رنگ ہوگا، اور خوشبو مشک کی خوشبو ہوگی۔

تشریح: شہید تازہ زخم اور خون کے ساتھ اس لئے آئے گا کہ میدانِ حشر میں اس کی مظلومیت ظاہر ہو، اور قاتل رسوا ہو اور اس حدیث سے استدلال اس طرح ہے کہ مشک ہرن کا خون ہے، جو اس کے نافہ میں جمع ہوتا ہے اور خشک ہو کر گر جاتا ہے، وہ اعلی درجہ کی خوشبو ہے، شہید کے خون سے بھی ویسی ہی مہک آئے گی اور وہ بالا جماع پاک ہے۔ معلوم ہوا کہ ناپاک چیز تغیر کے بعد پاک ہو جاتی ہے اور اس کے برعکس بھی ہوتا ہے، یعنی پاک چیز تغیر کے بعد ناپاک ہو جاتی ہے۔

لغات: تَفَجَّر: میں ایک ت حذف کر دی گئی ہے أی تتفجر اور یہ مستقل جملہ ہے .... عَرف: عین کے زبر کے ساتھ ہے، بعض طلبہ عین کا پیش پڑھتے ہیں جو صحیح نہیں۔ عَرف کے معنی ہیں: خوشبو۔

بابُ الْبَوْلِ فِی الْمَاءِ الدَّائِمِ

ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنا

یہ باب ایک نسخہ میں ہے تمام نسخوں میں نہیں ہے، اگر یہاں باب مانیں تو یہ باب در باب ہے، یعنی ضمنی باب ہے، اور حدیث اوپر والے باب سے متعلق ہے۔

حدیث: نبی ﷺ نے فرمایا: ''ہم دنیا میں آخری اور آخرت میں پہلی امت ہیں'' یعنی اگر چہ ہم دنیا میں تمام امتوں کے بعد آئے ہیں مگر آخرت میں ہمارا معاملہ سب سے پہلے پیش ہوگا۔

اور ابوالیمان ہی کی سند سے آپؐ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص ہرگز ٹھہرے ہوئے پانی میں جو جاری نہ ہو پیشاب نہ کرے، پھر اس میں نہائے''

قولہ: نحن الآخرون السابقون: یہ ایک صحیفہ کا سرنامہ ہے، امام بخاریؒ جب بھی اس صحیفہ سے حدیث لاتے ہیں تو یہ سرنامہ ذکر کرتے ہیں۔ پھر مناسبِ مقام حدیث لاتے ہیں، یہاں سرنامہ مراد نہیں، بلکہ اگلے نمبر پر جو حدیث ہے وہ مراد ہے۔ جیسے پہلے حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث گذری ہے، ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن نے اپنے ابا سے سن کر ایک کاپی میں حدیثیں لکھی تھیں، اس کا سرنامہ ذکر النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم تھا، جب بھی اس کاپی سے حدیث لائیں گے، پہلے یہ جملہ لائیں گے، پھر مناسبِ مقام حدیث لائیں گے، یا جیسے امام مسلم رحمہ اللہ جب بھی ہمام بن منبہ کے صحیفہ سے حدیث لاتے ہیں تو فذکر منھا أحادیث سے آغاز کرتے ہیں۔

دائم کے معنی ہیں: ہمیشہ رہنے والا، یعنی نہ بہنے والا، نبی ﷺ نے نہ بہنے والے پانی میں پیشاب کرنے سے منع

کیا، اور یہ ممانعت اس وجہ سے ہے کہ اگر وہ پانی تھوڑا ہے تو پیشاب کرنے سے ناپاک ہوجائے گا، اور کثیر ہے تو اگر چہ ناپاک نہیں ہوگا مگر اس میں پیشاب کرنا نظافت کے خلاف ہے۔ پھر جب وہ خود دوسرے وقت اس پانی سے غسل کرے گا تو اس کا جی کیسے چاہے گا؟

اور ماء جاری میں پیشاب کرنے کی ممانعت نہیں، کیونکہ پیشاب بہہ کر چلا جائے گا۔ غرض نبی ﷺ نے فرمایا: کوئی ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے، پھر وہ اس میں نہائے، وہ پانی پاک ہے، جبھی نہائے گا، معلوم ہوا کہ تغیر کے بغیر پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ یہی امام مالک اور امام بخاری رحمہما اللہ کا استدلال ہے۔

فائدہ: بعض لوگ حوض میں وضو کرتے ہیں اور دھوون حوض میں گراتے ہیں بلکہ پیر بھی اندر ڈال کر دھوتے ہیں، یہ تہذیب کے خلاف ہے۔ ان لوگوں کو سمجھایا جائے تو جواب دیتے ہیں: حوض ناپاک نہیں ہوتا، بیشک ناپاک نہیں ہوتا مگر گندہ تو ہوتا ہے، جبکہ شریعت مطہرہ نے پانی کو صاف رکھنے کا حکم دیا ہے۔ حوض صرف اس لئے ہوتا ہے کہ اس میں سے پانی لے کر وضو کیا جائے، نہ اس لئے کہ سارا میل اس میں ڈالا جائے۔

[٦٨-] بابُ الْبَوْلِ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ

[٢٣٨-] حدثنا أَبُو الْيَمَانِ، قَالَ: نا شُعَيْبٌ، قَالَ: أَنَا أَبُو الزِّنَادِ، أَنَّ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ هُرْمُزَ الْأَعْرَجَ حَدَّثَهُ، أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ، أَنَّهُ سَمِعَ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: "نَحْنُ الْآخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ"

[انظر: ٨٧٦، ٨٩٦، ٢٩٥٦، ٣٤٨٦، ٦٦٢٤، ٦٨٨٧، ٧٠٣٦، ٧٤٩٥]

[٢٣٩-] وَبِإِسْنَادِهِ، قَالَ: "لَايَبُوْلَنَّ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ، الَّذِيْ لَا يَجْرِيْ، ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيْهِ"

بابٌ: إِذَا أُلْقِيَ عَلٰى ظَهْرِ الْمُصَلِّيْ قَذَرٌ أَوْ جِيْفَةٌ لَمْ تَفْسُدْ عَلَيْهِ صَلَاتُهُ

نمازی پر گندگی یا مردار ڈالا جائے تو نماز فاسد نہیں ہوگی

اس باب کا مقصد ابتدائے صلوٰۃ اور بقائے صلوٰۃ میں فرق کرنا ہے۔ اگر نمازی کو کپڑے پر یا بدن پر ناپاکی کا علم ہے تو اس کے ساتھ نماز شروع کرنا صحیح نہیں، اور نماز کے اندر ناپاکی کا علم ہو تو فوراً ناپاک چیز بدن سے علاحدہ کردے، اور نماز پڑھتا رہے، نماز صحیح ہوگی۔ اور دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل ہے۔ انھوں نے نماز کے اندر اپنے کپڑے پر خون دیکھا تو اس کپڑے کو الگ کردیا اور نماز جاری رکھی، یا نماز کے بعد ناپاکی کا علم ہو تو بھی نماز صحیح ہے۔ اس کا اعادہ واجب نہیں۔ حضرت سعید بن المسیب اور عامر شعبی رحمہما اللہ نے یہ بات فرمائی ہے (یہ باب کی تقریر ہے)

اور حضرت الاستاذ علامہ فخر الدین احمد مراد آبادی قدس سرہ نے فرمایا کہ یہ باب دفع دخل مقدر کے طور پر لایا گیا ہے۔

اوپر یہ حدیث آئی ہے کہ ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ کیونکہ کھڈّے میں ایک آدمی کے پیشاب کرنے سے تغیر اوصاف نہیں ہوتا، اس لئے اس پانی سے نہا سکتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیشاب کھڈے میں بالیقین موجود ہے، پھر اس پانی سے نہانا کیسے صحیح ہوگا؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے اِس باب سے اعتراض کا جواب دیا ہے کہ جس طرح نمازی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے کپڑے پر یا بدن پر ناپاکی ہے اور اس نے نماز پڑھی تو اس کی نماز صحیح ہوگئی جبکہ اس کے بدن پر بالیقین ناپاکی تھی، پھر بھی نماز صحیح ہے۔ اسی طرح کھڈے میں بھی بالیقین پیشاب ہے مگر تغیر اوصاف نہ ہونے کی وجہ سے اس سے نہا سکتا ہے کیونکہ وہ پاک ہے۔ غرض امام بخاریؒ کے نزدیک ابتداء صلوٰۃ اور بقاء صلوٰۃ کے احکام الگ الگ ہیں، ناپاکی کے علم کے ساتھ نماز شروع کرنا صحیح نہیں، اور علم کے بغیر پڑھی ہوئی نماز صحیح ہے۔

اور احناف کے نزدیک ابتداء اور بقا کا حکم ایک ہے۔ پس جس طرح ناپاکی کے ساتھ نماز شروع کرنا صحیح نہیں، نماز کے بعد ناپاکی کا علم ہو اور یقین ہو کہ نماز میں ناپاکی کپڑے پر تھی اور درہم سے زیادہ تھی تو نماز کا اعادہ واجب ہے، اور درہم کے بقدر تھی تو وقت میں اعادہ واجب ہے، اور وقت کے بعد مستحب، اور درہم سے کم تھی تو نماز صحیح ہوگئی اعادہ ضروری نہیں، یا یقین نہ ہو تو بھی اعادہ ضروری نہیں۔ مثلاً ایک شخص بواسیر کا مریض ہے ایسے مریض کو کبھی استنجے کے بعد متصلاً خون آتا ہے، کچھ دیر کے بعد نہیں آتا۔ اس نے فجر سے پہلے استنجاء کیا پھر فجر پڑھی، پھر گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد پاجامہ میں خون دیکھا تو وہ خون بالیقین نماز میں تھا، پس اگر وہ درہم سے زیادہ ہو تو نماز کا اعادہ واجب ہے۔ اور اگر نماز کے بعد استنجا کیا تھا تو اب شک پیدا ہوگیا کہ بوقت نماز خون تھا یا نہیں؟ تو نماز صحیح ہے اور اعادہ ضروری نہیں۔

اسی طرح دورانِ نماز مصلی کے بدن پر یا کپڑے پر ناپاکی گری اور اس نے فوراً ناپاک چیز الگ کردی، ایک رکن کے بقدر ناپاکی بدن پر نہیں رہی تو نماز صحیح ہے، اور اگر ایک رکن کے بقدر ناپاکی بدن پر رہ گئی پھر الگ کی تو نماز فاسد ہوگئی، جیسے کوئی شخص بے سلی لنگی پہن کر نماز پڑھ رہا تھا، ہوا چلی اور ران کھل گئی مگر اس نے فوراً ستر ڈھانک لیا ایک رکن کے بقدر ران کھلی نہیں رہی تو نماز صحیح ہے، اور اگر ایک رکن کے بقدر ران کھلی رہ گئی تو نماز فاسد ہوگئی .... امام بخاری رحمہ اللہ اس باب میں دو آثار اور ایک حدیث لائے ہیں، جن سے حضرت رحمہ اللہ نے مدعی ثابت کیا ہے، ان کو سمجھنا ہے۔

[٦٩-] بابٌ: إِذَا أُلْقِيَ عَلٰى ظَهْرِ الْمُصَلِّي قَذَرٌ أَوْ جِيفَةٌ لَمْ تَفْسُدْ عَلَيْهِ صَلَاتُهُ

[١-] وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا رَأَى فِيْ ثَوْبِهِ دَمًا وَهُوَ يُصَلِّيْ وَضَعَهُ وَمَضَى فِيْ صَلَاتِهِ.

[٢-] وَقَالَ ابْنُ الْمُسَيَّبِ، وَالشَّعْبِيُّ: إِذَا صَلَّى وَفِيْ ثَوْبِهِ دَمٌ أَوْ جَنَابَةٌ، أَوْ لِغَيْرِ الْقِبْلَةِ، أَوْ تَيَمَّمَ وَصَلَّى ثُمَّ أَدْرَكَ الْمَاءَ فِيْ وَقْتِهِ: لَايُعِيْدُ.

پہلا اثر: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نماز کے اندر اپنے کپڑے پر خون دیکھا تو اس کپڑے کو الگ کردیا اور نماز

جاری رکھی، یعنی پہلے سے ان کے علم میں نہیں تھا کہ کپڑے پر خون لگا ہوا ہے، نماز کے دوران خون پر نظر پڑی تو کپڑا اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور نماز جاری رکھی۔ معلوم ہوا کہ نماز کے دوران مصلی کے بدن پر یا کپڑے پر ناپاکی گرے یا نماز کے اندر ناپاکی کا علم ہو تو نماز صحیح ہے اس کا اعادہ واجب نہیں۔

جواب: حضرت ابن عمرؓ کے کپڑے پر جو خون تھا وہ پہلے سے تھا اور حضرت کے علم میں نہیں تھا: اس کا بھی احتمال ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ نماز شروع کرنے کے بعد وہ خون نکلا اور کپڑے پر لگا اور وہ دم غیر مسفوح تھا پس نہ وضو ٹوٹا اور نہ نماز، اس لئے ابن عمرؓ نماز پڑھتے رہے اور خون آلود کپڑا ایک طرف رکھ دیا۔ مگر یہ جواب کمزور ہے۔

اصل جواب یہ ہے کہ وہ خون درہم کے بقدر تھا یا کم یا زیادہ؟ یہ بات جب تک طے نہ ہو استدلال ممکن نہیں، ہوسکتا ہے وہ خون ایک درہم کے بقدر یا کم رہا ہو تو احناف کے نزدیک بھی نماز صحیح ہے، اور یہ بات جاننے کی اب کوئی صورت نہیں۔ پس اس سے مدعی پر استدلال درست نہیں۔

فائدہ: حضرت ابن عمرؓ کے اس عمل سے یہ مسئلہ نکلا کہ درہم سے کم نجاست اگرچہ معاف ہے مگر اس کے ساتھ نماز نہیں پڑھنی چاہئے، نجاست زائل کر کے نماز پڑھنی چاہئے، لیکن اگر کسی کو معلوم نہ ہو اور اس نے نماز پڑھ لی تو نماز صحیح ہوگئی اس کا اعادہ واجب نہیں۔

دوسرا اثر: سعید بن المسیب اور عامر شعبی رحمہما اللہ فرماتے ہیں: جب کسی شخص نے نماز پڑھی اس حال میں کہ اس کے کپڑے پر خون تھا یا منی تھی، یا غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھی، یا تیمّم کر کے نماز پڑھی پھر وقت کے اندر پانی مل گیا تو نماز صحیح ہے اس کا اعادہ واجب نہیں، یعنی لاعلمی میں ناپاک کپڑے میں یا غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھی تو نماز صحیح ہے، غلطی پر مطلع ہونے کے بعد اس کا اعادہ واجب نہیں، خواہ وقت کے اندر غلطی پر مطلع ہوا ہو، یا وقت گذرنے کے بعد، اسی طرح پانی نہیں تھا، تیمّم کر کے نماز پڑھی پھر وقت کے اندر یا بعد میں پانی مل گیا تو بھی نماز کا اعادہ واجب نہیں، معلوم ہوا کہ ابتداء صلوٰۃ اور بقاء صلوٰۃ کا حکم الگ الگ ہے۔

جواب: غیر قبلہ کی طرف پڑھی ہوئی نماز احناف کے نزدیک بھی صحیح ہے، جبکہ تحری کر کے پڑھی ہو، اور پانی نہ ہونے کی وجہ سے تیمّم سے نماز پڑھی ہو تو بھی نماز صحیح ہے، پانی ملنے کے بعد اس کا اعادہ واجب نہیں خواہ وقت کے اندر پانی ملے یا وقت گذر جانے کے بعد۔ البتہ اگر کپڑے پر خون یا منی تھی اور لاعلمی میں نماز پڑھی تو اگر نجاست ایک درہم سے زیادہ تھی تو اس نماز کا اعادہ واجب ہے، اور درہم کے بقدر تھی تو وقت میں اعادہ واجب ہے اور وقت گذر جانے کے بعد مستحب، اور کم تھی تو اعادہ واجب نہیں، اور سعید بن المسیب اور عامر شعبی رحمہما اللہ تابعی ہیں ان کے قول امام اعظمؒ پر حجت نہیں۔

[۲۴۰-] حدثنا عَبْدَانُ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ أَبِيْ، عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ أَبِيْ إِسْحَاقَ، عَنْ عَمْرِو بْنِ مَيْمُوْنٍ، أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ قَالَ: بَيْنَا رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم سَاجِدٌ ح: قَالَ وَحَدَّثَنِيْ أَحْمَدُ بْنُ عُثْمَانَ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُرَيْحُ

ابْنُ مَسْلَمَةَ، قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ يُوْسُفَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، قَالَ: حَدَّثَنِي عَمْرُو بْنُ مَيْمُوْنٍ: أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ حَدَّثَهُ أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كَانَ يُصَلِّيْ عِنْدَ الْبَيْتِ، وَأَبُوْ جَهْلٍ وَأَصْحَابٌ لَهُ جُلُوْسٌ، إِذْ قَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ: أَيُّكُمْ يَجِيْءُ بِسَلَى جَزُوْرِ بَنِيْ فُلَانٍ، فَيَضَعُهُ عَلٰى ظَهْرِ مُحَمَّدٍ إِذَا سَجَدَ؟ فَانْبَعَثَ أَشْقَى الْقَوْمِ، فَجَاءَ بِهِ، فَنَظَرَ حَتّٰى إِذَا سَجَدَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم وَضَعَهُ عَلٰى ظَهْرِهِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ، وَأَنَا أَنْظُرُ، لاَ أُغْنِيْ شَيْئًا، لَوْ كَانَتْ لِيْ مَنَعَةٌ! قَالَ: فَجَعَلُوْا يَضْحَكُوْنَ، وَيُحِيْلُ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ، وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم سَاجِدٌ لاَ يَرْفَعُ رَأْسَهُ، حَتّٰى جَاءَ تْهُ فَاطِمَةُ فَطَرَحَتْهُ عَنْ ظَهْرِهِ، فَرَفَعَ رَأْسَهُ ثُمَّ قَالَ: " اللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ" ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، فَشَقَّ عَلَيْهِمْ إِذْ دَعَا عَلَيْهِمْ، قَالَ: وَكَانُوْا يَرَوْنَ أَنَّ الدَّعْوَةَ فِيْ ذٰلِكَ الْبَلَدِ مُسْتَجَابَةٌ، ثُمَّ سَمَّى: " اللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِأَبِيْ جَهْلٍ، وَعَلَيْكَ بِعُتْبَةَ بْنِ رَبِيْعَةَ، وَشَيْبَةَ بْنِ رَبِيْعَةَ، وَالْوَلِيْدِ بْنِ عُتْبَةَ، وَأُمَيَّةَ بْنِ خَلَفٍ، وَعُقْبَةَ بْنِ أَبِيْ مُعَيْطٍ" — وَعَدَّ السَّابِعَ فَلَمْ نَحْفَظْهُ — قَالَ: فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ! لَقَدْ رَأَيْتُ الَّذِيْنَ عَدَّ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم صَرْعَى فِيْ الْقَلِيْبِ قَلِيْبِ بَدْرٍ.

[انظر: ۵۲۰، ۲۹۳۴، ۳۱۸۵، ۳۸۵۴، ۳۹۶۰]

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ بیت اللہ شریف کے قریب نماز پڑھ رہے تھے، اور ابوجہل اور اس کے ساتھی وہاں بیٹھے تھے، اچانک ان میں سے بعض نے بعض سے کہا: تم میں سے کون ہے جو فلاں قبیلہ کی اونٹنی کا میل لائے اور جب محمد (ﷺ) سجدے میں جائیں تو اس کو ان کی پیٹھ پر رکھ دے؟ پس ان میں سے نہایت بدبخت (عقبہ بن ابی معیط) اٹھا اور میل لے آیا، اور انتظار میں رہا، یہاں تک کہ جب آپؐ نے سجدہ فرمایا تو اس میل کو آپؐ کی پیٹھ پر کندھوں کے درمیان رکھ دیا (ابن مسعودؓ کہتے ہیں) اور میں یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا، مگر میں کچھ نہیں کرسکتا تھا کاش مجھے قوت حاصل ہوتی! ابن مسعودؓ کہتے ہیں: پس وہ سب ہنسنے لگے، اور ایک دوسرے پر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ اور آپ سجدے میں پڑے رہے، آپؐ نے سر نہیں اٹھایا، یہاں تک کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور آپؐ کی پیٹھ سے میل کو الگ کیا (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بیٹی اور بچی تھیں وہ بدبخت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے، اور حضرت ابن مسعودؓ کی پٹائی کردیتے اس لئے وہ کچھ نہ کرسکے) پھر آپؐ نے سر اٹھایا اور بددعا فرمائی: اے اللہ! قریش کو پکڑ لے اور یہ بددعا تین مرتبہ فرمائی۔ یہ بددعا ان پر بہت بھاری ہوئی۔ ابن مسعودؓ کہتے ہیں: وہ جانتے تھے کہ بیت اللہ کے قریب دعا قبول کی جاتی ہے پھر آپؐ نے نام بنام بددعا فرمائی، اے اللہ! ابوجہل کو پکڑ لے، اور عتبہ بن ربیعہ کو، شیبہ بن ربیعہ کو، ولید بن عتبہ کو، امیہ بن خلف کو اور عقبہ بن ابی مُعیط کو۔ ابواسحاق کہتے ہیں: عمرو بن میمون نے ساتویں کا نام لیا مگر ہمیں وہ یاد نہ رہا (وہ عمارۃ بن الولید تھا) ابن مسعودؓ کہتے ہیں: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میں نے ان سب کو جن کے نام نبی ﷺ نے لئے تھے، بدر کے کنویں میں پچھڑے ہوئے دیکھا۔

تشریح:

۱-سَلٰی کا ترجمہ عام طور پر 'اوجھڑی' کیا جاتا ہے۔اور بعض لوگ 'بچہ دانی' ترجمہ کرتے ہیں۔ یہ دونوں ترجمے صحیح نہیں،اس کا صحیح ترجمہ 'میل' ہے۔رحم مادر میں ایک جھلّی ہوتی ہے،اس میں بچہ پلتا بڑھتا ہےاوراس میں گندہ پانی رہتا ہے۔جب دردزہ شروع ہوتا ہےتو وہ جھلی پھٹتی ہےاور چکنے پانی کے ساتھ بچہ باہر آجاتا ہےاور بچہ کی ناف ایک آنت سے جڑی ہوئی ہوتی ہے،تین انگلیوں کے بقدر چھوڑ کراس آنت کوکاٹ دیتے ہیں،پھروہ آنت اندر چلی جاتی ہے،اور بچہ کی ناف کودھاگے سے باندھ دیتے ہیں،کچھ دیر کے بعد دوبارہ درد ہوتا ہےاوروہ پردہ باہر آجاتا ہے،اس کوانسان کے تعلق سے نال اور جانور کے تعلق سے میل کہتے ہیں۔عربی میں انسان کی نال کے لئے مَشِیْمَة لفظ ہےاور جانور کے لئے سَلٰی. جانور کا میل پھینک دیتے ہیں اور عورت کی نال زمین میں گاڑ دیتے ہیں۔یہیں سے محاورہ چلا ہے کہ اس کی نال فلاں جگہ گڑی،یعنی وہ فلاں جگہ پیدا ہوا۔اوجھڑی اور بچہ دانی جانور ذبح کرنے کے بعد نکلتی ہےاوران کولوگ کھاتے ہیں اور حدیث میں ایسا کوئی لفظ نہیں جس میں یہ اشارہ ہو کہ وہ اونٹنی ذبح کی گئی تھی۔اور رہی یہ بات کہ حدیث میں لفظ جَزُوْر ہے،اور جزور اس اونٹ کو کہتے ہیں جوکاٹنے کھانے ہی کے لئے ہوتا ہےتو اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں بھی توالد وتناسل ہوتا ہے،پس یہ جزور کا میل تھا۔

۲-یُحِیل بعضهم علی بعض: کا ترجمہ ہے: مارے ہنسی کے ایک دوسرے پر گرنے لگے،یعنی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئے اور حاشیہ میں ایک مطلب لکھا ہے کہ ایک دوسرے کے حوالہ کرنے لگے یعنی ایک کہتا: تونے کیا،دوسرا کہتا: تو نے کیا، یہ ترجمہ مناسب نہیں، کیونکہ یہ مذموم حرکت جس نے کی تھی اس کوسب نے دیکھا تھا،پس ایک دوسرے کے سر الزام دھرنے کا کیا موقعہ تھا؟

۳-عقبہ بن ابی معیط ملعون نے جب میل لاکر آپؐ کی پیٹھ پر رکھا تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ وہاں موجود تھےاور سارا منظر دیکھ رہے تھے مگر مزاحمت نہیں کرسکتے تھے۔اس لئے کہ ان کے پاس خاندانی شرافت نہیں تھی،ان کا ایک معمولی اور غریب گھرانے سے تعلق تھا اور نہ وہ بہت زیادہ طاقت ور تھے۔بہت چھوٹے قد کے آدمی تھے،ایسا ناتواں بندہ کیا مزاحمت کرسکتا تھا!اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس خاندانی شرافت تھی وہ قریش کے اعلی خاندان بنو ہاشم سے تعلق رکھتی تھیں۔پھر بچی تھیں،ان پر دست درازی بنو ہاشم کو اپنا دشمن بنالینا تھا۔اس لئے ان شیاطین نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کچھ نہیں کہا۔

۴-اس حدیث سے امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال اس طرح ہے کہ نبی ﷺ پر سجدہ کی حالت میں نجاست رکھ دی گئی، پھر بھی آپؐ سجدہ میں رہے،نماز جاری رکھی،معلوم ہوا کہ دورانِ نماز اگر نمازی پر کوئی ناپاکی گرجائے تو نماز فاسد نہیں ہوتی۔

جواب: یہ استدلال بایں وجہ صحیح نہیں کہ نماز جاری تھی اس کی کوئی دلیل نہیں، نماز تو ٹوٹ گئی تھی۔ اور آپ سجدہ میں اس لئے پڑے رہے تھے کہ اس روح فرسا واقعہ سے آپؐ کا دل ٹوٹ گیا تھا، آپؐ نے حزن وملال کی وجہ سے سر نہیں اٹھایا پھر جب صاحبزادی نے پیٹھ سے گندگی ہٹائی تو آپؐ نے سر اٹھایا اور فوراً بددعا شروع کی، یہ دلیل ہے کہ آپ کی نماز باقی نہیں تھی ورنہ نماز پوری کر کے بددعا فرماتے۔

۵- حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جن شیاطین نے یہ مذموم حرکت کی تھی اور آپؐ نے نام بنام ان کے لئے بددعا کی تھی، اس بددعا کا اثر بدر میں ظاہر ہوا وہ تمام شیاطین کیفر کردار کو پہنچے۔ چنانچہ جنگ کے بعد نبی ﷺ نے ان سرداروں کی لاشیں ایک کچے بدبودار کنویں میں ڈلوادیں۔

بابُ البُصاقِ وَالْمُخَاطِ وَنَحْوِهِ فِي الثَّوْبِ

تھوک اور رینٹ وغیرہ کو کپڑے میں لینا

البزاق: تھوک، المخاط: ناک کی رینٹ —— تھوک، رینٹ، پسینہ اور آنسو وغیرہ کپڑے پر لگیں تو کچھ فرق نہیں پڑتا، اس لئے کہ یہ چیزیں پاک ہیں۔

حضرت عروہ: مسور بن مخرمہ اور مروان بن الحکم سے صلح حدیبیہ کا واقعہ روایت کرتے ہیں، وہ لمبی حدیث ہے، اس میں ایک مضمون یہ ہے کہ نبی ﷺ جب بھی ناک کی رینٹ جھاڑتے تو کوئی نہ کوئی صحابی اس کو ہاتھ میں لے لیتا، اور اس کو بدن پر مل لیتا، معلوم ہوا کہ رینٹ، تھوک اور آنسو وغیرہ پاک ہیں۔

وضاحت: حضرت مسور بن مخرمہؓ صحابی ہیں اور مروان بن الحکم مدینہ منورہ کا گورنر بھی رہا ہے اور امیر المؤمنین بھی بنا ہے۔ یہ نبی ﷺ کے عہد مبارک میں پیدا ہوا ہے، اس کا باپ حکم فتح مکہ کے موقعہ پر مسلمان ہوا تھا، مگر آپؐ نے اس کو طائف کی طرف جلاوطن کر دیا تھا، اس لئے کہ وہ آپؐ کے راز ظاہر کر دیتا تھا، مروان بھی باپ کے ساتھ طائف چلا گیا تھا، وہ اس وقت ناسمجھ بچہ تھا، اس نے حضور اقدس ﷺ کی زیارت کی ہے یا نہیں؟ اور وہ صحابی ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، راجح یہ ہے کہ وہ صحابی نہیں، اور وہ اس درجہ کا راوی بھی نہیں کہ اس کی روایت بخاری میں لائی جائے، اس لئے امام بخاری تعلیقاً اس کی حدیث لاتے ہیں اور کسی دوسرے کے ساتھ ملا کر لاتے ہیں، تنہا مروان کی حدیث تعلیقاً بھی نہیں لائے۔

حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ نے اپنے کپڑے میں تھوکا .... یہ روایت مختصر ہے: آپؐ نماز پڑھ رہے تھے، اور تھوکنے کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے کپڑے میں تھوک کر اس کو مل دیا اور نماز پڑھتے رہے۔ معلوم ہوا کہ تھوک بھی پاک ہے اور اوپر رینٹ کے بارے میں روایت تھی، پس دونوں کی طہارت ثابت ہوئی۔

سوال: کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ کے تھوک اور رینٹ کا پاک ہونا آپ کی خصوصیت تھی، اس سے تمام انسانوں کے تھوک اور رینٹ کے پاک ہونے پر استدلال کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟

جواب: امام بخاری رحمہ اللہ بلا دلیل خصوصیت کے قائل نہیں، ان کے نزدیک کسی بھی بات کو آپ کی خصوصیت قرار دینے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔ یہ بات حضرت الاستاذ نے القول الفصیح میں لکھی ہے جو مطبوعہ کتاب ہے۔

[۷۰-] بابُ البُصَاقِ وَالْمُخَاطِ وَنَحْوِهِ فِي الثَّوْبِ

وَقَالَ عُرْوَةُ عَنِ الْمِسْوَرِ وَمَرْوَانَ: خَرَجَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم زَمَنَ الْحُدَيْبِيَّةِ فَذَكَرَ الْحَدِيْثَ: وَمَا تَنَخَّمَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم نُخَامَةً إِلَّا وَقَعَتْ فِي كَفِّ رَجُلٍ مِنْهُمْ فَدَلَكَ بِهَا وَجْهَهُ وَجِلْدَهُ.

[۲٤۱-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ، قَالَ: ثَنَا سُفْيَانُ، عَنْ حُمَيْدٍ، عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: بَزَقَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم فِيْ ثَوْبِهِ.

قَالَ أَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ: طَوَّلَهُ ابْنُ أَبِيْ مَرْيَمَ، قَالَ: أَنَا يَحْيىٰ بْنُ أَيُّوْبَ، قَالَ: حَدَّثَنِيْ حُمَيْدٌ، قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم. [انظر: ٤٠٥، ٤١٢، ٤١٣، ٤١٧، ٥٣١، ٥٣٢، ٨٢٢، ١٢١٤]

قوله: طوّله ابن أبي مريم: امام بخاریؒ فرماتے ہیں: ابن ابی مریم نے اس حدیث کو تفصیل سے بیان کیا ہے، ان کی سند دوسری ہے جو اوپر جا کر حمید سے مل جاتی ہے، اس میں سمعتُ أنسا کی صراحت ہے۔

ایک بڑے محدث گذرے ہیں حماد بن سلمہ انھوں نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے کہ حمید طویل نے یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نہیں سنی، بلکہ ثابت بنانی سے سنی ہے، اور انھوں نے ابونضرہ سے اور انھوں نے حضرت انسؓ سے یعنی درمیان میں دو واسطے ہیں۔ امام بخاریؒ نے ابن ابی مریم کے حوالہ سے ان کی تردید کی کہ ان کی حدیث میں سمعتُ انسا کی صراحت ہے۔

باب: لَايَجُوْزُ الْوُضُوْءُ بِالنَّبِيْذِ وَلَا بِالْمُسْكِرِ

نبیذ اور نشہ آور چیز سے وضو جائز نہیں

امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک کسی بھی نبیذ سے وضو جائز نہیں، مگر حضرت کے پاس عدم جواز کی کوئی دلیل بھی نہیں۔ اس لئے حضرت رحمہ اللہ نے مسکر کا سہارا لیا ہے، باب میں اس کا اضافہ کیا ہے، تا کہ اس کے ذریعہ نبیذ سے وضو کے عدم جواز پر استدلال کریں، حالانکہ نشہ آور نبیذ سے وضو کوئی بھی جائز نہیں کہتا، پس یہ کہا جائے کہ امام بخاریؒ کے پیش نظر امام اعظم رحمہ اللہ کے قول سے تعرض کرنا نہیں ہے، نفس مسئلہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اگر نبیذ میں نشہ پیدا ہو جائے تو اس سے

وضو جائز نہیں، اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔

نبیذ: فعیل کا وزن ہے اور اسم مفعول کے معنی میں ہے، اس کے معنی ہیں: ڈالا ہوا، اور اصطلاح میں نبیذ اس پانی کو کہتے ہیں جس میں کھجور یا کشمش ڈالی گئی ہو، اور یہ چیزیں پانی میں گل گئی ہوں اور پانی میٹھا ہو گیا ہو۔

تمام ائمہ متفق ہیں کہ کھجور کے علاوہ کسی دوسری چیز کی نبیذ سے وضو جائز نہیں، اسی طرح کھجور کی وہ نبیذ جو گاڑھی ہوگئی ہو، اور اس میں نشہ پیدا ہو گیا ہو یا وہ پکالی گئی ہو اس سے بھی وضو جائز نہیں، اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ البتہ کھجور کی وہ نبیذ جس میں کھجور کا اثر ظاہر ہو گیا ہو یعنی پانی میٹھا ہو گیا ہو مگر ابھی رقیق وسیال ہو اور اس کو پکایا بھی نہ گیا ہو تو اس سے وضو کے جواز وعدم جواز میں پہلے اختلاف تھا، امام اعظم رحمہ اللہ اس نبیذ سے وضو ضروری قرار دیتے تھے، ایسی نبیذ کی موجودگی میں تیمّم جائز نہیں تھا۔

حضرت امام اعظمؒ کے اس مسئلہ میں اور بھی اقوال تھے۔ مگر آخر میں آپ نے جمہور کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا اور اسی پر فتوی ہے، پس مفتی بہ قول کے اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں رہا۔ امت متفق ہے کہ نبیذ تمر سے بھی وضو جائز نہیں۔ تفصیل تحفۃ الالمعی (۳۴۶:۱) میں ہے۔

آثار:

۱- حضرت حسن بصری اور ابو العالیہ رحمہما اللہ فرماتے ہیں: نبیذ سے وضو کرنا مکروہ ہے —— یہ قول امام اعظم رحمہ اللہ کے قول اول سے قریب ہے۔ اگر کسی کے پاس مطلق پانی نہ ہو اور نبیذ تمر ہو تو امام اعظم رحمہ اللہ اس سے وضو کو ضروری قرار دیتے تھے۔ یہ دونوں بزرگ بھی یہی فرما رہے ہیں کہ اس سے وضو کرنا جائز ہے مگر مکروہ ہے۔ پس اس سے امام اعظم کے قول اول کی تائید ہوتی ہے۔ امام بخاریؒ کا مدعی ثابت نہیں ہوتا، امام بخاری عدم جواز کے قائل ہیں اور یہ دونوں بزرگ کراہیت کی بات کہہ رہے ہیں، اور کراہیت اور عدم جواز میں فرق ہے۔

۲- حضرت عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے نبیذ اور دودھ سے وضو کرنے کی بہ نسبت تیمّم کرنا زیادہ پسند ہے —— دودھ سے وضو کرنا بالاجماع جائز نہیں، کیونکہ وہ پانی نہیں، اور نبیذ کا تذکرہ اس کے ساتھ ملا کر کیا ہے پس اس سے بھی وضو جائز نہیں۔ یہ قول امام بخاریؒ کا مستدل بن سکتا ہے، مگر یہ تابعی کا قول ہے۔

حدیث: نبی ﷺ نے فرمایا: ہر پینے کی چیز جو نشہ آور ہو حرام ہے۔

تشریح: ہر مسکر حرام ہے (صغری) اور مسکر سے وضو بالاجماع جائز نہیں (کبری) پس حرام چیز سے وضو جائز نہیں (نتیجہ) مگر یہ حدیث اس نبیذ کی دلیل بن سکتی ہے جو مسکر ہے، اور مسکر نبیذ سے وضو کے جواز کا کوئی قائل نہیں۔

[۷۱-] بابٌ: لَایَجُوْزُ الْوُضُوْءُ بِالنَّبِیْذِ وَلَا بِالْمُسْکِرِ

وَکَرِهَهُ الْحَسَنُ وَأَبُو الْعَالِيَةِ، وَقَالَ عَطَاءٌ: التَّيَمُّمُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الْوُضُوْءِ بِالنَّبِيْذِ وَاللَّبَنِ.

[۲۴۲-] حدثنا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللّٰه، قَالَ: ثَنَا سُفْيَانُ، قَالَ: حَدَّثَنَا الزُّهْرِيُّ، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ عَائِشَةَ، عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قَالَ: "كُلُّ شَرَابٍ أَسْكَرَ فَهُوَ حَرَامٌ" [انظر: ۵۵۸۵، ۵۵۸۶]

بابُ غَسْلِ الْمَرْأَةِ أَبَاهَا الدَّمَ مِنْ وَجْهِهِ

عورت کا اپنے باپ کے چہرے سے خون دھونا

حافظ رحمہ اللہ فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس ترجمہ کا مقصد یہ ہے کہ نجاست وغیرہ کو مثلاً خون، تھوک اور رینٹ کو صاف کردینا چاہئے، بدن پر باقی نہیں رہنے دینا چاہئے۔ اور حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے مقصد ترجمہ یہ بیان فرمایا تھا کہ نفس وضو میں ضرورت کے وقت استعانت جائز ہے، پہلے یہ مسئلہ آیا ہے کہ متعلقاتِ وضو میں تو استعانت جائز ہے مگر نفس وضو میں جائز نہیں، اس لئے یہ باب لاکر اشارہ فرمایا کہ کراہت بے ضرورت استعانت میں ہے، عند الضرورت نفس وضو میں بھی استعانت جائز ہے۔

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ کو گھر والوں نے وضو کرایا، آخر میں ایک پیر دھویا، جب دوسرے پیر کا نمبر آیا تو حضرت نے فرمایا: اس پر مسح کردو، یہ بیمار ہے، حاشیہ میں ہے کہ اس پیر پر پھوڑا نکل رہا تھا، اور پیر دھونے میں مرض بڑھ جانے کا اندیشہ تھا، حضرت ابو العالیہ کے اس عمل سے پتا چلا کہ ضرورت کے وقت نفس وضو میں بھی استعانت جائز ہے، اور یہ قول حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے جو مقصد ترجمہ بیان فرمایا ہے اس کے اعتبار سے تو باب سے منطبق ہے مگر حافظ رحمہ اللہ کے بیان کے اعتبار سے باب سے منطبق نہیں۔

حدیث: ابو حازمؒ سے مروی ہے کہ انھوں نے سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ سے سنا درانحالیکہ ان سے لوگوں نے پوچھا تھا —— اور اس وقت میرے اور ان کے درمیان کوئی حائل نہیں تھا، یعنی میں ان کے بالکل قریب بیٹھا تھا —— جنگ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم کا علاج کس چیز سے کیا گیا تھا؟ انھوں نے فرمایا: اب دنیا میں مجھ سے زیادہ یہ بات جاننے والا کوئی نہیں رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ڈھال میں پانی لا رہے تھے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپؐ کے چہرۂ مبارک سے خون دھو رہی تھیں (جب خون نہیں رکا تو) ایک چٹائی لی گئی، اور وہ جلائی گئی، اور اس کی راکھ زخم میں بھری گئی تب خون رکا۔

تشریح: جنگِ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دانت میں چوٹ آئی تھی اور خود (لوہے کی ٹوپی) کی دو کڑیاں پیشانی میں گڑ گئی تھیں، حضرت ابو عبیدۃ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے ان کو دانتوں سے کھینچ کر نکالا تھا جس کی وجہ سے ان کے دو دانت گر گئے تھے۔ اس زخم سے خون پھوٹ پڑا، حضرت علی رضی اللہ عنہ ڈھال میں پانی لائے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے زخم کو دھویا، مگر جب خون نہ رکا تو ایک چٹائی جلائی گئی اور اس کی راکھ زخم میں بھری گئی جس سے خون بند ہو گیا۔

نبی ﷺ کے چہرے سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خون دھویا تھا، معلوم ہوا کہ بدن پر سے خون وغیرہ نجاست کو صاف کردینا چاہئے، پس یہ حدیث حافظ رحمہ اللہ نے جو مقصد ترجمہ بیان کیا ہے اس کے اعتبار سے بھی باب سے منطبق ہے۔

[۷۲-] بابُ غَسْلِ الْمَرْأَةِ أَبَاهَا الدَّمَ مِنْ وَجْهِهِ

وَقَالَ أَبُو الْعَالِيَةِ: امْسَحُوْا عَلٰى رِجْلِيْ، فَإِنَّهَا مَرِيْضَةٌ.

[۲۴۳-] حدثنا مُحَمَّدٌ، قَالَ: ثَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ، عَنْ أَبِيْ حَازِمٍ، سَمِعَ سَهْلَ بْنَ سَعْدِ السَّاعِدِيَّ، وَسَأَلَهُ النَّاسُ، وَمَا بَيْنِيْ وَبَيْنَهُ أَحَدٌ: بِأَيِّ شَيْئٍ دُوِيَ جُرْحُ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم؟ فَقَالَ: مَا بَقِيَ أَحَدٌ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّيْ، كَانَ عَلِيٌّ يَجِيْءُ بِتُرْسِهِ، فِيْهِ مَاءٌ، وَفَاطِمَةُ تَغْسِلُ عَنْ وَجْهِهِ الدَّمَ، فَأُخِذَ حَصِيْرٌ فَأُحْرِقَ فَحُشِيَ بِهِ جُرْحُهُ. [انظر: ۲۹۰۳، ۲۹۱۱، ۳۰۳۷، ۴۰۷۵، ۵۲۴۸، ۵۷۲۲]

وضاحت: سَمِعَ سَهْلَ بْنَ سعد: سے پہلے أَنَّه بڑھا سکتے ہیں جیسے حدثنا سے پہلے قال بڑھاتے ہیں ....

دُوِی: دَاوَی یُدَاوِیْ مُدَاوَاۃ (مفاعلہ) سے ہے، ایک واؤ محذوف ہے، اس کی جگہ الٹا پیش لگایا گیا ہے، اس کا نام صلہ ہے، صلہ: وَصَلَ یَصِلُ (ض) کا مصدر ہے، اس کے معنی ہیں: ملانا، یعنی واؤ کو پیش میں، الف کو زبر میں اور ی کو زیر میں ملانا، جیسے ﴿یَخْلُدْ فِیْهٖ مُهَانًا﴾ میں ی کو کسرہ میں ملایا گیا ہے اس لئے کھڑا زبر لکھا گیا ہے، اور ﴿مَا أَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ﴾ میں واؤ کو پیش میں ملایا گیا ہے اس لئے الٹا پیش لکھا گیا ہے، اور عربی میں صلہ عام ہے جیسے طاؤس، داؤد وغیرہ ان میں بھی واؤ پیش میں ملایا گیا ہے۔

باب السِّوَاكِ

مسواک کرنے کا بیان

سِوَاك: دانت صاف کرنے کی لکڑی، اس کو مسواک بھی کہتے ہیں، اس کی جمع مَسَاوِيك ہے، ساك يسوك سوكا الشيئ: رگڑنا، ملنا —— مسواک کی سنت متفق علیہ ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ وضو کی سنت ہے، یا نماز کی یا دین کی؟ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الوضوء میں یہ باب لا کر اشارہ فرمایا کہ یہ وضو کی سنت ہے، یعنی وضو سے پہلے مسواک کرنا چاہئے۔ اور شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ کی رائے یہ ہے کہ یہ دین کی سنت ہے، لہٰذا اس کے لئے کوئی وقت متعین نہیں، جب بھی منہ میں تغیر آجائے مسواک کرنا چاہئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: نبی ﷺ جب بھی باہر سے گھر میں تشریف لاتے تو مسواک فرماتے (مسلم، مشکوۃ حدیث ۳۷۷) شاہ صاحب رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں

تحریر فرمایا ہے کہ مضمضہ اور استنشاق امور فطرت میں سے ہیں جن کو وضو میں شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح مسواک بھی امور فطرت میں سے ہے جس کو طہارت میں لیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسواک درحقیقت دین اسلام کی سنت ہے اس کو وضو میں لیا گیا ہے، چنانچہ علامہ ابن الہمام نے مسواک کو پانچ جگہ مستحب قرار دیا ہے: جب دانت پیلے پڑ جائیں، جب منہ میں بدبو پیدا ہو جائے، جب آدمی نیند سے بیدار ہو، وضو سے پہلے اور نماز سے پہلے (فتح القدیر ۱:۲۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: میں نے ایک رات نبی ﷺ کے گھر گذاری، جب آپؐ تہجد کے لئے اٹھے تو مسواک کی۔ یہ روایت بار بار گذری ہے، اور استنان کے معنی ہیں: دانتوں پر لکڑی یا انگلی پھیرنا، سِنّ کے معنی ہیں: دانت۔ استنان اسی سے مشتق ہے۔

حدیث: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نبی ﷺ کے پاس آیا میں نے دیکھا آپؐ اپنے ہاتھ میں مسواک لے کر مسواک فرمارہے ہیں اور آپؐ کے منہ سے اع اع کی آواز نکل رہی ہے، درانحالیکہ مسواک آپؐ کے منہ میں تھی، گویا آپؐ قے کر رہے ہیں۔

تشریح: حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ جب خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تھے تو آپؐ مسواک فرمارہے تھے، اور منہ سے اع اع کی آواز نکل رہی تھی، جیسے کوئی بہ تکلف قے کرتا ہے۔ ظاہر ہے صرف دانتوں پر مسواک پھیرنے سے آواز پیدا نہیں ہوتی، آواز پیدا ہونا قرینہ ہے کہ مسواک زبان پر پھیری جارہی تھی، معلوم ہوا کہ زبان کا صاف کرنا بھی اہم ہے، کیونکہ جب بلغم زبان پر جم جاتا ہے تو ذہن میں بلادت پیدا ہو جاتی ہے اور زبان کی حرکت بھی ٹھیک نہیں رہتی، الفاظ کے تلفظ پر اثر پڑتا ہے۔ اس لئے وضو میں دانت اور زبان دونوں کو صاف کرنا چاہئے تاکہ نماز میں قراءت بے تکلف ہو۔

حدیث (۲): حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ رات میں جب تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو اپنے منہ کو مسواک سے رگڑتے تھے۔

تشریح: نیند میں معدہ کے ابخرہ منہ میں آتے ہیں جن سے منہ میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے اس لئے بیدار ہونے کے بعد مسواک کرنا سنت ہے، حنفیہ کے نزدیک مسواک دراصل وضو کی سنت ہے مگر اس کے علاوہ اوقات میں بھی سنت ہے جیسا کہ ابن الہمامؒ نے لکھا ہے۔

[۷۳-] بابُ السِّوَاكِ

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: بِتُّ عِنْدَ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم فَاسْتَنَّ.

[۲٤٤-] حدثنا أَبُو النُّعْمَانِ، قَالَ: ثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ، عَنْ غَيْلاَنَ بْنِ جَرِيْرٍ، عَنْ أَبِي بُرْدَةَ، عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم فَوَجَدْتُهُ يَسْتَنُّ بِسِوَاكٍ بِيَدِهِ، يَقُوْلُ: أُعْ أُعْ، وَالسِّوَاكُ فِيْ فِيْهِ، كَأَنَّهُ يَتَهَوَّعُ.

[۲۴۵-] حدثنا عُثْمَانُ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ، قَالَ: ثَنَا جَرِيْرٌ، عَنْ مَنْصُوْرٍ، عَنْ أَبِي وَائِلٍ، عَنْ حُذَيْفَةَ، قَالَ: كَانَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم إِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ يَشُوْصُ فَاهُ بِالسِّوَاكِ. [انظر: ۸۸۹، ۱۱۳۶]

بابُ دَفْعِ السِّوَاكِ إِلَى الْأَكْبَرِ

مسواک بڑے کو دینا

مسواک بذاتِ خود معمولی چیز ہے، پس چھوٹے کو دینی چاہئے، جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب پہلا پھل لایا جاتا تو آپؐ برکت کی دعا فرماتے پھر جو سب سے چھوٹا بچہ ہوتا اس کو بلا کر عنایت فرماتے، مسواک کی لکڑی بھی معمولی چیز ہے، وہ بھی چھوٹے کو دینی چاہئے، مگر شریعت کی نظر میں وہ اہم ہے، اس لئے بڑے کو دینے کا اشارہ دیا گیا۔

حدیث: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا: آپؐ مسواک فرمارہے ہیں۔ دو شخص آپؐ کے پاس آئے ایک بڑا تھا اور دوسرا چھوٹا۔ آپؐ نے چھوٹے کو مسواک دینا چاہا، حضرت جبرئیل علیہ السلام فوراً آئے اور فرمایا: بڑے کو دیجئے، چنانچہ آپؐ نے بڑے کو مسواک دی۔ معلوم ہوا کہ شریعت کی نظر میں مسواک کی بڑی اہمیت ہے۔

[۷۴-] بابُ دَفْعِ السِّوَاكِ إِلَى الْأَكْبَرِ

[۲۴۶-] وَقَالَ عَفَّانُ: حَدَّثَنَا صَخْرُ بْنُ جُوَيْرِيَةَ، عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: " أَرَانِي أَتَسَوَّكُ بِسِوَاكٍ، فَجَاءَ نِي رَجُلَانِ: أَحَدُهُمَا أَكْبَرُ مِنَ الآخَرِ، فَنَاوَلْتُ السِّوَاكَ الْأَصْغَرَ مِنْهُمَا، فَقِيْلَ لِيْ: كَبِّرْ، فَدَفَعْتُهُ إِلَى الْأَكْبَرِ مِنْهُمَا "

وَقَالَ أَبُوْ عَبْدِ اللهِ: اخْتَصَرَهُ نُعَيْمٌ، عَنِ ابْنِ الْمُبَارَكِ، عَنْ أُسَامَةَ، عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ.

وضاحت: وقال عفان: یہ شروع سے سند ہے تعلیق نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے جو حدیثیں باقاعدہ اساتذہ سے پڑھی ہیں وہاں حدثنا لکھتے ہیں۔ اور جو حدیثیں مذاکرے میں حاصل کی ہیں ان کو قال سے شروع کرتے ہیں، اس قال کو بھی حدثنا کی طرح جلی لکھنا چاہئے .... امام بخاریؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو نعیمؒ ابن المبارکؒ سے، وہ اسامہؒ سے، وہ نافع سے، وہ ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں، مگر وہ حدیث مختصر ہے اور طبرانی کی معجم اوسط میں ہے، اس میں صرف یہ جملہ ہے: أمرني جبريل أنْ أكبر: جبرئیلؑ نے مجھے حکم دیا کہ مسواک بڑے کو دوں، اس میں خواب کا ذکر نہیں ہے۔

بابُ فَضْلِ مَنْ بَاتَ عَلَى الْوُضُوْءِ

رات میں باوضو سونے کی فضیلت

نیند موت کی بہن ہے، جس طرح موت سے پہلے ذکر خوش نصیبی ہے، اسی طرح باوضو اللہ کا ذکر کرتے ہوئے سونا

بھی افضل ہے، تاکہ اگر سوتے ہوئے موت آجائے تو خاتمہ طہارت وذکر پر ہو اور موت فطرت پر واقع ہو۔

حدیث: حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نبی ﷺ نے مجھ سے فرمایا: جب آپ سونے کے لئے بستر پر آئیں تو پہلے نماز والی وضو کرلیں، پھر دائیں کروٹ پر لیٹیں اور یہ دعا پڑھیں: اے اللہ! میں نے اپنی ذات آپ کے سپرد کی، اور اپنا معاملہ آپ کو سونپ دیا، اور اپنی پیٹھ آپ کی طرف لگادی، مجھے آپ سے امید بھی ہے اور آپ کا ڈر بھی، آپ کے سوانہ کوئی پناہ کی جگہ ہے اور نہ نجات کی، مگر آپ کی طرف، اے اللہ! میں ایمان لایا ان تمام کتابوں پر جو آپ نے نازل فرمائی ہیں اور ان تمام نبیوں پر جن کو آپ نے مبعوث فرمایا ہے۔

پس اگر آپ رات میں مرگئے تو فطرت (دین) پر مریں گے، اور ان کلمات کو آخری بات بنائیں جن کو آپ بولیں، یعنی اس کے بعد کچھ نہ بولیں اور بولیں تو یہ ذکر دوبارہ کرلیں۔

حضرت براءؓ کہتے ہیں: میں نے یہ دعا نبی ﷺ کے سامنے دوہرائی، جب میں اللّٰھم آمنت بکتابك الذی أنزلت پر پہنچا تو میں نے بنبیك کی جگہ برسولك کہا، آپؐ نے فرمایا: نہیں، وبنبیك الذی أرسلتَ۔

تشریح:

۱- یہ دعا سوتے وقت سب سے آخر میں پڑھنی چاہئے۔ پھر کسی سے بات نہیں کرنی چاہئے اور اگر کی تو دعا دوبارہ پڑھے، جیسے حدیث میں ہے: مَن کان آخر کلامہ لا إلٰہ إلا اللہ دخل الجنۃ: جس کا آخری کلام لا إلٰہ إلا اللہ ہو وہ جنت میں جائے گا، یہاں بھی یہی مسئلہ ہے: کلمہ طیبہ پڑھ کر مریض کسی سے بات نہ کرے، اور اگر کوئی دنیوی بات کرے تو دوبارہ کلمہ کی تلقین کی جائے۔

۲- حضرت براء رضی اللہ عنہ نے جب مذکورہ دعا یاد کرکے نبی ﷺ کو سنائی تو بنبیك کی جگہ برسولك کردیا۔ آپؐ نے ٹوکا اس لئے کہ رسول تو بڑے حضرات کو کہتے ہیں جو نئی شریعت کے ساتھ مبعوث کئے جاتے ہیں۔ اگر ان کی تخصیص کی جائے گی تو چھوٹے حضرات (انبیاء) نکل جائیں گے۔ حالانکہ تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اسی لئے نبی ﷺ کی صفت خاتم النّبیین آئی ہے۔ خاتم المرسلین نہیں آئی، نبی عام ہے، رسول غیر رسول سب کو شامل ہے۔ کیونکہ وہ اسم جنس ہے اور تمام انبیاء کو شامل ہے اور لفظ کتاب بھی اسم جنس ہے، اللہ کی تمام کتابوں کو شامل ہے۔ خاص قرآن مجید اور خاص نبی ﷺ مراد نہیں۔

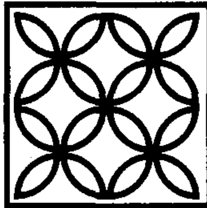
۳- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسنون دعاؤں اور مسنون اذکار کی حفاظت کرنی چاہئے، اس میں تبدیلی نہیں کرنی چاہئے، ہوسکتا ہے الفاظ کی تبدیلی سے مفہوم بدل جائے اور دعا کرنے والا سمجھ نہ سکے، اس لئے مسنون اذکار وادعیہ کی حفاظت کرنی چاہئے، البتہ اس میں اضافہ کرنے کی گنجائش ہے، شروع میں بھی، آخر میں بھی اوز درمیان میں بھی مگر درمیان میں اضافہ کرنا مجھے پسند نہیں۔

[۷۵-] بابُ فَضْلِ مَنْ بَاتَ عَلَى الْوُضُوْءِ

[۲۴۷-] حدثنا مُحَمَّدُ بْنُ مُقَاتِلٍ، قَالَ: أَنَا عَبْدُ اللّٰهِ، قَالَ: أَنَا سُفْيَانُ، عَنْ مَنْصُوْرٍ، عَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَيْدَةَ، عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ، قَالَ: قَالَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم:" إِذَا أَتَيْتَ مَضْجَعَكَ فَتَوَضَّأْ وُضُوْءَ كَ لِلصَّلاَةِ، ثُمَّ اضْطَجِعْ عَلٰى شِقِّكَ الأَيْمَنِ، ثُمَّ قُلْ:" اللّٰهُمَّ أَسْلَمْتُ وَجْهِيْ إِلَيْكَ، وَفَوَّضْتُ أَمْرِیْ إِلَيْكَ، وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِیْ إِلَيْكَ، رَغْبَةً وَرَهْبَةً إِلَيْكَ، لاَ مَلْجَأَ وَلاَ مَنْجَأَ مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ، اللّٰهُمَّ آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِیْ أَنْزَلْتَ، وَبِنَبِيِّكَ الَّذِیْ أَرْسَلْتَ" فَإِنْ مُتَّ مِنْ لَيْلَتِكَ فَأَنْتَ عَلَى الْفِطْرَةِ، وَاجْعَلْهُنَّ آخِرَ مَا تَتَكَلَّمُ بِهِ "

قَالَ: فَرَدَّدْتُهَا عَلَى النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم، فَلَمَّا بَلَغْتُ: "اللّٰهُمَّ آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِیْ أَنْزَلْتَ" قُلْتُ: وَرَسُوْلِكَ، قَالَ:" لاَ، وَنَبِيِّكَ الَّذِیْ أَرْسَلْتَ" [انظر: ۶۳۱۱، ۶۳۱۳، ۶۳۱۵، ۷۴۸۸]

﴿الحمدللہ! کتاب الوضوء کی تقریر کی ترتیب پوری ہوئی﴾



اہم تصانیف: حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

(۱) تحفۃ الالمعی شرح سنن الترمذی: یہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ کے دروسِ ترمذی کا مجموعہ ہے، آٹھ جلدوں طبع ہو چکا ہے، جو ترمذی شریف جلد ثانی مع شمائل ترمذی پر مشتمل ہے، مقدمہ: نایاب اور قیمتی معلومات پر مشتمل ہے اور شرح کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں مدارکِ اجتہاد بیان کئے گئے ہیں، نیز ترمذی شریف کی عبارت صحیح اعراب کے ساتھ دی گئی ہے اور کتاب کا ہر ہر لفظ حل کیا گیا ہے، شروع میں کتاب العلل کی شرح بھی ہے، جو ایک قیمتی سوغات ہے۔ غرض یہ شرح ہر مدرس کی ضرورت اور حدیث کے ہر طالب علم کی حاجت ہے۔

(۲) رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ —— حضرت الامام المجد دالشاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ عالم اسلام کی ان برگزیدہ علمی شخصیتوں میں سے ہیں جن کی شہرت زمان ومکان کی قیود میں محدود نہیں، وہ اگر چہ ہندوستان میں پیدا ہوئے مگر ان کی شخصیت تمام عالم اسلام کا سرمایہ ہے۔ ان کی کتابیں اور انکے علوم ومعارف اسلامی تاریخ کا انمول خزانہ ہیں۔ حضرت الامام کی بہت سی کتابیں مختلف موضوعات پر ہیں لیکن حکمت شرعیہ اور فلسفۂ اسلام پر ان کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' اپنی نظیر آپ ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کے متعدد تراجم ہو چکے ہیں اور بعض بازار میں دستیاب بھی ہیں لیکن ان سے کتاب حل نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائیں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ کو جنھوں نے نہایت محنت کے ساتھ اس کتاب کی شرح لکھی۔ شرح سے علماء، طلباء اور پڑھے لکھے لوگ بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ شرح پانچ جلدوں میں اور تین ہزار چھ سو صفحات میں مکمل ہوئی ہے۔ ظاہری طور پر وہ تمام محاسن کتاب میں موجود ہیں جو ہونے چاہئیں، کتابت روشن اور واضح ہے، کمپیوٹر کتابت ہے، مگر جلی خط ہونے کی وجہ سے ضعیف نگاہ والے بھی بآسانی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ کاغذ نہایت اعلیٰ اور قیمتی ہے، طباعت بھی بہت عمدہ ہے، جلد مضبوط، دلکش اور خوب صورت ہے۔ اور قیمت اتنی کم ہے کہ اس ضخامت کی کتاب بازار میں اس قیمت پر دستیاب نہیں۔

نیز حضرت مفتی صاحب نے ایک احسان امت پر یہ بھی کیا ہے کہ حجۃ اللہ البالغہ پر عربی حاشیہ تحریر فرمایا ہے۔ جو دو جلدوں میں طبع ہو گیا ہے عربی خوان حضرات حاشیہ کی مدد سے کتاب حل کر سکتے ہیں اور درس میں بھی اس کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔

(۳) کامل برہانِ الٰہی تبیین وتشریح حجۃ اللہ البالغہ: رحمۃ اللہ الواسعہ میں مفتی صاحب نے عنوان قائم کر کے جو حجۃ اللہ کی آسان شرح کی ہے اس کو علحدہ کر لیا ہے اور ہلکی چار جلدوں میں مذکورہ نام سے یہ نئی کتاب تیار کی ہے اس میں حجۃ اللہ البالغہ کی عربی عبارت، ترجمہ، لغات اور تشریحات شامل نہیں۔ اب یہ عام مطالعہ کی ایک بہترین کتاب بن گئی ہے جو لوگ حجۃ اللہ حل نہیں کرنا چاہتے صرف اس کے مضامین پڑھنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ قیمتی سوغات ہے، زبان آسان اور سلیس ہے، ہر قاری بے تکلف اس کا مطالعہ کر سکتا ہے۔

(۴) ہادیہ شرح کافیہ: کافیہ علم نحو کا مشہور ومقبول متنِ متین ہے، اس کی عبارت سلیس اور آسان ہے، مگر اس آسان کتاب کو طریقۂ تدریس نے مشکل بنا دیا ہے۔ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ نے اس پر ایک کام یہ کیا ہے کہ کافیہ کو مفصل ومرقم

کیا ہے۔اس کے ہر مسئلہ اور ہر قاعدہ کو علحدہ کیا ہے، پھر اس کی نہایت آسان شرح لکھی ہے اور شروع میں کافیہ پڑھانے کا طریقہ بیان کیا ہے، اور قدیم طرز سے ہٹ کر کافیہ کس طرح طلبہ کے ذہن نشین کی جائے اس کے لئے ''مشقی سوالات'' دیئے گئے ہیں...... پھر دوسری شرح الوافیۃ عربی میں لکھی ہے اور اس پر وہی مفصل ومرقم متن ہے تاکہ طلبہ درس میں اس کو سامنے رکھ کر پڑھ سکیں۔

⑤ آسان نحو (دو حصے) نحو کی ابتدائی عربی کتابوں میں تدریج کا لحاظ نہیں رکھا گیا، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ یہ دو حصے پڑھا کر علم نحو کی کوئی بھی عربی کتاب شروع کرائی جاسکتی ہے۔ زبان آسان اور انداز بیان سلجھا ہوا ہے۔

⑥ آسان صرف (تین حصے) آسان نحو کے انداز پر تدریج کا لحاظ کر کے یہ رسالے مرتب کئے گئے ہیں۔ پہلے حصہ میں گردانیں ہیں قواعد برائے نام ہیں اور دوسرے حصہ میں قواعد مع گردان دیئے گئے ہیں۔ اور ابواب کی صرف صغیر دی گئی ہے۔ اور تیسرے حصہ میں تعلیلات اور ہفت اقسام کی گردانیں ہیں، بہت آسان اور مفید نصاب ہے۔

⑦ آسان منطق: ترتیب تیسیر المنطق۔ دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس میں تیسیر المنطق کی جگہ اب یہ کتاب پڑھائی جاتی ہے۔ اس میں تیسیر المنطق ہی کو سہل کر کے مرتب کیا گیا ہے، کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

⑧ تفسیر ہدایت القرآن: یہ مقبول عام وخاص تفسیر ہے۔ پارہ ۳۰ و ۱-۹ حضرت مولانا محمد کاشف الہاشمیؒ کے لکھے ہوئے ہیں اور ۱۰ تا ۱۸ مفتی صاحب نے لکھے ہیں، آگے کام جاری ہے اس تفسیر میں ہر ہر قرآنی کلمہ کے الگ الگ معنی دیئے گئے ہیں اور حاشیہ میں حل لغات اور ضروری ترکیب بھی ہے۔

⑨ الفوز الکبیر (جدید ترجمہ) قدیم ترجمہ میں سُقم تھا، اس کو سنوارا گیا ہے، بغلی عناوین بڑھائے گئے ہیں اور ضروری حاشیہ لکھ کر عمدہ کاغذ پر کتاب طبع کی گئی ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں اب یہی ترجمہ پڑھایا جاتا ہے۔ متوسط استعداد کے طلبہ از خود بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کی آسان اردو شرح الخیر الکثیر مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری نے لکھی ہے، اور عربی شرح العون الکبیر ہے۔

⑩ العون الکبیر: یہ الفوز الکبیر کی عربی شرح ہے، پہلے قدیم تعریب کے مطابق تھی، اب جدید تعریب کے مطابق کر دی گئی ہے۔

⑪ فیض المنعم: مقدمہ مسلم شریف کی اردو شرح ہے۔ اس میں ضروری ترکیب اور حل لغات بھی ہیں، غرض کتاب حل کرنے کے لئے ہر ضروری بات اس کتاب میں موجود ہے اور کوئی غیر ضروری بات نہیں لی گئی۔

⑫ تحفۃ الدرر: یہ نخبۃ الفکر کی بہترین اردو شرح ہے، کتب حدیث پڑھنے والوں خصوصاً مشکوٰۃ شریف پڑھنے والوں کے لئے نہایت قیمتی سوغات ہے۔

⑬ مبادئ الفلسفہ: اس میں فلسفہ کی تمام اصطلاحات کی عربی زبان میں مختصر اور عمدہ وضاحت کی گئی ہے۔ دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہے۔

⑭ معین الفلسفہ: یہ مبادئ الفلسفہ کی بہترین اردو شرح ہے، اور حکمت وفلسفہ کے پیچیدہ مسائل کی عمدہ وضاحت پر مشتمل اور معلومات افزا کتاب ہے۔

یادداشت